بسم اللہ الرحمن الرحیم

مدیر ترجمان القرآن کی خدمت میں

ترجمان القرآن ماہ جون و جولائی ۱۹۸۰ء کے اشارات سے متاثر ہو کر میں نے چند سطور محترم دوست نعیم صدیقی کو ارسال کی تھیں۔ ان سطور کا مقصد ان کی اشاعت نہ تھی۔ بلکہ اس قلبی تعلق کا اظہار تھا جو نعیم صدیقی صاحب کے ساتھ قائم ہے۔ اور اس تحریک کے ساتھ روحانی رشتے کا نتیجہ تھا۔ جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے بہترین ۳۰ سال صرف کئے ہیں کیونکہ اقامت دین کے اجارہ داروں نے اس تعلق کو اگرچہ بے رحمی کے ساتھ یکطرفہ طور پر منقطع کر دیا ہے۔ لیکن میں اس کی کسک کو آج بھی دل میں محسوس کرتا رہتا ہوں۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم بحث و فکر کے معاملے میں جس بات کی شدید مخالفت کیا کرتے تھے۔ ترجمان القرآن کے صفحات کو اسی بات کا ارتکاب کر کے داغ دار بنا دیا ہے۔ یعنی یہ کہ پہلے مصنوعی کمزور پوزیشن میری جانب منسوب کی گئی اور پھر نہایت "بہادرانہ" تابڑ توڑ حملے کر کے قارئین کو تاثر دیا گیا کہ "دشمن" کو تہس نہس کر دیا گیا ہے۔ یہ لکھتے ہوئے بے حد صدمہ ہوتا ہے کہ جناب نعیم صاحب کا یہ جواب میری تحریر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کی ایک ایک سطر افترا پردازی اور وسوسہ اندازی کا شاہکار ہے۔ یہاں پر بھی جناب نعیم صدیقی صاحب نے وہی موقف اختیار کیا جس کی مذمت مولانا مودودی مرحوم ہمیشہ کیا کرتے تھے کہ کسی کی مخالفت میں خوب خوب غلط بیانی کر کے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر دو ظاہر ہے کہ اس کا جواب ان سب لوگوں تک نہ پہنچ سکے گا جن کے ذہنوں کو مسموم کیا جا چکا ہے۔ اس لئے جو لوگ جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس شخص کے مخالف بن جائیں گے وہ خالص نفع کی شکل میں تمہارے کیمپ میں آجائیں گے۔

میرے محترم دوست اور منجھے ہوئے صحافی نے میری تصویر کھینچی اتنی چابک

ماہنامہ

میثاق

لاہور

(۱۹)

فروری ۱۹۸۰ء

ماہ ربیع الاول

کی مناسبت سے اس شمارے میں سیرت اور تاریخ کے موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد کی تین تقاریر یکجا شائع کی جارہی ہیں۔

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

(فون : 852683 - 852611)

قیمت فی پرچہ چار روپے ______ ۴/۰۰

دستی اور مہارت کی نہیں ہے کہ میں باہر سے مخالفت کرنے والوں اندر رہ کر اختلاف کرنے والوں اور تحریک سے علیحدہ ہوجانے والوں کے تمام مذموم خصائص کا مجموعہ نظر آنے لگا ہوں۔ بہرحال مجھے ملا حیاں سنانا جو انکی داخلی ضرورت ہے۔ جسکے ذریعہ اپنے مؤکلوں کو مخلصانہ وکالت کا یقین دلاسکتے ہیں اس لئے گالیاں سنکر "بے مزہ" نہ ہونگا۔

ان کا مؤکل نعیم صاحب کے اس اظہار کے علی الرغم کہ وہ میرے جواب دینے کے لئے موجود نہیں ہے: اپنے نام نہاد دستور اور ملک کے رائج الوقت نظام کے خلاف زیر زمین پورے تنظیمی ڈھانچے کے ساتھ موجود ہے۔ انتخاب بھی ہو رہے ہیں اور اجتماعات بھی حتیٰ کہ اختلاف رکھنے والوں سے محض ربط وضبط کی بنا پر رکنیت کی معطلی اور معافی کے بعد بحالی کے فیصلے بھی کئے جارہے ہیں اس وجہ سے مجبورًا میں اپنی تحریر کی اشاعت کیلئے ماہنامہ میثاق سے درخواست کر رہا ہوں کہ وہ اگر ممکن ہوسکے تو ان کی اشاعت کے لئے اپنے چند قیمتی صفحات کا زیاں برداشت کرے ممکن ہے کہ "گھر والوں" میں سے کسی کی نظر میری اس تحریر پر پڑجائے اور ان کو معلوم ہوجائے کہ یہ ایک ایسے مظلوم کی فریاد ہے جو گھر سے نکلا نہیں نکالا گیا ہے۔

فقط والسلام

سید وصی مظہر ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اپریل تا جون ۸۰ء کے اشارات میں آپ نے تحریک اسلامی اور دعوت اسلامی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی وجہ سے میرے اس یقین میں اور بھی اضافہ ہوا کہ آپ کو گذشتہ چند برسوں میں اگرچہ تحریک اسلامی کے عملی حالات سے دُور رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن حالات کی ہر کروٹ پر آپ نگاہ رکھتے ہیں۔ اور تحریک جن اجتماعی و انفرادی مسائل سے دوچار ہے ان سے آپ بخوبی واقف ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ ا

عرضِ احوال

خدا خدا کرکے قلم کی گرہ کھلی اور چند نہایت اہم خطوط کی تحریر سے فراغت پاتے ہی پہلی
ِست میں امریکہ کے سفر کی رُوداد لکھنی شروع کی تو اس کا طول بر حساب کتاب سے آگے
لتا محسوس ہوا۔ ادھر پرچے کی اشاعت میں پہلے ہی تاخیر ہوچکی تھی لہٰذا طے کیا گیا کہ اب جنوری
رفروری کا شمارہ مشترک شائع ہو، جو حاضرِ خدمت ہے!

وطنِ عزیز کی داخلی فضا میں امن و استحکام کے آثار پیدا ہوئے تو سرحد پار افغانستان
ہائی دھماکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ اس امر کا اندازہ تو کافی پہلے سے تھا کہ رُوس کسی
ِبھی افغانستان سے پسپائی اختیار نہ کرے گا، اور اپنی افواج براہِ راست اور کھلم کھلا داخل
ِ ہیں تو اس سے بھی گریز نہ کرے گا۔ لیکن بالفعل یہ معاملہ جس ڈھٹائی کے ساتھ ہوا ہے اُس
پوری دُنیا کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا ہے۔ اگر کوئی ایسی حکومت افغانستان میں قائم
جسے دُنیا نے تسلیم کر لیا ہوتا، جیسے کہ نور محمد ترکئی کی حکومت تھی یا پھر حفیظ اللہ امین کی۔ اور وہ
.وست ملک سے مدد کی طلبگار ہوتی، تب تو ایسی کسی کارروائی کے لئے کسی درجے میں
!ز پیش کی جاسکتی تھی لیکن غالباً مزید خطرہ (RISK) مول لینا رُوس کی مصلحت میں
۔ لہٰذا اُس نے کھُلی جارحیّت کا راستہ اختیار کرنے میں بھی باک محسوس نہ کی۔ اور خود ہی
اللہ امین کی حکومت کا تختہ اُلٹا اور اُسے قتل کیا، اور ایک ایسے شخص کی حکومت کا اعلان
جو اس وقت افغانستان میں موجود بھی نہ تھا۔

اس کے بعد چند دن کے اندر اندر رُوسی افواج جس طرح پہلے افغانستان کے قلب پر
ہوئیں اور پھر انہوں نے چاروں سمتوں میں یلغار شروع کر دی۔ اس سے بالکل وہی
ہو گیا ہے جو قرآنِ حکیم میں یاجوج و ماجوج کے ذکر کے ضمن میں وارد شدہ الفاظ میں

پہ یہ بھی کسی مثبت سیاسی اساس پر نہیں ہے، اور اس اعتبار سے سخت ناقابلِ اعتبار ہے!

نصب العین سے مطابقت رکھتے ہیں۔

میں اپنی بات کو روزمرہ کی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں " فرض کیجئے کہ ایک بچے نے غیر شعوری طور پر کسی فلمی اداکار کو اپنا ہیرو بنالیا ہے۔ دوسری طرف اُس کے والد ماجد اُس کو ایک اچھا ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں والدصاحب کی نصیحتوں کو خواہ زبانی طور پر بچہ درست تسلیم کرے مگر عملاً اپنے خیالی ہیرو کے رنگ میں رنگے جانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اور ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لئے جو ضروری تقاضے ہیں اُن کو اپنی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ سمجھے گا۔

باپ کے خیال سے اگر اُن میں سے کوئی تقاضہ اُسے پورا بھی کرنا پڑ جائے تو انتہائی ناگواری کیساتھ اُسے پورا کرے گا۔ بالکل اسی طرح سے ہوا یہ کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اقامتِ دین کا جو عظیم الشان نصب العین تحریک اسلامی کی تاسیس کی بنیاد تھا۔ وہ بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اُس کے بجائے ایک دوسرا نصب العین عملی طور پر اختیار کرلیا گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کی صورت میں جو مصنوعی انقلاب برپا ہوا اُسکے دباؤ کے تحت تحریک نے فیصلہ کیا کہ اُسکے پاس جو بھی قوت ہے اُس کے ذریعے سے زور لگا کر سیاسی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور پھر حقیقی اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے حکومت کے ذرائع اور وسائل کو بھی استعمال کرکے ملّت پاکستان کو جلد از جلد دعوت اسلامی کی علمبردار ملّت میں تبدیل کردے۔ لیکن کچھ تو اپنی قوت کا اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی۔ کچھ ملک کی سیاسی قیادت کی پشت پر کام کرنے والی باطل کی عالمی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کا صحیح اندازہ لگایا جاسکا۔ جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے ایک طرف ملک سے بتدریج جمہوریت کا خاتمہ کردیا گیا۔ دوسری طرف تحریک کے خلاف تمام گروہوں اور طبقوں کو سرگرم عمل کردیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی قیادت پر قبضہ کرنے کی منزل دور سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور اس منزل کے حصول میں ہم اس درجہ کھوئے گئے کہ ہم اپنے دشمنوں کی چالوں کو کماحقہٗ سمجھ بھی نہ سکے۔ ہم نے مسلمانوں کی اسلامیت کا ڈھنڈورہ اس طرح پیٹا اور اُن کے آزادانہ ووٹ سے اسلامی قیادت کے وجود میں آجانے کے یقینی

وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۹ | جنوری - فروری ۱۹۸۰ء | عدد ۱

مشمولات

ہوچکا ہے اور صاف نظر آرہا ہے کہ دُنیا کی عظیم ترین حربی قوتوں۔ SUPER POW-
ERS۔ کی زور آزمائی کا میدان اب اسی علاقے کو بننا ہے، جہاں توحیدِ الٰہی کے امانتدار
اور نبیِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا بستے ہیں، اور نقشہ وہی بن رہا ہے کہ ؎
آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے ؞ کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟
اِس سلسلے میں خطرے کی زد میں تو اگرچہ ترکی بھی ہے، جہاں رُوس ارمنی عیسائیوں
کے ذریعے بدامنی پھیلا رہا ہے اور اس سے کہیں زیادہ ایران بھی جس کے داخلی انتشار اور
امریکہ کے ساتھ آویزش نے صورتِ حال کو اور بھی زیادہ مخدوش بنا دیا ہے۔ لیکن واقعہ
یہ ہے کہ ہر اعتبار سے شدید ترین خطرہ پاکستان کو لاحق ہے جس کے جنوب مشرق میں بھارت
ایک عظیم عسکری قوت بن چکا ہے اور جہاں اندرا گاندھی دوبارہ نہایت فیصلہ کن اور مستحکم
اکثریت کے ساتھ برسرِ اقتدار آگئی ہیں، اور بقول لارڈ کیرنگٹن روس بھارت گٹھ جوڑ
(SOVIET-INDIA AXIS) اپنی سابقہ شان کے ساتھ برسرِکار آرہا ہے۔
یہی وجہ ہے کہ اس وقت عالمی ڈپلومیسی کی سب سے بڑی جولانگاہ برِّصغیر ہند و پاک بن چکا
ہے۔ اور مشرق و مغرب کے چوٹی کے زعماء دہلی اور اسلام آباد آجا رہے ہیں۔۔۔ اس پس منظر
ں وقت جن لوگوں کے ہاتھوں میں اس ملک کی زمامِ کار ہے، اُن کے کاندھوں پر بڑی
ذمہ داریاں آگئی ہیں اور ہر پاکستانی مسلمان کو تمام سیاسی و گروہی اختلافات کو بالائے
،کھ کر دعا کرنی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو صحیح سوجھ بوجھ عطا فرمائے، اور
فیصلوں تک پہنچنے کی توفیق دے۔
اندریں حالات دُعا کے علاوہ ہم درویشوں کے کرنے کا کام یہی ہے کہ "تحریکِ
،رجوع الی القرآن" اور "دعوتِ تجدیدِ ایمان، توبہ اور تجدیدِ عہد" کے ضمن
ں مساعی تیز تر کر دیں۔ اس لئے کہ رحمتِ الٰہی کو پکارنے کی سبیل یہی ہے کہ اخلاص
ھ توبہ کی جائے۔ اور اللہ کے ساتھ از سرِ نو اپنے ایمان و یقین اور عہد و میثاق کے
کو استوار کیا جائے۔ اور پوری توجہ قرآن کے ساتھ ایک مضبوط ذہنی و قلبی تعلق قائم
پر مرتکز کر دی جائے۔ اس لئے کہ قرآن ہی منبعِ ایمان و سرچشمۂ یقین بھی ہے اور
ئے فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام 'حبل اللہ' بھی۔ جو اُمّت کی وحدت
ت اور فکر و عمل کی یک جہتی و یک رنگی کی مثبت اساس بن سکتی ہے۔ چنانچہ اس موقع

سامنے آتا ہے یعنی : وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ ٥ [له] -- یعنی ایسے محسوس ہوگا جیسے وہ ہر اونچائی سے پھسلتے چلے آرہے ہوں !

اس پس منظر میں بعض مبصرین کی یہ رائے بہت وزنی نظر آتی ہے کہ ایسے لگتا ہے کہ جیسے رُوس نے روایتی اور نیوکلر جملہ اقسام کے اسلحہ و سامانِ جنگ میں امریکہ اور اُس کے اتحادیوں پر ایسی فیصلہ کُن برتری حاصل کر لی ہے کہ اب اسے اپنی توسیع پسندی کے بے لگام شوق کی لگام مزید کھینچے رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اب اصل حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہے، لیکن اگر یہ بات کسی بھی درجے میں مبنی برحقیقت ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ "حَتّٰى إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوْجُ وَمَأْجُوْجُ" کی خدائی وعید کا وقت آن پہنچا ہے۔

اس صورتِ حال میں مسلمانوں کا اپنی صفوں کے انتشار کو دُور کرنا اور "وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" کے مطابق ہر ممکن اسلحہ اور سامانِ حرب و ضرب جمع کرنا بھی یقیناً لازمی و لابدی ہے ---- لیکن ان سے بھی مقدم اور اہم تر بات یہ ہے کہ خلوصِ دل سے توبہ و استغفار کرتے ہوئے رحمتِ خداوندی کو پکارنے کی کوشش کی جائے بمصداق الفاظِ قرآنی: "يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا تُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا" اس لئے کہ بندۂ مومن کی اُمید بھی اُسی کی رحمت سے وابستہ ہوتی ہے، اور خوف بھی ہوتا ہے۔ تو صرف اُسی کی سزا اور پکڑ کا از رُوئے الفاظِ قرآنی :

"عَسٰى رَبُّكُمْ أَنْ يَّرْحَمَكُمْ وَإِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا"

یعنی تمھاری بے راہروی کی جو سزا تمھیں مل چکی ہے یا مل رہی ہے، اس کے بعد تم راہِ راست پر آجاؤ تو رحمتِ خداوندی اب بھی تمھیں اپنے سائے میں لے لے گی، لیکن اگر تم نے سابقہ ڈگر ہی اختیار کئے رکھی تو اللہ بھی پھر وہی کرے گا، جو پہلے کر چکا ہے ---- افسوس کہ اس پُرخطر مرحلے پر بھی مشاہدہ یہی ہے کہ اور ساری چیزوں کی جانب تو دھیان جاتا ہے لیکن اس اصل حقیقت کی جانب بالکل توجہ نہیں رہی۔ فَيَا لَلْأَسَفِ ---- !!!

بہرحال یہ ظاہر ہے کہ پورے مشرقِ وُسطیٰ کا نظم و امن متزلزل (بقیہ ص ۹)

[له] کھل گئے یاجوج اور ماجوج کے لشکر تمام ❖ چشمِ مسلم دیکھ لے تفسیرِ حرفِ ...

نوش فرمایا۔ جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے " اسد اللہ و اسد رسولہ " بھی شامل تھے
اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسے قرآن کے قاری و مُقری بھی۔ گویا جواب پورا
بھرپور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی ہی آیت میں مسلمانوں کی دلجوئی فرماتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:
: اِنْ یَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ
یعنی "اے مسلمانو! اگر آج تمہیں کوئی چرکا لگا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی تو بالکل
ایسا ہی چرکا لگ چکا ہے!"

بلکہ ایک دوسرا پہلو نسبتاً زیادہ تکلیف دہ یہ تھا کہ بدر میں تو مسلمانوں نے مدینہ سے اسّی
میل دُور جا کر قریش کو شکستِ فاش دی تھی، اور اُحد میں دشمنوں نے انہیں تین گھر پر آکر
کاری زخم لگایا۔ نتیجۃً مسلمانوں کو یکدم اپنے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی اور
مسلمانوں کی جو دھاک غزوۂ بدر کی وجہ سے بیٹھ گئی تھی اور جو رعب داب قائم ہو گیا تھا،
وہ دفعتہً ختم ہوتا محسوس ہوا، جس کے نتیجے میں بددلی اور دل شکستگی کی ایک عام فضا
پیدا ہو گئی اور کچھ ضعیف الایمان لوگوں کے دلوں میں تو شدید مایوسی نے ڈیرا ڈال لیا۔ اس
پس منظر میں یہ عظیم آیتِ مبارکہ مسلمانوں کے لئے ایک نوید جانفزا بن کر نازل ہوئی کہ اے
مسلمانو! اس عارضی اور وقتی صورتِ حال سے نہ پست ہمت ہو نہ غمگین، اہلِ ایمان کے
ابتلاء و آزمائش ــــ اور جانچ پرکھ کے لئے دنوں کا اُلٹ پھیر اور حالات کی اُونچ
نیچ بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمتیں مضمر ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ عارضی ہوتا ہے ــ اللہ کا
وعدہ اپنے اہلِ ایمان بندوں سے یہی ہے کہ:
اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝
کہ یقیناً آخری فتح تمہاری ہی ہوگی ــ اور غالب تم ہی رہو گے بشرطیکہ تم ایمان پر ثابت
قدم رہے ــ اور یقین کا دامن تم نے ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ گویا بقول علاّمہ اقبال ؎
تُندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب ✿ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے
اِس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی یہ آیتِ محکم اہلِ ایمان کے حق میں
ابدالآباد تک کے لئے اُمید کا ایک پیغام اور فتح و نصرت کی ایک نوید جانفزا ہے۔ خالقِ
کائنات اور شہنشاہِ ارض و سمٰوٰت کے اس پختہ وعدے سے بڑھ کر اُمید افزا، اور
مسرت بخش چیز اور کون سی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ وعدہ غیر مشروط

نشری تقریر

اسرار احمد

احمدہٗ و اصلّی علیٰ رسولہ الکریم

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ★ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا

وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

یہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۳۹ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

(اے مسلمانو!) نہ پست ہمت ہو نہ غمگین، اگر تم مومن ہو تو یقیناً تم ہی غالب رہو گے

یہ الفاظِ مبارکہ اُس مفصل خطاب کے دوران وارد ہوئے ہیں جو سورۂ آلِ عمران میں آیت ۱۲۱ سے آیت ۱۸۰ تک پھیلا ہوا ہے اور جس میں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات اور اس کے فوراً بعد کے مترتب ہونے والے اثرات اور اُن سے پیدا شدہ مسائل و معاملات پر تفصیلی تبصرہ بھی ہے اور مسلمانوں کو آئندہ کے لئے واضح ہدایات بھی دی گئی ہیں۔

غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جو فتح مبین اپنے خاص فضل و کرم اور خصوصی نصرت و تائید سے عطا فرمائی تھی اور یوم بدر کو جس طرح حق و باطل کے مابین امتیاز کر دینے والا "یوم الفرقان" بنا دیا تھا، اس کے نتیجے میں واقعہ یہ ہے کہ پورا ایک سال مسلمانوں کے لئے امن و سکون ہی نہیں فتح کے کیف و سرور کے عالم میں گذرا جس سے نہ صرف یہ کہ مستقبل کے لئے امید اور اعتماد کی فضا پیدا ہوئی۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو یہ سمجھا کہ بس اب آخری فتح اور غلبۂ کامل بالکل قریب ہے۔ اس "مد" کے عالم میں غزوۂ اُحد ایک فوری "جزر" کی کیفیت لئے ہوئے آیا۔ بدر میں ستر کفارِ قریش ہلاک ہوئے تھے، جن میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ ایسے سردار بھی شامل تھے تو اُحد میں ستر ہی صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے جام شہادت

ن ہو ہے ہی امن و سکون اور اطمینانِ قلبی کی کیفیت جس میں نہ خوف کی
تی رہے نہ حزن کی بمصداق الفاظِ قرآنی :

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ○

باؤ کہ اللہ کے دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے — اور نہ کوئی غم ان کے نزدیک
نا ہے ! — دُنیا کے بدلتے ہوئے حالات، عارضی شکست و ہزیمت یا جانی
ںن کے بارے میں اہلِ ایمان کا نقطۂ نظر سورۂ توبہ کی اس آیۂ مبارکہ میں بڑی
ی سے وارد ہوا ہے کہ ——

ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ ○

اے کافرو ! اور منافقو ! تم ہمارے بارے میں دو انتہائی اعلیٰ اور عمدہ صورتوں
وائے آخر تیسری کون سی صورت کی آس لگا رہے ہو ؟ اگر ہم سب اللہ کی راہ میں
قتال کرتے ہوئے کام آجائیں اور جامِ شہادت نوش کر لیں تو ہمارے نزدیک
ں کامیابی اور کوئی ہے ہی نہیں — اور اگر ہم غازی بن کر لوٹے اور
مرانی بھی ہمارے قدم چوم لے تب تو تمہارے معیارات کے مطابق
شمار ہوں گے۔ اب تم سوچو کہ وہ کون سی تیسری صورت ہے جس کا
دیکھنا چاہتے ہو ؟ —— !!

ں آیۂ مبارکہ کا پہلا لفظ خصوصی توجہ کا مستحق ہے — یعنی لَا تَھِنُوْا
ہن ہے۔ وھن عربی زبان میں ضعف کو کہتے ہیں۔ عام اس
ف ظاہری اور عملی ہو یا معنوی و باطنی — اور فی الواقع ان میں کوئی
نہیں اس لئے کہ اندر کی کمزوری ہی ظاہری کمزوری کا سبب بنتی ہے اور
ں کی پستی ہی انسان کے جوشِ عمل اور جذبۂ جہاد کو دیمک کی طرح چاٹ
غور کیا جائے تو کسی مسلمان میں ہمت کی پستی اور ارادے کا ڈھیلا پن
سے پیدا ہو سکتا ہے اور وہ ہے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے الفاظِ مبارکہ
ب الدّنیا و کراھیۃ الموت !— یعنی دُنیا کی محبت اور موت کا خوف !
چیزیں براہِ راست نتیجہ ہیں ایمان کے ضعف کا۔ اگر اللہ پر ایمان حقیقی
تو اس کا لازمی نتیجہ ہے اس سے کی محبت، اور ظاہر ہے کہ محبوب سے

نہیں ہے، بلکہ جس طرح بندے اور ربّ کے مابین تمام معاملات دو طرفہ ہیں جیسے نصرت
ہے کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ !— (اگر تم اللہ کی مدد
کروگے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدموں کو جما دے گا!) — یا یاد
اور ذکر کہ: فَاذْكُرُوْنِیْٓ اَذْكُرْكُمْ ! (پس تم مجھے یاد رکھو، مَیں تمہیں یاد رکھوں گا)
یا جیسے توبہ کا معاملہ ہے کہ بندہ توبہ کرتا ہے گناہ اور معصیت کو ترک کر کے طاعت و
فرمانبرداری کی جانب پلٹ کر اور اللہ بھی توّاب ہے یعنی فوراً اپنی عنایتوں اور شفقت
کے ساتھ متوجہ ہوجاتا ہے بندے کی جانب — یا جیسے شکر، کہ بندہ بھی شکر کرتا ہے اللہ کا
احسان مان کر، اور اللہ بھی شکور ہے یعنی بندوں کی قدر افزائی فرماتا ہے!۔ اسی طرح
کا معاملہ اس وعدے کا بھی ہے کہ مسلمان ہی دُنیا میں سربلند ہوں گے۔ بشرطیکہ وہ واقعۃً
مومن ہوں — اور واقعہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی موجودہ حالت پر نظر ڈالیں اور اس
سوال کا جواب حاصل کرنا چاہیں کہ ؎

"ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۞ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جنابِ میں"

تو وہ اسی آیۂ کریمہ میں موجود ہے — اور اگر اس کی روشنی میں ہم جائزہ لیں او
غیر جانبداری اور انصاف پسندی کے ساتھ اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور اپنے گریبان ...
تو صاف نظر آجائے گا کہ اُمّتِ مسلمہ کی ایک عظیم اکثریّت کے قلوب و اذہان نورِ ایمان سے
محروم ہوچکے ہیں — اور مغرب سے اٹھنے والی مادّہ پرستانہ الحاد کی آندھیوں نے عالمِ
اسلام کے اکثر و بیشتر حصّے میں ایمان و یقین کے ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کو بالکل گُل کر کے
رکھ دیا ہے۔ علّامہ اقبالؔ نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ؎

"بُشدہ مومن و بے ذوقِ طلب ۞ العجب، ثمّ العجب، ثمّ العجب!"
"رفت سوزِ سینۂ تاتار و کُرد ۞ یا مُسلماں مُرد یا قرآں بمُرد"

کیسے ممکن ہے کہ ایمان ہو اور انسان میں نہ ذوقِ طلب ہو نہ جوشِ عمل، نہ جذبۂ جہاد!
واقعہ یہ ہے کہ اگر دو اور دو مل کر چار ہی ہوتے ہیں نہ کبھی تین ہو سکتے ہیں نہ پانچ، تو یہ
بھی ناممکن ہے کہ دلوں میں ایمان موجود ہو اور پھر بھی مایوسی کے یہ بادل چھا جائیں اور
خوف اور حُزن کے گھٹا ٹوپ اندھیرے انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیں۔
ذرا غور کیا جائے تو ایمان کا لفظ تو بنا ہی امن کے مادّے سے ہے، اور اس کا

درسِ قرآن

سُورَۃُ العَصْر

از : مولانا عبدالغفار حسن ، استاذ حدیث جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

۴، نومبر ۱۹۸۴ء کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی امریکہ، کینیڈا، مصر کے دورہ اور حج کی سعادت سے مراجعت پر کراچی کے ہوٹل "جبیس" میں بعض احباب کی جانب سے ایک دعوتِ عصرانہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت از راہِ لطف وکرم مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدّظلّہٗ استاذ الحدیث مدینہ یونیورسٹی نے منظور فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا جہاز بہت زیادہ تاخیر سے کراچی پہنچا اور وہ اس تقریبِ استقبالیہ میں شرکت نہ فرما سکے۔

مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے اس موقع پر "سورۃ العصر" کی مختصر تشریح فرمائی جو ہدیۂ قارئین ہے۔ مولانا محترم کو چند ہی روز کے بعد واپس حجاز شریف تشریف لے جانا تھا۔ اس لئے اُن کے بقول ڈاکٹر صاحب کے تشریف نہ لا سکنے کی وجہ سے یہ استقبالیہ تقریب ایک الوداعی تقریب میں تبدیل ہوگئی۔ شہر کے اس اعلیٰ اور نفیس ہوٹل میں اس موقع پر مدعوّین ایک سَو حضرات میں سے تقریباً ساٹھ افراد موجود تھے۔ بقیہ حضرات کو ڈاکٹر صاحب کے نہ پہنچنے کی اطلاع مل چکی تھی، چنانچہ وہ شریک نہیں ہوئے۔ شرکاء میں شہر کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے بہت سے چوٹی کے لوگ موجود تھے۔ جن میں وکلاء، اخبارات کے مُدیران، صحافی، انجینئرز، اعلیٰ ملازمین، ڈاکٹرز، سابق وزیر، علماء و دانشور اور تاجر حضرات شامل ہیں۔ مولانا صاحب کا یہ درس ٹیپ سے ہمارے رفیق جناب پرویز اقبال صاحب نے منتقل کیا ہے۔ ـــــ خاکسار قاضی عبدالقادر ـ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ـــ امّا بعد ـــ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ـ

اس موقع پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مشہور مقولہ یاد آیا۔ انہوں نے

کا اشتیاق ہوتا ہے نہ کہ دُوری یا ہجر کا۔ نتیجۃً مومن کے لئے موت خوش آئند ہونی چاہئے حیاتِ دُنیوی کا طول ناپسندیدہ، بموجب فرمانِ نبوی: ”الدّنیا سجن المومن وجنّة الکافر!“ (یعنی دُنیا مومن کے لئے قید خانہ کے مانند ہے اور کافر کے لئے جنّت!) اور بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

”نشانِ مردِ مومن با تو گویم ٭ چوں مرگ آید تبسّم برلب اوست!“

اسی طرح اگر آخرت پر حقیقی یقین ہو اور انسان کا دل گواہی دے کہ وہ اللہ کے عفو و درگذر اور فضل و کرم سے جنّت میں داخل کیا جائے گا تو کیا حیاتِ دُنیوی کا ایک ایک لمحہ اس پر شاق نہ گذرے گا۔ گویا ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہے حبّ الدّنیا و کراہیۃ الموت۔ اور اس کا حاصل ہے ہمّت کی پستی اور جوشِ عمل اور جذبۂ جہاد کا فقدان — یعنی وھن!

آخر میں اس حدیث شریف کا ذکر مناسب رہے گا جس میں وھن کی یہ شرح وارد ہوئی ہے۔ ایک بار آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے فرمایا کہ: ”اے مسلمانو! ایک وقت آئے گا کہ اقوامِ عالم تم پر ایک دوسرے کو دعوت دیں گی جیسے دسترخوان چُنے جانے کے بعد دعوت کھلانے والی مہمانوں کو بُلایا کرتی ہے!“ — یعنی تم اقوامِ عالم کے لئے لقمۂ تر بن جاؤ گے۔ اس پر صحابہؓ نے عرض کیا کہ: ”حضور! کیا ان دنوں ہماری تعداد بہت کم ہو جائے گی؟“ — آپؐ نے فرمایا: ”نہیں تمہاری تعداد بہت ہوگی لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے اوپر کے جھاگ اور خس و خاشاک کی سی ہو کر رہ جائے گی!“ — استفسار پر آپؐ نے فرمایا: ”یہ اس لئے ہوگا کہ تمہارے اندر ’وھن‘ پیدا ہو جائے گا!“ — اور پھر اس سوال کے جواب میں کہ: حضور! یہ ’وھن‘ کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ”حُبّ الدّنیا وکراھیة الموت!“ — یہ حدیث مبارک کہ دورِ حاضر کے مسلمانوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے — اور اس میں ہماری پوری موجود الوقت صورتِ حال کی تصویر بھی موجود ہے، اور اس کے اسباب کی مکمّل تشخیص بھی!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس ’وھن‘ کی دلدل سے نکلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

بالآخرۃ کو اپنالیا، حقیقت میں انہوں نے ایک بڑا حصّہ ایسا حاصل کرلیا جس سے اُن کی فلاح ہو سکتی ہے۔ لیکن مکمل فلاح تب ہوگی جبکہ دوسرا اصول بھی اپنالیں اور وہ ہے: "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"! یعنی محض ایمان کافی نہیں، اس کا تعلق انسان کے دل سے ہے۔ لہٰذا محض کوئی عقیدہ، کوئی فکر جو انسان کے دل پر اور اس کے دماغ پر چھا جائے محض وہ کافی نہیں ہے، جب تک کہ اس کی عملی شکل نہ ہو۔ اس لئے ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب انسان کو یقین حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر، اس کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے پر، اس کے مختار مطلق ہونے پر اور اس کے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہونے پر تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایمان سے اس کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو، تبدیلی پیدا ہو، بجائے شر کے خیر آئے، بجائے گناہ کے نیکی اس کی زندگی میں چھا جائے۔ اس لئے فرمایا: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، اور یہاں لفظ اَلصّٰلِحٰت فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام نیکیاں جن کو اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نیکی قرار دیا ہے۔

آج کل کی نیکیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو روایتی نیکیاں اور ایک وہ نیکی جو کتاب و سنّت سے ثابت ہے۔ روایتی نیکی وہ ہے کہ جو عامۃ الناس نے یا آباء و اجداد کی تقلید میں نیکی بن گئی۔ یہاں قرآن مجید میں اَلصّٰلِحٰت سے وہ نیکی مراد نہیں ہے جو ہمارے رواج کی بناء پر یا غلط قوموں کی تقلید کی بناء پر، یا آباء و اجداد کی تقلید کی بناء پر ہماری قوم میں اجتماعی اور انفرادی زندگی میں سمو دی گئی ہے۔ بلکہ اَلصّٰلِحٰت سے مراد وہ نیکیاں ہیں جو قرآن مجید سے ثابت ہیں، جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ اس لئے فرمایا کہ: "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"! کہ انسان جب ایمان لاتا ہے تو ایمان کا لازمی نتیجہ کیا ہے؟ عملِ صالح، لیکن اب ایمان اور عمل صالح کی یہ دو نعمتیں حاصل ہو گئیں تو ایک صحیح تقاضا یہ ہے کہ اب یہ نعمت متعدی ہونی چاہیئے، انسان کی اپنی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ اس کو پھیلائے۔ یعنی نیک بنو اور نیک بناؤ، یعنی دوسروں تک بھی اس دعوت کو، ایمان کی دعوت کو اور عملِ صالح کی دعوت کو پھیلاؤ۔ اس لئے اس کے بعد فرمایا: "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ"! کہ وہ آپس میں تلقین و نصیحت کرتے ہیں حق کی اور سچائی کی، باطل کو چھوڑ کر جو حق ہے۔ صحیح معنیٰ میں جو چیز کتاب و سنّت سے ثابت ہے

ایسے ہی موقع پر کہا تھا کہ "عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ" کہ میں نے اپنے رب کو عزائم کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔ یعنی انسان بڑے پختہ ارادے کر لیتا ہے، لیکن وہ وقت پر پورے نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی حیثیت کیا ہے۔ بڑے بڑے عزائم رکھتا ہے، بڑے بڑے اُس کے ارادے ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ اور ہوتی ہے، لہٰذا اُس کے سارے عزائم، اُس کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس وقت خیال تو یہ تھا کہ عصرانے کی مناسبت سے "سورۃ العصر" کی تفسیر بیان کی جائے۔ لیکن اتنا وقت نہیں ہے کہ یہ تفسیر مکمل ہو سکے اور ویسے بھی موجودہ صورت ایسی ہے کہ مغرب کا وقت قریب ہے تو اس لئے مناسب یہی ہے کہ چند ضروری باتیں تبلیغ و دعوت کے سلسلے میں عرض کر دی جائیں۔

سورۃ العصر کا خلاصہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o اس میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کو گواہ ٹھہرایا ہے اِس بات پر کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں صرف وہی لوگ خسارے سے پاک ہیں، جنھوں نے چار بنیادی اُصولوں کو اپنا لیا ہے۔ اِن میں سے پہلا اُصول ہے ایمان، دوسرا ہے عملِ صالح، تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا ہے تواصی بالصبر۔ تو عصر کے معنیٰ اصل میں آتے ہیں نچوڑنے کے عربی زبان میں، اور ظاہر بات ہے کہ جس چیز کو نچوڑا جاتا ہے۔ مثلاً جب آپ نے گنّے کو نچوڑا اور اُس کا رس نکالا، تو اب یہ رس واپس نہیں جا سکتا۔ آج کل سائنس نے کافی ترقی کی ہے، لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے کوئی آلہ اب تک ایسا ایجاد نہیں ہوا کہ نچوڑا ہوا رس دوبارہ واپس جا سکے، جہاں سے اُسے نکالا گیا تھا۔ اس میں اشارہ ہے اِس بات کی طرف کہ زمانہ جو گزرتا جا رہا ہے وہ واپس نہیں آ سکتا۔ جس طرح کہ نکالا ہوا رس دوبارہ اُس پھل میں، یا اُس چیز میں نہیں لے جایا سکتا۔ تو فرمایا: وَالْعَصْرِ قسم ہے زمانے کی، زمانہ گواہ ہے، شاہد ہے اس دعوے پر جو بعد میں بیان کیا جا رہا ہے کہ تمام انسان یقیناً گھاٹے میں ہیں۔ البتہ وہ لوگ گھاٹے میں نہیں جن کے اندر چار باتیں پائی جاتی ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جو لوگ ایمان لے آتے ہیں۔ یہاں ایمان سے مراد ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرۃ ہے۔ جن لوگوں نے اپنی انفرادی زندگی میں اور اپنی اجتماعی زندگی میں ایمان باللہ کو، ایمان بالرسالت کو، ایمان

مباحث قرآنی

شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِينٍ

از جناب احمد الدین مارہروی (ایم اے ، ایم ایڈ)

قرآن حکیم کی سورۃ صٰفّٰت میں حضرت یونس علیہ السّلام کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ فَسَاهَمَ
فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ۝ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ۝ فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ
كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ ۝ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ۝ فَنَبَذْنٰهُ
بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِیْمٌ ۝ وَ اَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ۝

(اور تحقیق یونس پیغمبروں میں تھے، جب وہ بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے۔ پھر جب قرعہ ڈالنے والوں میں شریک ہوئے تو انہیں کا نام نکلا۔ پھر انہیں مچھلی نے نگل لیا اور وہ خود اپنے کو ملامت کرنے لگے۔ اور اگر وہ خدا کے نام کی تسبیح نہ کرتے تو قیامت تک اس کے پیٹ میں رہتے۔ تو ہم نے انھیں ایک چٹیل جگہ پر ڈال دیا۔ اور اس وقت ان کی حالت بڑی سقیم تھی اور وہاں ہم نے یقطین کا ایک پودا اُگا دیا۔ (سورۂ صٰفّٰت ، آیات ۱۳۹ تا ۱۴۶)

حضرت یونس علیہ السّلام کو جس قوم کی رُشد و ہدایت کا فریضہ سپرد ہوا تھا اس کے متعلق جدید تحقیقات سے واضح ہو چکا ہے کہ عراق کے مشرقی علاقے میں آباد تھی۔ اس لئے کشتی میں سوار ہونے، مچھلی کے نگلنے اور پھر انہیں قرب و جوار ہی میں کہیں چٹیل اور بے آب و گیاہ ساحل پر اُگل دینے کا واقعہ پیش آیا ہوگا۔ یہ بات بھی تحقیق ہو گئی ہے کہ جس مچھلی کا اس مقام پر ذکر کیا گیا ہے وہ وہیل تھی اور میرا خیال ہے کہ بلین (BLEEN) قسم کی ہوگی، جس کے دانت نہیں ہوتے۔ بلکہ اوپر کے جبڑے یا تالو میں چھلنی کی طرح کا ایک پردہ لٹکتا رہتا ہے۔ چھوٹی غذا اس میں سے چھن کر اندر جاتی ہے، اور بڑی (جیسے کہ انسانی جسم) کو نگلتے وقت چھلنی ایک طرف ہٹ جاتی ہے، اور شکار بلا چبائے اندر چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کا ہضم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بالعموم یا تو وہ اُسے اُگل دیتی ہے یا مر جاتی ہے۔ چنانچہ دونوں قسم کے واقعات مشاہدہ میں آچکے ہیں۔

اُس کی طرف بلاتے ہیں اور اس کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ لیکن ایک انسان جب یہ دعوت دیتا ہے، اور جب لوگوں کو حق کی طرف بلاتا ہے تو بہت سے ایسے لوگ بھی معاشرے میں پائے جا سکتے ہیں، جن کے مفاد پر چوٹ پڑتی ہے۔ جبکہ وہ حق کی دعوت قبول کرتے ہیں یا اس کو پھلتے پھولتے دیکھتے ہیں تو ان کی طرف سے پھر مخالفت ہو سکتی ہے، معاندانہ سرگرمیاں ہو سکتی ہیں، مختلف قسم کی تہمتیں تراشی جا سکتی ہیں تو ایسے موقع پر فرمایا: " وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ!" کہ وہ آپس میں تلقین کرتے ہیں صبر کی۔ لہٰذا دعوتِ حق کے لئے تین چیزیں بنیادی ہیں۔ ایک تو یہ کہ دعوت سے پہلے تواصی بالحق سے پہلے علم ضروری ہے۔ یعنی جس چیز کی آپ دعوت دے رہے ہیں، پہلے اس کا علم بھی ہونا چاہیئے، جتنی بھی آپ دعوت دیتے ہیں، اجمالی طور پر یا تفصیلی طور پر اسی لحاظ سے ہمیں علم ہونا چاہیئے کہ ہم کس چیز کی طرف بُلا رہے ہیں اور اس کی کیا اہمیت ہے؟ دعوت سے پہلے علم اور دعوت کے دوران حِلم — حِلم یعنی صبر، جب دعوت دینے کا وقت آیا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے دعوت دیتے وقت رِقّت کی ضرورت ہے، نرمی کی ضرورت ہے، محبّت کی ضرورت ہے۔ اندازِ تبلیغ نہایت ہی اچھا ہونا چاہیئے۔ جیسے کہ فرمایا: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط یعنی یہ کہ اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلاؤ حکمت کے ساتھ، دانائی کے ساتھ اور دلنشیں نصیحت کے ساتھ۔ اور اگر کبھی بحث کی ضرورت پیش آجائے تو ایسی صورت میں ایسا طریقہ اختیار کرو جو ناگوار نہ ہو، بلکہ انتہائی حکیمانہ ہو، فرمایا:

—— " وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ط !" ——

تو دعوت سے پہلے، تواصی بالحق سے پہلے ضرورت ہے علم کی اور تواصی بالحق کے دوران یعنی دعوت و تبلیغ کے درمیان ضروری ہے کہ رقّت اختیار کی جائے یعنی نرمی اختیار کی جائے۔ اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے لوگ بیزار نہ ہوں۔ فتوے کی زبان اختیار نہ کی جائے۔ تکفیر کی زبان اختیار نہ کی جائے، تفسیق و تضلیل کی زبان اختیار نہ کی جائے۔ خواہ کتنا ہی انسان مخالفت پر آمادہ ہو، کتنا ہی وہ دشمن بن جائے اور مخالف کیسی ہی زبان استعمال کرے، لیکن ایک داعیٔ حق کا فرض یہ ہے کہ اُس کی زبان نہایت ہی پاکیزہ اور اُس کا اندازِ بیان نہایت ہی ستھرا ہو۔ تو دوسری چیز یہ ہے کہ دعوت کے دوران

صاحب تھانوی نے کدو کا لفظ حذف کر دیا ہے۔ مارم ڈیوک پکتھال نے لوکی کا درخت لکھا۔ مولانا محمود الحسنؒ صاحب اور مولانا شبیر احمدؒ صاحب عثمانی نے بھی شاہ صاحب ہی کا اتباع کیا ہے۔ میں خود اس کے متعلق عرصہ تک مذبذب رہا، حتیٰ کہ پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ اور مجھے بحیثیت ناظمِ تعلیمات تین سال تک مکران میں قیام کرنے اور گھوم پھر کر اس تمام علاقے کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اہلِ مکران کی زبان مسخ شدہ فارسی ہے، لیکن اس میں دوسری زبانوں بالخصوص عربی کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔ پنجابی اور انگریزی کے لفظ بھی شامل ہو گئے۔ بلیدہ میں ایک نیا لفظ اگین (ا۔گ۔ی۔ن) سننے میں آیا جو ایک خاص قسم کی گول لوکی کے واسطے استعمال ہوتا ہے جو تربوز کے برابر ہوتی ہے۔ ظاہری طور پر تو یہ لوکی ہی ہوتی ہے، لیکن اس کا مزا ککڑی سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس میں شیرینی بھی ہوتی ہے اور پانی کا جزو تو بہت ہی زیادہ ہوتا ہے۔ چھلکا بھی اتنا نرم اور لذیذ ہوتا ہے کہ بآسانی کھا لیا جائے۔ ہمیں تو اسے بجائے پکانے کے کچا کھانے میں زیادہ لطف آتا تھا۔

ایک روز یکایک خیال آیا کہ کہیں یہی تو وہ پودا نہیں جو خدا تعالیٰ نے حضرت یونس ؑ کے واسطے اس چٹیل میدان میں پیدا کیا تھا۔ اور جس کا ذکر اوپر کی آیات میں کیا جا چکا ہے۔ لفظ اگین کی ساخت پر غور کیا تو ایسا نظر آیا کہ 'ق' کا تلفظ تو موجودہ عربی کی طرح 'گ' میں تبدیل ہو گیا۔ ی، ل سے بدل گئی اور 'ط' کثرتِ استعمال سے حذف ہو گیا۔ اس طرح یقطین نے اگین کی شکل اختیار کر لی۔

اس کے بعد یہ جستجو ہوئی کہ بجانے اس کا پودا کس ماحول میں نشو و نما پاتا ہے اور اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ خوش قسمتی سے مکران کے صدر مقام تربت میں حکومت پاکستان کے شعبۂ تحفظِ پوداجات (PLANT PROTECTION) کا بھی ایک دفتر ہے، اس سے بھی اس سلسلہ میں رابطہ قائم کیا گیا۔ پتہ چلا کہ ساحلی علاقوں میں خود رَو اُگا کرتا تھا۔ لیکن اب جو بازار میں اس کی مانگ بڑھی تو کاشتکاروں نے کھیتوں میں بھی بونا شروع کر دیا ہے۔

مکران کا ساحل طبعی طور پر ساحلِ عراق سے مشابہ ہے۔ اس کے قریب مچھلیوں کی بڑی کثرت ہے، جو قدیم الایّام سے اس علاقہ کے لوگوں کی خوراک اور ذریعہ آمدنی ہے۔ چنانچہ پسنی اور گوادر کی بندرگاہوں کو ماہی گیروں کی جنت کہا جاتا ہے، اور انہیں علاقوں میں اگین کی پیداوار ہوتی ہے۔ ہم نے ان مقامات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ جگہ جگہ مچھلیوں کی گلی سڑی ہڈیوں اور کانٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن پر یہ پودا اُگتا ہے، اور خوب نشو و نما پاتا

حضرت یونس علیہ السلام جب اُس کے پیٹ میں گئے تو وہ انہیں جزوِ بدن نہ کر سکی۔ ساتھ ہی انہوں نے خدا تعالیٰ سے دعا اور استغفار کی، جس کا ذکر سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں اس طرح کیا گیا ہے:

فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ہ فَاسْتَجَبْنَا لَہٗ وَنَجَّیْنٰہُ مِنَ الْغَمِّ (۲۱ : ۸۷)

"آخر کار انہوں نے تاریکیوں (یعنی سمندر اور وہیل کے پیٹ کی تاریکیوں) میں سے پکارا کہ تیرے سوا کوئی حاجت روا نہیں ہے، تو پاک ہے اور میں ہی گنہگاروں میں سے ہوں۔ پس ہم نے اس کی دُعا قبول کی اور اُسے غم سے نجات دی!"

اور نتیجۃً وہیل نے انہیں ایک ایسے کنارے پر لے جا کر اُگل دیا جو ایک چٹیل ساحل تھا۔ اور وہاں خدا تعالیٰ نے کمال شفقت و مہربانی سے ایک نئے قسم کا شجر (پودا) اُگا دیا، جس کو یقطین کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ لیکن ادنیٰ تفکر سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ یقطین کی کوئی خاص قسم تھی۔

ہم کو حکم دیا گیا ہے کہ قرآن کی آیات اور اُس کی حکمتوں پر غور کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو ذہن اس سوال کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت یونسؑ کی کیا حالت تھی اور ان کو کن اشیاء کی ضرورت رہی ہوگی۔

پہلی بات تو یہ نظر آتی ہے کہ مچھلی کے پیٹ میں رہنے اور ابکائیاں لے کر نکلنے کے بعد ان کی کھال جگہ جگہ سے اُدھڑ گئی ہوگی، اس میں زخم پڑ گئے ہوں گے، جن پر مکھیوں کے بیٹھنے اور ستانے اور ان میں زہریلے جراثیم کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے سخت اذیت کا سامنا ہوگا۔ دوسرے اس حالت میں سخت اور سنگلاخ زمین پر لیٹے رہنا تکلیف کا باعث ہوتا ہوگا، اور کروٹ لینے سے زخموں میں رگڑ لگتی ہوگی۔ پھر دھوپ کی تپش اوّل تو ویسے ہی تکلیف دہ ہوتی ہے اور زخموں میں تو آفتاب کی کرنیں تیر و نشتر بن کر چبھتی ہوں گی۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کے لئے غذا اور پانی کی ضرورت ہوگی۔

چنانچہ باری تعالیٰ نے ان جملہ ضروریات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے وہاں یہ مخصوص پودا اُگا دیا۔ لیکن اس یقطین کا ادراک اور صحیح طور پر سمجھنا دُور بیٹھے ہوئے مترجمین اور مفسرین کے لئے آسان ثابت نہ ہو سکا۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کدو کا پیڑ کیا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔

شاہ رفیع الدّین صاحب نے اُسے ایک درخت بیل والا یعنی کدو کہا ہے۔ مولانا اشرف علی،

درسِ حدیث

ایمان اور اس کے تقاضے

از: مولانا محمد حسین میر، استاذ عربی، قرآن اکیڈمی، لاہور

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، فَاَفْضَلُهَا قَوْلُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اور سب سے معمولی، کسی تکلیف دہ چیز کو راہ سے ہٹا دینا ہے۔ اور حیاء بھی ایمان کی ایک بہت بڑی شاخ ہے۔

ایمان سے مراد ہے یقین۔ یقین دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یقین وہ ہے جو فلسفی کے دلائل سے ہمارے اندر پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ یہ دُنیا حادث ہے اور ہر حادث کے لئے ایک مُحدِث (بنانے والے) کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس دنیا کے لئے بھی ایک مُحدِث کی ضرورت ہوئی، اور وہی خدا ہے۔ لیکن یہ یقین یہیں تک محدود رہتا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ ہماری شخصیت پر کچھ اثر نہیں ڈالتا۔ اس کے مقابلے میں ایک یقین وہ ہے جو خدا کے پیغمبر کی وساطت سے ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ اللہ نے ہمیں پیدا کیا، بلکہ وہ انسان پر اس قدر مہربان ہے کہ سب سے پہلے تو اسے اپنی ساری مخلوق کے مقابلہ میں احسنِ تقویم میں پیدا کیا۔ پھر اسے عقل جیسا جوہر بخشا۔ اس کے رہنے کو زمین بنائی اور اس کا پیٹ اتنے قیمتی خزانوں سے بھر دیا کہ ان کو نکال نکال کر اور انہیں کام میں لا لا کر ہی ہم تمدن کے اس نقطۂ عروج پر پہنچے ہیں۔ اگر وہ زمین میں یہ دفینے ودیعت نہ کرتا یا آج بھی انہیں اٹھا لے تو ہماری موجودہ ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور نہ ہی ہم آئندہ اس میں رتی بھر اضافہ کر

ہے۔ غلاظت کے یہ انبار بہت اعلیٰ قسم کی کھاد کا کام دیتے ہیں اور سمندر کے بخارات سے پیدا ہونے والی شبنم نیچے گر کر اُن کی آبیاری کرتی ہے۔ بیل دُور دُور تک پھیلی ہوتی ہے جس کے اندر بیک وقت ایک نہیں دو چار انسان اپنے آپ کو بخوبی چھپا سکتے ہیں۔ پتے نہایت چکنے اور ملائم ہوتے ہیں۔ جو نیچے نرم و نازک گدوں اور اُوپر اوڑھنے کے لئے ریشمی چادر کا کام دیتے ہیں۔ تری اور خنکی اتنی ہوتی ہے کہ آفتاب کی کرنیں اندر چھپے ہوئے انسان کو تکلیف نہیں دے سکتیں۔ اس کا پھل جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے ککڑی کی طرح نہایت لذیذ، میٹھا، سبک اور ہاضم ہوتا ہے اور مریضوں کے لئے بڑی اچھی غذا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر رطوبت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ پانی نہ بھی میسّر آئے تب بھی پیاس نہیں لگتی۔

ایک عجیب بات جس نے ہم سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا یہ تھی کہ کھلے ساحل پر دھوپ میں جہاں مچھلی پڑی ہوتی ہے وہاں کیڑے مکوڑوں اور مکھیوں کی بڑی افراط ہوتی ہے لیکن اس پودے کے قریب دُور دُور تک ان میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا۔ محکمۂ پودا جات نے اس معاملہ میں میری بڑی مدد کی۔ ان کے افسروں نے اس کے پتوں اور ڈنٹھلوں کا کیمیاوی تجزیہ کر کے پتہ لگایا کہ اس کی رگ و پے میں جو عرق دوڑتا پھرتا ہے اس کے اندر ایک کیمیاوی مادّہ شامل ہے جو حشرات الارض کے واسطے مہلک بھی ہے اور اس کی بُو اُن کو ناگوار بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ ادنیٰ کیڑے تو درکنار سانپ بچھو بھی اس طرف کا رُخ کرنے سے کتراتے ہیں ___ قرآن مجید جس کا محض پڑھ لینا لوگ باعثِ ثواب و برکت اور اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، دراصل علم و حکمت کا ایک بحرِ ذخّار ہے جس میں اسی کو علم ہے کہ کتنے گوہر آبدار پوشیدہ ہیں۔ اور اُن کی دریافت کے لئے کتنی گہرائی تک غوّاصی کرنے کی ضرورت ہے۔ علمائ، مفسرین و محققین چودہ سو برس سے اسی تگ و دَو میں مصروف ہیں اور انہوں نے دُنیا کو بے شمار ملدّت گوہر دار فراہم کئے ہیں۔ لیکن کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس لامتناہی خزانہ کا کتنا حصّہ ایسا ہے جو ابھی تک نظروں کے سامنے نہیں آسکا۔ مجھے جب خود اس قسم کا کوئی نکتہ ہاتھ آجاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مرتبہ قرآن پڑھ چکا ہوں، یہ معمولی سی بات پہلے کیوں سمجھ میں نہیں آئی مگر جب اکبرالٰہ آبادی مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے کہ: ؎

ذہن میں جو گھر گیا، لاانتہا کیوں کر ہوا ∴ جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا!

تو دل پکار اُٹھتا ہے کہ قرآن اسی ہستی کا تو کلام ہے۔ اس کو تو لوگ قیامت تک اسی طرح سمجھنے کی کوشش میں لگے رہیں گے، اور کل نکات کو اس وقت تک بھی حل نہ کر سکیں گے۔

عمل حقوق العباد کی ذیل میں آتا ہے۔ گویا فکر و عمل کی ان دو انتہاؤں کا ذکر کر کے آپ نے ایمان کے محاسن و مکارم کو بیان کرنا اس لئے ضروری نہ سمجھا کہ آپ کے مخاطبین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔۔۔ آپؐ کی تعلیمات کے نتیجے میں ان سے بخوبی واقف تھے۔ ویسے بھی معروفات و منکرات کا احساس نفس انسانی میں فطری طور پر ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اس لئے ان کی تفصیل نہ ہی ضروری تھی اور نہ ہی مقصود، کیونکہ حضورؐ بتانا یہ چاہتے تھے کہ یہ حقوق اللہ سے حقوق العباد تک پھیلے ہوئے تمام اعمالِ حسنہ ایمان کے برگ و بار ہیں۔ اگر یہ سرسبز و شاداب اور تر و تازہ ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ ایمان میں حرارت بھی ہے اور قوت بھی۔ لیکن خدانخواستہ اگر یہ پھول مرجھانے لگے ہیں یا پتیاں جھڑنے لگی ہیں یا شاخیں سوکھ رہی ہیں تو فکر کرنی چاہیئے۔ معلوم ہوتا ہے ایمان کو کوئی کرم چاٹ رہا ہے، اس کی توانائیاں ختم ہو رہی ہیں۔ اسکو توبہ، تجدید عہد انابت الی اللہ اور رجوع الی القرآن کے ذریعے پھر سے توانا بنایا جائے۔

اس سلسلہ میں حضورؐ کے اس ارشاد کی طرف توجہ ضرور دی جائے کہ: ادنٰھا اماطة الاذٰی عن الطریق۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام معاشرتی اخلاق یعنی ایسے اعمال اور رویے جن کا تعلق خلقِ خدا کے فائدے سے ہو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ جس دین میں راستے میں سے کسی معمولی سی ایذا رساں چیز کو ہٹا دینے کو بھی ایمان کا تقاضا کہا گیا ہو، لازمًا اس کے ہاں اس کا اصل تقاضا یہ ہونا چاہیئے کہ بنی نوعِ انسان کو جہالت کے خارزار سے نکالنے کے لئے درسگاہیں قائم کی جائیں۔ ان کو دکھوں اور بیماریوں کے گڑھوں میں گرنے سے بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ شفاخانے کھولے جائیں۔ ان میں سے معذور افراد کو سہارا دینے اور اُن میں اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہونے کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے ان کی بحالی اور فلاح و بہبود کے اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ مگر افسوس کہ رحمة للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ایمان رکھنے والے اہل ثروت اپنے اس فرض سے اس طرح غافل ہیں کہ غیر مسلم قومیں آج بھی بجا طور پر انہیں یہ طعنہ دے سکتی ہیں کہ اسلام کے ان نام لیواؤں کو انسانی بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اس حدیث میں جو چیز خاص طور پر توجہ طلب ہے، وہ حضورؐ کے فرمان کا آخری جملہ ہے کہ "اَلْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ" جس کا مطلب ہے کہ حیاء بھی ایمان کی ایک بہت بڑی شاخ ہے۔ آخر حضورؐ نے ستر سے زیادہ حسنات کو چھوڑ کر صرف اس کو کیوں خاص طور پر ذکر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس جاہلی دور کی کچھ جھلک ابھی باقی تھی جس میں عورت پورے سولہ سنگھار کے

سکتے ہیں۔ پیغمبرِ خدا ﷺ توجہ دلاتا ہے کہ اپنے دائیں بائیں، اوپر تلے نگاہ اٹھا کر دیکھو۔ چاند اور سورج تمہاری غلامی میں سرگرداں ہیں، ہوائیں تمہارے لئے سمندر بدوش ادھر سے ادھر پھر رہی ہیں۔ غرض تم تخلیق کائنات کی غایتِ اُولیٰ اور سلسلۂ تکوین کا مقصدِ اصلی ہو۔ یہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تمہیں اپنی نیابت کا شرف بھی بخشا ہے اور فرشتوں تک کو تمہارے حضور میں سربسجود کر دیا ہے۔

اس طرح سے جو یقین و ایمان ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک زندہ و توانا ایمان ہوتا ہے جو ہمارے اندر اپنے خالق و محسن کے لئے جذبۂ امتنان و تشکّر اور محبت و عظمت کو ابھارتا ہے۔ ہماری گردنیں بارِ احسان سے اس کے سامنے جھک جاتی ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ اپنے اس محسنِ حقیقی کے مطیع و فرمانبردار بندے بن کر رہیں۔ ہماری زندگی کا سارا تانا بانا اسی کی رضا و خوشنودی کے ارد گرد بُنتا جائے۔ اس طرح پیغمبرِ خدا کے بوئے ہوئے ایمان کے اس بیج سے حُسنِ فکر و عمل کا ایک ایسا شجرۂ طیبہ پھوٹتا ہے کہ: اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔

فکر و عمل کا یہ شجرۂ طوبیٰ نیچے سے اوپر تک کثیر الانواع اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں جڑیں بھی ہوتی ہیں، تنا بھی، چھوٹی اور بڑی شاخیں بھی، سرسبز و شاداب پتیاں بھی رنگ برنگ کے مہکتے پھول بھی اور لذیذ و شیریں پھل بھی۔ یہ سب ایمان کے وہ تقاضے ہیں جن کے متعلق حضورؐ نے فرمایا کہ وہ ستّر سے کچھ اُوپر ہیں۔ اکثر اہلِ علم نے اس سے مراد محض کثرت لی ہے۔ جس طرح کہ ہماری اپنی زبان میں بھی بعض اعداد سے متعیّن مقدار نہیں بلکہ کثرت ہی مراد ہوتی ہے۔ البتہ بعض دوسرے اہلِ علم — ابن حبّان، ابن حجر، اور بیضاوی وغیرہم نے متعیّن تعداد مراد لی ہے۔ اور قرآن و سنّت میں تتبع کے بعد ثابت کیا ہے کہ واقعی ان کی تعداد ستّر سے کچھ اوپر — ستّر کے قریب ہے۔

تاہم حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے اس ارشاد میں ان سب کی تفصیل سے تعرّض نہیں فرمایا۔ صرف دو کا ذکر کر کے چھوڑ دیا ہے اور فرمایا کہ ایمان کی ان شاخوں میں سب سے افضل اللہ تعالیٰ کے وحدہ لاشریک ہونے کی شہادت دینا ہے، جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور اس کی سب سے معمولی یا قریبی (سہل العمل) شاخ، کسی ایسی چیز کا راستے سے ہٹا دینا ہے، جس سے کسی بھی رہ گیر کو گزند پہنچ سکتا ہو۔ جیسے کانٹا، پتھر، گڑھا وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ

تمباکو نوشی اور شریعتِ اسلامی

پروفیسر سمیع اللہ شہاب

حج کے موقع پر ہر سال سگریٹ اور تمباکو نوشی کی وجہ سے آگ لگنے کا کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ ضرور ظہور پذیر ہو جاتا ہے، جس سے بعض اوقات کافی جانی و مالی نقصان ہو جاتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں بھی ایسے نقصانات کی مثالیں کم نہیں۔ ابھی چند دن پہلے کراچی میں اسی عادتِ بد کی وجہ سے ایک اسکول بس میں درجنوں معصوم بچے جھلس کر رہ گئے۔

(روزنامہ "پاکستان ٹائمز" لاہور مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۷۷ء)

چنانچہ اسی بنا پر پچھلے کئی سالوں سے یہ مسئلہ علمائے عرب کی سنجیدہ توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور وہ اس بارے میں شریعتِ اسلامی کی روشنی میں اپنے خیالات پیش کر رہے ہیں۔ ان میں بعض حضرات تو سگریٹ اور تمباکو نوشی کو شراب نوشی سے بھی زیادہ سنگین گناہ قرار دیتے ہیں۔

چند سال اِدھر کی بات ہے کہ راقم الجزائر جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے قاہرہ کے ہوائی اڈے پر ٹھہرا۔ قاہرہ کے ہوائی مستقر پر ایک عظیم کھلی مارکیٹ (سوق الحر) قائم ہے۔ جس میں ہر قسم کا ولایتی مال بغیر کسی کسٹم یا ٹیکس کے دستیاب ہوتا ہے۔ اگرچہ کہنے کو تو وہاں ہر قسم کا مال تھا، لیکن زیادہ تر انگریزی شراب کا کاروبار تھا۔ راقم نے وہیں کے ایک عالمِ دین کے سامنے اس وسیع کاروبار پر حیرت کا اظہار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کی نظر صرف شراب کی طرف کیوں گئی ہے، ساتھ والے سٹور میں اسی تعداد میں انگریزی سگریٹ بھی تو فروخت ہو رہے ہیں اس کا نوٹس کیوں نہیں لیتے۔ جو عملاً ہمارے لئے شراب نوشی سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہو رہے ہیں۔ پھر انہوں نے وسیع پیمانے پر اس سگریٹ نوشی سے ہونے والے تازہ نقصانات کی طرف اشارہ فرمایا اور اس کی شرعی حیثیت کے بارے میں یہ رہنمائی فرمائی کہ اسلامی ممالک میں سب سے پہلے سگریٹ نوشی کا ظہور مصر میں ہوا اور اس وقت کے جید علماء نے اسے شراب نوشی کی طرح حرام قرار دیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے مجھے ایک فتویٰ کی نقل مہیا کی جس میں یہ تفصیلات کسی

ساتھ راہوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں بے حجابانہ نکلا کرتی تھی۔ اور لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالا کرتی تھی اور کچھ نگاہیں بھی اس کے تعاقب میں رہا کرتی تھیں۔ چنانچہ فرمایا کہ ایمان کا ایک بہت بڑا مظہر شرم و حیا بھی ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو لازم ہے کہ وہ راہ چلتے نگاہیں جھکا کر چلیں، عورتیں اپنے جسم ڈھانپ کر باہر نکلیں تاکہ اسلامی معاشرہ دقاحت و بے حیائی اور اخلاق باختگی سے پاک و صاف رہے۔ یا پھر ہمارے اس دورِ جاہلیتِ جدیدہ میں زیادہ شدّت کے ساتھ اٹھنے والے اس فتنہ کی خبر آپ کو دے دی گئی تھی۔ اس لئے آپ نے آنے والی نسلوں (جن میں ہمارا دور بھی شامل ہے) کو انتباہ فرمایا کہ دیکھو! جب تک تم میں حیا ہے، ایمان بھی ہے۔ جہاں حیا رخصت ہوئی، ایمان کی بھی بس خیر مناؤ۔ کیونکہ بے حیائی غارت گرِ دین و ایمان ہے۔ یہ بے حیائی جس طرح عورتوں کے بے حجابانہ اور پوری زیب و زینت کے ساتھ کوچہ و بازار میں پھرنے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح اس برائی کے اظہار کی اور بھی بیسیوں شکلیں ہمارے ہاں مروّج ہیں۔ ہمارے شعر و ادب کا بیشتر حصہ اسی ذیل میں آتا ہے، ٹیلیویژن، فلم اور تصویر نے اس فتنے کو سہ آتشہ بنا دیا ہے۔

ہم ان باتوں کو معمولی سمجھتے ہیں، اور انہیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن یاد رکھئے بدعملی آخر کار یا تو ہمارے دلوں سے دولتِ ایمان کو بالکل ہی چھین لیتی ہے اور ایک بدکردار شخص بالآخر خدا اور رسول ہی کا منکر ہو جاتا ہے۔ یا کم از کم ایمان کو اس قدر ادھ مؤا اور کمزور بنا دیتی ہے کہ اس میں سے قوّتِ مزاحمت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور پھر مغرب و مشرق سے اٹھنے والی فتنہ کی ہر لہر اسے اپنے ساتھ بہالے جاتی ہے۔ ان میں نئے نئے فتنے جنم لیتے ہیں اور کوئی ان کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے۔!

اللھم حبّب الینا الایمان وزیّنہ فی قلوبنا وکرّہ الینا الکفر والفسوق والعصیان واجعلنا من الرّاشدین ٥

علماءِ عرب نے اس نقصان کا سختی سے نوٹس لیا اور تمباکو کے استعمال کو شرعاً ناجائز قرار دے دیا۔ سعودی عرب کے ڈاکٹر صاحبان نے بھی اس کی تائید کی اور اسے انسانی صحت کے لئے سخت مضر قرار دیا۔ خود سعودی عرب میں سگریٹ سازی کا کوئی کارخانہ نہیں۔ سب کا سب مال مغربی ممالک سے درآمد ہو کر وہاں پہنچتا ہے۔ سعودی عرب کی حکومت نے ان حضرات کی رائے کا احترام کرتے ہوئے سگریٹ کی درآمد پہ سخت پابندیاں عائد کردیں۔

(روزنامہ "نوائے وقت" لاہور بابت یکم جنوری ۱۹۷۷ء)

بدقسمتی سے اس سال پھر حج کے موقع پراسی سگریٹ نوشی کی وجہ سے صفا کے مقام پہ ایک خوفناک آگ بھڑک اٹھی۔ جس سے تین چار بڑی بڑی عمارات جل کر راکھ ہوگئیں اور کافی مالی نقصان ہوا، اور شاید جانی نقصان بھی ہوا ہو۔ چنانچہ اس دفعہ پھر یہ مسئلہ وہاں کے علماء کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کے استعمال کو تو وہ پہلے ہی حرام قرار دے چکے تھے۔ اب انہوں نے اس کی تجارت کو بھی حرام قرار دے دیا جس کی بعض کڑی پابندیوں کے تحت حکومت نے اجازت دے رکھی تھی۔ چنانچہ ۲ر دسمبر ۱۹۷۷ء کو خانہ کعبہ کے امام شیخ عبداللہ الخلیفی نے کعبہ شریف ...... میں جمعہ کا خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اعلان کیا:

"اے مسلمان بھائی! رزقِ حلال تلاش کر۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پہ درود شریف کے بعد، اے لوگو! اللہ کا خوف کرو۔ اپنے اوپر اس کی نعمتوں کو پہچانو۔ اس نے تمھیں ہر قسم کی بھلائی اور فضل سے نوازا ہے اور جان لے کہ بھلائی کے بہت سے راستے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تقویٰ اختیار کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اے مسلمان بھائی! تم پر یہ معاملہ مخفی نہیں کہ دینِ اسلام نے تجارت کی دعوت دی ہے۔ اللہ کے بندو! شریعتِ اسلامی نے کوئی تجارت حرام نہیں قرار دی۔ مگر وہ جو ظلم، دھوکے اور مصنوعی مہنگائی پہ مشتمل ہو یا ایسی چیز کی جسے دینِ اسلام نے حرام قرار دے دیا ہو۔ مثلاً شراب، نشہ، بت اور سگریٹ نوشی کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اُن سے کسی قسم کا نفع اٹھانے کی اجازت نہیں۔ بس ان تمام چیزوں کی تجارت بھی حرام ہے، اور تجارت کرنے والے کے لئے بھی وبالِ جان ہے۔ اس سے جو آمدنی ہوگی وہ خالص حرام ہوگی، اور انسان کا جو گوشت حرام کے مال سے پیدا ہوگا، وہ دوزخ کی آگ کا زیادہ مستحق ہوگا!"

(اخبار العالم الاسلامی مکۃ المکرمہ، بابت ۵ر دسمبر ۱۹۷۷ء ۔ شمارہ نمبر ۵۵۵)

حد تک موجود تھیں۔ یہ فتویٰ سلطان عبدالحمید ثانی کے ایک سرکاری قاضی شیخ محمد کامل ابن مصطفیٰ نے جاری کیا تھا۔ اور ترکی حکومت نے اُسے شائع کرایا تھا۔ فتویٰ کے اصل الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"تمباکو نوشی کے بارے میں سلف صالحین سے کچھ منقول نہیں، کیونکہ اُن کے زمانے میں اس کا وجود نہ تھا۔ اِس کا وجود سن ہجری کے ایک ہزار سال گزر جانے کے بعد ہوا۔ جس زمانے میں مصر میں تمباکو نوشی کا رواج ہوا تو اس وقت کے مشہور علماء شیخ اللقانی اور شیخ الاجہوری تھے۔ شیخ اللقانی نے فوراً اُس کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر فرمادیا۔ اور اس میں شیخ سالم السنہوری کی تائید بھی شامل کی، اور اس کی حرمت پر سخت زور دیا۔ ان کے بعد شیخ الخرشی کا زمانہ آیا تو انہوں نے علماء کی ایک جماعت سے مل کر اس کی حرمت کا فتویٰ دیا۔ انہوں نے اس کی حرمت کے بہت سے دلائل دیئے جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمباکو نوشی بغیر کسی فائدے کے، مال کو جلا کر ضائع کرنا ہے۔ (الفتاویٰ الکاملۃ فی الحوادث الطرابلسیۃ مطبوعہ مصر صفحہ ۲۸۶)

وطن واپس پہنچنے پر راقم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ جب تمباکو نوشی کا ظہور برصغیر ہندو پاک میں ہوا تو یہاں کے علمائے دین کا اس بارے میں کیا ردِعمل تھا۔ خوش قسمتی سے تھوڑی سی محنت کے بعد مجھے اس وقت کے ایک مشہور مجتہد عالم کا فتویٰ مل گیا۔ یہ عالم دین برِصغیر کے عظیم فقیہ و مفتی علامہ عبدالحی فرنگی محلی تھے۔ یہ کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ ابھی تک برِصغیر ہندو پاک نے ان جیسا فقیہ پیدا نہیں کیا۔ فقہ میں اس بلند مرتبے کے باوجود آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب تک اپنا فتویٰ اپنے زمانے کے دوسرے فقہاء کو نہ دکھا لیتے، جاری نہ تھے۔ آپ نے تمباکو اور سیگریٹ کے نشہ آور پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہوئے آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے یعنی جمادی الثانی ۱۲۹۸ھ میں اپنا یہ تاریخی فتویٰ صادر فرمایا:

"چرٹ پینا مثل حقہ پینے کے .... مکروہ تحریمی ہے، بلا ریب و بلاشک!
اور چرٹ پینے میں بسبب مشابہت نصاریٰ زیادہ کراہت ہے، واللہ اعلم۔
(مجموعۃ الفتاویٰ مطبوعہ مطبع شوکتِ اسلام لکھنؤ ۱۳۰۹ھ جلد ۱ صفحہ ۸۳)

بات آج کے موقع پر سگریٹ نوشی کی وجہ سے مسلمانوں کے جانی و مالی نقصان سے چلی تھی۔ پچھلے سال

تقاریرِ سیرت - ۴

حیاتِ طیبہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا مدنی دور

ڈاکٹر اسرار احمد

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُۨ ۝ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ۝ ـــــ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۝

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ـــــ اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنَا رُشْدَنَا وَاَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا

کل ہم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے اِس دَور پر جو ابتدائے وحی سے شروع ہوا اور ہجرت پر ختم ہوا اور اس کے کچھ اہم واقعات اور ان مراحل پر جن سے ان تیرہ سالوں میں دعوتِ نبوی گزری تھی، غور کیا۔ میں نے کل ایک بات کہی تھی جس کی وضاحت آج کرنا چاہتا ہوں، وہ بات یہ ہے کہ مکّہ مکرمہ میں جب کہ حالات بالکل ہی مایوس کُن ہو چکے تھے، اُمید کی کوئی کرن کسی طرف سے نظر نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم خود دل برداشتہ ہو کر طائف تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے دُنیوی اعتبار سے ناکام لوٹنا پڑا۔ اِس کے بعد از خود ایک کھڑکی کُھل گئی۔ مدینہ منوّرہ سے چھ افراد سنہ ۱۱ نبوی میں ایمان لائے۔ سنہ ۱۲ میں وہ بارہ ہو گئے۔ سنہ ۱۳ میں یہ تعداد ۷۲ تک پہنچ گئی۔ مدینہ منوّرہ میں ابھی حضورؐ کے قدم مبارک پہنچے بھی نہیں اور وہاں دعوت

کعبہ شریف میں یہ خطبہ حج کے دنوں میں دیا گیا اور اسے سننے والے ساری دُنیا کے دس لاکھ سے زیادہ حجّاجِ کرام تھے۔ مختلف اسلامی ممالک کی مساجد میں کعبہ شریف کے اس خطبے کو عقیدۃً دُہرایا جاتا ہے۔ اس لئے اسلامی دُنیا میں اس کا خاطر خواہ اثر ہوا ہوگا لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ہاں بہت اکثر ایسے لوگ حج کی سعادت حاصل کرتے ہیں، جو عربی زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے حجّاجِ کرام تھوڑی بہت عربی زبان جانتے ہوتے تو کعبہ شریف میں ارشاد ہونے والے اس خطبے کا ہمارے ہاں بھی بڑا اثر ہوتا اور لاکھوں مسلمان اس عادتِ بد سے نجات پا جاتے۔ اب ہم اپنے علماءِ کرام سے ہی یہ توقع کرسکتے ہیں کہ وہ سعودی عرب کے علماء کے اس فتویٰ کو زیادہ سے زیادہ مسلمانوں تک پہنچائیں۔

کعبہ شریف کے امام صاحب کے فتویٰ کے بعد اس موضوع پر زیادہ لکھنے کی ضرورت تو نہیں، تاہم علماءِ کرام نے اس پر جو بحثیں فرمائی ہیں، ان میں سے ایک مفید نکتے کی طرف اشارہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ جہاں اکثر علماء نے اس کو خمر پر قیاس کرتے ہوئے حرام قرار دیا ہے وہاں بعض حضرات نے اس کی حرمت کے لئے قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ سے استدلال فرمایا ہے :-

"وہ حلال کرتا ہے ان کے لئے طیّبات (خوشگوار چیزیں) اور حرام کرتا ہے اُن پر خبائث (یعنی گندی / مُضرِ صحت چیزیں) (سورۃ الاعراف۔ آیت ۱۵۷)

قرآن مجید ایسی تمام اشیاء کو خبیث کے لفظ سے موسوم کرتا ہے۔ جن سے انسان کی صحیح نشو نما میں رکاوٹ ہو اور وہ اس کی صحت بخش بالیدگی میں حائل ہوں۔ اور تمباکو ان اشیاء میں سے ہے کہ جن کے مضرِ صحت اور انسان کی صحیح نشوونما میں رکاوٹ کے بارے میں دُنیا کے اکثر ماہرین صحت متفق ہیں۔ اسی لئے مجلس اقوامِ متحدہ نے یہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے کر تمباکو نوشی کے انسداد کیلئے مختلف النوع اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں۔

سگریٹ نوشی کے بارے میں قدیم اور جدید علماءِ اسلام کے فتاویٰ قارئین کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ان پر عمل کرکے اس عادتِ بد سے خود بھی اور دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی نجات دلا سکتے ہیں۔

(بشکریہ ملک ھلال احمد کلستو، سوسائٹی ماڈل ٹاؤن، ۱۰۰ ھ)

ظاہر ہو گیا تو اب بعثتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا جو تکمیلی مرحلہ ہے : لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ط اب اس کے لئے براہِ راست اقدام کا آغاز ہو گیا۔ مدینہ منورہ کے بارے میں یہ جان لیجئے ، جیسا کہ میں نے پہلے بھی اشارۃً عرض کیا تھا کہ تمدنی اعتبار سے وہ مکہ معظمہ سے ایک قدم آگے تھا۔ مکے میں صرف ایک قبیلہ آباد تھا ، جبکہ مدینہ میں پانچ بڑے اہم اور طاقتور قبیلے آباد تھے۔ یعنی وہاں کی زندگی ابھی قبائلی سطح پر تھی اور یہاں ایک شہری ریاست قائم تھی۔ پانچ قبیلوں نے مل جل کر باہم کچھ اصول طے کر کے وہاں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی تھی۔ ان میں دو قبیلے اَوس اور خزرج ، اصل عرب قبیلے تھے اور آپ اپنی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ مالکانِ دیہہ تھے۔ ان کے علاوہ تین اور قبائل یہود یوں کے تھے جن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کب یہاں آکر آباد ہوئے ، اور کیوں یہاں آباد ہوئے۔ لیکن ایک گمان ہے کہ یہ لوگ درحقیقت یہاں اس پیشین گوئی کی بنیاد پر آئے تھے کہ آخری نبوت کا ظہور کھجوروں کے جھنڈوں والی سرزمین میں ہوگا۔ وہی پیشین گوئی جس کی بنیاد پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رہنمائی ملی۔ ایک عیسائی راہب نے انہیں بتایا کہ میرا علم یہ بتاتا ہے کہ اب نئی نبوت کے ظہور کا وقت قریب ترین ہے اور اُن کا ظہور ہوگا کھجوروں کی سرزمین میں ، تو انہوں نے بھی اُدھر سفر اختیار کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس اُمید میں آئے تھے کہ وہاں پہنچیں جہاں اِس آخری اور کامل نبوت اور رسالتِ کاملہ کا ظہور ہونے والا تھا۔ واللہ اعلم۔

اِن پانچ قبائل میں سے جیسا کہ میں نے عرض کیا دو ، اَوس و خزرج۔ مالکانِ دیہہ تھے ، اور یہود کے متعلق یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ساہوکاروں کے تین خاندان تھے ، جو وہاں آباد تھے۔ خزرج کا قبیلہ بڑا تھا اور اَوس کا چھوٹا۔ اُن کے مابین خانہ جنگی رہتی تھی اور یہودیوں کو موقع ملتا تھا۔ کبھی اِن کا ساتھ دے دیا کبھی اُن کا۔ لہٰذا رفتہ رفتہ وہ اپنا تسلّط اور HOLD مدینہ منورہ پر مضبوط کرتے گئے۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر یہ اَوس و خزرج بچارے اُن کے دست نگر رہتے تھے۔ مالی اعتبار سے تو آپ کو بنیوں اور یہودیوں کا کردار معلوم ہی ہے اور ہمیشہ سے ہے۔ یہودی ایک تعلیم یافتہ قوم تھے ، اُن کے پاس ایک کتاب بھی تورات۔ شریعت تھی ، قانون اور ضابطہ تھا ، اُن کے فقہا تھے ، اُن کے ہاں عدالتیں ہوتی تھیں

کامیابی کے مراحل طے کر رہی ہے۔ آپ کے ایک ادنیٰ جاں نثار حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک سالہ تبلیغ کا نتیجہ یہ نکلا۔ تو میں نے عرض یہ کیا تھا کہ اس میں کسی انسانی کوشش کو دخل نہیں۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اس میں میں نے یہ سوچا کہ کچھ مغالطہ ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ ایک طرف تو یہ بات جان لیجئے کہ انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ جب تک اللہ نہ چاہے۔ لیکن دوسری طرف اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسانی کوشش اور سعی و جہد کی سرے سے کوئی اہمیت نہیں۔ حقیقت ان دونوں کے بین بین ہے۔ میں اگر یہ سمجھوں کہ میں صرف اپنے ارادے سے اپنے ہاتھ کو جنبش دے سکتا ہوں تو یہ بھی شرک ہو جائے گا۔ شرک فی القدرۃ اور شرک فی الارادہ۔ قدرت اور ارادہ صرف اللہ کا ہے کہ وہ جو چاہے کر گزرے، وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ ہے ماسوا کے لئے اپنی انگلی تک کو حرکت دینا صرف اپنے ارادے سے ممکن نہیں کل جو میں نے عرض کیا یہ تھا کہ جو مساعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائیں اور آپ کے ساتھیوں نے جو محنتیں کیں، جو مشقتیں اٹھائیں، جس طرح جان و مال کو کھپایا، یہ اپنی جگہ اس کی نفی نہیں ہوگی اور اسی سے درحقیقت ہم پر اتمامِ حجت ہوتی ہے۔ کوشش کرنا ہر مسلمان کا ہر وقت فرض ہے، لیکن یہ کہ کون سی کوشش کس وقت تک بارآور ہو، اس کا فیصلہ کلیتہً اللہ کے پاس ہے۔ ان دونوں باتوں کو بیک وقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بہرحال مدینہ منورہ دار الہجرت بنا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ ربیع الاوّل ۱۳ نبوی کو قبا میں تشریف آور ہوئے اور تقریباً دو ہفتے آپ نے وہاں قیام فرمایا۔ وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی بنیاد رکھی:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾۔ وہ لوگ کہ اگر ہم انہیں زمین میں تمکن عطا عطا فرمائیں اور غلبہ دیں تو اُن کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اقاموا الصلوٰۃ۔ اب یہاں دیکھئے کہ اس غلبے اور تمکّن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ۔ اگر مشیتِ خداوندی نہ ہوتی اور مدینے میں یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ حالات کا رخ کیا ہوتا۔ مشیتِ خداوندی کو ہی فیصلہ کُن دخل حاصل ہے: ”اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ“! جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ تمکن فی الارض

ذہن میں چلاتے چلیں ؎

آپ مدینہ تشریف لاتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے مدینہ میں اپنی پوزیشن کو CONSOLIDATE کیا۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو آپ کے ساتھ آئے ہیں، مکّہ سے مہاجر ہو کر، لُٹ پٹ کر، یہاں اُن کا کوئی ذریعۂ معیشت نہیں۔ اپنا کوئی مکان نہیں۔ یہاں کے جو لوگ ایمان لائے ہیں، وہ انصار کہلاتے ہیں۔ یہاں آکر سب سے پہلی بات جو آپ نے کی وہ تھا 'عقدِ مواخات'، جس کی نظیر تاریخ نسلِ انسانی میں نہیں ملتی۔ انہوں نے سگے بھائیوں سے بڑھ کر مہاجرین سے سلوک کیا۔ یہاں تک ہوا کہ اگر کسی کے دو گھر ہیں تو اُس نے گھر تقسیم کر دیئے کہ ایک تم لے لو ایک میں رکھ لیتا ہوں۔ یہ اُس وقت کے جس معاشرے میں ہو رہا ہے، اس کے پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ یہاں تک ہوا کہ ایک انصاری کی دو بیویاں تھیں اُس نے آکر اپنے مہاجر بھائی کو لاکر گھر میں کھڑا کر دیا کہ اس وقت حجاب کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لئے پردہ نہیں تھا، اور کہا ان دونوں میں جو تمہیں پسند ہو میں اسے طلاق دے دیتا ہوں، تم اس سے شادی کر لو۔ اس درجہ کی اخوت ہو تو جماعت بنیانِ مرصوص بنتی ہے۔ اس کے بغیر قدم آگے اُٹھ ہی نہیں سکتا۔

دوسری طرف آپ نے یہود کو جکڑ لیا، آتے ہی اُن سے معاہدے کر لئے۔ یہود ان معاہدوں میں ایسے بندھے کہ بعد میں پیچ و تاب کھاتے ہیں لیکن کھُلم کھُلا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت نہ کر سکے۔ اِس میں حکمتِ خداوندی بھی دیکھئے۔ اس کی طرف بہت کم لوگوں کی توجّہ ہوئی ہے۔ مدینے میں آنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہود کو کچھ احساس ہوا کہ یہ تو ہمارے متّبعین میں سے ہیں۔ انہوں نے ہمارا قبلہ اختیار کیا ہے۔ گویا انہیں فوری طور پر یہ احساس نہ ہوا کہ نئی نبوّت و رسالت ہماری سیادت و قیادت کی جڑیں کاٹ دے گی۔ بلکہ وہ کچھ مطمئن سے ہو گئے کہ ٹھیک ہے، نبوّت تو نئی ہے، لیکن بہرحال وہ ہمارے قبلے کے پیروکار ہیں۔ یہ تو جب تحویلِ قبلہ کا حکم آیا ہے تو اُن کے کان کھڑے ہوئے ہیں۔ اب یہ معاملہ ایک نئی اُمّت کے قیام کا ہے۔ ایک نئے مرکز کے گرد ایک نئی اُمّت کی تشکیل

کرتی تھیں۔ اِس اعتبار سے یہودی ایک متمدّن قوم تھے۔ مگر اَوس و خزرج
ان ایسی کوئی چیز نہ تھی۔ لہٰذا ہر اعتبار سے یہودیوں کا پلڑا بھاری تھا۔ اب
صورت یہ ہوئی کہ ایمان لانے والے تھے اَوس اور خزرج کے کچھ لوگ۔ اگرچہ ان میں
سربرآوردہ لوگ بھی تھے، لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ پورے قبیلے اس طریقے سے تو
ایمان نہیں لائے تھے جس طریقے سے مہاجرین۔ وہ تو ایمان لائے تھے قبیلے کی سطح
پر۔ ان میں جو افراد ELDERS OF THE CLAN تھے انہوں نے فیصلہ کیا
اور پورا قبیلہ ایمان لے آیا۔ تو حضورؐ جب مدینے پہنچے ہیں تو یہ دونوں قبیلے گویا کہ
ایمان لا چکے تھے۔ لیکن ان سب لوگوں کے ایمان کی وہ کیفیت نہ تھی۔ بے شک ان
میں وہ بھی تھے جن کی کیفیت وہی تھی، مگر ایسے بھی تھے جو صرف اپنے خاندان، اور
قبیلے کی سطح پر فیصلے کی وجہ سے مسلمان ہو گئے تھے۔ ورنہ ان پر یہود کے اثرات بہت
گہرے قائم رہے۔ درحقیقت یہی POINT OF CONTACT ہے کہ جہاں سے
نفاق کا مرض شروع ہوا، ایسے ہی لوگوں کو یہودیوں نے آلۂ کار بنایا، ایسے ہی لوگوں
کے ذریعے سے مسلمانوں کی جماعت میں ریشہ دوانیاں اور سازشیں شروع ہوئیں اور
ان کو موقع ملا۔ اس لئے کہ اُن سے سابقہ تعلّقات، حلیف ہونے کا تعلّق، پھر اُن کا ایک
رعب۔ یہ ساری چیزیں وہ تھیں کہ جن کی بنا پر قدم قدم پہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم
کو مشکلات پیش آئیں۔

یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ حضورؐ کی حیاتِ طیّبہ کا یہ وہ دَور ہے جس کے
بارے میں مغربی مفکّرین نے بھی آپ کی تعریف میں وہ تمام SUPER LATI-
VE ڈگریاں استعمال کی ہیں جو اُن کے پاس تھیں۔ ایک مدبّر اور سیاست دان، معاملہ فہم
دور اندیش انسان، ایک نہایت ماہر صدرِ مملکت، حکمران، سپہ سالار، غرض ہر اعتبار
سے تعریف کے جتنے الفاظ ممکن ہیں انہوں نے استعمال کر دیئے۔ خصوصاً منٹگمری واٹ
(MONTGOMERY WATT) یہ الفاظ استعمال کرتا ہے: "ONE OF THE
GREATEST SONS OF ADAM" اور ہارٹ (HEART) نے
جس کا کل میں نے ذکر کیا تھا THE GREATEST مان لیا ہے کہ نسلِ آدم میں
سرِفہرست حضرت محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ اب اس تدبّر کا ...

سے ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اُوس کے سردار تھے۔ مکے میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے۔ ابوجہل نے دیکھ لیا۔ اُس نے کہا: تم نے ہمارے مفروروں کو پناہ دی ہے۔ اب ہم تمھیں یہاں نہیں آنے دیں گے، طواف نہیں کرنے دیں گے تو سعد بن معاذؓ نے جواب دیا کہ ذرا سوچ لو، ہم تمھارے قافلے نہیں گذرنے دیں گے، سیدھی سی بات ہے کہ تمھاری ساری سیادت، ساری چودھراہٹ، تمھاری ساری خوشحالی کا دارومدار اِس بات پہ ہے کہ اہلِ عرب تمھارے قافلوں سے تعرض نہیں کرتے کہ یہ متولّیٔ کعبہ ہیں۔ ہم پر کعبے کا راستہ بند کیا تو پھر وہ PRIVILEGES جو تمھیں حاصل ہیں، حاصل نہیں رہیں گے۔ بالکل وہی بات ہوتی ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے چاروں طرف سے اُن کے تجارتی قافلوں کو چاروں طرف سے مخدوش بنا دیا، آپ نے چھاپہ مار دستے بھیجے۔ ایک واقعہ بھی ہو گیا جو واقعہ نخلہ کہلاتا ہے اب آپ دیکھیے کہ آپ نے نہ صرف شام کے تجارتی راستہ پہ، بلکہ مکے اور طائف کے درمیان کا جو راستہ ہے اس پر بھی ایک طرح کی PICKETING کی ہے۔ چند افراد کا ایک دستہ مرتب کیا اور کہا کہ نخلہ کے مقام پہ چلے جاؤ، قیام کرو، اُن کی نقل و حرکت پہ نگاہ رکھو۔ اگرچہ حضورؐ کی جانب سے حکم نہیں تھا۔ لیکن اتفاقاً وہاں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔

مسلمانوں کے ہاں ایک مشرک عمرو بن عبداللہ حضرمی مارا گیا۔ اب اتفاقاً کہہ لیں یا مشیّتِ ایزدی کہہ لیں، ہجرت کے بعد پہلا خون مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ یہی سلسلہ چل رہا تھا کہ اُن کا ایک بڑا قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں گیا۔ اب وہ شام سے واپس آ رہا تھا۔ اُدھر مشیّتِ ایزدی کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔ حضورؐ کو حکم ہوا کہ نکلیے۔ مدینہ منوّرہ میں حضورؐ نے اپنا ارادہ واضح نہیں فرمایا، نفیرِ عام بھی نہیں تھی کہ ہر مسلمان ضرور چلے۔ آپ ایک جمعیّت لے کر نکلے۔ ابھی آپ نے کچھ ظاہر نہیں فرمایا کہ کیا کر رہے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ ذرا باہر نکل کر آپ نے مجلس مشاورت منعقد کی اور فرمایا! مسلمانو! دو جماعتیں ہیں، ایک شمال سے قافلہ آ رہا ہے اُس کے ساتھ بہت سا مالِ تجارت ہے۔ صرف پچاس محافظوں کا ایک دستہ اُس کے ساتھ ہے۔ اُدھر چونکہ ابوسفیان کو کچھ اندیشہ ہو گیا تھا۔ اُس نے مکّہ مکرّمہ کی طرف قاصد دوڑا دیئے کہ ہو سکتا ہے ہم پر حملہ ہو، لہٰذا حفاظت کا ایسا انتظام کرو کہ ایک دستہ

ہو رہی ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سولہ، سترہ مہینے مل گئے۔ اس میں حضورؐ نے مدینہ منورہ میں اپنی پوزیشن کو پورے طور پر مستحکم کر لیا۔

اب اس کے بعد ہے اہم بات۔ رمضان المبارک ۲ھ میں غزوۂ بدر ہوا اس کے بارے میں ہمارے ہاں کچھ مؤرخین نے خواہ مخواہ ایک معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا ہے کہ حضورؐ نے تو جنگ کا آغاز نہیں کیا، صرف DEFENCE کیا۔ DEFENSIVE جنگ کی تو اسلام میں اجازت ہے۔ جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ جو صورت حال ہے اس کو آپ سمجھئے۔ اس پہلو سے تو کہا جا سکتا ہے کہ جنگ مسلمانوں پر ٹھونس دی گئی کہ اہل ایمان کو مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ ظلم جو مکے کی سرزمین پر روا رکھا گیا۔ گویا قریش کی طرف سے جنگ کا آغاز تھا اس لئے جو آیات میں نے ابھی آپ کو پڑھ کر سنائی ہیں ان میں قتال کا حکم دیا گیا ہے: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ۔ (ان لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے، جنہیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا بلا کسی جرم کے سوائے اس کے کہ انہوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے!) تو اس اعتبار سے تو یقیناً آغاز قریش کی طرف سے ہو چکا۔ لیکن متعین طور پر ہجرت کے بعد جو اقدام ہوا ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوا ہے۔ یعنی آپ یہ نہ سمجھئے کہ اگر قریش چڑھائی کر کے نہ آتے تو وہ STATUS QUO تسلیم کر لیتے، ٹھیک ہے بیٹھ گئے۔ اب یہ مدینے میں بیٹھے اپنی دعوت و تبلیغ کریں، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ تو کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکے کو مشرکین کے تسلط سے نکالنے کے لئے اور: لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط کا جو فرض منصبی تھا، اللہ کے دین کو غالب کرنا، اس کے لئے آپ اقدام نہ فرماتے؟ تو یہ بات سمجھ لیجئے کہ درحقیقت بعثت محمدی کا جو امتیازی مقصد ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط اس کے لئے اب اقدام خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوگا۔ وہ اقدام کیا تھا، مکے کی معاشی ناکہ بندی۔ لائف لائن (LIFE LINE) مکے کی معاش کے اعتبار سے تجارتی قافلے کا وہ راستہ تھا جو مدینے اور ساحل کے درمیان سے ہو کر گزرتا ہے، شام کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت وہاں سے ہے۔ چنانچہ باقاعدہ ایک واقعہ آتا ہے، یہ ہجرت کے فوراً بعد کا واقعہ

نہ اگر مدینے پر کوئی حملہ کرے اور وہاں حضورؐ کو کوئی گزند پہنچانا چاہے تب انصار پابند تھے کہ وہ حضورؐ کی حفاظت کریں گے۔ اس سے زیادہ کا ابھی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اب کھڑے ہوئے ابن عبادہؓ، یہ رئیس اعظم تھے خزرج کے اور خزرج بہت بڑا قبیلہ تھا اوس کے مقابلے میں، کم سے کم تین گنا، تو رئیس انصار اصل میں یہی تھے۔ ان کی تقریر بڑے معرکے کی تقریر ہے۔ انہوں نے کہا اس بیعتِ عقبہ والے معاملے کو اب آپ بھول جائیے: اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ۔ ہم آپ ایمان لا چکے ہیں، آپ کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اب آپ کا جو ارادہ ہو جو قصد ہو، اگر آپ ہمیں سمندر کے کنارے سے جا کر کھڑا کر دیں گے اور ہمیں اس میں چھلانگ لگانے کے لئے کہیں گے تو بے دریغ اس میں چھلانگ لگا دیں گے، تو بسم اللہ کیجئے، جدھر چلنے کا ارادہ ہے چلئے۔ یعنی کسی تردّد کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔ اب یہاں کا معاملہ اور ہے، اب معاملہ ہے نبوّت کا، رسالت کا اور اُمّت کا۔ بیعتِ عقبہ کے وقت شرائط کیا تھیں اور کیا نہیں تھیں، اُن کو رہنے دیں۔ چنانچہ قافلہ بدر کو روانہ ہو گیا۔ اور دیکھئے عجیب بات ہے بدر کی، مشیّتِ ایزدی بعض اوقات بندوں کی مشیّت کے ساتھ آ کر منطبق ہو جاتی ہے۔ ایک طرف دشمنِ خدا چاہتا ہے کہ جنگ ضرور ہو۔ اسے اپنی طاقت کا غرّہ تھا، ایک ہزار کا کیل کانٹے سے مسلّح لشکر لے کر آیا تھا اس لئے سمجھتا تھا کہ فتح یقینی ہے۔ لہٰذا اُس نے کہا تھا کہ یہ یوم، یومِ فرقان ہو گا۔ قرآن مجید نے بھی سورۂ انفال میں غزوۂ بدر کو یوم الفرقان کا نام دیا ہے۔ یہ اصل میں اسی کا دیا ہوا نام ہے، جس کو قرآن نے ADOPT کر لیا ہے۔ طے ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر اور یہ اس لئے کہہ رہا تھا کہ اس کو اپنی فتح کا یقین تھا۔

دوسری طرف اللہ فرماتے ہیں کہ ہماری بھی مشیّت یہی تھی کہ ٹکراؤ ہو: لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ ۚ ہم بھی یہ چاہتے تھے کہ حق اور باطل کا فیصلہ ہو جائے: لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ تاکہ جو زندہ رہے وہ بھی دلیل کے ساتھ زندہ رہے اور جو مرے وہ بھی دلیل کے ساتھ مرے۔ اب خدائی مشیّت اور ابوجہل کی مشیّت نتیجے کے اعتبار سے ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی۔ یہ بھی جان لیجئے، میں نے ابھی لفظ HAWKS استعمال کیا تھا۔ قریش میں HAWKS

آجائے جو ہمیں ESCORT کرے۔ اُدھر ابوجہل کا مزاج HAWKS کا تھا۔ وہ چاہتا
کہ کسی نہ کسی طرح جنگ ہو، فوج کشی کریں اور اسلام کے اس چراغ کو گُل کردیں۔
اُس نے اِس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک واویلا مچادیا کہ تمھاری ساری دولت
خطرے میں ہے اور تمھارے تجارتی قافلے کو محمدؐ لوٹنا چاہتے ہیں (صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم)
چنانچہ اُدھر سے ایک ہزار کا لشکر کیل کانٹے سے لیس ہوکر آیا۔ حضورؐ نے فرمایا اب
یہ دو جماعتیں آرہی ہیں۔ مسلمانو! بتاؤ، کدھر کا قصد کریں۔ سورۂ انفال میں اس
پوری مشاورت کا ذکر آیا ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اے مسلمانو! وَتَوَدُّوْنَ
اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ۔ کہ تم تو چاہتے تھے کہ تمھیں وہ جماعت
ملے جس میں کانٹا نہ چبھے۔ بہرحال بربنائے طبع بشری یہ تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا
کہ لقمۂ تر کو چھوڑ کر لوہے کے چنے کو چبانے کی کوشش کرے۔ سوائے اُن لوگوں
کے جو طے کرچکے ہوں کہ تن من دھن اللہ کی راہ میں لگادیں گے۔ اِس لئے ظاہر ہے
کہ اس جماعت میں بھی وہ لوگ تھے، جن کی رائے یہ ہوئی کہ قافلے کی طرف چلنا
چاہئے۔ یہ مشورہ دراصل ساتھیوں کے MORALE کو دیکھنے کے لئے تھا۔ اندازہ
کیا ہے کہ ان کی سوچ کیا ہے۔ حضورؐ مشورہ طلب کررہے ہیں، ایک اپنی بات کہہ
رہا ہے تو دوسرا اپنی۔ ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ حضرت عمرؓ تقریر کرتے ہیں کہ نہیں حضورؐ
لشکر کی طرف چلنا چاہئے۔ حضورؐ متوجّہ نہیں ہورہے۔ مہاجرین میں سے کچھ اور
نے تقریریں کیں، حضورؐ نے اہمیّت نہ دی۔ آخر میں حضرت مقدادؓ نے تقریر
کی اور بڑی پیاری تقریر کی کہ حضور ہمیں حضرت موسیٰؑ کے وہ ساتھی نہ سمجھئے جنہوں
نے جنگ کا مرحلہ آیا تو کہہ دیا تھا کہ:

"اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ ۝ !"

ہم وہ نہیں ہیں، لیکن حضورؐ اِدھر بھی التفات نہیں فرمارہے۔ اب انصار کو
خیال ہوا کہ معاملہ اصل میں ہم سے ہے، اور وہ بات ذہن میں رکھے ہوئے ہیں جو
کل عرض کی تھی کہ بیعتِ عقبہ ثانیہ جس کے نتیجے میں مدینہ منوّرہ دارالہجرت
اور حضور یہاں تشریف لائے۔ اس میں یہ چیز شامل نہیں تھی کہ مدینے سے
نکل کر بھی حضورؐ کے ساتھ ہوکر جنگ لڑیں گے۔ اس میں یہاں تک PLIED

وہ ہے جس کو عرب میں لڑاکا قوم سمجھا ہی نہیں جاتا تھا یعنی انصار- اور صبح ٹکراؤ
ہونے والا ہے- دونوں فوجوں کے عین بیچوں بیچ گھانس پھونس کی ایک جھونپڑی
بنائی گئی، جس کے اندر اللہ کا رسول سربسجود ہے- بڑا طویل سجدہ ، بڑی طویل دعا،
ننگی تلوار لئے ہوئے حضرت ابوبکرؓ پہرے پر کھڑے ہیں- اس رات کے حوالے سے حضرت
علیؓ کا ایک قول ملتا ہے- ہم میں سب سے زیادہ شجاع ابوبکرؓ تھے- اس لئے کہ
اس شب کو جو سب سے زیادہ خطرناک شب تھی- محمدؐ کے پہرے دار ابوبکرؓ تھے-
اس وقت حضورؐ نے جو دعا مانگی ہے، اگرچہ اس میں بہت ہی عاجزی اور تضرع تھا
تاہم نیاز سے بڑھ کر اُس میں ناز کا انداز تھا:

"اے اللہ! اگر یہ لوگ کل یہاں ہلاک ہوگئے تو پھر قیامت تک تجھے
پوجنے والا کوئی نہ ہوگا!"

کیوں؟ بات واضح ہے- مَیں آخری رسول ہوں اور میری پندرہ برس کی کمائی
یہ ہے جو مَیں نے میدان میں لاکر ڈال دی ہے- اِس پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ
حضور! بس کیجئے، بس کیجئے! پھر آپ نے پیشانی اٹھائی، فتح کی خبر ملی- آپؐ نے صبح
کے وقت بتادیا کہ فلاں کافر فلاں جگہ قتل ہوگا- یہ ہے وہ یوم الفرقان، یوم التقی
الجمعان- ابوجہل قتل ہوا ہے- حضرت معاذ اور معوّذ دو (TEEN AGERS)
تھے، جنھوں نے قتل کیا، دونوں انصاری نوجوان تھے- حضرت عبدالرحمٰن بن عوف
سے آکر پوچھتے ہیں- چچا جان! ہم نے سُنا ہے کہ ابوجہل نامی کوئی شخص مکّہ کا باشندہ
ہے جو ہمارے نبیؐ کو بہت زیادہ ایذائیں پہنچاتا ہے، وہ کہاں ہے، ہمیں بتادیجئے-
انہوں نے اشارہ کیا- وہ ہے ابوجہل- سپہ سالار کی حیثیت میں تھا، کسی خاص مقام
پر کھڑا تھا- یہ دونوں تیر کی طرح پہنچے- مَیں سمجھتا ہوں کہ اُس کا کوئی باڈی گارڈ بھی ہوگا
آس پاس بھی کوئی ہوگا- مگر یہ کسی کو سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے- یہ دو نوجوان جو
دوڑتے ہوئے آرہے ہیں، یہ کاہے کو آرہے ہیں، اُن کے سان گمان میں بھی یہ بات
نہ آئی ہوگی- دونوں نے جاکر اسے قتل کیا ہے، گرایا ہے- زمین پر گرا ہے اور جب گردن
کاٹنے لگے ہیں تو کہنے لگا کہ گردن ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ جب نیزے پر رکھو تو معلوم
ہو کسی سردار کا سر ہے کہ اونچا سر ہے- اور حضورؐ جب اُس کی لاش پر آئے ہیں اور آپ

بھی تھے، DOVES بھی، نیک لوگ بھی تھے۔ کل بھی میں نے ایک شخص کا ذکر کیا تھا، مطعم بن عدی کا جو طائف سے واپسی پر حضورؐ کو اپنی امان میں مکے میں لے کر گیا تھا۔ اسی طرح عقبہ بن ربیعہ ایمان نہیں لایا۔ کفر ہی پر مرا لیکن شرافت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تصادم ہو۔ حکیم بن ہشام رضؓ جو بعد میں ایمان بھی لے آئے، وہ بھی چاہتے تھے کہ تصادم نہ ہو، یہاں فوج پڑی ہوئی ہے، قافلہ نکل گیا وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنکُم۔ وہ تو چلا بھی گیا، لہٰذا یہاں پر عقبہ بن ربیعہ اور حکیم بن ہشام رضؓ نے تحریک شروع کی کہ جس مقصد کے لئے ہم آئے تھے وہ تو پورا ہو گیا۔ ہمارا قافلہ تو محفوظ نکل گیا۔ اب کاہے کو خون ریزی کی جائے۔ محمدؐ کو عرب کے حوالے کر دو، خود نپٹ لیں گے۔ یہاں پر بھی دانش مندوں کی سی بات کی ہے، بہرحال ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے کہ محمدؐ کو جو عرب کے حوالے کر دیا جائے گا تو اگر محمدؐ جیت گئے تو آخر وہ ہمارے ہی تو ہیں، ہماری ہی جیت ہو گی۔ دیکھئے اُن کا وہی نسلی اور قبائلی تعلق۔ ایک قریشی اگر پورے عرب پر غالب آ جاتا ہے تو غالب کون آیا۔ قریش کا قبیلہ اور اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو جو تم چاہتے ہو وہ ہو گیا۔ کیوں خواہ مخواہ اپنے ہاتھوں کو اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے خون سے رنگین کرتے ہو۔

بات اتنی وزنی تھی کہ پورے لشکر میں پھیل گئی کہ ٹھیک ہے، جنگ نہیں ہونی چاہیئے۔ ابوجہل ڈٹا ہوا تھا کہ جنگ ہو گی، اس لئے آخری وقت ایک ہتھکنڈہ کیا۔ نخلہ کے واقعہ میں جس کا میں نے حوالہ تھا، عمرو ابن عبداللہ حضرمی مارا گیا۔ اس کے بھائی کو بلایا اور اُسے انتقام لینے پر اُکسایا۔ چنانچہ اُس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے چیخ اور پکارنا شروع کر دیا کہ غداری ہو رہی ہے۔ میرے بھائی کے خون کا بدلہ لیا جانا چاہیئے۔ ابوجہل نے عتبہ بن ربیعہ کو بھی عرب حمیّت کے حوالے سے طعنہ دیا کہ بزدلی دکھا رہے ہو۔ اس نے کہا کل میدان جنگ میں پتہ چلے گا کہ بزدل کون ہے۔ گویا وہ عربی حمیّت جوش میں آ گئی اور اس طرح جنگ ہو کر رہی۔ اب جنگ سے پہلی رات کا ذرا تصوّر کیجئے۔ اُدھر ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس لشکر اور اِدھر صرف تین سو تیرہ آدمی، ستّر اونٹ اور دو گھوڑے، تلواریں بھی سب کے پاس نہیں۔ وہ تو مدینہ سے جنگ کے لئے نکلے ہی نہ تھے، نہ انہیں پہلے سے خبردار کیا گیا تھا۔ تو

اس فتح کے نتیجے میں اگر لوگ جمع ہو گئے تو جماعت بحیثیتِ مجموعی کمزور ہو جائے گی۔
ایک ہی سال بعد شوال ۳ھ میں جوابی حملہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ہوا جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے۔ تین ہزار کا لشکر پورے اہتمام کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے۔ ان کی ہمتیں دیکھئے کہ عین مدینہ منورہ تک پہنچ گئے۔ دامنِ اُحد میں جو معرکہ ہو رہا ہے، مدینے سے کل چھ میل کا فاصلہ ہے۔ یہاں مشاورت ہوئی، کیا کرنا چاہیئے۔ حضورؐ کی اپنی رائے یہی تھی کہ شہر کے اندر رہ کر ہی مقابلہ کیا جائے۔ یہاں پھر دیکھئے۔ کون سی دو رائیں مل رہی تھیں۔ تاریخ کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جائے تو بڑا دلچسپ ہے۔ وہاں مشیّتِ خداوندی اور خواہشِ ابوجہل اور یہاں رائے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور رائے منافقِ اعظم عبداللہ بن اُبیّ کی ایک ہو گئی۔ عبداللہ بن اُبیّ کی رائے بھی یہی تھی۔ اور یہ بات سمجھ لیجئے کہ یہ خزرج کا بہت بڑا سردار تھا۔ اس حد تک کہ اس کی بادشاہت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہ اس کو مدینے کا بادشاہ مان لیا جائے گا۔ تاج تیار ہو چکا تھا، صرف تاجپوشی کی رسم باقی تھی کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ اور اس کی بادشاہی و سیادت و قیادت کا چراغ گُل ہو گیا۔ لہٰذا اس کے دل میں جو عداوت اوّل روز سے حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تھی، اس کا آپ اندازہ کر لیجئے۔
قبائلی اثرات کے تحت وہ بھی ایمان تو لے آیا لیکن ہے یہ منافقِ اعظم، منافقین کا سردار۔ اس کی بھی رائے یہ تھی کہ اندر رہ کر لڑیں۔ ہماری اتنی طاقت نہیں ہے کہ کھلے میدان میں جا کر مقابلہ کر سکیں تین ہزار کے لشکر کا، لہٰذا مدینے میں محصور ہو کر جنگ کیجئے۔ اس کے الفاظ بھی یہ ہیں کہ یا رسول اللہ! مدینے کی تاریخ ہی یہ ہے کہ جب ہم نے باہر نکل کر مقابلہ کیا ہے تو اکثر ہمیں زک اٹھانی پڑی ہے، اور اگر ہم نے اندر محصور ہو کر مقابلہ کیا تو ان کے فوجیوں سے ہمارے نوجوان لڑتے تھے اور اوپر سے ہماری عورتیں، بچے ان پر سنگ باری کرتے تھے، اور وہ تنگ جگہوں پر پٹ کر آتے تھے، لہٰذا ہم جیت جاتے تھے۔ رائے حضورؐ کی بھی یہی تھی، لیکن وہ نوجوان جو خاص طور پر فتح بدر کے بعد ایمان لائے تھے، جوش میں تھے، بڑی تقریریں ہوئیں۔ کہا گیا کہ ہمیں شہادت چاہیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات مان لی۔

نے اس کی گردن پہ پاؤں رکھا ہے تو فرمایا کہ : ھٰذا فرعون ھٰذہ الامّۃ کہ یہ اس اُمّت کا فرعون ہے۔ ان کے ستّر افراد مزید قتل ہوئے۔ عتبہ بن ربیعہ نے اپنی وہ بات صحیح ثابت کر کے دکھا دی۔ چنانچہ پہلا شخص جو میدانِ جنگ میں آیا وہی تھا۔ حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں واصلِ جہنّم ہوا اور یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ شروع میں جب تین افراد کفّار کی طرف سے اور ادھر سے تین انصاری ان کے مقابلے کے لئے نکلے تو عتبہ نے چیخ کر کہا کہ اے محمّدؐ! ہماری بے عزّتی نہ کرواؤ۔ یہ ہمارے مقابل کے لوگ نہیں ہیں، ہم ان چرواہوں سے لڑنا نہیں چاہتے۔ ہمارے لئے جو ہمارے مدِّمقابل ہیں، ان کو بھیجو۔ تب حضرت حمزہ، حضرت ابوعبیدہ اور حضرت علی نکلے۔ بہرحال میں نے اسے ذرا تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ یہ نقطۂ آغاز بھی ہے اور فیصلہ کن معرکہ بھی یہی تھا۔ جس نے کہ تاریخ کو بدل دیا۔ اسی لئے اُسے ابوجہل نے بھی یوم الفرقان اور اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں اسے وہی نام دیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کس کے ساتھ ہے۔ اس لئے کہ دو فریقوں میں باہم کوئی نسبت ہی نہیں۔ اتنا بڑا لشکر کیل کانٹے سے مسلّح ہو کر اور غرقِ آہن ہو کر آئے اور پٹ جائے اس چھوٹے سے دستے کے ہاتھوں جن کی اکثریّت کاشتکار تھی بقول ان کے اور وہ جنگجو لوگ بھی نہ تھے۔ کوئی ساز و سامان نہیں، اسلحہ نہیں۔ تو معلوم ہو گیا کہ حق کس کے ساتھ ہے۔ یہی بات ہے جس کی وجہ سے درحقیقت اس کو 'یوم الفرقان' کہا گیا۔

اب ذرا آگے چلئے، ویسے تو یہ ہے کہ صرف غزوۂ بدر پر جی چاہتا ہے کہ ایک مکمل تقریر ہو، مغالطے ہی ختم ہو جائیں۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ اقدام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے ہوا۔ بدر کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ تیزی کے ساتھ اسلام کی طرف آئے۔ اوس و خزرج میں اگر کچھ لوگ ابھی مذبذبین تھے تو اُن کے دل بھی ٹھک گئے۔ بات یہی معلوم ہوتی ہے، ٹھیک ہے۔ یہ جو نفری اگلے سال آئی، اللہ تعالیٰ نے اس کی چھانٹی کی۔ غزوۂ احد کی جو حکمت ہے اس کو ذہن میں رکھئے، درحقیقت وہ PURGE اور تطہیر اور چھانٹی کے لئے تھا۔ یہ کچے پکے لوگوں کی بھیڑ جو محمّدؐ کے گرد جمع ہو گئی۔ ابھی تو عالمی سطح پر انقلاب کے لئے بڑی ہی محنتِ شاقّہ کی ضرورت ہے۔

لائے اور گُٹھری بنا کر مدینے بھیج دیئے گئے اور حال یہ ہو گیا کہ بدن پہ سوائے پیوند لگے ہوئے کمبل کے اور کچھ نہیں۔ واقعہ آتا ہے کہ حضورؐ مسجدِ نبوی میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سامنے سے گزر ہوا، ایک پھٹی ہوئی کملی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ نوجوان کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا۔ اور جب دامنِ اُحد میں شہادت کا مرتبہ ملا ہے تو اُن کی تدفین کے وقت یہ مسئلہ سامنے آیا کہ شہید کا تو کوئی کفن نہیں، سوائے اُن کپڑوں کے جو اُس وقت ان کے بدن پر ہوں، اور اُن کے بدن پہ ایک ہی چادر تھی جو اتنی چھوٹی تھی کہ پورا جسم ڈھکتا نہیں تھا۔ اگر سر کو ڈھانپتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں کو ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا تھا۔ معاملہ حضورؐ کی خدمت میں پیش ہوا کہ کیا کریں۔ آپؐ نے فرمایا اُن کے سر کو چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں پر گھاس ڈال دو۔ یہ آخری لباس ہے اُس ڈُو، ڈُو سو درہم کا جوڑا پہننے والے کا۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے متعلق آتا ہے کہ اُس کے کپڑے پیرس سے دُھل کر آتے تھے، عرب معاشرے کے اس خوش پوش نوجوان کے کپڑے شام سے دُھل کر آیا کرتے تھے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اُن کی لاش کا مُثلہ ہوا، کلیجہ چبایا گیا۔ جو کچھ قلبِ محمدیؐ پر بیت رہی ہے آپ ذرا اُس کا تصور کیجیے۔ کل بھی مَیں نے عرض کیا تھا کہ آپ کے سینے میں کوئی پتھر کا ٹکڑا تھا، بڑا احساس قلب تھا۔ جو کچھ بیت رہی ہے اس کا اظہار ہوا۔ جب مدینے تشریف لائے، مدینہ ماتم کدہ بنا ہوا ہے، ستر شہداء، ہر گھرانے سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اُس وقت حضورؐ کی زبان پر یہ الفاظ آئے: "اَمَّا حَمۡزَۃُ فَلَا بَوَاکِیَ لَہٗ!" (کہ حمزہ کے لئے تو کوئی رونے والی بھی نہیں!)۔ انصار اپنے گھروں میں گئے اور اپنی خواتین کو حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بہن اور حضورؐ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھیجا۔

حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دندان مبارک شہید ہوئے، خود کی کڑیاں تلوار کے شدید وار کی وجہ سے پیشانی کی ہڈی میں گھُس گئیں۔ آپ پر غشی طاری

فیصلہ ہو گیا کہ کھلے میدان میں لڑیں گے۔ اس کے بعد جب آپ حجرے سے برآ
ہوئے تو زرہ پہنی ہوئی تھی، تو لوگوں کا ماتھا ٹھنکا کہ بات تو صاف ہے، اور چا
کہ اپنی رائے واپس لیں مگر حضورؐ نے فرمایا کہ کسی نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہتھ
پہن کر اتار دے۔ سورۂ آلِ عمران میں باقاعدہ حکم ہے کہ : شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کہ
سے مشورہ کیا کیجئے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ کہ جب فیصلہ کر لو تو پھر ڈٹ
جائیں اور اللہ پر بھروسہ کریں۔ یہ بار بار کے فیصلے بدلنے اچھے نہیں۔ بہر حال جنگ
ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ آلِ عمران میں بڑی تفصیل سے بیان کیا کہ مسلمانوں کو جو
زک اٹھانی پڑی وہ اس لئے اٹھانی پڑی کہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ تم اپنی کمزوریوں
واقف ہو جاؤ۔ ہم نے تو اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ پہلے مسلمانوں کو فتح ہوئی لیکن
کے نتیجے میں جب مالِ غنیمت جمع کیا جا رہا تھا، وہ پچاس تیر انداز جنھیں حضورؐ نے مت
کیا تھا، مالِ غنیمت کے لالچ میں اپنی جگہ سے ہٹ گئے :

حَتّٰى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ
مَا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ط

کہ وہ مالِ غنیمت جو تمھیں پسند ہے جب وہ سامنے آیا تو تمھیں یاد نہ رہا کہ رسو
صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم کیا تھا۔ عبداللہ بن اُبیّ پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو لے کر علیحد
گیا تھا۔ معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی جماعت میں اب یہ منافقین کا عنصر شامل
چکا ہے۔ ہزار کو لے کر نکلے تھے، تین سو چلے گئے، سات سو رہ گئے تین ہزار کے مقا
میں۔ ابتدائی فتح کے بعد شکست ہوئی اور ستّر مسلمان ہی دامنِ احد میں شہید
بالکل وہی تعداد ہے جو میدانِ بدر میں مشرکین کے مقتولین کی تھی :

"تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ط!"

(ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں!)

حضرت حمزہؓ شہید ہوئے، حضرت مصعبؓ بن عمیر شہید ہوئے، وہ مصعب
بن عمیرؓ جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں۔ جن کا ایک ایک جوڑا دو دو سو درہم کا ہوتا
اور شام سے دُھل کر آیا کرتا تھا۔ معطّر لباس پہنے ہوئے مکے کی گلیوں میں نکلا
کرتے تھے تو اشارے ہوتے تھے کہ وہ کون جا رہا ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر

اُن کی بد عہدی کی وجہ سے مدینہ سے نکال دیا گیا!) اُدھر سے نجد کی طرف کے قبائل یعنی اہلِ عرب کی پوری طاقت مجتمع ہو گئی تھی۔ آگ لگائی گئی، جذبات ابھارے گئے اور بارہ ہزار کے لشکرِ جرّار نے مدینے کو آکر گھیر لیا۔ یہ چھوٹا سا لشکر معلوم ہوتا ہے مگر اُس وقت کے اعتبار سے سوچیے تو بہت بڑا لشکر تھا۔ دامنِ اُحد میں کل تین ہزار ہی تو آئے تھے اور اب بارہ ہزار:

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا ۝ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ..... ۝

یعنی اے مسلمانو! یاد کرو جب احزاب، لشکر پر لشکر آ رہے تھے اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی آ رہے تھے۔ (مدینہ حجاز کا شہر ہے، اس کے دائیں طرف کا علاقہ اونچا ہے۔ جسے نجد کا علاقہ کہتے ہیں۔ اُدھر سے جو لشکر آ رہے تھے اُن کے متعلق کہا "مِّن فَوْقِكُمْ" اور ساحل کی طرف ڈھلوان ہے، اُدھر سے قریش چل کر آئے تھے۔ اُن کے متعلق کہا کہ: "مِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ" کہ وہ نیچے سے آ رہے تھے۔ شمال سے یہود آئے اور انہوں نے گھیرے میں لے لیا!) اور جب نگاہیں پتھرانے لگیں اور دل اُچھل کر ہنسلیوں میں آ پھنسے اور تمھیں طرح طرح کے خیال آنے لگے، اللہ کے بارے میں اس وقت امتحان ہو گیا اہلِ ایمان کا، جانچے گئے، پرکھے گئے کہ کون کتنے پانی میں ہے، اُن کے اندر واقعتہً کتنا ایمان ہے، کون جھوٹ موٹ کا عاشقِ رسول بنا ہوا تھا، اور کون واقعتہً تن من دھن کی قربانی کا فیصلہ کر کے آیا تھا۔ یہ اصل میں امتحان، آزمائش و ابتلا تھا۔

ایسی خوفناک صورتِ حال ہو گئی تھی کہ محسوس یہی ہوتا تھا کہ THIS IS THE END۔ کس کس کا مقابلہ کریں گے۔ چھوٹی سی بستی ہے، مارِ آستین بنو قریظہ موجود ہیں، کسی بھی وقت وہ پیچھے سے خنجر گھونپ سکتے ہیں، ادھر لشکر ہوا ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے خندق کھودی گئی۔ جس طرح غزوۂ اُحد میں مشورہ ہوا تھا، اسی پر یہاں بھی عمل ہوا۔ بہرحال خندق کھودی جا رہی ہے، سنگلاخ زمین ہے، سردی کا شدید موسم ہے، کھانے کو کچھ نہیں ہے بانٹ

ہوئی۔ یہ بھی مشہور ہوگیا کہ حضورؐ کا انتقال ہوگیا، شہید ہو گئے۔ یہ سارے واقعات وہ ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ بہرحال ان کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدر کی فتح کے بعد جو فضا بنی تھی اب اُس کے بالکل برعکس ہوگئی۔ وہ دھاک جو بیٹھی تھی، ختم ہوگئی اور اُحد کے بعد ہوا اُکھڑ گئی۔ یہ بھی جیسے لوگ ہوتے ہیں، ویسے ہی تھے۔ ستر آدمی اُن کے مارے گئے تھے، ستر اُن کے شہید ہو گئے۔ لہٰذا اب جو وقت آیا ہے، وہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی شدید ترین ہے، اور صحابہ کرامؓ کے لئے بھی۔ چاروں طرف سے قبائل شیر ہو گئے۔ آج ادھر سے آ کر کوئی چھاپہ مار گیا کل اُدھر سے آ کر کوئی حملہ کر گیا، کوئی اونٹ لے کر نکل گیا کوئی آ کر نخلستانوں میں آگ لگا گیا۔ ادھر سے یہودی بھی شیر ہو گئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازشیں ہو رہی ہیں، بظاہر دعوت میں بلایا جا رہا ہے، اُوپر سے پتھر برسانے کی اسکیم بن رہی ہے، طرح طرح کے شوشے چھوڑے جا رہے ہیں۔ حضرتِ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پہ تہمت لگ گئی ہے، جس میں غیر تو غیر کچھ اپنے بھی ملوّث ہو گئے ہیں۔ یہ دو سال آپؐ پر اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ پر بڑے کٹھن گزرے ہیں۔ اس کٹھنائی اور اس سختی کا نقطۂ عروج ہے غزوۂ احزاب۔

یہ بات ابھی تک عقدۂ لاینحل ہے کہ غزوۂ اُحد میں تقریباً فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے بعد مشرکین واپس کیوں چلے گئے، بہرحال چلے گئے۔ انہیں جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُدھر حضورؐ کو بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ کچھ دُور جا کر یہ سوچیں گے کہ ہم نے یہ کیا حماقت کی، اور پھر پلٹنے کا خیال کریں گے۔ لہٰذا اگرچہ مسلمان زخموں سے چور چور تھے۔ اُن سے فرمایا کہ اُن کا پیچھا کرو، ورنہ انھیں غلطی کا احساس ہوگیا تو وہ پھر لوٹیں گے۔ بہرحال جس طرح طائف کا دن حضورؐ کے لئے شخصی اور انفرادی سطح پر TURNING POINT تھا، اسی طرح غزوۂ خندق مسلمانوں کی جماعت کے لئے TURNING POINT تھا۔ اس میں تین قوتیں مجتمع تھیں۔ قریش کی بھرپور طاقت، یہود کی مکمّل طاقت جو مدینے میں تھے، مگر جلاوطن کر دیئے گئے تھے۔ (اب سارے واقعات میں آپ کو نہیں سنا سکتا۔ بہرحال انہیں

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے اور سچا وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے!) دونوں باتیں اپنی جگہ حق ہیں۔ حضورؐ نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ عرب و عجم پر تمہیں غلبہ حاصل ہوگا، اور قرآن میں یہ وعدہ بھی تھا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ
مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ

یہ آیات سورۂ بقرہ کی ہیں جو غزوۂ بدر سے بھی پہلے نازل ہو چکی ہے۔ (اے مسلمانو! ہم تمہیں آزمائیں گے، خوف ہوگا، خطرہ ہوگا، بھوک اور فاقہ ہوگا، مال کا نقصان بھی ہوگا، جانی ضیاع بھی ہوگا، کئی دھرے پر پانی پھر جائے گا، فصلیں اجڑیں گی، غرض سب کچھ ہوگا) اُن کی نگاہ تھی اس پر، اس لئے کہا: هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ! (کہ یہی تو ہے جس کا وعدہ کیا تھا ہم سے اللہ اور اس کے رسول نے اور بالکل صحیح وعدہ کیا تھا اللہ اور اس کے رسول نے) اب دیکھئے یہ ایک ہی SITUATION ہے، نتیجے دو نکل رہے ہیں، ایک ہی کتاب ہے قرآن مجید مگر: يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط (اس سے اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے!)۔ اسی طرح ایک ہی SITUATION ہے غزوۂ احزاب کی مگر نتیجے دو نکل رہے ہیں۔ معلوم ہوا اصل فیصلہ کن چیز انسان کے اندر کی کیفیت ہے۔ بہرحال اب میں تفصیل میں نہیں جا سکتا، وقت ختم ہو رہا ہے۔ جتنی خوفناک صورت بنی تھی، اتنا ہی معجزانہ طور پر معاملہ ختم ہو گیا۔ اس میں حضورؐ کی تدبیر کو بھی بڑا دخل ہے۔ اس کی تفصیل کا اب وقت نہیں۔ لیکن آخری فیصلہ کن چیز تائید ایزدی ہے۔ ایک ایسا جھکڑ چلا ایسی آندھی آئی کہ اُن کے خیمے اُکھڑ گئے، دیگیں جو چڑھی ہوئی تھیں الٹ گئیں۔ آگ پھیل گئی، خیموں میں آگ لگ گئی، ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ اس افراتفری کے عالم میں جو انتہائی حکیمانہ اقدامات حضورؐ نے کئے تھے وہ بھی اس کے پشت پر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفار میں پھوٹ پڑ گئی۔ آپس میں بے اعتمادی پیدا ہو گئی۔ ایک آسمانی آفت نازل ہو گئی۔ انہوں نے اپنے اپنے خیمے اٹھائے اور چلے گئے اور فضا

سارے اُن کے قبضے میں آچکے ہیں، چاروں طرف سے تو BLOCKADE ہے۔ کھانے کو کہاں سے آئے گا، فاقہ پر فاقہ ہے، لوگوں نے اپنے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ LITERALLY یا محاورۃً نہیں۔ واقعتہً ایسا ہی ہے تاکہ نقاہت کی وجہ سے کمر دوہری نہ ہو جائے۔ اس حال میں کھدائی کر رہے ہیں مگر زبانوں پر یہ ترانہ ہے ؎

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا ؛ عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا ؕ

(ہم ہیں وہ لوگ جنھوں نے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے!) بیعت کس بات پر کی ہے : عَلَی الْجِهَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا ؕ (ہم نے جہاد پر بیعت کی ہے جب تک ہم ہیں، جب تک جان میں جان ہے!) — اَللّٰهُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃَ — فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَۃَ ؕ (اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے، عیش تو بس آخرت کا عیش ہے!) اور حضورؐ فرمارہے ہیں: (اے اللہ! مغفرت فرما انصار کی بھی اور مہاجرین کی بھی!) - بھاری بھاری پتھر اٹھا کر آپؐ بھی دوسروں کے ساتھ باہر پھینک رہے ہیں۔ یہ نقشہ نہیں ہے کہ کہیں خیمے میں گاؤ تکیہ ہے اور وہاں بیٹھے ہوں۔ بالکل عام مسلمانوں کی طرح کام کر رہے ہیں۔ اور جب کچھ لوگوں نے آکر اپنا کرتا اُٹھایا اور دکھایا کہ حضورؐ! ہم نے فاقہ کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں، تو حضورؐ اپنا کرتہ اٹھا کر دکھاتے ہیں کہ وہاں بھی دو پتھر بندھے ہوئے ہیں۔

انتہائی خطرناک و مخدوش صورت حال ہے۔ قرآن مجید نقل کرتا ہے۔ اس آزمائش کا نتیجہ کیا نکلا۔ جن کے دلوں میں روگ تھا، نفاق تھا، انہوں نے یہ کہا کہ : مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ؕ — ہم سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے جو وعدے کئے تھے وہ جھوٹے نکلے، غلط ثابت ہوئے، ہمیں سبز باغ دکھایا، مروا دیا۔ ہم سے کہا گیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی مملکتیں تمہاری ہوں گی، اور ہو یہ رہا ہے کہ ہم رفع حاجت کے لئے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ ایک ہی SITUATION ہے۔ نتیجے دو نکل رہے ہیں۔ جن کے دلوں میں روگ تھا، اُن کا قول یہ ہے اور جن کے دلوں میں ایمان تھا اُن کا قول یہ ہے۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

ہی کچھ اور شرائط بھی ہیں۔ ہمارا اگر کوئی شخص آپ کے پاس جائے گا تو آپ
پس کرنا ہوگا، اور اگر کوئی مسلمان مرتد ہو کر ہمارے پاس آئے گا تو ہم اسے
نہیں کریں گے۔ نبی علیہ السّلام مسکرا رہے ہیں، شرط یہ شرط مان رہے ہیں
ن پیچ و تاب کھا رہے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے ہم دب کے صلح کیوں کر رہے ہیں۔
سے زیادہ شدّت کے ساتھ اضطراب : اشدهم فی امر الله عمر
ہے۔ ان کے لئے تو یہ چیز کسی درجے میں قابل قبول نہیں تھی۔ دوڑتے ہوئے
رت ابوبکر صدّیق رضؓ کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا ہم حق پر نہیں؟ یقیناً ہیں تو
یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ پھر حضورؐ کے پاس گئے اور عرض کیا
کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ حق پر ہیں، پھر یہ دب کر ہم صلح کیوں کر رہے ہیں؟۔
ؐ مسکرائے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں، ——— مجھے ساری عمر
بات کا قلق رہا کہ میں نے کچھ گستاخی کے ساتھ بات کی، لیکن یہ گستاخی
یں، یہ حمیّتِ حق کا جذبہ ہے۔ اس کو بیان کرنے والے، بیان کرتے وقت کچھ
مرچ لگاتے ہیں۔ دراصل ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جن کے دلوں میں حضرت
رضؓ کی دشمنی اور بغض و عناد ہے، وہ بھول جاتے ہیں کہ حمیّتِ حق کا یہی جذبہ
حضرت علی رضؓ کے اندر بھی ہے۔

ایک معاہدہ لکھا جا رہا ہے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کاتب ہیں۔ حضورؐ
DICTAT. کروا رہے ہیں۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمدؐ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم
ر قریش کے درمیان طے پایا۔ قریش کا وفد کہتا ہے کہ حضورؐ ہمیں یہ قبول نہیں
ہے، آپ کے نام کے ساتھ رسول اللہ کے الفاظ منظور نہیں ہیں۔ اگر ہم آپ
کو رسول اللہ مان لیتے تو جھگڑا کاہے کا تھا؟ محمدؐ بن عبداللہ اور قریش کے
مابین لکھئے۔ حضورؐ فرماتے ہیں۔ علیؓ! رسول اللہ کے الفاظ مٹا دو۔ حضرت
علی رضؓ عرض کرتے ہیں: حضورؐ! میں تو نہیں مٹاتا۔ حضورؐ پوچھتے ہیں کہاں لکھا
ہے اور اُسے خود اپنے ہاتھ سے مٹاتے ہیں۔ تو اگر کہنے کو آئیں تو یہ تو معصیت
ہوگئی، حضورؐ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگئی۔ نمک مرچ لگائیے تو کہاں تک بات
جائے گی۔ حالانکہ نہ وہ گستاخی ہے نہ یہ معصیت ہے دونوں میں درحقیقت حمیّتِ حق

ایسے صاف ہوگئی کہ جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ امتحان لینا تھا، لے لیا۔ کون کتنے
میں ہے، یہ کھل گیا۔ غزوۂ خندق کے بعد حضورؐ نے فرمایا: لن یغزوکم قریش
بعد عامکم ھذا و لکنکم تغزونھم! "یعنی مسلمانو! اب اس س
کے بعد قریش تم پر حملہ آور نہیں ہو سکیں گے۔ اب تم اُن پر حملہ آور ہو گے۔"
انگریزی میں کہیں گے: "BLES HAVE BEEN TURNED"
پانسہ پلٹ گیا۔ کفر، جتنی جمعیت اور تیاری کے ساتھ اس وقت آیا تھا، اس
زیادہ تیاری ممکن نہیں۔ اس میں ناکامی کے بعد اب ان میں حوصلہ نہیں کہ دو
اتنے اہتمام کے ساتھ آئیں۔ یہ واقعہ ۵ھ کا تھا۔ اس کا مظہر کیا ہے کہ ا
سال ۶ھ میں حضور بغرض عمرہ مکہ مکرمہ کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ خواب
آپ نے دیکھا کہ عمرہ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو بتایا گیا، تیار ہو جائیں۔ چودہ سو
کے ساتھ حضورؐ ہدی کے جانور لے کر روانہ ہوئے، احرام بندھا ہوا ہے، تلوار
ہیں لیکن نیاموں میں بند، کوئی اور ساز و سامان ساتھ نہیں۔

اُدھر قریش سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں۔ صورتِ حال معلوم ہے، آنحضر
صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ روک نہیں سکتے۔ صورتِ حال سمجھئے اس لئے کہ ا
دوران میں یہی تو نہیں ہوا کہ حضورؐ بس مدینہ منورہ ہی میں کام کرتے رہے
آس پاس دعوت پہنچ رہی ہے، قبائل میں اب آپ کے جاں نثار موجود ہیں
گویا کہ اب قریش ISOLATE ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی طرح گوارا نہیں کہ ا
طرح شکست قبول کرلیں۔ آخر عرب ہیں اور عربوں میں بھی قریش۔ حضور صلی
اللہ علیہ وسلم حدیبیہ تک پہنچ گئے۔ سلسلہ جنبانی شروع ہوئی، کیا کرنا چاہئے
پہلے تو رعب ڈالا گیا، سفارتیں آئیں، ان میں سہیل بن عمرو بہت بڑے سفیر
بعد میں ایمان لے آئے۔ یہاں آکر تو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں،
وہاں جاکر خبر دیتے ہیں کہ اے قریش! میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں
محبت اور جو جاں نثاری کا جذبہ میں نے محمدؐ کے ساتھیوں میں دیکھا ہے محمدؐ
کے لئے، وہ کہیں اور نہیں دیکھا۔ لہٰذا عافیت اسی میں ہے کہ صلح کرلو۔ معاملہ
ہوتی ہے۔ اس سال آپ کو واپس جانا پڑے گا۔ اگلے سال آپ عمرہ کیجئے۔ اس

چکا ہے - دل فتح ہو رہے ہیں - یہ صورتِ حال دیکھی تو قریش سمجھ گئے کہ ہمارے
ہاتھ بندھ گئے - وہ شق بھی ان کے خلاف پڑی - یہاں سے کوئی مسلمان اُن کی
اسیری سے نکل بھاگتا تھا تو مدینے کو نہیں جاتا تھا کہ واپس کر دیں گے - انہوں
نے اپنا ایک اڈہ بنا لیا اُس تجارتی شاہراہ پر سڑک کے عین کنارے پر جو ساحلِ سمندر
کے قریب سے گزرتی تھی اور چھاپے مارنے شروع کر دیئے - ظاہر بات ہے کہ وہ اس
معاہدہ کے پابند نہیں تھے جو قریش نے حضورؐ سے کیا - اگر وہ مدینہ میں آتے تو حضورؐ انہیں
واپس کر دیتے - اس پر انہوں نے کہا کہ آپ ان کو اپنے پاس بلا لیں مدینہ میں - ہم
معاہدے کی اس شق کو خود ہی واپس لیتے ہیں - وہ دیکھ رہے ہیں کہ صلح اُلٹی ان پہ
پڑ رہی ہے - طیش میں آکر اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے - یعنی جو قبیلہ مسلمانوں کا حلیف
تھا اس پر حملہ کیا قریش کے حلیف قبیلے نے اور قریش کے سردار بھیس بدل کر اس میں
شریک ہوئے اور تلواریں چلائیں - مسلمانوں کا حلیف قبیلہ حضورؐ کے پاس گیا
اور فریاد کی - حضورؐ نے سفارت بھیجی کہ نقصان کی تلافی کرو اور قاتلین کو ہمارے
حوالے کرو ورنہ معاہدہ ختم ہوتا ہے - جوش میں آکر انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے
معاہدہ ختم - ہمارے اور محمدؐ کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں -
ذرا نوٹ کیجئے ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ اس بات کے منتظر تھے کہ
اُن کی طرف سے خلاف ورزی ہو اور آپ اس OPPORTUNITY کو
SEIZE کریں - اس موقع کو ایسی مضبوطی سے پکڑا کہ قریش پر فوراً یہ
احساس طاری ہوا کہ ہم نے غلطی کی ، ہم مارے گئے ، صلح کی تجدید ہونی چاہیئے ،
غلطی ہو گئی - محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے ، یہ کیا کر بیٹھے -
اب ابوسفیان آئے ہیں صلح کی تجدید کرنے کے لئے - اب حضورؐ نہیں کر رہے -
دیکھئے ! ایک یا دو سال پہلے حضورؐ نے بظاہر گر کر صلح کی - اب حضورؐ صلح نہیں
کر رہے ، کیوں ؟ ذہن میں رکھئے - اب کفر کو صلح کر کے خواہ مخواہ ایک :-----
FRESH LEASE OF EXISTANCE دینا ہے - قوت ان کی
ٹوٹ چکی ہے ، مخاصمت اب ان میں موجود نہیں ، مقابلہ کر نہیں سکتے تو اب صلح کی
ڈھال انہیں کاہے کو دی جائے - اللہ کے دین کو غالب کرنا ہے - اصل مقصد تو

ہے۔ مطلب یہ کہ میں اپنے قلم سے نہیں مٹا سکتا۔ یہاں محمدؐ رسول اللہ کے الفاظ ہیں۔ آپ اپنے ہاتھ سے مٹا دیجئے۔ اِسی ارادے اور اسی جذبے سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، کہ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔ اگر ہم حق پر ہیں تو ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں۔ اور صورتِ حال دیکھئے، اسی وقت سہیل بن عمرو کے صاحبزادے آجاتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں اور بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور سخت لاغر ہیں، کسی طرح بچ کر آ گئے اور کہا حضورؐ! مجھے اپنے ساتھ لے چلیئے۔ انہوں نے میرا جو حشر کیا ہے وہ دیکھ لیجئے۔ سب مسلمان اُن کی حالت کو دیکھ رہے ہیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں، معاہدہ ہو چکا ہے تمھیں واپس جانا ہوگا۔ مسلمانوں کے دلوں پر جو بیت رہی ہے اس کا اندازہ کر لیجئے۔ اس معاہدے کو قرآن مجید نے "فتح مُبین" قرار دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ (اے محمدؐ! ہم نے تو آپ کو کھُلی فتح عطا کی) اور وہ کھُلی فتح ثابت ہو گئی۔ ہر اعتبار سے یہ معاہدہ حضورؐ کے حق میں پڑا اور مسلمانوں کے متعلق HOSTILITIES ختم ہو گئیں۔ حضورؐ کے گویا ہاتھ کھُل گئے۔ دعوتی و تبلیغی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئیں۔ پورے عرب میں جنگ نہیں، امن ہے۔

حضورؐ کے پاس اصل مسخر کرنے والی قوت قرآن مجید اور اس کی دعوت تھی۔ ہے: "جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتحِ زمانہ!" تلوار دل کو فتح نہیں کیا کرتی، دل کو فتح کرتا ہے قرآن مجید! یہ جنگوں کا سارا معاملہ الیباچل رہا تھا کہ ادھر کما حقہٗ، توجہ نہیں ہو رہی تھی۔ ہر وقت جنگ، ہر وقت خطرے کی حالت۔ اب جو موقع ملا ہے تو بیرونی اور اندرونی دونوں سطحوں پر دعوت و تبلیغ کا عمل پوری شدّت سے شروع ہو گیا۔ اصحابِ صفہ کی جو جماعت تیار ہو رہی تھی، اُس میں سے پچاس کو اِدھر بھیج دیا، سَو کو اُدھر بھیج دیا، ستّر کو ادھر بھیج دیا۔ اُن میں بیچارے وہ بھی تھے جن کو شہید کر دیا گیا۔ دھوکے سے لوگ لے جاتے تھے کہ ہمارے علاقے میں کچھ لوگ بھیجئے جو قرآن پڑھائیں، سکھائیں اور پھر کہیں گھاٹی میں لے جا کر شہید کر دیا۔ بیرِ معونہ کے واقعہ میں ستّر اصحابِ صُفّہ میں سے شاید ایک بچ سکا۔ لیکن اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ دعوتی عمل پوری شدّت کے ساتھ شروع ہو

ہے، بالکل معمولی سی، ورنہ قریش کو معلوم تھا کہ ہم کس پوزیشن میں ہیں —
رتِ حال تبدیل ہو گئی، فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں - یہ وقت ہے
دنوں کے اکڑنے اور سینوں کے تننے کا - مگر یہاں یہ کیفیت ہے کہ محمدؐ رسول اللہ
اللہ علیہ وسلم کی گردن اتنی جھکی ہوئی ہے کہ جس سواری پر بیٹھے ہیں اُس کی گردن
سے آپ کی پیشانی مَس کر رہی ہے - بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا : وَادْخُلُوا الْبَابَ
سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ" - کہ فاتح کی حیثیت سے داخل ہوں تو جھک کے داخل
ہوں، اس وقت غرور نہ ہو، استکبار نہ ہو - یہاں اسی پر عمل ہو رہا ہے - معافی
کا اعلان عام ہو گیا کہ جو اپنے گھر میں رہے اسے بھی معاف، جو خانہ کعبہ میں
آجائے اُسے بھی پناہ مل گئی - سب سے بڑا دشمن رہا تھا ابو سفیان - فرمایا !
جو شخص اس کے گھر میں چلا جائے اُسے بھی امان ! اور پھر جب سب سردارانِ
قریش گردن جھکائے سامنے آئے ہیں تو پوچھا : تمھیں معلوم ہے میں تم سے کیا معاملہ
کروں گا ؟ اُن کا جواب انتہائی خوشامدانہ جواب تھا جو کسی عرب کی زبان پہ
آسکتا ہے کہ : خیرًا، اخٌ کریمٌ وابنُ اخٍ کریمٍ - اور حضورؐ کا جواب
یہ ہے کہ میں تم سے وہی بات کہتا ہوں جو میرے بھائی یوسفؑ نے کہی تھی کہ :-
" لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۝ .... " اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ " — جاؤ
تم سب آزاد ہو - یہ ہے رمضان ۸ھ میں مکّے کا فتح ہو جانا - گویا کہ اندرونِ
عرب کامیابی کی علامت اور SYMBOL -

لیکن کفر کی ایک آخری کوشش اور ہوئی - غیر قریش عرب قبائل نے
مجموعی طور پر ایک دفعہ پھر کوشش کی کہ کسی طرح اس سیلاب کو روکا جائے -
یہ تھے ثقیف، طائف، اور ہوازن کے لوگ - بنی ہوازن بڑے تیرانداز تھے -
چنانچہ اگلے ہی مہینے شوال ۸ھ میں غزوۂ حُنین پیش آگیا - حضورؐ کے ساتھ
اب بارہ ہزار کا لشکر تھا - دس ہزار مدینے سے آئے تھے اور دو ہزار مکّے سے
شامل ہوئے - ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ابھی ایمان نہیں لائے مگر ساتھ شامل ہو گئے
مقابلہ ہوتا ہے - تیروں کی ایک بوچھاڑ ایسی آئی کہ بھگدڑ مچ گئی - اگرچہ روایات
مختلف ہیں اور کچھ دشمنانِ صحابہؓ نے اس کو EXPLOIT بھی کیا ہے تاکہ ان

وہ ہے۔ اس میں تاخیر کس لئے۔ معلوم ہوا کہ اصل نہ صلح ہے نہ جنگ۔ اصل یہ ہے مقصد : لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔ یہاں تک دلچسپ واقعات آتے ہیں۔ اس ضمن میں کہ حضرت ابوسفیانؓ۔ بہرحال صحابی ہیں، بعد میں ایمان سے آئے ان کا نام ادب سے لینا ہوتا ہے۔ مدینے اس کوشش میں آئے کہ صلح کی تجدید ہو جائے، اپنی صاحبزادی کے گھر پہنچے، یعنی اُمّ حبیبہ کے گھر جو حضورؐ کی زوجہ محترم اور اُمّ المؤمنین ہیں۔ آج کل بھی آپ کو معلوم ہے، کسی بڑے آدمی یا افسر کا APPROACH کرنی ہو تو اندرونِ خانہ کا راستہ اگر موجود ہو تو اس سے زیادہ مؤثر راستہ اور کوئی نہیں۔ یہ بڑی اُمیدیں لے کر گئے ہوں گے۔ وہاں عجیب واقعہ پیش آیا، گھر میں پہنچے، حضورؐ کا بستر بچھا ہوا تھا، اُس پر بیٹھنے لگے، بیٹی نے کہا : ذرا ٹھہریئے اباجان! بستر لپیٹ دیا۔ اب سوچئے۔ یہ عرب کا سیاسی سردار، مدبّر، حرب کا بیٹا جو قریش کا رئیس رہا۔ اس نے کہا، یہ بستر میرے لائق نہ تھا یا میں اس کے لائق نہ تھا؟ اب ذرا جواب دیکھئے۔ حضرت اُمّ حبیبہؓ نے کہا آپ اس کے لائق نہیں ہیں۔ یہ بستر محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ہے اب وہ کیا سفارش کرواتے، وہاں سے نکلے۔ مسجدِ نبویؐ کے پاس کچھ درویش صحابہ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے ابوسفیان پر کوئی فقرہ چست کر دیا، حضرت ابوبکرؓ پاس سے گزر رہے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں سمجھایا کہ آخر قریش کا سردار ہے، ایسی بات نہیں کرنی چاہیئے۔ اُن کی آپس میں کچھ تلخ کلامی ہو گئی۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو بھی کچھ جواب دے دیا، آخر درویش تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جا کر حضورؐ سے شکایت کی۔ حضورؐ نے کیا فرمایا: ابوبکرؓ کہیں ان کو ناراض تو نہیں کر دیا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن سے یہ ناراض ہو جائیں ان سے اللہ بھی ناراض ہو جاتا ہے۔

اِن درویشوں میں ابوذرؓ ہوں گے، سلمان فارسیؓ ہوں گے۔ درویشوں کا یہ وقار تھا۔ بہرحال صلح نہیں ہوئی۔ آپؐ نے ۸ھ میں فیصلہ کن اقدام فرمایا اب دس ہزار کی جماعت ہے اور محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کل آٹھ برس بعد فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے، انقلاب آ گیا۔ معمولی سی جھڑپ کہیں کہیں

حضورؐ نے خطبہ دیا۔ دیکھیے! خطباتِ نبویؐ میں سے CLIMAX یہی خطبہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اے اہلِ یثرب! کیا یہ درست نہیں کہ تم گمراہ تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت دی۔ انھوں نے کہا: "بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ط!" کیا یہ درست نہیں کہ تم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اللہ نے میرے ذریعے تمھیں ایک بنا دیا۔ تمھارے دلوں میں محبت پیدا کر دی۔ انھوں نے کہا: "بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ط!"۔ ان باتوں کا تو انکار ممکن ہی نہیں۔ حضورؐ نے وہ سارے احسانات گنوائے جو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی وساطت سے انصار پر کیے اور آپؐ نے بات کو پلٹا۔ ہاں اے اہلِ یثرب! تم یہ کہو کہ اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) تمھیں کوئی پناہ دینے والا نہیں تھا۔ ہم نے پناہ دی، تمھیں تمھاری قوم نے نکال دیا تھا۔ ہم نے اپنے اہل و عیال سے بڑھ کر تمھاری حفاظت کی۔ میں کہوں گا، تم درست کہتے ہو، تو اے معشرِ انصار! کیا تمھیں یہ بات نہیں پسند کہ لوگ بھیڑیں، بکریاں اور اونٹ لے کر اپنے گھروں کو جائیں اور تم محمد رسول اللہ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ۔ سب کی چیخیں نکل گئیں، سب پکار اٹھے "رَضِیْنَا، رَضِیْنَا" (ہم راضی ہیں، ہم راضی ہیں!) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک مشہور شعر ہے ؎

رَضِیْنَا قِسْمَةَ الْجَبَّارِ فِیْنَا ؛ لَنَا عِلْمٌ وَّلِلْجُهَّالِ مَالٌ

(ہم اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی ہیں کہ ہمیں علم عطا فرمایا اور جاہلوں کو دولت عطا فرمائی!)

بہر حال اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ایک قدم پر مسئلہ کھڑا ہو جاتا تھا، ایک حل ہوا تو دوسرا آ رہا ہے، دوسرا حل ہوا تو تیسرا آ رہا ہے۔ اپنوں کی طرف سے بھی ہے اور اغیار کی طرف سے بھی ہے۔ منافقین بہر حال قانوناً تو اپنے تھے، مسلمان تھے، کلمہ گو تھے۔ بہر صورت فتح مکہ کے بعد اب تین باتیں ہوئیں۔ حضورؐ نے حکمت یہ اختیار فرمائی کہ پہلا حج جو آیا وہ مشرکین کے زیرِ اہتمام رہنے دیا۔ مسلمانوں اور مشرکین نے مل کر حج کیا۔ لیکن اگلے سال آپؐ نے انتظام مشرکین کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور امیرِ حج ابوبکر صدیق رضؓ کو بنا کر بھیجا، قافلہ مدینے سے آیا، حضورؐ خود تشریف نہیں لائے۔ اس کے بعد سورۂ توبہ کی جو آیات نازل ہو گئیں وہ اعلانِ

لوگوں کو بدظن کیا جائے اور کہا جاتا ہے کہ دو آدمی رہ گئے، تین رہ گئے، چھ رہ گئے۔ یہ غلط ہے، یہ ضرور ہے کہ لشکر میں بھگدڑ مچی ہے لیکن کئی سو ساتھی حضورؐ کے ساتھ تھے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سواری سے اترے، عَلَم ہاتھ میں لیا۔ حضورؐ کی ذاتی شجاعت کا سب سے بڑا اظہار یہاں ہوا۔ آپؐ یہ رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے: اَنا النبیّ لا کذب - انا ابن عبد المطلب۔ پھر آپؐ نے آوازیں دیں: یا اھل الشجرۃ الیّ عباد اللہ (اے بیعتِ شجرہ، بیعتِ رضوان کرنے والو! میری طرف پلٹ آؤ!) اللہ تعالیٰ نے فتح دی۔ قرآن مجید میں سورۂ توبہ میں اس کا ذکر آیا ہے: وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ: "اس حنین کے دن کو یاد کرو جب تمھیں اپنی کثرتِ تعداد کا کچھ غرّہ ہوگیا تھا!" (بارہ ہزار ہیں ہمیں کون شکست دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً پکڑا) "زمین تم پر اپنی تمام وسعتوں کے باوصف تنگ ہوگئی!"۔ مومن کو صرف اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیئے، اسباب و وسائل پر نہیں۔ اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ سارا ساز و سامان تیار کرو۔ لیکن بھروسہ صرف اللہ پر ہو۔

غزوۂ حنین کا صرف ایک واقعہ سنا کر میں اس کو ختم کر رہا ہوں۔ چند منٹ مجھے دیجئے، بڑا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ اس کی تقسیم کے وقت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مکّے کے نئے ایمان لانے والوں کو ذرا زیادہ دیا تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو جو قرآن کا بیان کردہ مصرف ہے۔ لیکن اب دیکھئے، صورتِ حال کیسی پیدا ہوتی ہے۔ منافقین کا ELEMENT تو موجود تھا۔ عجیب انداز میں کہا گیا۔ جب خون دینے اور جانیں دینے کا وقت تھا تو ہم یاد آتے تھے، انصار، اور اب بانٹنے کا وقت آیا تو اپنے گھر والے، اپنے خاندان والے، اپنے قبیلے والے یاد آگئے۔ اب اس اعتبار سے تو یہ بات غلط نہیں کہ اس وقت جو مؤلفۃ القلوب تھے، وہ مکّے کے لوگ تھے، حضورؐ کے قبیلے کے لوگ تھے۔ چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، حضورؐ کو بھی خبریں پہنچ رہی ہیں۔ دیکھئے! حضورؐ نے کیا کیا۔ کیسی نازک صورتِ حال ہے اور کس طرح اسے HANDLE کیا ہے۔ ایک بڑا خیمہ لگوایا اور انصار کو جمع کیا، انصار آگئے

کا صفایا ہوگیا۔ اُسے شرک اور کفر سے پاک کر دیا گیا، اگلے سال ہے حجۃ الوداع، حضورؐ تشریف لائے، بہ نفسِ نفیس حج ادا کیا۔ سوا لاکھ یا ایک لاکھ چالیس ہزار مسلمان، عرب کی سرزمین سے جمع ہیں۔ آخری خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔ اس کے بعد کُل اسّی یا نوّے دن حضورؐ کی حیاتِ دُنیوی کے ہیں:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ۝ ——— اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝

سارے مراحل طے ہوگئے۔ خطبہ دیا اور آخر میں لوگوں سے سوال کیا: "اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ (لوگو! کیا میں نے پہنچا دیا؟) اور صحابہؓ نے جواب دیا: اِنَّا نَشْھَدُ اِنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ (ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ بھی ادا کر دیا! حقِ نصیحت بھی ادا کر دیا، حقِ امانت بھی ادا کر دیا۔) کہیں یہ الفاظ ہیں کہ: اِنَّکَ اَدَّیْتَ الامانۃ وَنصحت الامۃ ۔ اِس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہا: اَللّٰھُمَّ اشھد ، اَللّٰھُمَّ اشھد، اَللّٰھُمَّ اشھد (اے اللہ تو بھی گواہ رہ! تین بار فرمایا) کہ وہ بھاری بوجھ جو بفحوائے الفاظِ قرآنی: اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا ثَقِیْلًا ط میرے کاندھوں پر تھا اُتر گیا۔

حضرات! جزیرہ نمائے عرب کی حد تک دونوں کام پورے ہوگئے۔ اہلِ عرب تک تبلیغ کا حق بھی ادا ہوگیا اور جزیرہ نمائے عرب تک: لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ بھی ہوگیا۔ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرضِ منصبی کا ایک ONASE ... تکمیل کو پہنچا۔ لیکن آپؐ صرف عرب کے لئے رسول بن کر نہیں آئے۔ آپؐ سے ختمِ نبوّت کا وہ حصّہ جو: وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا یا: مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ کی رُو سے آپ پر لازم آتا تھا: یعنی بعثتِ نبویؐ کا بین الاقوامی یا عالمی پہلو ابھی میری آج کی گفتگو میں باقی رہ گیا ہے۔ بات طویل ہورہی ہے۔ میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ نامعلوم میں کن کن چیزوں کو چھوڑ کر نکلا ہوں۔ ہر جگہ خیال ہوتا تھا یہ بات ضرور بیان کرنے کی ہے، لیکن وقت نہیں۔ بات آج بھی نامکمل رہی ہے۔ بعثتِ نبویؐ کا جو بین الاقوامی پہلو ہے وہ اِن شاء اللہ آئندہ تقریر میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ———

بمارت ہے مشرکین سے، انہیں صرف اَشْہُرِ حُرُم کی مہلت دی جارہی ہے۔ اس عرصے میں ایمان لے آئیں تو عافیت ہے۔ اگر اپنے شرک و کفر پر اڑے رہیں تو ان کا قتلِ عام شروع ہو جائے، وہ کیوں؟ وہ بات جو میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں جس قوم پہ رسول کی بعثت کی حجت قائم ہو چکی ہو، اب اس کے لئے رعایت نہیں۔ جس ضابطے کے تحت قومِ نوحؑ، قومِ ہود، قومِ صالح ہلاک ہوئی ہیں، وہ ضابطہ اب لاگو ہو رہا ہے اہلِ عرب پر:

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا ۙ شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ؕ

تو اگر آلِ فرعون غرق کئے گئے ہیں تو تمہارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا یا ایمان لے آؤ ـــــ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ

عذابِ خداوندی کی صورتیں بدل سکتی ہیں۔ کبھی وہ زمین میں زلزلے کی شکل میں آسکتا ہے، کبھی وہ آسمان سے بارش اور طوفان کی صورت میں آسکتا ہے اور کبھی مسلمانوں کی تلواروں کی صورت میں آسکتا ہے۔ یہ اعلان حضرت علیؓ نے حضورؐ کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے حج کے موقع پر کر دیا۔ یہ ۹ھ کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد یوں سمجھئے کہ جزیرہ نمائے عرب میں MOPPING UP OPERATION ہوا۔ سب ایمان لے آئے اور قرآن کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی: اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ کفر اور شرک کا خاتمہ ہو گیا۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو تارکِ وطن ہو کر چلے گئے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مکے سے نکلے تھے توحید کے لئے، مگر ابوجہل کے صاحبزادے عکرمہ نکلے شرک کے لئے، غیرت سے نہیں مانا کہ ایمان لے آئیں۔ مغلوب ہو گئے مگر ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن عجیب واقعہ ہوا، حبشہ کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں طوفان آیا۔ جس کشتی پر سوار تھے، ڈولنے لگی۔ سب لوگوں نے اللہ کو پکارنا شروع کیا۔ وہ خود کہتے ہیں میں نے سوچا کہ اسی کی دعوت تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دیتے ہیں۔ کسی لات، کسی ہبل کسی عزیٰ کو کوئی نہیں پکار رہا۔ خطرے کے وقت پکارا ہے تو اللہ کو پکارا ہے۔ لہٰذا واپس آئے اور ایمان لے آئے۔ بہرحال اس ایک سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب

کا اللہ نے ذمہ لے لیا ہے۔ قرآن مجید سے متعلق ان دونوں اُمور کا براہِ راست تعلق ختمِ نبوت سے ہے۔ ختمِ نبوت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مکمل دین اور ایک مکمل نظامِ زندگی عطا کیا گیا۔ انسان کی اجتماعی زندگی کے جتنے گوشے، جتنے پہلو ہیں، اور اس میں گوناگوں قسم کی جو پیچیدگیاں، تمدن و تہذیب اور ہیئتِ اجتماعیہ کے ارتقائی مراحل کے دوران پیدا ہوتی چلی گئیں۔ ان سب کا ایک متوازن اور معتدل حل، ایک نظامِ عدل و قسط، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دینِ حق کی شکل میں دے دیا گیا، اور آپ کا فرضِ منصبی یہ قرار پایا کہ اس نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم کر کے دکھا دیا جائے تاکہ بنی نوعِ انسان پر حجت صرف اس اعتبار ہی سے قائم نہ ہو کہ ہدایتِ خداوندی، انفرادی زندگی سے متعلق ہے اور انفرادی سیرت و کردار کا جو معاملہ ہے، صرف اس کے ضمن میں کامل ہدایت ملی ہے۔ بلکہ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت اس صورت میں بھی ہو جائے کہ نظامِ اجتماعی سے متعلق بھی جو ہدایت دی گئی، اس کا بھی ایک عملی نمونہ دُنیا میں قائم کر کے اور چلا کر دکھا دیا جائے۔ وہ کوئی UTOPIA نہیں ہے، وہ کوئی صرف نظری تعلیم نہیں ہے کہ جو قابلِ عمل نہ ہو بلکہ وہ قابلِ عمل ہے، وہ دنیا میں قائم ہوا ہے اور بڑے وسیع و عریض خطّے پر قائم ہوا ہے، اور وہ چلا ہے اور اس کی برکات کا دُنیا نے بچشمِ سر مشاہدہ کیا ہے۔

تیسرا پہلو ختمِ نبوت کا وہ ہے، جس کے لئے میں نے آج دو آیتیں پڑھیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے اور آخری نبی و رسول ہیں، جن کی بعثت علی الاطلاق پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ آپ سے پہلے کسی نبی اور رسول کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے نہیں تھی۔ ویسے بھی ظاہر ہے کہ انسانی تمدن، ذرائع رسل و رسائل حمل و نقل کے وسائل ابھی اتنے تھے ہی نہیں کہ کسی ایک دعوت پر بنی نوعِ انسان کو مجتمع کیا جا سکتا۔ لہٰذا نبوتیں REGIONAL بھی تھیں اور موقت بھی تھیں۔ ایک علاقے میں ایک نبی آئے، انہوں نے دعوت دی، قوم سے بایں الفاظ خطاب کیا "یَا قَوْمِ، یَا قَوْمِ!"۔ حضرت نوحؑ ہوں یا حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ ہوں، یا حضرت شعیبؑ، قرآن میں بار بار ذکر آتا ہے: یَا قَوْمِ، یَاقَوْمِ! (اے میری قوم کے لوگو!) اس کے بعد بہت سے رسول آئے، یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ

سلسلہ تقاریر سیرت - ۵

اسرار احمد

خلافتِ صدیقیؓ
اور
انقلابِ نبویؐ کا استحکام

خطبۂ مسنونہ کے بعد - فقد قال اللہ تعالیٰ: "وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝" وقال فی موضعٍ اٰخر: وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝ صدق اللہ العظیم ۔ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ - اٰمین یا ربَّ العالَمین

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امتِ مسلمہ کی تاریخ کے سلسلے میں چند تقاریر کا جو پروگرام چل رہا ہے، اس میں ہم متعدد اسباب کی بنیاد پر اپنے شیڈیول (SCHE-DULE) سے خاصے پیچھے رہ گئے ہیں - ایک تو تقریروں کا نمبر اندازے سے بڑھ رہا ہے - اور کل کا ایک سانحہ ہو گیا ہے - بہرحال جیسے بھی اللہ کو منظور ہو گا، اسے ہم پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے - پہلی دو تقریریں اصولی مباحث پر مشتمل تھیں - (۱) بعثتِ انبیاء کا عمومی مقصد کیا ہے اور (۲) خاتم النبیین، آخر المرسلین، سیّد الانبیاء اور افضل المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بنیادی کیفیات کیا ہیں - پھر اس کے پس منظر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جو کارنامۂ حیات ہے، اسے صحیح طور پر ASSESS کیا جا سکتا ہے - تین باتیں آپ کے ذہن میں ہوں گی کہ ختمِ نبوّت کا ایک مظہر تو یہ ہے کہ ہدایت اپنے تکمیلی مراحل کو پہنچ گئی، الھدٰی کی صورت میں یا بالفاظِ دگر قرآن حکیم کی صورت میں آسمانی ہدایت ہمیشہ ہمیش کے لئے، ابدالآباد تک کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اور اس کی حفاظت

نوعِ انسانی کی طرف علی الاطلاق ہوئی :

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝" اور "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝"

اور ایک خطبے میں آپ نے اس کی وضاحت کی ہے ، یہ خطبہ "نہج البلاغہ" میں ہے۔ یہ خطبہ نبی علیہ السّلام کا ہے اور معلوم ہوتا ہے یہ بالکل ابتدائی دَور کے خطبات میں سے ہے۔ الفاظ یہ ہیں : "انّی لرسول اللہ الیکم خاصّۃ و الی النّاس کافّۃ !"

"لوگو ! مَیں اللہ کا ایلچی ہوں پیامبر ہوں ، رسول ہوں تمھاری طرف بالخصوص (کیونکہ مخاطب اہلِ عرب ہیں) اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم !"

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ بعثتِ خصوصی کی حد تک جو ذمّہ داریاں تھیں وہ تو نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جیسا کہ ہم پچھلی تقریر میں دیکھ چکے ہیں ، بنفسِ نفیس مکمّل کر دیں ، دونوں کام کر دیئے ، دونوں چیزیں تھیں جو دے کر بھیجے گئے — الہدیٰ — قرآن حکیم — جس کی تبلیغ پر خطبۂ حجّۃ الوداع کے دوران گواہی لے لی - چنانچہ آپؐ نے پوچھا : الا ھل بلّغت ؟ (لوگو ! کیا مَیں نے پہنچا دیا یا نہیں ؟) اور جواب لے لیا - آپ نے یہ عمل تین مرتبہ دُہرایا ، کیونکہ عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ بات کو تین بار دُہرایا کرتے تھے ، ظاہر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا ، مجمع بہت بڑا تھا - ایک دفعہ دائیں طرف رُخ کر کے بات کی ہے ، ایک دفعہ سامنے رُخ کر کے بات کی ہے ، اور ایک دفعہ بائیں طرف رُخ کر کے بات کی ہے - تو عقلاً اور منطقی طور پر بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تین مرتبہ آپ نے کہلوایا ہے : — انّا نشھد انّك قد بلّغت و ادّیت و نصحت ! (ہاں حضور ! ہم گواہ ہیں آپ نے حقِّ تبلیغ ادا کر دیا ، حقِّ نصیحت ادا کر دیا ، حقِّ خیرخواہی اور حقِّ امانت ادا کر دیا !) — آپ نے تین مرتبہ فرمایا : "اللّٰھم اشھد ، اللّٰھمّ اشھد ، اللّٰھمّ اشھد !" (کہ اے اللہ ! تو بھی گواہ رہ) — پہلی بات تو مکمّل ہو گئی - قرآن مجید میرے پاس امانت تھا ، مَیں تم تک پہنچا دیا ، اب تمھارے پاس امانت ہے ، تم اسے پوری نوعِ انسانی تک پہنچاؤ ! کس قدر جامع کلمہ ہے : "فلیبلغ الشاھد الغائب !" کہ اب جو لوگ یہاں ہیں ، وہ اُن تک پہنچائیں ، جو یہاں موجود نہیں ہیں - اس غائب میں وہ بھی آ گئے جو اس وقت کُرّۂ ارضی پر موجود تھے ، اور وہ تمام انسان بھی آ گئے جو قیامت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متصلاً قبل حضرت مسیح علیہ السّلام تشریف لائے۔ حضرت مسیح اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے درمیان تقریباً چھ صدیوں کا وقفہ ہے، اور یہ وقفہ نبوّت و رسالت کا وقفہ ہے، اسے فترۃِ اُولیٰ کہیں۔ اِن چھ صدیوں میں نبوّت کا دروازہ بند رہا ہے اور پھر ایک دفعہ کھُل کر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ اس لئے اس کو فترۃِ اُولیٰ کہتے ہیں۔ آخری فترۃ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہوئی —— اور اس سے پہلے تمہیداً چھ سو برس ایسے بھی گذرے ہیں کہ پورے کُرّہٗ ارضی پر کوئی نبی اور رسول نہیں حضرت مسیح علیہ السّلام کے بارے میں ایک مغالطہ ہو سکتا ہے، اس لئے کہ عیسائیت جیسے کہ دنیا میں آج موجود ہے، بین الاقوامی مذہب بن گیا ہے، تو اس سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ شاید حضرت مسیح علیہ السّلام کی بعثت کسی خاص قوم کی طرف نہیں تھی اس مغالطے کی اصلاح کر لیجئے۔ قرآن مجید تعیّن کے ساتھ کہتا ہے کہ "رسولاً الیٰ بنی اسرائیل" کہ حضرت مسیح علیہ السّلام رسول تھے صرف بنی اسرائیل کی طرف اور لُطف یہ ہے کہ یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں :

"مَیں بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں آیا ہوں!"

یہ الفاظ ابھی تک موجود ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السّلام نے جب اپنے حواریّین کو تبلیغ کے لئے بھیجا ہے تو اس وقت انہوں نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، بڑا پیارا خطبہ ہے، کچھ ہدایات دی ہیں، اگرچہ وہ میرے موضوع سے متعلّق نہیں ہیں، مگر مَیں نہیں چاہتا کہ آپ کو نہ سناؤں — بڑا پیارا جُملہ ہے :

"تم نے مفت پایا ہے، مفت تقسیم کرو، مَیں نے تم سے کوئی اُجرت نہیں لی، تم بھی اپنی دعوت و تبلیغ کی کسی سے اُجرت وصول نہیں کرو گے۔"

ساتھ ہی واضح طور پر ممانعت کر دی ہے، بلکہ وہاں ایک تشبیہ ہے جو ویسے تو کچھ گراں گذرتی ہے کہ کوئی شخص اپنے بچّوں کی روٹی کُتّوں کے آگے نہیں ڈالا کرتا۔ میرے پاس ایک پیغام ہے جو صرف بنی اسرائیل کے لئے ہے، لہٰذا یہ دعوت صرف اُن تک محدود ہے! یہ دراصل سینٹ پال تھا، جس نے دینِ عیسوی میں جو مسیح علیہ السّلام کا اصل دین تھا، جہاں اور تغیّر و تبدّل کیا ہے، یہ تبدیلی بھی اُسی نے پیدا کی ہے۔ ورنہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اس مقدّس گروہِ انبیاء و رسل میں پہلے اور آخری نبی و رسول ہیں کہ جن کی بعثت پوری

کا شاہکار ہے۔ اِس کی تاریخ اگر آپ پڑھنا چاہیں تو MONT GOMERY WATT کی کتاب MOHAMMAD AT MADINA پڑھئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ اس شخص نے کس قدر TRIBUTES آپ کو PAY کئے ہیں۔ اسے آپ کی دُور اندیشی اور تدبّر کا شاہکار مانا ہے۔ جاتے ہی انہیں معاہدوں میں جکڑ لیا۔ دوسری جو بات میں نے عرض کی تھی، یہ تھی کہ ۱۶ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کرکے جو نماز پڑھی گئی، اس میں بھی حکمتِ خداوندی کارفرما تھی۔ یہود یہ سمجھے کہ یہ تو ہمارے ہی پیرو ہیں، ہمارے قبلے کا اتباع کر رہے ہیں، لہٰذا فوری طور پر مخالفت اور اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لاکر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کی راہ میں مزاحم ہونا یہ نہیں ہوا، کچھ WAIT AND SEE کا سا عمل رہا ہے۔ اس میں اور پہلو بھی تھے بہرحال جب غزوۂ بدر ہوا تو دو اعتبارات سے یہود کے کان کھڑے ہوئے۔ ایک تو اس سے متصلاً قبل تحویل قبلہ ہوگیا۔ حکم ہوا کہ "فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ" ! کہ اب اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لو۔ کان کھڑے ہوئے کہ یہ تو بالکل نئی شریعت ہے، نیا قبلہ، نیا مرکز، نئی اُمّت۔ دوسرے بدر کی فتح میں ان کو بھی اب پوری طرح محسوس کرا دیا۔ کہ یہ معاملہ اب ایسا نہیں ہے جسے نظر انداز کیا جا سکے۔ تین قبیلے تھے (۱) بنو قینقاع (۲) بنو نضیر (۳) بنو قریظہ۔ ان میں سے بنو قینقاع کا پیشہ زرگری تھا، سب سے زیادہ امیر بھی تھے۔ لہٰذا اتفاقاً سب سے زیادہ بہادر قبیلہ بھی یہی تھا، اس لئے سب سے پہلے انہوں نے اقدام کیا۔ غزوۂ بدر کے فوراً بعد اُن کو جوش آیا، ایک مسلمان خاتون کی بے حرمتی کی۔ ایک مسلمان نے جوشِ حمیّت میں اس یہودی کو قتل کر دیا، یہودیوں نے اس انصاری صحابی کو شہید کر دیا۔ اب معاملہ بڑھا، جس کے نتیجہ میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فوراً اقدام فرمایا۔ پندرہ دن کا محاصرہ ہوا اور اس کے بعد ان کو وہاں سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ یہود کا پہلا قبیلہ تھا جو جنگِ بدر کے فوراً بعد چلا گیا۔

غزوۂ اُحد کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بعد صورتِ حال بڑی مخدوش ہوگئی تھی، دشمنوں کے حوصلے بلند ہوگئے تھے کہ ایسی کوئی ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ یہ بھی انسان ہی ہیں۔ اگر بدر میں ستّر مشرک مارے گئے تھے تو اُحد میں ستّر مسلمان بھی شہید ہوگئے۔ اُن کے حوصلے جو بڑھے تو بنو نضیر نے ایک نئی حرکت کی، اور وہ تھی نبی علیہ السّلام

تک پیدا ہونے والے ہیں۔ مطلب یہ کہ اب یہ امانت میرے کاندھے سے اتری اور تمھارے کاندھے پر آگئی۔

دوسرا پہلو ہے: "لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" ۔ اس اعتبار سے بھی ظاہر بات ہے کہ سارے جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کو غالب کر دینے سے بعثتِ نبویؐ کا مقصد بہ تمام و کمال پورا نہیں ہوا، جب تک کہ پورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس اعتبار سے اپنے مقصدِ بعثت کے اس بین الاقوامی PHASE کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنفسِ نفیس کیا، اور یہ ہے درحقیقت میری آج کی گفتگو کا موضوع۔ اس لئے کہ جس کام کا آغاز آپ نے فرمایا اور اس کی تکمیل ہوئی دورانِ خلافتِ راشدہ، تو خلافتِ راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا آغاز کیسے فرمایا۔ اس سے پیشتر چند منٹ لوں گا۔ پچھلی تقریر میں ایک بات رہ گئی، عرب میں جو یہود آباد تھے، اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہوا۔ غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد، غزوۂ احزاب، صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوۂ حنین، یہ چھ LAND MARKS ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اللہ کے دین کا غالب ہونا، اور اس میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ سنہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اعلان فرما دیا گیا، اُن آیات کا جو سورۂ توبہ کے آغاز میں ہیں:-

"بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...... !"

کہ مشرکین کے ساتھ اب کوئی معاہدہ نہیں ہے، صرف چار مہینے کی مہلت دی جا رہی ہے، جسے اسلام قبول کرنا ہے وہ کرلے اور جسے اپنے کفر و شرک پر اڑے رہنا ہے وہ جہاں سینگ سمائیں چلا جائے۔ اُس کے لئے جزیرہ نمائے عرب میں کوئی گنجائش نہیں ہے کھلا اعلان ہے کہ:

"فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ !"

کہ جب یہ محترم مہینے ختم ہو جائیں تو اے مسلمانو! قتل کرو ان مشرکوں کو، جہاں پاؤ۔ یہ معاملہ تھا بنی اسمٰعیل کے لئے، یا اہلِ عرب کے لئے، یہود کے معاملے میں ایک نرمی برتی گئی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے ذرا آپ پہلے پوری تاریخ کو ذہن میں لائیے۔ مدینہ منوّرہ میں تشریف لاتے ہی آپ نے یہود سے معاہدے کئے۔ یہ مَیں ذکر کر چکا ہوں کہ یہ آپ کے تدبّر

IMPLIED تھا کہ ملک چھوڑ کر چلے جاؤ، تو چلے جاؤ، ملک میں رہ نہیں سکتے۔ لیکن یہود کو یہ رعایت دی گئی کہ اسلام کو قبول کرلو تو ہمارے بھائی، برابر کے حقدار۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو وہ چھوٹے بن کر رہیں اور جزیہ دیں تو وہ ذمی کی حیثیت سے اسلامی مملکت میں رہ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے، وہ جو میری دو تقریریں تھیں، اُن میں اس کا جواب بھی ہے۔ جس قوم کی طرف نبی کی براہِ راست بعثت ہوتی ہے، جس میں وہ نبی ہوتا ہے، جس کی زبان بولتا ہوا وہ آتا ہے، اُس قوم کو پھر کوئی رعایت نہیں دی جاتی۔ دوسری قوم کے لئے کوئی رعایت ہو سکتی ہے کہ اس کے اور ان کے درمیان کوئی حجاب طاری ہو سکتا ہے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بفحوائے آیتِ قرآنی:

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ !"

انہی میں سے تھے۔ لہٰذا اہلِ عرب پر تو اتمامِ حجت بتمام و کمال ہو گیا۔ اُن کے لئے اب کوئی رعایت نہیں، کوئی CONCESSION نہیں، اُن کو دو ٹوک فیصلہ کرنا ہوگا یا اسلام قبول کریں، یا ملک چھوڑ کر چلے جائیں، ورنہ ان کو قتل کر دیا جائے گا۔ البتہ یہ ہے کہ یہود کے ساتھ جو رعایت برتی گئی، اُس پر قیاس کرتے ہوئے، بعد میں دنیا کی تمام اقوام ہیں، اُن کے ساتھ معاملہ اسی قاعدے کے تحت ہوگا۔ چنانچہ تاریخ اسلام کی یہ ایک بڑی نمایاں بات ہے کہ خلافت راشدہ کے دوران جب مسلمان نکلے ہیں تو ان کی طرف سے ہمیشہ تین باتیں پیش کی گئیں۔

(i) اسلام لے آؤ تو ہمارے بھائی ہو اور تمہارے جان و مال اتنے ہی محترم ہوں گے، جتنے کسی مسلمان کے ہوئے ہیں۔

(ii) اگر اسلام نہیں لاتے تو جزیہ دو اور چھوٹے ہو کر رہو، اس لئے کہ فاسد اور ظالمانہ نظام انسان کو اپنے اندر جکڑ لیتا ہے، اور وہ حجاب اور پردہ بن جاتا ہے اللہ اور بندے کے مابین۔ لہٰذا اس غلط نظام کو ختم SHATTER کر دیا جائے گا۔ فرد کو کبھی مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ اپنا مذہب ترک کرے اور اسلام قبول کرے، اس کو پوری آزادی ہے۔ لیکن نظامِ اجتماعی اللہ کے دین کے سوا گوارا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کے خلاف ہو جائے گا!

کو قتل کرنے کی سازش۔ ان کی یہی حرکت اُن کی جلاوطنی کی تمہید بن گئی۔

تیسرا قبیلہ رہ گیا بنو قریظہ کا، اُن کے ساتھ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بڑی نرمی برتی۔ انصار کے ساتھ ان کے بڑے اچھے تعلّقات تھے۔ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ اُن کے گہرے مراسم تھے۔ لیکن غزوۂ خندق کے موقع پر انہوں نے بدعہدی کی۔ وہ تو یوں کہئے کہ حکمتِ خداوندی یا مشیّتِ ایزدی کا فیصلہ ہی کچھ اور تھا، ورنہ SITUATION بڑی خطرناک بن چکی تھی۔ بارہ ہزار کا لشکر سامنے اور بنو قریظہ نے صاف کہہ دیا کہ ہمارے اور محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کے درمیان کوئی عہد نہیں۔ حضرت سعد بن معاذ رضؓ جو اُن کے حلیف اور ان سے قریبی تعلّق رکھنے والے تھے، وہی حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے گئے تھے، وہ واپس آئے تو حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجمعِ عام میں نہ کہنا۔ ایسا نہ ہو مسلمانوں کی ہمّتیں پست ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اشارے کنائے میں بتا دیا کہ انہوں نے بدعہدی کی ہے۔ لہٰذا غزوۂ اُحد کے بعد غزوۂ بنو قریظہ ہوا اور بنو قریظہ کو اُن کی بدعہدی کی سزا دی گئی۔ ان کے جتنے قابلِ جنگ مرد تھے، ان کو قتل کر دیا گیا اور باقی کو جلاوطن کر دیا گیا۔ مدینے سے یہودیوں کا استیصال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کا مرکز بنا خیبر، جو پہلے سے بھی اُن کا بہت بڑا مرکز اور گڑھ تھا۔ یہ جو قبیلے وہاں پہنچے تو اُن کی ایک جمعیت بن گئی اور وہ لگے اس مرکز سے مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے، ان ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے اور ان کا مرکز توڑنے کے لئے ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں حضورؐ نے خیبر پر حملہ کیا اور اسے ختم کر دیا۔ اس طرح اندرونِ ملک۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک ایک طرف مشرکین کے استیصال سے شرک کی مکمّل بیخ کنی ہو گئی اور دوسری طرف یہودیوں کی طاقت بھی ختم ہو گئی۔ البتّہ ان کے ساتھ رعایت یہ برتی گئی کہ:

حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ○

"کہ اگر یہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں تو ان کو قتل نہیں کیا جائے گا۔"

یہ بات ذرا سمجھنے کی ہے کہ یہ رعایت اہلِ عرب کو نہیں دی گئی۔ ان کے دو ہی ALTER NATIVES تھے یا اسلام قبول کرو یا قتل کر دیئے جاؤ گے تیسرا

سمجھتا تھا۔ عربوں کی اس وقت سرے سے کوئی حیثیت تھی ہی نہیں۔ اس وقت دو عظیم طاقتیں SUPER POWERS تھیں۔ ایک سلطنتِ رُوما اور دوسری سلطنتِ کسریٰ۔ عرب کے تمام زرخیز علاقے ان کے پاس تھے۔ عراق عرب پر جو بہت زرخیز ہے، ایرانیوں کا تسلّط تھا اور شام عرب پر رومیوں کا تسلّط تھا۔ باقی درمیان میں "الربع الخالی" رہ گیا۔ وہ یا تو لق و دق صحرا ہے یا حجاز کا پہاڑی علاقہ ہے۔ یمن جو زرخیز علاقہ تھا اس پر ایران کا قبضہ تھا اور عرب کی حیثیت صرف آزاد قبائل کی سی تھی کہ ہمیشہ حکومتیں ان کے ساتھ زیادہ تعرّض نہیں کیا کرتیں۔ البتّہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ قبائل ہمارے زیرِ اثر ہیں۔ چنانچہ کسریٰ کے ذہن میں بھی تھا کہ یہ تو میری رعیّت میں سے ہے۔ اس کی یہ گستاخی کہ مجھے خط لکھا۔ ؟ عرب کے قاعدے کے مطابق پہلے حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کا نام تھا اور بعد میں شاہِ کسریٰ کا: "من محمّد رسول اللّٰہ اِلیٰ کسریٰ عظیم فارس !" اس پر وہ اس قدر طیش میں آیا کہ خط پھاڑ دیا، اور یمن کے حاکم کے نام ایک حکم بھیجا۔ (اس حاکم کا نام باذان تھا) کہ یہ (معاذ اللّٰہ) پاگل انسان کون ہے؟ اس کو فوراً گرفتار کر کے ہمارے ہاں پیش کرو۔ اس نے دو آدمی روانہ کئے جو آپ کی خدمت میں پہنچے اور کہا کہ بادشاہوں کے بادشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے۔ اس پر حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جاؤ اور اس کو بتا دو کہ اسلامی حکومت اس کے دارالحکومت تک پہنچ جائے گی، اور ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ آپؐ نے رات ان ایلچیوں کو ٹھہرایا اور صبح خبر دے دی کہ جاؤ تمہارا بادشاہ مر چکا ہے، اس لئے کہ اس رات وہ قتل کر دیا گیا تھا، اور وہ خسرو پرویز کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ یہ معاملہ تو ہُوا اُن کے ساتھ۔

قیصرِ رُوم کے دربار میں حضرت دحیہ کلبیؓ گئے۔ یہ وہ صحابی ہیں جو انتہائی خوبرو اور خوش شکل تھے، اور اُن کا ذکر خاص طور پر اس پہلو سے آتا ہے کہ حضرت جبریل ؑ آپ کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے تو حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں آتے تھے۔ اگرچہ وقت لگے گا، لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ یہ جو دو عظیم سلطنتیں تھیں ان کا معاملہ یہ تھا کہ کبھی سلطنتِ رُوما کا پلڑا بھاری ہوتا تھا اور کبھی کسریٰ کو پسپائی اختیار کرنا پڑتی تھی، اور کبھی ایرانی آگے بڑھتے تھے اور رومی پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ اب صورت

(iii) اور اگر یہ دونوں باتیں منظور نہیں ہیں تو تلوار ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گی۔

اب آگے چلیئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے بین الاقوامی مرحلے INTER NATIONAL PHASE کا آغاز کس طرح کیا۔ حکمت تبلیغ کے اعتبار سے سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیئے اور یہ بہت اہم بات ہے کہ یہ ناممکن تھا کہ جیسے ہی حضورؐ نے مکہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ اسی وقت آپ قیصر کو، کسریٰ کو، مقوقس کو، نجاشی کو، خطوط بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن یہاں تدریج دیکھیئے کہ جب جزیرہ نمائے عرب میں آپ نے اپنے قدم مضبوطی سے جما نہیں لیئے اور صلح حدیبیہ نہیں ہو گئی، آپ نے اس کام کا آغاز نہیں کیا۔ صلح حدیبیہ درحقیقت اس بات کی علامت ہے کہ اب قریش نے حضورؐ کو تسلیم کر لیا، چاہے آپؐ نے بظاہر دب کر صلح کی۔ اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اکثر صحابہؓ حتیٰ کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ میں پیچ و تاب کی کیفیت تھی۔ لیکن اصل بات کہ: إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا ط اس اعتبار سے تھی کہ قریش نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا کہ اب آپ کی ایسی حیثیت ہے کہ ہم آپ سے مصالحت کر لیں۔ چنانچہ یہ موقع ہے کہ اندرون ملک آپ کے مشن کی تکمیل کا مرحلہ قریب آگیا ہے۔ اب آپ نے خطوط کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ہے حکمتِ تبلیغ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ تیرہ برس تک حضورؐ نے اپنی تمام تر توجہ مکہ کی سرزمین پر مرکوز رکھی ہے۔ سنہ ۱۰ نبوی میں آپ نے طائف کا سفر کیا ہے۔ گویا کہ جب تک اہلِ مکہ نے آپؐ کو قتل کرنے کا فیصلہ نہ کر لیا تھا، اُس وقت تک آپؐ نے مکہ سے قدم بھی باہر نہ رکھا۔ اور اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے مدینہ میں تمکن عطا فرمایا تو پورے چھ برس مدینہ میں جدوجہد ہوتی رہی ہے اور جب صلح حدیبیہ کے بعد آپؐ کی طاقت کو تسلیم کر لیا گیا تو اب آپؐ کے نامہ ہائے مبارک مختلف بادشاہوں اور رؤسا کو گئے ہیں۔

آپؐ کے دعوتی خطوط اور دعوت نامے قیصرِ روم و کسریٰ (عظیم فارس) مقوقس (شاہِ مصر) نجاشی (شاہ حبش) رؤسائے یمن، حارث غسّانی (رئیسِ شام) اور آس پاس کے تمام حکمرانوں اور سلاطین کی طرف گئے ہیں۔ کسریٰ کی بدبختی کہ حضرت عبداللہ بن حذافہ خط لے کر گئے، کسریٰ طیش میں آگیا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ وہ عربوں کو اپنی رعیت

کے ساتھ دربار منعقد ہوا۔ اپنے تمام نائبین سلطنت بلالئے، وہ بھی اس اعتبار سے بڑا عجیب ہے کہ اس نے بھرے دربار میں چاہا کہ حق واضح ہو جائے۔ سوالات تھے' یہ کون صاحب ہیں؟ ان کا خاندان کیسا ہے؟ ان کے ہاں کبھی بادشاہت تو نہیں تھی؟ ان تمام باتوں کا جواب حضرت ابوسفیان نے دیا۔ ایک بڑا عجیب قول ان کے متعلق ہے کہ میں قدم قدم پر چاہتا تھا کہ جھوٹ بولوں (اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہرقل ان سے سچ پوچھوا رہا ہے۔ ہرقل کی جرح ایک بڑے ماہر کی جرح تھی، اور وہ ہر وہ بات اگلوا رہا تھا جس سے ثابت ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر میں نے جھوٹ بولا تو یہ عرب جو اُن کے ساتھ تھے کیا کہیں گے کہ اتنا بڑا سردار جھوٹ بول رہا ہے، لہٰذا میں جھوٹ نہ بول سکا۔ ہرقل نے یہ سوال بھی کیا کہ کہیں اُن کے خاندان میں بادشاہت تو نہیں رہی؟ نہ اس کھوئی ہوئی بادشاہت کو حاصل کرنے کے لئے یہ مذہبی سٹنٹ کھڑا کیا ہوا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کے متعلق جب اس نے سوال کیا تو ابوسفیان نے جواب دیا کہ انہوں نے آج تک کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ ایک سوال اس نے یہ بھی کیا کہ اس کے پیروکاروں میں اکثریت غرباء کی ہے یا امراء کی؟ جواب ملا غُرباء کی! پھر کہا جو شخص اُن پر ایمان لے آتا ہے، کبھی واپس بھی پھرتا ہے؟ جواب ملا آج تک کوئی واپس نہیں پھرا۔ حضرت ابوسفیان سچ بولنے پر مجبور ہیں اور اس کے تمام نائبین یہ مکالمہ سُن رہے ہیں۔

جب اہل دربار پر یہ بات واضح ہو گئی کہ ہرقل مسلمان ہوا چاہتا ہے، تو اب دربار میں شور برپا ہو گیا اور پادریوں کے نتھنوں میں سے مارے غصّے کے شُوں شُوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ یہ چیز ہرقل کے پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ اُس کو اپنی حکومت زیادہ عزیز تھی۔ اس نے پادریوں سے کہا کہ میں تو تمہارے ایمان کی آزمائش کے لئے یہ مکالمہ کر رہا تھا کہ تم لوگوں میں ایمان موجود ہے بھی یا نہیں۔ اس طرح ہرقل محروم رہ گیا اور ایمان نہ لاسکا۔

مقوقس شاہِ مصر کی طرف حضرت حاطب ابن ابی بلتعہؓ گئے۔ وہ بھی عیسائی تھا اور حضورؐ کو پہچان گیا۔ اگرچہ ایمان وہ بھی نہیں لایا لیکن اس نے حضرت حاطب کے ساتھ

حاشی کہ رومی تو عیسائی (اہل کتاب) تھے اور ایرانی آتش پرست۔ اور مکی دور میں سمجھا جاتا تھا کہ مسلمانوں کی ہمدردیاں رومیوں یعنی نصاریٰ (عیسائیوں) کے ساتھ ہیں، اور ایرانی، مشرکین مکہ سے قریب تر ہیں اور ہوا یہ کہ اُس زمانہ میں ہرقل کو قیصرِ روم تھا، ایرانیوں کے ہاتھوں ایک بڑی شرمناک شکست ہوئی اور اس کا نتیجہ نکلا کہ مشرکوں نے گھی کے چراغ جلائے اور بغلیں بجائیں کہ دیکھو مسلمانو! تمہارے اہل کتاب پسپا ہو گئے اس پر مسلمانوں کے دل بجھ گئے۔ سورۂ روم کی ابتدائی آیات اسی موضوع پر ہیں:

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۝

اور اس میں یہ خوشخبری بھی سنادی گئی کہ وہ مغلوب ہونے کے بعد پھر غالب ہو جائیں گے اور یہ صرف چند سالوں میں ہوگا۔ یہ ایک پیش گوئی تھی جو صحیح ثابت ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس مدت پر ایک مشرک سے شرط کرلی اور اس میں مدت کم معین کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا بِضْع کا لفظ دس سے کم کے لئے آتا ہے۔ لہٰذا ۹ سال کی شرط رکھو۔ ٹھیک ۹ سال بعد یہ واقعہ ہوا کہ اِدھر مسلمانوں کو معرکۂ بدر میں فتح ہوئی اور اُدھر قیصرِ روم کو فتح ہوئی، اور اہلِ ایمان کے لئے یہ دو طرفہ خوشی تھی۔ تو اس پس منظر کو ذہن میں رکھئے۔ اس وقت بڑا جشن منایا جا رہا تھا اور ہرقل خود پیادہ چل کر آیا تھا، بیت المقدس میں شکرانہ ادا کرنے کے لئے یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں حضرت دحیہ کلبیؓ حضور اکرمؐ کا خط لے کر پہنچے۔ حارث غسانی نے یہ خط قیصر کے پاس پہنچا دیا۔ اُس نے خط پڑھا، بات سمجھ میں آگئی، عیسائی تو اس بات کے منتظر تھے اور وہ بڑا عالم تھا۔ اس لئے اس کو بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی، لیکن اس نے کوشش یہ کی کہ جس طرح کسی رومن ایمپائر نے مجموعی حیثیت سے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ اسی طرح اب پوری سلطنتِ روما اسلام کو قبول کرلے اور میرا اقتدار برقرار رہے۔ اس نے اپنے سرکردہ لوگوں سے یہ معلوم کروایا کہ دیکھو کوئی عرب تو نہیں آئے ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت ابوسفیان جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، ایک تجارتی قافلے کے ساتھ وہاں ٹھہرے ہوئے تھے، ان کو طلب کیا گیا اور پوری شان و شوکت

دُنیوی اعتبار سے اُس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ وہ وقت تھا کہ اہلِ ایمان کے ایمان کی پوری آزمائش ہو گئی۔ منافقین اب کیا کریں، اُن کے لئے تو معاملہ یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں اپنا نام شامل رکھوانا چاہتے ہیں تو نکلنا پڑتا ہے اور اگر مرتد ہوں تو ویسے قتل کئے جائیں۔ اگر نکلتے ہیں تو صاف نظر آرہا ہے کہ موت کے منہ میں جارہے ہیں۔ وہ کبھی بڑے ہی ناصحانہ انداز میں کہتے تھے: "لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ!" (اس سخت گرمی میں نہ نکلو!)۔ اُن کے مقابلے میں مسلمانوں سے جواب دلوایا کہ: قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ (اے نبی! کہہ دیجئے کہ جہنّم کی آگ اس سے کہیں زیادہ سخت گرم ہے!)۔ اب خود دیکھ لو، یا یہ گرمی لے لو یا وہ (جہنّم کی)۔ کسی نے کہا: غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ان لوگوں کی تو مت ماری گئی، یہ لوگ تو موت کے منہ میں جارہے ہیں — جواب دلوایا گیا:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَیَیْنِ ؕ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ یُّصِیْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَیْدِیْنَا۔

(کہو تم ہمارے متعلق دو بھلائیوں میں کسی ایک کے منتظر ہو سکتے ہو، جبکہ ہم تمہارے متعلق اِس امر کے منتظر ہیں کہ اللّٰہ تعالیٰ یا تمہیں اپنے کسی عذاب میں مبتلا کرے یا ہمارے ہاتھوں سزا دے!")

گویا کہ ہمارے تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔ اگر ہم سب شہید ہو جائیں تو بہت بڑی کامیابی اور اگر کامیاب ہو کر لوٹ آئے تو تم بھی مانوگے کہ کامیاب ہیں۔ ہمارے لئے تو ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں۔

بہر حال حضورِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم تیس ہزار کا لشکر لے کر نکلے۔ منزل منزل کرتے ہوئے شام اور عرب کی سرحد (تبوک) تک پہنچ گئے۔ ہرقل ۵، ٦ لاکھ کی فوج کے ساتھ موجود ہے، لیکن مقابلے میں نہیں آیا، یہ بڑا عقدہ ہے کہ کیا وجہ ہوئی کہ ہرقل مقابلے میں نہیں آیا۔ بات صاف ہے کہ ہرقل پہچان گیا تھا کہ یہ اللّٰہ کے رسول ہیں۔ علمائے یہود یا علمائے نصاریٰ تو حضور صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کو اس طرح پہچانتے تھے جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے: "یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ!" غزوۂ موتہ میں بھی وہ پیچھے ہی رہا اور خود دیکھتا رہا کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے، اور اب

بڑے اکرام و تعظیم کا معاملہ کیا اور حضورؐ کی خدمت میں دو لڑکیاں بطورِ تحفہ ارسال کیں حضرت ماریہ قبطیہ اور حضرت شیریں، دونوں ایمان لے آئیں۔ حضرت ماریہ قبطیہ کے بطن سے حضرت ابراہیم تولّد ہوئے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گھوڑا دُلدُل بھی مقوقس ہی کا بھیجا ہوا تھا۔

حضرت نجاشی ایمان لا ہی چکے تھے لیکن ایک معاملہ ہوا جس نے تاریخ کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ شرجبیل بن عمرو جو رؤسائے شام میں سے تھا، اُس کے پاس حضورؐ کے ایلچی حضرت حارث بن عمیرؓ گئے۔ اُس نے طیش میں آکر اُن کو شہید کر دیا۔ سفیر کا قتل ہمیشہ سے ایک بہت بڑا جرم ہے اور اسے اقدامِ جنگ تصوّر کیا جاتا ہے۔ یہ بات سلطنتِ رُوما سے مسلح تصادم کی تمہید بن گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہزار کا لشکر تیار کیا۔ حضرت زید بن حارثہ رضؓ کو اس کا علم دیا اور فرمایا کہ اگر یہ شہید ہو جائیں تو حضرت عبداللہ بن رواحہ انصاری علم سنبھال لیں۔ اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو حضرت جعفر طیّارؓ علم سنبھال لیں۔ اگرچہ لشکر میں بڑے بڑے صحابہؓ موجود تھے، لیکن حضورؐ نے سپہ سالار بنایا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام یہ ساری اونچ نیچ ختم کر چکا ہے۔ قریش کی قرشیت اور ایک آزاد کردہ غلام کے مابین اسلام کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ اس تین ہزار کے لشکر کے سامنے شرجبیل بن عمرو ایک لاکھ کی فوج لے کر آگیا۔ دنیوی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ گویا ایسے ہی ہے جیسے ہماری (پاکستان کی) جنگ روس یا امریکہ سے چھڑ جائے۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایک لاکھ کا لشکر آرہا ہے، تو انہوں نے مجلسِ شوریٰ منعقد کی کہ اب کیا کیا جائے۔ اتنے بڑے لشکر کا مقابلہ کوئی دانشمندی نظر نہیں آتی۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فرمایا کہ ہمارا مقصد تو شہادت ہے۔ اس سے بلند اور مقصد کیا ہو گا۔ جنگ کا فیصلہ ہو گیا، حضرت زید بن حارثہ رضؓ شہید ہوئے، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ شہید ہوئے، حضرت جعفر طیّارؓ شہید ہوئے۔ حضرت جعفر شہید کے ساتھ عجیب معاملہ ہوا، اُن کے جسم پر ۸۰ زخم تھے اور ان میں سے کوئی پیٹھ پر نہ تھا۔ ایک ہاتھ کٹ گیا تو دوسرے میں عَلَم سنبھال لیا جب دوسرا بھی کٹ گیا تو دونوں کٹے ہوئے ہاتھوں سے عَلَم اپنے سینے سے لگالیا۔ آخرکار

ورِ صلّی اللہ علیہ وسلّم بنفسِ نفیس آ گئے تھے۔ وہ پاگل نہیں تھا کہ مقابلہ کرتا۔ حضورؐ
ں میں بیس دن تک مقیم رہے۔ وہ اس سے باخبر تھا کہ چاہے چھری خربوزے پر پڑے یا
بزہ چھری پر بات ایک ہی ہو گی، لہٰذا وہ طرح دے گیا اور مقابلہ میں نہ آیا۔ حضورِ اکرم
بھی اس سے آمدِ اقدام نہیں فرمایا۔

غزوۂ موتہ کے واقعے سے اگر لوگوں کے حوصلے پست ہوئے تھے یا لشکرِ روما کی
وئی دھاک بیٹھ گئی تھی تو اس کا حضورؐ نے مداوا فرما دیا۔ حضورؐ بیس دن تک مقیم رہے
ں پاس کے رؤسا آتے رہے، کسی نے اسلام قبول کر لیا اور کسی نے اطاعت قبول
رلی۔ اس طرح حضورؐ پورے علاقے پر دھاک قائم کر کے واپس تشریف لے آئے
— ذہن میں رکھئے کہ اس کے بعد جب آپؐ کا انتقال ہوا ہے، تو جیشِ اسامہؓ
یار تھا، یہ تھا سلطنتِ روما سے ٹکراؤ کا معاملہ۔ سلطنتِ روما کے ساتھ اس کا آغاز
لافتِ راشدہ میں نہیں ہوا۔ اس پورے عمل کا آغاز محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ
آلہٖ وسلّم نے بنفسِ نفیس کیا ہے۔ تبوک کے بعد جیشِ اسامہ تیار تھا اور حضرت
زیدؓ کے بیٹے اُسامہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ یہ جیش صرف اس وجہ سے رکا رہا
کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم مرض الموت میں مبتلا تھے۔ یہ ہے دراصل اس عمل
کا نقطۂ آغاز جو بعد میں دورانِ خلافتِ راشدہ اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

اِس بات کو ذہن میں رکھئے کہ خلافتِ راشدہ درحقیقت خلافت علیٰ منہاج
النّبوۃ ہے۔ میں بہت سی باتیں چھوڑے جا رہا ہوں ان پر۔ اِن شاء اللہ مفصّل گفتگو
ہو گی۔ اور میں کل اس کے بعض انتہائی اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا۔ تاریخ کے
بارے میں جو مغالطے ان لوگوں کے دلوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، جو اپنے آپ کو اہلِ سنّت
کہتے ہیں اُن کا ازالہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ورنہ خلافتِ راشدہ سے تو سخت بدظنی
موجود ہے۔ عام نوجوان یہ کہتا ہوا ملے گا کہ خلافتِ راشدہ میں کیا رکھا تھا، سارا
زمانہ باہمی خانہ جنگی کی نذر ہو گیا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر خلافتِ راشدہ کی نفی
ہو جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے پورے کارنامے کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ
اصل حجّت تو یہ ہے کہ ایک اجتماعی نظام کو چلا کر دکھا دیا جائے، اور یہ تقاضا اگر بتمام و
کمال پورا ہوا ہے تو وہ دورانِ خلافتِ راشدہ پورا ہوا ہے۔ اس لئے کہ حضورِ اکرم کی

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاملہ سنبھالا جو "سیف من سیوف اللہ" ہیں۔ اور وہ بڑی حکمت عملی سے لشکر کو بچا کر واپس لے آئے۔ یہاں مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ عورتیں باہر نکل آئیں اور خاک ڈالی گئی کہ تم اللہ کے راستے میں پیٹھ دکھا کر آئے ہو۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، انہوں نے درست کیا۔ سورۂ انفال میں یہ چیز موجود ہے کہ اگر حکمتِ عملی کی وجہ سے پیچھے ہٹنا پڑے تو جائز ہے بشرطیکہ جان بچانا مقصود نہ ہو۔

گویا کہ اس مرحلے کے بعد اب سلطنتِ روما کے ساتھ ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیاری شروع کی، اور ۹ھ میں نفیرِ عام کا حکم دے دیا کہ ہر وہ مسلمان جو جنگ کے قابل ہے اٹھ کھڑا ہو۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ ہر ایک کے لئے نکلنا لازم ہو۔ ترغیب و تشویق ہوتی تھی کہ اللہ کی راہ میں نکلو۔

۱۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا ۔ (نکلو ہلکے ہو یا بھاری)

۲۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۝

اے اہلِ ایمان! تمہیں کیا ہو ا کہ جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو زمین کا بوجھ بن جاتے ہو۔ کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دُنیوی زندگی کو پسند کر لیا ہے۔ آخرت کے مقابلے میں دُنیوی زندگی معمولی متاع سے زیادہ نہیں

اب آپ اندازہ کر لیں کہ امتحان کس قدر کٹھن تھا۔ مدنی دور میں مسلمانوں کے لئے ایک تو غزوۂ احزاب کا وقت اور دوسرے غزوۂ تبوک کا مرحلہ عظیم ترین آزمائش کے مراحل تھے۔ سخت گرمی کا موسم تھا اور قحط کا عالم تھا، کھجور کی فصل تیار تھی۔ نکل جاتے ہیں تو فصل اٹھانے والا کوئی نہیں ہو گا، اور فصل تباہ ہو جائے گی، لگ بھگ سات سو میل کا سفر طے کرنا ہے، ہر ایک کے پاس سواری موجود نہیں ہے، پھر یہ ٹکراؤ ہے سلطنتِ روما کے ساتھ۔ اب تک تو معاملہ ایک اور تین کا تھا۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں یہی تناسب تھا۔ غزوۂ خندق میں ایک اور دس کا تھا، لیکن یہاں تو کوئی نسبت ہی نہیں حضورؐ کا مقابلہ سلطنت رُوما سے ہے۔ اُن کے پاس لاکھوں کی تربیت یافتہ فوج ہے اور یہاں

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نماز پڑھا رہے تھے، حضور بیمار تھے۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو آپ حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رض نے پیچھے ہٹنا چاہا لیکن آپ نے اشارے سے منع فرمایا، اور خود حضرت ابوبکر رض کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اب یہ معاملہ ہے کہ حضور کو دیکھ کر حضرت ابوبکر رض رکوع و سجود کر رہے ہیں اور ابوبکر رض کو دیکھ کر ساری جماعت نماز پڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد آپ نے خطبہ دیا جس کے الفاظ یوں ہیں کہ: "اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ چاہے تو دنیا میں رہے اور اس کی نعمتوں میں سے حصہ پائے، اور چاہے تو اللہ کے پاس آ جائے۔ اللہ کے بندے نے دوسری بات قبول کر لی!" ___ حضرت ابوبکر رض رو پڑے، کیونکہ وہ مزاج شناسِ رسول تھے، اس لئے بات کو سمجھ گئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ کا جو آخری وقت ہے اُس میں ایک تو یہ الفاظ بار بار زبان پہ آئے:

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ان انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ جن کو اللہ تعالیٰ نے انعامات سے نوازا ___ اور آخری وقت کے جو الفاظ مروی ہیں وہ یہ ہیں:

اللّٰھم فی الرفیق الاعلیٰ ___ اللّٰھم فی الرفیق الاعلیٰ

میں نے کبھی اس سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اگر میدانِ حشر میں کہیں موقع ملا تو حضور سے شکوہ کریں گے کہ آپ نے اس سلسلہ میں محبتِ خداوندی کے جذبے کے غلبے کی وجہ سے جلدی کی۔ ابھی یہاں بڑی ضرورت تھی کہ انقلاب کا استحکام ہوتا اور تربیت ہوتی اور ان نئے قبیلوں کو کسوٹی پہ پرکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد "يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کی بجائے: يَخْرُجُوْنَ مِنْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا معاملہ ہوگیا اور لاکھوں لوگ مرتد ہو گئے۔ ارتداد کا فتنہ کوئی فتنہ سا فتنہ تھا۔ نئے نبیوں کا دعویٔ نبوت شروع ہو گیا۔ مسیلمہ کذاب کے ساتھ جو جنگ ہوئی ہے وہ بہت بڑی جنگ تھی۔ مانعینِ زکوٰۃ کا معاملہ تھا کہ نماز پڑھوا لو لیکن زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق کی سیرتِ مبارکہ کا وہ پہلو سامنے آتا ہے۔ اس نحیف الجثہ شخصیت

اپنی حیاتِ طیبہ میں تو یوں کہئے کہ انقلاب کی تکمیل ہوئی۔ ابھی اس کی برکات کا ظہور تو پورے طور پر نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ انقلاب کے بعد اس کو مستحکم (CONSOLIDATE) کیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی برکات کا ظہور ہوتا ہے یہ اللہ کی مشیّت تھی اور سب سے بڑھ کر حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اختیار (یہاں اختیار قبول کرنے کے معنی میں ہے!) تھا، کہ آپؐ نے اس دُنیا میں مزید قیام کرنا گوارا نہ کیا ورنہ جی چاہتا ہے کہ حضورؐ اپنے انقلاب کی تکمیل کے بعد کچھ اور عرصہ اس دُنیا میں مقیم رہتے تاکہ جو لوگ ایک کثیر تعداد میں ایمان لائے تھے، اور جن کے بارے میں قرآن مجید میں ہے "وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا!" اُن کی تربیت ہو سکتی اور اس کے لئے وقت درکار تھا کہ آپ ان لوگوں کی بذاتِ خود تربیت فرماتے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہر وہ لمحہ جو اس دُنیا میں بیت رہا تھا وہ آپ پر انتہائی شاق تھا۔ بس فرضِ منصبی کی تکمیل ہوئی، لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ کا فریضہ مکمّل ہوا، اُدھر اللہ کی طرف سے اس کی شہادت بھی آگئی کہ:

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"

اور اِدھر حضورؐ نے بندوں سے بھی شہادت لے لی کہ:

"انا نشهد انك قد بلغت و اديت و نصحت!"

اور حضورؐ نے "اَللّٰهُمَّ فِي الرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى!" کہہ کر اس دنیا سے رخصت کی درخواست کر دی۔

ویسے تو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اس حیاتِ دُنیوی کے دوران میں بھی اللہ سے کون سا بُعد تھا۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

"لِيْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِيْ فِيْهِ نَبِيٌّ مُّكَرَّمٌ وَلَا مَلَكٌ مُّقَرَّبٌ!"

کہ میرا اللہ کے ساتھ ایک خاص وقت بھی ہوتا ہے۔ یہ معیّت اور قرب بتمام وکمال حاصل تھا پھر بھی ایک حجاب اور پردہ تو موجود ہے۔ آپ اب اور زیادہ وقت کے لئے دنیا میں رہنے کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے بعد کل ۸۰، ۸۲ دن ہیں، جو آپ کے اس حیاتِ دنیوی میں گذرے، اور جب مرض الموت کے دوران آپؐ نے خطبہ دیا، حضر

کہ آپؐ کی وفات کے بعد مذکورہ جملہ کہہ سکتے۔ یہ جملہ وہی کہہ سکتا ہے جس کے رُوئیں رُوئیں میں توحیدِ خداوندی رچ بس گئی ہو۔ کہ "جو محمدؐ کو پوجتا تھا وہ سُن لے کہ محمدؐ کا انتقال ہوگیا ہے لیکن جو خدا کا پجاری تھا اور اللہ کی عبادت کرتا تھا، اس کو مطمئن رہنا چاہیئے کہ اس کو موت نہیں آئے گی، وہ الحیّ ہے اور لا یموت ہے!" اس کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ آیت پڑھی:

مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ۔

"اور نہیں محمدؐ مگر پیغمبر جن سے پہلے بہت سے پیغمبر گذر چکے ہیں۔ کیا اگر وہ فوت ہو جائیں مارے جائیں تو تم پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے، اور جو بھی پچھلے پاؤں لوٹے گا اللہ کو کچھ ضرر نہ پہنچائے گا۔!"

اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلوار نیام میں چلی گئی۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ آیت اسی وقت نازل ہوئی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی، اور میں وقت کی کمی کی وجہ سے اس تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ بات سمجھ لیجئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے اس قدر شواہد موجود ہیں کہ جب تک کوئی شخص ڈھٹائی، ضد اور تعصب کی پٹی اپنی آنکھوں پر نہ باندھ لے وہ ابوبکرؓ کی خلافت کا انکار نہیں کر سکتا۔

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زندگی میں امامت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمائی، اور ذہن میں رکھیئے گا کہ اس امامت کو آج کی امامت پر قیاس نہ کیجئے گا۔ وہ ہماری امامت نہ تھی کہ جس کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم کہہ گئے ہیں ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے ✧ اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

وہ دو رکعت کی امامت نہ تھی، وہاں دین و دُنیا کی وحدت تھی۔ مسجدِ نبوی کے امام مُحمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ہیں۔ اپنی حیاتِ طیبہ کے دوران کے بعد خلیفۂ رسول ہی امام ہوئے۔ مسجدِ نبویؐ کے صحن میں تمام حجرے کے بند کروا دیئے گئے، سوائے حضو

کے پردے میں کسی چٹان جیسی مضبوط اور پہاڑ جیسی بلند شخصیت موجود تھی۔ شاید حکمتِ خداوندی میں حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کا اظہار مقصود تھا کہ فتنۂ مانعین زکوٰۃ کھڑا ہو گیا۔ ورنہ شاید دُنیا کو معلوم نہ ہوتا کہ ابوبکرؓ کی رقیق القلب شخصیت کے اندر کیسا فولادی انسان پنہاں ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ REVOLUTION کے بعد COUNT-ER REVOLUTION ضرور ہوتی ہے اور REACTIONARY عناصر اُبھرتے ہیں۔ مخالف قوتیں جب دیکھتی ہیں کہ اب ہم اس انقلاب کا راستہ نہیں روک سکتے تو وہ دبک جایا کرتی ہیں اور اپنے اوپر اس انقلاب کا لبادہ اوڑھ لیتی ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ موقع کی تاک میں رہتی ہیں کہ جب بھی موقع ملے گا ہم مناسب اقدام کریں گے۔ ان قوتوں کو REACTIONARY FORCES یا COUNTER-REVOLUTIONARY MOVEMENTS کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ سازگار فضا اور کیا ہوگی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ مسلمانوں کے دلوں میں صدمے کی کیفیت کا آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس کا تصوّر بھی نہیں کرتے ہوں گے کہ حضورؐ کبھی ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ جب حضرت عمرؓ کا یہ حال ہو گیا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر تلوار سونت کر بیٹھ گئے کہ جس شخص نے کہا کہ محمدؐ کا انتقال ہو گیا ہے، میں اس کی گردن اُڑا دوں گا اور جلالِ فاروقی کے سامنے کس کو دم مارنے کی مجال تھی؟ تمام لوگ دم بخود ہیں۔ ہاں مجال اگر کسی کی تھی تو وہ ابوبکر صدیقؓ تھے۔ وہ آئے سیدھے حجرے میں گئے، آپؐ کے جسدِ اطہر کو بوسہ دیا۔ اور خطبہ دیا:

من کان یعبد محمدا فان محمدا قدمات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حیّ لایموت۔

آپ سوچئے کہ اس جملے کو کہنے کے لئے کتنے حوصلے اور چیتے کے جگر کی ضرورت تھی۔ وہ ابوبکرؓ جس کی رقیق القلبی کا یہ عالم ہے کہ غزوۂ بدر میں مشورہ دیا کہ ان قیدیوں کو معاف کر دیا جائے۔ گویا اگر خلیفہ بلا فصل کہنا چاہئے تھا ان کو، جن کی رائے اور محمدؐ کی رائے میں کوئی فرق نہیں ہے، اور پوری تاریخ کے دوران کہیں آپ کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ایک ہو اور ابوبکر صدیقؓ کی دوسری ہو۔ ان کا مقام تھا

تھوڑی سی پیش رفت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں ہوئی۔ شامی فتوحات سے سلسلے کا آغاز ہو گیا لیکن اصل توسیع تو دورِ فاروقیؓ اور دورِ عثمانی میں ہوئی انقلابِ نبویؐ کو مستحکم کرنے میں جس عزیمت کا معاملہ ہوا ہے اس کو حضرت عمرؓ سے تقابل کر کے دیکھئے۔ مانعینِ زکوٰۃ کا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اس وقت کے حالات کی نزاکت دیکھ کر مصلحت بینی کا مشورہ دے رہے ہیں کہ یہ چونکہ جنگ ایک دم شروع نہ کیجئے۔ مسلمانوں کے دل زخمی ہیں اور حوصلے پست ہیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی جدائی سے طبیعتیں بہت پژمردہ اور مضمحل ہیں۔ ایک طرف نئی نبوّت کے دعویدار ہیں اور دوسری طرف مانعینِ زکوٰۃ۔ مدّعیانِ نبوّت کے خلاف نبرد آزما ہو جائیے اور مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں نرمی برتئے۔ اس لئے کہ ایک تو انہوں نے توحیدِ خداوندی کا انکار نہیں کیا، حضور کی نبوّت سے انکار نہیں کیا، نماز کا انکار نہیں کیا، صرف زکوٰۃ کا انکار کر رہے ہیں۔ اس لئے مصلحت کو پیش نظر رکھئے، نیز جیشِ اُسامہ کو روانہ نہ کیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ کا جواب تھا کہ جو جھنڈا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کھول دیا، مَیں اُسے کیسے تہ کر سکتا ہوں۔ یہ خلافت تو نہ ہوئی اور ان کے مشن کی طرف کوئی اقدام تو نہ ہوا۔ اُن کے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لے لوں تو خلافت کا کیا فائدہ ہوا، اور اس کے بعد حضورؐ کی حدیث بیان کی

امرت ان اقاتل النّاس حتّی یشھدوا ان لا الٰہ الّا اللہ وان محمّداً عبدہ ورسولہ ویقیموا الصّلوٰۃ ویؤتوا الزّکوٰۃ فاذا فعلوا ذٰلک عصموا منّی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مَیں لوگوں کے ساتھ جنگ کروں تا آنکہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اُس کے بندے اور رسول ہیں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ یہ کر لیں گے تو میری طرف سے اُن کے جان و مال، سوائے اسلامی قانون کے، محفوظ ہو جائیں گے۔ اور اُن کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے!"

اہلِ عرب کے ساتھ جنگ اگر بند ہو سکتی تھی تو مندرجہ بالا تین شرائط کی بنیاد پر۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حجرے کے۔ مرض الموت میں خطبہ ارشاد فرمایا کہ ابوبکرؓ کی جان و مال نے مجھے جتنا فائدہ پہنچایا کسی اور کے جان و مال نے نہیں پہنچایا۔ اگر ان باتوں کے بعد بھی سمجھا جائے کہ راہ نمائی نہیں تھی تو کتنا غلط ہے۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ حکم موجود نہیں تھا۔ آپؐ معاملہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ پر چھوڑ گئے ہیں۔ اب اُمت کا معاملہ اُن کے حوالے ہے۔ آپ نے ایک اُمّت تشکیل دی ہے، اور وہ ایسی اُمّت نہیں ہے کہ جسے شعور نہ ہو اور وہ بُرے بھلے کی پہچان سے عاری ہو۔ یہ وہ جماعت ہے جس کی تربیت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی۔ یہ جماعت جانتی ہے کہ کون کس چیز کا اہل ہے، اور اس وقت جو سب سے زیادہ اہل تھا، اُسی کو منتخب کر لیا گیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کا بار اٹھانے کے بعد لوگوں کو تاکید کی کہ نہ تو مجھے خلیفۃ اللہ کہا جائے اور نہ ہی خلیفۃ المسلمین، مَیں تو خلیفۃ الرّسول ہوں (اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں)۔ یعنی جو مشن محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تھا، اُسی کی تکمیل میرا مقصدِ زندگی ہے۔ خلافتِ راشدہ عام معنٰی میں حیثیتِ حاکمہ نہیں تھی کہ صرف مسلمانوں کی حکومت ہو، اور قیامِ امن کے لئے کوئی انتظام ہو۔ یہ اُمور اُس کے اجزاء میں شامل ہیں، لیکن اصل مقصد محمد رسول اللہؐ کے مشن کی تکمیل تھا۔ اسی لئے اس کو خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کہا گیا ہے۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی دو بعثتیں ہیں ایک اِلیٰ اَهْلِ الْعَرَب اور دوسرے اِلی کافّۃ النّاس۔ اہل عرب کی حد تک تمام فرائض نبی اکرمؐ نے خود ادا کر دیئے، اور دوسرے عمل کا آغاز فرما کر دُنیا سے تشریف لے گئے۔ اب اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا اور اس کے لئے یہ ادارۂ خلافت وجود میں آیا تھا۔ اِس خلافتِ راشدہ میں پہلی خلافت، خلافتِ ابوبکر صدّیق ہے۔ اِس میں یہ چیز اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اس میں اصل CONTRIBUTION یہ ہے کہ اندرونِ ملک انقلابِ محمّدیؐ کے بعد اٹھنے والی تمام REACTIONARY FORCES کے ساتھ نبرد آزما ہو کر اور ان سب کو کچل کر انقلابِ محمّدیؐ کو مستحکم بنا دیا اور اس کے بعد ابوبکر صدّیقؓ بھی اس دُنیا سے تشریف لے گئے۔ اگرچہ INTERNATIONAL PHASE کا اجراء تو ہو چکا تھا لیکن اس کا اصل دَور خلافتِ عمرؓ کا دَور ہے۔ آغاز حضورؐ نے فرمایا

خلافتِ فاروقیؓ و عثمانیؓ اور انقلابِ نبویؐ کی توسیع

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ و نستغفرہٗ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ و من یضللہ فلا ھادی لہٗ و نشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہٗ و نشھد ان محمدًا عبدہٗ و رسولہٗ، ارسلہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ و کفیٰ باللّٰہ شھیدًا و صلی اللّٰہ علیہ و علیٰ آلہ و اصحابہ تسلیمًا کثیرًا کثیرًا۔ امّا بعد فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ و خیر الھدیٰ ھدی محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم و شر الامور محدثاتھا و کل محدثۃ بدعۃ و کل بدعۃ ضلالۃ و کل ضلالۃ فی النار۔

امّا بعد۔ فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ○ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ○ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ڔ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ڗ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَــظَ فَاسْتَوٰى عَلٰي سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ۭ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ○

وقال تبارک و تعالیٰ فی سورۃ النور :- وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ

یہ کم از کم ہیں اور میں ان میں کوئی ترمیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ ہے وہ عزیمت جس کے حامل ہیں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ الفاظ یہ آتے ہیں کہ اگر کوئی میرے ساتھ نہ نکلے گا تو میں تنہا جنگ کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کی تائید شامل حال ہوئی تمام قوتوں کو کچل کر اندرونِ ملک اس انقلاب کو مستحکم کر گئے۔ مشیّتِ ایزدی کے آگے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ اگر یہ استحکام حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ہاتھوں ہوا ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کا عہد ۲۵ برس کی بجائے ۲۵۰ برس تک جاری رہتا۔ اَللّٰہُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔۔۔۔ اور آج میرا ذہن اس بات کی طرف منتقل ہوا کہ کیا عجب مشیّتِ ایزدی کا یہی منشا ہو کہ عظمتِ ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ اگر یہ تمام مراحل آپؐ نے بنفسِ نفیس طے کرا دیئے ہوتے تو ابوبکر صدّیق کی عظمت کیسے نمایاں ہوتی ۔۔۔۔ اس اللہ کے بندے نے تو حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کے دوران اپنے آپ کو اس طرح گم کر دیا تھا کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کہیں جدا گانہ تشخص نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ہو سکتا ہے کہ مشیّتِ ایزدی کو یہی چیز مطلوب ہو کہ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتی عظمت لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آئے۔

بہرحال یہ کارنامۂ صدّیقی ہے جو تمہید بنا ہے اس بات کے لئے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ یکسو ہو کر بین الاقوامی مرحلے کی طرف متوجہ ہو گئے جس کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ اسی سیلاب کے متعلق علامہ اقبال مرحوم نے فرمایا تھا ؎

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری ؏ تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

اس پہ اِنْ شَاءَ اللہ کل صبح گفتگو ہو گی۔ کل ٹھیک ساڑھے نو بجے جمع ہوں گے اور خلافتِ راشدہ اور خاص طور پر "الفتنۃ الکبریٰ!" شہادت حضرت عثمان ذوالنورینؓ" اور اس کے بعد جو حالات اور واقعات سامنے آئے وہ عرض کروں گا۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ ٥

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

ف آج ہمارا اجتماع دس منٹ تاخیر سے شروع ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ تقاریر کے ضمن
ہمارا جو پروگرام تھا، اخبارات کی اطلاعات کی وجہ سے اس میں کچھ خلط مبحث ہو گیا
۔ دراصل آج کا عام اعلان جو "پاکستان ٹائمز" میں بھی آیا ہے وہ "اُمّتِ مسلمہ کے
ج و زوال کی تاریخ، اختتامِ خلافت سے تنسیخِ خلافت تک!" یہ اصل میں اگلی تقریر کا
نوع تھا۔ پروگرام یہی تھا۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول آپ نے سنا ہوگا کہ
فْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ (میں نے اپنے ربّ کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا!) کہ
ی مشیت، ہمارا ارادہ، ہماری خواہش، ہماری تمنّا اپنی جگہ لیکن اصل فیصلہ کُن چیز اللہ
مشیت ہے، ہوتا وہ ہے جو وہ چاہتا ہے کہ اپنے پورے عزم بالجزم کے باوجود جب
دے بدلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کوئی بالاتر قوّت ہے کہ جس کا فیصلہ آخری ہے گویا کہ
معرفتِ ربّانی کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔ آج ہم خلافتِ راشدہ کے موضوع پر گفتگو کریں
اور اس کے ضمن میں الفتنۃ الکبریٰ کا ذکر بھی ہوگا۔ کُبریٰ مؤنث ہے اکبر کی،
سب سے بڑا فتنہ، تاریخِ اسلامی کا بالکل رُخ بدل دینے والا فتنہ یعنی شہادتِ حضرت عثمان رضی
آج گفتگو ہوگی۔ بعد میں مسلمانوں کی تاریخ میں جتنے بھی فتنے اُٹھے آپ دیکھیں گے کہ اکثر و
تر وہ اسی فتنے کی صدائے بازگشت ہیں۔ ہمارے اس پروگرام کے جو تین حصّے رہ جائیں گے اُن
تکمیل اِنْ شاء اللہ ہم اگلے ہفتے کریں گے۔ کیونکہ آج تو مجھے اپنے پروگرام کے مطابق کراچی
ا ہے۔ اگلی جمعرات کو اِنْ شاء اللہ العزیز شام کو مغرب اور عشاء کے مابین "اختتامِ خلافتِ
شدہ سے تنسیخِ خلافت تک اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی تاریخ!" کے موضوع پر تقریر ہوگی
اگلے جمعہ کو اِنْ شاء اللہ، اِسی وقت بقیّہ موضوعات پر ایک جامع تقریر ہو جائے گی اور
لے جمعہ کو بفضلہٖ تعالیٰ یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

اب آئیے اصل موضوع کی طرف اور اس کے لئے چند بنیادی باتیں ذہن میں تازہ کر لیجئے۔
سلسلۂ تقاریر میں ہمارا نقطۂ آغاز یہ تھا کہ نبوّت کا اصل مقصد کیا ہے۔ محاسبۂ اُخروی کے
ن میں انسانوں پر اتمامِ حُجّت۔ یہ مقصدِ بعثتِ انبیاء ہے۔ مبادا کہ وہ یہ عُذر پیش کر سکیں کہ
ے ربّ! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ اوّلیں حُجّت انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ
ائق ہیں، سماعت ہے، بصارت ہے، عقل و شعور کی صلاحیتیں ہیں، نیکی اور بدی کی تمیز ہے۔
ب میں ودیعت شدہ معرفتِ ربّانی ہے، رُوح کی گہرائیوں میں سُلگتا ہوا عشقِ خداوندی کا

الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ .... صدق الله العظیم ط

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ اللّٰھم الھمنی رشدی واعذنی من شرور نفسی، ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزق اجتنابه آمین

یا رب العٰلمین ۝

میں اپنی تقریروں کا آغاز بالعموم ان دعاؤں سے کیا کرتا ہوں۔ ان کا ویسے تو ہر تقریب سے ہی بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ لیکن آج جس نازک اور پیچیدہ معاملے پر اظہارِ خیال کرنا ہے۔ اس اعتبار سے دونوں دعائیں بہت اہم ہیں۔ بولنے والا، کہنے والا، بیان کرنے والا، اپنے حق میں بھی دعا کرے اور سامعین کے حق میں بھی دعا کرے: اللّٰھم الھمنی رشدی (اے اللہ! میرے دل میں وہی بات ڈال جو حق ہو، درست ہو، صحیح ہو) واعذنی من شرور نفسی۔ اور مجھے نفس کی شرارتوں سے اپنی پناہ میں رکھ۔ کہیں کوئی نفسانیت، کہیں کوئی عصبیتِ جاہلیہ، کہیں کوئی تعصب، کہیں کوئی گروہی یا طبقاتی یا فرقہ وارانہ ضد اور ہٹ دھرمی میرے نقطۂ نظر اور میری رائے کو کج نہ کردے۔ دوسری دعا ہے: اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه۔ اے پروردگار! ہمیں حق کو حق دکھا، ہم حق کو حق ہی دیکھیں، حق کو حق سمجھیں اور ہمیں اس کے اتباع کی توفیق عطا فرما۔ اس میں اولاً حق کی پہچان اور ثانیاً اس کی اتباع کی توفیق کے لئے دعا کی گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں مرحلے کٹھن ہیں۔ حق کے پہچاننے کے لئے بہرحال کچھ شرائط ہیں، جن میں خلوصِ نیت کو اولیت حاصل ہے۔ لیکن حق کا پہچاننا جتنا مشکل ہے، پہچاننے کے بعد اس کو قبول اور اختیار کرلینا بدرجہا مشکل ہے۔ وارنا الباطل باطلاً۔ اور ہمیں باطل کو باطل دکھا۔ ایسا نہ ہو کہ تلبیس ابلیس لعین سے حق کو باطل سمجھ بیٹھیں یا باطل کو حق سمجھ لیں وارزقنا اجتنابه۔ اور ہمیں اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما۔ یہ دونوں دعائیں بڑی اہم ہیں۔ عام حالات میں بھی ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے، لیکن بالخصوص آج کا جو موضوع ہے، اس کے اعتبار سے پہلے اپنے حق میں بھی اور آپ سب کے حق میں بھی پورے خلوصِ قلب کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں یہ دونوں دعائیں کررہا ہوں۔ اس کے بعد پہلے مجھے دو معذرتیں کرنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہماری روایات کے

اس انتہا پر زور دیا جائے اور دوسری چیز ہاتھ سے جاتی رہی۔ آزادی پر زور دیا تو اونچ نیچ
وبھنج گئی کہ انسانیت طبقات میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ مساوات پر زور دیا تو آزادی کی چڑیا ہاتھ
سے اُڑ گئی۔ یہ نہ ہو۔ تمام چیزیں بیک وقت ایک اجتماعی نظام میں سموئی ہوئی پورے توازن
و اعتدال کے ساتھ دینِ حق ۔۔ اسلام ۔۔ کی صورت میں انسان کو دے دیا گیا، اور اس
کو چلا کر دکھا دیا گیا تاکہ نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لئے یہ حجّت بھی بتمام و کمال پوری ہو جائے۔
اسی ختمِ نبوّت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ سابقہ تمام انبیاء و رُسُل صرف اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے
انبیاء و رُسُل کی اس مقدّس جماعت میں محمّد بن عبداللہ بن عبدالمطلب صلّی اللہ علیہ وسلّم فداہ آباءنا
و اُمّہاتنا، پہلے اور آخری فرد ہیں جن کی بعثت تمام نوعِ انسانی کی طرف ہوئی اور اس تمام
کو زمان و مکان دونوں کے اعتبار سے سمجھئے۔ پورے کرۂ ارضی کے لئے مکان کے اعتبار سے
اور تا قیامِ قیامت زمان کے اعتبار سے۔ وما ارسلنٰک الّا رحمۃ للعٰلمین۔ وما ارسلنٰک
الّا کافّۃ للنّاس بشیرًا و نذیرًا۔ یہی الفاظ۔ بشیر و نذیر۔ آئے ہیں اس آیت میں
جو میں نے پہلے سُنائی یعنی رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ
بَعْدَ الرُّسُلِ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ۝ حضورؐ، مُبشّر اور نذیر بن کر آئے۔ وہی بشارت اور
اِنذار محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا مقصدِ بعثت ہے۔ ان تین امتیازات کے ساتھ ایک ہدایتِ
کاملہ عطا کر دی گئی۔ اس کی حفاظت کا ذمّہ لے لیا گیا۔ دوسرے صرف انفرادی رہنمائی نہیں۔
نظامِ اجتماعی کے اعتبار سے ایک متوازن اور معتدل نظامِ عدل و قسط جسے الدّین القیّم کے
نام سے جانتے ہیں، عطا کر دیا گیا اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ۲۳ سالہ محنتِ شاقّہ جس کا ایک
اجمالی نقشہ میں تین تقریروں میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں، کے نتیجہ میں دونوں کام کر دیئے۔
الھدیٰ کی تبلیغ مکمّل کی۔ یا ایھا النبیّ بلّغ ما انزل الیک من ربک فان لم تفعل فما
بلّغت رسالتہ۔ چنانچہ حجّۃ الوداع میں گواہی لے لی۔ آپ نے پوچھا: الا ھل بلّغتُ۔ اور
جواب مل گیا کہ: انّا نشھد انّک قد بلّغت وادّیت ونصحت۔ دوسری DIMENSION
اسی ۲۳ برس کی محنتِ شاقّہ کی یہ ہے کہ اس نظام عدل و اجتماعی کو، دینِ حق کو بالفعل قائم
کر دیا۔ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہو گئی، اللہ کا دین غالب ہو گیا، کفر اور
شرک کا استیصال ہو گیا، زیادہ سے زیادہ اہل کتاب کو یہ OPTION دی گئی، کہ وہ چاہیں تو
ذمّی بن کر رہ سکتے ہیں۔ اپنے دین یہودیت و نصرانیت پر قائم رہیں۔ البتّہ یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ

جذبہ ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کی بنیاد پر ہر انسان مسئول ہے، جواب دہ ہے (ACCOU- NTABLE) ہے، RESPONSIBLE ہے۔ لیکن رحمتِ خداوندی کا تقاضا ہوا کہ انسان کے لئے مزید آسانی پیدا کی جائے۔ اس عظیم امتحان میں کچھ اور سہولتیں دی جائیں۔ وحی کا سلسلہ جاری فرمایا، ہدایتِ ربّانی نازل ہوتی رہی تاکہ عقل و خرد، شعور اور فطرت کے اندر جو صلاحیتیں مضمر ہیں، اُن کو اُجاگر کیا جائے۔ انبیاء نے حق اور عدل و راستی کی طرف دعوت بھی دی۔ اور اس پر عملاً چل کر بھی دکھایا۔ اتمامِ حُجّت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: لئلا یکون للنّاس علی اللہ حجّۃ بعد الرّسل وکان اللہ عزیزاً حکیماًo (تاکہ لوگوں کے پاس رسولوں کے بعد اللہ کے مقابلے میں، اللہ کے سامنے پیش کرنے کے لئے کوئی حجت کوئی دلیل، کوئی عذر، کوئی بہانہ نہ رہے) قافلۂ نبوّت، قافلۂ انسانیت کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ یہ پہلا انسان، پہلا نبی بھی تھا۔ حضرت آدم علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام سے قافلۂ انسانی نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے اور نبوّت و رسالت بھی ساتھ ساتھ ارتقائی مراحل طے کرتی رہی تا آنکہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نبوّت و رسالت، اتمام اور تکمیل کو بھی پہنچ گئی اور نتیجۃً ختم ہو گئی۔ یہ ختمِ نبوّت نتیجہ ہے اتمامِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کا۔ اس اتمام و تکمیلِ رسالت کے تین پہلو اہم ہیں۔ ایک اس اعتبار سے کہ نوعِ انسانی بحیثیتِ مجموعی عقل اور شعور کی صلاحیّتوں کے اعتبار سے عہدِ طفولیّت سے نکل کر بلوغ کی عمر کو پہنچ گئی۔ لہٰذا اس قابل ہو گئی کہ الہُدیٰ (کامل ہدایت نامہ، ابدی ہدایت نامہ) اب اس کو عطا کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ قرآن مجید کی صورت میں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر نازل ہوا اور اس کی حفاظت کا ذمّہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔

دوسری طرف انسان کا اجتماعی شعور بھی ترقّی کی منزلیں طے کرتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا کہ اس دَور کا آغاز ہو رہا تھا، جس میں اجتماعیّت، انفرادیّت پر غالب آجانے والی تھی۔ ہیئتِ اجتماعیہ اور نظامِ اجتماعی کی اہمیّت فیصلہ کُن ہو جانے والی تھی، افراد اس کے شکنجے میں جکڑے جانے والے تھے۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ اب صرف انفرادی ہدایت و رہنمائی نہیں اجتماعی ہدایت و رہنمائی عطا کی جائے۔ ایک ایسا نظامِ عدل و قسط عطا کیا جائے۔ جس میں انسان کے جُملہ عواطف، اُس کے جملہ میلانات، اُس کی فطرت و طبیعت کے تمام جبلّی رجحانات کی تشفّی کا پُورا اہتمام ہو اور اُن میں بتمام و کمال توازن و اعتدال ملحوظ رکھا گیا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ ایک

کہ آپ کا نامہ مبارک خسرو پرویز نے چاک کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ اس نے میرا خط نہیں پھاڑا اپنی سلطنت کے پرزے کر دیئے۔ حضورؐ کی یہ پیش گوئی پوری ہو کر رہنے والی تھی۔ لیکن عالمِ واقعہ میں پہلا تصادم رُوما سے ہوا۔ کل میں عرض کر چکا ہوں کہ ہرقل بھی خوب پہچان چکا تھا کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور رسول ہیں۔ مقوقس نے بھی پہچانا اور اب اس کے بعد شاہِ نجاشیؓ تو ایمان بھی لے آئے۔ بہرحال اس وقت یہ بات ذہن میں رکھئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کا آغاز فرما دیا۔ کل ایک نوجوان نے بعد میں سوال کیا تھا اس کا جواب میں یہاں اس مرحلے پر دے دینا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ ہمارے ہاں بڑا ہی پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ ایک جانب سے الزام عائد کیا گیا۔ دوسری جانب سے مدافعانہ اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا گیا اور حقیقت اسی خرافات میں کھو کر رہ گئی۔ الزام یہ تھا (جو مغرب اور عالمِ عیسائیت کی طرف سے عائد کیا گیا) کہ "بوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!" یہ مسلمان بڑے وحشی لوگ تھے، انہوں نے اپنا دین بالجبر پھیلایا ہے، تلوار کے زور سے پھیلایا ہے۔ ہم تبلیغ کرتے ہیں، ہم دلوں کو جیتتے ہیں، ہمارے مشن کبھی بھی عیسائیت کی تبلیغ کے لئے جبر اور طاقت کا استعمال نہیں کرتے۔ جب کہ اسلام اس کے CONTRAST میں قوت سے پھیلا ہے، طاقت سے پھیلا ہے، تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ ایک ایسا الزام ہے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی ایک بھیانک تصویر دُنیا کے سامنے آتی ہے۔ نتیجتاً ہمارے ہاں ملّت اور دین کے ساتھ خیر خواہی رکھنے والے نیک اور بھلے لوگوں نے مدافعت کی۔ اُن کی نیتیں غلط نہیں تھیں، نیت تو یہی تھی کہ مدافعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اُمتِ محمدؐ کی ہو لیکن انداز ابتداءً بڑا معذرت خواہانہ تھا کہ نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ اسلام میں جنگ تو صرف مدافعت کے لئے جائز ہے۔ جارحانہ جنگ اسلام میں ہے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں سرسیّد احمد خاں مرحوم ہیں، ان کا خلوص و اخلاص شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ لیکن ہر دَور کا کچھ اثر ہوتا ہے کہ جس سے بچنا آسان نہیں ہوتا۔ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے یہ انداز اختیار کیا۔

سوال یہ ہے کہ اس میں اصل نقطۂ عدل ہے کیا؟ یہ بات جان لینی چاہیئے۔ میں نے اپنی گذشتہ تقریروں میں دو مواقع پر اس کو ضمنی طور پر DEAL کیا تھا۔ ایک ہجرت کے فوراً بعد جب سلسلۂ غزوات کا آغاز ہوا تو میں نے عرض کیا تھا کہ یہ نہ سمجھئے کہ آگے کی طرف

وَهُمْ صَاغِرُوْنَ ٥ اپنے ہاتھوں جزیہ دیتا ہوگا اور چھوٹے بن کر رہنا ہوگا۔ اس لئے بڑا تو اللہ ہے، اللہ اکبر (بڑا اللہ ہے) بڑائی اللہ کے لئے ہے اور غلبہ اللہ کے دین کے لئے ہے: یا ایھا المدثر قم فانذر، وربّک فکبّر - یہ اسی تکبیر ربّ کا ظہور ہے، کا تقاضا ہے۔

یہ دونوں وہ کام ہیں جو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اہل عرب اور جزیرہ نمائے عرب دونوں کے اعتبار سے بہ نفسِ نفیس خود سرانجام دے دیئے۔ آپؐ کے کام کا تیسرا پہلو تھا مذکورہ بالا اُمور کی عالمی سطح پر تکمیل۔ اب یہ فرضِ منصبی قرار پایا اُمّتِ محمّدیہ علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام کا۔ اسی خطبہ حجۃ الوداع میں قرآن مجید کے بارے میں ہدایت دے دی کہ: فلیبلّغ الشاھد الغائب - اب پہنچائیں وہ جو یہاں موجود ہیں، اُن کو جو یہاں موجود نہیں۔ میں کل عرض کر چکا ہوں کہ بڑے ہی بلیغ الفاظ میں یہ تاکید فرمائی ہے۔ اس موقع پر موجود نہ ہونے والوں میں وہ بھی شامل ہیں جو اس وقت جزیرہ نمائے عرب سے باہر تھے۔ وہ جو علاّمہ اقبال نے کہا کہ:

بس رہے تھے یہیں سلجوقی بھی، تورانی بھی ✤ اہلِ چیں، چین میں۔ ایران میں ساسانی بھی!
اسی معمورے میں آباد تھے یونانی بھی، ✤ اسی دنیا میں یہودی بھی تھے، نصرانی بھی!

تو نا معلوم کتنی اقوام تھیں، وہ بھی شامل ہوگئیں اور تا قیامِ قیامت ہونے والے تمام افرادِ نسلِ انسانی لفظِ غائب میں شامل ہوگئے۔

دوسرا پہلو ہے: لیظھرہ علی الدّین کلّہ۔ اس کو عالمی سطح پر پھیلانے کا۔ تو اس کا آپ نے بہ نفسِ نفیس آغاز فرمادیا۔ دعوتی خطوط لکھے جن کے نتیجے میں سلطنتِ روم سے تصادم کا آغاز ہوگیا۔ کل میں نے جو عرض کیا اس کو انگریزی میں IRONY OF FATE کہا جائے گا کہ دیکھئے مسلمانوں کی ہمدردیاں کس کے ساتھ تھیں۔ جب سلطنتِ روما کو سلطنتِ ایران کے ہاتھوں شکست ہوئی تو مسلمانوں کے دل بجھے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی تسلّی کے لئے قرآن مجید میں یہ پیش گوئی نازل فرمائی کہ گھبراؤ نہیں: الٓمٓ ٥ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین ٥ لیکن اب یہ تاریخ کے عجیب حقائق ہیں کہ اسی سلطنت سے تصادم کا آغاز ہوا۔ پہلی لڑائیاں اُسی سے ہوئیں۔ سلطنتِ ایران کے ساتھ تصادم بعد میں ہوا۔ اگرچہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پیش گوئی فرمادی تھی۔ جب آپ کو بتایا گیا

کروں گا تو ترمیم ہو جائے گی- آج کل ایک لفظ چلتا ہے REVISIONIST- کوئی انقلابی نظریہ آتا ہے، وہ قائم ہوتا ہے- اس کے بعد اس کے پیرو سوچتے ہیں کہ اس پر چلنا مشکل ہے، کچھ ترمیم کر دو، آپ کو معلوم ہے RUSSIA اور CHINA کے درمیان یہی بات بنائے نزاع ہے- مارکس (MARX) کا جو فلسفہ تھا اور LENIN کا جو اصل انقلاب تھا، انہوں نے اس میں ترمیم کر دی- روس اس پر قائم نہیں رہا- یہ CHINA کا بڑا CHARGE ہے اور وہ روسیوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ REVISIONIST ہیں- حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر حضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی کم سے کم شرائط میں سے اگر کسی کو کم کر دیتے تو یہ وہ REVISIONISM ہوتا جس سے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے موقف میں ترمیم ہو جاتی جو حضرت ابوبکر صدّیق رضؓ سے کسی طرح ممکن نہ تھی- چنانچہ جیشِ اُسامہ گیا اور وہی تمہید بن گیا، سلطنتِ روم کے ساتھ باقاعدہ جنگوں کا اور فتوحات شام شروع ہو گئیں- ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھیئے، کیونکہ یہ اپنی جگہ اٹل تاریخی حقائق ہیں اور اب سمجھئے اس بات کو قرآن مجید کے مطالعہ سے میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں- اس معاملے میں جو نقطۂ عدل ہے کچھ اس طرح بَین بَین واقع ہوا ہے کہ یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ اسلام کی تبلیغ میں تلوار کو سرے سے کوئی دخل نہیں اور یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اسلام کی تبلیغ ہی تلوار کے بل پر ہوئی- اسلام دو چیزوں میں بڑا بنیادی فرق کرتا ہے- ایک ہیں افراد اور ایک ہے نظام اجتماعی- افراد میں سے کسی فرد کو اپنا دین تبدیل کرنے پر اسلام مجبور نہیں کرتا- پوری تاریخ میں کسی ایک ایسے واقعہ کا بھی ذکر نہیں، لیکن غلط بنیادوں پر مبنی نظامِ اجتماعی کو اسلام گوارا نہیں کر سکتا- اس کو ملیامیٹ کرنا، اس کو توڑنا مسلمانوں کے لئے نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے- اگر کسی معذوری کی وجہ سے رُکے رہے تو اور بات ہو گی کہ اَلْمَجْبُوْرُ عِنْدَ اللہِ مَعْذُوْرٌ، جیسے کہ جنگ میں بھی کبھی ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے جیسی کہ جنگِ موتہ میں پیش آئی تو منظم پسپائی اختیار کر لی جس کی اجازت مُتَحَیِّزًا اور مُتَحَرِّفًا (سورۃ انفال) کے دو الفاظ میں دی گئی ہے- اسی طریقے سے اگر طاقت نہیں ہے تو بات اور ہے- لیکن اگر طاقت ہو اور کسی باطل نظام کا وجود گوارا کر لیا جائے تو یہ ایمان کے منافی ہے- غلط نظام کو بالجبر اور بالقوّت توڑا جائے- وجہ کیا ہے- اس کو سمجھئے اور یہ فلسفۂ دین کا ایک اہم مسئلہ ہے- یہ میں

سے کوئی پیش قدمی نہ ہوتی تو حضورؐ بھی مدینے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دینِ حق کا غلبہ کیسے ہوتا، کفر اور شرک کا استیصال کیسے ہوتا۔ اللہ کا وہ گھر جو بتکدہ بنا ہوا تھا۔ اُسے نجاست سے پاک کیسے کیا جاتا۔ PEACEFUL CO-EXISTANCE یا STATUS QUO ۔ وغیرہ بڑے خوبصورت سے نام ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں اُن کا وجود کہیں نہیں ہے۔ حق اور باطل CO-EXIST نہیں کر سکتے، حق آئے گا تو باطل پیچھے ہٹے گا۔ باطل بڑھے گا تو حق دبے گا۔ ان میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے کو گوارا نہیں کر سکتے: جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اقدام فرمایا مکے کا ----- ECONOMIC BLOCKADE کر کے آپ نے اس کی معاشی شہ رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفیر کے قتل کو برداشت کر لیتے تو جنگِ موتہ نہ ہوتی، یہ جنگ نہ ہوتی تو سفر تبوک نہ ہوتا۔ پھر جنگِ موتہ کے نتیجہ میں اگر کچھ مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا تو غزوۂ تبوک میں اس سے کہیں زیادہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں کل عرض کر چکا ہوں کہ دبدبہ قائم ہو گیا۔ آپ بیس دن تبوک میں مقیم رہے، بیس ہزار مسلمانوں کے ساتھ، معمولی بات نہیں ہے اور قیصر مقابلے میں نہیں آسکا، تمام علاقے کے جو سردار تھے۔ رؤسا تھے، قبائلی شیوخ تھے۔ وہ آئے۔ کسی نے اسلام قبول کر لیا، کسی نے معاہدہ کر لیا۔ اس کے باوجود جیشِ اُسامہ کس لئے تیار کیا۔ کوئی FRESH PROVOCATION ہسٹری کے ریکارڈ میں موجود نہیں ہے۔ لیکن جیشِ اُسامہ تیار رہے، جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور میں یہ کل عرض کر چکا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ کہا بھی گیا۔ مشورہ دیا گیا بڑے پر زور طریقے سے کہ ان تین محاذوں میں سے کم از کم ایک محاذ کو ابھی آپ بند کر دیں۔ بیک وقت تین محاذوں کا کھولنا درست نہیں ہو گا۔ حکمت کے خلاف ہو گا۔ لیکن وہ تو خلیفہ کا [illegible] ت ذہن میں رکھئے کہ جیسے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسولِ اکمل ہیں، اسی طرح [illegible] بکرؓ خلیفۂ کامل تھے۔ خلافت کا جامہ بتمام و کمال حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی شخصیت پر راست آتا ہے۔ انہوں نے اس مشورے کے جواب میں فرمایا کہ جو کام حضورؐ نے کیا یا اس کا آغاز کیا، میں اس سے قدم کیسے پیچھے ہٹاؤں۔ جو کم سے کم شرائط محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معین کر دیں، ان سے کم پر میری صلح کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا

ستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم وقل امنت بما انزل من کتاب
مرت لاعدل بینکم۔ آخری حصۂ آیت کا مطلب ہے: "مجھے حکم ہوا ہے تمہارے
ین عدل کا۔ یہی بات ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ کامل رسول اللہ صلی اللہ
یہ وسلم نے فرمائی۔ بیعتِ خلافت کے بعد جو پہلا POLICY STATEMENT
یا: اس میں خلافت کی غرض و غایت OUT LINE کی جا رہی ہیں:

"مسلمانو! تم میں ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے، جب تک کہ ان سے
حق وصول نہ کر لوں — اور ہر ضعیف قوی ہے، جب تک کہ میں اس کا
حق نہ دلوا دوں!"

یہ ہے اس بات کی اہمیت کہ نظامِ باطل کو کسی درجے میں گوارا نہ کیا جائے۔ یہ ظالمانہ نظام
ہے جو کسی خاندان کو نوعِ انسان کی گردن پر مسلط کر رہا ہے۔ وہ حاکم یہ محکوم۔ ؎ :

"تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!"

کہیں اس نے سرمایہ کو ایک لعنت بنا کر مسلط کر دیا اور انہیں دو طبقات میں تقسیم کر دیا
ایک محروم طبقہ اور دوسرا وہ طبقہ جس کے متعلق میں نے ابھی کہا تھا کہ انہیں فراوانی کا
ہیضہ ہو گیا ہے۔ جن کی ایک ایک تقریب پر لاکھوں روپے صرف ہو جاتے ہیں۔ مجھے ایک
واقعہ یاد آیا۔ ایک زمانے میں جب کہ لاہور میں میرے درس کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا۔
کچھ حضرات کو حسنِ ظن ہو گیا تھا۔ وہ میرے درس سمن آباد میں شریک ہوا کرتے تھے، ان کا
انتقال ہو گیا۔ ان کے بعد ان کے لڑکے کی شادی کا مرحلہ آیا، اس نے آ کر کہا کہ اگر ابا جان
ہوتے تو یقیناً آپ سے درخواست کرتے کہ آپ نکاح پڑھائیں۔ انہوں نے کہا نکاح آپ
پڑھائیں۔ میں نے حامی بھر لی لیکن میں جو اس بارات میں گیا اور میں نے جو شادی کا نقشہ
وہاں دیکھا، معلوم ہوتا تھا کہ ہر درخت کے ہر پتے کے ساتھ ایک قمقمہ لگا ہوا ہے، اور وہ
روشنیوں کا طوفان، وہ ہیرے اور ان کے لباس اور بے شمار انسان۔ اس وقت جو میں نے
تقریر کی وہ میری زندگی کی سخت ترین تقاریر میں سے تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خطبۂ نکاح
جنتر منتر کے انداز میں تو پڑھتا نہیں ہوں۔ خطبہ تو خطبہ ہوتا ہے۔ خطبے کی غرض تذکیر ہے۔
میں نے کہا — اور یہ ۶۸ - ۱۹۶۷ء کی بات ہے — ہماری منافقت یہ ہے کہ ہم نام لیتے ہیں
فاطمۃ الزہراء رض کا اور عمل ہمارا یہ ہے۔ یعنی قول اور فعل میں بالکل مطابقت نہیں ہے

پہلے ختم نبوّت کے ضمن میں عرض چکا ہوں کہ غلط نظام بندوں اور ربّ کے درمیان حجاب بن جاتا ہے۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی جہاں اور بڑی خدمات ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے ایک بہت بڑے SOCIAL THINKER - کی حیثیت سے، دو اعتبارات سے اس نظامِ اجتماعی کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ (آپ کو معلوم ہے کہ سوشیالوجی (SOCIOLOGY) ایک جدید علم ہے اور اس دور کا سب سے بڑا سوشل تھنکر وہ ہے جو اجتماعی مسائل کا حل بتائے۔ اس لحاظ سے شاہ صاحب کو اپنے وقت کا سب سے بڑا SOCIAL THINKER کہا جا سکتا ہے) ایک تو یہ اگر نظام ظالمانہ ہو، اور کوئی حرج نہیں اگر استحصالی نظام کے الفاظ استعمال کر لئے جائیں۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کچھ لوگوں کے پاس تو عیش و عشرت کے لئے ہر چیز کی فراوانی ہے اور کچھ لوگ دو وقت کی نانِ جویں کے لئے محتاج ہیں۔ جن کے پاس دولت کی فراوانی ہے، وہ اس کی وجہ سے خدا سے دُور ہو گئے ہیں اور جن کے لئے دو وقت کی روٹی کا حصول مشکل ہو گیا ہے، وہ بالکل ڈھور ڈنگروں کی سطح پر آجاتے ہیں، وہ خدا کو کیا پہچانیں اور اس کی کیا بندگی کریں۔ دو وقت کی روٹی کے لئے جدّ و جہد میں مصروف رہتے ہیں جیسے باربرداری کا اُونٹ یا کولھو کا بیل ہو۔ اگر انسان کو اس سطح پر گرا دیا جائے، تو اس کے لئے اس کا کہاں امکان ہے کہ وہ یہ سوچے کہ یہ آسمان کس نے بنایا، یہ زمین کس نے بنائی، فطرت کے اشارات کو پڑھئے۔ ؏

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!

کہاں معرفتِ ربّانی اور کہاں عبادتِ ربّانی۔ انسان ان چیزوں سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے اور یہ ظالمانہ نظام سب سے بڑا حجاب بن جاتا ہے بندے اور ربّ کے درمیان۔ یہ ہے اہمیت نظامِ اجتماعی کی۔ اس لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ ہم نے اپنے رسولوں کو بیّنات، کتاب اور میزان کے ساتھ اس لئے بھیجا کہ : لیقوم النّاس بالقسط (تاکہ لوگ عدل اور انصاف پر قائم رہیں) یہ سورۂ حدید کی آیت ہے، جس کا میں نے ترجمہ کیا، پوری آیت یوں ہے :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

پچیسویں پارہ کی سورۂ شوریٰ میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ : فَلِذٰلِکَ فَادْعُ

تم جو چاہو کرو۔ اگر دونوں چیزیں منظور نہیں ہیں تو میدان میں آؤ، تلوار ہمارے اور
رے درمیان فیصلہ کرے گی۔ یہ تاریخ کی وہ حقیقت ہے جس کے لئے کسی ریسرچ
ضرورت نہیں ہے۔ تو جس نے کبھی تاریخِ اسلام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے وہ بھی جانتا
کہ یہی تین ALTERNATIVES ہیں۔ لہٰذا اس نقطۂ عدل کو پہچان لیجئے کسی
کو کبھی مجبور نہیں کیا گیا، نہ کیا جائے گا:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ
وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا۔

نظامِ باطل جو یقیناً ظالمانہ نظام ہے۔ کوئی نظامِ باطل عادلانہ نہیں ہو سکتا۔ عادلانہ
نظام تو صرف اللہ کے دین کا ہے۔ اس نظامِ باطل کو مسلمان ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں
کر سکتا۔ اسلام اس کے وجود کو اپنے لئے چیلنج (CHELLENGE) سمجھتا ہے۔ اس کا
قلع قمع جبر اور قوت کے ساتھ، اسلام کا نصب العین ہے۔ اس میں یہ بات ضرور ہے
اگر بالفرض ایسے حالات ہو جائیں کہ ہمیں تبلیغ اور اپنے نظریات کی اشاعت کا بھرپور
موقع دیا جائے تو ضروری نہیں کہ پہلے مرحلے میں تلوار اٹھائی جائے۔ لیکن ظاہر بات ہے یہ
IF جو ہے IT IS A BIG IF۔ کیا روس (RUSSIA) کبھی گوارا کرے گا
کہ آپ وہاں جا کر اسلام کی تبلیغ کریں؟ ہر نظام اپنا تحفظ کرتا ہے، لہٰذا وہ کبھی برداشت
نہیں کرے گا۔

اس اعتبار سے اگر مسلمانوں کے پاس طاقت ہو تو نظامِ باطل کا قلع قمع کرنے کیلئے
اس طاقت کا استعمال ضروری ہے۔ یہ ہے اس سلسلے میں نقطۂ عدل۔ چنانچہ خلافتِ راشدہ
کے دوران ایک جملہ فاتحِ ایران حضرت سعد بن ابی وقاص نے اس وقت فرمایا، جب
ایرانیوں نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگ ہم پر چڑھائی کر کے کیوں آئے ہیں؟ لیکن اس سے
پہلے اس HISTORICAL BACK GROUND کو ذہن میں رکھئے کہ اس وقت
دو عظیم سلطنتیں تھیں جو اپنے وقت کی SUPER POWERS تھیں۔ ایک سلطنتِ کسریٰ
اور دوسری سلطنتِ روما۔ ان دونوں کے درمیان واقع تھا جزیرہ نمائے عرب کا علاقہ جو
ایک لق و دق صحرا تھا۔ دونوں سلطنتوں میں سے کسی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی، جیسا کہ عام طور پر غیر
زرخیز سرحدی علاقوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ ہر سلطنت انہیں اپنے زیرِ اثر رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

علامہ اقبال نے کیا خوب نصیحت فرمائی ہے :-

اگر پندے ز درویشے پذیری ❊ ہزار اُمت بمیرد تو نہ میری!
بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر ❊ کہ در آغوش شبیرے بگیری!

اس زمانے میں بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے، سرخ ٹوپیوں والوں کے۔ سرمایہ دار ڈرا رہا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ میں نے کہا تھا، یہ کہاں سے آگئے۔ یہ کہیں RUSSIA سے نہیں آئے، یہ IMPORTED نہیں ہیں۔ یہ آپ کی ان غلط حرکتوں کا نتیجہ ہے جو سامنے آرہا ہے میں نے کہا، یہی بیرے جو آپ کو SERVE کر رہے ہیں، آپ کے شوفر، آپ کے چوکیدار، آپ کے خانسامے وغیرہ، ان میں سے کتنے ہی ہوں گے، جن کے گھروں میں جوان بچیاں بیٹھی ہوں اور وہ اُن کے ہاتھ پیلے نہیں کر سکتے۔ ان کے جو کم سے کم لوازمات ہیں، وہ بھی اُن کو میسّر نہیں۔ اور آپ کے ہاں یہ الّلے تلّلے ہو رہے ہیں۔ اس لئے یہ حقیقت خوب سمجھ لیجئے کہ: باطل کسی صورت گوارا نہیں، اس کا قلع قمع کرنا ہے۔ اسلام اس کے لئے طاقت استعمال کرتا ہے، اگر ہو، نہ ہو تو الگ بات ہے۔ لیکن اگر قوّت ہو تو وہ تلوار استعمال کرتا ہے۔ میں کل عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں نے ہمیشہ تین ALTERNATIVES دیئے اور یہ بھی کوئی بعد کی بات نہیں ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دیئے ہوئے ہیں بلکہ خود قرآن کے دیئے ہوئے ہیں۔ اِس کی اصل وہ حکم ہے جو قرآن مجید کی سورۂ توبہ میں یہود بنی نضیر کے بارے میں بیان کیا گیا۔ مشرکینِ مکّہ کے لئے کوئی OPTION نہیں ہے۔ مشرکینِ عرب کے لئے حکم ہے کہ ایمان لے آؤ ورنہ گردن اُڑا دی جائے گی۔

تیسرا اگرچہ صراحتاً مذکور نہیں ہے تاہم خود بخود مفہوم ہے کہ یا پھر اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاؤ۔ چنانچہ حضرتِ عکرمہ رض (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) ملک چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ لیکن اہلِ کتاب کے لئے تین OPTIONS ہیں۔ اسلام لے آؤ، اس صورت میں ہمارے بھائی ہو گے۔ جس طرح کسی دوسرے مسلمان کا جان و مال محترم ہے، ایسی ہی تمھاری جان و مال کا احترام ہوگا۔ یہ نہیں کرتے تو: حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ ○ چھوٹے بن کر رہو، جزیہ دو، تمھیں کوئی بالجبر مسلمان نہیں کرے گا۔ رہو یہودی اور عیسائی لیکن چھوٹے ہو کر رہنا پڑے گا — LAW OF THE LAND اس کا ہوگا جس کی فی الواقع زمین ہے، کیونکہ: "الارض للہ، الملک للہ!" PERSONAL LAW

نہیں آسکے گی۔ وہ درحقیقت جانشینیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، خلافتِ رسالت یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہے۔ اس خلافت کے سلسلے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پہ میں کل عرض کر چکا ہوں۔ یہ دَورِ خلافت مختصر تھا لیکن کارنامہ انتہائی عظیم تھا۔ حضورؐ کے انتقال کے بعد انقلابِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے خلاف جتنی قوتیں اُبھریں، جن کو آپ COUNTER - REACTIONARY FORCES کہہ سکتے ہیں اور REVOLUTIONARY MOVEMENT - بھی کہہ سکتے ہیں۔ انقلاب کو کالعدم کرنے کے لئے اقدام بھی کہہ سکتے ہیں، جو چاہیں کہہ لیں۔ مقصود تو ایک مفہوم کا ابلاغ ہے ؎

عباراتنا شتّٰی وحسنک واحد ٭ اے اللہ! ہماری عبادتیں مختلف ہوسکتی ہیں، تیرا حسن وجمال تو ایک وحدت ہے!" - ان تمام REACTIONARY FORCES کو مکمل طور پر کچل کر رکھ دیا۔ وہ ان تمام قوتوں سے پوری قوت کے ساتھ جسے آپ انگریزی میں WITH AN IRON WILL - AN IRON HAND کہیں گے، نبرد آزما ہوئے اور اس انقلاب کو جزیرہ نمائے عرب کی حد تک کامل طور پر CONSOLIDATE کر کے دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اب اس کے بعد خلافتِ راشدہ کا چوبیس سالہ دور ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھئے کہ نوعِ انسانی پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو اصل حجت قائم ہوئی ہے، وہ اسی دَور میں ہوئی ہے، اس لئے کہ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی برکات کا ظہور اب ہوا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ ایک مسلسل جدّوجہد، ایک پیہم کشمکش سے عبارت ہے اور میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ حالات و واقعات کی رفتار اتنی سریع اور اس کا TEMPO - اتنا تیز تھا کہ واقعۃً ایک دفعہ تو انسان چکرا جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو ایک LIFESPAN میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا۔ فردِ واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور ایک وسیع وعریض خطے پر ایک نظام بالفعل قائم ہوگیا۔ اور کُل بائیس برس میں دعوت بھی ہوگئی، تنظیم بھی ہوگئی، تربیت بھی ہوگئی، کش مکش بھی ہوگئی، تصادم بھی ہوگیا، مسلح تصادم ہوگیا، فتح بھی ہوگئی، قیامِ امن بھی ہوگیا۔ اور یہ سب کچھ صرف بائیس برس میں ہوگیا، تو اب آپ خود سوچئے کہ حالات واقعات کی تیز رفتاری کا کیا عالم ہوگا۔ اگرچہ جو نظام عہدِ خلافتِ راشدہ میں قائم ہوا ہے، اُس کا پورا CREDIT حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جاتا ہے۔ آخر عمرؓ کون ہے؟ عمر ابن الخطاب کو عمرؓ

ویسے درحقیقت یہ آزاد قبائلی علاقہ تھا، اور ایسے ہی دیگر علاقوں کے باشندوں کی طرح اُن کا پیشہ بھی لوٹ مار تھا۔ ظاہر بات ہے کہ جب اپنے گھر میں پیدا کچھ نہ ہوتا ہو تو کہاں سے کھائیں گے۔ گئے کوئی ہلّہ بول دیا، کہیں سے کچھ لوٹ مار کے لے آئے، پھر کسی اور جانب چھاپہ بول دیا۔ چنانچہ عربوں میں یہی طریقہ رائج تھا، تو ایرانیوں نے یہ کہا کہ تم پہلے تو اس طرح آیا کرتے تھے۔ اب تم کسی طرح ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے، یہ فرق کیوں ہے؟ ہم تمھیں دے دلا دیتے ہیں، جو کہتے ہو دے دیتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت سعدؓ نے وہ تاریخی جملہ کہا ہے، اس کا ایک ایک لفظ نوٹ کر لیجئے۔ زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ ایسی ہی سفارت کے موقع پر وہ جملہ بھی آیا تھا کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اب میرے ساتھ وہ لوگ ہیں جنھیں زندگی کی نسبت موت زیادہ عزیز ہے۔ پہلے ہم لوٹ مار کرنے تھے، جینے کے لئے، اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لئے۔ لیکن اب جو لوگ آئے ہیں، ان کی تو قلبِ ماہیت ہو چکی ہے، وہ بالکل بدل چکے ہیں۔ اب یہ وہ لوگ ہیں جنھیں زندگی کی نسبت موت عزیز تر ہے۔

دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے: انا قد ارسلنا یعنی ہم بھیجے گئے ہیں، خود نہیں آئے۔ پہلے لوٹ مار کرنے آتے تھے، لیکن اب ہم ایک مشن پر ہیں۔ ہماری جو سابقہ تاخت ہوتی تھی، اس سے ہمارا یہ حملہ مختلف ہے کہ اب میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں۔ اور پھر اس جملے میں مناسبت ہے رسالت سے۔ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ، اس سے فعل مجہول ہے اَرۡسَلَ (بھیجا)، اُرۡسِلَ بھیجا گیا۔ ہم بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسالتِ محمدیؐ کا مشن ہے، جس کی تکمیل پر ہم مامور ہیں:

انا قد ارسلنا لنخرج الناس من ظلمات الجهالة الی نور الایمان

(تاکہ ہم لوگوں کو جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر انھیں ایمان کی روشنی میں لے آئیں)

اگلا جملہ اس سے بھی اہم ہے: و من جور الملوک الی عدل الاسلام۔ اور بادشاہوں کے ظلم و تشدّد کی چکی سے، جس میں وہ پس رہے ہیں، نکال کر اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ اب اس جملے کو سمجھ لیجئے، یہ خلافت راشدہ کا مشن ہے، یہ ماٹو (MOTTO) ہے خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کا، کیوں؟ میں نے عرض کیا تھا کہ اسے صرف مسلمانوں کی ایک حکومت نہ سمجھئے، صرف ایک سیاسی نظام نہ سمجھئے۔ اگرچہ ایک سیاسی نظام یا ہیئتِ اجتماعیہ کے اعتبار سے اس کی برکات بھی بڑی ممتاز ہیں۔ لیکن اسے صرف اس حد تک سمجھیں گے اور اس اعتبار سے اسے ASSESS کریں گے، تو اس کی پوری تصویر سامنے

تھے، اب وہ سمٹ کر یورپ تک محدود ہو گئی، ذرا سی انگلی قسطنطنیہ پر ٹکی رہ گئی رہی سلطنتِ کسریٰ تو اُس کے تو وہ پرزے ہوئے کہ باید و شاید۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس نے میرا خط چاک نہیں کیا بلکہ اپنی سلطنت کے پُرزے کر دیئے ہیں یہ ذہن میں رکھیئے کہ فتوحات کے اس سیلاب میں کشور کشائی یا مالِ غنیمت کو مقصود کی حیثیت حاصل نہ تھی ہے "شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن :: نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!" اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک اللہ کی راہ میں قتل ہو جانا کہ مسلمان کا اس سے بڑا مقصد اور کوئی نہیں۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی تمنا ہے جو اللہ نے پوری نہیں کی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی کوئی تمنا اللہ تعالیٰ پوری نہ کرے۔ عجیب بات ہے لیکن نہیں کی۔ حضورؐ کے الفاظ ہیں: میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں، پھر مجھے زندہ کیا جائے، پھر قتل کیا جاؤں! قتل فی سبیل اللہ کی یہ لذت اور پھر بھی آپؐ کی تمنا پوری نہیں کی جاتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ایک اٹل قانون ہے کہ رسول کبھی قتل نہیں ہوتے۔ رسول نمائندہ ہے اللہ کا، اللہ کی حکومت کا اور اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی (اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے!)۔ رسول کہیں مغلوب ہونے کو آئے تو پوری کی پوری قوم کو تہس نہس کر دیا جائے گا۔ کوئی رسول مغلوب نہیں ہوتا، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔

ایک معنیٰ تو مقتول فی سبیل اللہ ہونا ہے اور دوسرا اللہ کے دین کی گواہی اور توحید کی گواہی دینا جیسے اقبال نے کہا ہے: "دے تو بھی محمدؐ کی صداقت پہ گواہی!" یہ وہ گواہی ہے جس کو ادا کر کے آپ اسلام میں داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: اشهد ان لا الٰه الا الله واشهد ان محمداً عبده ورسوله۔ یہ گواہی انفرادی طور پر بھی دی جاتی ہے اور اجتماعی طور پر بھی۔

بہرحال ایک کام تو یہ ہوا کہ اتنے وسیع وعریض رقبے پر سے انسانوں کو بادشاہوں کے ظلم سے نجات دلا کر عدلِ اسلام سے روشناس کرایا گیا۔ غلامی کے جوئے ان کی گردن سے اتار دیئے، اور اس امر کی گواہی دوسروں نے بھی دی ہے۔ کسریٰ کا ایک ایلچی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملنے آیا۔ اس نے اہلِ مدینہ سے پوچھا، تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ جواب ملا: لَيْسَ لَنَا مَلِكٌ وَلَنَا اَمِيْرٌ۔ ہمارا بادشاہ وادشاہ کوئی نہیں ہے،

فاروق رضؓ کس نے بنایا؟ یہ کس کی مسیحائی ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ حضورؐ ہی کی تربیت کا کرشمہ تھا، اس لیئے اس کا سارا CREDIT حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جاتا ہے۔ جیسے ایک بند کلی ہو اور پھر وہ کھل کر پھول بن جائے، پھول میں پتّیاں وہی ہیں جو کلی میں تھیں، کسی نئی پتّی کا اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن بہرحال وہ پھول کھلتا ہے تب پتّیاں نمایاں ہوتی ہیں۔ کلی میں وہی پتّیاں ہیں لیکن بند ہیں تو POTENTIALLY وہ ساری برکات نبی اکرم صلّی اللہ کے قائم کئے ہوئے نظام میں اوّل یوم سے موجود تھیں۔ لیکن ان کا جو ظہور ہوا ہے' وہ دورِ خلافت عمر فاروقؓ اور دورِ خلافت حضرت عثمانؓ میں ہوا ہے (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) یہ ذہن میں رکھئے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے بارے میں بڑے بڑے مغالطے لوگوں کے ذہن میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں اس پر تفصیلی گفتگو تو بعد میں کروں گا، اس وقت یہ ذہن میں رکھیئے کہ طویل ترین دورِ خلافت حضرت عثمانؓ کا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے اڑھائی سال، حضرت عمرؓ کے دس سال اور حضرت عثمانؓ کے بارہ سال۔ ان بارہ سالوں میں سے دس سال تو بالکل اُسی شان کے ہیں، جس شان کا دورِ فاروقی تھا۔ اختلاف، تنازع، فتنہ، یہ سب کچھ آخری دو سالوں میں ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کے ذہن میں یہ نقشہ بٹھا دیا گیا ہے کہ شاید خیر و خوبی اور بھلائی صرف دورِ فاروقی میں تھی۔ دورِ عثمانی میں تو فتنہ تھا، فساد تھا، اختلاف تھا۔ یہ ایک بہت بڑی تاریخی غلطی ہے، جس کا ازالہ کر دینا ضروری ہے۔ دس سالہ دورِ فاروقی اور حضرت عثمان کے پہلے دس سالوں کو ملا کر بیس سال بنتے ہیں۔ بیس سال کے اس عرصہ میں دو کام ہوئے ایک تو لیظھرہ علی الدّین کلّہ۔ اس کو علاّمہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے کہ:

سے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو ٭ تھمتا نہ تھا کسی سے سَیلِ رواں ہمارا!

ام فتح ہوا، ایران فتح ہوا، ترکستان کے علاقوں تک بات پہنچی ہوئی ہے، شمالی افریقہ تریباً پورا فتح ہو چکا ہے، ایشیائے کوچک فتح ہو چکا ہے، صرف تھوڑا حصّہ۔ مدینۃ القیصر یٰ قسطنطنیہ۔ بچا ہوا ہے۔ سلطنتِ رُوما کی تین ٹانگیں تھیں، جن میں سے دو ٹوٹ چکی ہیں۔ یہ تین برّاعظموں پر پھیلی ہوئی بہت بڑی سلطنت تھی۔ پورا شمالی افریقہ، پورا مغربی ایشیا شیائے کوچک جسے ASIA MINOR (چھوٹا ایشیا) کہتے ہیں۔ پھر نیچے SYRIA اور رالاردن (JORDON) یہ مغربی ایشیا ہے اور کچھ اس کے مقبوضات تھے جو یورپ میں

ں ازدواجی زندگی پر بڑے زبردست حملے کئے ہیں، بڑے رقیق حملے کئے ہیں۔ کیونکہ تعدّدِ
ازدواج کی کڑوی گولی عیسائیوں کے حلق سے کسی طرح نیچے اترتی ہی نہیں۔ اوّل تو اُن
کے ہاں شادی کرنا ہی گھٹیا کام ہے، اُن کی اپنی VALUES ہیں۔ تجرّد کی زندگی بسر
کرنا اُن کے ہاں اونچے درجے کا کام ہے۔ شادی کرنا اور پھر متعدد شادیاں یہ انہیں
کسی طرح قبول نہیں۔ ویسے ایک معاملے میں، مَیں اُس کی حماقت کی داد دیتا ہوں۔ ایسی
احمقانہ بات لکھی ہے، جس کا اسے جواب دینا چاہیئے، جواب وہ کسی اور سے مانگ رہا
ہے۔ میں کیوں بیان کر رہا ہوں، نقلِ کفر، کفر نباشد۔ مجھے اس کے بیان کرنے میں
کوئی خوشی نہیں ہے، بیان اس لئے کر رہا ہوں کہ معلوم ہو جائے کہ وہ حضور صلّی اللہ
علیہ وسلّم کا دشمن ہے۔ دشمن اگر کسی پہلو سے عظمت کی گواہی دے، تو وہ عظمت مُسلّمہ
ہوتی ہے۔ تو مَیں پہلے اس کی دشمنی ESTABLISH کر رہا ہوں۔ اس نے عجیب جملہ
لکھا ہے کہ: "حیرت ہے کہ اتنے گھٹیا انسان (مراد حضورؐ ہیں) کے گرد ایسے عظیم لوگ
کیسے جمع ہو گئے! پہلا نام خدیجۃ الکبریٰ کا لیا ہے، دوسرے لوگوں میں حضرت ابوبکر
صدیق رضؓ، عمر فاروق رضؓ اور عثمان غنی رضؓ شامل ہیں۔ تو خدا کے بندے! اس کا جواب تو
دے۔ اگر تو اُن کی عظمت کا قائل ہے، یا یوں کہو کہ یہ احمق تھے، بیوقوف اور
کودن تھے۔ انہیں تو تو مان رہا ہے۔ اُن کی عظمت کو تسلیم کر رہا ہے اور جس سورج
کے گرد یہ چاند جمع ہیں، اس کا انکار کر رہا ہے۔ یہ تو تمہاری اپنی آنکھ کا قصور ہے جاہل
اس کی دشمنی کو ESTABLISH کرنے کے لئے مَیں نے یہ چند باتیں بتائیں۔ اب
یہی شخص ہے جو پورا خطبہ حجّۃ الوداع نقل کر رہا ہے۔ ذہن میں رکھیئے اس PROPO-
RTION کو۔ وہ ایک VOLUME میں پوری نسلِ انسانی کی تاریخ لکھنے والا ہے
لیکن خطبہ حجّۃ الوداع پورے کا پورا نقل کر رہا ہے۔
ہاں تو وہ کہتا ہے کہ: جہاں تک انسانی حرّیت، اُخوّت اور مساوات کے وعظوں
(SERMONS) کا تعلق ہے تو یہ SERMONS دُنیا میں بہت کہے گئے
JESUS OF NASARAT (مسیح ناصری) نے بھی بہت کہے لیکن تاریخِ انسانی
میں ان اُصولوں پر معاشرہ صرف محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے قائم کیا ہے۔ اس سے بڑا
TRIBUTE اور ہو نہیں سکتا، اور پھر ایسے ذلیل شخص کی زبان سے، جس کی نگاہوں سے
حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی ذاتی عظمت چھپی رہ گئی ہے لیکن وہ حضورؐ کے کارناموں کو

ہمارا تو ایک امیر ہے۔ اس نے پوچھا: اچھا تو اس امیر کا قصرِ امارت کہاں ہے؟ انہوں
نے جواب دیا، اُس کا کوئی قصرِ امارت نہیں، وہ ابھی اس دروازے سے نکل کر مدینہ سے
باہر گیا ہے۔ وہ اٹھا اور باہر جا کر دیکھا کہ عمر فاروق رضؓ ایک جھاڑی کے سائے میں اپنے کوڑے
کو تکیہ بنائے ہوئے پڑے ہیں۔ جس کے نام سے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہو
جاتا ہے، وہ یوں فرشِ زمین پر لیٹا ہوا ہے۔ کچھ دیر دم بخود اس منظر کو دیکھتا رہا اور آخر
کہہ اٹھا کہ اے عمر! تم عدل و انصاف سے کام لیتے ہو، لہٰذا تمھیں کوئی ڈر نہیں، ہمارے
بادشاہ ظلم کرتے ہیں، لوگوں کا خون چوستے ہیں، اس لئے ہر وقت کانپتے رہتے ہیں اور اسی لئے
انہیں باڈی گارڈ بھی چاہئیں۔ انہیں اُونچی اونچی فصیلوں والے محل بھی چاہئیں تحفظات
چاہئیں۔ یہ تھی وہ رائے جس کا اظہار سفیرِ کسریٰ نے اسلام کے نظامِ عدل اور اپنے ہاں کے
نظامِ جور کے متعلق ظاہر کی۔

تو اتنے بڑے رقبے پر اسلام کو غلبہ ہوا، غلبہ اس معنیٰ میں کہ نوعِ انسانی کی بیڑیاں
کاٹ دی گئیں، غلامی کے طوق ان کی گردنوں سے اُتار دیئے گئے۔ ع

"تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!"

کوئی حاکم نہیں، کوئی محکوم نہیں۔ کوئی مالک نہیں، کوئی مملوک نہیں۔ صرف ایک چیز ہے
کہ: کونوا عباد اللہ اخواناً ۵ اس بات کو نوٹ کر لیجئے کہ: HUMAN-FREEDOM
کا سب سے بڑا چارٹر، اسلامی چارٹر ہے۔ یہ UNO اور LEAGUE OF
NATIONS کے چارٹر کیا، سب سے بڑا MAGNA CARTA حقوقِ انسانی کا
وہ خطبہ ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ: الفضل ما
شهدت به الأعداء (اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دے!) یہ اقوال
ایچ۔ جی ویلز (H. G. WELLS) کا ہے وہ بہت معروف شخصیت ہے SCIEN-
TIFIC FICTION میں اس کا بڑا اونچا مقام ہے۔ اس نے کہانیاں (STORIES)
لکھی ہیں، جو سائنسی خیالات پر مبنی ہیں۔ اس کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس نے تاریخ
(HISTORY) کو بھی FICTION بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسے خوبصورت پیرائے میں
تاریخ لکھی ہے کہ آدمی پڑھے تو ذرا بوجھل محسوس نہ ہو۔ اس کی دو کتابیں SHORT-
HISTORY OF THE WORLD اور CONCISE HISTORY
OF THE WORLD بہت مشہور ہیں۔ اس میں [illegible] نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

بندھنوں میں جکڑے جاتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام (FUDAL SYSTEM) پوری دنیا میں تھا۔ کیا تھا، بادشاہ تھا۔ بادشاہ کے نیچے BARONS ہیں۔ اور LORDS ہیں۔ پنج ہزاری، بیس ہزاری، تیس ہزاری منصبدار ہیں۔ ان کے علاقے ہیں، اُن علاقوں کے وہ کامل مالک ہیں۔ رہنے والے سب ان کی رعیت، غلامی در غلامی یورپ نے حقوق حاصل کرنے کے لئے بڑا زور مارا، بڑی بڑی قربانیاں دیں ——— وہ DIVINE RIGHTS OF KING کے دعوے کے ساتھ مسلط تھے۔ اُن سے حقوق لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ یہ آزادی حاصل ہوئی تو وہ ایسی غیر معتدل ہوگئی کہ روپیہ میرا ہے، میں جو چاہوں کروں، چاہے شراب خانہ کھولوں، چاہے قحبہ خانہ کھولوں، مجھے آزادی حاصل ہے۔ کسی کو روکنے کا حق نہیں ہے، روپیہ میرا ہے، مجھے آزادی حاصل ہے کہ اُسے سود پر چلاؤں، اس پر قدغن کیسی؟

چنانچہ اس آزادی نے سرمایہ داری کی لعنت کی شکل اختیار کر لی۔ جاگیرداروں سے نجات ملی تو سرمایہ دار مسلط ہوگئے کہ صاحب مجھے آزادی حاصل ہے، کارخانہ میرا میں تو مزدوری دوں گا تیس روپے، کسی کو کام کرنا ہے تو کرے، نہ کرنا ہو نہ کرے۔ مزدور بھی آزاد ہے، مگر مزدور آزاد کہاں۔ جب وسائل کا ارتکاز چند لوگوں کے ہاتھ ہوگیا ہو؟ کبھی آپ کے ہاں AERATED WATER چلتے تھے۔ ہر گاؤں آپ کے ہاں مشین لگی تھی۔ تھوڑے سے پیسے کسی کے پاس ہوئے، اُس نے مشین بوتلیں بھر بھر کے بیچنے لگا۔ مگر پھر یہ بڑے بڑے کارخانے لگ گئے اور وہ مشین خا ہوگئیں۔ ہر شخص کے لئے اس سطح کا کارخانہ لگانا ممکن نہیں، جس سطح کا ایک سرما لگائے گا۔ اب چھوٹی معیشت والوں کا دروازہ بند ہوگیا، اور زیادہ سے زیادہ مجبور ہوگئے کہ ان کارخانوں میں جاکر ملازمت کریں۔ بظاہر آزاد ہیں لیکن درحقیقت مجبور ہیں کہ دو اڑھائی روپے اُجرت پر کام کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ جب چیزیں کو پہنچ جاتی ہیں تو سے

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں ٭ توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسمِ سامری

اور بغاوت تو ہوگی۔ ظلم ایک حد کو پہنچنے کے بعد ایک ردِّعمل کو جنم دیتا ہے۔ اس کوئی شک نہیں کہ اسی رنگ میں کچھ عرصہ تک سرمایہ داری مسلط رہی۔ اب سرمایہ

جھٹلا سکتا ہے۔ اگر یورپ کا تعصب اُس کی آنکھوں کی پٹی بن گیا اور حضورؐ کی شخصی عظمت کا وہ اندازہ نہ کر سکا۔ لیکن تاریخ کی ایک عظیم حقیقت کو جھٹلائے تو کیسے جھٹلائے۔ بہرحال اتنے وسیع و عریض رقبے پر اس نظام کو قائم کر دیا، جس میں ہر اعتبار سے عدل و قسط اور انصاف مکمل ہو، درحقیقت اسلام کا ایک عظیم احسان تھا۔

مَیں نے ایک بار پہلے بھی عرض کیا تھا اور آج بھی اشارۃً وہی بات کہی۔ اب اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ نظامِ اجتماعی کے متعدد پہلو ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ CONFLI-CTING ہوتے ہیں۔ انفرادی آزادی اور اجتماعی مصلحتیں باہم ٹکراتی ہیں۔ انسان کہتا ہے مجھے آزادی ہونی چاہئے، مَیں جو چاہوں کروں، جو چاہوں سوچوں، جو چاہوں زبان سے بک دُوں، آزادی ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ آزادی اجتماعی اعتبار سے مضر ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اب نقطۂ عدل کیا ہے کہ آزادی بھی مجروح نہ ہو اور اجتماعی مصلحتیں بھی پامال نہ ہوں بڑا کٹھن کام ہے، بہت مشکل معاملہ ہے۔ سب مانتے ہیں کہ مساوات ہونی چاہیئے، سو فیصد مساوات تو ظاہر ہے نہ کبھی دُنیا میں ہوئی ہے نہ ہوگی اور نہ ہی فطرت کے مطابق ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے سرخ و سپید رنگت دی ہے، کسی کا رنگ سیاہ کر دیا ہے، کیا کریں۔ کسی کو یورپ میں پیدا کر دیا، کسی کو افریقہ میں پیدا کر دیا، کیا کریں۔ کسی کو ذہنی صلاحیتیں بہت دے دیں مگر جسمانی قوّت نہیں دی۔ کوئی اگر چھ سات گھنٹے تک مسلسل کشتی چلا سکتا ہے تو اسے سوچنے کی طاقت نہیں دی۔ تو یہ فرق اور تفاوت تو ضرور رہے گا۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ چھوٹے چھوٹے قطعے تو چائنا نے بھی انفرادی ملکیت میں دے رکھے ہیں۔ بہرحال کچھ آزادی تو دینی پڑے گی، کامل مساوات تو ممکن نہیں — RUSSIA بھی ایک حد کو جا کر وہیں پہ واپس آیا ہے۔ نجی ملکیّت کو ایک محدود پیمانے پر (LIMITED SCALE) پھر جاری کرنا پڑا ہے۔ یہ فطرتِ انسانی ہے بیشک مساوات بھی مطلوب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک کو تو کھا کھا کے ہیضہ ہو رہا ہے اور ایک نِن جویں کا محتاج ہے۔ لیکن اس کی خاطر انسان کو اس طرح پابند کر دیا کہ آزادی بالکل ہی سلب ہو جائے، یہ بھی فطرت کے خلاف ہے، کیا کریں بڑا مشکل معاملہ ہے۔ تاریخِ انسانی انہی مسائل میں ٹھوکریں کھا رہی ہے، ایک بند کھولتے ہیں تو دوسرے کئی

ب ہم سُنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔ حُریّت کا اِس سے اُونچا کوئی معاملہ انسان نے کبھی پہلے دیکھا نہ اس کے بعد۔ ایک گورنر نے اپنے گھر کے باہر ڈیوڑھی بنالی تھی۔ آخر وہ گورنر ہے اُسے کوئی وقت آرام کے لئے بھی چاہیئے، یہ تو نہیں کہ جو چاہے اور جب چاہے منہ اُٹھائے، اندر چلا جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے، لیکن اس پر بھی قصرِ خلافت سے (یہ قصر کا لفظ بھی مَیں نے ایسے ہی کہہ دیا، حالانکہ وہاں قصر یا محل نام کی تو کوئی چیز تھی نہیں) بہرحال دار الخلافہ کی جانب سے ڈانٹ پڑی کہ لوگوں کو اُن کی ماؤں نے آزاد جنا ہے، تم نے انہیں اپنا غلام کب سے بنا لیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ڈیوڑھی مسمار کروا دی۔ آرڈی ننس نافذ ہوتا ہے کہ حق مہر فلاں حد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے، آرڈی ننس ہے عمر فاروق رضؓ کا، مگر ایک عورت اٹھتی ہے اور کہتی ہے کہ عمر! جس حق کی کوئی حد نہ اللہ تعالیٰ نے قائم کی، نہ اللہ کے رسول ﷺ نے، تم کون ہوتے ہو اُس کی حد مقرر کرنے والے۔ اور عمرؓ بلا تأمل کہتے ہیں کہ آج ایک بڑھیا نے عمر کو دین سکھایا، یہ کہہ کر آرڈی ننس واپس لے لیا۔۔ یہ ہے آزادی۔ اگر آزادی کسی چڑیا کا نام ہے تو اس سے بڑی آزادی کا تصوّر نا ممکن ہے۔ اس آزادی کے ساتھ اب آپ تصوّر کیجئے مساوات کا۔ وہ مساوات نہیں کہ آپ نے سو آدمیوں کو ایک رسّے سے باندھ دیا اور کہا کہ دوڑو، اور آپ خوش ہو گئے کہ اس طرح وہ دوڑ میں مساوی رہیں گے، نہ کوئی آگے ہوگا نہ پیچھے۔ ایسی مساوات نہیں بلکہ وہ مساوات کہ دوڑنے کی بھی پوری آزادی ہے۔ چونکہ شخصی ملکیت ایک INCENTIVE ہے، اس لئے اسلام میں اِس کی پوری آزادی ہے، لیکن اس دوڑ میں آگے پیچھے رہنے کا امکان پیدا ہو جائے گا۔ یہ دو اور دو چار کی طرح ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔ اب یا تو رسّے سے سب کو باندھ دیجئے، کوئی نہ آگے رہیگا نہ پیچھے۔ مگر جب کھُلا چھوڑیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی آگے آئے گا اور کوئی پیچھے۔ اسلام اس تفاوت کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا نظامِ معاشیات ایسا عادلانہ ہے کہ اس میں ایک RATIO اور PROPORTION ہوتی ہے۔ آگے والوں سے کیا لیا جائیگا اور پیچھے رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کو UND-ER WRITE کر دیا جائے گا۔ وہ بہرحال اُن کو مل کر رہے گا، لکیر کھینچ دی گئی۔ چاہے تو جدید اصطلاح میں HAVES اور HAVENOTS کہہ لیجئے، چاہے فقیر اور غنی۔ فقیر کون ہے؟ جس کے پاس سات تولے سونا نہیں ہے، چھ تولے ہے تو کوئی حرج نہیں

سے نجات پانے کے لئے ایک نئی تحریک چلی۔ چنانچہ اب جو انسان نے سوچا تو سوشلزم (SOCIALISM) کہہ لیجئے یا کمیونزم (COMMUNISM) کہہ لیجئے، ایک پارٹی سٹیٹ قائم ہو گئی۔ یہ پارٹی اب BIG LAND LORD ہے، BIG زمیندار ہے۔ BIG سرمایہ دار ہے۔ آپ کی آزادی سلب، جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے۔ اس پس منظر میں دیکھئے کہ جو نظام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا، اور جس کی برکات کا ظہور خلافتِ راشدہ میں ہوا، وہ کیا تھا۔ آزادی کا یہ عالم ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ مسجدِ نبوی میں خطبہ دے رہے ہیں۔ (یہاں یہ عرض کر دوں کہ یہ خطیب، امام اُن میں سے نہیں جن کے متعلق علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ؎

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے ✤ اس کو کیا سمجھیں بیچارے یہ دو رکعت کے امام

بلکہ عمر فاروق خلیفۂ وقت ہیں!) ایسے میں ایک شخص کھڑا ہو جاتا ہے، جس نے پھٹا پُرانا کمبل پہن رکھا ہے اور عمر فاروق رضؓ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: "لا سمع ولا طاعة" کہ نہ کوئی بات سُنیں گے اور نہ ہی اطاعت کریں گے۔ یہ کلمۂ بغاوت ہے۔ عمر فاروق رضؓ پوچھتے ہیں، کیوں بھائی! وہ شخص جواب دیتا ہے کہ آپ نے جو کُرتہ پہن رکھا ہے وہ مالِ غنیمت کی چادروں سے بنا ہے۔ ہر مسلمان کو اس سے جتنا حصّہ ملا ہے اس سے کُرتہ نہیں بنتا، آپ جیسے طویل القامت شخص کا اس سے کُرتہ کیسے بن گیا۔ جواب دیجئے کہیں خیانت تو نہیں ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا تھا: "اگر میں سیدھا چلوں تو میری اطاعت تم پر واجب ہے، اور اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرنا تم پر لازم ہے!" تو یہ درویش بھی عمر فاروقؓ کو سیدھا کر رہا ہے۔

اب آپ غور کیجئے، بہتر ین سے بہترین جمہوری ملک میں بھی صدرِ مملکت، صدرِ ریاست (HEAD OF THE STATE) کو کتنا تحفّظ دیا جاتا ہے۔ اس کو عدالت میں طلب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ذاتی معاملات کو زیرِ بحث نہیں لایا جا سکتا، اور یہاں معاملہ صرف ایک معمولی کرتے کا ہے۔ اس پر بھی جواب طلبی ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا کہ تم بتاؤ، انہوں نے کھڑے ہو کر TESTIFY کیا کہ میں نے اپنے حصّے کا کپڑا بھی اباجان کو دے دیا تھا۔ کیونکہ کُرتا نہ میرا بن رہا تھا نہ اُن کا۔ اس طرح اُن کا کرتہ بن گیا۔ اس پر وہ درویش کہتا ہے کہ: "الآن نسمع ونطیع!" کہ ہاں،

ہا، خونریزیوں کے بعد جائے گی، تجربے کرے گی- ان تجربوں سے نا معلوم کتنا کچھ نقصان ہوگا۔ ہم چار و ناچار پہنچے گی وہیں۔ ے

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو ۔ آنکہ از خاکش بروید آرزو

یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہاست ۔ یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ است

پیرا عظم چین چو- این- لائی کی بیٹی سائیکل پر سکول جاتی ہے- اپنی جگہ یہ واقعی ایک قابلِ تعریف بات ہے- اس سے ہمارے ذہنوں پر بڑا رعب طاری ہو جاتا ہے، لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے ۔ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اب اس مساوات کو دیکھئے حضرت عمر فاروق بہ نفسِ نفیس شہر بیت المقدس کا چارج لینے جا رہے ہیں، کیونکہ مسلمانوں نے محاصرہ کر رکھا ہے۔ شہر کی فصیلیں بڑی مضبوط ہیں، شہر اپنی ضروریات میں خود کفیل ہے۔ راشن بہت، پینے کے لئے پانی بہت۔ اہلِ شہر کے لئے کوئی خاص دقت نہیں تھی، فصیلیں اور دروازے بند کئے بیٹھے ہیں۔ خود ان کی طرف سے پیشکش ہوتی ہے۔ پادری سفید جھنڈے لئے ہوئے فصیل پر آتے ہیں اور کہتے ہیں: مسلمانو! تم قیامت تک بھی یہاں پڑے رہوگے تو شہر فتح نہیں ہوگا۔ ہاں! ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ شہر فتح ہوگا تو ایک درویش بادشاہ کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ اس کے کچھ اوصاف ہیں، کچھ علامات ہیں، وہ ہمارے ہاں لکھی ہوئی ہیں، تم میں ہمیں ویسا کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ سُن کر ایک دم حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ بادشاہ تو عمرؓ ہے۔ اس لئے دارالخلافہ میں اُن کے تشریف لانے کے لئے عرضداشت بھیجی گئی۔ چنانچہ تشریف لائے۔ پادریوں نے کہا تھا کہ اگر وہ درویش بادشاہ خود آجائے تو ہم شہر کے دروازے کھول دیں گے، اور اس کے حوالے کر دیں گے۔ آپ کو کسی خونریزی کی ضرورت نہیں، یہ تھا مقصد سفر کا۔

یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ کوئی پرائیویٹ VISIT نہ تھی، STATE — VISIT تھی اور اس سے زیادہ اہم سرکاری VISIT کون سی ہوگی۔ مدینے سے بیت المقدس تک کا کتنا لمبا سفر ہے، اگر ہزار نہیں تو لگ بھگ سات سو میل تو ضرور ہوگا۔ EXACTLY نہیں کہہ سکتا، آپ سوچتے ہوں گے، ساتھ بڑا لاؤ لشکر ہوگا۔ ENTUR-AGE، خدم و حشم، سیکرٹری، باڈی گارڈ ہوں گے۔ مگر یہاں کیا ہے؟ تنہا عمرؓ، ایک

وہ فقیر ہے اور زکوٰۃ لینے کا حقدار ہے۔ جو لوگ اس پالے سے ادھر ہیں وہ اغنیاء ہیں۔ ساڑھے سات تولے سونا اور باون تولے چاندی یہ نصاب ہے، یہ ایک حد ہے۔ جو اُدھر چلے گئے وہ اغنیاء ہیں، جو اِدھر رہ گئے وہ فقراء ہیں۔

زکوٰۃ کیا ہے؟ تؤخذ من اغنیاء ھم و ترد الیٰ فقراء ھم۔ اگرچہ بات لمبی ہو رہی ہے، تاہم میں عرض کر دوں کہ دُنیا میں اس وقت جو معاشرے ہیں ان میں انگریزی معاشرہ بڑا UNIQUE ہے۔ اِس قوم میں ایک طرف تو روایت پرستی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ہر نئی چیز کے لئے کان کھلے بھی رکھتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں متضاد ہیں۔ جو نئی بات آئے گی، اُس پر کھلے دل سے غور کریں گے، سوچیں گے اور اس میں جو اچھا پہلو ہوگا، لے لیں گے: "خُذ مَا صَفَا وَدَع مَا کَدِر!" مثلاً بادشاہت سے جمہوریت تک کا سفر طے کیا، خون کسی نے دیا، فرانسیسیوں نے، انقلاب کہیں آیا۔ خون کی ندیاں کہیں بہیں۔ لیکن بہترین جمہوریت کون لے گیا۔ انگریز۔ اس کے باوجود بادشاہت برقرار، روایت کی روایت قائم اور جمہوریت کی جمہوریت۔ بالشویک ریوولیوشن (BOLSHVEK REVOLUTION) آیا RUSSIA میں SOCIALIST-ECONOMY کا تجربہ وہاں ہوا، خون ریزی ہوئی اور SOCIALISM اور CAPITALISM کا امتزاج کہاں ہو رہا ہے، U-K میں SUBSIST-ANCE ALLOWANCE کون دے رہا ہے؟ U.K. لیکن ساتھ ہی آزادی بھی برقرار ہے۔ اگر آپ UNEMPLOYED ہیں تو STATE آپ کی بنیادی ضروریات کو UNDER-WRITE کر دے گی، وہ آپ کو مہیا کرے گی۔ آپ اسے ہفتہ وار لے لیجئے تاکہ آپ کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ یہ اصل میں SYNTHESIS ہے۔ اور یہ وہ SYNTHESIS ہے جو اپنے آخری نقطۂ عروج پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ انسان ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچے گا، بڑی خونریزیوں کے بعد وہاں پہنچے گا، پہنچے گا لامحالہ وہیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ کہیں اور جائے۔ یہی خیال ہے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کا، جس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب: "IDEOLOGY OF FUTURE" میں کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مستقبل کا نظریۂ حیات اسلام ہے۔ چار و ناچار نوعِ انسانی ادھر جا رہی ہے لیکن وہ ٹھوکریں کھا کر جائے گی، دھکے کھا کر جائے

رُودادِ سفر

ڈاکٹر اسرار احمد

"سِیرُوا فِی الْاَرْضِ" سے طبعی مناسبت

سیر و سفر کا شوق یوں تو غالباً راقم کی گھٹی ہی میں پڑا ہوا تھا، لیکن زندگی کا رُخ رفتہ رفتہ کچھ ایسے انداز میں ایک خاص سمت میں مڑتا چلا گیا کہ بیرونی ممالک کے سفر کی نوبت بہت تاخیر سے آسکی۔

گھٹی میں پڑے ہونے کی گواہی تو اس ایک واقعے سے بھی مل جاتی ہے کہ ابھی تیسری جماعت ہی میں پڑھتا تھا، اور میری عمر کا وہ ساتواں یا زیادہ سے زیادہ آٹھواں سال ہو گا جب میں نے بغیر کسی بزرگ کی رفاقت و نگرانی کے اپنے ہی ایک ہم عمر اور ہم جماعت کی معیت میں حصار سے دہلی تک کا سفر کر ڈالا تھا، اور دہلی کی خوب سیر کی تھی۔ اس سفر کے بہت سے گفتنی و ناگفتنی واقعات مجھے اب تک اچھی طرح یاد ہیں۔ اور اب ذکر آ ہی گیا ہے تو ایک بات کا تذکرہ تو غالباً بے محل نہ ہو گا کہ اُن دنوں (یہ غالباً ۱۹۴۰ء کے جولائی یا اگست کا واقعہ ہے) دہلی میں جامع مسجد کے مشرقی جانب واقع پارک میں کوئی آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ دہلی میں میں اپنے چھوٹے ماموں صغیر احمد جان صغیر مرحوم کے ہاں مقیم تھا۔ خود انہیں تو غالباً اس کانفرنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، البتہ اُن کی اہلیہ محترمہ مجھے ساتھ لے کر اس میں گئی تھیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہاں ایک مقرر نے بڑی گھن گرج کے ساتھ خطاب فرمایا تھا، اور اُن کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ اس ناسمجھی اور بے شعوری کے عالم میں بھی اس تقریر کا کچھ ایسا نقش میرے تحت الشعور میں قائم ہو گیا تھا کہ لگ بھگ بیس سال بعد غالباً ۱۹۶۰ء میں منٹگمری (حال ساہیوال) میں ایک اہل حدیث کانفرنس جامع مسجد مولوی عبدالجلیل صاحب میں منعقد ہوئی اور اس

اُونٹنی، ایک غلام، اس عالم میں سفر ہو رہا ہے۔ ایک منزل عمرؓ اونٹنی پر سوار ہوتے ہیں اور نکیل غلام کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگلی منزل میں غلام سوار ہے اور مہار پکڑے عمرؓ پیدل چل رہے ہیں۔ یہ دُنیا دس بار ختم ہو کر پھر پیدا ہوئے تو بھی اس مساوات کی کیا، اس کے آس پاس کی مثال بھی پیش نہیں کر سکتی۔ نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مثل ممکن اور نہ خلافتِ راشدہ کی مثال ممکن۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے انتقال پر ایک بات کہی تھی کہ اے ابوبکرؓ تم اپنے بعد آنے والے کے لئے بڑی سختی پیدا کر گئے، ایسا معیار قائم کر گئے جس پر پورا اُترنا آسان نہیں۔ بہرحال ہمارا معیار اور IDEAL یہی نظام ہے جو یہ حضرات قائم کر گئے۔ THESE ARE NOT FAIRY TALES۔ یہ پریوں کی کہانیاں نہیں ہیں۔ یہ تاریخی حقائق ہیں۔ یہ نظام قائم ہوا ہے، بالفعل قائم ہوا ہے، دُنیا کی شہادت ہے کہ قائم ہوا ہے۔ اس شہادت کی ایک ECHO سمجھئے یا صدائے بازگشت کہیئے جو اس صدی کے آغاز میں مہاتما گاندھی کی زبان سے اُس وقت بُلند ہوئی جب کانگرس کی PROVI-NCIAL CABNETS۔ بنی تھیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس نے کسی اشوک، کسی وکرماجیت، کسی چندر گپت موریا اور کسی رام چند کی مثال پیش نہیں کی۔ کی تو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی۔ یہ ہے میری گفتگو کا موضوع، جسے میں نے "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!" کے مصداق، شاید ذرا زیادہ پھیلا دیا۔ بہرحال یہ ہے اتمامِ حجت، یہ ہے بعثتِ انبیاء کی غرض و غایت اور یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا تقاضا۔ ایک نظامِ عدلِ اجتماعی کے لئے پوری انقلابی جدّوجہد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور پھر اُس کے خلاف اٹھنے والی COUNTER REVO-LUTIONARY FORCES سے خلیفۂ کامل، خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نبرد آزما ہوئے اور بالکل ایک SETTLED معاشرہ دے کر رخصت ہوئے۔ اب اس چمن میں جس میں ہل چل چکے تھے، کاشتکاری ہوئی ہے، اور دورِ فاروقی و عثمانی میں ایک لہلہاتی فصل، نوعِ انسانی کے لئے نظامِ عدلِ اجتماعی کے عملی نمونے کی صورت میں جملہ برکات کے ساتھ ظہور میں آتی ہے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

توسیع و تنظیم کے ضمن میں مسلسل جاری رہتا تھا۔ قصّہ مختصر یہ کہ جو چھٹی بھی بغیر سفر گذرتی تھی، اس کے خالی خالی سے گذر جانے کا شدید احساس ہوتا تھا اور جی چاہتا تھا کہ معاملہ وہی ہو کہ

"ہر صبح سفر، ہر شام سفر ٭ اس زندگی کا ہے نام سفر!"

جولائی اگست ۱۹۴۶ء کے ایک یادگار سفر کا ذکر بھی اس مرحلے پر بے محل نہ ہوگا۔ یہ سفر مَیں نے بھائی اظہار احمد صاحب کی معیّت میں کیا تھا۔ سبب سفر یہ تھا کہ پھوپھی زاد بھائی شیخ نصیر احمد صاحب (مرحوم) کے بارے میں یہ فیصلہ کہ انہیں انجینئرنگ اسکول رسول میں داخل کرایا جائے بعض وجوہات سے بہت تاخیر سے ہو سکا تھا اور اب درخواست داخلہ کی مدّت ختم ہو رہی تھی اور بذریعہ ڈاک درخواست کی ترسیل کی کوئی صورت نہ تھی۔ صرف ایک امکان تھا کہ کوئی سفر کر کے وہاں جائے اور خود درخواست پہنچا دے: "اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں!" کے مصداق ہمیں اور کیا چاہئے تھا۔ چنانچہ بھائی جان اور مَیں حصار سے چلے اور منڈی بہاؤ الدّین پہنچے۔ وہاں سے جو ٹرالی روزانہ رسول جایا کرتی تھی، ہماری ٹرین کے لیٹ ہو جانے کے باعث وہ نکل گئی تھی۔ چنانچہ ہمیں لگ بھگ نو میل کا فاصلہ تقریباً دوڑتے ہوئے طے کرنا پڑا۔۔۔ تاہم درخواستِ داخلہ بروقت داخل کرادی گئی۔ اسی سفر میں ہم نے رسول ہیڈورکس کی بھی سیر کی اور کھیوڑہ کی نمک کی کان کو بھی خوب دیکھا۔۔۔۔ اور پھر واپسی پہ اچانک خیال آیا اور لاہور سے جانبِ پٹھانکوٹ رُخ کرلیا۔ اور دو دن "دارالاسلام" میں بسر کئے جس کا تفصیلی ذکر ان شاءَ اللہ پھر کبھی آئے گا۔

اس سے قبل ۱۹۴۶ء کے اوائل میں ایک سفر لاہور کا اور بھی کر چکا تھا جس کے دوران مَیں نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک بڑے جلسے میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے شرکت کی تھی، جس سے حبیبیہ ہال اسلامیہ کالج میں مؤسّسِ پاکستان محمّد علی جناح مرحوم نے خطاب فرمایا تھا۔

۱۹۴۷ء کے ماہ جولائی میں مجھے حصار سے پھر لاہور آنے کا موقع ملا۔ اور اس بار سفر سے ہوا۔ اس وقت کے ضلعی سربراہ یعنی ڈپٹی کمشنر اور آج پورے ملک کی عدلیہ کے سربراہ یعنی چیف جسٹس آف پاکستان شیخ انوار الحق صاحب کی معیّت میں، ۱۲ / جولائی ۱۹۴۷ء کو مَیں نے لاہور ہی میں اپنا میٹرک کا رزلٹ سُنا۔ بڑے بھائی ان دنوں انجینئرنگ کے آخری سا

میں میں نے اپنے شعور کے دور میں پہلی بار مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالوی مرحوم کی تقریر سنی وہ پرانی یاد تازہ ہوگئی اور دل و دماغ نے گواہی دی کہ یہی وہ مقرر تھے جن کی تقریر میں نے بچپن میں سُنی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد جب میں نے اس کا ذکر مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ سے کیا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی کہ واقعتہً وہ تقریر مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم ہی کی تھی اور اسی تقریر نے موصوف کو آل انڈیا شہرت عطا کی تھی۔

دہلی کا یہ سفر اس اعتبار سے آسان تھا کہ ایک تو چاہے ہم عمر ہی سہی بہرحال ایک ہم سفر ساتھ تھا اور دوسرے ایک تیز رفتار گاڑی ہریانہ ایکسپریس حصار ہی سے چلتی تھی اور صرف تین یا چار جگہ ٹھہرتی ہوئی کل تین گھنٹے میں دہلی جا پہنچتی تھی۔ لیکن دو ہی سال بعد جبکہ میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کی دعوت پر جو اُن دنوں اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم اور ریواز ہاسٹل میں مقیم تھے، میں نے بالکل تن تنہا لاہور کا سفر کیا۔ یہ سفر اس اعتبار سے زیادہ مشکل تھا کہ اس میں راستے میں بھٹنڈا ریلوے اسٹیشن پر گاڑی بھی بدلنی تھی۔ اور حصار سے جس گاڑی سے میں روانہ ہوا وہ وہیں سے چار گھنٹے لیٹ روانہ ہوئی تھی۔ گویا بھٹنڈا میں جو گاڑی مجھے لینی تھی، اُس کے ملنے کا کوئی امکان نہ رہا تھا۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کہ مجھے پوری رات بھٹنڈا ریلوے اسٹیشن ہی پر بسر کرنی پڑی اور میں ایک دن کی تاخیر سے لاہور پہنچ سکا، اور اس اثناء میں لاہور سے حصار اور حصار سے لاہور تاروں کا تبادلہ بھی ہوا اور میری گمشدگی کی اطلاع بھی لاہور پولیس کے ہاں درج ہوگئی۔

سیر و سفر کے اسی پیدائشی شوق کا نتیجہ تھا کہ ہائی سکول کا پورا عرصہ ایسے بیتا کہ جیسے ہی گرمیوں کی تعطیلات قریب آتی تھیں سفر کے پروگرام بننے شروع ہو جاتے تھے۔ کسی سال لاہور کا رُخ ہوتا تھا بھائی جان کے پاس آنے کے لئے، اور کسی سال دہلی کا ماموں جان کے یہاں۔ بلکہ اس میں اضافہ یہ ہوا کہ چونکہ بڑے ماموں محکمہ ریلوے میں ملازم تھے اور اُن کی تعیناتی بالعموم بی بی اینڈ سی آئی آر (B.B. & C.I.R) کے وسطِ ہند کے جانب کے سٹیشنوں پر ہوتی تھی۔۔۔ لہٰذا ہماری سیر کا دائرہ بھرت پور، آگرہ، گنگاپور اور دریائے چنبل پر واقع ایک حسین شہر کوٹہ بوندی تک وسیع ہوگیا تھا۔

اس وسیع تر دائرے کے علاوہ تھا ضلع حصار کے تحصیل ہیڈ کوارٹرز یعنی ہانسی اور سرسہ کے سفر کا سلسلہ جو کچھ عزیزوں سے ملنے کے لئے اور کچھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی

اس کے فوراً بعد میرے کاندھوں پر اسلامی جمعیت طلبہ کی گوناگوں ذمہ داریاں آ گئیں، اور میری تگ ودو اور دوڑ دھوپ اور لامحالہ سفر کا دائرہ پورے مغربی پاکستان کو محیط ہو گیا۔ ۱۹۵۲ء کا ایک یادگار سفر بالاکوٹ کا تھا۔ ان دنوں شورش کاشمیری مرحوم نے اپنی کسی تحریر میں جماعتِ اسلامی کے بارے میں لکھ دیا تھا کہ "کیا عجب کہ یہ تحریک بھی جو پٹھان کوٹ سے شروع ہوئی ہے، کسی بالاکوٹ پر ختم ہو جائے!" ۔۔۔ اس پر دل سے ایک ہُوک سی اٹھی اور میں فوراً چند رفقاء کے ہمراہ بالاکوٹ جا پہنچا اور شہیدین ؒ کی قبروں کی جا زیارت کی۔ واپسی پر پرانی "سیلانی طبیعت" نے جوش مارا تو ایبٹ آباد سے مری تک پیدل سفر کیا۔ اور ہمالیہ کے ایک حقیر سے گوشے ہی کو سہی، بہرحال اپنے قدموں تلے پامال کرنے کا فخر حاصل کر لیا۔

بالاکوٹ کو بجا طور پر وادیٔ کاغان کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں تو صرف اس دروازے ہی کی زیارت ہوئی تھی، لیکن اس کے بعد پہاڑوں سے بالعموم اور وادیٔ کاغان سے بالخصوص عشق کا ایک رشتہ قائم ہوا جو تا حال شدت کے ساتھ برقرار ہے۔ چنانچہ اس پورے عرصے کے دوران دوسرے، تیسرے سال لازماً وادیٔ کاغان کا چکر ضرور لگا لیتا ہوں اور کم از کم ناران تک ضرور ہو آتا ہوں، خواہ وہاں قیام صرف ایک رات ہی کا ہو سکے ۔۔۔۔۔۔ (گزشتہ سے پیوستہ سال حبیب محبتی فرید احمد محبوب ترمذی صاحب نے 'نیپا' ۸۵ء/۸۴ کے ایک گروپ کے ساتھ گلگت اور ہنزہ وغیرہ کے سفر کی دعوت دی تو اسی عشق کے ناطے میں نے فوراً لبیک کہی اور اس طرح "دُنیا کی چھت" کے ایک حصے کی بھی سیر کر لی۔)

۱۹۵۵ء کے ایک یادگار سفر کا ذکر کیے بغیر بھی گزرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُن دنوں مَیں جماعت اسلامی منٹگمری کا امیر تھا، اور جماعت کا کل پاکستان سالانہ اجتماع پھر کراچی ہی میں منعقد ہو رہا تھا۔ میں نے جماعت کے مقامی ارکان اور احباب کے ساتھ 'باجماعت' سفر کا پروگرام بنایا اور لوگوں کے احتجاج کے باوجود طے کیا کہ سفر بجائے میل یا ایکسپریس ٹرین کے پسنجر سے ہو گا۔ جب اسٹیشن پر ٹکٹ خریدنے کا مرحلہ آیا تو ریلوے والوں کو بھی حیرت ہوئی اور انہوں نے کہا کہ آج تک کوئی شخص کراچی پسنجر سے نہیں گیا۔ لہٰذا مطبوعہ ٹکٹ تو موجود نہیں ہیں البتہ خصوصی ٹکٹ بنائے دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سفر میں

کا امتحان دے رہے تھے۔ وہ فارغ ہوئے تو ہم دونوں نے براستہ امرتسر و لدھیانہ حصار کا سفر کیا۔ یہ پورا علاقہ سکھوں کا گڑھ تھا، اور اس وقت قومی و مذہبی منافرت عروج پہ تھی اور اعصاب میں شدید تناؤ پیدا ہو چکا تھا اور مجھے اب تک یاد ہے کہ پورا راستہ ہم دونوں بھائی ہندوؤں اور سکھوں کی خشمگیں نگاہوں کا ہدف بنے رہے تھے ـــ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان تجربات سے گذر چکنے کے بعد بھی "سیلانی طبیعت" نے زور لگایا اور مئی ۱۹۴۷ء کی عید الفطر کے موقع پر پھر دہلی میں تھا اور دوگانۂ عید دہلی کی تاریخی عیدگاہ میں ادا کر رہا تھا۔ وہاں سے جونہی حصار واپسی ہوئی ہندوؤں کے حملے شروع ہو گئے اور ہم حصار میں 'محصور' ہو گئے۔

ڈیڑھ ماہ سے کسی قدر زائد محصوری کے بعد وہ تاریخی سفر شروع ہوا جسے اپنی زندگی کے لانگ مارچ (MARCH) سے تعبیر کروں تو غلط نہ ہوگا۔ حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک ایک سو ستر میل کا سفر ایک پیدل قافلے کے ساتھ پورے بیس دنوں میں۔ جس کے دوران پیش آمدہ حالات و واقعات کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے اور جس کی صعوبتیں اور مصیبتیں ناقابلِ بیان ہیں، تاہم جس کا حاصل یہ ہوا کہ: ع

شکر، صد شکر کہ جمّازہ بمنزل رسید!

یعنی تحریک پاکستان کے ایک ادنیٰ اور ننھے کارکن کو پاکستان پہنچنا نصیب ہو گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد کے ابتدائی دو سالوں کے دوران والد مرحوم کی تعیناتی تو اولاً لاہور پھر قصور، پھر پتوکی اور بالآخر منٹگمری (حال ساہیوال) میں ہو گئی اور بھائی جان بحیثیت ایس ڈی او محکمہ انہار چیچہ وطنی، پاکپتن، دیپالپور ہوتے ہوئے ہرنولی (تھل، ضلع میانوالی) پہنچ گئے۔ جب کہ میں لاہور میں گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم اور کرشن نگر میں مقیم رہا۔ اس عرصے کے دوران پنجاب کے متذکرہ بالا شہروں اور قصبوں کے مابین ہی آمد و رفت جاری رہی اور کوئی طویل سفر نہ ہو سکا۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ تحریکِ جماعتِ اسلامی کے ساتھ ایک نیم شعوری لیکن گہرا قلبی تعلق قائم ہو گیا تھا اور اب توجّہ کا اصل مرکز تحریک اور اس کے دعوتی و تنظیمی اُمور تھے نہ کہ سیر و سفر۔

پاکستان میں پہلا طویل سفر اواخر ۱۹۵۱ء میں کراچی کا ہوا۔ جہاں جماعتِ اسلامی کا کل پاکستان سالانہ اجتماع منعقد ہوا تھا۔

نہ رہا جہاں ہوائی جہاز سے اترنے یا چڑھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔

جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے لگ بھگ دس سال بعد اوائل ۱۹۶۶ء میں میں ایک نئے عزم و ارادے کے ساتھ دوبارہ واردِ لاہور ہوا۔ اور جیسا کہ اکثر رفقاء و احباب کے علم میں ہے، یہیں سے میری زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ الحمدللہ کہ پورے چار سال میں نے لگ لپٹ کر پوری تندہی سے کام کیا۔ اور نہایت مختلف النوع بلکہ متضاد ذمہ داریوں کو نباہا —— چنانچہ ایک جانب میڈیکل پریکٹس بھی اور دوسری جانب "دارالاشاعت الاسلامیہ" کا قیام، حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کا اجراء اور 'میثاق' کی ادارت —— نتیجۃً ان دنوں سفر کی نوبت کم ہی آئی۔ اور ارضِ لاہور ہی تمام تر توجہات کا مرکز بنی رہی۔

• البتہ جب 'میثاق' کے بعض مضامین کے نتیجے میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگوں کے حلقے میں کچھ حرکت پیدا ہوئی تو پھر کراچی، سکھر، رحیم آباد اور رحیم یار خاں کے بعض سفر ہوئے۔ جن کے نتیجے میں اوّلاً "قراردادِ رحیم آباد" وجود میں آئی اور پھر "اجتماعِ رحیم یار خان" منعقد ہوا۔ نتیجۃً 'تنظیم اسلامی' کی 'نشاۃِ اُولیٰ' ہوئی۔ اور اس کے ضمن میں ایک یادگار سفر مولانا امین احسن اصلاحی کی معیت میں ہوا۔ چنانچہ لاہور سے بذریعۂ کار ساہیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یار خاں اور رحیم آباد ہوتے ہوئے ہم دونوں سکھر پہنچے۔ جہاں سے مولانا بذریعہ ریل کراچی تشریف لے گئے اور میں نے بقیہ سفر بھی کار ہی سے طے کیا۔ لیکن افسوس کہ بعض حوادث کی وجہ سے جن میں سے ایک اسی سفر کے دوران بمقام سکھر پیش آیا تھا۔ 'تعمیرِ نو' کی یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

وسط ۱۹۷۰ء میں متذکرہ بالا دو طرفہ بلکہ متضاد مصروفیات کی کھینچ تان اور کام کے بوجھ کی وجہ سے میری صحت خراب ہو گئی تو میں نے بحالیٔ صحت کے لئے اوّلاً بھائی جان کے یہاں جوہر آباد میں پندرہ دن آرام کیا۔ اور پھر خالص سیر اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے ایک سفر محترم اسرار الحق کی دعوت پر بھائی جان کی معیت میں مشرقی پاکستان (حال بنگلہ دیش) کا کیا۔ آٹھ دن کے اس 'طوفانی سفر' میں ہم نے نہ صرف یہ کہ ڈھاکہ، کومیلا، چاٹگانگ اور کاکسس بازار تک کی سیر کی۔ بلکہ شمال میں چائے کے باغات بھی دیکھے اور پھر سٹیمر کے ذریعے ایک سفر چاند پور سے کھلنا تک کا کیا (اور

اگلا صفحہ دیکھیں

اس وقت کی انٹر کلاس (جس کا کرایہ میل کی تھرڈ کلاس ہی کے لگ بھگ تھا) میں ہمیں وہ آرام ملا جو میل کی فرسٹ کلاس میں نہ ملتا۔ اور پورا سفر پکنک کی سی کیفیت میں گذرا۔ اگرچہ منٹگمری سے کراچی تک تاریخیں تین تبدیل ہوگئیں ۔!!

اپریل ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی سے علیحدگی ہوئی تو اس کے بعد سے لگ بھگ دو سال تک کسی 'نئی تعمیر' کی تلاش و جستجو میں "سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ" پر عمل ہوتا رہا۔ اب کبھی لاہور آنا ہوتا تھا مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں، کبھی لائلپور (حال فیصل آباد) حکیم عبدالرحیم اشرف کے پاس، کبھی رحیم آباد جانا ہوتا تھا سردار محمد اجمل خان لغاری کے یہاں، کبھی سکھر وہاں کے رفقاء سے ملاقات کے لیے، اور کبھی کراچی وہاں کے دوستوں بالخصوص ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی صاحب سے ملنے کی غرض سے۔ حتیٰ کہ ایک بار تو منٹگمری سے پریکٹس کی بساط لپیٹ کر بوریے بستر سے اور اہل و عیال سمیت کراچی جانا ہوگیا۔ لیکن جیسا کہ قارئینِ 'میثاق' کے علم میں ہے اس دشت نوردی و بادیہ پیمائی سے حاصل کچھ بھی نہ ہوسکا۔

اپریل ۱۹۶۲ء میں میرا پہلا غیر ملکی سفر ہوا —— اور الحمد للہ کہ یہ "سفر مقدس" تھا۔ یعنی برائے حج بیت اللہ و زیارتِ مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کراچی سے جدہ بذریعہ ہوائی جہاز جس دن روانگی ہوئی، وہ میری تیسویں سالگرہ کا دن تھا، یعنی ۲۶/ اپریل ۱۹۶۲ء۔ حج تو بحمد اللہ اس کے بعد بھی کئی بار نصیب ہوئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مرتبہ جو لطف آیا تھا وہ پھر کبھی نہ آیا۔ ایک تو شاید اس لئے کہ والدین کی ہمراہی کی سعادت حاصل تھی۔ چنانچہ والد مرحوم و مغفور بھی ساتھ تھے اور والدہ ماجدہ مدظلہا بھی۔ دوسرے اس لئے کہ ابھی اژدحام کی وہ کیفیت پیدا نہ ہوئی تھی جو اب ہوگئی ہے۔ اور منیٰ میں قیام کے دن واقعۃً "اَیَّامِ اکل و شرب" اور حالِ کیف و سرور ہوتے تھے ۔ واللہ اعلم ۔!!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک ایک بالکل دوسری نوعیت کے سفر کا تجربہ ہوا۔ اس دوران میں میں نے بھائی جان کی دعوت پر اُن کے تعمیراتی کاروبار میں شرکت اختیار کرلی تھی۔ لہٰذا اب کاروباری سفروں کا چکر چلا۔ چنانچہ کیماڑی سے تورخم تک سڑک کو بھی بارہا ناپنے کا موقع ملا۔ اور غالباً مغربی پاکستان کا کوئی ہوائی اڈہ بھی باقی

اس کے بعد ایک ماہ کے لئے میں برادرِ عزیز الصار احمد سلمہٗ کی دعوت پر جو، اُن دنوں وہاں پی ایچ ڈی کی تکمیل کر رہے تھے، لندن گیا ـــــ اور یہ "دیارِ مغرب" اور "تہذیب حاضر" کے ساتھ میرا "قصۂ زمین برسرِ زمین!" کی نوعیت کا پہلا معاملہ تھا ـــــ واپسی پر بلجیم کے ایک نومسلم نوجوان عبدالعزیز وان کینبٹر کی ملاقات کے لئے دو دن برسلز میں رکا ـــــ اور پھر حج بیت اللہ سے دوسری بار مشرف ہونے کے ارادے سے واپس حجاز آگیا، اور وہیں میں نے زندگی کا اہم ترین فیصلہ کیا ـــــ یعنی اب پریکٹس کو خیرباد ـــــ اور کل وقتی توت وقف برائے خدمت کتاب اللہ و اعلاءِ کلمۃ اللہ ـــ!!

الغرض اس سفر میں میں نے بقول حضرتِ اکبر اوّل و آخر تو "خدا کا گھر" دیکھا اور اس کے درمیان کچھ "خدا کی شان" بھی دیکھ لی۔

میری ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۹ء تک کی مصروفیات کا علم قارئینِ 'میثاق' کی اکثریت کو بخوبی حاصل ہے۔ اس دوران میں اندرونِ ملک سفر تو گویا زندگی کے مستقل لوازم میں شامل رہا۔ 'دعوت رجوع الی القرآن' کے 'داعی' اور 'تحریکِ تعلیم و تعلّمِ قرآن' کے 'محرک' کی حیثیت سے ملک کے طول و عرض میں میری نقل و حرکت بہت سوں کے لئے قابلِ حیرت رہی ہے تو بہت سوں کے لئے باعثِ رشک ـــ بلکہ بعض کے لئے بنائے حسد بھی! تاہم اس کا مفصل ذکر تو کیا اجمالی جائزہ بھی نہ یہاں مطلوب ہے نہ ممکن ـــــ البتہ اس کے 'اوّل و آخر' کا ذکر مناسب رہے گا ـــــ یعنی ۱۹۷۲ء کے پورے بارہ مہینے میں نے ہر ماہ کراچی کا سفر کیا اور راستے میں اکثر سکھر، صادق آباد، رحیم یار خاں اور ملتان میں سے ہر ماہ کم از کم تین مقامات پر رکنے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور یہ سب سفر ریل سے ہوئے اور اس کی تھرڈ کلاس میں (سوائے آخری ایک یا دو ماہ کے کہ ان میں بعض احباب کے اصرار پر ایک جانب کا سفر ہوائی جہاز سے ہوا۔) اور اب گذشتہ تین چار سال سے حال یہ ہے کہ ٹرین سے سفر کی نوبت شاذ و نادر ہی آتی ہے۔ حتیٰ کہ ابھی پچھلے دنوں بذریعہ ریل ساہیوال جانا ہوا تو ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی بہت پرانی بھولی بسری یاد تازہ ہوئی ہو۔

اس عرصے میں بیرونِ ملک سفر دو بار حجازِ مقدس ہی کے ہوئے۔ ایک ۱۹۷۴ء

یہی تاحال راقم کا واحد بحری سفر ہے!)

دسمبر ۱۹۷۰ء میں پاکستان کے پہلے عام انتخابات کا انعقاد طے تھا، ادھر ملک میں سیاسی افراتفری عروج پر تھی۔ چنانچہ دائیں اور بائیں بازو کی تقسیم شدّت اختیار کر چکی تھی۔ اور مذہبی جماعتوں میں سے بھی دو اسی بنیاد پر ایک دوسرے کے مقابل کھڑی تھیں۔ یعنی ایک جانب جماعت اسلامی اور دوسری جانب جمعیّۃ علماءِ اسلام۔ اس موقع پر بعض اسباب کی بنا پر جمعیّۃ العلماء کی جانب سے مجھ پر زور پڑا کہ ہمارے ٹکٹ پر الیکشن لڑو۔ مَیں اپنی کمزوریٔ طبع کی وجہ سے صاف جواب تو نہ دے سکا البتّہ ایک طویل عرصے کے لئے ملک سے باہر چلا گیا۔ یہ میری زندگی کا تاحال طویل ترین سفر ہے، جس میں مَیں اپنے مستقر سے پورے ۱۲۰ دن (تبلیغی بھائیوں کی اصطلاح میں تین چلّے) غیر حاضر رہا۔

اس سفر کے دوران پورا ماہِ رمضان مبارک مَیں نے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی اور روضۃ النّبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ٹھنڈی چھاؤں اور مولانا عبدالغفار حسن مدظلّہٗ کے سایۂ عاطفت میں گزارا۔ اور یوں تو پورا مہینہ ہی کیف و سرور کے عالم میں گزرا لیکن بالخصوص آخری عشرہ اور اس کے دوران مسجد نبوی کے "قیام اللّیل" کی لذّت کو تو واقعہ یہ ہے کہ مَیں نہ اب تک بھول سکا ہوں، نہ غالباً آئندہ کبھی بھول سکوں گا۔

۱؎ موصوف اس وقت مشرقی پاکستان پی ڈبلیو ڈی میں غالباً ڈپٹی چیف انجینئر تھے۔ اور ان کے ساتھ میری نام کی مشابہت کے علاوہ ہمارے خاندانوں میں بھی بہت سی دوسری مشابہتیں موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم بھی پانچ ہی بھائی ہیں اور وہ بھی۔ ان کے یہاں سب سے بڑے اظہار الحق ہیں اور ہمارے یہاں اظہار احمد۔ ان پانچ میں سے بھی تین انجینئر ہیں اور ہمارے یہاں بھی یہی معاملہ تھا۔ اُن میں سے بھی ایک ڈاکٹر ہیں اور ادھر مَیں نے بھی ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اگرچہ اس کا ساتھ زیادہ دیر تک نہ دے سکا۔ پھر عجیب اتفاق یہ کہ ہم دونوں کلاس فیلو بھی تھے۔ آخری، اور اہم ترین مشابہت یہ کہ ان کے بھی سب سے چھوٹے بھائی انتصار الحق نے فلسفے میں پی ایچ ڈی کیا اور ہمارے بھی سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد ہیں جنھوں نے فلسفے ہی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ پھر ان دونوں کے ناموں میں بھی لفظی مشابہت موجود ہے۔ الغرض۔ ع: "اتفاقات ہیں زمانے کے!" ☆

سے ایک دوسرا دعوت نامہ ملا جس سے معلوم ہوا کہ وہاں کوئی تازہ انتخاب ہوا ہے اور نئی مجلسِ منتظمہ نے سابقہ منتظمہ کی دعوت کی پُرزور تجدید کی ہے۔ نئے صدر عظیم الرحمٰن خاں صاحب کی جانب سے یہ نیا دعوت نامہ الیسا پُرزور تھا کہ مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ اب رختِ سفر باندھ ہی لیا جائے۔ چنانچہ سمیع اللہ خاں صاحب کو بھی مطلع کر دیا گیا کہ وہ ہالینڈ سے رابطہ قائم کر کے کوئی مشترکہ پروگرام ترتیب دے لیں۔ اور خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ سارے مراحل بہت تیزی سے طے ہو گئے، اور اُدھر فوراً یا لیٹ موسٹ پی آئی اے کا ایک دوطرفہ ٹکٹ موصول ہو گیا۔ اور اِدھر یو ایس اے اور کینیڈا دونوں کے MULTIPLE VISITS کے ویزے مل گئے۔ گویا رکاوٹ کوئی باقی نہ رہی۔

لاہور سے روانگی ہفتہ ۱۸ر اگست ۱۹۷۹ء کو شام کے ساڑھے چار بجے پی آئی اے سے ہوئی۔ اور ۱۹ر اور ۲۰ر دو دن کراچی میں قیام کے بعد ۲۰ر اور ۲۱ر کی درمیانی شب کو (فنی اعتبار سے ۲۱ر کو صبح ڈیڑھ بجے) پی آئی اے کے DC 10 طیارے کے ذریعے جانبِ مغرب روانگی ہوئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ کی پرواز کے بعد طیارہ دوبئی کے ہوائی اڈے پر اترا اور وہاں لگ بھگ ڈیڑھ گھنٹہ قیام کے بعد مزید تین گھنٹے ۲۵ منٹ میں قاہرہ پہنچا۔ اس پورے عرصے میں محسوس ایسے ہوتا رہا جیسے ہم آگے آگے بھاگ رہے ہوں اور سورج ہمیں پکڑنے کی کوشش میں پیچھے پیچھے دوڑا چلا آ رہا ہو۔ نتیجہ یہ کہ دورانِ پرواز تو وہ ہمیں نہ پکڑ سکا، البتہ قاہرہ ائیرپورٹ پر اس نے آ ہی لیا۔ (اس وقت کراچی میں سورج طلوع ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے!)۔ قاہرہ ائیرپورٹ پر نامعلوم کس وجہ سے ہمارا جہاز بھی ٹرمینل بلڈنگ سے بہت فاصلے پر کھڑا رہا اور کسی کو باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں ملی۔ ایک گھنٹے بعد وہاں سے روانگی ہوئی تو اندازہ ہوا کہ قاہرہ شہر بہت بڑا بھی ہے اور نہایت جدید بھی۔ بہرحال اب ہمارا رُخ جانبِ شمال تھا۔ اور تین گھنٹے ۵۰ منٹ کی پرواز کے بعد فرینکفرٹ پہنچا ہوا۔ وہاں بھی ایک گھنٹہ قیام رہا اور پھر کُل ۴۵ منٹ کی پرواز نے پیرس پہنچا دیا۔ جہاں پھر ایک ہی گھنٹہ قیام رہا۔

وسطی یورپ کے اِن دو ہوائی مستقروں پر نزول و صعود کے وقت کی نیچی پرواز کے دوران جرمنی اور فرانس کے جو علاقے نظر آئے اُن کی سرسبزی اور شادابی بھی حد درجہ

میں اپنی اہلیہ اور چچی صاحبہ اور رفیق مکرم ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب اور ان کی اہلیہ کی معیت میں حج کے لئے ــــ اور دوسری بار ۱۹۷۶ء میں ساہیوال کے حاجی عبدالمجید صاحب کی معیت میں بغرضِ عمرہ ــ!

امریکہ میں ڈیڑھ ماہ

لاہور اور کراچی میں درسِ قرآن کی مجالس میں بارہا ایسا ہوا کہ درس کے بعد کوئی صاحب ملے اور انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ میں بلادِ عرب میں کسی جگہ یا افریقہ و یورپ کے کسی ملک یا امریکہ میں کسی مقام پر رہتا ہوں، جہاں ہماری ہندو پاکستان سے آمدہ مسلمانوں کی کوئی سوسائٹی بھی بنی ہوئی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ سوال بھی کر دیا کہ اگر ہم اُس سوسائٹی کی جانب سے آپ کو وہاں آنے کی دعوت دیں تو کیا آپ وقت نکال سکیں گے؟ جواب میں میں غور کرنے کا وعدہ کر کے ٹالتا رہا۔ اس لئے کہ اکثر و بیشتر اندازہ یہی ہوا کہ یہ کسی وقتی سے تأثر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کی پشت پر کوئی سنجیدہ ارادہ موجود نہیں ہوتا ــــ اسی طرح کا کوئی معاملہ لاہور میں وسط ۱۹۷۸ء میں بالٹی مور (امریکہ) سے آئے ہوئے ایک ماہر امراض چشم ڈاکٹر شوکت علی صاحب سے ہوا۔ لہٰذا میں نے اِسے بھی کوئی اہمیت نہ دی۔ پھر ایسا ہی معاملہ کراچی میں جناب سمیع اللہ صاحب مقیم ٹورنٹو (کینیڈا) سے ہوا۔ اور اگرچہ وہ بہت ہی مستعد بھی نظر آئے اور سنجیدہ بھی، اور انہوں نے میری حقیر سی تالیفات سے بھی بہت دلچسپی لی، اور میرے دروس کے TAPES بھی بہت سے منگوائے تاہم یہ خیال ہرگز نہ تھا کہ اُن کی تحریک پر امریکہ کے سفر کی کوئی صورت جلد بن جائے گی لیکن ہوا یہ کہ ایک طرف تو جلد ہی ڈاکٹر شوکت علی (صدر) اور ڈاکٹر جاوید شفیع (سیکرٹری) کے دستخطوں سے اسلامی سوسائٹی آف بالٹی مور (میری لینڈ) کی جانب سے باضابطہ دعوت نامہ موصول ہو گیا۔ اور دوسری جانب ٹورنٹو میں سمیع اللہ خاں صاحب کی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں اور کچھ مطبوعات اور زیادہ تر دروسِ قرآن اور تقاریر سیرت کے TAPES کے ذریعے وہاں ایک وسیع حلقۂ تعارف پیدا ہو گیا اور ان کی جانب سے بھی کینیڈا کے دورے کی شدید خواہش کا اظہار شروع ہوا۔ اس سب کے باوجود میں اس معاملے میں سنجیدگی سے نہیں سوچ رہا تھا کہ اچانک بالٹی مور کی اُس سوسائٹی کی جانب

منتظر ہو تو وہاں ہُو کا عالم پایا۔ اب "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"! قاضی صاحب نے کتابوں کے بھی بھاری بھاری بنڈل ساتھ کر دیئے تھے، لہٰذا سامان کافی تھا۔ اب نہ میں اس قابل تھا کہ اسے چھوڑ کر کہیں بھاگ دوڑ کر سکوں، اور نہ ہی اس "غیر کی بستی" میں سڑک کے کنارے سامان سمیت کھڑے رہنے میں کوئی معقولیت نظر آتی تھی۔ ادھر جیب میں فارن ایکسچینج اب تک صرف ٹریولرز چیکس کی صورت میں تھا۔ گویا نہ لوکل کرنسی ہی تھی نہ ریزگاری۔ ایک پورٹر سے درخواست کرکے عظیم الرحمٰن خاں صاحب کے گھر فون کرایا تو معلوم ہوا کہ اُن کا گھر سکاربرو کورٹ آرنلڈ میں ہے جو وہاں سے لگ بھگ تیس میل دُور ہے اور خود وہ اس وقت بالٹی مور کے وسط شہر (DOWN-TOWN) میں واقع اسلامی مرکز میں تراویح پڑھنے گئے ہیں، جس کا فاصلہ اُن کے گھر سے کوئی بیس میل ہے، اور وہاں آج ختمِ قرآن بھی ہے۔ لہٰذا فراغت روزانہ کے مقابلے میں تاخیر سے ہوگی۔ گویا تین چار گھنٹے سے قبل اُن کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے ـــــ چنانچہ چارو ناچار نہایت بے بسی کے عالم میں یہ چار گھنٹے ایئرپورٹ پر انتظار میں بسر کئے۔ تا آنکہ وہ واپس گھر پہنچے اور اُن کے علم میں بات آئی تو انہوں نے عقلمندی کی اور ایئرپورٹ سے نسبتاً قریب رہنے والے رفیق سیّد ساجد حسین صاحب کو فون کر دیا جو عبدالقیوم صاحب کی معیّت میں فوراً ایئرپورٹ پہنچے اور مجھے گلن برنی میں واقع اپنے مکان پر لے گئے۔ وہاں پہنچ کر وقت دیکھا تو رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ بہرحال یہ اطمینان تھا کہ کسمپرسی کا عالم ختم ہوا اور اب خواہ "دیارِ غیر" ہی میں سہی تاہم اپنوں کے ہاتھوں میں ہوں۔ اس وقت یہ شعر بہت مناسبِ حال محسوس ہوا کہ : ؎

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ⁂ ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے!

بالٹی مور ــــ واشنگٹن

بالٹی مور اور واشنگٹن کے مابین اگرچہ ساٹھ ستّر میل کا فاصلہ ہے، لیکن امریکہ کے حساب سے انہیں TWIN CITIES قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں کی انٹرنیشنل ایئرپورٹ مشترکہ ہے جو دونوں کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ اس علاقے میں میں پورے دن گھومتا رہا۔ یعنی ۲۲ اگست تا یکم ستمبر ـــ اس دوران میرا قیام زیادہ تر سیّد ساجد حسین صاحب کے مکان پر رہا۔ یہ یو پی کے ضلع فتح پور سے تعلق رکھتے ہیں

دل کو لبھانے والی محسوس ہوئی، اور دونوں شہروں کے فضائی نظارے اور ہوائی اڈوں کی وسعت و عظمت، چہل پہل اور حُسنِ انتظام سے مشرق و مغرب کا فرق بھی پوری طرح واضح ہوگیا۔

پیرس سے TRANS-ATLANTIC پرواز شروع ہوئی تو اب معاملہ برعکس ہوگیا۔ یعنی سورج ہمارے آگے آگے تھا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے وہ غریب دن بھر کے طویل سفر کا تھکا ماندہ غروب ہونے کی فکر میں ہو تاکہ رات کی تاریکی میں آرام کرسکے اور ہم ڈنڈا لیئے اُس کے پیچھے دوڑ رہے ہوں کہ تجھے ڈوبنے نہ دیں گے۔ پورے آٹھ گھنٹے تک یہ تعاقب جاری رہا، یہاں تک کہ جب ہمارا جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر اُتر کر ساکن ہوگیا، تب سورج کو بھی مہلت ملی کہ جلدی سے بسترِ افق میں گھس کر رات کی تاریکی کی چادر تان لے۔ وقت کا گورکھ دھندا ملاحظہ ہو کہ ہم پیرس سے چلے تو وہاں کے مقامی وقت کے مطابق سہ پہر کے ساڑھے تین بجے تھے — اور جب آٹھ گھنٹے کی پرواز کے بعد نیویارک پہنچے تو وہاں ابھی شام کے صرف ساڑھے پانچ بجے تھے۔ اور اِدھر پاکستان میں تاریخ بدل چکی تھی اور کراچی میں رات کے ڈھائی بجے کا سماں تھا۔

کسٹم اور امیگریشن کے معاملات سے فارغ ہو کر انٹرنیشنل ونگ سے باہر آیا، اور لوکل ایئرلائنز میں سے ALLEGHENNY ایئرلائن کے ٹرمینل پر پہنچا۔ وہاں سے دو گھنٹے بعد پرواز مل گئی جس نے کُل ۴۵ منٹ میں بالٹی مور واشنگٹن انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر لا اُتارا۔ اس وقت وہاں ۲۱ر اگست کی رات کے ساڑھے نو بجے کا عمل تھا، جبکہ کراچی میں ۲۲ر کی صبح کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

اور اسی فرق نے میرے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی۔ رفیقِ مکرّم قاضی عبدالقادر صاحب نے جو تار میری آمد کے سلسلے میں بالٹی مور دیا تھا اس میں غالباً پرواز کے گھنٹوں (FLYING HOURS) کا حساب کتاب جوڑ کر میری آمد کی تاریخ ۲۲ر درج کر دی تھی، لہٰذا میں اپنے میزبانوں کی توقع سے ایک دن قبل پہنچ گیا۔ اِدھر میں پوری طرح مطمئن تھا کہ کوئی نہ کوئی ایئرپورٹ پر ضرور آجائے گا۔ چنانچہ پہلے تو ملی فرنج میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، پھر چاروناچار اپنا سامان لے کر باہر آیا کہ شاید کوئی وہاں

عرب کی حکومت اور رابطۂ عالمِ اسلامی کی کوششوں کو کافی دخل حاصل ہے۔ چنانچہ سعودی عرب کی حکومت ہر سال اس کمیونٹی کے ۲۰ افراد کو اپنے خرچ پر سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے حج کراتی ہے ـــــ یہاں نمازِ جمعہ تو مقامی امام صاحب ہی نے پڑھائی البتہ اس کے بعد مَیں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سورۂ حج کی آخری دو آیات کا درس دیا۔ نمازِ جمعہ کے بعد عظیم صاحب کے مکان پر احباب کا ایک اجتماع تھا۔ وہاں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ سیاسی اور مذہبی میدان میں نقطہ ہائے نظر اور زاویہ ہائے نگاہ کے جو اختلافات اپنے ملک میں پائے جاتے ہیں، وہ سب یہاں بھی بہ تمام و کمال موجود ہیں۔

ہفتہ ۲۵ر اگست کا تقریباً پورا دن ڈاکٹر مشتاق صاحب کے یہاں گذرا۔ جن سے پہلی ملاقات عید کی نماز میں ہوئی تھی۔ اُن کا تعلق پاکستان میں فیصل آباد سے ہے اور وہ نہایت نیک دل اور دیندار انسان ہیں۔ بنیادی طور پر B. V. SC. تھے لیکن پھر ڈھیروں علم حاصل کیا، اور اب امریکہ کی فیڈرل سول سروس میں غذا اور ادویات کے کنٹرول کے محکمے میں اعلیٰ عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ دفتر واشنگٹن میں ہے لیکن مکان جو نہایت کشادہ بھی ہے اور حد درجہ خوبصورت اور مرصّع و مسجّع بھی، میری لینڈ کے قصبہ فلمنٹن کے نواح میں ایک پہاڑی پر بنایا ہے، جہاں سے دفتر کا فاصلہ تیس میل سے کم نہیں۔ ان کی اہلیہ جو حد درجہ سادہ مزاج خاتون ہیں اور ان کے بچّے (ایک بیٹی اور تین بیٹے) بھی بیک وقت نہایت ذہین بھی ہیں اور بہت نیک بھی ـــــ واقعہ یہ ہے کہ سرزمینِ امریکہ میں اس گھرانے کو دیکھ کر شدید حیرت کا احساس بھی ہوا، اور حد درجہ مسرّت بھی حاصل ہوئی۔

مشتاق صاحب نے اپنے بعض احباب کو بھی مدعو کیا ہوا تھا اور وہ بھی بمعہ اہل و عیال آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہاں درسِ قرآن کی دو مجلسیں ہوئیں، ایک کھانے سے پہلے اور دوسری کھانے کے بعد ـــــ پہلی میں سورت والعصر کا بیان ہوا اور دوسری میں آیۂ بِرّ کا۔

اتوار ۲۶ر اگست کو دس بجے صبح جان ہاپکنز یونیورسٹی بالٹی مور کے شیفر ہال میں ایک اجتماع منعقد ہوا، جس میں مَیں نے اوّلاً 'حقیقتِ جہاد' کے موضوع پر اُردو میں تقریر کی جس کا ترجمہ ڈاکٹر جاوید شفیع صاحب نے انگریزی میں کیا جو کسی طرح بھی اطمینان بخش نہ تھا۔ چنانچہ جب سوال جواب کا مرحلہ آیا تو مَیں نے خود ہی انگریزی میں جواب دینے شروع کر دیئے اور ایک مستفسر کی شوخی پر ذرا برہم ہو کر جس روانی کے ساتھ مَیں نے انگریزی میں تقریر کی اس

ان کے دادا گورنمنٹ کنٹریکٹر تھے۔ اور انہوں نے ذاتی محنت سے بہت اونچا مقام حاصل کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کے نجی مراسم مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے ایسے اعاظمِ رجال سے تھے۔ پاکستان آکر انہیں نہایت نامساعد حالات کا سامنا رہا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح عزت و وقار کے ساتھ دن گذار دیئے۔ ان کے بیٹے اور ساجد صاحب کے والدِ ماجد آج کل کراچی میں ناظم آباد میں مقیم ہیں اور خود ساجد صاحب کئی سال سے امریکہ میں ہیں۔ اُس وقت وہ ایک ادویہ سازی کی فرم میں کام کر رہے تھے، لیکن ڈومینکن ریپبلک میں میڈیکل کالج میں داخلہ لے چکے تھے اور کچھ ہی دنوں میں وہاں جانے والے تھے۔ اُن دنوں ان کے ساتھ ہی عبدالقیوم صاحب بھی مقیم تھے، جن کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ اور جو بالٹی مور کی میونسپل کمیٹی میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ اتفاق سے ان دونوں حضرات کے بچے اُن دنوں پاکستان آئے ہوئے تھے۔ نتیجۃً اُن کا "خانۂ خالی" "غریب الدیار" لوگوں کی قیام گاہ بن رہا تھا۔ اُن کے یہاں جو بستر مجھے ملا، معلوم ہوا کہ اسی پر مجھ سے کچھ ہی دن پہلے جناب نعیم صدیقی اور ان سے چند ماہ قبل برادرم خرم جاہ مراد سوتے رہے ہیں۔ سید ساجد حسین اور جناب عبدالقیوم دونوں ہی نہایت مخلص مسلمان ہیں۔ اُن کی محبت بھری مہمان نوازی عرصۂ دراز تک یاد رہے گی۔

۲۲ر اور ۲۳ر دو دن آرام کرتے ہوئے گذرے۔ ۲۲ر کی افطاری ہم سب نے عظیم الرحمٰن خاں کے مکان پر کی۔

۲۴ر اگست کو جمعہ بھی تھا اور عید الفطر بھی۔ عید الفطر کی نماز میں نے بالٹی مور کے وسطِ شہر سے بہت قریب واقع اُس کھلے پلاٹ میں پڑھائی جو وہاں کی اسلامی سوسائٹی نے اسلامی مرکز کی تعمیر کے لئے خرید لیا ہے۔ موسم ابر آلود تھا اور ہر آن اندیشہ تھا کہ بارش نہ شروع ہو جائے۔ لہٰذا حاضری کم تھی اور زیادہ تر لوگ DOWN TOWN میں واقع 'مسجد محمد' چلے گئے تھے ـــــ خود ہم بھی نمازِ جمعہ کے لئے وہیں گئے۔ یہ اُن سیاہ فام امریکی مسلمانوں کی مسجد ہے جو آنجہانی علی جاہ محمد کے پیرو تھے اور جن کے موجودہ لیڈر اس کے بیٹے والیس محمد (WALLACE MOHAMMAD) ہیں۔ جنہیں یہ لوگ 'امام' کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ علی جاہ خود تو نہایت گمراہ انسان تھا اور اپنے آپ کو نبی اور رسول ہی نہیں خدا کا اوتار بھی سمجھتا تھا۔ لیکن والیس محمد کافی حد تک صحیح رُخ پر آ چکے ہیں، اور اس میں سعودی

کو مدعو کیا تھا۔ لیکن اس روز بھی طوفانی بارش ہوئی اور بہت کم لوگ آسکے۔ بہرحال شام کی چائے کے بعد درس کی ایک نشست ہوئی اور اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے مکان کو جاتے ہوئے ایک زیر سمندر سرنگ سے گذرنا ہوا تو عجیب سا احساس ہوا کہ ہماری کار اس وقت لاکھوں ٹن پانی کے نیچے دوڑ رہی ہے۔

بدھ ۲۹ اگست کو واشنگٹن کا دوسرا چکر لگا۔ اور وہ اس طرح کہ صبح تقریباً آٹھ بجے ساجد صاحب کے مکان سے عظیم صاحب کے ساتھ اُن کی کار پر روانگی ہوئی۔ انہوں نے ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد واشنگٹن کے شمالی مضافات میں نارتھ کیرولٹن کے اسٹیشن پر زیر زمین ریل (METRO) میں سوار کرادیا۔ اس طرح واشنگٹن کی SUB-WAY کی بھی سیر ہوگئی۔

دس بجے فیڈرل سنٹر سٹیشن پر مشتاق صاحب مل گئے۔ اُن کے ساتھ دو میل کا پیدل مارچ کیا اور ان ہی کی معیّت میں "قصرِ سفید" کی سیر کی۔ اس سے فارغ ہو کر یادگارِ واشنگٹن (WASHINGTON MONUMENT) پر آگئے۔ وہاں عظیم صاحب بھی دوبارہ مل گئے اور انہی کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر انہی کے ساتھ MONUMENT TOWER پر چڑھنا ہوا۔ ٹاور کے اوپر سے واشنگٹن کا منظر بڑا عجیب تھا۔ وہائٹ ہاؤس، کیپیٹل بلڈنگ اور جیفرسن میموریل سب چھوٹے چھوٹے گھروندوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ ایک جانب دریا بہتا دکھائی دے رہا تھا اور اُس کے پار واشنگٹن نیشنل ایئرپورٹ کا پورا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ الغرض خوب سیر رہی۔ شام کو عظیم صاحب ہی کے ساتھ ساجد صاحب کے مکان پر واپسی ہوئی۔

جمعرات ۳۰ اگست کو اوّل وقت آرام کیا۔ دوپہر کو وسیم صاحب آگئے اور اپنی گاڑی پر ڈاکٹر جاوید شفیع کے کلینک پر لے گئے۔ وہاں سے ان کے ہمراہ ان کے گھر جانا ہوا۔ جہاں انہوں نے بہت سے احباب کو مدعو کیا ہوا تھا۔ شام کی چائے کے بعد درس کی محفل جمی۔ سورۂ حج کی آخری دو آیات کا مفصّل درس ہوا۔

جمعہ ۳۱ اگست کو واشنگٹن کا تیسرا اور آخری چکر مشتاق صاحب ہی کی ہمراہی میں لگا۔ جہاں واپسی کے سفر کے لئے براستہ قاہرہ و جدّہ پی آئی اے سے بکنگ کرائی۔ اور نمازِ جمعہ واشنگٹن کے مشہور اسلامک سنٹر میں ادا کی۔ نماز سے قبل تقریباً نصف گھنٹہ ایک مصری قاری صاحب نے قرآنِ حکیم کی قراءت فرمائی، جس سے واقعہ یہ ہے کہ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے بلادِ مغرب کے ان دس دنوں کا پیدا شدہ غبار

پر خود مجھے بھی شدید حیرت ہوئی اور تمام احباب کو بھی۔ ساجد صاحب، قیوم صاحب، عظیم صاحب اور مشتاق صاحب سب ہی کا کہنا تھا کہ آپ کے پاس نہ خیالات (IDEAS) کی کمی ہے نہ ذخیرۂ الفاظ (VOCABULORY) کی، پھر آپ خواہ مخواہ انگریزی میں تقریر کرنے سے کیوں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ اس پر میں نے ان سے عرض کیا کہ بھائی واقعہ یہی ہے کہ مجھے انگریزی میں گفتگو کی بالکل مشق نہیں ہے اور میں حتی الامکان اردو ہی میں خطاب کروں گا۔ تاہم نمازِ ظہر کے بعد جب دوسرا سیشن شروع ہوا تو ابتداءً میں نے پھر ترجمے کا سہارا لیا، لیکن پھر پہلی سی صورتِ حال دیکھ کر میں نے جلد ہی مترجم صاحب کو چھٹی دے دی اور انگریزی ہی میں خطاب شروع کر دیا۔ موضوع تھا: "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا طریقِ انقلاب" ــــ بعد میں اس پر بھی خاصی گرماگرم بحث رہی اور بحیثیتِ مجموعی یہ دونوں اجلاس بہت کامیاب رہے۔ شام کو میں مشتاق صاحب کے مکان آ گیا، اور تقریباً دو دن وہیں مقیم رہا۔

پیر ۲۷ راگست کو ساڑھے سات بجے صبح مشتاق صاحب اور اُن کے دو بچوں کے ہمراہ واشنگٹن روانگی ہوئی۔ شہر کے بالکل مرکز میں واقع اُن کے دفتر تک پہنچنے میں پورا ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ مشتاق صاحب تو دفتر چلے گئے اور میں نے اُن کے بچوں کے ساتھ امریکہ کے "قومی فضائی و خلائی عجائب گھر" کی سیر کی۔ دوپہر کا کھانا مشتاق صاحب گھر سے لائے تھے جو ہم نے "قصرِ سفید" (WHITE HOUSE) کے سامنے واقع لان میں کھایا۔ اس کے بعد "طبعی تاریخ کے عجائب گھر" کا چکر لگایا۔ اسی قسم کا میوزیم میں ۷۰ - ۱۹۷۱ء میں لندن میں دیکھ چکا تھا۔ اور ذہن میں تأثر یہی قائم ہوا کہ وہ اس سے بہتر تھا۔ تاہم اس میں امریکہ کے اصل باشندوں کی تاریخ سے متعلق حصّہ یقیناً بہت دلچسپ بھی تھا اور معلومات افزا بھی۔

واشنگٹن سے واپسی پر نہایت طوفانی بارش ہوئی۔ چنانچہ ایک گھنٹے کا سفر ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ شام کو عظیم صاحب کے مکان پر احباب سے ایک غیر رسمی ملاقات طے تھی، لیکن شام کے سات مشتاق صاحب کے مکان پر ہی بج گئے تھے، اور میں تھکا ہوا بھی بہت تھا۔ لہٰذا ان سے فون پر معذرت کرنی پڑی، جس کا افسوس رہا۔

منگل ۲۸ راگست کو صبح آرام کیا۔ تیسرے پہر ساجد حسین صاحب کے ہمراہ راک بری روڈ پر واقع وسیم افتخار صاحب کے مکان پر جانا ہوا۔ اُن کا تعلق بھی حیدر آباد دکن سے ہے، اور بہت درد مند مسلمان ہیں۔ انہوں نے بہت اہتمام کیا تھا اور اپنے بہت سے احباب

عرض کردیا کہ اب دیر ہوگئی ہے، لہٰذا جو کچھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں، اگر کل کسی وقت موقع مل سکا تو عرض کردوں گا۔ بظاہر منتظمین نے بھی اسے پسند کیا اور اگلے روز دوپہر کے کھانے کے بعد کا وقت طے ہوا، اور اس طرح یہ مجلس ختم ہوئی۔

اگلی صبح کنونشن کا ایک اکیڈمک سیشن تھا اور اس کے بعد بزنس سیشن۔ اور اس کے دوران کچھ اندرونی حالات بھی معلوم ہوئے اور اس 'نادیدہ ہاتھ' کی بھی اصل حقیقت کھلی۔ اور وہ یہ کہ ایسوسی ایشن میں دو گروپوں کے مابین اقتدار کی رسّہ کشی ہو رہی ہے۔ ایک M.S.A کے زیر اثر گروپ ہے اور دوسرا اُس کا مخالف۔ چنانچہ انتخاب میں خوب کشمکش ہوئی، اور بڑی تکلیف دہ صورتِ حال سامنے آئی۔ اور اندازہ ہوا کہ انجمنوں اور اداروں میں جو کچھ یہاں ہوتا ہے بالکل وہی کچھ وہاں بھی ہو رہا ہے۔ بہر حال اسی بحث و نزاع میں صبح کا سیشن طویل ہوگیا اور دوپہر کے کھانے کے بعد کسی تفصیلی خطاب کا ویسے بھی موقع نہ رہا اور دوسرے باہمی اختلافات اور اُن کے نتیجے میں دیئے جانے والے 'استعفوں' کے باعث فضا بھی بہت مکدّر ہوچکی تھی۔ لہٰذا اب کچھ عرض کرنے کے لئے مناسب ماحول موجود نہ تھا۔ الغرض میرے لئے اس کنونشن میں شمولیت کا حاصل صرف 'سَیر' رہی۔ 'ڈلاس' وہی شہر ہے جہاں آنجہانی جان ایف کینیڈی سابق صدر ریاستہائے متحدہ امریکہ قتل ہوئے تھے، اور شیراٹن ہوٹل جس میں یہ کنونشن منعقد ہو رہا تھا اس کے عین وسط میں واقع ہے۔ چنانچہ صبح و شام برادرم ڈاکٹر سعید الظفر صاحب کی معیت میں چہل قدمی بھی رہی اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کے حالات و مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیالات بھی ہوتا رہا۔

معلوم یہ ہوا کہ امریکہ کی مسلم سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (M.S.A) ابتداءً ایک بہت فعّال تنظیم تھی اور اس میں اسلامی جذبہ رکھنے والے سبھی نوجوان شامل تھے، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطّے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اور اس نے ایک عرصے تک بہت مفید کام کیا، لیکن بعد ازاں اُس پر کچھ تو پیشہ ور لیڈروں نے اپنا تسلّط جما لیا۔ اور کچھ سعودی عرب سے مالی امداد کی بارش برسنی شروع ہوگئی۔ نتیجۃً اس وقت یہ تنظیم سخت انتشار کا شکار ہے اور اس کے بہت سے مخلص کارکن علیحدگی اختیار کر چکے ہیں۔ لیکن وہ پیشہ ور لیڈر اپنی اس اصل تنظیم کو خراب کرنے کے بعد دوسری انجمنوں اور ایسوسی ایشنوں پر بھی اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے کی کوشش میں ہیں، جس کے نتیجے میں

دل پر سے دُھل گیا ہے ـــ اور اس طرح بالٹی مور، واشنگٹن اور ان کے گردو نواح میں دس روزہ قیام اختتام پذیر ہوا۔ یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہوگا کہ یہ پورا علاقہ نہایت سرسبز و شاداب اور ہر اعتبار سے انتہائی حسین و جمیل ہے!

ڈلاس امریکہ میں آباد مسلمانوں نے جو بہت سی تنظیمیں اور انجمنیں قائم کی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹروں کی انجمن "اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن" (A-M-I) بھی ہے۔ اس کا ان دنوں ڈلاس میں سالانہ کنونشن ہو رہا تھا اور اس کے منتظمین نے میری آمد کی اطلاع پا کر مجھے "مہمان مقرر" کی حیثیت سے مدعو کیا تھا۔ چنانچہ ہفتہ یکم ستمبر کو بالٹی مور سے صبح ساڑھے دس بجے ایسٹرن ایرلائنز کی پرواز سے جانب ڈلاس روانگی ہوئی۔ یہ شہر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بالکل جنوب میں واقع ہے اور بالٹی مور سے اس کا فاصلہ لگ بھگ ڈیڑھ ہزار میل ہے۔ چنانچہ پرواز بھی دو حصوں میں ہوئی۔ پہلے پونے دو گھنٹے میں اٹلانٹا پہنچنا ہوا۔ اور وہاں سے اتنی ہی دیر کی مزید پرواز سے ڈلاس رسائی ہوئی، جہاں مقامی وقت کے مطابق سہ پہر کے تین بجے تھے۔ دن کا کھانا جہاز ہی میں کھایا، جس کے لئے پہلے ہی "کوشر" کا آرڈر دیا جا چکا تھا۔ یعنی یہودیوں کا کھانا جس میں گوشت بھی ذبیحہ ہوتا ہے اور حرام روغنیات بھی استعمال نہیں ہوتیں ـــــــ اٹلانٹا اور ڈلاس دونوں کے ہوائی اڈے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور امریکہ کی مادی عظمت اور شان و شوکت کا نقش دل پر قائم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ایک ہوائی مستقر کی وسعت میں ہماری سب سے بڑی ائیرپورٹ یعنی کراچی ایسے درجن بھر ہوائی اڈے سما سکتے ہیں۔

ڈلاس ائیرپورٹ پر آئی ایم اے کے صدر ڈاکٹر بشیر الدّین صاحب کے برادر خورد بھی موجود تھے اور آئی ایم اے کی ایگزیکٹو میں کینیڈا کے نمائندے برادرم ڈاکٹر سعید الظفر صاحب بھی ـــ لہٰذا کسی دقت کا سامنا نہ ہوا اور ان کے ساتھ فوراً شیراٹن ہوٹل آ گیا جہاں کنونشن ہو رہی تھی۔ رات کو ایسوسی ایشن کا سالانہ ڈنر تھا، اس میں شرکت کی اور اس کے بعد میری تقریر تھی۔ لیکن کوئی 'نادیدہ ہاتھ' اُسے سبوتاژ کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ چنانچہ پہلے صرف میری تقریر کا اعلان ہوا لیکن بعد میں "مہمان مقررین" کی لائن لگ گئی۔ اور "مہمان اعلیٰ" (CHIEF GUEST) کو اس وقت دعوتِ خطاب دی گئی جب نصف شب کا عمل ہو چکا تھا اور اکثر مندوبین پر نیند کا اثر صاف نظر آ رہا تھا۔ لہٰذا میں نے چار و ناچار کچھ کہا تو سہی لیکن جلد ہی

وہ صاحب جن سے کراچی میں ملاقات ہوئی تھی اور جنھوں نے کینیڈا کے اس صنعتی شہر کے مسلمان آبادکاروں (IMMIGRANTS) میں میرا تعارف اکثر و بلیشتر بذریعہ TAPES اور کچھ کچھ بذریعہ کتب کرایا تھا وہ سمیع اللہ صاحب ہیں، جن کا اصل تعلق لکھنؤ سے تھا، جہاں سے مہاجر ہو کر وہ پاکستان آئے اور یہاں لاہور ہی میں کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، پھر کچھ عرصہ پاکستان میں مختلف جگہوں پر ملازمت کرتے رہے اور بالآخر ہزاروں بلکہ لاکھوں پاکستانی نوجوانوں کی طرح بلادِ مغرب کا رُخ اختیار کر لیا۔ انہوں نے یہاں درسِ قرآن کے پروگرام کے لئے بہت محنت کی تھی، جس کے نتیجے میں استقبال کرنے والے حضرات کی آنکھوں میں محبّت کی جھلک بھی صاف نظر آئی۔ اور ان کے انداز سے صاف معلوم ہوا کہ انھیں میرے درسِ قرآن کا نہایت اشتیاق کے ساتھ انتظار ہے۔

سمیع اللہ صاحب نے تو اس پروگرام کے لئے دو ہفتے کی چھٹی ہی لے لی تھی اور وہ اس پورے عرصے کے دوران میرے ساتھ تقریباً سائے کی طرح لگے رہے۔ میرا قیام بھی اُن ہی کے مکان پر رہا ـــ درمیان میں صرف دو تین دن کے لئے برادرم حافظ سعید صاحب اپنے گھر لے گئے۔ (یہی وہ دوسرے صاحب ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے، ان کے والد ماجد مولانا عبدالعزیز مرحوم و مغفور منٹگمری کی جامع مسجد نور کے خطیب تھے اور مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ مجاز، اب میری اِن سے عزیزداری بھی ہو گئی ہے۔ یعنی میرے خویش عزیزم محمود میاں کی ہمشیرہ ان کے گھر میں ہیں۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ کبھی اُن سے ملاقات بھی ہوئی ہے لیکن انہوں نے کہا کہ وہ بچپن میں میرے زیرِ علاج رہے ہیں ـــ یہ بھی اب کئی سال سے ٹورنٹو میں مقیم ہیں اور کچھ ملازمت کا شغل بھی ہے اور کچھ ذاتی کاروبار کا بھی۔)

بہر حال ایئرپورٹ پر تشریف لانے والے حضرات سے مختصر ملاقات کے بعد سمیع اللہ صاحب کے مکان پر آنا ہوا۔ جہاں سہ پہر میں کچھ آرام کیا۔ شام کو ایک غیر رسمی ملاقات اور اجتماعی طعام کا اجتماع تھا، جس میں پینتیس۳۵ کے لگ بھگ حضرات شریک ہوئے۔ تعارف ہوا تو محسوس ہوا کہ سبھی نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ چنانچہ کوئی انجینئر ہے، کوئی ڈاکٹر اور کوئی پروفیسر۔ تیس۳۰، پینتیس۳۵ اشخاص کے اس مجمع میں کم و بیش نصف درجن تو پی ایچ ڈی تھے۔ اب صرف چند نام یاد رہ گئے ہیں۔ مثلاً ۱۔ ڈاکٹر

انتشار کا عمل اُن تک بھی متعدی ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

بہرحال یکم و دو ستمبر کو ڈلاس میں مقیم رہنے کے بعد ڈاکٹر سعید الظفری کی معیّت میں ۳ ستمبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے ایئر کینیڈا کے ذریعے ٹورنٹو کے لئے روانگی ہو گئی۔ لگ بھگ چار گھنٹے کے اس سفر کا سعید صاحب کی رفاقت کے باعث پتہ بھی نہ چلا۔ اس سے قبل ڈلاس میں شیراٹن ہوٹل میں بھی ملے اور وہ ایک ہی کمرے میں رہے تھے، اور گفتگو کا کافی موقع ملا تھا۔ اُن کا تعلق ہندوستان میں الٰہ آباد سے ہے۔ لیکن زندگی کا اکثر و بیشتر حصہ دیارِ مغرب ہی میں گذرا ہے۔ نہایت صالح اور مجاہدانہ کردار کے حامل مسلمان ہیں۔ زمانۂ طالب علمی میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور بغیر کسی کو اطلاع دیئے الجزائر کے جہادِ آزادی میں جا شریک ہوئے تھے اور وہاں کچھ زخمی ہونے کے باعث اور زیادہ تر پھیپھڑوں کے متأثر ہونے کے باعث ہی واپسی ہوئی تھی۔ اور اب بھی ہمہ تن اسی انتظار میں ہیں کہ پھر کہیں "جہاد بالسّیف" کا موقع ملے تو سب کچھ تج کر جا شامل ہوں۔ گویا معاملہ وہی ہے کہ ؎

بہت جی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر ؎ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

ٹورنٹو ڈلاس اور ٹورنٹو کے مابین فاصلہ تو لگ بھگ دو ہزار میل ہے تاہم چونکہ دونوں تقریبًا ایک ہی طول بلد پر واقع ہیں، لہٰذا دونوں کے وقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ جب ہم چار گھنٹے کی پرواز کے بعد ٹورنٹو پہنچے تو وہاں بھی دوپہر کے ساڑھے بارہ ہی بجے تھے۔ تقریبًا نصف گھنٹے میں کسٹم اور امیگریشن والوں کی پوچھ گچھ سے خلاصی ہوئی اور اب جو باہر آیا تو حیران رہ گیا۔ اِس دُور دراز شہر میں ہفتہ وار تعطیل (WEEKEND) کے بعد پہلے کام کے دن (WORKING-DAY) یعنی پیر کے روز پندرہ بیس حضرات استقبال کے لئے موجود تھے جن میں سے اس سے قبل صرف ایک صاحب سے ایک بار کراچی میں ملنا ہوا تھا، اور ایک ہی اور صاحب تھے جن سے غائبانہ تعارف تھا (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تعارف نرا غائبانہ نہیں تھا، بلکہ کوئی بیس سال قبل کی ملاقات بھی تھی!) اس سے اندازہ ہو گیا کہ یہاں معاملہ کچھ مختلف ہے ـــــ !!!

ہوئی دُنیا کی بلند ترین عمارت ہے۔ اور وہیں سے بہت دُور دُور تک کا منظر صاف نظر آتا ہے۔ اُوپر سیاحوں کے لیے دُوربینیں بھی نصب ہیں تاکہ خوب دُور دُور تک دیکھ سکیں۔ اس کے بعد "ٹورنٹو پلیس" کی سیر کی۔ یہ یہاں کی خوبصورت ترین سیرگاہ ہے جو جھیل ٹورنٹو کے کنارے واقع ہے۔

شام کو درس کے لئے مسجد میں حاضری ہوئی تو برادرم محترم جاہ مراد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ آج کل انگلینڈ میں پروفیسر خورشید صاحب کے قائم کردہ ادارے "اسلامک فاؤنڈیشن" میں بحیثیت ریذیڈنٹ ڈائرکٹران کی نیابت کر رہے ہیں، اور امریکہ کے "حلقۂ احباب اسلامی" کی دعوت پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ چنانچہ مانٹریال میں ایک تربیت گاہ میں شرکت کر چکے تھے اور اب امریکہ کے دوسرے شہروں کے دورے پر تھے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ہو جائے تو اچھا ہے کہ شمالی امریکہ میں جماعت اسلامی سے منسلک لوگ اس حلقے کی صورت میں منظم ہیں اور ٹورنٹو میں چند مخلص کارکنوں پر مشتمل اس کی ایک چھوٹی مگر فعال شاخ موجود ہے۔

درس میں حاضری بالکل کل جتنی ہی تھی بلکہ اس سے بھی قدرے زائد۔ مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا درس اوّل مشتمل بر سورۃ العصر مکمل ہوا اور دوسرے درس یعنی آیۂ برّ کا آغاز ہوا۔

۶ ستمبر کو سمیع اللہ صاحب کے ساتھ نیاگرا جانا ہوا، جہاں مشہورِ زمانہ آبشار کی سیر کی۔ نیاگرا بھی ٹورنٹو سے تقریباً اسی میل دور ہے۔ راستے سے ذرا ہٹ کر کچنر واقع ہے۔ جاتے ہوئے وہاں ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب کے مکان پر ناشتہ کیا۔ دن کا کھانا نیاگرا میں جناب اقبال گورائی صاحب کے یہاں کھایا۔ شام کو نیاگرا سے واپسی ہوئی اور حسبِ معمول درس ہوا، حاضری میں مزید اضافہ ہوا۔ آیۂ برّ کا درس مکمل ہوگیا۔

۷ ستمبر کو جمعہ تھا۔ اب تک درس کی مجالس میں تو صرف اُردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ جمع ہو رہے تھے لیکن جمعہ میں مقامی لوگ بھی ہوتے ہیں اور کچھ عرب حضرات بھی، لہٰذا مختصر خطبۂ جمعہ انگریزی میں دیا۔ موضوع تھا: "جمعہ کی اصل حکمت، اور خطبۂ جمعہ کا اصل مقصد!" ــــ چار پانچ صد حضرات شریک تھے، لیکن جمعہ یہاں

عبدالفتّاح صاحب سرحق ہیں، حیدرآباد (دکن) سے تعلّق ہے اور آج کل کچنر میں مقیم ہیں جو ٹورنٹو سے لگ بھگ اسّی میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کے دینی جذبے اور ذوق و شوق کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اس قدر فاصلے سے تقریباً روزانہ درس میں شرکت کے لئے آتے رہے۔ (۲) ڈاکٹر نسیم خاں جنھوں نے بچّوں کی نفسیات میں پی ایچ ڈی کیا ہے، اُن کا تعلّق پاکستان میں اسلامی جمعیّت طلبہ سے رہا ہے اور اب بھی فعّال دینی مزاج رکھتے ہیں۔ (۳) نذیر احمد صاحب، ان کا تعلّق بھی حیدرآباد دکن ہی سے ہے۔ دینی تقریبات میں بہت سرگرم رہتے ہیں اور کینیڈا سے حج کے قافلوں کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ (۴) ڈاکٹر ریاض منیر نظامی صاحب ٹورنٹو کے مشہور اور مقبولِ عام معالجین میں سے ہیں، الرجی کے اسپیشلسٹ ہیں۔ (۵) قاضی اورنگ زیب صاحب۔ ان کا تعلّق گوجرانوالہ سے ہے، فنِ تعمیرات میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور اپنی ذاتی فرم چلا رہے ہیں۔ (۶) ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری۔ دہلی سے تعلّق ہے اور تعلیمات میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ (۷) مسٹر مولادینا۔ بمبئی سے تعلّق ہے، وکالت کرتے ہیں۔ اقبالیات سے بہت شغف رکھتے ہیں۔ "اقبال اکادمی" کے نام سے ایک ادارہ ٹورنٹو میں قائم کیا ہوا ہے۔ (۸) خواجہ سعید الدّین صاحب نہایت خاموش طبع انسان ہیں اور گہرے مذہبی مزاج کے حامل ــــ مغرب اور عشاء کی نمازیں اِن سب حضرات کی معیّت میں یونیورسٹی روڈ کی جامع مسجد میں ادا کیں جہاں اگلے روز سے درسِ قرآن کا سلسلہ شروع ہونا تھا۔

۴ ستمبر کو بعد نمازِ مغرب پہلا درس تھا۔ مغرب سے قبل مسجد کے ہال میں داخل ہوتے ہی خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا۔ دو صد سے زائد لوگ جمع تھے، خواتین جو ایک گیلری میں تھیں، اس کے علاوہ تھیں۔ بچے بھی زرق برق لباس پہنے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ بالکل کسی خوشی کی تقریب (FESTIVAL) کا سا گمان ہوتا تھا۔ لوگوں کا ذوق و شوق دیدنی تھا۔ جو بیان میں نہیں آسکتا۔ درس کے لئے زیادہ وقت لگانے کے لئے عشاء کی نماز کو مقرّرہ وقت سے نصف گھنٹہ مؤخّر کرنے کا فیصلہ ہوا۔ پونے دو گھنٹے سے لگ بھگ درس جاری رہا، لیکن پھر بھی سورۃ العصر کا بیان مکمّل نہ ہوسکا۔

۵ ستمبر کے دن کا اکثر حصّہ ٹورنٹو کی سیر میں گذرا۔ چنانچہ شہر کے مرکز بالخصوص سٹی ہال کی سیر کی۔ جیبرسی این ٹاور پر چڑھ کر ارد گرد کا نظارہ کیا۔ یہ انسانی ہاتھوں کی بنی

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مارچ - اپریل ۱۹۸۰ء

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★

بکے ار مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور
فون : 852683 - 852611

مختصر ہی ہوتا ہے۔ اس لئے کہ چھٹی تو ہوتی نہیں، اکثر لوگ دوپہر کے کھانے کے وقفے ہی کو کچھ کھینچ تان کر قدرے لمبا کرتے ہیں اور اسی میں جمعہ ادا کرتے ہیں۔
شام کو سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۶ کا درس ہوا۔ حاضری ڈھائی یعنی تین سو سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گویا ذوق و شوق بجائے گھٹنے کے بڑھ رہا تھا۔ فللّٰہِ الحمد و المنّۃ۔ درس سے قبل اچانک جناب عثمان سیٹھ سے ملاقات ہو گئی۔ یہ پاکستان کے مشہور صنعت کار سیٹھ احمد داؤد کے بھانجے ہیں اور ۱۹۶۱-۶۲ء میں بوریوالہ ٹیکسٹائل ملز کے مینیجنگ ڈائریکٹر تھے۔ انہیں درس میں شریک دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ پہلے دن ہی سے مسلسل آ رہے ہیں۔ میں ہجوم میں اس سے قبل انہیں پہچان نہ سکا۔

(جاری ہے!)

بقیہ درسِ قرآن صـ۱۴ سے آگے

یہ اُس کا طریقہ ہونا چاہئے اور پھر دعوت کے بعد صبر کا مرحلہ آتا ہے۔ جب انسان نے دعوت دے دی، اب اس صورت میں اگر گالیاں دی جاتی ہیں، اگر بُرا بھلا کہا جاتا ہے تو ایسے موقعوں پر صبر کیا جائے اور کوئی انتقامی جذبہ کار فرما نہ ہو۔ اگر انتقامی جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر ایسی صورت میں وہ داعی اپنی دعوت کے تمام ثمرات سے محروم ہو جاتا ہے، پھر اس کو اس کے ثمرات (دعوت کے) نہیں مل سکتے، تو یہ خلاصہ ہے سورۂ عصر کا، فرمایا:

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳

یہ عجیب بات ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے اعزاز میں یہ عصرانہ دیا گیا، لیکن وہ تشریف نہیں لا سکے۔ اب یہ ہے کہ وہ آنے والے تھے اور میں جانے والا ہوں حجازِ مقدس۔ لہٰذا کچھ تھوڑا بہت موقع مل گیا کہ میں آپ سے مخاطب ہو سکوں۔

اللہ تعالیٰ صحیح ایمان اور عملِ صالح اور دعوتِ حق اور اس راہ میں صبر کی توفیق ہمیں عطا فرمائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

ڈاکٹر اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

اس بار ــــ اوّلاً تو پیشِ نظر اشاعت کی کہانی ہی خاصی دلچسپ ہے۔ مارچ کے شمارے میں کسی قدر تاخیر تو راقم کے سفرِ ہند کے باعث ہی ہو گئی تھی۔ تاہم وہ بس اتنی ہی تھی کہ پرچہ زیادہ سے زیادہ دس مارچ تک حوالۂ ڈاک ہو جاتا۔ لیکن اس میں مزید اضافہ پریس کی مشغولیت کے باعث ہو گیا۔ اس لئے کہ وہاں کسی سرکاری کام کی لمبی داب چل رہی تھی۔ جب اس طرح معاملہ وسطِ مارچ سے بھی آگے نکل گیا تو مجبوراً یہ فیصلہ کیا گیا کہ اب اسے بھی دو ماہی اشاعت ہی بنا دیا جائے۔ چنانچہ دو مضامین کا اضافہ آخر میں اور ایک کاپی کا اضافہ شروع میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ 'عرضِ احوال' پر مشتمل پہلے آٹھ صفحات کا شمار ابجد ہوز کے حساب سے ہے اور اس کے بعد پھر صفحہ نمبر ا پہ 'تقدیم' سامنے آجاتی ہے، جس سے اصلاً مارچ کی اشاعت کا آغاز ہونا تھا۔ الغرض ــ عرفت ربّی بفسخ العزائم! والا معاملہ ہے!

کچھ ایسا ہی، بلکہ اس سے بھی کسی قدر بڑھ کر معاملہ اس بار 'قرآن کانفرنس' کا ہوا۔ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کے بارے میں انجمن کی مجلسِ منتظمہ نے اوّلین فیصلہ ۲۱ تا ۲۳ مارچ کا کیا تھا۔ بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ بالکل یہی تاریخیں دارالعلوم دیوبند کے 'جشنِ صد سالہ' کی تقریبات کی ہیں اور پاکستان سے کثیر تعداد میں علماء و فضلاء اس میں شرکت کے لئے تشریف لے جائیں گے تو تاریخیں تھوڑی سی آگے بڑھا دی گئیں یعنی ۲۳ تا ۲۷ مارچ، اور اس کا اعلان بھی گذشتہ شمارے کے کور پہ شائع کر دیا گیا۔

ادھر راقم ہندوستان میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہما کی خدمت میں حاضر ہوا تو دونوں بزرگوں نے مشفقانہ مشورہ دیا کہ تم

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

عدد	مارچ ـ اپریل ۱۹۸۰ء	جلد ۲۹

مشمولات

پبلشر : ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع : رشید احمد چوہدری

مطبع : مکتبہ جدید پریس، شارع فاطمہ جناح، لاہور

میں اور دوسرا بعد نمازِ عشاء واپڈا آڈیٹوریم یا مسجدِ شہداء میں۔ پہلے کا عنوان حسبِ سابق "عظمت و اعجازِ قرآن!" ہوگا اور اس میں ان شاء اللہ مختلف مکاتب فکر کے چوٹی کے علماء شرکت فرمائیں گے۔ اور دوسرے کا "دستوری اور قانونی مسائل اور قرآنِ حکیم!" اور اس میں بفضلہٖ تعالیٰ وبعونہٖ ملک کے چوٹی کے ماہرینِ قانون و دستور کی شرکت متوقع ہے۔!!

بقیہ تمام اجلاس 'قرآن اکیڈمی' ۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن لاہور میں منعقد ہوں گے روزانہ شام کو عصر تا مغرب مقالے کی نشست ہوگی جس میں اقتصادی، سماجی اور تحریکی مسائل پر روزانہ ایک ایک مقالہ پیش ہوگا جو تیس تا چالیس منٹ کا ہوگا تقریباً نصف گھنٹہ سوالات کے جوابات کے لئے رکھا جائے گا، اور آخر میں صدارتی خطبہ ہوگا۔ ان کی تفصیل ان شاء اللہ العزیز کانفرنس کے انعقاد سے ایک ہفتہ قبل اخبارات میں شائع کر دی جائے گی۔۔۔ مغرب تا عشاء دو دن تقاریر کے سیشن ہوں گے اور ایک دن محفلِ قراءت کے لئے مخصوص رہے گا۔۔۔ اُمید واثق ہے کہ ۲۱ر اپریل کو 'یومِ اقبال' کی تعطیل ہوگی، لہٰذا اُس روز ایک نشست ۹ بجے صبح تا ۱ بجے دوپہر بھی رکھی جائے گی اور اُس کا عنوان ہوگا "علامہ اقبال اور قرآنِ حکیم!"

سفرِ ہند کے دوران جن اصحابِ علم و فضل سے ملنا ہوا اُنہیں 'قرآن کانفرنس' میں شرکت کی دعوت بھی دی گئی۔ ان میں سے دو حضرات کے خطوط یہاں موصول ہوئے ہیں۔ ایک ڈاکٹر اختر الواسع صاحب (جو صفحہ ۸ پر درج ہے) اور دوسرا مولانا تقی امینی مدظلہ کا، جن سے غائبانہ تعارف تو بہت عرصے سے تھا لیکن ملاقات کے بعد یگانگت کا احساس بہت ہی شدت کے ساتھ پیدا ہوا۔ اُن کا ایک خط جو برادرم قاضی عبدالقادر صاحب کے خط کے جواب میں حال ہی میں موصول ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ "دل را بہ دل رہیست!" کے مصداق یہی تاثر اُن کا بھی ہے۔ اُن کا وہ گرامی نامہ حسبِ ذیل ہے:

دفترِ ناظم سنی دینیات
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۹ر مارچ ۱۹۸۰ء

مخلصم و مکرم جناب قاضی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

اس تاریخی اجلاس میں ضرور شرکت کرو۔ اور جب میں نے عرض کیا کہ یہ اجتماع تو فضلاءِ دار العلوم کا ہے اور میرا معاملہ تو زیادہ سے زیادہ سہ
أُحِبُّ الصَّالِحِينَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ ⁂ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِي صَلَاحًا
والا ہے، تو انہوں نے فرمایا کہ اس کی فکر تم مت کرو، ہم دعوت نامہ بھجوا دیں گے، چنانچہ وہ موصول بھی ہو گیا۔ اب ایک جانب ان بزرگوں کی یہ شفقت اور دوسری جانب علماءِ کرام سے رابطے کے اس زرّیں موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش۔ فیصلہ یہی ہوا کہ اس اجتماع میں ضرور شرکت کی جائے۔ (چنانچہ ان سطور کی تحریر کے وقت راقم ہندوستان کے "بارِ دگر" سفر کے لئے بالکل پا بر کاب ہے!) اور اس طرح مزید تاخیر ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ کانفرنس ۴ر تا ۹ر اپریل منعقد ہو اور اس کے لئے ابتدائی اشتہار بھی روزنامہ 'نوائے وقت' میں اشاعت کے لئے بھیج دیا گیا۔ لیکن پھر اچانک معلوم ہوا کہ یکم یا دس اپریل یونیورسٹی میں تعطیلات ہوں گی، اور اس بار چونکہ کانفرنس 'قرآن اکیڈمی' میں منعقد کی جا رہی ہے لہٰذا یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کی شمولیت بطورِ خاص پیشِ نظر ہے اس لئے ایک بار پھر کانفرنس کا پروگرام مؤخر کرنا پڑا۔ اب تا حال حتمی فیصلہ یہی ہے کہ یہ کانفرنس ۱۸ر تا ۲۱ر اپریل منعقد ہو گی۔ باقی ہو گا وہی جو اللہ چاہے گا، لہٰذا اُسی سے دعا ہے کہ وہ حالات کو سازگار بنا دے، اور ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس مجوّزہ تاریخوں میں اپنی سابقہ روایات کے مطابق کامیابی کے ساتھ منعقد ہو۔
وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ ۔۔۔۔۔۔!!

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی، اور اس کے زیرِ اہتمام سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ ۱۹۷۳ء سے شروع ہو گیا تھا۔ تا حال چھ کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں، چار لاہور میں اور دو کراچی میں، اب یہ ساتویں کانفرنس قریب الانعقاد ہے۔

اس کا اجمالی پروگرام اس اشاعت کے کور کے صفحات پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان شاء اللہ العزیز ۱۸ اپریل کو دو اجلاس ہوں گے، اور دونوں وسطِ شہر لاہور میں ہی ہوں گے۔ پہلا نمازِ جمعہ کے بعد سے عصر کے وقت تک جامع مسجد دار السلام باغ جناح

مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات و حیات سے متعلق اخبارات و جرائد کے خصوصی نمبروں کا سلسلہ تو اگرچہ اب ختم ہو گیا ہے، تاہم اُن کے بارے میں جذبات و تأثرات پر مشتمل مضامین اور انٹرویوز کی اشاعت کا سلسلہ تاحال جاری ہے۔

ع: "کعبے سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی!" کے مصداق مولانا مودودی کی ذات سے ایک تعلق اِن سطور کے عاجز و ناکارہ راقم کو بھی رہا ہے۔ ایک خاصا لمبا عرصہ تو راقم کی زندگی کا وہ ہے جس کے دوران اُن کی شخصیت کو راقم کی بھی "محبت و عقیدت" کے 'مرکزِ اعلیٰ' کی حیثیت حاصل رہی۔ بعد میں وہ رشتے تو کمزور پڑتے پڑتے بالکل ٹوٹ گئے، البتہ "احسان مندی" کا ایک تعلق ہے جو جوں کا توں برقرار رہا، اور تاحال برقرار ہے۔!! اس کی تفصیل تو ان شاء اللہ جلد ہی سپردِ قلم ہو گی۔ اس وقت صرف بر سبیلِ تذکرہ عرض ہے کہ کچھ تو اسی 'نسبتِ قدیمہ' کا اثر تھا اور کچھ بدلے ہوئے حالات کا تقاضا کہ میں نے امریکہ کے سفر پر روانہ ہونے سے قبل یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کے دوران اگر ممکن ہوا تو مولانا سے ملاقات کروں گا۔ افسوس کہ مولانا سے ان کی زندگی میں تو ملاقات نہ ہو سکی، البتہ بفیلو میں انتقال کے بعد اُن کی صورت نہایت قریب سے دیکھنے اور نمازِ جنازہ ادا کرنے کا موقع مل گیا ـــــ فللّٰہ الحمد! اخبارات و جرائد کے جو خاص نمبران دنوں مولانا مرحوم کے نام سے معنون شائع ہو رہے ہیں، ان میں سے 'قومی ڈائجسٹ' کے نمائندے جناب فضل عظیم صاحب نے مجھ سے بھی ایک 'انٹرویو' کی خواہش ظاہر کی جو میں نے بخوشی دے دیا۔ اور جب انہوں نے اسے TAPE سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے ایک نظر ڈالنے کے لئے مجھے دیا تو میں نے تو نہ پڑھا، البتہ ایک صاحب سے اس کی نقل کرا لی تاکہ اسے 'میثاق' میں بھی شائع کر دیا جائے ـــــ 'قومی ڈائجسٹ' کے اُس خاص شمارے میں تو یہ کسی سبب سے شائع نہ ہو سکا ـــ بلکہ اس کے بعد بھی ایک اشاعت میں وہ بار نہ پا سکا۔ البتہ اب مارچ کے شمارے میں وہ شائع ہو گیا ہے۔ لہٰذا ہم بھی اُسے ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے فضل عظیم صاحب نے جب اسے ٹیپ سے اُتار کر دیا تھا تو راقم اسے نہیں پڑھ سکا تھا۔ اب کتابت شدہ صورت میں دیکھا تو اس میں چند ایک لفظی غلطیاں نظر آئیں جو غالباً سماعت کے مغالطے کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً بھائی اظہار احمد صاحب کے ذکر میں بی۔ ایس۔ سی انجینئرنگ کے بجائے بی۔ اے یا اسی قبیل کی ایک دو اور غلطیاں جن کی اصلاح کر دی گئی

گرامی نامہ پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد دو کتابیں بھی موصول ہوگئیں، بے حد خوشی ہوئی، دل سے دعائیں نکلیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض مضامین بھی دیکھے۔ حیرت ہے کہ ہم دونوں کے درمیان اس قدر فکری ہم آہنگی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس دور میں ڈاکٹر صاحب کو خدمتِ قرآن کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ اُس کی بہت بڑی نعمت ہے جس قدر بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ ایسے مخلص بندوں کے صدقے میں مجھ ناچیز کو بھی قرآن فہمی کا سلیقہ عطا فرمائے، آمین! "مبادیٔ" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اپنے میں تو کچھ اہلیت نظر آتی نہیں ہے، آپ حضرات دُعا فرمائیں تو اُمید ہے کہ راستہ کھل جائے اراد بھی ہے کہ اب بقیہ زندگی اسی میں گذرے۔ اس کے فضل و کرم اور توفیق کی دُعا کرتا رہتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام مسنون اور دُعا کی درخواست ضرور کریں اور آپ بھی فراموش نہ فرمائیں ـــ پاسپورٹ بنوانے کی کوشش کر رہا ہوں، کامیابی اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ دیو بند جانے کی زیادہ قوی اُمید نہیں ہے۔ کہیں آنے جانے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، دُعا کی مکرّر درخواست ہے۔ خدا کرے آپ اور ڈاکٹر صاحب بخیر تیت ہوں ؛ والسلام

محمد تقی امینی

راقم نے انجمن کی تاسیس کے موقع پر ہی واضح کر دیا تھا کہ اس کے پیش نظر خدمتِ دین کا جو ہمہ گیر پروگرام ہے' انجمن اس کے صرف مرحلۂ اوّل کی حیثیت رکھ ہے۔ اس کے بعد ان شاء اللہ ایک 'باقاعدہ جماعت' کی تشکیل کا مرحلہ بھی جلد یا بدیر ضرور آئے گا۔ الحمد للہ کہ ۱۹۷۵ء میں وہ جماعت بھی 'تنظیم اسلامی' کے نام سے قائم ہو گئی تھی ـــ اور اس کے بھی اب تک چار سالانہ اجتماع منعقد ہو چکے ہیں۔ اس بار کا سالانہ اجتماع بھی 'قرآن کانفرنس' کے متّصل رکھ لیا گیا ہے ـــ یعنی ۲۲ تا ۲۴ اپریل ۱۹۸۰ء، تاکہ بیرونِ لاہور کے رُفقاء ایک ہی سفر میں دونوں میں شرکت کر سکیں! مو 'قرآن کانفرنس' میں شمولیت کے لئے بیرونِ لاہور سے آنے والے حضرات کے قیام و طعا کا انتظام بھی 'قرآن اکیڈمی' ہی میں ہوگا ـــ اگرچہ ہوگا بدرویشانہ انداز کا۔ اور ایسے حضر کے لئے ۱۹، اور ۲۰، اپریل کے دن کے اوقات میں بھی اِن شاء اللہ مفید پروگرام رکھے جائیں گے ـــ !!

مُسلّم ہے۔ مولانا ابوالکلام کی برسی ۲۲ر فروری کو منائی گئی۔ اس کی مناسبت سے اس کی اشاعت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ خط سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کے چیئرمین جناب شاہ محمد شاہ صاحب کی دریافت و عنایت ہے۔ "الجمعیّت" کا وہ شمارہ جس میں یہ خط شائع ہوا تھا، شاہ صاحب کے پاس موجود ہے۔ خط کا متن درج ذیل ہے!

صدیق محترم! "الجمعیّت" کے خاص نمبر کے لئے آپ نے ازراہِ عنایت تحریر طلب کی ہے۔ ایڈیٹر صاحب "الجمعیّت" اور مولانا احمد سعید صاحب کے خطوط اور تار پہنچے۔ مَیں ضرور اس کی تعمیل کرتا اگر ترتیبِ کُتب اور اجراء "الہلال" کی مشغولیّت مانع نہ ہوتی۔ علاوہ بریں آپ نے بحث و بیان کے لئے جو مواضیع قرار دیئے ہیں اُن میں کوئی موضوع بھی ایسا نہیں ہے جس پر بارہا "الہلال" میں خامہ فرسائی نہ کی جا چکی ہو۔ اگر مقصود تجدیدِ فکر و ذوق ہے تو "الہلال" کے مقالات بجنسہٖ یا بہ تغیّرِ اسلوب و شکل شائع کئے جا سکتے ہیں۔ ان سے زیادہ بالفعل گنجائش بحث و بیان بھی نہیں۔ ولنعم ما قیل ؎

"ہماں عشق ست برخود بستہ چندیں داستاں رتہ ؛ کسے بر معنیٔ یک حرف صد دفتر نمے سازد!"

البتہ وقت کے عملی مباحث میں سب سے زیادہ ضروری سوال وہی ہے جسے آپ نے آخری قرار دیا ہے۔ یعنی مسلمانانِ ہند کا موجودہ تشتّت و انتشار کیونکر نظم و اجتماع کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ لیکن حیران ہوں کہ اس کے جواب میں کیا عرض کروں؟ مَیں تو خود سرتا پا سوال ہوں شاید ہی گذشتہ دس پندرہ سال کے اندر کسی شخص نے قولاً و فعلاً اس سوال کے جواب دینے کی ایسی کوشش کی ہو جیسی مَیں کر چکا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ وقت کا مزاج موافق نہیں ہوا، اور یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ مستقبل کا انتظار کیا جائے ؎

از حُسن ایں چہ سوال ست کہ معشوق تو کیست؟ ؛ ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم مے دانی!

مسلمانانِ ہند کے نظم و اجتماع کے لئے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ حقیقی اور سادہ طریقہ تو وہی ہے جس پر خود اسلام کی رُوح شریعت مبنی ہے۔ یعنی منصبِ امامت کا قیام و نفاذ۔ آج کل کی بول چال میں یہ منصب ایک طرح کی ڈکٹیٹرشپ (تفویضِ مطلق) سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن یہ ایسی ڈکٹیٹرشپ ہے جس کی طرف خود نصف یورپ کی موجودہ اجتماعی ذہنیت مائل ہو رہی ہے۔ اٹلی کا نیا جماعتی فوجی نظام دراصل اسلامی امامت ہی کی ایک زیادہ مطلق و مستند صورت ہے۔ تفصیل اس اجمال کی "الہلال" میں ملاحظہ کیجیے گا۔ علاوہ

ہے۔ البتہ اب شائع شدہ انٹرویو سے تقابل سے معلوم ہوا کہ 'اصل' میں سے بعض چیزیں حذف کردی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک تو ایسی ہے جس کے بارے میں میں نے اختیار دیا تھا کہ چاہیں تو آپ حذف کردیں۔ لیکن بعض دوسری باتیں ایسی بھی ہیں جن کے حذف کے باعث میرے نقطۂ نظر کی ترجمانی صحیح نہیں ہو پائی۔ بہرحال اب اس مکمل متن کی اشاعت سے ان شاء اللہ اس کا ازالہ ہو جائے گا۔!!

راقم نے اپنے "تحریکی سلسلۂ نسب" کو بحمداللہ کبھی چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اسے اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں ہے کہ اس کی قائم کردہ 'تنظیم اسلامی' مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی 'حزب اللہ' اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی 'جماعتِ اسلامی' ہی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے، خواہ کتنی ہی چھوٹی اور حقیر کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق کوئی بات کبھی سامنے آتی ہے تو فوراً توجہ کا مرکز بن جاتی ہے — حال ہی میں معاصر 'جسارت' کراچی نے مولانا آزاد مرحوم کا ایک خط شائع کیا ہے جو ادارۂ جسارت کے تمہیدی نوٹ سمیت من وعن درج ذیل ہے:

> مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جس زمانے میں "الجمعیۃ" دہلی کے ایڈیٹر تھے اور اُن کے قلم کے جوہر کھل رہے تھے۔ اُس دور میں مولانا مودودی نے "الجمعیۃ" کے "ابراہیم خلیل اللہ" نمبر کے لئے مولانا ابوالکلام کو خط تحریر کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس ضمن میں ایک خط مفتیٔ اعظم ہند مولانا محمد کفایت اللہ صاحب کو لکھا جس میں مولانا مودودی کے خط کا بھی تذکرہ ہے ÷
>
> یہ خط مولانا مودودی نے "الجمعیۃ" کے جون ۱۹۲۷ء کے شمارے میں شائع کیا۔ یہ خط اس کے بعد کہیں شائع نہیں ہوا، اور اب ۵۳ سال کے بعد پہلی مرتبہ شائع ہو رہا ہے۔ اس خط سے مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے تعلقات کے متعلق واضح اشارہ ملتا ہے اور یہ ایک تحقیق طلب کام ہے ÷
>
> اس خط میں کئی فکر انگیز خیالات ہیں اور بعض ایسے افکار بھی جن سے موجودہ اندھیروں میں افکار کے چراغ روشن کئے جا سکتے ہیں۔ خط میں تحریکِ نظمِ جماعت کی طرف اشارہ ہے اور قومی اجتماعیت کا بھی تذکرہ ہے ÷
>
> مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے ہزار اختلافات کے باوجود اس خط کی تاریخی اہمیت

تقدیم

گذشتہ شمارے میں امریکہ کے سفر کی روداد کی جو پہلی قسط شائع ہوئی تھی اس میں حصار اور دہلی کا ذکر بھی موجود تھا - اس کی تحریر کے وقت سان گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ فوراً ہی بچپن کی ان بھولی بسری یادوں کے بالفعل تازہ ہونے کی صورت بھی پیدا ہو جائے گی لیکن اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ "چٹ منگنی پٹ بیاہ !" کے سے انداز میں سفرِ ہند کا اہتمام ہوا ، اور فروری ۸۰ء کے پورے دو ہفتے راقم ہندوستان گذار آیا ، اور چونکہ اس سفر میں برادرم قاضی عبدالقادر صاحب بھی ساتھ تھے (بلکہ صحیح یہ ہے کہ میں اُن کے ساتھ تھا !) لہٰذا اسی "چٹ منگنی پٹ بیاہ !" کے انداز میں واپس لاہور پہنچنے کے دوسرے ہی دن اُس کی روداد بھی تیار ہو گئی — جسے میں بغیر پڑھے ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں - اس لئے کہ اُس صورت میں ممکن ہی تھا کہ میں کچھ ردّ و بدل یا ترمیم و تنسیخ کرتا اور اس طرح اشاعت میں مزید تاخیر ہو جاتی۔ — حصار میں راقم نے اپنی زندگی کے ابتدائی پورے پندرہ برس گذارے تھے - اُس کی گلیوں ، اور سڑکوں پر راقم تگ بھگ دو گھنٹے بالکل اجنبیوں کی طرح گھومتا رہا ، اور اس دوران میں دوسرے بہت سے احساسات کے ساتھ سب سے گہرا نقش جو دل پر قائم ہوا وہ دُنیا کی بے ثباتی کا تھا - بقولِ غالبؔ ؎

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ ٭ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے !

یا بقول اقبالؔ ع "جو تھا نہیں ہے ، جو ہے نہ ہوگا ، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ !" — اور بقولہٖ تبارک و تعالیٰ : "کَاَنَّهُمْ یَوْمَ یَرَوْنَهَا لَمْ یَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِیَّةً اَوْ ضُحٰهَا" — (النّٰزعٰت) : "ایسے محسوس کریں گے جس دن کہ دیکھیں گے اس کو کہ نہیں رہے تھے مگر بس ایک رات یا اس کی صبح !"

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کی ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کا ترمیم شدہ پروگرام کور کے صفحات پر دیکھا جا سکتا ہے - اس بار ہم یہ کانفرنس 'قرآن اکیڈمی' میں منعقد کر رہے ہیں - اس سے لاہور کے احباب کو تو یقیناً قدرے دقّت ہوگی ، لیکن باہر سے آنے والے حضرات کو اُسی قدر سہولت رہے گی ، اس لئے کہ اُن کے قیام کا انتظام بھی اکیڈمی ہی میں ہوگا - کانفرنس کے باضابطہ اجلاس تو کوئی تعطیل نہ ہونے کے باعث صرف شام ہی کو ہوں گے - لیکن باہر سے آنے والے حضرات کیلئے اِنْ شاء اللہ صبح کے اوقات میں بھی مفید پروگرام رکھے جائیں گے ، اسی لئے 'تنظیم اسلامی' کا سالانہ اجتماع بھی ان ہی ایّام میں رکھ لیا گیا ہے (۲۲ تا ۲۴ اپریل) تاکہ بیرونِ لاہور کے رفقاءِ تنظیم ایک ہی سفر میں دونوں میں شرکت کر سکیں ٭

اسرار احمد

بریں اسلامی امامت کو ڈکٹیٹر شپ سے تعبیر کرنا بھی اصلاً صحیح نہیں۔ اگرچہ تعبیر و تسمیہ کے معاملہ میں بہت وسعت ہے۔ اسلامی امامت کے نظامِ عمل میں عزم اور شوریٰ دونوں عنصر موجود ہیں، اور اس طرح وہ شخصیت کی قوت اور جماعت کی نگرانی، دونوں کو بیک محل جمع کرتا ہے کہ "شاورھم فی الامر واذا عزمت فتوکل علی اللہ"۔ بہر حال حقیقی نظم تو یہ ہے، اگر وقت کا مزاج اس کا متحمل ہو سکے ؛

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جمعیتوں کے اصول پر کوئی ایسی جمعیت وجود میں آئے جو تمام منتشر اجزاءِ جماعت کو ایک نقطۂ اجتماع میں سمیٹ سکے۔ یہ آج کل کا عام اور معمول طریقہ ہے، لیکن اس درجۂ نظم کی راہ میں بھی موانع کم نہیں ہیں جس طرح افراد کے اغراض بسا اوقات مانعِ اجتماع ہوتے ہیں، اسی طرح جماعت بندی کی حالت میں جماعتوں کی ہستی بھی کسی بڑے اجتماع میں مدغم ہو جانا گوارا نہیں کرتی۔ بحالتِ موجودہ مسلمانوں میں افراد اور جماعات دونوں کی ہستیاں مانعِ کار ہیں۔ مذہب اور سیاست دونوں کے بے شمار حلقے بن گئے ہیں اور ہر حلقہ سب سے پہلے اپنی ہستی کی خیر منانا چاہتا ہے۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا۔ والسلام علیکم ود

کلکتہ ۲۵ مئی ۱۹۲۷ء ——— ابو الکلام

قارئینِ 'میثاق' فی الحال تو اس تاریخی خط کا ہدیہ من و عن قبول فرمانے پر اکتفا کریں۔ اس کے مندرجات اور اس پر ادارہ 'جسارت' کے تمہیدی نوٹ پر ان شاء اللہ پھر کبھی گفتگو ہو گی ؛

یک ماہی اشاعت کو دو ماہی بنانے کے لئے ایک اور مضمون جس کا اضافہ طور پر اضافہ کیا گیا وہ "قرآن اور آثارِ کائنات!" کی قسطِ ثانی ہے۔ راقم نے اس کی قسطِ اوّل بھی اشاعت کے بعد ہی دیکھی تھی۔ اسی وقت معلوم ہوا کہ صرف "تفہیم القرآن" سے انتخاب پر ہی مشتمل ہے، تاہم یہ بھی محسوس ہوا کہ بے مفید ——— بہرحال اس کے ضمن میں ایک دوسری وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اس کی قسطِ اوّل پر مرتب کا نام 'محمد یونس جنجوعہ' درج تھا۔ انہوں نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا تو تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک دوسرے 'محمد یونس' ہیں ——— جنجوعہ صاحب نہیں!

بھاگے اور سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے مدین پہنچے جہاں کوئی یار و مددگار تو کیا ہوتا نتے اور پہچاننے والا بھی نہ تھا۔ اس عالم میں انہوں نے دعا کی کہ "رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ" یعنی "اے ربّ میرے! میں سراپا محتاج ہوں ہر اُس خیر کا جو تو میری جھولی میں ڈال دے!" ___ مؤخر الذّکر دعاؤں کی نہایت درخشاں مثالیں سورۂ فرقان کے آخری رکوع میں ملتی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں یعنی 'عباد الرحمٰن' کے دلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے: "وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا" یعنی "وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے ربّ! پھیر دے ہم سے جہنّم کے عذاب کو، یقیناً اُس کا عذاب لاگو ہو جانے والی چیز ہے!" ___ اور: "وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا" یعنی اے ربّ ہمارے! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور بنا ہمیں خدا ترس لوگوں کا پیش رو!" ___ مزید برآں خبریہ اسلوب ہی میں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں وہ دعائیں بھی جو عالمِ آخرت کے مختلف مراحل و مواقع یعنی میدانِ حشر، پل صراط اور جنّت و دوزخ میں مانگیں گے، اہلِ حق و ہدایت یا اہلِ زیغ ضلال! ٭

قرآنِ حکیم کی دعاؤں میں جامع ترین اور ہر اعتبار سے کامل و اکمل دعا ہے سورۂ فاتحہ جس میں مکمل ترجمانی ہے فطرتِ انسانی کی ___ اور جس کے ضمن میں ادعیۂ قرآنیہ کا ایک دوسرا نادر اسلوب سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اس کے آغاز میں نہ انشائیہ انداز ہے نہ خبریہ یعنی نہ فعلِ امر 'قُلْ'۔ یا۔ 'قُوْلُوْا' وارد ہوا ہے نہ فعلِ ماضی یا مضارع 'قَالُوْا' یا 'یَقُوْلُوْنَ' ___ گویا اسلوبِ بیان یہ اختیار کیا گیا کہ یہ ہے وہ صدا یا دُعا جو ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کے قلب کی گہرائیوں سے از خود نکلتی ہے یا نکلنی چاہیئے۔ اسی اسلوب کی دوسری نہایت اعلیٰ مثالیں ہیں وہ دعائیں جو "الزّھراوَین" یعنی سُورۂ بقرہ اور سُورۂ آلِ عمران' دونوں کے آخر میں وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کی آخری آیت کا آغاز تو ہوتا ہے نہایت شاہانہ انداز میں ان قوانینِ الٰہیہ کے بیان سے کہ: "لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" یعنی: "اللہ نہیں مکلّف ٹھہراتا کسی کو مگر اُس کی وسعت کے مطابق!" ___ اور: "لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ!" ___ یعنی

قرآن حکیم کی دُعائیں

نشری تقریر

اسرار احمد

قرآنِ حکیم کی رُو سے انسان کی غایتِ تخلیق 'عبادتِ ربّ' ، بلفوائے الفاظِ قرآنی: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ٥ یعنی "میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں!"۔ یہ 'عبادتِ ربّ' قرآنِ حکیم کی ایک نہایت جامع اور ہمہ گیر اصطلاح ہے جس کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ اس وقت نہ ممکن ہے نہ مطلوب البتہ اس کے اصل جوہر اور لُبِّ لُباب کی جانب رہنمائی فرما دی ہے صاحبِ جوامع الکلم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ان حد درجہ مختصر لیکن غایت درجہ جامع فرموداتِ مبارکہ میں کہ: "اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ - اور - "اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ"۔ یعنی دُعا ہی عبادت کا جوہر اور مغز ہے — بلکہ دعا ہی اصل عبادت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں بکثرت دعائیں وارد ہوئی ہیں۔ کہیں انشائیہ اسلوب میں۔ یعنی نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کی وساطت سے جملہ اہلِ ایمان کو تلقین کے پیرائے میں کہ یوں کہو۔ یا یوں دعا مانگو جیسے "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا" یعنی کہو کہ اے میرے ربّ میرے علم میں اضافہ فرما!"— کہیں خبریہ انداز میں۔ یعنی سابقہ انبیاء و رُسُل اور صُلحاء و ابرار کی دعاؤں کے نقل کرنے کی صورت میں، یا عمومی طور پر اپنے محبوب اور نیکوکار بندوں کے دلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کے انداز میں۔ مقدّم الذکر دعاؤں کی نہایت درخشاں مثالیں ہیں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السّلام کی نہایت جامع دُعا کہ: "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ!" یعنی "اے ربّ ہمارے ہم دونوں کو بھی اپنا تابع فرمان بنائے رکھ اور ہماری نسل میں سے بھی اپنی ایک فرماں بردار اُمّت برپا کیجیو!"— یا حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی وہ دعا جو انتہائی کسمپرسی اور بے چارگی کے عالم میں اُن کے قلب کی گہرائیوں سے اُس وقت نکلی جب وہ مصر سے جان بچا

بنی اسرائیل میں معرکۂ طالوت و جالوت کو وہی مقام اور اہمیّت حاصل ہے جو اُمّتِ محمّد علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی تاریخ میں غزوۂ بدر کو حاصل ہے ۔۔۔ کہ جس طرح بنی اسرائیل کے دورِ عروج یا عہدِ زرّیں یعنی ملکِ داؤد و سلیمان علیہما السّلام کا آغاز ہوا معرکۂ طالوت و جالوت سے ، اسی طرح اسلام کا وہ دورِ غلبہ و عروج شروع ہوا غزوۂ بدر سے جس کا نقطۂ کمال یعنی × ۱۳۸ ء ہے خلافتِ حضراتِ صدّیقِ اکبر و فاروقِ اعظم و عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ۔۔۔ اب اگر یہ بات پیش نظر رہے کہ سورۂ بقرہ کا زمانۂ نزول ہے ہجرت کے متصلاً بعد سے لے کر غزوۂ بدر سے متصلاً قبل تک تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھیوں کو ماضی کی تاریخ کے اس ورق کے ذریعے دراصل دکھایا جارہا ہے آنے والے حالات و واقعات کا ایک واضح عکس ۔ کہ جس طرح سامنا کرنا پڑا تھا حضرت طالوت کے مٹھّی بھر بے سروسامان اہلِ ایمان ساتھیوں کو جالوت کے غرقِ آہن لشکروں کا ، اسی طرح تمہارا مقابلہ ہونے والا ہے کل تین سو تیرہ کی تعداد اور نہایت بے سروسامانی کی حالت میں قریش کے ایک ہزار کیل کانٹے سے لیس غرقِ آہن سورماؤں سے ۔۔۔ اور جس طرح صبر و ثبات کے صلے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح دی تھی ان کے دشمنوں پر اُسی طرح اگر تم بھی صبر کا دامن تھامے رکھو اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر بھروسہ رکھو تو وہ (اللہ) تمہیں بھی فتح عطا فرمائے گا تمہارے دشمنوں پر ۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۰ میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپؐ کے ساتھیوں کو وہ دعا بھی سُنا دی گئی جو حضرتِ طالوت کے ساتھیوں نے مانگی تھی اور پھر آیت ۲۸۶ میں وہ مفصّل دعا بھی تلقین فرمادی گئی جو اَب نکلنی چاہیئے اہلِ ایمان کے قلوب کی گہرائیوں سے ۔۔۔ اور اسی پر ختم فرمادیا اس سورۂ مبارکہ کو ۔۔۔۔۔ !!

واضح رہے کہ دُعا کی اصل روح ہے اللہ کے سمیع و بصیر اور عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ہونے کا یقینِ کامل ۔۔۔ اور اُسی کی نصرت و تائید اور توفیق و تیسیر پر کامل توکّل و اعتماد ۔۔۔ اور یہی دونوں چیزیں ہیں جو ہمیں ان دونوں دعاؤں کے ایک ایک حرف میں رچی بسی نظر آتی ہیں ؎

وَاٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝

"اُس کو ملے گا جو اُس نے کمایا ہوگا اور اُسی پر پڑے گی جو بُرائی اُس نے کی ہوگی"۔ اور اس کے بعد بغیر کسی انشائیہ یا خبریّہ تمہید کے دُعا شروع ہوجاتی ہے:

"رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج وَاعْفُ عَنَّا وقفہ وَاغْفِرْ لَنَا وقفہ وَارْحَمْنَا وقفہ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝"

"یعنی اے ربّ ہمارے! نہ گرفت فرما ہماری اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں۔ اے ربّ ہمارے! مت عائد فرما ہم پر ایسی ذمہ داریاں جیسی کہ تونے عائد کیں ہم سے پہلے والوں پر، اور نہ ڈال ہم پر وہ جس کی ہم طاقت نہ رکھتے ہوں، اور درگذر فرما ہم سے، اور بخشش فرما ہماری، اور رحم فرما ہم پر، اور مدد فرما ہماری کافروں کے مقابلے میں"۔ بالکل یہی اُسلوب سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع میں ہے کہ "اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ" کے فوراً بعد بغیر کسی فعل 'قَالُوْا' یا 'يَقُوْلُوْنَ' کے آغاز ہوجاتا ہے اِس عظیم دُعا کا جو "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج" سے شروع ہوتی ہے — اور — اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ط — پر ختم ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۰ میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ کے ضمن میں حضرت طالوت کے اہلِ ایمان ساتھیوں کی وہ دُعا نقل ہوئی ہے جو انہوں نے اُس وقت مانگی تھی جب اُن کا سامنا جالوت اور اُس کے لشکر سے ہوا — ارشاد ہوتا ہے: "وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝" یعنی "جب وہ سامنے ہوئے جالوت اور اُس کی فوجوں کے تو انہوں نے کہا۔ اے رب ہمارے! انڈیل دے ہم پر صبر اور جما دے ہمارے قدم اور مدد فرما ہماری کافروں کے مقابلے میں!" — بادنیٰ تأمّل واضح ہو جاتا ہے کہ اس دُعا میں ایک عکسِ کامل موجود ہے۔ یا بالفاظِ دیگر یہ مکمّل خلاصہ ہے اُس مفصّل اور عظیم دُعا کا جس کا ذکر پہلے ہوچکا ہے اور جس پر سورۂ بقرہ ختم ہوتی ہے۔ اور ذرا غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ اس مناسبت و مشابہت کا سبب کیا ہے۔ تاریخ

نے جو تائیدی تقریظ لکھی ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علمائے کرام بھی سلسلۂ نوربخشیہ کو تاریخی حوالے سے ایک گمراہ اور مائل بہ تشیّع فرقہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ضروری سمجھا کہ محترم پروفیسر صاحب کے مقالے سے قارئین کے ذہن میں مذہبِ نوربخشیہ کا جو غلط تصوّر ابھرا ہے اُسے دُور کرنے کے لئے چند ضروری نگارشات پیش کروں:

'میثاق' کے صفحہ ۳ پر "کشمیر زیرِ نگین سلاطین" نامی کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں: "اس کی تعلیمات میں شیعہ عقائد کا رنگ نمایاں ہے!" حالانکہ یہ بات بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ سیّد محمّد نوربخش رہ کی تعلیمات میں شیعیت ہے یا خود حضرت سیّد محمّد نوربخش مائل بہ تشیّع تھے۔ آپ کی تعلیمات افراط و تفریط سے بالکل پاک ہیں۔ سیّد محمّد نوربخش رہ کی تعلیمات نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت اور فرمانِ نبوی صلعم کا نچوڑ ہیں۔ البتّہ یہ رسومات جو اس وقت سلسلۂ نوربخشیہ میں رائج ہیں، اُن کا حضرت سیّد محمّد نوربخش رہ کی تعلیمات سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ یہ سب شیعی عقائد ہیں اور شیعوں نے مکر و فریب کے ساتھ ان کو مذہبِ نوربخشیہ میں داخل کیا ہے۔ بلکہ حقیقت میں سلسلۂ نوربخشیہ اور نوربخشی تعلیمات افراط و تفریط سے مُبرّا ایک ایسا معتدل اور جامع مذہب ہے اور باقی افراط و تفریط کے شکار فرقوں کے مقابلہ میں عقائد و مسائل، اصول و فروع کا ایک "متفقہ پلیٹ فارم" ہے جس کے اندر ملّتِ اسلامیہ کا اتّحاد و اتفاق اور ملّی وحدت موجود ہے نیز 'میثاق' کے اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ: "یہ لوگ خلفائے ثلاثہ کی شان میں گُستاخی کرتے ہیں!" نعوذ باللہ! یہ بات بالکل غلط ہے اور یہ نوربخشیوں پر صریح بہتان ہے۔ نُوربخش لوگ خلفائے راشدین یا اُمّہاتُ المؤمنین کے بارے میں گستاخی یا بے ادبی بالکل نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ایسا کرنے والوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے غضب کا مستحق سمجھتے ہیں۔ نُوربخشیوں کی کسی کتاب میں اور نہ ہی عقائد میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان میں کوئی گستاخانہ بات پائی جاتی ہے اور نہ کوئی ثابت کر سکتا ہے۔ نوربخشی تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مومن اور اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جان نثار ساتھی سمجھتے ہیں، اور یہی عقائد ہماری کتابوں میں بھی ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ نوربخشی عقائد کی تمام کتابوں میں صحابہ کرام رض اور خلفائے راشدین و اُمّہات المومنین کی شان میں ہدیۂ عقیدت اور نذرانے پیش کئے ہیں اور کوئی بھی قاری اس سلسلے میں مزید اطمینان چاہتا ہو تو نوربخشیہ مذہب کی مستند کتابوں (نجم الہُدیٰ، کشف الحقیقت

سلسلۂ نوربخشیہ

کے ضمن میں ایک غلط فہمی کا ازالہ

غلام حسن نوربخشی ـــــ و ـــــ محمد حق نواز بلتستانی

معروف پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہ کا مقالہ: "اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش!" اولاً ماہنامہ 'میثاق' میں ۶۸-۶۹ء کے دوران چھ اقساط میں شائع ہوا تھا اور پھر یکجا صورت میں ستمبر، اکتوبر ۷۶ء کی مشترک خصوصی اشاعت کے طور پر شائع ہوا (اور اب کتابی صورت میں طبع شدہ موجود ہے!) اس میں کشمیر کے سلسلۂ نوربخشیہ سے متعلق جو چند اشارات آئے ان کے ضمن میں تردیدی وضاحت پر مشتمل ایک خط غلام حسن نوربخشی صاحب کا ہمیں ملا تھا، لیکن اس مراسلہ نگار نے اپنا پتہ درج نہیں کیا تھا لہٰذا اسے قابلِ اشاعت نہ سمجھا گیا۔ گذشتہ سال بلتستان سے تعلق رکھنے والے ایک نہایت نیک اور دردمند نوجوان محمد حق نواز صاحب 'تنظیمِ اسلامی' میں شامل ہوئے تو اُن سے نوربخشی سلسلے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں جن سے غلام حسین صاحب کے خط کے مندرجات کی تائید ہوئی۔ چنانچہ اب وہ خط محمد حق نواز صاحب کی نظرثانی اور کسی قدر حک و اضافہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے ـــــــ اسرار احمد

ماہنامہ 'میثاق' بابت ماہ ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۶ء میں تصوف کے بارے میں خصوصی اشاعت پڑھ کر بہت دکھ ہوا کیونکہ محترم المقام پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے مقالے کے مطالعہ کرنے سے پہلے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پروفیسر موصوف نے اپنے مقالے کے سلسلے میں نہ کوئی نوربخشی لٹریچر دیکھا ہے اور نہ ہی حضرت سید محمد نوربخش ؒ کی کتابوں ہی سے استفادہ فرمایا ہے۔ نیز پروفیسر موصوف کے مقالے پر حضرت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

یقین: رُوحِ سعی و عمل

از

ڈاکٹر اسرار احمد

یہ مقالہ ریڈیو پاکستان لاہور کے ماہ ربیع الاوّل کے پروگرام

خیرُ الوریٰ

میں بتاریخ ۱۴ جنوری ۸۰ئہ نشر ہوا

اَحْمَدُہٗ وَ اُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ - اَمَّا بعد - فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ ـــــ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

محترم صدرِ مجلس و مہمانِ خصوصی اور معزز سامعین!

یہ بات کہ یقین ہی انسان کی سعی و عمل کی اصل رُوح ہے اتنی ظاہر و باہر ہے کہ بظاہر اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل نظر آتا ہے ـــــ اس لئے کہ کون نہیں جانتا کہ انسانی شخصیت کے دو۲ پہلو ہیں: ایک۱ علمی یا فکری و نظری پہلو اور دوسرا۲ عملی پہلو۔ اور

نورالمؤمنین - اور قائم الحق) کا مطالعہ کر سکتا ہے ؂

مزید 'میثاق' کے اسی صفحہ پر لکھا ہے کہ "نوربخش نے امام مہدی المنتظر ہونے کا دعویٰ کیا تھا!" - یہ بھی بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ حضرت محمد نوربخش رح نے کبھی بھی مہدیٔ موعود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نوربخشی انہیں امام نہیں مانتے بلکہ صرف پیر اور مجتہد مانتے ہیں اور اگر امام مانتے بھی ہیں تو انہی معنوں میں جن میں حنفی حضرات امام ابوحنیفہ کو مانتے ہیں، اِس سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں مانتے۔ مہدویت کا الزام حضرت سیّد محمد نوربخش رح پر اس وقت کے "علمائے سوء" نے اُن کے علمی اور عملی کارناموں سے حسد کی بنا پر باقاعدہ سازش کے تحت انہیں بدنام کرنے کے لئے لگایا تھا جو کہ بالکل باطل ہے۔ جیسا کہ مشہور نقّاد، مؤرّخ اور محقّق دانشور اُستاد سعید نفیسی صاحب کی رائے ہے وہ لکھتے ہیں کہ: "با دعائے مہدویّت متہمش ساختند در ایں باشاہ امر بحبس وتبعید داد!" -

(احوال و آثارِ علاؤ الدولہ سمنانی ص۸) ؂

نیز سیّد محمد نوربخش نے سرکارِ دو عالم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم کے اسم مبارک اور کنیت کو ایک ساتھ رکھنے سے منع کیا ہے اور کہا ہے: "یکرہ ان یجمع اسم محمدؐ مع کنیۃ ابی القاسم الا لمن قال فیہ رسول اللّٰہ ص اسمہ اسمی وکنیتہ کنیتی"

(ملاحظہ ہو فقہ احوط ص۲۷) ؂

یہ حوالجات کافی ہیں اس بات کے ثبوت کے لئے کہ حضرت سیّد محمد نوربخش رح نے کبھی بھی مہدویّت کا دعویٰ نہیں کیا، اور یہ کہ نوربخشیہ والے بھی ان کو امام ان معنوں میں نہیں سمجھتے ہیں جن معنوں میں شیعہ اپنے بارہ اماموں کو سمجھتے اور مانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ شیعہ عقائد کی رُو سے امام "منصوص من اللّٰہ" اور "معصوم" ہیں اور چونکہ یہ خیال اور عقیدہ باطل ہے لہٰذا نوربخشی کسی کو ان معنوں میں امام نہیں مانتے جن معنوں میں شیعہ اپنے اماموں کو سمجھتے ہیں۔ نوربخشی حضرت سیّد محمد نوربخش رح کو صرف پیرِ طریقت اور مجتہد سے زیادہ اور کچھ نہیں سمجھتے اور مانتے ہیں ؂

پروفیسر صاحب اپنی کتاب "اسلامی تصوّف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش!" کے ص۳۱ پر لکھتے ہیں: "نوربخشی سلسلے کے عقائد 'احوط' نامی کتاب میں مندرج ہیں!" یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ 'احوط' نامی کتاب نوربخشیوں کی عقائد کی کتاب ہے بلکہ وہ تو

باقی ص۲۲۳ پر دیکھیں!

عاجز ہے۔ البتہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بات کی جائے تو یقین کے ضمن میں ایک وسیع تر اصطلاح سامنے آتی ہے ــــ یعنی 'ایمان' اور سعی و عمل کے لئے ایک زیادہ حسین و جامع عنوان سامنے آتا ہے ــــ یعنی 'جہاد' اور اِن دونوں کے مابین چولی دامن کے رشتے اور لازم و ملزوم کی نسبت کو واضح کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر مختلف الفاظ و اسالیب میں۔ ان میں سے اہم ترین اور جامع ترین مقام تو ہے سورۂ حجرات کی آیت ۱۵ جہاں ارشاد ہوتا ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

(یعنی) مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر شک میں نہیں پڑے اور جہاد کیا انہوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں (حقیقت میں) صرف یہی لوگ سچے ہیں!

یہی بات سورۂ صف میں اِن الفاظ میں سامنے آتی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

: یعنی اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس کاروبار کی جانب جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان محکم رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر۔ اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے۔ اگر تم صاحبِ علم ہو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے!

اور: "اِک پھول کا مضمون ہو تو سَو رنگ سے باندھوں!" کے مصداق یہی حقیقت واضح کی گئی ہے سورۂ انفال کی آیت ۷۴ میں بدیں الفاظ :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ۝

(یعنی) اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں ــ اور وہ جنھوں نے پناہ دی اور نصرت کی ــ یہی لوگ ہیں حقیقتاً مومن، ان کے لئے مغفرت بھی ہے اور باعزت رزق بھی!

دونوں کے مابین ایک نہایت گہرا اور مضبوط تعلّق پایا جاتا ہے۔ یعنی ایک سبب ہے اور دوسرا اُس کا نتیجہ اور اُن کے مابین لازم و ملزوم کی یہ نسبت اتنی قوی ہے کہ دونوں کو ایک ہی تصویر کے دو رُخ قرار دینا قطعاً غلط نہ ہوگا۔ یعنی ایک انسانی شخصیت کا باطنی و داخلی رُخ ہے اور دوسرا اس کا ظاہری و خارجی رُخ ـــــ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ جو باتیں انسان کے فکر و نظر میں رچتی بستی چلی جاتی ہیں، گویا جن اُمور پہ یقین اس کے دل و دماغ میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے، اُن کے اثرات اس کے فعل و عمل، سعی و جُہد اور طلب و جستجو میں نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر جتنا جتنا اضافہ اس یقین کی گہرائی و گیرائی میں ہوتا چلا جاتا ہے، اتنی ہی شدّت سعی و عمل میں بڑھتی چلی جاتی ہے ـــــ یہاں تک کہ کسی انسان کی سعی و عمل کے انداز اور طلب و جستجو کے رُخ سے اُس کے عقائد و نظریات بھی پوری صحت کے ساتھ مستنبط کئے جا سکتے ہیں اور اُن کے سطحی یا راسخ ہونے کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جا سکتا ہے ۞

البتّہ ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ انسان کے حقیقی اور واقعی افکار و نظریات یا بالفاظِ دیگر اس کی اصل ذہنی اقدار کا ہے، اُس کے مُبیّنہ عقائد یا مزعومہ خیالات و نظریات کا نہیں۔ اس لئے کہ قول و فعل کا وہ تضاد جو بہت سے انسانوں میں نظر آتا ہے، دراصل اس کے حقیقی و واقعی نظریات اور اس کے مبیّنہ عقائد کے فرق و تفاوت کا مظہر ہوتا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ خود اُسے اس کا ادراک و شعور ہو یا نہ ہو ـــــ اسی طرح کا ایک معاملہ ان مریض شخصیتوں کا بھی ہے جنہیں ضعفِ ارادہ کی بیماری لاحق ہوتی ہے۔ جس کے باعث ان کے حقیقی عقائد و نظریات بھی ان کے عمل پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک استثنائی معاملہ ہے ورنہ عام اصول بہرحال یہی ہے کہ ایک نارمل انسان کی سعی و عمل کا رُخ بھی اس کے یقین ہی سے متعیّن ہوتا ہے اور اس کی شدّت و قوّت یا ضعف و اضمحلال کا دارومدار بھی یقین کی پختگی یا کمزوری ہی پر ہوتا ہے ۞

اس میں ہرگز کوئی شک یا شبہ نہیں ہے کہ حضرت خیر الوریٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم و فداہ آباءنا و اُمّہاتنا جن کے نامِ نامی اور اسمِ گرامی سے یہ سلسلۂ مقالات معنون ہے، کی تعلیم و تلقین اور تزکیہ و تربیت سے جو پیکرِ یقین اور مجسمۂ سعی و عمل جماعت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تیار ہوئی تھی اس کی کوئی دوسری نظیر پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے

'ایمان'۔ 'امن' سے بابِ افعال کا مصدر ہے جس کے خواص میں 'تعدیہ' بھی شامل ہے۔ یعنی جو افعال ثلاثی مجرّد میں 'لازم' ہوتے ہیں وہ اس باب میں آکر بالعموم 'متعدّی' ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لفظی معنی ہوئے 'امن دینا' ــــ اور جب اس پر اضافہ ہو حروفِ جار 'با' یا 'لام' کا تو اس کے معنی ہوجاتے ہیں کسی کی تصدیق کرنا 'لام' کے ساتھ ہو تو عموماً سطحی اور سرسری سی تصدیق مراد ہوتی ہے اور 'با' کے ساتھ ہو تو پورے وثوق اور اعتماد والی تصدیق ــــ واضح رہے کہ اصل مادّے یعنی 'امن' سے اس کا تعلق اب بھی منقطع نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ کسی شخص کی لائی ہوئی کسی خبر یا اس کے کسی دعوے کی تردید وتکذیب کا لازمی نتیجہ ہے قدح اور فتنہ وفساد ہے اور اس کی توثیق وتصدیق کا منطقی نتیجہ امن وسکون۔ چنانچہ اصطلاحِ شرع میں ایمان نام ہے: تصدیق بما جاء بہ النّبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یعنی ان امورِ غیبی کی تصدیق کا جن کی خبر دی ہے محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ــــ اور بالکل فطری اور منطقی طور پر اس کے دو رُخ یا دو پہلو ہیں: ایک خارجی وظاہری یعنی "اقرار باللّسان" والا پہلو جس پر اس دُنیا میں کسی انسان کے مومن ومسلم قرار دیئے جانے کا دارومدار ہے۔ چنانچہ وہ کلمۂ شہادت کی صورت میں ارکانِ اسلام میں اوّلین رکن کی حیثیت سے شامل ہے اور دوسرا داخلی وباطنی پہلو جو عبارت ہے 'یقینِ قلبی' سے اور جو رکنِ رکین ہے ایمانِ حقیقی کا اور جس کا لازمی نتیجہ ہے جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ ــــ!!

الغرض ایمانِ حقیقی ہی کا دوسرا نام یقین ہے اور اس کا محل 'قلب' ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں متعدّد مقامات پر ایمانِ حقیقی کا محل 'قلب' کو قرار دیا گیا جیسے:

(۱) سورۂ حجرات کی آیت ۷ میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَ زَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (یعنی) اللہ نے محبوب بنا دیا ہے تمہارے نزدیک ایمان کو اور کھبا دیا ہے اسے تمہارے دلوں میں ــــ!!

(۲) اور آیت ۱۴ میں بعض بدّوؤں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ (یعنی) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں:

ذہن و قلب کی وہ خاص کیفیت جو قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم و تربیت کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نفوس میں پیدا ہو گئی تھی — یا صحیح تر الفاظ میں جو قرآنِ حکیم کی آیاتِ بیّنات کے ذریعے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پیدا فرما دی تھی، بمصداقِ الفاظِ قرآنی: ”هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ“ (الحدید آیت ۹) اس کی تعبیر کے لیے قرآنِ حکیم اگرچہ کہیں کہیں لفظِ ’یقین‘ بھی استعمال کرتا ہے بالخصوص آخرت کے ضمن میں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح ’ایمان‘ ہی کی ہے جو ’یقین‘ کی نسبت وسیع تر بھی ہے اور زیادہ بامعنیٰ بھی۔

’یقین‘ کے لفظی معنی کے ضمن میں امام راغب اصفہانی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ”مُفرداتُ القرآن“ میں لکھتے ہیں:

الیقینُ صِفَةُ العلم فوق المعرفةِ والدّرایة واخواتها۔ یقال علم الیقین ولا یقال معرفة الیقین وهو سکونُ الفهمِ مَعَ ثَباتِ الحُکْمِ	(یعنی، یقین اگرچہ علم ہی کی کیفیت کا نام ہے تاہم وہ مجرّد عقلی پہچان یا منطقی استدلال اور اس قبیل کی دوسری چیزوں سے بلند تر ہے۔ چنانچہ ’علم الیقین‘ تو کہا جاتا ہے لیکن معرفۃ الیقین نہیں بولا جاتا۔ گویا یقین وہ کیفیت ہے جس میں فہم و شعور کا ٹھہراؤ اور رائے کی پختگی دونوں شامل ہیں —!)

اس سے ایک طرف تو یہ واضح ہو گیا کہ ’یقین‘ ایک خالص داخلی کیفیت کا نام ہے اور دوسری طرف یہ اشارہ بھی مل گیا کہ اس میں کسی بات کے صحیح یا مطابقِ واقعہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی بحث نہیں ہے۔ گویا ’یقین‘ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی — ایمان کا معاملہ ان دونوں اعتبارات سے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اس میں ”تصدیق بالقلب“ کے ساتھ ساتھ ”اِقرار باللّسان“ بھی لازمی ہے اور دوسری جانب ایمان نام ہے نفس الامر کی ان ازلی و ابدی حقیقتوں پر یقین کا، جن کی شہادت خود فطرتِ انسانی میں مضمر ہے، لہٰذا اس کا اصل حاصل ہے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان یا بالفاظِ دیگر شخصیتِ انسانی کا داخلی امن۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی یہ اساسی و بنیادی اصطلاح ماخوذ ہی ’امن‘ کے مادّے سے ہے۔ ❊

مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک ایمان ہما شما کا ہے اور ایک ایمان صدّیقِ اکبر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ـــــ اور پھر ایک ایمان خود رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا بقولئے الفاظِ قرآنی: "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ" یعنی "ایمان لائے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم اس پر کہ جو نازل کیا گیا اُن پر اُن کے ربّ کی جانب سے اور ایمان لائے اہلِ ایمان!" ـــــ اور ان کے مابین نسبت و تناسب کا معاملہ بالکل وہی ہے کہ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!" ـ گویا ایمان کے مابین مراتب و مدارج بے شمار ہیں۔ البتّہ اس کو اُصولی طور پر دو درجوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے: ایک اپنی نوعیّت کے اعتبار سے علم الیقین ہے اور دوسرا عین الیقین اور حق الیقین کا مجموعہ۔ واضح رہے کہ یوں تو اُمورِ ایمانی جہت سے ہیں، لیکن اصلاً ایمان نام ہے ایمان باللہ کا اور ایمان بالآخرت ہو یا ایمان بالرّسالت یہ دونوں ایمان باللہ ہی کی فروع (COROLLORIES) ہیں۔ اس لئے کہ آخرت مظہر ہے اللہ کی صفتِ عدل کی اور رسالت مظہر ہے صفتِ ہدایت کی ـــــ اب ایمان باللہ کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان اللہ کے وجود اور اس کی صفات کو ان کے مظاہر و آثار سے مستنبط کرے بقولِ شاعر: ؏ "حق مری دسترس سے باہر ہے، حق کے آثار دیکھتا ہوں میں!" ـــــ یہ علم الیقین کا درجہ ہے ـ یعنی معرفتِ الٰہی بذریعہ مشاہدۂ آیاتِ الٰہی اور واقعہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی ایک عظیم اکثریّت کی رسائی بس یہیں تک ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان باللہ کے ضمن میں قرآن نے اسی اسلوب کو بتکرار و اعادہ اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ مکّی سورتوں میں وہ مضامین بکثرت اور شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جن کا خلاصہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۶۴ میں ایسی جامعیّت کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اسے "آیت الآیات" قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	(یعنی) بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَ	اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اس کشتی
الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ	میں جو لوگوں کے لئے نفع بخش سامان لئے دریا
بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ	میں چلتی ہے اور اللہ نے آسمان سے جو پانی اُتارا
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ	زندہ کر دیا اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو

(۳) اسی طرح سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں سچے اور مخلص اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا :

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ○

(یعنی) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں راسخ دیا ہے ایمان، اور تائید کی ہے ان کی اپنے خاص فیض سے، اور داخل کرے گا اُن کو اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی اور وہ اس سے خوش۔ یہ جماعت ہے اللہ کی۔ سُن رکھو اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے — !!

اس یقینِ قلبی کے تین مدارج قرآنِ حکیم نے متعین فرمائے ہیں۔ عِلْمُ الْیقین، عینُ الیقین اور حقُّ الیقین۔ ان میں سے مقدم الذکر دونوں کا تذکرہ سورۂ تکاثر میں ہے اور مؤخر الذکر الفاظ دو جگہ آئے ہیں ایک سورۂ واقعہ میں اور دوسرے سورۂ حاقہ میں — ان تینوں کے مابین فرق و تفاوت کو آگ کی سادہ سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کہیں دور سے دُھواں نظر آئے تو یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ وہاں آگ ہے۔ یہ علم الیقین کا پہلا درجہ ہے جس میں کسی شئے کے وجود کا یقین خود اس کے مشاہدے سے نہیں بلکہ اس کے آثار کے مشاہدے کی بنا پر ہوا ہے۔ گویا اس میں تعقّل و تفکّر اور استدلال اور استنباط و استنتاج کا واسطہ پایا جاتا ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ خود آگے بڑھ کر اپنی آنکھ سے آگ کا مشاہدہ کر لیں، یہ عین الیقین ہے اور اس میں یقین کی شدت پہلے کی نسبت یقیناً بہت زیادہ ہے تاہم ع : "آنچہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب!" کے مصداق ایک امکان باقی رہتا ہے کہ شاید وہ صرف نمود نار ہو فی الواقع نار نہ ہو۔ لیکن اگر اس آگ کی کوئی چنگاری اڑ کر آپ کی جلد پر پڑ جائے اور اس کی جلن اور سوزش آپ خود محسوس کر لیں تو اب یہ وسوسہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور یقین اپنے تکمیلی درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ ہے حقُّ الیقین کا درجہ — !!

چنانچہ یہی فرق و تفاوت ایمان کے مراتب و مدارج کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس ایمان سے قطع نظر جس میں ساری بحث 'اِقرار' بالِلّسان' اور 'شہادت' سے ہے، تصدیقِ قلبی زیرِ بحث ہی نہیں آتی۔ حقیقی ایمان کے بھی بے شمار مراتب و

"اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ" ۔ یعنی "یہ کہ تو اللہ کی اطاعت و عبادت میں اس شدتِ یقین سے سرگرم ہو جائے کہ جیسے تو اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو!"

الغرض یہ ہے ایمان باللہ کا وہ درجہ جسے 'عین الیقین' اور 'حق الیقین' سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جہاں پہنچ کر انسان خود مجسّم یقین بن جاتا ہے، اور یقین انسان کے روئیں روئیں سے پھوٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ نہ یہ بات غلط ہے کہ: ؏

"نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!" ۔ اور نہ ہی یہ کوئی انہونی بات ہے کہ:

"یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے ٭ وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!"

۔ البتہ یہاں تک رسائی ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہو سکتی، یہ درجہ صرف خواص کا ہے اور ظاہر ہے کہ: "وَقَلِیْلٌ مَّا هُمْ"

یہاں مختصراً یہ بھی بیان ہو جائے تو مناسب رہے گا کہ قرآنِ حکیم ایمان بالآخرت کے ضمن میں خاص طور پر "یقین" کا ذکر کیوں کرتا ہے۔ دراصل عوامی سطح پر انسانوں کے عمل پر سب سے گہری چھاپ جس ایمان کی پڑتی ہے وہ ایمان بالآخرت ہی ہے۔ لہٰذا وہ عوام الناس بھی جن کا ایمان ابھی 'اقرار' بالّلسان یا شہادت ہی کے درجے میں ہو اپنے عمل کی درستی کے لئے محتاج ہیں کہ کم از کم آخرت کے ضمن میں اُن کا ایمان 'علم الیقین' کے درجے کو لازماً پہنچ جائے ورنہ ایمان کے کوئی اثرات اُن کے افعال و اعمال پر قطعاً مترتّب نہ ہوں گے ۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ بقرہ کے آغاز میں بھی ایمان بالآخرت کے ضمن میں فرمایا: "وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝" ۔۔ اور اسی طرح سورۂ لقمان کے آغاز میں بھی فرمایا: "وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝" ۔ اور سورۂ جاثیہ میں بھی منکرین قیامت کے ذکر میں فرمایا:

وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝	(یعنی) اور جب کہا گیا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے وقوع میں کوئی شک نہیں تو تم نے کہا: "ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے، صرف ایک خیال سا تو ہمیں ہوتا ہے، لیکن یقین نہیں آتا!"

قصّہ مختصر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآنِ حکیم کے حوالے سے بات جو یقین کے

فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ
تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝

کے بعد اور پھیلا دیئے اس میں تمام اقسام کے
جانور، اور ہواؤں کے چلنے میں اور بادل میں
جو مسخّر ہے آسمان اور زمین کے درمیان نشانیاں
ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لئے!

الغرض آیاتِ آفاقی پر تعقّل و تفکّر کے ذریعے بھی یقیناً ایمانِ حقیقی پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ ہے بہرحال 'علم الیقین' ہی کے درجے میں، اور یہ سمجھنا غلطی ہی نہیں بہت بڑی گمراہی ہے کہ ایمان باللہ کا آخری درجہ یہی ہے۔ اللہ کی ہستی اور اُس کے وجود کا یقین انسان کو 'عین الیقین' بلکہ 'حق الیقین' کے درجے تک بھی حاصل ہو سکتا ہے بشرطیکہ انسان بفحوائے الفاظِ قرآنی: وَفِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اور بقول علّامہ اقبال مرحوم ع: "اپنے من میں ڈوب کر پاجا سُراغِ زندگی!" اپنے باطنی شعور کو اُجاگر کرے اور دل کی آنکھ سے جمالِ الٰہی کا مشاہدہ کرے۔ چنانچہ یہی وہ بات ہے جسے علّامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس جدید علم الکلام کی اساس بنایا ہے جس کے اصول و مبادی انہوں نے اپنے مشہورِ زمانہ لیکچرز میں معیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ کہ مشاہدہ صرف خارجی نہیں ہوتا باطنی بھی ہوتا ہے ــــ اور تجربہ صرف مادّی اور حسّی ہی نہیں ہوتا قلبی و روحانی بھی ہوتا ہے اور اس حسِّ باطنی کے اعتبار سے ایمان باللہ معقولات اور تصوّرات کے دائرے سے نکل کر محسوسات و مشاہدات کے دائرے میں آجاتا ہے، اور ایمان بندۂ مومن کا قال ہی نہیں حال بن جاتا ہے۔

یہ بات کہ ایمان 'عین الیقین' اور 'حق الیقین' کے درجے کو پہنچ سکتا ہے صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے احوال سے نور روزِ روشن کی طرح ثابت ہے ہی، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اس مشہور اور متّفق علیہ حدیث سے نقلاً بھی ثابت ہے جسے 'حدیثِ جبریل' سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے محدّثین نے اُس کے مضامین کی اہمیت اور جامعیّت کے پیشِ نظر "اُمّ السُّنّۃ" قرار دیا ہے۔ اس میں حضرت جبریل علیہ السّلام کے اس سوال کے جواب میں کہ: "اخبرنی عن الاحسان!" یعنی مجھے احسان کے بارے میں بتائیے!"۔ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (حجرات: ۱۵)
اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں صرف یہی لوگ (دعوئی ایمان میں) سچے ہیں۔

اِس آیۂ مبارکہ میں "لَمْ یَرْتَابُوْا" کے الفاظ مبارکہ نے ایمان کے "یقین" والے پہلو کو بالکل متعین کر دیا ہے، اور اس کے بعد کے الفاظ نے واضح کر دیا ہے کہ ایمانِ حقیقی کا لازمی نتیجہ جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ ہے۔

جہاد یا مجاہدہ — 'جُہد' کے مادّے سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے، جس کے خواص میں مشارکت بھی ہے اور مقابلہ بھی (یعنی ایک ایسی عملی کیفیت جس میں دو فریق شریک ہوں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے یا ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے درپے ہوں۔ جیسے قتل ایک یکطرفہ فعل ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کر دیتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ بھی اس کے قتل کا ارادہ رکھتا ہو۔ جبکہ قتال یا مقاتلہ ایک دوطرفہ عمل ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے قتل کے ارادے ہی سے میدان میں اترتے ہیں۔ اسی طرح بحث ایک یکطرفہ فعل ہے جس میں ایک شخص کسی مسئلے کے بارے میں کھود کرید کر رہا ہوتا ہے — اور مباحثہ میں دو فریق شریک ہوتے ہیں اور دونوں اپنے موقف کو درست اور فریقِ مقابل کے موقف کو غلط ثابت کرنے پر تُلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح 'جُہد' ایک یک طرفہ عمل ہے جس کا ترجمہ اُردو یا فارسی میں 'کوشش' ہوگا۔ جب کہ جہاد یا مجاہدہ ایک دو طرفہ عمل ہے جس کا ترجمہ اُردو یا فارسی میں 'کشمکش' ہوگا اور انگریزی میں ——— TO STRUGGLE

ایمانِ حقیقی یا یقینِ قلبی کے نتیجے میں جو کشمکش یا تصادم پیدا ہوتا ہے اُس کا اوّلین میدان کار انسان کی اپنی داخلی شخصیت ہے۔ جیسے ہی انسان کے قلب و ذہن نورِ ایمان سے منور ہوتے ہیں، اُس کے سفلی جذبات و خواہشات کے طوفان اس روشنی کو گل کر دینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ انسان کی حیوانی شخصیت یا LIBIDO کی گہرائیوں اور اُس کے اندھیاروں کا مشاہدہ دورِ جدید کے علمائے نفسیات نے خوب کیا ہے، اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ان کی کیفیت فی الواقع وہی ہے جو قرآنِ حکیم کی اس تمثیل میں بیان ہوئی کہ:

اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌ
یا جیسے اندھیرے گہرے سمندر میں چھائی ہوئی ہو اس پر ایک موج، اور اس پر پھر ایک اور موج، اور پھر اس پر ایک بدلی، گویا

لئے وسیع تر اور کثیر الاستعمال اصطلاح تو ایمان ہی کی ہے لیکن ایمان کا جو جزو شخصیت کے سعی و عمل والے پہلو سے متعلق ہے وہ یقین قلبی سے عبارت ہے اور لازمی نتیجہ وہ ہے جسے قرآن جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔

ایمان اور جہاد کے باہمی لزوم کے ضمن میں اس سے قبل قرآنِ حکیم کے متعدد مقامات کا حوالہ دیا جا چکا ہے لیکن ان میں سے اہم ترین مقام سورہ حجرات کی آیت ۱۵ ہے جس میں 'مومنِ حقیقی' کی "جامع و مانع" تعریف بیان ہوئی ہے۔ اس لئے بھی کہ اس کے آغاز و اختتام دونوں پر حصر کا اسلوب موجود ہے۔ یعنی آغاز بھی ہے کلمۂ "انّما" سے اور آخر میں بھی اسم اشارہ "اُولٰٓئِکَ" پر اضافہ فرمایا گیا ہے اسم ضمیر "ھُمْ" کا۔ گویا کہ: "مومن تو بس یہی ہیں!" اور "صرف وہی لوگ سچے ہیں!" ــــ اور اس سے قبل والی آیت یعنی آیت ۱۴ میں قرآن کے عام طرز بیان کے خلاف 'ایمان' اور 'اسلام' کا ذکر مقابلۃً کیا گیا ہے اور ایک کی نفی کُلّی کے باوصف وباوجود دوسرے کا اثبات کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(یعنی) یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے (اے نبی!) کہہ دیجئے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو، بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں، ابھی تک تو ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ البتہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر کاربند رہو تو تمہارے اعمال (کے اجر و ثواب) میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، رحم فرمانے والا ہے!

اس سلسلۂ کلام میں آپ سے آپ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی ایمان کسے کہتے ہیں، حقیقی مومن کی تعریف کیا ہے؟ ــــ چنانچہ اس سوال کا جواب ہے جو اگلی آیت میں دیا گیا۔ یعنی:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

(یعنی) مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول پر، پھر شک میں نہیں پڑے، اور جہاد کیا انہوں نے لئے

نتیجہ نکلتا ہے عمل کی درستی اور انسانی شخصیت کی تزئین و آرائش عادات حسنہ، اور اخلاقِ فاضلہ سے، اور اس کے بعد شروع ہوتا ہے عالمِ خارجی میں جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ کا سلسلہ۔

اس جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین قدم وہ ہے جسے سورۃ العصر میں تعبیر فرمایا گیا "تواصی بالحق" اور "تواصی بالصّبر" سے یا سورۂ بلد میں بیان کیا گیا "تواصی بالصّبر" اور "تواصی بالمرحمۃ" کے الفاظ سے، یا متعدّد مقامات پر بیان کیا گیا "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کی اصطلاحات کے حوالے سے یا کہیں تعبیر فرمایا گیا: "دعوت الی الخیر" یا "دعوت اِلَی اللّٰہ" کے الفاظ سے ۔۔۔ اللہ اور آخرت پر ایمان و یقین کے نور کو جیسے ہی انسانی شخصیت میں تمکّن و قرار حاصل ہو جاتا ہے اس کا ظہور آپ سے آپ خارج میں بھی شروع ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کوئی مادّی چیز جب خود گرم ہو جائے تو اس سے حرارت خود بخود ماحول میں سرایت کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اور پھر جیسے جیسے اس کی حرارت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ماحول میں حرارت کا اثر و نفوذ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ البتہ اس میں ایک اضافی شدّت پیدا ہوتی ہے ایمان بالرّسالت کے حوالے سے۔ یعنی یہ کہ برائی کے خلاف جہاد اور خیر اور بھلائی کی جانب دعوت تو عین انسانی فطرت کا بھی تقاضا ہے اور ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے اس میں مزید نکھار بھی پیدا ہو جاتا ہے لیکن جب کوئی نبی یا رسول مامور من اللہ ہو کر اس فریضے کو سرانجام دیتا ہے تو اس کا ہدف و مقصود یہ بن جاتا ہے کہ خلقِ خدا پر اتمامِ حجّت ہو جائے اور لوگ محاسبۂ اُخروی کے وقت کوئی عذر پیش نہ کر سکیں بفحوائے الفاظِ قرآنی:

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ط (سورۂ نساء آیت ۱۶۵)

(یعنی رسول بشارت دینے والے اور خبردار کر دینے والے بنا کر بھیجے گئے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی دلیل باقی نہ رہ جائے)

اسے اصطلاحِ قرآنی میں "شہادت علی النّاس" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کو اب آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ختمِ نبوّت اور تکمیلِ رسالت کے بعد اُمّتِ مُسلمہ کا مقصدِ وجود قرار دیا گیا ہے ۔۔۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: (البقرۃ: ۱۴۳)

بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ط (النّور ۴۰) اندھیرے ہوں بعض پر بعض، تہ در تہ!

اس پس منظر میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے ہی انسان کے قلب و ذہن میں نورِ ایمان و یقین کی شمع روشن ہوتی ہے۔ شہوات و خواہشات کی ظلمات کے ساتھ اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ جہاد یا مجاہدہ ہے جسے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے افضل الجہاد قرار دیا ہے۔ یعنی جب آپؐ سے سوال کیا گیا کہ: "اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ؟" تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اَنْ تُجَاهِدَ نفسكَ فِی طاعةِ اللّٰہ"

اس جہاد میں جب اللہ انسان کو کامیابی عطا فرما دیتا ہے اور انسان کے نفسِ امّارہ پر قلب و روح کی تجلّیات غالب آجاتی ہیں تو اس کا اوّلین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا اپنا عمل درست ہو جاتا ہے۔ گناہ اور معصیت سے نجات مل جاتی ہے اور انسانی شخصیّت خیرات و حسنات کی آماج گاہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں بھی بے شمار مقامات پر ایمان کے فوراً بعد عملِ صالح کے ذکر کے ذریعے واضح کی گئی ہے اور حدیث شریعت میں بھی مثبت پیرائے میں بھی بیان ہوئی ہے۔ یعنی مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ: "اَیُّ الْاِیْمَانِ اَحْسَن ؟" (یعنی اچھا ایمان کون سا ہے) آپؐ نے فرمایا: "خُلُقٌ" یعنی "وہ جس کے نتیجے میں اخلاقِ حسنہ پیدا ہوں" — اور منفی پیرائے میں بھی بیان ہوئی ہے۔ جیسے وہ مشہور روایت جس کی رُو سے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ کبھی شاذ ہی ایسا ہوا ہوگا کہ حضور صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں کہ:

"لَا ایمان لمن لا امانة لهٗ ولا دین لمن لا عهد لهٗ" — (یعنی جس شخص میں امانتداری نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس میں ایفائے عہد کا مادّہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں!) — یا وہ مشہور اور متفق علیہ حدیث جس کی رُو سے آپ نے فرمایا: "وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ — وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ — وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ !" (خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ خدا کی قسم وہ مومن نہیں!) — پوچھا گیا: "من یا رسول اللّٰہ" (حضور کون؟) تو آپؐ نے فرمایا: "اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ !" (یعنی وہ کہ جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو!)

الغرض — ایمان جب یقینِ قلبی کی صورت اختیار کرتا ہے — تو اس کا پہلا

آخر میں اگر ایک اور اہم حقیقت کی جانب بھی اشارہ ہوجائے تو بات مکمل ہوجائے گی کہ اس ایمان کا منبع اور یقین کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے ۔۔۔ ڈھونڈے سے ہی ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا نظامِ دعوت و تربیت گھومتا ہے قرآن مجید کے گرد اور آپ کی پوری انقلابی جدّوجہد کا مرکز و محور ہے قرآنِ حکیم بمصداق الفاظِ قرآنی:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	(یعنی) تلاوت کرتا ہے وہ ان پر اللہ کی آیات
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	اور تزکیہ کرتا ہے اُن کا اور تعلیم دیتا ہے انھیں کتاب اور حکمت کی!

گویا آپ کا آلۂ انقلاب قرآن مجید ہے! ـــ بقول مولانا حالی مرحوم ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا ~~~~~ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

تو اب مردِ مومن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ چشمِ تصوّر کے سامنے آئے گا اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوگا اور دوسرے میں تلوار ـــ قرآن خود اس کے ذاتی یقین کا منبع و سرچشمہ بھی ہے اور اس کے ذریعے وہ دُنیا سے جہالت کی تاریکیاں فرو کرتا ہے اور تلوار علامت (SYMBOL) ہے اُس کے جذبۂ سعی و عمل اور جوشِ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے ـــ اور اس کا مطلوب و مقصود ہے حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ کی رُو سے:

اِنَّا اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمٰتِ الْجَهَالَةِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ	ہم اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ لوگوں کو نکالیں جہالت کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی جانب اور نجات دلائیں انہیں بادشاہوں کے ظلم وستم اور روشناس کریں اسلام کے نظامِ عدل کے

گویا بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ؎

"مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی ✧ میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی"

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

(یعنی) اسی طرح ہم نے بنایا ہے تمہیں درمیانی اُمّت تاکہ تم بن جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی پر ـــــ اور رسول بن جائیں گواہ تم پر!

اور اسی کے لئے سعی وجُہد اور جہاد و مجاہدہ کے لئے للکارا گیا ہے مسلمانوں کو سورۂ حج کی اس آخری آیت میں جس کے آغاز میں فرمایا:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰكُمْ

اور جہاد کرو اللہ کے لئے جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اُس نے تمہیں (اس مقصد کے لئے) منتخب کر لیا ہے۔

اور آخر میں اس کا ہدف و مقصود معیّن کر دیا گیا ان الفاظ میں کہ: لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ - (تاکہ بن جائیں رسولؐ گواہ تم پر۔ اور بن جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر!)ـــــ اور اس پر بھی اکتفا نہیں۔ اس جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف اور مقصود ہے وہ جسے سورۂ مدثر میں تعبیر فرمایا گیا: وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کے مختصر لیکن نہایت جامعیت اور فصاحت و بلاغت کے حامل الفاظ سے یعنی اللہ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کا بالفعل قیام و نفاذ ـــــ اور جو سورۂ صف، سورۂ فتح اور سورۂ توبہ میں بیان کیا گیا: "اظہارِ دینِ الحق علی الدّین کُلّہٖ!" کی جامع اصطلاح کے حوالے سے بلجوائے الفاظِ قرآنی: "هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ (یعنی وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ یعنی قرآن مجید اور دینِ حق یعنی اسلام کا نظامِ عدلِ اجتماعی دے کر تاکہ غالب و قائم کر دیں اسے پورے کے پورے نظامِ زندگی پر!)

اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک عظیم انقلاب کا متقاضی ہے ـــــ جس کے لئے ایک بھرپور انقلابی جدّوجُہد ناگزیر ہے۔ گویا ایمانِ حقیقی یا یقینِ قلبی کا لازمی نتیجہ ہے ایک عظیم انقلابی جدّوجُہد جس سے مقصود آخرت میں جہنّم سے نجات اور رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اور جس کا ہدف اس دُنیا میں وہ ہو جسے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تعبیر فرمایا: "لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا!"ـــــ کے الفاظ سے، یعنی تاکہ اللہ کا کلمہ ہی سر بلند ہو۔ اور اس کے جھنڈے سے اونچا کوئی جھنڈا نہ رہے۔

درسِ سورۃ العصر

مولانا عبد الغفار حسن مدظلہ

وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝

یہ مختصر سی سورت جو اس وقت تلاوت کی گئی ہے اس کا نام سورۃ العصر ہے اس کے تلاوت کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قرآن مجید سے ہمارا تعلق قائم ہو اور اسے سمجھنے، اور سمجھانے کا شوق پیدا ہو۔ یہ سورت اور اسی طرح کی دوسری چھوٹی چھوٹی سورتیں عام طور پر نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن پڑھنے والوں اور سننے والوں کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا مطلب کیا ہے، ان کا ترجمہ کیا ہے اور ان کے ہم سے تقاضے کیا ہیں؛ حلال کیا ہے؟ حرام کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو کیا کام پسند ہیں، کیا ناپسند ہیں؟ تو خاص سورۃ العصر ہی کیا پورا قرآن مجید ہم پڑھتے رہتے ہیں لیکن اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے قرآن کا پہلا حق یہ ہے کہ اُسے ٹھہر ٹھہر کر اطمینان کے ساتھ پڑھا جائے۔ رمضان میں آپ جب تراویح میں قرآن مجید سُنتے ہیں تو بہت سے حافظ اُسے اِس طرح پڑھتے ہیں کہ صرف 'یَعْلَمُوْنَ'۔ 'تَعْلَمُوْنَ' ہی سننے میں آتا ہے اور کچھ خبر نہیں ہوتی کہ کیا پڑھا گیا حالانکہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا کہ آپ پڑھیے قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر، اطمینان کے ساتھ —— ایک دوسری آیت میں فرمایا: وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ۝ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۶)
کہ ہم نے اس قرآن مجید کو اُتارا تاکہ آپ اُسے ٹھہر ٹھہر کر اطمینان سے پڑھیں۔ یہ قرآن مجید کا پہلا حق ہے۔ اس کے ادب اور احترام کا تقاضا ہے کہ اُسے انتہائی عاجزی کے ساتھ انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ یہ سمجھ کر پڑھا جائے کہ یہ رب العالمین کا کلام ہے، احکم الحاکمین کا کلام ہے، اس ہستی کا کلام ہے جس کے قبضہ میں آسمان و زمین ہیں، جو سا

بقیہ سلسلۂ نوربخشیہ از صہ ۸

فقہی مسائل پر مشتمل کتاب ہے اور اس میں فقہی مسائل مندرج ہیں نہ کہ عقائد ی — عقائد کے سلسلے میں "اصولِ عقائد" نامی کتاب ہے، وہ بھی خود حضرت سید محمد نوربخش کی اپنی تصنیف ہے اور فیروز سنز لاہور سے چھپ چکی ہے — اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات غلط ہے کہ نوربخشی عقائد 'احوط' نامی کتاب میں ہیں بلکہ اس کتاب کا نام ہی "فقہ احوط" ہے اور فقہی مسائل پر بحث کی ہے۔ عقائد کی کتاب جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں "اصولِ عقائد" نامی کتاب ہے — اس کے ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ نوربخشی سلسلے کا قرامطہ، اسماعیلیہ، باطنیہ نزاریہ اور شیعہ وغیرہ سے کوئی تعلق ہے، اور یہ کہ نوربخشی لوگ عقیدۂ بداء، رجعت، تناسخ حلول، تجسم، تاویل اور اوتار وغیرہ، اس قسم کا کوئی عقیدہ نہیں رکھتے ہیں۔ بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسا ہمارے اہلِ سُنّت میں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ ہیں اور یہ کہ نوربخشی اپنے سلسلے کو ان سلسلوں سے الگ نہیں سمجھتے بلکہ ایک سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت سید محمد نوربخش کے سلسلہ سے آپ کو معلوم ہوگا، حضرت سید محمد نوربخش رح کا سلسلہ اس طرح ہے "سید محمد نوربخش رح، خواجہ اسحاق ختلانی، سید علی ہمدانی رح، شیخ محمود مزدقانی، علاؤ الدولہ سمنانی عبدالرحمن اسفرائنی، احمد ذاکر جورجانی، شیخ علی ابن لالا، شیخ نجم الدین کبرائی، شیخ عماد یدلیسی، ابونجم سہروردی، شیخ ابوذر رودباری، شیخ سری سقطی، شیخ معروف کرخی، حضرت علی رضا تا حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!" —

(بحوالہ دعوت الصوفیہ ص۲ و فلاح المؤمنین ص۳۲)

نوربخشی شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے حامل اور اتباعِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قائل ہیں اور اسی پر ان کا ایمان ہے۔ چنانچہ حضرت سید محمد نوربخش فرماتے ہیں :

هرچه ضدِ شرع باشد باطل است ❊ حرفِ بے مغز آں همه لاطائل است
پس شما ایں راه را تابع شوید ❊ سوئے مسلک ہائے دیگر کم گروید
ایں شرف را داشت موقوف اے ذکی ❊ حق تعالیٰ بر تبعیّتِ راهِ نبیؐ

ماننا یہ قرآن مجید کا ہم پر دوسرا حق ہے۔

جب قرآن مجید کو سمجھ لیا تو اس کا تیسرا حق ہم پر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ہمارے فیصلے قرآن مجید کے مطابق ہوں۔ قرآن مجید کی تفسیر کی روشنی میں ہوں جو رسول اکرمؐ نے کی ہے۔ اس لئے کہ حدیث اور سنت قرآن مجید کی تفسیر ہے۔ رسولِ اکرمؐ پر قرآن مجید نازل ہوا تو جس طرح آپؐ نے اس کا مطلب بیان فرمایا ہے۔ آپؐ نے جو اس کی تفسیر بیان فرمائی ہے یا آپؐ کے صحابہؓ نے آپ سے سُن کر آگے بیان کیا ہے وہ تفسیر قابل عمل ہے درحقیقت اس کا اہتمام ہونا چاہیئے، اسی کو جاننے کے لئے اور اسی کے حصول کے لئے بڑی کوششیں وقف ہونی چاہئیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (آیت ۱۰۵)؛ کہ بے شک ہم نے اتاری ہے کتاب حق کے ساتھ تیری طرف (اس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں ہے۔ ساری کتاب حق ہی حق ہے) تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں ان احکام کی روشنی میں جو اللہ تعالےٰ نے آپ کو بتلائے ہیں!"

سورۂ حٰم سجدہ میں فرمایا: لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ○ (آیت ۴۲)۔ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس کے نہ آگے سے باطل آسکتا ہے نہ پیچھے سے، اس لئے کہ یہ اُس ہستی کی طرف سے نازل کی گئی ہے جو حکمت والی ہے اور حمد والی ہے یعنی تعریف والی ہے۔ لہٰذا یہ کتاب حق کے ساتھ اُتاری گئی ہے، اس میں حق ہی حق ہے، سچ ہے، صداقت ہے۔ ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ اس کتاب کو پڑھے لیکن اس پر عمل نہ کرے۔ قرآن مجید جس چیز کو حلال ٹھیرائے اُسے حرام سمجھے اور جسے حرام قرار دے اُسے حلال ٹھیرائے۔ اس لئے قرآن مجید کا تیسرا حق ہم پر یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ پہلا حق تو یہ ہوا کہ انسان ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے اُسے پڑھے۔ بلکہ اس سے بھی پہلے ہے ایمان بالقرآن یعنی یہ کہ قرآن مجید پر ایمان لایا جائے۔ ایمان لایا جائے اس بات پر کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور بڑی عظمت والی ہے۔ زبان سے تو ایمان سب ہی لاتے ہیں۔ لیکن مطلوب ہے دل سے ایمان لانا تو قرآن کا ہم پر پہلا حق ہوا اُس پر دل سے ایمان لانا، دوسرا تلاوتِ قرآن، تیسرا حق ہے اس کو سمجھنا اُس پر تدبر کرنا اور چوتھا حق اس پر عمل کرنا اور اپنے تمام جھگڑوں اور نزاعات میں اس کو حَکَم

کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اُس کے کلام کو پڑھتے ہوئے آدمی کے جسم پر لرزہ طاری ہونا چاہئے کپکپی طاری ہونی چاہیئے۔ نہ کہ یہ کیفیت کہ قرآن مجید پڑھے اور اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ کیا پڑھا۔ پھر آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ قاری حضرات خصوصاً مصری قاری جب قرآن مجید پڑھتے ہیں تو لوگ اس طرح داد دیتے ہیں اور بعض اوقات تالیاں بجاتے ہیں جیسے مشاعرہ ہو رہا ہو۔ حالانکہ قرآن مجید سننے کے بعد دل کانپ اٹھنے چاہئیں، ڈر جانے چاہئیں۔ جیسا کہ فرمایا: " وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ " اور سورۃ انفال میں فرمایا: " وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ (آیت ۲) اور جب اللہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، ایمان بڑھ جاتا ہے، لیکن جب آپ اسے سن کر داد دیں گے، تالیاں بجائیں گے، جس طرح شعراء کو داد دی جاتی ہے جب آپ اسے مشاعرہ بنا دیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ ایمان بڑھے گا کہاں، گھٹ جائے گا۔ تو قرآن مجید کا پہلا حق یہ ہوا کہ اسے اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے۔ چاہے آپ اسے تراویح میں پڑھیں یا ویسے ہی تلاوت کریں، بہر حال جلد بازی سے پرہیز کیا جائے۔

قرآن مجید کا صرف پڑھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ ہم پر اور تمام مسلمانوں پر اس کا دوسرا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے کہ قرآن مجید کے ہم سے تقاضے کیا ہیں؟ وہ ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے، جیسا کہ فرمایا: كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (سورۃ ص۔ آیت ۲۹): کہ ہم نے برکت والی کتاب اس لئے اُتاری ہے تاکہ اس سے لوگ نصیحت حاصل کریں اور اس کی آیات میں تدبّر کریں، غور و فکر کریں۔ انہیں معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا کام پسندیدہ ہے اور کون سا ناپسندیدہ ہے، کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام ہے؟ یہ ساری باتیں قرآن مجید سے معلوم ہوتی ہیں۔ انہیں معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے، اسی لئے ایک اور آیت میں فرمایا: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ۝ (سورۃ محمد آیت ۲۴) کیا وہ قرآن مجید میں غور نہیں کرتے؟ کیا اُن کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں"۔ قرآن مجید بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ اُسے سمجھا جائے۔ قرآن بار بار اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسے سمجھا جائے۔ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے عربی زبان کو سیکھا جائے ورنہ ترجمہ سے اس کو سمجھا جائے، بہرحال اس کا علم حاصل کرنا، اُس کو سمجھنا اور

غلط خواہشات ہیں، غلط عقیدے ہیں، ان کو مٹانے اور ان کی اصلاح کے لئے قرآن مجید کو نازل کیا ہے۔ سینوں اور دلوں میں جو بیماریاں ہیں ان کے لئے قرآن شفاء ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ قرآن کریم پڑھنے سے نزلہ نہیں جائے گا، سر کا درد نہیں جائے گا۔ جائے گا سر کا درد بھی اور نزلہ بھی لیکن کہنے کا مقصود یہ ہے کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد یہ نہیں ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ یہ ٹوپی ہے جو سر پر رکھی جاتی ہے، لیکن اگر آپ بازار گئے، آپ نے دیکھا کہ لیموں بک رہے ہیں وہ آپ نے خریدے۔ آپ کے پاس کوئی تھیلا ہے نہیں، آپ نے وہ لیموں ٹوپی میں ڈال لئے تو اس سے آپ کا کام تو چل گیا لیکن ظاہر ہے کہ ٹوپی سر پر رکھنے کے لئے بنائی گئی ہے لیموں رکھنے کے لئے تو نہیں بنائی گئی۔ یا توپ کی مثال لیجئے اس کے بنانے کا مقصد تو یہ ہے کہ اس کے استعمال سے دشمن کو ختم کیا جائے۔ آپ اگر اس سے مچھر اور مکھی مارنا چاہیں گے تو وہ مر تو جائیں گے، لیکن ظاہر ہے کہ توپ مچھر اور مکھی مارنے کیلئے تو نہیں بنائی گئی۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان مجاہد کے پاس ہو تو وہ اس سے اسلام کے دشمنوں اور دین کے باغیوں کو ختم کرے۔ قرآن حکیم تعویذ گنڈوں کے لئے نازل نہیں کیا گیا۔ جاہلوں میں یہ چیز عام ہے۔ جہاں تعویذ گنڈے ہوتے ہیں وہاں عورتوں کا زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔ کسی کو بچے کی طلب ہے، کسی کا کوئی اور مقصد ہے۔ ایک عورت جاتی ہے اور پیر صاحب سے کہتی ہے کہ مجھے ایسا تعویذ دو کہ میری بہو ٹھیک ہو جائے، اور میری تابع ہو جائے۔ دوسری جاتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کو ایسا تعویذ بنا دیا جائے کہ اُس کا شوہر اپنی ماں سے فرنٹ ہو جائے اور اُس کا غلام بن جائے۔ ایسے الٹے سیدھے تعویذ قرآنِ حکیم سے بنائے جاتے ہیں۔

بعض پیر نقوش بنا کر دیتے ہیں جیسے نقشِ سلیمانی۔ اس طرح قرآن مجید کی آیات ایک کھیل بنا لیا گیا ہے۔ کوئی بیمار ہو، سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر دو، اللہ شفاء دینے والا ہے اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس کو سمجھو تو سہی۔ اس کے علاوہ قرآن مجید ایصالِ ثواب کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس کا عام رواج ہے، مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے پڑھا جاتا، خواہ اُس نے پوری عمر قرآن نہ پڑھا ہو، کھول کر بھی دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی ہو۔ مگر مرنے کے بعد اُس کے لئے قرآن خوانی ہوگی۔ میں کہتا ہوں قرآن خوانی کے ساتھ قرآن دانی بھی ضرور

اور سچ ماننا ہے۔ قرآن حکیم کے ادب اور اس کے احترام کا یہ تقاضا ہے کہ جب اُسے سنے اس کو سمجھ لیا، اس پر عمل کر لیا۔ قرآن حکیم بہت بڑی نعمت ہے تو پھر اس نعمت کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ٥ (سورۃ نحل آیت ۴۴) کہ ہم نے آپ کی طرف ذکر کو نازل کیا (قرآن مجید کا ایک نام ذکر بھی ہے) تاکہ آپ اسے دوسروں تک پہنچائیں، دوسروں کے سامنے بیان کریں کھول کھول کر بیان کریں۔ لیکن افسوس کہ قرآن مجید سے روز بروز ہمارا تعلق کٹتا جا رہا ہے۔ ہم قرآن مجید کے حقوق کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اب تو قرآن مجید کے ساتھ ہمارا تعلق یہ رہ گیا ہے کہ اسے عدالتوں میں حلف اٹھانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے حلف چاہے سچا ہو یا جھوٹا۔ یا پھر چور پکڑنے کے لئے قرآن مجید کی آیات کو دیکھا جاتا ہے کہیں سفر کو جا رہے ہوں تو جانے یا نہ جانے کے لئے اس سے فال نکالی جاتی ہے یا پھر اس سے تعویذ گنڈے کئے جاتے ہیں۔ نزلہ زکام، کھانسی، بخار اور دوسرے ظاہری و باطنی امراض کے لئے تعویذ گنڈے دیئے جاتے ہیں جن کی باقاعدہ فیس مقرر ہے۔ اس کا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ کوئی تعویذ پانچ روپے کا ہے، کوئی دس کا، کوئی بیس کا۔ اب ہر چیز کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ چنانچہ تعویذوں کی قیمتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ قرآن مجید پر لوگوں نے اس قسم کی کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں کہ اس کی فلاں آیت کی فلاں خاصیت ہے اور فلاں کی فلاں —!!

اس سے انکار نہیں کہ قرآن مجید سے ظاہری امراض کو بھی شفا نصیب ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا: وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸۲) ہم قرآن میں سے ایسی آیتیں اُتارتے ہیں کہ جن میں شفا ہے لیکن شفاء کس چیز کی؟ اصل شفاء اس بات کی ہے کہ ہمارے دلوں کی جو بیماریاں اور اُن کے روگ ہیں وہ دُور ہوں۔ اس لئے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ٥ (سورۃ یونس آیت ۵۷): اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی اور اس میں شفا ہے، دوا ہے، علاج ہے سینوں کی بیماریوں کا۔ سینے میں دل ہوتا ہے۔ اس لئے دل میں جو کھوٹ ہے، غلط میلانات ہیں، غلط خیالات ہیں، غلط محبتیں ہیں، غلط نفرتیں ہیں

گئی ہے کہ لوگ بچوں کو ناظرہ قرآن بھی نہیں پڑھاتے، حفظ کرانا تو بڑی بات ہے۔ لوگ سوچتے ہیں کون حفظ کرائے، حفظ کرانے میں چار سال لگیں گے۔ چار سال میں تو بچہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا۔ میٹرک کرنے میں سولہ سال لگتے ہیں (یعنی سولہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کر لیتا ہے) حفظ کرا[illegible]ئے تو بچہ میٹرک بیس سال میں جا کر کرے گا۔ ایک صاحب نے اخبار میں ایک مضمون لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان میں جسے اب بنگلہ دیش کہا جاتا ہے، کچھ لوگوں نے تحقیق کی کہ کالجوں میں اخلاق و کردار کے لحاظ سے کون سے لڑکے اچھے ہوتے ہیں تو [illegible]روے کے بعد معلوم ہوا کہ جن لڑکوں نے بچپن میں قرآن مجید ناظرہ پڑھا تھا، کالج میں جانے کے بعد وہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ یہ قرآن مجید کی بڑی برکت ہے۔ اگر سمجھ کر پڑھا جائے تو یہ تو بڑی بات ہے۔ لیکن اگر ناظرہ ہی پڑھ لیا جائے تو اس میں بھی برکت ہوتی ہے، اور انسان کا اپنے رب کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ہو جاتا ہے۔ یہ معاملہ اب گھٹتا جاتا ہے۔

پہلے بچے نہ صرف ناظرہ پڑھتے تھے، بلکہ حفظ کرتے تھے، انہیں اس کا شوق ہوتا تھا۔ اب وہ زمانہ لد گیا۔ اب نہ حفظ کا وہ چرچا ہے نہ پہلے جیسے قرآن مجید پڑھنے والے ہیں پہلے عورتیں تک قرآن مجید حفظ کرتی تھیں، وہ حافظہ ہوتی تھیں، ان میں باہم ایک دوسرے سے مقابلہ ہوتا تھا۔ اب مقابلہ اس کا نہیں ہوتا کہ اللہ کے دین کا کتنا علم حاصل کیا، قرآن کتنا پڑھا۔ اب مقابلہ کھیلوں کا ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ ہمارا یہ سلوک نہایت افسوسناک ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ ہمارا تعلق کیسے قائم ہو اور اس کو کس طرح ہم سمجھیں؟ اس سلسلہ میں، میں نے ابتداء میں سورۃ العصر پڑھی تھی جو نمازوں میں اکثر پڑھی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ دو سطروں میں لکھی جاتی ہے، لیکن اتنی جامع سورت ہے کہ گویا سمندر ہے، جسے کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ الفاظ تھوڑے ہیں لیکن معانی و مطالب بہت وسیع ہیں فرمایا: وَالْعَصْرِ ۝ قسم ہے زمانہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے زمانہ کو بطور گواہ کے پیش کیا ہے اللہ تعالیٰ جب کوئی قسم بیان فرماتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے گواہ بناتے ہیں۔ یعنی بعد میں جس بات کو بیان کرنا ہوتا ہے اس کے لئے پہلے اپنی مخلوق میں سے کسی کو گواہ بنا لیتے ہیں۔ یعنی جو بات آگے بیان کی جا رہی ہے، جو دعویٰ پیش کیا جا رہا ہے

اب قرآن خوانی تو ہوتی ہے، قرآن دانی نہیں ہوتی۔ ابھی ہمارے ایک عزیز کا انتقال ہوا، وہاں پر ہم گئے۔ ایک صاحب نے کہا کہ مرحوم کے لئے گیارہ قرآن ختم کئے گئے۔ میں نے کہا کہ گیارہ قرآن تو ختم کرلئے مگر قرآن میں آتا ہے: "اقیموا الصلوٰۃ" تو اس پر بھی عمل ہوا کہ نہیں؟ تو معلوم ہوا کہ قرآن مجید ختم کرنے والے سو میں سے بمشکل گیارہ آدمی نماز پڑھنے والے ہوں گے۔ تو یہ قرآن مجید بس مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے رہ گیا ہے، زندوں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ موت والے دن، سوئم میں، دسویں اور چالیسویں میں اُسے پڑھ دو، برسی کے موقع پر اسے پڑھ دو اور بس معاملہ ختم۔ حالانکہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد تو یہ تھا کہ اس کو سمجھ کر پڑھا جائے، اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے، زندہ چلتے پھرتے انسانوں کے مردہ دلوں کو زندہ کیا جائے۔ اُن کے اخلاق، اُن کے عقیدے اور اُن کے عمل کی اصلاح کی جائے، اس مقصد کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ نیا گھر بنایا جائے یا نئی دکان کھول لی جائے تو اُس میں برکت کے لئے قرآن خوانی ہوتی ہے۔ لیکن دکان میں کاروبار کس طرح کا ہوگا اس سے کوئی غرض نہیں۔ بعض لوگ تو غضب کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے شراب خانہ کھولا تو اُس کے افتتاح کے موقع پر قرآن مجید کی تلاوت کرادی حالانکہ وہاں تو یہ آیت صادق آتی ہے:

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ (سورۃ المائدہ آیت عـــ۹۰)

لوگوں نے قرآن مجید کا مذاق بنا رکھا ہے۔ یہاں پر اگر قوالی ہوتی، مشاعرہ ہوتا یا کوئی فلم ہوتی تو آپ دیکھتے کہ لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے، لیکن قرآن مجید کا بیان ہو، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت، آپؐ کی حدیث یا آپؐ کی سیرت کا بیان ہو تو بس چند اللہ کے بندے آجاتے ہیں۔ یہ ہمارا حال ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں آتا ہے کہ قیامت کے دن حضورِ اکرمؐ اپنی اُمت سے شکوہ کریں گے، وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ٥ (سورۃ فرقان، آیت عـــ۳۰) "رسول کہے گا اے میرے پروردگار! میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا، اس پر عمل کرنا ترک کر دیا تھا۔ اب تو حالت یہاں تک پہنچ

سے معنی یہاں پہ ہیں " تمام "۔ عربی میں ایک " ال " ایسے ہے جیساکہ انگریزی میں لفظ THE ہے جو خاص کے معنی میں آتا ہے اور ایک " ال " انگریزی کے ALL کے معنی میں آتا ہے یعنی 'تمام'۔ تو یہاں یہ دوسرا 'ال' مراد ہے۔

زمانہ گواہ ہے بیشک تمام انسان گھاٹے میں ہیں، خسارے میں ہیں : اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔ مگر جو ایمان لے آئے ۔ ایمان کے معنی یقین کے ہیں ۔یعنی اللہ تعالیٰ پہ ایمان اُس کے رسولوں پہ ایمان ، خاص کر رسولِ اکرمؐ پہ ایمان ، آپؐ کی رسالت پہ ایمان آپؐ کی نبوت پہ ایمان ، آپؐ کے خاتم النبیین ہونے پہ ایمان ، جو کچھ بھی آپؐ لائے ہیں اور جو کچھ بھی آپؐ نے فرمایا ہے اُس پہ ایمان ، آپؐ کے سچے ہونے پہ ایمان ، آپؐ کے امانتدار ہونے پہ ایمان ، آپؐ کے حیادار ہونے پہ ایمان ۔غرضیکہ جتنے بھی اچھے اخلاق ہو سکتے ہیں اُن سب سے آپؐ موصوف تھے ، اس بات پہ ایمان ۔ ایمان تین ہیں ۔ اوّل اللہ تعالیٰ پہ ایمان ، دُوُم رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی جو صفات قرآنِ حکیم میں بیان ہوئی ہیں اور جو حدیث میں بیان ہوئی ہیں اُن پہ ایمان اور سوُم آخرت پہ ایمان ۔ یہ تینوں ایمانیات بنیادی ہیں ۔ اسی لئے آپؐ مکّی سورتوں میں دیکھیں گے کہ ایمان عقیدہ توحید اور آخرت کا بہت بیان کیا گیا ہے ۔ اس لئے کہ جب تک یہ پختہ نہ ہو ، اس کے مطابق دل و دماغ کی اصلاح نہ ہو ، اس وقت تک صحیح معنوں میں اچھا عمل ہو نہیں سکتا ۔ عمل کی بنیاد ایمان ہے ۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ ایک انگارہ سامنے رکھا ہوا ہے ۔ آپ کو یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے ۔ انگارے کو ہاتھ لگائیں گے تو ہاتھ جل جائے گا جھلس جائے گا ۔ اس لئے آپ اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے ، لیکن ایک چھوٹا سا معصوم بچہ ہے ، اُسے پتہ نہیں یہ انگارہ کیا چیز ہے ۔ اُس کے لئے تو وہ ایک چمکدار چیز کھلونے کی مانند ہے ۔ وہ اسے اٹھانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھائے گا ۔ اگر آپ نہ روکیں گے تو وہ ہاتھ جلا بیٹھے گا ۔ بس اس یقین کا نام ایمان ہے کہ آگ جلا دیتی ہے ۔ اسی طرح جن کا ایمان دوزخ پہ ہے وہ ایسے کام کیوں کریں گے جو دوزخ کی آگ میں لے جانے والے ہیں ۔ جن کا ایمان نہیں ہے ' وہ یہ کام کر لیتے ہیں ، اُنہیں جنت و دوزخ کی پرواہ نہیں ہوتی ، تو جزا و سزا پہ ایمان ہونے یا نہ ہونے کا فرق یہ ہے ۔ اُن کا انجام وہی ہے جو کافروں اور منکرین کا انجام ہوتا ہے اور جو اُس بچہ کا انجام ہوتا ہے جو انگارہ پہ ہاتھ رکھ دیتا ہے اور اپنا ہاتھ جلا لیتا ہے ۔ اس لئے

اُس دعویٰ کی سچائی اور صداقت پر زمانہ گواہ ہے۔ شروع سے لے کر اب تک کی تاریخ گواہ ہے، قوموں کی تاریخ پڑھ جائیے تو معلوم ہوگا کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں مگر جنھوں نے چار اصول اپنائے، جنھوں نے چار باتوں پر عمل کیا وہ گھاٹے سے پاک گئے۔ یہ گویا قرآن مجید کا دعویٰ ہے۔ عصر کے معنی عربی زبان میں نچوڑنے کے آتے ہیں۔ جیسے سورۂ یوسف میں فرمایا: اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ (آیت ۳۶) "میں دیکھ رہا ہوا کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں"۔ ع۔ ص۔ ر: عصر۔ اس کا معنیٰ نچوڑنا ہوا۔ اور جو عرق آپ نے نچوڑ لیا وہ واپس نہیں جا سکتا۔ اگر آپ لیموں کا عرق نچوڑ کر جا ہیں کہ عرق پھر واپس لیموں میں چلا جائے تو یہ ناممکن ہے۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے لیکن اب تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو گنے سے نکلے ہوئے رس کو واپس گنے میں ڈال دے اور گنا پھر تازہ ہو جائے۔ گنے کا رس گنے میں واپس نہیں جا سکتا، لیموں کا عرق دوبارہ لیموں میں واپس نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح زمانہ ہے کہ جو گذر گیا واپس نہیں آسکتا۔

زمانہ کو عصر اسی لئے کہتے ہیں کہ زمانہ گویا نچوڑا ہوا رس ہے جو واپس نہیں آسکتا۔ اسی طرح بوڑھے آدمی کی جوانی واپس نہیں آسکتی۔ جو جوان ہیں اُن کا بچپن واپس نہیں آسکتا۔ جو گزر گیا، سو گزر گیا۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

لَیْتَ الشَّبَابَ یَعُوْدُ یَوْمًا ——— فَاُخْبِرَہٗ بِمَا فَعَلَ الْمَشِیْبُ

کاش! کہ جوانی لوٹ آتی تو میں اُسے بتاتا کہ بڑھاپے نے مجھ پر کیا ستم ڈھائے ہیں، جھریاں پڑ گئی ہیں، دانت ٹوٹ گئے ہیں، معدہ خراب ہو گیا ہے، کھانا ہضم نہیں ہوتا، بُری حالت ہو گئی ہے۔ مگر جوانی تو واپس نہیں آسکتی، وہ کیسے واپس آئے گی۔ تو معلوم ہوا کہ بچپن گیا واپس نہیں آسکتا، جوانی گئی واپس نہیں آسکتی، اُدھیڑ پن کی عمر گئی واپس نہیں آسکتی۔ ہاں بڑھاپا آگیا تو واپس نہیں جاتا۔

بڑھاپے کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک بڑھاپا تو وہ ہے جب انسان چل پھر سکتا ہے اور دوسرا بڑھاپا وہ ہے جب وہ صاحبِ فراش ہو جاتا ہے کہ بس پلنگ پر پڑا ہوا ہے۔ خدا اس سے بچائے، تو یہ بڑھاپا بھی حقیقت میں خدا کی طرف سے آزمائش ہے۔ تو فرمایا وَالْعَصْرِ "قسم ہے زمانہ کی"۔ اِنَّ کا معنیٰ ہے بیشک۔ یہ تحقیق کے معنی میں آتا ہے۔ اَلْاِنْسَانَ۔ الْ

کی شان سب سے اونچی ہے۔ آپؐ سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ ہیں۔ کوئی کتنا ہی متقی ہو، نیک ہو، زاہد ہو، عابد ہو، صوم و صلوٰۃ کا پابند ہو۔ پھر کوئی کتنی ہی عبادت کرے، ریاضت کرے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ رسولِ اکرمؐ میں، کسی نبی میں، کسی ولی میں نہیں پائی جا سکتیں۔ اسی طرح پر ایک صفت اللہ تعالیٰ کی یہ ہے کہ وہ بخشنے والا ہے، وہ معاف کرنے والا ہے، وہ رحمٰن ہے، وہ رحیم ہے، اُس کی رحمت بے پایاں ہے۔ رحیم کا لفظ رسولِ اکرمؐ کے لئے بھی آیا ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت لامحدود ہے، رسولِ اکرمؐ کی رحمت محدود ہے اس لئے اصل رحمت کی صفت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ توحید کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو بندوں کی صفات ہیں، جو ان کی کمزوریاں ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت نہ کی جائیں۔ اگر آپ نے یہ ثابت کر دیا تو یہی شرک ہوگا۔ مثلاً باپ ہونا، بیٹا ہونا، شوہر ہونا، بیوی ہونا — یہ انسانوں میں ہوتا ہے، مخلوق میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے: لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۝ نہ وہ کسی کا بیٹا ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ وہ سب سے بالاتر ہے (نہ اُس کی بیوی ہے، نہ اُس کے بچے ہیں!) معلوم ہوا کہ جو بندوں کی صفات ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرنا اصل توحید کے خلاف ہے۔ اسی طرح جو صفات خاص اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں وہ بندوں کے لئے ماننا، خواہ وہ کتنے ہی اونچے درجہ کے ہوں، یہ بھی توحید کے خلاف ہے۔ تو پہلا ایمان، ایمان باللہ ہے یعنی اُس کی ذات پر ایمان، اُس کی صفات پر ایمان، اُس کے اختیارات پر ایمان، اُس کے حقوق پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ کامل ہے، وہ رحیم ہے، خالق ہے، قادرِ مطلق ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن لوگ پریشان ہوں گے، اُمتیں پریشان ہوں گی، اُمتِ محمدیہ بھی پریشان ہوگی۔ اس پریشانی کے عالم میں لوگ مختلف انبیائے کرام کے پاس جائیں گے۔ حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، سب کے پاس جائیں گے سب یہی کہیں گے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ تو سب کے سب رسولِ اکرمؐ کے پاس آئیں گے، اور کہیں گے کہ آپ ہماری شفاعت کیجئے تو آپؐ فرمائیں گے۔ اُمتی، اُمتی۔ ہاں میں سفارش کروں گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ فرماتے ہیں کہ میں اپنے ربّ کے سامنے سجدہ میں

فرمایا گیا ہے : اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا - مگر وہ جو ایمان لے آئے - بنیادی معاملہ عقیدۂ ایمان کا ہے - سب سے پہلے ایمان باللہ ہے - اللہ تعالیٰ پر ایمان ، یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر ایمان ، اُس کی ذات پر ایمان ، اُس کے اختیارات پر ایمان ، اُس کے جو حقوق ہیں اُن پر ایمان - یہی دراصل توحید ہے اور یہی معنی ہیں ایمان باللہ کے - اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے - اِلٰہٌ وَّاحِدٌ : اللہ ایک ہی ہے اُس کے ساتھ کسی اور کو اِلٰہ ماننا شرک ہوگا - اللہ تعالیٰ کی صفات پر ایمان جو توحید کی صفات کہلاتی ہیں - معنی اس کے یہ ہیں کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں وہ بندوں میں نہیں مانی جا سکتیں - حتیٰ کہ انبیائے کرام اور اولیائے کرام میں نہیں مانی جا سکتیں - جو اللہ کی صفات ہیں وہ اُسی کے لئے خاص ہیں - مثلاً وہ حیّ و قیّوم ہے ، وہ زندہ رہنے والا ہے ، ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا - یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس میں کوئی شریک نہیں - سب کے لئے فنا ہے اُس کے لئے فنا نہیں ہے - لم یزل ، لا یزال - اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت قرآن مجید میں عالم الغیب والشّہادہ بیان ہوئی ہے - وہ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے - یہ صفت کسی انسان ، کسی نبی ، کسی ولی کی نہیں ہو سکتی - کسی کو کچھ خبر نہیں کہ کل کیا ہونے والا ہے ؟

وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌ مَّاذَا تَکۡسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدۡرِیۡ نَفۡسٌۢ بِاَیِّ اَرۡضٍ تَمُوۡتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ ۝ (سورۃ لقمان آیت ۳۴)

کسی جان کو نہیں معلوم کہ کل اُس کے ساتھ کیا ہوگا اور اُسے نہیں معلوم کہ کل اُس کی موت کہاں آئے گی - بے شک اللہ تعالیٰ خبر رکھنے والا ، جاننے والا ہے ! --- حدیث میں آتا ہے کہ ایک شادی میں ایک لڑکی شعر پڑھ رہی تھی (چھوٹی بچیاں گیت گا رہی ہوں گی) رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی وہیں تشریف فرما تھے - بچی نے یہ مصرعہ پڑھا : فینا نبیٌّ یعلم ما فی غدٍ : "کہ ہمارے درمیان ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا !" رسول اکرم نے فرمایا کہ : "خبردار ! ایسا نہ کہو - یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے !" - اِنَّمَا الۡغَیۡبُ لِلّٰہِ ؕ (سورۃ یونس آیت ۲۰) "غیب کا علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے !" --- وہی کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے ، وہی قادرِ مطلق ہے - رحمٰن ، رحیم ، مالک ، یہ اور اس طرح کی صفات اللہ تعالیٰ کی خاص صفات ہیں اور یہ صرف اُسی کے لئے خاص ہیں - اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں میں محمد رسول اللہ

جرأت آگئی کہ وہ اللہ پر جھوٹ باندھتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے، یہ کیسے ممکن ہے؟ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے دلیل میں اپنی زندگی پیش کی کہ میں نے تم میں ایک لمبی مدّت گذاری ہے۔ پھر تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا تم میں عقل نہیں ہے؟ رسولِ اکرمؐ پر ایمان لانا اور آپؐ کی وہ صفات جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور صحیح احادیث میں بیان ہوئی ہیں کہ آپؐ مبشّر ہیں، آپؐ منذر ہیں۔ آپؐ نذیر ہیں، آپؐ سراجِ مُنیر ہیں، آپؐ روشن چراغ ہیں، آپؐ روشن آفتاب ہیں۔ اِن تمام صفات پر ایمان لانا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے، ایمان کا ایک حصّہ ہے۔ آپؐ کی ایک صفت خاتم النّبیین بھی ہے کہ رسولِ اکرمؐ آخری نبی ہیں۔ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا، خواہ وہ بروزی ہو، خواہ مستقل ہو، خواہ غیر مستقل۔ حضورؐ کی صفت خاتم النّبیین قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ۝ (سورۃ الاحزاب آیت ۴۰) "محمدؐ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیین ہیں"۔ یعنی تمام نبیوں کو ختم کرنے والے ہیں، تمام نبیوں کی آمد پر مہر لگادی۔ اب آپ کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا، قیامت تک اب آپؐ کی نبوّت چلے گی۔ اب کوئی نبی نہیں آسکتا جو آپؐ کی نبوّت کو ختم کردے یا اپنی طرف سے کچھ اور لگائے یا آپ کا ظلّ اور بروز بن کر اپنا کاروبار چمکائے!

ایمان باللہ اور ایمان بالرّسالت کے بعد تیسرا ایمان بالآخرت ہے۔ آخرت پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پر اگر ہم اچھے کام کریں گے تو اُس کا بدلہ آخرت میں اچھا ملے گا، اور اگر یہاں بُرے کام کریں گے تو آخرت میں بُرے بدلے سے ہمکنار ہوں گے۔ ایمان بالآخرت کے بغیر ہماری دُنیا نہیں سنور سکتی۔ ایمان لانے سے جنّت تو ملے گی، لیکن اگر لوگ آخرت پر صحیح معنوں میں ایمان لے آئیں تو دُنیا بھی ملے گی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضؓ رات کو گھوم رہے تھے۔ یہ آپؓ کی عادت تھی۔ خلافت کی ذمّہ داریوں کی وجہ سے بے چین رہتے تھے۔ راتوں کو گھوم کر دیکھتے تھے کہ کوئی بھوکا تو نہیں سو رہا، کوئی یتیم تو نہیں رو رہا، کوئی بیوہ تو بے چین و بے قرار نہیں ہے۔ اپنا خادم ساتھ لیتے اور رات کو شہر کا گشت لگاتے تھے۔ چنانچہ اُس رات گھومتے گھومتے ایک گھر کے پاس سے گذرے۔ صبح کا وقت قریب تھا، اذان ہونے والی تھی، ایک بڑھیا اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھی

گر جاؤں گا اور طویل سجدہ کروں گا۔ اپنی اُمّت کو بخشوانے کے لئے اپنے ربّ سے التجائیں کروں گا، گنہگاروں کو بخشوانے کے لئے ان کی شفاعت کی دعائیں کروں گا، تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔ "یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَكَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ۔ یا محمدؐ اپنا سر اُٹھائیے، اور مانگئے، آپ کو دیا جائے گا، اور شفاعت کیجئے آپؐ کی شفاعت قبول کی جائے گی، اے نبیؐ! آپ شفاعت کیجئے، آپؐ کی شفاعت قبول ہوگی۔ یہ ہے توحید۔ یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کچھ فرما رہے ہیں، اور رسول اللہ کچھ کہہ رہے ہیں، اور رسول اللہ کا ارشاد اللہ تعالیٰ کے حکم پر غالب آجائے۔ یہ نہیں ہوسکتا بلکہ اللہ کا حکم ہر حال میں غالب رہے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: "وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى!" (سورت انبیاء۔ آیت ۲۸): نہیں شفاعت کریں گے مگر اُن کے لئے جنھیں اللہ نے پسند کر لیا ہے، اور اُس کے اذن اور اُس کے حکم کے بغیر شفاعت نہیں کریں گے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے — اگر قرآن مجید کو اس طرح سمجھا جائے تو اصل توحید صاف کھُل کر آجاتی ہے۔

اللہ پر ایمان لانے کے بعد دوسرا ایمان کا درجہ ہے، رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان۔ ہمیں قرآن مجید رسولِ اکرمؐ کے ذریعہ ملا ہے، کیونکہ آپؐ نے یہ بتایا کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ جب تک کہ آپؐ کو سچّا نہیں مانیں گے اور آپؐ کی رسالت اور نبوّت پر ایمان نہیں لائیں گے ہماری نجات نہیں ہوسکتی۔ کوئی شخص کتنا ہی اللہ پر ایمان لے آئے لیکن اگر وہ رسول اکرمؐ کی رسالت پر، آپؐ کے پیغمبر ہونے پر، آپؐ کے سچّے نبی ہونے پہ ایمان نہیں لاتا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی نجات نہیں ہوسکتی۔ اسے کیسے خبر ہوئی کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ یہ تو رسولِ اکرمؐ نے فرمایا تب ہی معلوم ہوا، اور آپؐ کو رسول کیسے مانا۔ اِس لئے کہ آپؐ سچے تھے، امین تھے، مشرکوں، کافروں اور دشمنوں نے بھی اس کی گواہی دی۔ جب آپؐ نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ آپؐ جھوٹے ہیں، کافروں نے بھی یہ نہیں کہا کہ آپ جھوٹے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپؐ صادق اور امین ہیں:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورۂ یونس آیت ۱۶)

"کہ میں نے تمھارے اندر ایک لمبی مدّت گذاری ہے، پھر کیا تم عقل نہیں رکھتے!"

کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ چالیس برس تک اُس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، خیانت نہیں کی، بے ایمانی نہیں کی اور چالیس برس ہونے کے بعد ہی جب کہ انسان زیادہ سنجیدہ ہوجاتا ہے اُس میں اتنی

پنا حصّہ بھی ہوتا ہے۔ اب اگر آخرت پر ایمان ہے تو پھر یہ دھندے نہیں چل سکتے، یکلخت سب ختم ہو جائیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ یہودیوں کے پاس گئے تھے۔ یہودیوں کے ساتھ یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ باغ میں جو پھل آئیں گے اُس کا نصف وہ رکھیں گے اور نصف حصّہ مسلمانوں کا ہو گا۔ تو مسلمانوں کا نصف حصّہ، وصول کرنے کے لیے وہ صحابی رض پہنچے۔ یہودیوں نے انہیں رشوت دینی چاہی کہ وہ مسلمانوں کا حصّہ کم وصول کر لیں۔ مثلاً کھجوریں اگر حصّہ میں ساٹھ من آتی تھیں تو کہا ہو گا کہ چالیس من لے جاؤ بقیہ کے بدلے میں ہم سے کچھ رقم لے لو۔ آج کل کے لوگ ہوتے تو فوراً قبول کر لیتے۔ اپنا فائدہ دیکھتے چاہے مسلمانوں کا بیت المال بالکل خالی ہو جائے۔ تو انہوں نے کہا کہ نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے ساری کھجوروں کے برابر برابر دو حصّے کر دیئے اور یہودیوں سے کہا کہ ایک حصّہ وہ لے لیں اور دوسرا حصّہ انہوں نے لا کر بیت المال میں جمع کرا دیا۔ دل میں اگر خوفِ آخرت ہو تو کوئی طمع انسان کو راہِ راست سے نہیں ہٹا سکتی۔ دُنیا میں اگر امن کا بول بالا ہو سکتا ہے، عدل و انصاف قائم ہو سکتا ہے، راحت حاصل ہو سکتی ہے تو اس کی ایک ہی شکل ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اُس کی صفات کے ساتھ ایمان، رسولِ کریم پر ایمان اور آخرت پر ایمان پختہ اور یقینی ہو۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر یہ دُنیا جہنم ہے چاہے آپ کتنے ہی مارشل لاء لگا دیں، کتنے ہی کوڑے ماریں اور کچھ ہی کیوں نہ کر ڈالیں۔ اگر دل میں ایمان نہیں اُترا تو لوگ حیلے نکال لیتے ہیں۔

اب مثلاً حکومت کی طرف سے پابندی ہے کہ شادی بیاہ میں بیس سے زائد آدمیوں کو کھانا نہ کھلایا جائے۔ لیکن کل میں ایک شادی کی تقریب میں شریک ہوا تو وہاں تقریباً پانچ سو آدمی ہوں گے اور سب کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ اب کیا یہ گیا کہ ولیمہ کی جگہ عقیقہ کر دیا گیا تھا ولیمہ لیکن ظاہر عقیقہ کیا گیا۔ اس لیے کہ ولیمہ میں افراد پر پابندی ہے جب کہ عقیقہ میں نہیں۔ ایمان دل میں نہ ہو تو قانون کی پابندی سے بچنے کے لئے سینکڑوں حیلے تراش لئے جاتے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رض کے زمانہ میں ایک بہت ہی نیک مجاہد فوجی تھا جس کے کپڑے پھٹے، پیوند لگے تھے اور کمبل بھی پرانا لپٹا ہوا تھا۔ اس کو کسریٰ کا تاج ملا۔ بہت ہی قیمتی، موتی ہیرے جواہرات سے مرصّع۔ وہ اسے اپنے پھٹے پرانے کمبل میں لپیٹے رات کی تاریکی میں لے کر اپنے سپہ سالار کے پاس آیا اور کہا کہ یہ تاج مجھے پڑا ملا ہے، آپ وصول کر لیجئے اور

بیٹی دودھ میں پانی ملادو تاکہ زیادہ فائدہ ہوسکے۔ مثلاً چار سیر دودھ اگر ہو تو پانی ملا کر پانچ ہوجائے، اور ایک سیر کے زیادہ پیسے ملیں گے۔ بیٹی سمجھدار تھی، اُس نے کہا کہ میں تو نہیں ملاتی۔ بڑھیا نے کہا کہ کون سا عمرؓ دیکھ رہا ہے، ملا دے نا! کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ کا بڑا رعب داب تھا اور پھر اُن کے پاس کوڑا اور دُرّہ تھا۔ لڑکی نے جواب دیا: ہاں عمرؓ تو نہیں دیکھ رہا مگر عمرؓ کا خدا تو دیکھ رہا ہے۔ اللہ دیکھ رہا ہے، عالم الغیب دیکھ رہا ہے، احکم الحاکمین دیکھ رہا ہے، ربّ العالمین دیکھ رہا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لڑکی کا یہ جواب بہت پسند آیا۔ آپ نے اپنے خادم سے کہا کہ اس گھر پہ نشان لگادو، کل ہم اس گھر میں اپنے لڑکے کے لئے رشتے کا پیغام بھجوائیں گے۔ تو یہ تھی لڑکی جو حضرت عمر فاروقؓ کی بہو بنیں اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کی نانی ہوتی ہیں۔ یہ تھا اُس زمانہ میں لڑکی کے لئے نیکی کا معیار۔ آج معیار بدل چکے ہیں۔ آج لڑکی کا حُسن وجمال دیکھا جاتا ہے، تعلیم اور ڈگریاں دیکھی جاتی ہیں اور بڑے خاندان سے تعلّق دیکھا جاتا ہے۔ ایمان بالآخرۃ آپکے اس دُنیا میں خالص دودھ اور گھی کے ملنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

اگر گھی دودھ اور مصالح وغیرہ بیچنے والے آخرت پر ایمان رکھتے ہوں تو ملاوٹ ختم ہوجائے، بے ایمانی ختم ہوجائے، ہر چیز خالص ملنے لگے، رشوت کا بازار ختم ہو۔ رشوت یہاں لوگ دیتے بھی ہیں، کھاتے بھی ہیں۔ یہ اس لئے کہ آخرت پر ایمان نہیں ہے، ایمان بالغیب نہیں ہے، ایمان بالشّہود ہے۔ ایمان بالشّہود کے معنیٰ ہیں جو چیز سامنے ہے، نظر آرہی ہے اُس پہ ایمان لاؤ۔ اگر کوئی شخص ہزار روپے رشوت دے رہا ہے تو یہ سامنے کی چیز ہے لے لی جائے گی، آخرت کی خبر خدا جانے، جب آئے گی دیکھا جائے گا، جہنّم کا عذاب اور آگ کے شعلے تو دُور کی باتیں ہیں، اس وقت تو ہزار روپے مل رہے ہیں انہیں لے کر رخصت کرو۔ لیکن اگر آخرت پہ ایمان ہو تو یہ نہیں ہوسکتا۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: ”لعن اللہ الرّاشی والمرتشی والرّائش!“ (لعنت ہے راشی پر یعنی رشوت دینے والے پر، والمرتشی اور رشوت قبول کرنے والے پر اور جو ان دونوں کے درمیان دلّالی کرتا ہے)۔ جو بڑے افسر ہوتے ہیں وہ خود رشوت نہیں لیتے، اُن کے دلال یا ایجنٹ ہوتے ہیں، وہ کام کرا دیتے ہیں اور رشوت وصول کرکے افسر تک پہنچا دیتے ہیں۔ اِس میں خود اُن کا

سی ہماری محبت کا حال ہے۔ ہم زبان سے کہتے تو ہیں کہ ہمیں اللہ اور اُس کے رسولؐ سے بڑی محبت ہے لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو صاف طرح دے جاتے ہیں۔ رسول اکرمؐ کا حال تو یہ تھا کہ نماز کے لئے مسجد میں تشریف لاتے تھے، بیماری کی حالت میں بھی مسجد آتے تھے اور جماعت سے نماز نہیں چھوٹنے دیتے۔ دو آدمیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر آپ کے قدم لکیر کھینچتے تھے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم خراٹے لیتے رہتے ہیں اور اُس وقت سو کر اٹھتے ہیں جب سورج طلوع ہو چکتا ہے اور پھر بھی کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسولؐ کے سچے چاہنے والے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حق یہ ہے کہ آپؐ سے محبت ہونی چاہیئے، آپ کی محبت دل میں گھر کر جائے۔ حدیث میں آتا ہے: لا یؤمن احدکم حتی اکون أحبّ الیه من والدہ وولدہ والناس اجمعین ۰ (کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں پیارا نہ ہو جاؤں تمہارے ماں باپ سے اور دنیا بھر کی مخلوق سے!)۔ دوسرا حق آپؐ کا یہ ہے کہ آپ کی محبت کے ساتھ ساتھ آپؐ کی عظمت بھی ہو، آپ کی بڑائی ہو۔ محبت تو انسان اولاد سے بھی کرتا ہے، بیوی سے بھی کرتا ہے، دوستوں سے بھی کرتا ہے لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ایسی محبت ہونی چاہیئے کہ جس کے ساتھ عظمت بھی ہو، بڑائی بھی ہو، تعظیم بھی ہو۔ کیونکہ اگر تعظیم نہ ہو تو وہ محبت بیکار ہے۔ نبی اکرمؐ کا تیسرا حق ہے آپؐ کی اطاعت، آپؐ کا اتباع اور آپؐ کی سُنّت کی پیروی۔ آپ کہتے ہیں محبت تو بہت ہے لیکن اطاعت نہیں، ہو رہی تو یہ کیسی محبت ہے۔ زبان سے تو آپ محبت محبت بہت کہیں لیکن اصل چیز ہے اطاعت، آپؐ کے احکام کی اور اس شریعت کی جسے لے کر آپؐ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جسے آپؐ نے حلال ٹھیرایا ہے اُسے حلال سمجھا جائے جسے حرام قرار دیا ہے اُسے حرام سمجھا جائے، جسے آپؐ نے پسند یا ناپسند کیا ہے، وہی ہماری بھی پسند یا ناپسند ہو۔ جب تک ہم ایسا نہیں کریں گے اطاعت کیسے ہوگی اور محبت کس چیز کا نام ہے اور تعظیم کسے کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا:

"فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۰ (سورۃ نساء - آیت ۶۵)۔ (قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ آپؐ کو ان تمام معاملات میں حَکَم اور جج نہ بنائیں جن میں یہ جھگڑتے

مدینہ بھیج دیجئے، یہ مسلمانوں کا حق ہے، بیت المال میں جمع کرا دیجئے۔ اگر وہ چاہتا تو تاج کی کسی کو خبر نہ دیتا، پورا تاج ہضم کر جاتا یا اُس میں سے کچھ قیمتی موتی چُرا لیتا لیکن جیسا اُس کو ملا تھا ویسا ہی اُس نے حوالے کر دیا۔ اور کمال یہ ہے کہ رات کی تاریکی میں کمبل میں چھپا کر خاموشی سے دے گیا۔ وہ اس لئے کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ بڑا ایماندار ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کا حال یہ ہے کہ ذرا سا سماجی کام اگر کر دیں تو اس کی نمائش کرتے پھریں گے۔ غریبوں کی مدد کرنے یا سیلاب زدگان کو کوئی عطیہ دینے جا رہے ہوں تو فوٹو گرافروں کو ساتھ لے جائیں گے۔ ذرا سا نیکی کا اگر کوئی کام کیا تو اُس کی شہرت ہو گئی۔ اخبار میں خبر شائع ہو گئی، کسی غریب کو کوئی عطیہ دیتے ہوئے فوٹو شائع ہو گیا کہ یہ ہیں وہ صاحب کہ جنھوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری ہے۔ وہ جو کسی نے کہا (غالباً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا تھا) کہ ہمارے مجاہد تو بڑے امانتدار ہیں انھیں کسریٰ کا تاج ملا اور فوراً سپہ سالار کے حوالے کر دیا تو جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھی ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بات یہ ہے عمر رضی اللہ عنہ! تم امانتدار ہو تو یہ بھی امانتدار ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ یہ جائز ہے، وہ ناجائز ہے، یہ حلال ہے وہ حرام ہے تو تمھاری رعایا بھی، تمھارے فوجی اور مجاہد بھی غلط کاموں سے بچے ہوئے ہیں اور جائز اور ناجائز، حلال و حرام کی تمیز روا رکھتے ہیں۔ جب ایسا ایمان ہوگا تو اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہوگا: "وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"۔ اس کا پھل نیک عمل ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ ایمان دل میں ہو، خدا کا خوف دل میں ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں ہو، اُس کے رسول ؐ کی محبت دل میں ہو اور پھر عملِ صالح دل میں نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی جھوٹ بھی بولتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ؐ کی محبت کا دعویٰ بھی کرے۔ اِس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے کسی کا بوڑھا باپ بیمار ہو، بیٹا کہتا ہے ابا جان! مجھے آپ سے محبت ہے، شدید محبت ہے، میں آپ کی محبت میں مرا جا رہا ہوں، آپ کی بیماری دیکھ دیکھ کر مجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے، کاش! آپ کی جگہ میں ہوتا، میں آپ کی جگہ مر جاؤں اور آپ زندہ رہیں۔ آپ میرے بڑے محسن ہیں، بہت کرم فرما ہیں۔ مُنہ پہ بے حد تعریف کرتا ہے۔ باپ کہتا ہے بیٹے! میں اس وقت شدید تکلیف میں ہوں، تم ڈاکٹر کے پاس جا کر میرے لئے دوا لے آؤ۔ بیٹا کہتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے صبر کیجئے، ایک بڑی شاندار فلم آ رہی ہے۔ میں ذرا اُسے دیکھ لوں اس کے بعد دوا لے آؤں گا۔ چاہے اتنے عرصے میں باپ قبرستان پہنچ جائے۔ تو ایسی

درسِ حدیث

ایمان و عمل کی سلامتی اور دو مسنون دُعائیں

از قلم: مولانا محمد حسین میر، اُستاذ عربی، قرآن اکیڈمی

حدیث ۱ : عَنْ ابی موسیٰؓ قال، قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم مثل القلب کریشۃ بارض فلاۃ یقلبھا الریاح ظھرًا لبطن (رواہ احمد)

حدیث ۲ : عَنْ انسؓ قال کان رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یکثر ان یقول یامقلّب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینک فقلت یا نبی اللّٰہ اٰمنابک وبما جئت بہ فھل تخاف علینا قال نعم ان القلوب بین اصبعین من اصابع اللّٰہ یقلبھا کیف یشاء (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

حدیث ۳ : عن عبد اللّٰہ بن عمرو قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم : ان قلوب بنی اٰدم کلھا بین اصبعین من اصابع الرحمٰن کقلب واحد یصرفہ کیف یشاء ثم قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم : اللّٰھم مصرف القلوب صرف قلوبنا علیٰ طاعتک (رواہ مسلم)

❁ ترجمہ ۱ : "حضرت ابو موسیٰ رضؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا : دل کی مثال، پر زے کے اُس پر کی سی ہے جو بیابان میں پڑا ہو کہ اسے آندھیاں نیچے اوپر کرتی رہتی ہیں !"

❁ ترجمہ ۲ : "حضرت انس رضؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے : اے دلوں کے الٹنے پلٹنے والے ! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھیو ! -اس پر میں نے عرض کیا : اے اللہ کے نبی ! ہم آپ پر اور آپ کی لائی ہوئی تعلیمات پر ایمان لا چکے، تو کیا آپ کو ہمارے بارے میں کوئی ڈر ہے ؟ آپؐ نے فرمایا : ہاں ! دل، اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ انہیں جیسے چاہے اُلٹ پُلٹ دیتا ہے !"

❁ ترجمہ ۳ : حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا : تمام انسانوں کے دل ایک دل کی طرح اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں میں ہیں، وہ انہیں

ہیں اور آپؐ کے فیصلے کو سن کر کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔ بلکہ خوشی خوشی اس فیصلے کو مان جائیں !)

مطلب یہ کہ آنکھیں بھی ٹھنڈی ہو جائیں اور دل بھی باغ باغ ہو جائے ۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کردیں، چاہے اُس سے بظاہر کتنا ہی نقصان نظر آرہا ہو۔ یہ مطلب ہے : "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کا۔ "صالحات" کے سلسلے میں ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ " الصّٰلِحٰت" کے معنیٰ ہیں خاص قسم کی نیکیاں۔ اِس میں جو" ال" ہے اس کے معنیٰ وہی ہیں جو انگریزی میں THE کے ہوتے ہیں۔ THE BOOK کے معنیٰ خاص کتاب۔ " الصّٰلِحٰت" کے معنیٰ ہیں خاص نیکیاں۔ وہ نیکیاں جنھیں اللہ اور اُس کے رسولؐ نے نیکی قرار دیا ہے۔ کوئی مولوی صاحب، کوئی پیر صاحب یا کوئی حاکم کسی کام کو نیکی قرار دے دیں تو وہ نیکی نہیں بن سکتا، جب تک کہ اُس کے ساتھ اللہ اور اُس کے رسول کی شہادت موجود نہ ہو۔ اسی طرح کوئی اسمبلی کسی کام کو" نیکی" قرار دے دے تو وہ اُس وقت تک نیکی قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک اللہ اور اُس کے رسولؐ کی سند اُس کے ساتھ نہ ہو۔ کتنی ہی بدعات مسلمانوں میں رائج ہیں جن کا کوئی ثبوت اللہ کی کتاب یا رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت اور حدیث سے نہیں ملتا۔ چنانچہ اُن کا شمار" الصّٰلِحٰت" میں نہیں ہوگا، چاہے انہیں کتنا ہی ثواب کی نیت سے کیا جائے۔ انسان کا عمل وہی قبول ہوگا جس میں اخلاص ہو، جو صرف اللہ کے لئے ہو، ساتھ ہی سُنّت کے مطابق ہو، رسولِ اکرمؐ کے ارشاد اور آپؐ کے فرمان کے مطابق ہو۔ ؛

جب آپ ایمان بھی لے آئے، نیک عمل بھی آپ نے کئے تو" ایمان اور عملِ صالح !" دونوں نعمتیں آپ کو مل گئیں۔ اب یہ نعمت آپ کی ذات تک محدود نہ رہے بلکہ متعدّی ہونی چاہیئے۔ آپ کے گھر والوں کی طرف، آپ کے پڑوسیوں میں، آپ کے رشتہ داروں میں، آپ کے دوستوں میں، جہاں تک ہوسکے یہ متعدّی ہو۔ جیسے بیماری متعدّی ہوتی ہے، برائی متعدّی ہوتی ہے، اِسی طرح نیکی بھی متعدّی ہوتی ہے۔ وہ آگے بڑھنی چاہیئے۔ ہم خود نیک ہیں اولاد نیک نہیں ہے، وہ نماز نہیں پڑھتی۔ یہ نیکی متعدّی کہاں ہوئی، یہ تو ایک جگہ پر ٹھہر گئی۔ : "وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ !" وہ آپس میں وصیّت کرتے ہیں حق کے ساتھ۔ یعنی نیکی کو پھیلایا جائے۔ لیکن نیکی کو پھیلانے سے قبل ہمیں اُس کا شعور ہونا چاہیئے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا، پھر وصیّت

مذکورہ بالا مثالیں بتاتی ہیں کہ ہدایت وضلالت، راست روی و کج روی کے درمیان بہت کم فاصلہ ہے۔ خیال کی ایک ہی لہر ہمیں گمراہ سے ہدایت یافتہ اور ہدایت یافتہ سے گمراہ بنا دے سکتی ہے۔ ہمارے فکر وخیال کی یہ تیز رو گاڑی ذرا سا کانٹا بدل جانے سے جہاں ہمیں اس لائن پر بھی ڈال سکتی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ : وَاللّٰہُ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ! وہاں ہمیں اس راہ پر بھی سرپٹ لے جا سکتی ہے۔ جس کا انجام یہ ہو کہ : فانھار بہ فی نار جھنم ۔۔ گویا انسانی فکر اپنی ذاتی سوچ کے لحاظ سے بھی ہر وقت کسی نہ کسی انقلاب کی زد میں ہے۔ ذہن کی اسی کیفیت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ : و اعلموا انّ اللّٰہ یحول بین المرء وقلبہ ۔

یہ تو وہ اندرونی خطرہ ہے جو ہمارے دین و ایمان کو اندرونی دشمنوں اور آستین کے سانپوں (نفس و شیطان) سے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سے کہیں زیادہ مہلک خطرہ ان بیرونی عوامل کا ہے جو ہر وقت انسان کے ذہن پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اخبارات، یہ جرائد و رسائل، یہ ریڈیو، یہ ٹیلیویژن، یہ شعر و ادب، یہ آرٹ جو پوری طرح شیطانی قوتوں کے تصرف میں ہیں، اثر آفرینی میں ان کی قیامت سامانیوں کا اندازہ لگائیے اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ کس طرح شب و روز ان کو انسانی ذہن کی تطہیر کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ علمِ نفسیات نے انسانی ذہن پر حملہ آور ہونے کے لئے ایسے خفیہ ہتھیار ان کو مہیا کر دیئے ہیں کہ ان کے ہاتھوں گھائل ہونے والا خود بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ ۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں !

یہی وہ قوتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے : اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ہ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو غیر محسوس طریقے پر انسانوں کے ذہنوں میں وسوسے ڈالتے ہیں۔ الحاد و زندقہ اور فسق و فجور کے انہی لشکروں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "الرّیاح" کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ یہ آندھیاں جب اٹھتی ہیں تو بیابان میں پڑے ایک پر کی طرح فکرِ انسانی ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر جھکڑوں میں ہچکولے کھاتا پھرتا ہے اور اسے کسی دیوار یا درخت کا سہارا ابھی میسر نہیں آتا۔ جب مغرب سے سیاہ آندھیاں اٹھتی ہیں تو وہ اسے ایک رخ پر اڑا لے جاتی ہیں اور مشرق سے سرخ بگولے ابھرتے ہیں تو وہ اسے دوسرے رخ میں بہا لے جاتے ہیں ؛

جیسے چاہے گردش دیتا رہتا ہے۔ پھر آپؐ نے یہ دُعا کی: اے دلوں کو گردش دینے والے حق! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت و فرماں برداری پر ہی گردش دیجو!"

انسان محض گوشت پوست کے ایک ڈھانچے کا نام نہیں بلکہ وہ عبارت ہے کردار کے اس تانے بانے سے جسے وہ اپنے اردگرد بنتا ہے۔ تعمیر شخصیت کے اس عمل میں اگرچہ کردار و عمل کا ایک نمایاں مقام ہے، بلکہ کسی معاشرہ کی تشکیل یا اس کے استحکام میں اصل اہمیت ہی کردار و عمل کو حاصل ہے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انسان کی سیرت کا مرکز و محور اس کا فکر ہی ہوتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ فکر و ذہن ایک بنیاد ہے اور سیرت و کردار اس پر اٹھنے والی ایک عمارت۔ اگر یہ بنیاد مضبوط و مستحکم ہے تو اس عمارت کے بھی مضبوط و مستحکم ہونے کا امکان ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ بنیاد ہی کمزور اور بودی ہو تو خطرہ ہے کہ سے "خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج :: تا ثریا می رود دیوار کج"

ایک طرف انسانی شخصیت کی تعمیر میں فکر کو یہ بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ دوسری طرف اُس کی کمزوری یا ہر لحظہ تغیّر پذیری کا یہ عالم ہے کہ اُس کے تحفّظ کا آپ لاکھ اہتمام کریں کسی وقت بھی کوئی اندرونی لہر اُٹھ کر اُس کے اندر تلاطم بپا کر سکتی اور پوری شخصیت کو تہ و بالا کر کے رکھ دے سکتی ہے۔ اسی برِّصغیر کے ایک نامور عالم و خطیب اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ میرے والد ایک راسخ العقیدہ صاحبِ سلسلہ تھے۔ انہوں نے میرے خیالات کو اپنے کھینچے ہوئے حصار کے اندر بند رکھنے کے لئے اس قدر اہتمام کیا کہ مجھے دینی تعلیم کے لئے کسی دینی درسگاہ میں بھیجنا بھی گوارا نہ کیا، بلکہ گھر پر ہی میری تعلیم کا بندوبست کیا اور خوب ٹھونک بجا کر ایک قدامت پسند عالم کو میری تعلیم پر لگایا۔ ان سارے اہتمامات کے باوجود نہ معلوم کس گوشے اور کس رخنے سے میرے ذہن و فکر میں ایسا انقلاب آیا کہ میں نے ساری خاندانی روایات کو تج دیا۔ اسی طرح کی بیسیوں مثالیں ہمیں اپنے اردگرد مل جائیں گی کہ بعض اچھے خاصے دیندار گھرانوں میں پرورش پانے والے نوجوان خدا و رسول سے باغی ہو گئے اور دوسری طرف الحاد و زندقہ کے ماحول میں پروان چڑھنے والے لوگوں کی ایسی کایا پلٹی کہ وہ زاہد شب زندہ دار بن گئے۔ انسانی ذہن کی اسی کمزوری کو پرندے کے پر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ پرندے کا پر اپنی ذات میں بالکل کمزور اور بودا ہوتا ہے ٭

بیداریٔ ضمیر کے نمونے

حافظ منظور احمد، ایم۔ اے
لیکچرار شعبۂ علوم اسلامیہ، زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی آمد سے دُنیا ایک نئے تمدّن اور طرزِ معاشرت سے رُوشناس ہوئی، جس کا پہلے کوئی تصوّر موجود نہیں تھا۔ اہلِ دُنیا کو عظمتِ انسان کا درس دیا گیا اور مختلف طبقات اور متنفّر طبائع کو کچھ اس طرح قریب لایا گیا کہ وہ ایک ہی کنبہ کے افراد نظر آنے لگے۔ الدّنیا مزرعۃ الآخرۃ فرما کر دُنیا اور اُس کی رعنائیوں سے پردہ اُٹھایا گیا اور جو لغزشیں دُنیا اور اُس کے مظاہر کو سمجھنے میں سرزد ہوئی تھیں۔ ایک ایک کر کے اُن کی نشاندہی کی گئی۔ انسان کے ضمیر کو بیدار اور اُس کے شعور کو زیادہ سے زیادہ حسّاس بنایا گیا۔ یہ اسی روحانی انقلاب کا نتیجہ تھا کہ جزیرۂ عرب کے مٹھی بھر انسانوں نے نہایت ہی مختصر مدّت میں دُنیا کی دو عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل کیا۔ یہ رُوحانی عظمت ہمیں حضرتِ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صبر میں بھی نظر آتی ہے، جس کا مظاہرہ انہوں نے قریش کی ایذا رسانی کا سامنا کرتے ہوئے کیا۔ قریش نے حضرت بلالؓ کو دینِ حق سے پھیرنے کے لئے ایسی جفائیں روا رکھیں، جن کی برداشت انسان کی ہمّت سے باہر ہے۔ اُنہیں تپتے سنگریزوں پر لٹایا جاتا اور بھاری بھاری پتھر اُن کے سینے پر رکھے جاتے۔ لیکن ان ناقابلِ برداشت مصائب پر بھی وہ اَحَد اَحَد کہا کرتے تھے۔ یہ وہ دینی روح تھی، جو کسی راہ چلتے عامی میں سرایت کرتی تو وہ شاہانِ کج کلاہ کے سامنے کھری کھری باتیں کرتا اور راہِ حق میں کسی قسم کی ملامت تک کی پرواہ نہ کرتا۔ یہی انقلابِ روح خلیفۂ ثانی میں نظر آتا ہے، جو وسیع سلطنت کا مالک ہونے کے باوجود سادگی قناعت اور بے نیازی کے اعلیٰ معیار پر قائم ہے۔ ایسے ہی بیداریٔ ضمیر کے صدہا واقعات ہیں جن سے تاریخِ اسلام بھری پڑی ہے۔ افادۂ عام کے لئے چند ایک واقعات پیشِ خدمت ہیں:

بُریدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: "ماعز بن مالک رسول اللہ کی خدمت

جب ذہنِ انسانی پر اندرونی و بیرونی دشمنوں کی یلغار ہو، ایسے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس کی نصرت و اعانت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، جس کے قبضۂ قدرت میں ہمارے دل بھی ہیں (بین اصبعین من اصابع اللہ) اور جسے اسباب و عوامل پر بھی ہر طرح کی قدرت حاصل ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان احادیث کے اندر دُعا کی صورت میں، اس سے ایمان و عمل کی سلامتی کے لئے التجا کرتے رہنے کی تلقین کی ہے، اور یہی مُدّعا و مقصود ہے اِس دُعا کا جو قرآن مجید میں آئی ہے اور جسے اکثر حضورؐ مانگا کرتے تھے: رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝

دونوں دعاؤں کے الفاظ میں کچھ اختلاف ہے اور وہ بڑا بلیغ و ذومعنیٰ اختلاف ہے۔ پہلی دُعا کے الفاظ ہیں: اے دلوں کے الٹنے پلٹنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھیو!۔ قلب اُلٹانے، کسی چیز کو سیدھے سے اُلٹے یا اُلٹے سے سیدھے رُخ پر کر دینے کو کہتے ہیں۔ دین چونکہ ایک فکر، ایک فلسفہ اور ایک نظامِ حیات ہے اور اُس کی ضد کفر ہے، چاہے اُس کی نوعیت کوئی ہو کیونکہ "الکفر ملۃ واحدۃ"! تو دُعا کا مفہوم یہ ہوا کہ اے اللہ! میرے دل کے رُخ کو سیدھی جانب — دینِ اسلام کی جانب رکھیو! اِس کو اُلٹ کر کسی دوسرے دین، کسی دوسرے فکر یا کسی دوسرے فلسفہ پر نہ جما دیجو! — جب کہ دوسری دُعا کے الفاظ ہیں: اے دلوں کو گردش دینے والے! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت و فرماں برداری پر گردش دیجو! تصریف کا مطلب کسی چیز کو اُلٹا سیدھا، دائیں بائیں، نیچے اوپر گردش دینا ہے۔ چونکہ طاعت و فرمانبرداری کا تعلق عمل سے ہے اور عمل میں ہزار تنوّع ہے، صبح سے لے کر شام تک، گھر سے لے کر بازار، کھیت، دفتر یا کارخانے تک ہر روز سینکڑوں ایسے معاملات پیش آتے ہیں جہاں انسان کے جذبات میں بہہ کر غلط عمل اختیار کر لینے کے امکانات ہوتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی جانی چاہیئے کہ وہ ہمارے دلوں کو اس عمل کی طرف پھیر دے جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کا حامل ہو، نہ کہ اُس کی نافرمانی و سرکشی کا۔ اس طرح یہ دونوں دُعائیں مل کر فکر و کردار یا ایمان و عمل کی سلامتی کی دعائیں بن جاتی ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ ؕ

کے رجم کا حکم دیا گیا۔ خالد بن ولید نے آگے بڑھ کر ایک پتھر اس کے سر پر مارا، جس سے اڑکر خون کے کچھ چھینٹے آپ کے چہرے پر پڑے۔ اس پر آپ نے اُسے بُرے الفاظ سے یاد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خالد! ذرا سنبھل کر۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے جو اگر ناجائز چنگی وصول کرنے والا بھی کرتا تو اسے بخش دیا جاتا۔

ماعزؓ اور اس عورت کا کردار ہمارے سامنے ہے۔ اس میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ کسے پتہ نہیں ہوگا کہ اسے کتنے بُرے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ انہیں کسی نے جرم کرتے ہوئے دیکھا نہیں تھا کہ ان کا جرم ثابت کیا جا سکتا۔ آپ کی شفقت اور رحمت کا یہ تقاضا تھا کہ شبہ کی بنا پر ان کو سزا سے معاف رکھیں۔ لیکن ان دونوں نے بہت اصرار کیا اور بچ نکلنے کے تمام دروازے اپنے اوپر بند کر لئے۔ آخر یہ سب کیوں؟ ان کا یہ کہنا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کر دیجئے۔ ان کے اندر ایک ایسی محرک قوت کے وجود کی نشاندہی کرتا ہے جو خود زندہ رہنے کی خواہش پر بھی غالب ہے۔ یہ قوتِ ضمیر کی بیداری اور ضمیر کا شعور ہے۔ یہ گناہ سے پاک ہونے کی طلب ہے جس سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی واقف نہیں ہے۔ یہ اس بات سے آنے والی شرم ہے کہ کل اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہونا کہ ایک گناہ کیا تھا جس سے ابھی تک پاک نہیں ہو سکے۔ یہ ہے حقیقی اسلام۔ یہ ہے شدتِ احساس جو مجرم کے ضمیر میں جنم لیتا ہے۔

اس سلسلے میں شام کی امارت سے حضرت خالد بن ولیدؓ کو معزول کر کے ابو عبیدہؓ کو امیر مقرر کرنے کا واقعہ ہے۔ یہ حضرت خالدؓ بھی جو ابھی تک کسی شکست سے دوچار نہیں ہوئے۔ وہ ایسے سپاہی تھے جن کی رگ و پے میں شجاعت سرایت کئے ہوئے تھی۔ جاہلیت میں بھی اور اسلام میں بھی۔ انہیں امارت سے معزول کیا جاتا ہے۔ مگر یہ کینہ و فساد پر نہیں اترتے۔ انہیں غیرت نہیں ستاتی کہ میدانِ جنگ سے روپوش ہو جائیں۔ کسی طرح کی بغاوت کا خیال دل میں آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سابقہ جوش و جذبہ اور اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبہ کے لئے پوری تڑپ اور خدا کے راستے میں شہید ہونے کی تمنا کے ساتھ مصروفِ پیکار رہے۔ دراصل اسلام فرد کے ذہن میں جو ہمہ وقتی بیداری اور اس کے احساس میں جو شدت پیدا کرتا ہے وہ ان تمام خیالات سے بلند ہے۔ ــــ اور دیکھئے خلیفۃ المسلمین عمر بن الخطاب پانی کا مشکیزہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ ان کے صاحب زادے ناپسندیدگی کے لہجے میں ان سے پوچھتے ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں

میں حاضر ہوئے اور کہا "اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کر دیجئے"۔ آپؐ نے فرمایا "تیرا بُرا ہو، جا اور اللہ کے حضور توبہ و استغفار کر لے"۔ راوی کہتا ہے، وہ تھوڑی دور تک گئے، پھر واپس لوٹ آئے اور آپ سے پھر کہا کہ "اے اللہ کے رسول مجھے پاک کر دیجئے!" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر وہی جواب دیا۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ چوتھی بار رسول اللہؐ نے فرمایا "میں تجھے کس چیز سے پاک کروں؟ وہ بولے "زنا سے"۔ رسول اللہؐ نے لوگوں سے پوچھا "یہ شخص پاگل تو نہیں ہے؟ آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے!۔ آپؐ نے دریافت کیا: کیا اُس نے شراب پی ہے؟ ایک شخص نے اُٹھ کر ماعز کی بُو سونگھی تو اسے شراب کی بُو نہیں ملی۔ آپؐ نے پھر اُس سے پوچھا "کیا تم نے زنا کیا ہے؟" اُنہوں نے کہا "ہاں" اس پر آپؐ نے حکم صادر فرمایا اور انہیں سنگسار کر دیا گیا۔ اس واقعے کو دو تین دن گزرے ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا "ماعز" کے لئے مغفرت کی دُعا کرو۔ اُس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے پوری قوم کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو وہ ان کے لئے کافی ہے۔

پھر آپؐ کے پاس قبیلۂ ازد کے بطنِ غامد کی ایک عورت آئی اور اس نے کہا "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا: تیرا بُرا ہو، جا اور اللہ کے حضور توبہ کر!۔ وہ بولی: "کیا آپؐ مجھے ماعز کی طرح واپس لوٹانا چاہتے ہیں۔ یہ زنا سے قرار پایا ہوا حمل ہے!" آپ نے فرمایا "کیا تو زنا سے حاملہ ہے؟" اُس نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا: "وضع حمل تک انتظار کرو"۔ راوی کہتا ہے کہ پھر آپؐ نے اُس عورت کو بچہ جننے کے عرصہ کے لئے ایک انصاری کی نگرانی میں دے دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انصاری نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کیا کہ غامدی عورت بچہ جن چکی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "ہم ایسا نہیں کریں گے کہ اُسے سنگسار کر دیں اور اُس کے شیر خوار بچے کو اکیلا چھوڑ دیں کہ اسے کوئی دودھ پلانے والا نہ ہو"۔ اس پر ایک انصاری نے کھڑے ہو کر کہا "اے اللہ کے نبی! دودھ پلانے کا انتظام میرے ذمہ ہے"۔ راوی کہتا ہے کہ حضورؐ نے اُسے سنگسار کرا دیا۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا لوٹ جا۔ بچہ جننے کے بعد آنا۔ جب وہ آئی تو آپؐ نے فرمایا "جا اسے دودھ پلا، دودھ چھڑانے کے بعد حاضر ہونا"۔ چنانچہ جب آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی تو بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔ آپؐ نے بچہ کسی مسلمان کے سپرد کیا اور اُس عورت

بن عبدالرحمٰن کے پاس بھیجا اور انہیں مطلع کردیا کہ ان میں کچھ کپڑا عیب دار ہے۔ حفص نے یہ مال بیچ دیا مگر عیب بتانا بھول گیا۔ ناقص کپڑے کے عوض پورے دام وصول کرلئے۔ روایت ہے کہ اس کے دام تیس ہزار یا پینتیس ہزار تھے۔ امام ابوحنیفہ رح نے اپنے ساتھی کو لکھا کہ خریدار کی تلاش کرو۔ لیکن جستجو کے باوجود خریدار کا پتہ نہ چلا۔ اس پر ابوحنیفہ رح نے اپنے ساتھی سے علیحدگی اختیار کرلی۔ بلکہ اس قیمت کو اپنے پاکیزہ مال میں شامل کرنا بھی گوارا نہ کیا اور کل کا کل خیرات کردیا۔ روایت ہے کہ یونس بن عبید کے پاس مختلف داموں کے کپڑے تھے ایک قسم تھی جس کے جوڑے کے دام چار سو درہم تھے اور دوسری قسم کے جوڑے کے دام دوسو درہم تھے۔ آپ نماز کے لئے گئے اور اپنے بھتیجے کو دکان پر چھوڑ گئے۔ اسی اثناء میں ایک اعرابی آیا اور اس نے چار سو کی قیمت کا ایک جوڑا مانگا۔ لڑکے نے اسے دوسو درہم کا دکھایا اور اسے بہت پسند آیا اور وہ اسے راضی خوشی خرید کر چلا۔ وہ ہاتھ میں کپڑا لئے جا رہا تھا کہ راستے میں یونس بن عبید سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے اعرابی سے دریافت کیا کہ آپ نے یہ کپڑا کتنے میں خریدا ہے۔ اس نے جواب دیا چار سو میں۔ انہوں نے فرمایا: "یہ دوسو سے زیادہ کا نہیں ہے۔ لوٹ جاؤ اور اسے واپس کردو۔ اس نے جواب دیا۔ یہ جوڑا ہمارے علاقے میں پانچ سو کا ملتا ہے اور میں نے یہ راضی خوشی خریدا ہے۔ یونس نے کہا واپس جاؤ کیونکہ دین کی راہ میں خیرخواہی دنیا کی دولت سے بہتر ہے۔ پھر انہوں نے اپنے بھتیجے کو ڈانٹ پلائی اور کہا: تجھے شرم نہ آئی، تجھے خدا کا خوف نہ آیا!" لڑکا قسم کھانے لگا کہ اس نے راضی خوشی خریدا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا: "جو تو اپنے لئے پسند کرتا ہے، دوسروں کے لئے کیوں پسند نہیں کرتا!"

محمد ابن منکدر سے مروی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں اُن کے ملازم نے ایک اعرابی کے ہاں پانچ پانچ درہم والے کپڑے کے ٹکڑے دس دس درہم میں بیچ دیئے۔ آپ کو معلوم ہوا تو اس اعرابی کی تلاش میں نکلے یہاں تک کہ اسے ڈھونڈ پایا اور اسے ملازم کی غلطی بتائی کہ اس نے پانچ درہم کے بدلے دس درہم کو بیچ ڈالا۔ مگر وہ تعجب سے بولا کہ میں نے یہ دام راضی خوشی دیئے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا: "تم راضی ہو تو ہم تمھارے لئے وہ پسند کریں گے جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں!"

بے شک اِن تمام واقعات کے پیچھے کام کرنے والی ایک قوت ہے یعنی اپنے ضمیر کے آگے شرمانا اور خدا سے ڈرنا ہے۔ جب نفسِ انسانی اسلامی سیرت اختیار کرلیتا ہے تو ذوق

کیا۔ آپ جواب دیتے ہیں "میرا نفس غرور و خود پسندی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ میں نے چاہا کہ اسے ذلیل کروں!" بیداریٔ احساس ملاحظہ ہو۔ اس شخص کے دل کے کسی گوشہ میں خلافت فتوحات اور آئندہ آنے والی عزت و عظمت پر تھوڑی سی خود پسندی سوار ہو گئی تو انہیں گوارا نہیں کہ یہ خود پسندی باقی رہے اور پروان چڑھے۔ وہ جھٹ نفس کو ذلیل کرنے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ بھی سب کے سامنے۔ اسے اس بات کی پرواہ نہیں کہ وہ اتنی وسیع سرزمین کا مالک ہے۔

اور یہ ہیں جنابِ علی رضؓ۔ جاڑوں کا زمانہ ہے۔ ٹھنڈک کے مارے تھر تھر کانپ رہے ہیں بدن پر گرمی کے کپڑے ہیں۔ اس کے علاوہ بچاؤ کے لئے کچھ نہیں۔ بیت المال ان کے ہاتھ میں ہے لیکن ضمیر کی بیداری اور شعور کی بلندی انہیں بیت المال سے استفادہ کرنے نہیں دیتی۔

عمواس میں ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ عمواس کو ایک مہلک وبا نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حضرت عمر رضؓ کو ڈر ہے کہ امین الملت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ چنانچہ انہیں اس وبا سے نکالنے کے لئے خط لکھ کر بلاتے ہیں "امّا بعد! مجھے تم سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں بالمشافہ گفتگو کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ تاکید کرتا ہوں کہ اس خط پڑھنے کے بعد اسے رکھنے سے پہلے ہی چل پڑنا!" حضرت ابو عبیدہؓ حضرت عمر رضؓ کا خط پڑھتے ہی آپ کا مقصد بھانپ لیتے ہیں کہ انہوں نے مجھے اس مہلک وبا سے نکالنے کے لئے ایک بہانہ تلاش کیا ہے۔ فرماتے ہیں "اللہ تعالیٰ امیر المؤمنین کو معاف رکھے۔ میں سمجھ گیا کہ آپ کو میری ضرورت کیا ہے۔ اس وقت میرے ساتھ مسلمانوں کا پورا لشکر موجود ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس سے جدا ہوں۔ میں انہیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اللہ تعالیٰ میرا اور ان کی تقدیر کا لکھا ہوا پورا نہیں کر دیتا۔ امیر المومنین! ان وجوہات کی بنا پر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس درخواست سے بری فرمائیں اور لشکر میں رہنے دیں!"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ خط پڑھ کر رونے لگے۔ حاضرین دریافت کرتے ہیں کہ ابو عبیدہؓ چل بسے۔ وہ آنسوؤں میں رندھی ہوئی آواز میں جواب دیتے ہیں "گویا کہ چل بسے!"

یہ تقدیرِ الٰہی پر گہرا ایمان ہی تو تھا جس نے ابو عبیدہ رضؓ کو موت کے منہ میں روکے رکھا۔ اور یہ احساس بھی کہ خود بھاگ جانا اور لشکرِ اسلام کو موت کے منہ میں چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں جب کہ سب اللہ تعالیٰ کی راہ کے سپاہی ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کردار ملاحظہ ہو۔ انہوں نے کچھ سامان اپنے شریک حفص

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ساتھ

بھارت میں پندرہ دن

از قلم :- قاضی عبدالقادر (کراچی)

پی آر بی پیچھے نکل چکی تھی اور ہماری گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ واہگہ کی جانب بڑھ رہی تھی - ڈرائیونگ سیٹ پر امیرِ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تشریف فرما تھے - یہ ڈاکٹر صاحب کی سوزوکی وین تھی، جس میں میرے اور اُن کے علاوہ میاں عارف رشید (ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے) میری اہلیہ اور چھوٹی بچی اور میرے ایک قریبی عزیز صابری صاحب بیٹھے تھے - آج اتوار تھا اور فروری کی تین تاریخ - مطلع صاف تھا اور موسم خوشگوار، حالانکہ کل ہی لاہور کو تیز اور سرد ہواؤں نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا - *

یہ ہمارا انڈیا کا سفر تھا، جس کی تیاریاں خاصے عرصہ سے کی جا رہی تھیں - میری بہن اور بہنوئی علی گڈھ میں اور چھوٹا بھائی کانپور میں تھے، جن سے ملاقات کئے سترہ سال کی طویل مدت گذر چکی تھی - ایک لکیر نے ہماری قربت کو طویل فاصلہ میں تبدیل کر دیا تھا — زمینی فاصلے دُور تھے لیکن دل بہت قریب تھے، کتنے ہی خاندان ہیں جنھیں ایک لکیر نے ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے - ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں نے طویل عرصے تک انڈیا جانا ناممکن بنا دیا تھا - اس کے بعد ویزے ملنے شروع ہوئے تو اسلام آباد کے بھارتی سفارتخانے سے ویزا کا ملنا جُوئے شیر لانے سے کم نہ تھا - مہاجرین کی بڑی تعداد جو کراچی اور سندھ میں بستی تھی، ویزا کے حصول کے لئے اسلام آباد کا چکّر لگاتی، جس میں ضیاع ہوتا پیسے اور وقت کا اور حاصل ہوتی سخت ذہنی کوفت - جنتا گورنمنٹ کے زمانہ میں جہاں انڈیا اور پاکستان کے تعلّقات میں بہتری کی طرف پیش رفت ہوئی، وہیں یہ بھی ہوا کہ کراچی میں انڈیا کا ویزا آفس کھُل گیا اور ویزا کے حصول میں آسانیاں پیدا کر دی گئیں - چنانچہ اب کئی ماہ سے تو حال یہ ہے کہ بیرونِ کراچی کے درخواست دہندگان کو اسی روز اور کراچی کے شہریوں کو دوسرے دن

اسلام اس میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہ ضمیر کی بیداری اور احترام انسان کا درس ہی تھا جس نے فرضی انسانی تفریق کو ختم کیا۔ آپ کے زمانے میں غلام آزاد انسانوں سے الگ طبقہ سمجھے جاتے تھے۔

اس سلسلے میں جب ہم محمدؐ بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش جو قریش کے ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی ہے، کی شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید کے ساتھ کر دیتے ہیں۔ شادی ایک نازک مسئلہ ہے جس میں برابری کا سوال سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن دین کی قوت کے سوا کسی اور میں یہ طاقت نہیں کہ یہ معجزہ کر دکھائے۔ اس میں شک نہیں کہ ممالک متحدہ امریکہ میں غلامی قانوناً ممنوع ہے لیکن کسی نیگرو کے لئے کسی سفید چمڑی کی عورت کے ساتھ خواہ وہ کتنی ہی گئی گزری کیوں نہ ہو شادی کرنا ممنوع ہے۔ یہی نہیں بلکہ سیاہ فام لوگوں کے لئے بسوں اور دوسری سواریوں میں گوروں کے ساتھ بیٹھنا، ان کے ریستورانوں میں جانا بالکل ممنوع ہے۔

زمانہ کی گاڑی آگے چلتی ہے اور خلیفۃ المؤمنین عمر بن الخطابؓ عمارؓ بن یاسرؓ کو کوفہ کا والی مقرر کرتے ہیں حالانکہ وہ موالی میں سے ہیں۔ پھر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عمرؓ کے دروازے پر عمرو بن حارث بن ہشام کے بیٹے سہیل، ابوسفیان ابن حرب اور چند دوسرے اکابر قریش باریابی کے منتظر نظر آتے ہیں۔ لیکن آپ دو غریب موالی حضرت صہیبؓ اور حضرت بلالؓ کو سب سے پہلے بلاتے ہیں۔ کیونکہ وہ حضورؐ کے صحابہؓ اور جنگ بدر کے شرکاء میں سے ہیں۔ اس تقدیم پر ابوسفیانؓ کے نتھنے غصے سے پھول جاتے ہیں اور اُن کے منہ پر جاہلیت کی بات آتی ہے: "ایسی بات میں نے کبھی نہیں دیکھی کہ ان غلاموں کو اندر بلایا جائے اور ہمیں دروازے پر چھوڑ دیا جائے!"

موالی میں سے کسی نے قریش کے ایک فرد کو اس کی بہن کے رشتے کا پیغام دیا مگر قرشی نے انکار کر دیا۔ جب اس بات کا علم حضرت عمرؓ کو ہوا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ نکاح میں مانع کیا ہے۔ وہ اچھا آدمی ہے اور تیری بہن کو عطیہ بھی کافی فراخدلی سے دے رہا ہے۔ قرشی نے کہا کہ ہم اعلیٰ حسب و نسب والے لوگ ہیں۔ یہ شخص میری بہن کا کفو نہیں۔ اس حضرت عمرؓ نے فرمایا: "یہ آدمی دُنیا اور آخرت دونوں کا حسب رکھتا ہے۔ دُنیا کا حسب مال ہے اور آخرت کا حسب تقویٰ ہے۔ اگر عورت راضی ہے تو اس سے نکاح کر دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی بہن کا نکاح اُن سے کر دیا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!"

یہ مسافروں کی بھیڑ بھاڑ وغیرہ نہ ہو تو سفر واقعی میرے لئے ایک تفریح ہے۔ نئے نئے مقامات دیکھنے اور سیر سپاٹے کا شوق بچپن ہی سے گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ میری پیدائش یوپی کے ضلع بلند شہر کے ایک مشہور قصبہ ڈبائی کی ہے۔ علی گڑھ، ڈبائی سے کوئی پچیس میل دور ہے۔ بچپن میں اکثر میں ڈبائی سے علی گڑھ کا سفر کیا کرتا تھا۔ علی گڈھ کے کھٹ ٹیلے (شہر کے اندر ریلوے لائن کے اوپر پیدل چلنے کے لئے پل) پر کھڑے ہو کر گھنٹوں ریلوں کی آمد و رفت کا نظارہ کرنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ مجھے یاد ہے، غالباً میں چوتھی کلاس میں تھا۔ اُردو کے ٹیچر جوہری صاحب نے مضمون لکھنے کو دیا تھا کہ: "میں بڑا ہو کر کیا بنوں گا!" لڑکے مضمون لکھ کر لائے، اکثر نے ڈاکٹر اور انجینئر لکھا۔ آپ سُن کر تعجب کریں گے اور اُس وقت ہمارے ماسٹر صاحب کو بھی تعجب ہوا کہ میں نے لکھا کہ بڑا ہو کر میں ریل کا گارڈ بنوں گا، تاکہ نئے نئے شہر اور مقامات دیکھنے اور سفر، مسلسل سفر کا موقع ملتا رہے۔ یہ تھی سفر کے ساتھ بچپن سے میری دلچسپی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں سب سے لمبا سفر میں نے بینا (سی۔ پی) کا کیا تھا جہاں میرے ماموں پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ یا پھر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آنے کے لئے علی گڈھ سے بمبئی تک کا ریل کا اور بمبئی سے کراچی تک کا بحری جہاز کا سفر۔ اور یہ کراچی اور لاہور کے درمیان سفر تو اب روزمرّہ کے معمولات میں شامل ہو گیا ہے۔ ہم جب مسلمان ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ہر چیز کو مسلمان ہونا چاہیئے۔ ہمارا حضر، ہمارا سفر سب اسلام کے تابع ہونے چاہئیں۔ ایک مسلمان کی زندگی کا جو مقصد ہے اور جسے ہم نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے اور جس کے لئے ہم جیتے ہیں سفر ہو یا حضر اُس سے غافل رہنے کا سوال ہی نہیں۔ صرف "تفریح" ہمارے لئے کچھ نہیں۔ ہم جب ایک نصب العین کے داعی ہیں تو ہماری "تفریح" بھی بامقصد ہونی چاہیئے۔ ہم جس مشن کو لے کر چل رہے ہیں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، ہر وقت اور ہر دم اس کا پیشِ نظر رہنا ہماری نجاتِ اُخروی کے لئے ضروری ہے۔ چنانچہ انڈیا کا یہ سفر صرف تفریح کے لئے یا رشتہ داروں سے ملاقات کے لئے ہی نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ بھی تھا: ع "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے!" کسٹم کی پابندیوں کی وجہ سے زیادہ سامان نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کے چند سیٹ وغیرہ ہی پر اکتفا کرنا پڑا اور یوں ہمارے اس سفر کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے صاحبزادے میاں عارف رشید اور میرے ایک محترم عزیز

ویزا مل جاتا ہے۔ اِس کے برخلاف ہمارے ہندوستانی بھائیوں کو دہلی کے پاکستانی سفارتخانہ سے ویزا حاصل کرنے میں نہایت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بار بار دہلی کے چکر، روپے اور وقت کا ضیاع، انکوائریاں اور مہینوں کے بعد ویزا کا حصول، بقول اقبال ؎

"دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ ؛ بتکدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ!"

دہلی کے پاکستانی سفارتخانہ کے عملہ کے برتاؤ، ویزا جاری کرنے میں لیت ولعل اور مہینوں تک چکر لگوانے کے بعد ویزا کے اجراء نے بھارت میں پاکستان کے IMAGE کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ وہاں کے دوستوں نے ہمیں کہا کہ پاکستانی اربابِ بست و کشاد کو اس جانب توجہ دلائی جائے۔ اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو پاکستان کی GOOD-WILL ختم ہوتی چلی جائے گی۔ پچھلے دَور میں تو بعض وجوہات سے یہ چیزیں قابلِ فہم تھیں، لیکن اب جنرل ضیاء الحق صاحب کے دَور میں اس کا کوئی جواز نہیں ؛

ہزاروں لاکھوں پاکستانیوں نے اپنے بچھڑے ہوئے بھارتی احباب سے ملاقات کے لئے جب بھارت جانا شروع کیا تو مَیں نے بھی نومبر ۱۹۷۹ء میں اپنا، اپنی اہلیہ کا ویزا حاصل کر لیا۔ ویزا کی مدّت تین ماہ کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے جب مَیں نے ذکر کیا اور اُن سے بھی ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بھی تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کی جائے پیدائش مشرقی پنجاب کا شہر حصار تھی جو دہلی سے کوئی اسّی میل دُور ہے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں ڈاکٹر صاحب مع خاندان کے پیدل قافلہ کے ساتھ خون کا دریا پار کر کے حصار سے پاکستان تشریف لے آئے اور اس وقت سے کبھی دوبارہ بھارت جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ بھارت میں اُن کا کوئی قریبی عزیز بھی نہیں رہا۔ حصار تو مسلمانوں سے بالکل ہی خالی ہو گیا۔ مشرقی پنجاب کے دیگر اضلاع میں اب کہیں کہیں مسلمان دوبارہ بسنے شروع ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دل میں بھارت جانے اور وہاں کے شہروں خصوصاً حصار جانے کی خواہش تو عرصہ سے ضرور تھی۔ اب جب مَیں نے اپنے ساتھ چلنے کی درخواست کی تو ڈاکٹر صاحب فوراً تیار ہو گئے۔ پاسپورٹ تو موجود ہی تھا، ویزا حاصل کر لیا گیا۔ جنوری میں بھارت میں عام انتخابات ہونے والے تھے۔ اس سے قبل انتخابی ہنگاموں کا دَور ہوتا ہے۔ دسمبر اور جنوری شدید سردی کا زمانہ ہوتا ہے، اس لئے روانگی کے لئے فروری کا پہلا ہفتہ منتخب کیا گیا ؛

نہ جانے کیوں بچپن ہی سے سفر میرے لئے تفریح کا باعث ہوتا ہے۔ اگر

کے تمام اور خصوصاً مغربی علاقوں میں ہندو اور خصوصاً سکھ مسلمانوں کے جانی دشمن بن چکے تھے اور اُن کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ پہلی بار جب میں بھارت گیا تو بھارتی علاقے میں داخل ہونے کے بعد سکھوں کے مزاج میں خوشگوار تبدیلی محسوس کر کے خوشی ہوئی۔ کیونکہ لاشعور میں کہیں ایک سردار جی کرپان لئے بیٹھے تھے ـــ ڈاکٹر صاحب ۱۹۴۷ء کے خونی فسادات کے بعد پہلی بار بھارت جا رہے تھے ظاہر ہے کہ ان کی کیفیت بھی کچھ اسی طرح کی ہوگی۔ واہگہ جاتے ہوئے راستہ میں غالباً ایک طویل سوچ کے بعد مجھ سے فرمایا: "کیا وہاں ریلوے کمپارٹمنٹ میں بھی سکھ بیٹھے ہوں گے! اور میں اُن کی کیفیت کو بھانپ کر زیرِ لب مسکرا دیا ـــ اور اب یہ اٹاری ہے اور ہم ہیں اور سکھوں کا دیس ہے۔ ڈاکٹر صاحب چاروں طرف سکھوں کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے کیونکہ اب تو: ع جدھر دیکھتا ہوں اُدھر سکھ ہی سکھ ہیں!" ـــ فرمانے لگے یہاں تو ایک دو نہیں پورے ہول سیل میں ہیں۔ امرتسر جانے کے لئے اٹاری پر ایک سردار جی کی ٹیکسی پکڑی، گاڑی کیا تھی کھٹارہ تھی، کبھی گاڑی رہی ہوگی

گیٹ کسی صورت بند نہیں ہوتا تھا۔ سردار جی نے ایک رسّی نکالی جو اسی کام کے لئے مخصوص تھی، اور دونوں دروازوں کو اس سے باندھ دیا، اور پھر ان دروازوں کو گھور کر یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اب کھل کے دیکھو، نہ کردوں کرپان سے دو ٹکڑے تو خالصہ نام نہیں۔ ایسے میں ذہن میں سردار جی کے متعلق چند لطیفے بھی آ گئے، مگر سچی بات تو یہ ہے کہ سردار جی کے سامنے ڈاکٹر صاحب کو سنانے کی کچھ ہمت نہ پڑی، میری طبعی کمزوری آڑے آ گئی۔ ویسے بھی یہ سردار جی اور لطیفہ کا معاملہ تھا، کسی سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا معاملہ تو نہ تھا۔ سردار جی نے دروازوں کو رسّی سے باندھ کر مونچھوں پر یوں ہاتھ پھیرا جیسے کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر جب انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی چلی تو جان میں جان آئی۔ معلوم ہوا کہ یہ گاڑی چلتی بھی ہے، کیونکہ بزرگوں سے سنا ہے کہ: "چلتی کا نام گاڑی ہے!" ـــ ہاں یہ اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں راستہ ہی میں "قیلولہ" نہ کرنے لگے یا "غفرلہٗ" نہ ہو جائے اور ہم دیارِ غیر میں بیچارہ ہو کر رہ جائیں۔

سردار جی کچھ زیادہ ہی ہنس مکھ تھے، ادھر ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بھی سکھوں کے معاملے میں کھل چکی تھی۔ یعنی "انشراحِ صدر" حاصل ہو چکا تھا۔ راستہ بھر کبھی پنجابی اور کبھی اُردو میں باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے پلّے کچھ پڑیں کچھ نہ پڑیں۔ نصف گھنٹہ کے بعد ہم امرتسر کی

صابری صاحب واہگہ تک ہمیں چھوڑنے آئے ۔ صابری صاحب کسٹم کے سپرنٹنڈنٹ ہیں پہلے واہگہ پر تعینات تھے ، آج کل بڑے ڈاکخانہ میں ہیں ۔

دوپہر کے بارہ بجے کے قریب ہم واہگہ بارڈر پر تھے۔ کسٹم وغیرہ کے مراحل سے جلد ہی فارغ ہوگئے۔ کسٹم سپرنٹنڈنٹ صاحب نے چائے وغیرہ سے ہماری تواضع کی۔ صابری صاحب نے ہمیں وہاں مسجد دکھائی جو حال ہی میں تعمیر کی گئی ہے چھوٹی سی مسجد ہے مگر ہے خوبصورت اس میں بچّوں کے لئے ایک مدرسہ اور بچیوں کے لئے ایک انڈسٹریل ہوم کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ انڈسٹریل ہوم کے لئے کچھ مشینیں بھی آچکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صابری صاحب کو ایک دردمند دل دیا ہے۔ وہ سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے رہتے ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دین کا سپاہی بنائے اور دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے ۔

واہگہ کے گیٹ پر پاکستانی نوجوان رائفل لئے کھڑا تھا۔ چند قدم کے بعد بھارتی گیٹ پر رائفل بردار سردار جی کھڑے تھے۔ مَیں نے فوراً گھڑی دیکھی۔ بارہ بجنے والے تھے۔ مَیں ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سردار جی (قلی) نے کہا بابو جی! گھڑی آدھ گھنٹہ آگے کر لیجئے، یعنی ساڑھے بارہ بجے، اور میرے ذہن میں ایک لطیفہ گدگدی کرنے لگا۔ سرحد پر انڈیا اور پاکستان کے گیٹ آمنے سامنے ہیں، درمیان میں چند قدم کا فاصلہ ہے اور یہ جگہ "NO MAN'S LAND" کہلاتی ہے۔ دونوں گیٹوں پر دونوں ملکوں کے جھنڈے لہراتے رہتے ہیں۔ جو دو الگ الگ ملکوں کے مذہب، ثقافت، تمدّن اور تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سرحد سے پاکستان کی جانب واہگہ ہے، اور بھارت کی جانب پہلا قصبہ اٹاری۔ واہگہ کسٹم سے پاکستانی قلی سامان لاکر "NO MAN'S LAND" پر کھینچی ایک سفید لکیر پر رکھ دیتے ہیں۔ وہاں سے ہندوستانی قلی سامان اٹھاتے ہیں اور بھارت کی پہلی چوکی اٹاری تک لاتے ہیں۔ اٹاری پر بھی کسٹم وغیرہ کے مراحل سے جلد ہی فراغت ہوگئی۔ دونوں طرف قلیوں کے ریٹ متعین ہیں اور یہاں کنٹرول معلوم ہوتا ہے

۱۹۴۷ء میں پاکستان آنے کے بعد میں تو ۱۹۶۰ء اور ۱۹۶۳ء میں دو بار بھارت کا چکّر لگا چکا تھا اور وہاں پر ہندوؤں اور خصوصاً سکھوں کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات میں جو تبدیلی آچکی تھی، اُس کا مشاہدہ کر چکا تھا۔ حالانکہ ۱۹۴۷ء میں بھارت

پر رو دیا — ہر طرف درندوں اور بھیڑیوں کا راج تھا بقول جگر مراد آبادی مرحوم سے

دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن ۔۔۔ ⁂ ۔۔۔ اور اُس کا نام فصلِ بہاراں لیے ہے آج کل
انسانیت کے بھیس میں روحِ درندگی ۔۔۔ ⁂ ۔۔۔ انسان کے لباس میں شیطاں ہے آج کل
ہے زخمِ کائنات جو ہندو ہے ان دنوں ۔۔۔ ⁂ ۔۔۔ ہے داغِ زندگی جو مسلماں ہے آج کل
انسانیت کہ جس سے عبارت ہے زندگی ۔۔۔ ⁂ ۔۔۔ انساں کے سائے سے بھی گریزاں ہے آج کل

اور پھر زمانہ نے ایک اور کروٹ لی، سکھوں کو کچھ احساس ہوا کہ درندہ بن کر وہ کیا کر گزرے ہیں۔ حالات بدلتے گئے — اور آج ہم اُسی امرتسر ریلوے اسٹیشن کے فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو یہاں بھی کچھ لوگوں نے پہچان لیا، یہ حضرات پاکستان سے انڈیا جا رہے تھے۔ ایک صاحب نے ہمیں کافی کی دعوت دی جو ہم نے قبول کر لی۔ پاکستان کے مقابلے میں چیزیں سستی ہیں۔ چائے ۳۰ پیسے، کافی ۴۰ پیسے اور وہ بھی ہمارے ہاں کے اسٹیشنوں کے مقابلے میں QUANTITY اور QUALITY دونوں کے اعتبار سے بہت بہتر۔ سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شام کو علی گڑھ جانے والی ٹاٹا نگر ایکسپریس میں فرسٹ کلاس میں برتھ ریزرویشن کرا لیا۔ یہاں پر تھرڈ کلاس کو سیکنڈ کلاس کر دیا گیا ہے۔ لیکن فرسٹ کلاس وہی پرانی ہے۔ اس وجہ سے سیکنڈ اور فرسٹ کے کرایوں میں تقریباً چار گنے کا فرق ہے جس کا ہمیں بعد میں پتہ چلا۔ پاکستان میں ہم نے سنا تھا کہ انڈیا میں ریلوے کا نظام بہت بہتر ہے، لیکن ہمیں جو بات یہاں نظر آئی وہی وہاں بھی کوئی فرق نہیں۔ بہت سی گاڑیاں چل رہی ہیں لیکن رش بے پناہ۔ فرسٹ کلاس تک کا بیت الخلاء بہت گندہ، صفائی کا ناقص انتظام۔ ایک خاص بات جو ہم نے یہاں نوٹ کی وہ یہ ہے کہ بھارت کے لوگ عام طور پر محنتی اور جفاکش ہیں، جب کہ ہمارے ہاں تعیش اور تن آسانی راہ پا رہی ہے۔ وہاں بہت سادگی ہے، بازاروں میں بیرونی ممالک کی اشیاء نظر نہیں آتیں، معلوم ہوا کہ پابندی ہے، جیسی بُری بھلی چیز ہے بس اپنے ملک کی ہے جبکہ ہمارے بازار غیر ملکی اشیاء سے بھرے پڑے ہیں اور ہم قرض لے لے کر عیش کر رہے ہیں۔ ریزرویشن سے فارغ ہو کر میں نے علی گڑھ اپنے چچا زاد بھائی اور بہنوئی قاضی عبدالخالق کو اپنی آمد کا تار دے دیا۔ عبدالخالق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار ہیں۔ اسٹیشن سے باہر آ کر ایک سائیکل رکشہ میں جلیانوالہ باغ دیکھنے گئے۔ معلوم ہوا کہ رکشہ ڈرائیور مسلمان ہے۔ اُس نے بتایا کہ مشرقی پنجاب میں اور خصوصاً امرتسر میں مسلمان آ کر بسنے شروع ہو گئے

حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ خالصہ کالج کی عظیم عمارت کے سامنے سے گذرتے ہوئے میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھ ہی لیا کہ لاہور میں اس کا ہوسٹل بننے کی نوبت آئی تھی یا نہیں اور ڈاکٹر صاحب ہلکے سے مسکرا دیئے۔ اور میں اُس مسجد کو کبھی نہ بھولوں گا جو اٹاری سے روانہ ہونے کے بعد تھوڑے ہی فاصلہ پر سڑک سے ہٹی ہوئی بائیں ہاتھ کو پڑتی ہے۔ دُور سے اس کی ویرانی دیکھ کر خیال ہوتا تھا جیسے برسوں سے کوئی یہاں نماز پڑھنے نہیں آیا۔ اس کی ویرانی میرے دل کی ویرانی کو چھیدے دے رہی تھی۔ جی چاہا کہ ٹیکسی رکوا کر دو رکعت نماز نفل وہاں ادا کر لوں، مگر خیالات کی رفتار ٹیکسی کی رفتار کا ساتھ نہ دے سکی۔ ٹیکسی آگے نکل چکی تھی، اُس کے مینار زبانِ حال سے پکار پکار کہہ رہے تھے کہ ؎

"کون سی وادی میں ہے، کون سی منزل میں ہے ✤ عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں!"

دل کے نہاں خانہ میں ایک لہر سی اُٹھی، ایک بجلی سی چمکی ؎

"غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے ✤ کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟!"

تیزی سے پیچھے گذرتے ہوئے میناروں کو دیکھ دیکھ کر دل تڑپ اٹھا ؎

"دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں، آسماں ✤ آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں!"

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور مجھے ایسا لگا جیسے ؎

"بُوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے ✤ رنگِ حجاز آج بھی اُس کی نواؤں میں ہے!"

دل کی حالت کچھ عجیب سی تھی، آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ ہائے! ہم حسرتیں اور خواہشیں توڑتے چلے ہیں اور وہ بھی ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے لیکن — ہاں لیکن مسجد کے یہ مینار اُن دیوانوں کو تلاش کر رہے ہیں جو اپنا خونِ جگر پلا پلا کر اُمّت کی کھیتی کو سینچیں، ملّت کی کھیتی کو پروان چڑھائیں کیونکہ ؎

"نقش ہیں سب ناتمام، خونِ جگر کے بغیر ✤ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر!"

اور اب یہ سامنے امرتسر کا ریلوے اسٹیشن آچکا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ریل یہاں سے سیدھی لاہور جاتی تھی۔ لاہور اور امرتسر کا کوئی فاصلہ ہی نہ تھا۔ دونوں شہروں کی حیثیت — TWIN CITIES کی تھی اور اب ایک لکیر نے بہت ہی زیادہ فاصلے بڑھا دیئے۔ ہم الگ، تم الگ والا معاملہ ہو گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ مشرقی پنجاب کے دیگر اسٹیشنوں کی طرح یہ اسٹیشن بھی مسلمانوں کا مذبح خانہ بن گیا۔ مسلم کے خون کی یہاں وہ ارزانی ہوئی کہ الامان و الحفیظ! چہار طرف خون ہی خون۔ کسی مسلمان کا یہاں سے بخیریت گذرنا ممکن نہ رہا۔ اسپیشل ٹرینیں تہ تیغ کر دی گئیں)۔ پلیٹ فارم خون سے نہا گئے۔ ابلیس ننگا ناچ ناچا اور چشم فلک نے بھی اس منظر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ماحول ہماری یونیورسٹیوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں مکمّل علمی ماحول ہے۔ ایک ایک شعبہ میں یہاں متعدّد پی۔ ایچ۔ ڈی ملیں گے۔ جن میں سے متعدّد علم کے میدان میں قلم کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ یہاں اُستاد پڑھاتے اور لڑکے پڑھتے ہیں، اس طرح نہیں کہ ہمارے ہاں تعلیم کا ایک مذاق بنایا ہوا ہے ۔۔۔ ہماری یونیورسٹیوں کے متعدّد شعبے ایسے ملیں گے جہاں ایک بھی ڈاکٹر نہیں ہوگا۔ دوسری خوبی جو ہمیں یہاں نظر آئی وہ یہاں کی بلا کی سادگی ہے۔ یونیورسٹی کے علاقے میں کار خال خال ہی نظر آتے گی۔ ڈاکٹر، پروفیسر وغیرہ سائیکلوں پر آتے ہیں یا سائیکل رکشاؤں پر۔ "ہم بھی کچھ ہیں" اور رکھ رکھاؤ والی بات یہاں نظر نہیں آئے گی۔ تصنّع نام کو نہیں۔ بقولِ شاعر ؎

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ❊ ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جب کہ ہمارے ہاں تصنّع نے ہر طرف اپنے جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں۔ علم کو وہ سمجھتے بھی ہیں اور علمی شخصیّت کی قدر بھی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی کسی یونیورسٹی نے ڈاکٹر صاحب کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے!"۔۔ لیکن سینکڑوں میل دُور ایک دوسرے ملک کی یونیورسٹی نے ڈاکٹر صاحب کی جو پذیرائی اور عزّت افزائی کی اور انہیں جو اعزاز بخشا حقیقت یہ ہے کہ یہ علی گڑھ یونیورسٹی کے لوگوں کی عظمت کی دلیل ہے، کیونکہ جوہر کی قدر تو جوہری ہی کر سکتا ہے مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اب میں مختصر طور پر ہر روز کی ڈائری پیش کرتا ہوں۔

۴ / فروری بروز پیر | دوپہر کو گھر پہ آرام کرنے کے بعد شام کو بالائے قلعہ غازی عُزیر صاحب سے ملنے اُن کے گھر گئے۔ غازی صاحب سے قارئینِ 'میثاق' واقف ہوں گے کیونکہ اُن کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ علی گڑھ سے وہ بغرضِ ملازمت سعودی عرب جا چکے تھے، لیکن ابھی حال ہی میں اُن کا خط ڈاکٹر صاحب کو لاہور میں ملا تھا جس پر علی گڑھ کا پتہ تحریر تھا۔ یہ سمجھ کر کہ وہ علی گڑھ میں ہوں گے، ہم اُن کے گھر گئے مگر پتہ چلا کہ یہ ہماری غلط فہمی تھی وہ سعودی عرب ہی میں ہیں۔ البتّہ اُن کے والدِ محترم مولانا محمّد امین اثری صاحب سے ملاقات ہو گئی جو خود ایک بڑے عالمِ دین ہیں، مسلکاً اہلِ حدیث ہیں اور جماعتِ اسلامی ہند کے رکن ہیں۔ موصوف کا مضمون بھی 'میثاق' میں شائع ہو چکا ہے۔ وہاں پر خاصی دیر تک ایک نشست رہی جس میں علی گڑھ شہر کے امیرِ جماعت کے علاوہ دو

ہیں۔ امرتسر میں مسلمانوں کے متعدد چائے خانے اور رہائشی ہوٹل ہیں۔ مسلمان کشمیر سے خاصی تعداد میں آگئے ہیں، اس لئے امرتسر کی مساجد بھی آباد ہیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں سواری کے لئے سائیکل رکشہ عام ہیں۔ یہاں تک کہ دہلی میں بھی یہی عام سواری ہے جو خاصی سستی ہے۔ شروع میں بیٹھنے کو طبیعت مشکل ہی سے آمادہ ہوئی۔ یہ دیکھ کر کہ آدمی، آدمی کو کھینچ رہا ہے۔ بہت سے ایسے رکشہ ڈرائیور دیکھے کہ ہڈیوں کا پنجر معلوم ہوتے تھے لیکن رکشہ چلا رہے تھے۔ اُن کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ پاکستان کے بڑے شہروں میں عرصہ ہوا کہ انسانی نقطۂ نگاہ سے یہ سواری قانوناً بند کر دی گئی۔

ٹاٹا نگر ایکسپریس گو خاصی تاخیر سے آئی تھی، لیکن شام کو اپنے وقت کے مطابق ٹھیک سات بجے امرتسر سے واپس روانہ ہو گئی۔ علی گڑھ صبح آٹھ بجے گاڑی پہنچی۔ اسٹیشن پر کوئی لینے نہیں آیا تھا۔ پتہ چلا کہ کل دوپہر دو بجے کا روانہ کردہ ایکسپریس ٹیلیگرام اُن کو نہیں ملا۔ بعد میں آج رات کو پہنچا، گویا پیدل چل کر آرہا ہو۔ یہ تھا یہاں کا ڈاک و تار کا نظام ؛

علی گڑھ میں چھ دن

۴ فروری بروز پیر صبح ۸ بجے ہم لوگ علی گڑھ پہنچے اور ۱۰ فروری کو صبح ۹ بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ گویا علی گڑھ میں ہمارا قیام چھ دن رہا۔ یہ دن اس لحاظ سے نہایت اہم رہے کہ اس دوران وہاں پر خاصا دعوتی کام ہوا۔ صبح فجر کے بعد سے رات کے گیارہ، بارہ بجے تک کا ایک ایک لمحہ ہمارا دعوتی کاموں میں صرف ہوا۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر صاحب کو جو استقبالیہ (RECEPTION) ملا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چلتے وقت سان گمان میں بھی نہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے لیتا ہے اور جن کے دلوں کو کھولنا چاہتا ہے، کھول دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی پُراثر شخصیت نے یہاں کے لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر اپنے ڈیرے ڈال دیئے ہیں اور یہاں کے لوگ بھی کون ؟ ——— یونیورسٹی کے بہت سے اہلِ علم، ڈاکٹر، لیڈر پروفیسر، لیکچرار اور عام طلباء ——— یہاں پر ہمارے کام کا چھوٹا سا ہی سہی ایک BASE بن گیا ہے، اگر مزید کام کیا جائے تو اُمید ہے کہ یہ BASE بڑا ہوتا چلا جائے گا اور اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ یہ چھوٹا سا پودا آئندہ چل کر ایک بڑے اور گھنے درخت میں تبدیل ہو سکتا ہے، جس کی چھاؤں میں سسکتی انسانیت کو امن و سکون ملے ؛

۱۰ فروری بروز منگل | صبح ہی صبح ڈاکٹر احمد سورتی صاحب تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ کے ایک پروفیسر عضد الدین صاحب بھی تشریف لے آئے جو اس سے قبل پاکستان میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کر چکے تھے۔ علمی و دینی مسائل پر دیر تک تبادلۂ خیال جاری رہا ÷

جماعتِ اسلامی ہند نے اپنا ادارۂ تصنیف علی گڑھ میں قائم کیا ہوا ہے، جس کے سربراہ جناب مولانا جلال الدین انصر عمری صاحب ہیں، جو نہ صرف معروف عالمِ دین ہیں بلکہ کئی کتب کے مصنف بھی ہیں۔ کئی حضرات اُن کے معاون ہیں، جن میں جناب سلطان احمد صاحب اصلاحی، جناب محمد اسرار خان اور کشمیر (بارہ مولا) کے ایک نوجوان جناب حامد نسیم ہیں۔ اِن حضرات کو جب ڈاکٹر صاحب کی آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ آج گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب اُن کے ہاں تشریف لائیں۔ وقت کے مطابق ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لے گئے۔ مولانا انصر عمری صاحب اور اُن کے رُفقاء نہایت تپاک سے پیش آئے، ان کے ساتھ بھی دیر تک تبادلۂ خیال جاری رہا ÷

دو پہر دو بجے مولانا محمد امین اثری صاحب ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ آج رات بالائے قلعہ جامع مسجد کے قریب چوراہا چمنن شہید پر انہوں نے ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا تھا، جس کے اصل مقرر ڈاکٹر صاحب تھے، موضوع سیرتِ نبوی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دعوت قبول کر لی۔ ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ مولانا اثری صاحب کو دیا گیا۔ 'میثاق' کے "نقشِ غزل" والے شمارے مطالعہ کے لئے لے گئے ÷

مغرب کے وقت ادارۂ تصنیف جماعتِ اسلامی ہند کے سربراہ مولانا جلال الدین صاحب انصر عمری گھر پر تشریف لے آئے اور مختلف مسائل پر گفتگو فرمائی ÷

عشاء کے بعد بالائے قلعہ جلسے میں جانا تھا۔ اس جلسہ میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مُدیر "البرہان" اور علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک سٹڈیز کے وزٹنگ پروفیسر بھی مدعو تھے۔ منتظمین نے عشاء سے قبل گاڑی بھیج دی تھی۔ جس میں پہلے ڈاکٹر صاحب بیٹھے، پھر گاڑی مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے گھر اُنہیں لینے گئی۔ وہیں ڈاکٹر صاحب مولانا سے ملے۔ مولانا، ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھر دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ عشاء کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ علی گڑھ میں گذشتہ سال کئی بار فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے۔ فضا میں کشیدگی کے معمولی سے اثرات ابھی تک موجود تھے

تین ارکانِ جماعت اور چند دوسرے احباب شریک تھے۔ ملکی، دینی، سیاسی اور جماعتی مسائل پر دیر تک ڈاکٹر صاحب سے تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ معلوم ہوا کہ مولانا محمد امین اثری صاحب 'میثاق' نہایت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے کتابچے بھی مطالعہ کر چکے ہیں اور ہماری دعوت سے خاصے متأثر ہیں۔ ان جیسی بزرگ شخصیت اور سادگی بے پناہ، نہایت شفقت سے پیش آئے۔ انڈیا میں ہم نے یہ محسوس کیا کہ جماعتِ اسلامی کے اکثر لوگوں میں ڈاکٹر صاحب سے متعلق کوئی تعصب نہیں پایا جاتا جیسا کہ یہاں پایا جاتا ہے۔ وہ ہماری بات سنتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی انکشاف ہوا کہ جماعت اور اس سے باہر کا ایک بہت بڑا حلقہ ڈاکٹر صاحب کی ذات سے پہلے سے واقف ہے۔ ڈاکٹر صاحب وہاں کوئی غیر معروف شخصیت نہ تھے۔ علمی حلقوں میں گفتگو کرنے سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کے کتابچے خصوصًا: "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ!" لوگوں نے پڑھی ہوئی ہے۔ "تحریکِ جماعتِ اسلامی" بھی خاصی پھیلی ہے۔ اسی وجہ سے جہاں بھی ڈاکٹر صاحب گئے اور جن لوگوں سے بھی ملے اُن کی اکثریت ڈاکٹر صاحب کے نظریات سے پہلے سے واقف نکلی۔

رات گئے جب گھر واپس آئے تو وہاں دو حضرات ہمارے منتظر تھے (۱) ڈاکٹر احمد سُورتی صاحب، جو یونیورسٹی میں کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ہیں۔ کئی سال تک 'جماعتِ اسلامی' ہند کے رکن رہ چکے تھے۔ لیکن اختلافات کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔ وہاں جا کر ہمیں اندازہ ہوا کہ جماعتِ اسلامی ہند سے بھی بہت سے لوگ اختلافات کی بنا پر علیحدہ ہو چکے ہیں۔ ان میں بہت سی اعلیٰ علمی شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر احمد سورتی کے علاوہ علی گڑھ میں دو اور ایسے حضرات سے ملاقات ہوئی، ان میں سے ایک ہیں ڈاکٹر ابن فرید صاحب اور دوسرے ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی صاحب۔
(۲) جناب اختر الواسع۔ یہ ایک نوجوان ہیں جو اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار ہیں۔ انہوں نے انگریزی میں لکھی ہوئی اپنی ایک کتاب کے دو نسخے بھی ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔

رات دیر تک دونوں حضرات کا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تبادلۂ خیال رہا۔ ڈاکٹر احمد سورتی صاحب کی محبت کا تو یہ حال رہا کہ جب بھی موقع ملتا ڈاکٹر صاحب کے پاس آجاتے۔ گویا اُن سے ملنے کے لئے ہر وقت بے چین ہوں۔

چونکہ زیادہ ہوچکی تھی اس لئے انٹرویو تو نہیں لیا جا سکا، البتہ دونوں حضرات سے تبادلۂ خیالات ہوتا رہا ؛

۷ فروری بروز جمعرات | یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک سٹڈیز کی جانب سے آج صبح گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ حاضرین میں لیکچرار اور پروفیسر حضرات کے علاوہ چار یا پانچ ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ جن میں ڈاکٹر اقبال احمد انصاری صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن ندوی صاحب، ڈاکٹر محمود الحق صاحب کے نام یاد ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر عقد الدین صاحب، پروفیسر اختر الواسع صاحب اور دوسرے پروفیسر حضرات موجود تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ دیر تک سوالات و جوابات کی نشست رہی۔ سب حضرات ڈاکٹر صاحب سے متأثر تھے۔ اُن میں ڈاکٹر محمود الحق صاحب نے جو اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ سے متعلق ہیں لیکن اپنے خیالات کے اعتبار سے مارکسسٹ معلوم ہوتے ہیں، تابڑ توڑ سوالات کرنے شروع کئے، سوالات بھی بے تکے اُلجھے ہوئے۔ ایک سوال کا جواب پورا ہو نہیں پاتا تھا کہ دوسرا سوال شروع کر دیتے تھے۔ آخر کو ڈاکٹر صاحب کو کہنا پڑا کہ کیا آپ میرا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ دراصل وہ صاحب اس طرح ڈاکٹر صاحب کو پریشان کرنا چاہتے تھے لیکن ناکام رہے۔ دوسرے حضرات جو اُن کے خیالات سے واقف تھے، اس صورتِ حال پر پیچ و تاب کھاتے رہے ؛

دوپہر کا کھانا ڈاکٹر صاحب نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب کے ہاں تناول فرمایا۔ مولانا اکبر آبادی صاحب شعبۂ اسلامک سٹڈیز میں وزٹنگ پروفیسر (VISITING PROFESSOR) ہیں۔ ایک بار پاکستان آئے ہوئے تھے۔ ہماری قرآن کانفرنس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر محمد اسلم صاحب ان کو لے آئے۔ چنانچہ موصوف نے بھی اس میں تقریر فرمائی۔ ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی ہماری دعوت مولانا موصوف نے منظور فرمالی ہے ؛

ڈاکٹر احمد سورتی صاحب اس دوران ڈاکٹر صاحب سے برابر ملاقاتیں کرتے رہے۔ موصوف نے ایک سوسائٹی RADICAL SOCIETY کے نام سے بنائی ہے، جس کے آپ صدر ہیں۔ آپ نے آج شام چار بجے ڈاکٹر صاحب کو سوسائٹی کے اجتماع (کینیڈی ہاؤس) میں شرکت کی دعوت دی۔ تقریر کا موضوع تھا:

"PROPECTS OF ISLAMIC REVIVAL"

اس وجہ سے جلسہ کی اجازت بہت مشکل سے ملی۔ جلسہ کی صدارت مفتیٔ شہر مولانا عبدالقیوم صاحب نے کی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب نے مختصر تقریر کی۔ طویل تقریر ڈاکٹر صاحب کی تھی جو بہت پسند کی گئی۔ صدرِ جلسہ پاکستان جاچکے تھے اور ٹیلیویژن پر رمضان المبارک میں ڈاکٹر صاحب کا درسِ قرآن سُنتے رہے تھے، اس لئے نہ صرف پہلے سے واقف بلکہ خاصے متأثر تھے۔

۶ فروری بروز بدھ کل ڈاکٹر صاحب خاصے تھک چکے تھے، اس لئے آج آرام کرنا چاہا۔ لیکن ملاقات کے لئے آنے والے لوگوں کا تانتا بندھا رہا۔ میزبان قاضی عبدالخالق صاحب جو یونیورسٹی میں ڈپٹی رجسٹرار ہیں، انہوں نے ایک بڑے حلقے میں ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرایا۔ جس کسی کو ڈاکٹر صاحب کی آمد کا علم ہوا فوراً ملاقات کے لئے آتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب دینی و علمی سوالات کے جوابات کے ساتھ لوگوں کو اس کام سے متعارف کراتے تھے جو وہ پاکستان میں کر رہے ہیں۔

پاکستان کی اسلامی جمعیت طلباء کی طرح بھارت میں مسلمان طلباء کی جماعت کا نام "سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ" STUDENTS ISLAMIC MOVEMENT (S.I.M.) ہے۔ انہیں بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ آئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے آئے اور ڈاکٹر صاحب کو اپنے مرکز آنے کی دعوت دی۔ اس سلسلہ میں اُن کا ایک باقاعدہ تحریری دعوت نامہ ہمیں کل موصول ہوا۔ بعد نمازِ مغرب بدر باغ میں سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ (S.I.M.) کے مرکز ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے۔ مرکزی اور مقامی ارکان نے ڈاکٹر صاحب کا استقبال کیا۔ تحریکی کاموں وغیرہ کے سلسلہ میں متعدد سوالات کئے گئے، جن میں بعض چبھتے ہوئے سوالات بھی شامل تھے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے نہایت تسلی بخش جوابات دیئے اور اپنے موقف کی بھرپور وضاحت فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ "سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ" کی لائبریری کے لئے پیش کیا گیا۔ ایس آئی ایم۔ کی جانب سے بھی اُن کی کتب کا ایک سیٹ ہمیں دیا گیا۔

رات کو ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر احمد سوسنی صاحب کے مکان پر تشریف لے گئے وہاں پر ہفتہ وار "ہجوم" دہلی کے مُدیر بھی موجود تھے، جو اس سے پہلے گھر پر اپنے پرچے کے لئے ڈاکٹر صاحب کا انٹرویو لینے آچکے تھے، لیکن ملاقات نہ ہوسکی تھی۔ رات

ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ پیش کیا گیا، نیز مولانا محترم کو ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی جو موصوف نے قبول فرمائی ؎

۹ فروری بروز ہفتہ | شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے قائم مقام سربراہ جناب ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صاحب نے آج ناشتہ پر ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا، مفید تبادلۂ خیال ہوا ــــ پرسوں ریڈیکل سوسائٹی (RADICAL SOCIETY) کے اجتماع میں ڈاکٹر صاحب کی تقریر سے متأثر ہو کر ڈاکٹر احمد سورتی صاحب، ڈاکٹر محمد اقبال انصاری صاحب اور چند دوسرے احباب اُسی رات پروگرام بنا کر ڈاکٹر صاحب کے پاس گھر پر تشریف لائے۔ اُن کا پروگرام یہ تھا کہ یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کے اعزاز میں ایک اجتماعِ عام کا اہتمام کیا جائے، جس میں سیرتِ نبوی پر ڈاکٹر صاحب کی تقریر ہو۔ اسی وقت وائس چانسلر صاحب سے رابطہ قائم کیا گیا جنھوں نے نہ صرف اس کی منظوری دی، بلکہ صدارت بھی قبول فرمائی۔ اُسی وقت ہینڈبل اور پوسٹر کی عبارت تیار کی گئی۔ ڈاکٹر احمد سورتی صاحب، ڈاکٹر اقبال انصاری صاحب، چند دیگر احباب اور قاضی عبدالخالق صاحب ڈپٹی رجسٹرار نے بڑھ چڑھ کر سرگرمی سے حصّہ لیا۔ کل ایک دن میں ہینڈبل اور پوسٹر کی طباعت کرائی گئی۔ رات کو کیمپس اور ملحقہ علاقوں میں جگہ جگہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بڑے بڑے پوسٹر چسپاں تھے۔ یونیورسٹی کی جانب سے تمام شعبوں کو سرکلر اور اطلاع نامے بھیجے گئے۔ آج صبح تمام شعبوں میں طلباء میں ہینڈبل تقسیم کئے گئے۔ اس طرح کم وقت میں جتنی پبلسٹی کی جا سکتی تھی، کرنے کی کوشش کی گئی۔ ساڑھے گیارہ بجے یہ جلسہ کینیڈی ہال میں ہونا تھا۔ فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے یہ وسیع و عریض ہال امریکن طرز پر چند سال قبل ہی تعمیر ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آج سے چالیس سال قبل ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں مولانا مودودی مرحوم نے "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟" کے موضوع پر اپنا مشہور مقالہ پڑھا تھا۔ مولانا مودودی مرحوم نے اپنے اس مقالے میں اسلامی حکومت کے قیام کا جو PROCESS بتایا تھا، افسوس کہ وہ اور ان کی جماعت اس سے منحرف ہو گئے۔ مگر ٹھیک چالیس سال کے بعد (جو عقل کی بلوغت کا عرصہ ہوتا ہے) ۱۹۸۰ء میں اسی یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں آج وہ شخص تقریر کرنے والا تھا جو ایک چھوٹے سے قافلے کو ٹھیک اسی راہ پر لے کر جا رہا ہے، جس کی نشاندہی اسی مقام پر

اس سلسلہ میں سوسائٹی کی جانب سے ایک سائیکلو اسٹائل سرکلر یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں بھیجا گیا۔ سوسائٹی کے ارکان یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ ہیں۔ عصر اور مغرب کے مابین ڈاکٹر صاحب کی تقریر ہوئی۔ پروفیسروں اور لیکچرارز کے علاوہ صرف ڈاکٹروں کی تعداد ایک درجن سے کم نہیں ہوگی۔ تقریباً تمام شعبوں کے اساتذہ اس میں شریک تھے۔ تقریر نہایت مدلّل اور اثر انگیز تھی اور علی گڈھ کا علمی حلقہ اس سے بہت متأثر ہوا۔ ؂

جماعتِ اسلامی ہند کے ادارۂ تصنیف کے سربراہ جناب جلال الدّین صاحب انصر عمری نے ڈاکٹر صاحب کو مدعو کیا۔ ادارہ کے رُفقاء کے علاوہ جماعت کے کچھ اور حضرات بھی شریک ہوئے، جن میں جماعتِ اسلامی ہند کے محاسب جناب احسان محمد خاں صاحب اور ڈاکٹر نجات اللہ صدّیقی صاحب کے چھوٹے بھائی جناب احمد اللہ صدّیقی صاحب بھی موجود تھے۔ دیر تک دینی و علمی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ اسلامی تحقیق، اُس کا مدّعا اور طریقِ کار پر ڈاکٹر صاحب سے متعدّد سوالات کئے گئے، جن کے ڈاکٹر صاحب نے تشفّی بخش جوابات دیئے۔ متعدّد اُمور پر ڈاکٹر صاحب سے مشورے بھی حاصل کئے گئے۔ اِس موقع پر ادارۂ تصنیف و تالیف کو ڈاکٹر صاحب کے کتابچوں کا ایک سیٹ پیش کیا گیا ؂

۸ / فروری بروز جمعہ آج بھی متعدّد حضرات ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے تشریف لاتے رہے، جن میں ڈاکٹر معین فاروقی صاحب ریڈر CHEMISTRY DEPTT. اور ڈاکٹر فضل الرّحمن صاحب ندوی اسلامک سٹڈیز ڈیپارٹمنٹ شامل ہیں ـــ جماعتِ اسلامی ہند کے محاسب جناب احسان محمّد خان صاحب نے اپنے گھر پر ڈاکٹر صاحب کو عصرانہ دیا۔ جن میں ادارۂ تصنیف و تالیف کے رُفقاء، جماعتِ اسلامی کے متعدّد ارکان اور یونیورسٹی کے اساتذہ شریک تھے ؂

بعد مغرب مولانا محمّد تقی امینی صاحب (شعبۂ دینیات) سے اُن کے گھر پر ملاقات کی اور نہایت تفصیلی اور مفید گفتگو رہی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کی متعدّد کتابوں کا پہلے سے مطالعہ کر چکے تھے۔ مولانا موصوف خود ایک بلند پایہ مصنّف ہیں، فقہ پر اُن کی کئی کتب ہیں۔ "احتساب" کے نام سے علی گڈھ سے ہفتہ وار پرچہ نکالتے ہیں ـــ جو "صدقِ جدید" کے اسٹائل پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور مولانا موصوف کے خیالات میں رموز، سیاسی اور تحریکی مسائل میں حیرت انگیز مماثلت [illegible]

عکاسی بھی، واقعات بھی تھے اور کرنے کا اصل کام بھی۔ ہوش بھی تھا اور جوش بھی تھا۔ لوگ تھے کہ عش عش کر اُٹھے۔ بہت سے لوگوں کو روتے دیکھا — اور لوگ بھی کون ایک علمی گہوارے کے مکین — تقریر کے بعد وائس چانسلر صاحب نے فرمایا کہ "سیرتِ نبوی ﷺ پر تقریریں تو میں نے بہت سُنی ہیں لیکن اتنی جامع، مربوط، مدلّل اور دلوں کو گرما دینے والی تقریر آج پہلی بار سُنی ہے!" — انہوں نے فرمایا "میرے ذہن میں بہت سے اشکالات تھے، بہت سے سوالات اٹھتے تھے۔ آج ان سب کی وضاحت ہوگئی!"۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے بھی ڈاکٹر صاحب کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا — یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ایک جماعت کے چند نادان دوستوں اور جارحے بڑھے ہوئے جذباتی طلباء نے اس بات کی کوشش کی کہ جلسہ نہ ہونے پائے۔ لیکن الحمد للہ ثمّ الحمد للہ! جلسہ ہماری توقّع سے بہت زیادہ کامیاب رہا ؎

"یہ رتبۂ بلند مِلا جس کو مل گیا!"

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے آج بھی متعدّد حضرات گھر پر تشریف لاتے رہے، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر ابن فرید صاحب، ڈاکٹر فضل الرّحمٰن ندوی صاحب، مولانا محمّد تقی امینی صاحب، پروفیسر عبد الغفّار شکیل صاحب، مولانا محمّد سلطان اصلاحی صاحب، جناب عشرت علی قریشی صاحب (ڈپٹی لائبریرین)

جامعہ ملّیہ دہلی کے ایک استاد جناب رشید الوحیدی صاحب نے بھی کینیڈی ہال کے جلسہ میں شرکت کی۔ وہ بھی تقریر سے انتہائی متاثر ہوئے۔ معلوم ہوا کہ انہیں دہلی میں پتہ چلا تو وہ یہ تقریر سُننے کے لئے خاص طور پر علی گڑھ آئے۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ قیامِ دہلی کے دوران وہ جامعہ ملّیہ میں خطاب فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے قبول فرما لیا، لیکن بدقسمتی سے جمعہ، اتوار، ہفتہ تینوں دن جامعہ ملّیہ میں چھٹی رہی اس لئے خطاب نہ ہو سکا؛

سہ پہر بالائے قلعہ سے مولانا محمّد امین اثری صاحب تشریف لائے اور خواہش ظاہر کی کہ اتوار کو ڈاکٹر صاحب شہر میں ایک اور خطاب فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ کے لئے ہفتہ کی صبح روانہ ہوجانا تھا کیونکہ وہاں پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات کے لئے مولانا علی میاں صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن یونیورسٹی کی انتظامیہ کے اصرار پر کہ ڈاکٹر صاحب کینیڈی ہال میں ہفتہ کو تقریر فرمائیں، ڈاکٹر صاحب نے

مولانا مودودی مرحوم نے کی تھی، مگر خود اس سے منحرف ہو گئے تھے:

ـــ تِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ـــ

کم وقت میں پبلسٹی کے باوجود وسیع وعریض ہال طلباء اور اساتذہ
چکا تھا۔ ساڑھے گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ اسٹیج پر صدارتی
پروفیسر محمد شفیع صاحب وائس چانسلر بیٹھے تھے۔ ان کے ایک جانب ڈاکٹر صاحب
اور دوسری جانب مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب تشریف فرما تھے۔ ڈاکٹر
انصاری صاحب اسٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تلاوت
کے بعد سب سے پہلے وائس چانسلر صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہا
الفاظ میں نہایت جامع تعارف کرایا۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے
ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ وائس چانسلر کے بعد ڈاکٹر اقبال انصاری صا
نے ڈاکٹر صاحب کا تفصیلی تعارف کرایا اور خوب کرایا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب
کو خطاب کی دعوت دی گئی، خطاب کا موضوع تھا: "سیرتِ نبوی کا انقلاب
ڈاکٹر انصاری صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو شروع میں یہ کہہ دیا تھا کہ پو
سے زائد تقریر نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے تقریباً ایک گھنٹہ اتنی اثر انگیز تقریر
کہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے بعد میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کئی بار اس
پر افسوس کا اظہار کیا کہ انہیں وقت کا پابند کیوں کیا گیا۔ ڈاکٹر انصاری کے
میں یہ بات تھی اور اس کا تجربہ بھی تھا کہ دینی موضوعات پر طویل تقریروں سے
اُکتا کر جانا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح جلسہ اکھڑ جاتا ہے، اور وہ ڈ
صاحب کے خطاب کو ایسی "ممکنہ" صورت سے بچانا چاہتے تھے ــ لیکن و
ہوا کہ کسی کا اٹھنا تو درکنار لوگ ایسے بُت بنے بیٹھے سن رہے تھے جیسے ان
کر دیا گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ایک گھنٹہ کی یہ تقریر اُن کی زندگی کی
تاریخی تقریر تھی۔ "چالیس سال" پھر میرے ذہن میں گردش لگا رہے ہیں۔ اس
ایک سرے پر ایک مقالہ اور دوسرے سرے پہ یہ تقریر دونوں نے تاریخ میں
مقام پیدا کر لیا ہے ـــ لیکن کس طرح؟ کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے
ڈاکٹر صاحب کی تقریر میں فکر بھی تھی، فلسفہ بھی تھا، شریعت بھی تھی، اور علاوہ علا

اپنے دین کا سپاہی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ــــــــ!!

کانپور میں ایک دن | کانپور سے مجھ سے ملاقات کے لئے میرا چھوٹا بھائی قاضی عبدالقدیر علی گڑھ ایک روز کے لئے آیا تھا اور ڈاکٹر صاحب کو خاص طور پر دعوت دے گیا تھا کہ وہ کانپور ضرور تشریف لائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ جانا تھا لیکن چونکہ ٹاٹا ایکسپریس لکھنؤ نہیں جاتی تھی، اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا ہمارے ساتھ پہلے وہ کانپور چلیں گے اور وہاں سے بذریعہ بس لکھنؤ جائیں گے۔ کانپور اور لکھنؤ دونوں TWI-CITIES ہیں۔ درمیانی فاصلہ پچاس میل کے قریب ہوگا ؛

۱۰ فروری کی صبح ۹ بجے ہم ٹاٹا نگر ایکسپریس سے کانپور روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر قاضی عبدالخالق، قاضی محمد یونس اور دیگر احباب رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ ہاتھرس، ٹونڈلہ، اٹاوہ ہوتے ہوئے دوپہر کے کوئی دو بجے ہم کانپور پہنچے۔ اسٹیشن پر قاضی عبدالقدیر اور دیگر احباب استقبال کے لئے موجود تھے۔ گھر جا کر کھانا کھایا، آرام کیا اور ڈاکٹر صاحب اور میں شام کو عبدالقدیر کے ہمراہ کانپور کی سیر کو نکلے۔ مولانا حسرت موہانی روڈ پر شہر کا سب سے بارونق بازار ہے۔ اتوار کی وجہ سے بازار بند تھا لیکن دکانوں کے بند دروازوں کے باہر عارضی بازار لگا ہوا تھا۔ یہیں پر وہ مسجد ہے جس کے برابر ہی ایک مندر ہے۔ جہاں قبل تقسیم ہندوؤں نے اس پر شدید احتجاج کیا تھا کہ مسجد کے مینار مندر سے اونچے کیوں بنائے گئے ہیں۔ اس پر عرصہ تک ہنگامہ آرائی رہی۔ اس وقت مسجد کے قریب ہی ہندوؤں کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ جلسہ کیا تھا ایک "جلسی" تھی۔ ایک شامیانہ لگا تھا جس کے نیچے اسٹیج اور اسٹیج کے اوپر مقررین قطار اندر قطار، سامعین ندارد۔ بس یوں سمجھئے کہ دکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے ہوئے لوگ سن رہے تھے، یا پھر "بولتے ہوئے مقرر" کو "خاموش مقرر" سن رہے تھے۔ یوپی اسمبلی میں اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کے خلاف دھواں دھار تقریر ہو رہی تھی۔ لالہ جی کہہ رہے تھے کہ اردو ہمارے بچوں کو پڑھنی پڑے گی جو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ چھوٹا لام، بڑا لام، ہائی جمپ، لانگ جمپ ہمیں سب پڑھنا پڑے گا۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ لالہ جی تقریر اردو کے خلاف کر رہے تھے، لیکن اردو میں کر رہے تھے کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ؛

تقریر دلچسپ تھی، تھوڑی دیر سنی اور ہم آگے بڑھ گئے۔ تین پہیوں پر چلنے والی

لکھنؤ جانے کے لئے ایک دن کی تاخیر کردی۔ اب مزید ایک اور روز تاخیر کرنا ممکن نہ تھا اس لئے ڈاکٹر صاحب نے مولانا محمد امین اثری صاحب سے معذرت چاہی۔ مولینا محمد امین اثری اور ان کے احباب ڈاکٹر صاحب کو مزید سُننا چاہتے تھے۔ ان کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اسی روز بعد نمازِ عشاء پٹھان محلّہ کی جامع مسجد میں جلسہ کا اہتمام کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے سیرتِ طیبہ ؐ پر عام فہم انداز میں تقریر فرمائی۔ موضوع تھا: "اُمت پر نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حقوق!" یونیورسٹی کے ڈپٹی لائبریرین جناب عشرت علی قریشی صاحب (LINGUISTIC DEPTT.) کے ریڈر پروفیسر عبد الغفّار شکیل صاحب اور چند دیگر احباب بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھے۔ سیرتِ مطہرہ ؐ پر آج صبح کی کینیڈی ہال کی تقریر جو اہلِ علم کو مخاطب کر کے کی گئی تھی، اس کا ایک اور انداز تھا اور یہاں پٹھان محلّہ کی جامع مسجد میں عام لوگوں کو تخاطب کا انداز کچھ اور ہی تھا، گویا: "اِک پھول کا مضموں ہو تو سَو رنگ سے باندھوں!"۔۔۔۔۔۔۔۔ والا معاملہ تھا۔

اگلے دن ۱۰ر فروری کو صبح ۹ بجے ڈاکٹر صاحب لکھنؤ جانے کے لئے ٹاٹا نگر ایکسپریس سے عازم کانپور ہو گئے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی صاحب اتنے متأثر تھے کہ فرمانے لگے میں صبح اسٹیشن پر چھوڑنے آؤں گا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُن کے جذبۂ محبت و اخوّت کو دیکھتے ہوئے اُن سے گذارش کی کہ وہ یہ زحمت نہ فرمائیں۔۔۔۔۔۔۔۔!!

لوگوں کی شدید خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب علی گڑھ میں مزید قیام فرمائیں، کیونکہ "سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم!" والا معاملہ تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اپنی شدید مصروفیات کی وجہ سے مزید ٹھہرنے سے قاصر تھے۔ بہرحال وہاں کے احباب نے ڈاکٹر صاحب سے وعدہ لے لیا کہ وہ گاہے گاہے اپنی دعوت کے سلسلے میں علی گڑھ بھی تشریف لاتے رہیں گے!

ان چھ دنوں میں مختلف پروگراموں کے سلسلے میں یوں تو بہت سے حضرات نے اپنے اپنے طور پر بہت کچھ کام کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قاضی عبد الخالق صاحب (ڈپٹی رجسٹرار) اور ان کے برادرِ خورد قاضی محمد یونس صاحب نے اس کام کے لئے شب و روز ایک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو قبول فرمائے، عمل کی توفیق دے اور

وہاں سے دہلی روانگی ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کے لکھنؤ اور دہلی کے قیام کے دوران میرا قیام کانپور اور علی گڑھ میں رہا۔ اس لئے لکھنؤ اور دہلی کی رُوداد جو ڈاکٹر صاحب کی زبانی معلوم ہوئی اس کا اجمالی تذکرہ درج ذیل ہے :

۱۱ر فروری کی صبح لکھنؤ بس سے اتر کر ڈاکٹر صاحب سیدھے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مُدیر "الفرقان" کی قیام گاہ تشریف لے گئے۔ مولانا نعمانی صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی تھی۔ مولانا سے ملاقات کرکے ڈاکٹر صاحب ندوہ تشریف لے گئے اس لئے کہ قیام کا انتظام ندوہ میں کیا گیا تھا۔ ندوہ میں ڈاکٹر صاحب کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ دوپہر کا کھانا ندوہ کے تمام اساتذہ کے ساتھ کھایا۔ کچھ آرام کرنے کے بعد لکھنؤ کی سیر کی اور سی۔ آئی۔ ڈی آفس میں پاسپورٹ کا اندراج کرایا۔ ہندوستان اور پاکستان شاید دُنیا کے منفرد ممالک ہیں جہاں ملک کا ویزا دینے کی بجائے شہروں کا ویزا دیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو تین شہروں سے زیادہ ویزا نہیں دیا جاتا اور شہر میں آمد اور روانگی کا سی آئی ڈی آفس میں اندراج ضروری ہوتا ہے۔ شام کو ڈاکٹر صاحب مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے ملاقات کرنے تشریف لے گئے۔ رات کا کھانا مولانا محترم کے ساتھ تناول فرمایا اور مفید گفتگو کی ؛

مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کو ڈاکٹر صاحب کے بھارت آنے کی خبر مل چکی تھی۔ ندوہ لکھنؤ میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے علی گڑھ یونیورسٹی کے کینیڈی ہال کے جلسہ کی وجہ سے ایک دن کی تاخیر ہوگئی۔ مولانا علی میاں کو رائے بریلی جانا ضروری تھا اس وجہ سے وہ لکھنؤ سے تشریف لے جا چکے تھے ۱۲ر کی صبح ڈاکٹر صاحب مولانا علی میاں سے ملاقات کے لئے رائے بریلی تشریف لے گئے۔ ندوہ کے ناظم جناب مولانا معین اللہ صاحب ندوی بھی اس سفر میں ہمراہ تھے۔ انہوں نے کار کا انتظام کیا تھا۔ مولانا ندوی کے علاوہ اس سفر میں ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی بھی ساتھ تھے۔ ڈاکٹر قریشی صاحب لکھنؤ کے مشہور ہومیو پیتھک معالج ہیں۔ تبلیغ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور انہیں ملی وسیاسی اُمور میں مولانا علی میاں کے مُشیر و معاون کی حیثیت حاصل ہے۔ رائے بریلی لکھنؤ سے پچاس میل دُور ہے ؛

رائے بریلی پہنچ کر ڈاکٹر صاحب نے مولانا علی میاں سے ملاقات کی، پُرانے اور نئے اُمور پر سیر حاصل گفتگو کی۔ مولانا افتخار احمد فریدی صاحب، مُرادآباد سے آئے ہوئے تھے

موٹر رکشہ سے بڑی ایک سواری دیکھی اس میں چھ افراد بیٹھ سکتے ہیں، یوں آٹھ دس تک بھی بٹھائے جاتے ہیں۔ اسے یہاں TEMPO کہتے ہیں۔ کمپنی باغ کے سامنے سے اس میں بیٹھ کر ہم چار میل دور دریائے گنگا کے کنارے TANNERIES کے علاقے میں گئے۔ یہاں پر بہت سی ٹینریاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں کی تجارت پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ نوّے کے قریب ٹینریاں ہیں جن میں پچھتر سے زائد ٹینریاں مسلمانوں کی ہیں۔ ایک ٹینری پر کم و بیش سات، آٹھ کروڑ روپے کا انوسٹمنٹ (INVESTMENT) ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں سے ایک ٹرانسپورٹر حاجی صدّیق صاحب ہیں، جن کی تقریباً اسّی بسیں اور کوئی ایک سو بیس ٹرک چلتے ہیں۔ وہ ٹرانسپورٹ کے بادشاہ کہلاتے ہیں معلوم ہوا کہ بھارت میں مسلمانوں کی معاشی حالت اتنی خراب نہیں جتنی یہاں ہم سمجھتے ہیں — ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک عظیم تبدیلی آئی۔ ان میں ایک نئی عزم و ہمّت پیدا ہوئی ہے۔ ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے اور ملک کے سیاسی ڈھانچے میں اپنے مقام کا احساس پیدا ہوا ہے اور یہ کہ آپ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے اور کسی کی طرف نہ دیکھنے کا ایک نیا احساس جاگا ہے۔ ؛

کانپور بہت بڑا صنعتی شہر ہے، لکڑی اور کپڑے کی تجارت پر بھی مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اُن کی آبادی ایک چوتھائی سے بھی کم ہے۔ دریائے گنگا کے کنارے ایک مزار شریف ہے وہاں پر ہم نے فاتحہ پڑھی اور قریب کی مسجد میں نمازِ عشاء ادا کی۔ رات کو سیر کرتے ہوئے تاخیر سے گھر واپس پہنچے ؛

صبح فجر کی نماز اور ناشتہ کے بعد ڈاکٹر صاحب بذریعہ بس لکھنؤ روانہ ہوگئے اور میں کانپور ہی میں رہا۔ کانپور میں، میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کے چھوٹے بھائی جناب منیر احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات کی جو وہاں پر کاروبار کرتے ہیں "مدرسۃ الاصلاح" کے فارغ التحصیل ایک صاحب جناب قمر الدّین اصلاحی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب بھی تجارت کرتے ہیں۔ دونوں حضرات سے تبادلۂ خیال ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ان حضرات کو اور چند دیگر احباب کو پیش کیا۔ سیرتِ طیبہؐ پر ڈاکٹر صاحب کی تقاریر کے چند ٹیپ میں لے گیا تھا، دو جگہ یہ ٹیپ سُنائے گئے اور یہ ٹیپ وہاں پر چھوڑ دیئے گئے۔ کچھ حضرات اس کی نقل (RE-TAPE) کرنا چاہتے تھے ؛

لکھنؤ میں تین دن | ڈاکٹر صاحب بذریعہ بس کانپور سے لکھنؤ پہنچے۔ تین روز کے

لکھنؤ کا چار باغ کا ریلوے اسٹیشن برّصغیر کے مشہور ترین اور خوبصورت ترین اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب یہاں بھی ساتھ تھے۔ لکھنؤ میل میں ڈاکٹر صاحب کے لئے سیٹ ریزرو تھی جس سے وہ براستہ مُرادآباد، بریلی دہلی کے لئے روانہ ہوئے

دہلی میں چار دن

ڈاکٹر صاحب ۱۴ فروری کو صبح آٹھ بجے دہلی پہنچے مولانا وحید الدّین خان صاحب نے ایک خط میں اپنے ہاں قیام کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ان کے صاحبزادے ثانی اثنین سلمہٗ اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ان کا فلیٹ گلی قاسم جان میں الجمعیّت بلڈنگ میں واقع ہے۔ نہا دھو کر اور ناشتہ کر کے ڈاکٹر صاحب نے ثانی اثنین صاحب کے ساتھ دور کے ایک ننھیال کے عزیز حافظ محمّد عرفان صاحب کے مکان پر حاضری دی۔ یہاں سے جماعت اسلامی ہند کے مرکز تشریف لے گئے جہاں پر قیّم جماعتِ اسلامی ہند جناب افضل حسین صاحب نے آپ کا نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ غیریّت کا کوئی احساس نہ ہونے دیا بلکہ یہ پیشکش کی اور اس پر اصرار بھی کیا کہ ڈاکٹر صاحب جماعت کے مہمان خانہ میں قیام فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کی پیشکش پر شکریہ ادا کیا۔ افضل حسین صاحب نے دوسرے روز بعد نمازِ عصر مرکز جماعت میں ڈاکٹر صاحب کو درسِ قرآن اور بعد نماز عشاء کھانے کی دعوت دی، جسے انہوں نے قبول فرما لیا۔

دوپہر کو تبلیغی جماعت کے مرکز نظام الدّین تشریف لے گئے۔ جماعت کے امیر مولانا انعام الحسن صاحب جو آج ہی بنگلہ دیش کے دورہ سے واپس تشریف لائے تھے اس وقت آرام کر رہے تھے اس دوران ڈاکٹر صاحب نے مولانا عبید اللہ بلیاوی سے ملاقات کی جو نہایت محبّت اور شفقت سے ملے اور اعزاز و اکرام سے پیش آئے۔ وہاں ایک صاحب نے یاد دلایا کہ سی آئی۔ ڈی آفس میں دہلی آنے کا اندراج کرایا ہے کہ نہیں؟ چنانچہ ڈاکٹر صاحب واپس مولانا وحید الدّین صاحب کے مکان پر گئے، پاسپورٹ لیا اور سی۔ آئی۔ ڈی آفس میں اندراج کرایا۔ سی۔ آئی۔ ڈی آفس کے متّصل ہی مسجد عبد النّبی ہے جہاں جمعیّۃ العلماءِ ہند کا مرکزی دفتر واقع ہے۔ اس مسجد پر ہندوؤں نے قبضہ کر لیا تھا۔ مولانا حفظ الرّحمٰن صاحب نے بڑے ہی مجاہدانہ انداز میں اسے واگذار کرایا تھا۔ جمعیّت کے دفتر میں ڈاکٹر صاحب تشریف لے گئے، جہاں جمعیّت کے ناظم مولانا فضیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ صدر جمعیّت مولانا اسعد مدنی صاحب بنگلہ دیش کے

تھے، ان سے بھی یہیں پر ملاقات اور تفصیلی گفتگو ہو گئی۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب کی خواہش اُن سے ملاقات کے لئے مُراد آباد جانے کی تھی۔ مولانا علی میاں نے بہت ہی شفقت اور محبت کا مظاہرہ کیا۔ کوئی بیس گھنٹے اُن کی معیّت میں گذرے ؛

رائے بریلی سے قریب کوئی ایک ڈیڑھ فرلانگ دُور تکیہ شاہ علم اللہ ہے دریائے سئی کے کنارے ہے، ڈاکٹر صاحب وہاں تشریف لے گئے۔ بفضلہ تعالیٰ نمازیں یہیں پڑھیں، قبروں پر فاتحہ پڑھی۔ شاہ علم اللہ صاحب نے جو سید احمد شہیدؒ کے اجداد میں سے تھے، یہاں پر خانقاہ تعمیر کی تھی۔ تین سو برس قبل یہاں جو مسجد تعمیر کی تھی وہ ابھی اسی نقشہ پر موجود ہے۔ اس جگہ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ سیّد احمد شہیدؒ نے بیعت کے بعد یہیں سے سفرِ ہجرت کا آغاز کیا تھا۔ یہیں سے وہ فرزانے اٹھے تھے جو بالاکوٹ کے میدان میں جہاد کرتے ہوئے خاک و خون میں نہلائے گئے

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن ؛ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

۱۴ رفروری کو ناشتہ کے بعد مولانا علی میاں صاحب کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب تنہا سیر کو نکلے۔ بعض باتیں رہ گئی تھیں۔ اس سیر کے دوران ڈاکٹر صاحب نے اُن سے تسلّی بخش حد تک گفتگو کی ؛

ساڑھے دس بجے تک واپس لکھنؤ پہنچ گئے، سیدھے ندوہ اپنی قیام گاہ پہنچے دوپہر کا کھانا اساتذہ کے ساتھ کھایا۔ اساتذہ ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے خواہش مند تھے۔ لیکن ان دنوں طلباء کے امتحانات ہو رہے تھے، اس لئے خطاب نہ ہو سکا۔ تیزی سے وقت میں تیزی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے قابلِ دید مقامات کا ایک چکّر لگایا۔ احمد محمّد علی کا عطر کا کارخانہ بھی دیکھا اور وہاں سے عطر خریدا۔ انہی کے زیرِ اہتمام چلنے والے مدرسہ فرقانیہ کا بھی معائنہ فرمایا۔ اس دوران ڈاکٹر اشتیاق احمد قریشی صاحب ہمراہ تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی آفس جا کر لکھنؤ سے واپسی کا اندراج کرایا ؛

شام کو چار بجے مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کے ساتھ وقت طے تھا۔ وہاں جا کر ڈاکٹر صاحب نے مولانا محترم کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی۔ عالمِ اسلام کو درپیش سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی مسائل زیرِ بحث آئے۔ جماعتِ اسلامی کے ماضی اور حال کے سلسلے میں گفتگو ہوئی اور مستقبل کے اندیشوں پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ مولانا نعمانی صاحب سے ملاقات کر کے ڈاکٹر صاحب [illegible] اسٹیشن روانہ ہو گئے۔

۱۶ر فروری بروز ہفتہ | ڈاکٹر صاحب کی جائے پیدائش حصار ہے جو دہلی سے تقریباً سو میل دُور ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی کے پندرہ سال وہیں گذارے ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے ہنگاموں کے دَوران ڈاکٹر صاحب ایک پیدل قافلہ کے ساتھ خونی دریا کو پار کرتے ہوئے بیس ۲۲ دنوں میں پاکستان پہنچے۔ سلیمانکی ہیڈورکس آپ کا پہلا پڑاؤ تھا۔ اس کے بعد اب پہلی بار ہندوستان [illegible] آمد ہوئی تھی۔ اس لئے فطری طور پر شدید خواہش تھی کہ حصار کو دیکھا جائے۔ چنانچہ ثانی اثنین کے ہمراہ علی الصبح ہی روانہ ہوگئے اور بس کے ذریعہ رہتک مہم اور ہانسی ہوتے ہوئے حصار پہنچے۔ حصار کی آبادی میں آٹھ گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ پہلے وہاں چار ہائی اسکول تھے، اب متعدد کالج اور ایک بڑی زرعی یونیورسٹی بھی ہے۔ حصار اسٹیشن سے متصل اس مکان کو دیکھا جہاں پیدائش ہوئی تھی اور دادا کا انتقال ہوا تھا۔ وہ مکان بحمداللہ اُسی نقشہ پر قائم ہے اور پہلے سے بہت بہتر حالت میں ہے جبکہ ریلوے اسٹیشن کی سیر کی، یہ اسٹیشن کبھی بچپن میں ڈاکٹر صاحب کے کھیل کا میدان ہوتا تھا۔ جس ہائی اسکول میں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی تھی اُسے دیکھا وہ منہدم کر دیا گیا تھا شاید اُس کی جگہ کوئی نئی تعمیر کی جا رہی ہو۔ مسجدیں بہت ابتر حالت میں ہیں، اکثر کو مندر بنا لیا گیا ہے۔ پورے شہر میں کوئی مسلمان گھرانہ موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا وہاں چلنا پھرنا عجیب نظروں سے دیکھا جا رہا تھا، بعض لڑکوں کی طرف سے کچھ فقرے بھی چُست کئے گئے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب جلدی جلدی کچھ مقامات کو دیکھ کر، جو وہ دیکھنا چاہتے تھے سورج گرہن کے وقت سے قبل ہی دہلی اپنی قیام گاہ پر واپس تشریف لے آئے۔ سورج گرہن کے دوران پورے شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کرفیو لگا ہوا ہو۔ ایسا بھی ہندو MYTHOLOGY میں سورج گرہن سے متعلق عجیب غریب باتیں ہیں۔ جن کی وجہ سے ہندو بہت ہی زیادہ سہمے ہوتے تھے واپس آنے پر معلوم ہوا کہ جامعہ ملیہ سے رشید الوحیدی صاحب تشریف لائے تھے۔ انہیں سخت افسوس تھا کہ جمعہ، ہفتہ اور اتوار جامعہ میں چھٹی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے خطاب کا انتظام نہ کیا جا سکا۔ جامعہ ملّیہ سے فون پر بھی ڈاکٹر صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ڈاکٹر صاحب قیامگاہ پر موجود نہ تھے۔ شام کو وحیدالدّین خان صاحب کے ساتھ تفصیلی ملاقات ہوئی :

۱۷ر فروری بروز اتوار | شعیب کوٹی صاحب سابق سیکریٹری مسلم مجلسِ مشاورت نے کوچہ چیلاں کی مسجد خواجہ میر درد میں آج بعد نمازِ فجر ڈاکٹر صاحب کے درسِ قرآن

دورہ پر گئے ہوئے ہیں۔ فضیل صاحب سے مفید تبادلۂ خیالات ہوا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو اگلے روز دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ یہاں سے ڈاکٹر صاحب دوبارہ تبلیغی جماعت کے مرکز نظام الدین تشریف لے گئے۔ مولانا انعام الحسن صاحب سے ملاقات ہوئی انہوں نے اکرام فرمایا اور مدینہ منورہ کی کھجوریں ہدیۃً پیش کیں۔ عشاء کے بعد قیام گاہ پر واپسی ہوئی

۱۵ر فروری بروز جمعہ | صبح مولانا وحید الدین خان صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی جمعہ کی تیاری کرنے کے بعد سائیکل رکشہ میں ڈاکٹر صاحب تنہا اس مکان کو دیکھنے نکلے جس میں تقسیم سے قبل ان کے ماموں صغیر احمد جان صاحب صغیر مرحوم مقیم تھے سنہ ۱۹۴۰ء میں یہیں پہ نانا کا انتقال ہوا تھا، مکان جوں کا توں تھا۔ سفیدی اور رنگ وروغن ختم ہو چکا تھا۔ جمعہ کی نماز مشہورِ زمانہ جامع مسجد میں ادا کی۔ شاہی امام عبد اللہ بخاری صاحب دورے پر تھے، اس لئے نماز ان کے صاحبزادے نے پڑھائی، ان کی قرأت بہت اچھی تھی۔ نماز جمعہ سے قبل ڈاکٹر صاحب ندوۃ المصنفین تشریف لے گئے جہاں مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مدظلہٗ سے ملاقات ہوئی، کچھ دیر تبادلۂ خیال ہوا۔ بعد نمازِ جمعہ جمعیۃ العلماءِ ہند کے مرکز مولانا فضیل صاحب کی دعوت پہ تشریف لے گئے۔ دوپہر کا کھانا یہیں تناول فرمایا۔ یہیں پہ ایک سردار جی سے ملاقات ہوئی جو قرآن مجید کا منظوم ترجمہ گورمکھی زبان میں کر رہے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الرحمٰن کے پہلے رکوع کا ترجمہ سنا جو واقعی بہت عمدہ تھا۔

واپسی پر مولانا وحید الدین خان صاحب کے ہاں مختصر قیلولہ کیا اور پھر اُن کے ہمراہ جماعت اسلامی ہند کے مرکزی دفتر تشریف لے گئے، جہاں وہ درسِ قرآنِ حکیم کے لئے مدعو تھے۔ بعد عصر درسِ قرآن کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے عصر تا مغرب سورۂ صف اور مغرب تا عشاء سورۂ جمعہ کا اجمالی بیان فرمایا۔ آپ نے واضح فرمایا کہ نبی اکرمؐ کی بعثت کا اصل مقصد کیا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے آپؐ نے کیا طریق کار اختیار فرمایا۔ حاضری پچاس ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ جس میں جماعت اسلامی کے مرکزی اسٹاف بشمول مولانا حامد علی صاحب، مولانا افضل حسین صاحب کے علاوہ جماعت کے بہت سے دیگر ارکان موجود تھے۔ امیرِ جماعتِ اسلامی مولانا محمد یوسف صاحب اور مولانا حامد حسین صاحب ایران کے دورہ سے واپس آنے کے بعد آج کل بمبئی اور پھر جنوبی ہند کے دورہ میں مصروف تھے۔ درسِ قرآن کے بعد حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے اور رات گئے واپسی ہوئی

جانب اتاری اور واہگہ پر کسٹم وغیرہ کے مراحل سے فارغ ہو کر ٹیکسی پکڑی اور پیر ۱۸؍ فروری کو گیارہ بج کر پانچ منٹ پر واپس قرآن اکیڈمی پہنچ گئے۔ یعنی ۳؍ فروری کو گیارہ بج کر پانچ منٹ پر روانہ ہوئے تھے اور ۱۸؍ فروری کو اسی وقت واپس پہنچ گئے ____ چند ماہ قبل ایک تبلیغی دورہ ڈاکٹر صاحب نے دیارِ مغرب کا کیا تھا جس میں امریکہ، کینیڈا اور مصر شامل تھے ____ اور دوسرا تبلیغی دورہ بہ مشرق کا ہو گیا اور الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ دونوں دورے توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہے ہے۔ اس کامیابی پر ہمارے سر اپنے ربّ کے حضور جھک گئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دین کی راہ میں ہماری اس سعی کو قبول فرمائے اور ہمیں اس راہ میں مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس لئے کہ دُنیا کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں۔ چہار طرف ایک عظیم تغیّر برپا ہے اور کام کرنے کی جتنی ضرورت آج ہے اتنی ماضی قریب اور شاید ماضی بعید میں بھی پہلے کبھی نہ ہوئی ہوگی " اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے "

بقیہ درسِ قرآن "سورۃ العصر"

کرتے وقت نرمی ہو، نصیحت لٹھ مار نہ ہو۔ بڑی نرمی اور محبّت سے سمجھایا جائے۔ اور جب آپ نے نیکی کو آگے پھیلانے کا کام کیا تو اب اگر کوئی مخالفت کرتا ہے، طعنے دیتا ہے یا برا بھلا کہتا ہے آپ کو نصیحت کرنے کے لئے، تو اُن کی باتوں پر صبر کرنا چاہیئے، وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۔ "وہ آپس میں تلقین کرنے میں صبر کی!"

یہ ہے سورۃ العصر کی تفسیر۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ صحیح معنوں میں قرآن مجید کو سمجھیں اور سمجھائیں اور اس پر عمل کریں اور اپنے تمام انفرادی و اجتماعی کاموں میں اسی کو حکم (جج) بنائیں۔ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۵ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کی تفسیر وقت کی تنگی کی وجہ سے پوری تفصیل کے ساتھ نہیں پیش کی جا سکی۔ کسی دوسرے موقع پہ پیش کی جائے گی۔ اِن شاء اللہ العزیز ____ !!

اَقُوْلُ قَوْلِیْ هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ۝
وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

کا اہتمام کیا تھا۔ اس سلسلے میں ایک روز قبل روزنامہ "الجمعیۃ" اور روزنامہ "دع
میں اعلانات بھی شائع کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے سورۂ حج کے آخری
کا درس دیا جو بہت پسند کیا گیا۔ مولانا وحید الدین خان صاحب بہت ہی متاثر
فرمانے لگے کہ ڈاکٹر صاحب! پاکستان میں آپ کے درس سمجھنے والے مشکل سے چن
افراد نکلیں گے۔ اُمید ہے کہ مولانا "قرآن کانفرنس" میں شرکت کے لئے تشریف لائیں
اُن کی خواہش ہے کہ وہ یہاں ہمارے کام کا بھی مشاہدہ فرمائیں۔

ڈاکٹر صاحب کانپور سے لکھنؤ تشریف لے گئے تھے لیکن میں کانپور ہی سے
۱۴ر فروری کو میں کانپور سے واپس علی گڑھ آیا۔ علی گڑھ اور کانپور کے قیام کے دو
تقریباً تیس افراد کو ڈاکٹر صاحب کا مشہور کتابچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق!" ہد
علی گڑھ کے دوبارہ قیام کے دوران جماعتِ اسلامی ہند کے ادارۂ تصنیف و تالیف
سربراہ جناب مولانا جلال الدین صاحب انصر عمری اور ان کے رفقاء سے ملاقات کی
بلگرامی، جناب عشرت علی قریشی صاحب، مولانا تقی امینی صاحب اور چند دیگر حضرات سے
بھی ملاقات کی گئی۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کے مکان پر حاضری دی گ
ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ۱۷ر فروری کی صبح ایر انڈیا ایکسپریس سے دہلی روانہ ہوا، جہاں
بجے دوپہر پہنچا۔ اہلیہ اور بچّی ساتھ تھے۔ قاضی عبدالخالق صاحب، ان کی اہلیہ (یعنی م
کی بہن) اور چند دیگر احباب دہلی تک چھوڑنے آئے ہوئے تھے۔ ہم سب لوگ ڈاکٹر
صاحب کی قیام گاہ پر پہنچ گئے اور مولانا وحید الدین خان صاحب کے مہمان رہے۔ دو
اور رات کا کھانا اُن کے ہاں کھایا۔ مولانا ہمارے ساتھ بہت ہی محبّت اور شفقت سے پیش
آئے۔ وہ ایسے آدمی ہیں کہ واقعی اُن سے محبّت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شام کو ڈاکٹر
صاحب کے ہمراہ جامع مسجد ہوتے ہوئے جماعتِ اسلامی ہند کے دفتر گئے۔ مولانا افضل
صاحب بہت ہی محبّت سے پیش آئے۔ جماعت کے حلقہ یو پی کے رہنما جناب محمّد شفیع
مونس بھی موجود تھے۔ چائے وغیرہ سے تواضع کی اور مغرب تک تبادلۂ خیال جاری
بعد مغرب قیام گاہ پر واپس آکر اور کھانا کھا کر امرتسر جانے کے لئے دہلی کے اسٹیشن
پہنچے۔ فرنٹیئر میل میں برتھ ریزرو تھیں۔ سوا نو بجے فرنٹیئر میل روانہ ہوئی اور صبح سات
بج کر پچیس منٹ پر یعنی صرف پانچ منٹ تاخیر سے امرتسر کے اسٹیشن پر پہنچے۔ اٹاری کے
لئے ٹیکسی کرائے پر لی، ایک مسلمان کے ہوٹل پر ناشتہ کیا۔ بھارت اور پاکستان ک

یادِ رفتگاں

مولانا مودودی کے بارے میں مرحوم ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک انٹرویو

جو جناب فضل عظیم نمائندہ "قومی ڈائجسٹ" نے حاصل کیا!

سوال: آپ نے ۱۹۴۸ء سے جماعت اسلامی کے لئے سرگرمی سے کام آغاز کیا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۴ء تک اسلامی جمعیتِ طلبہ کے رکن بلکہ اسی زمانے میں ناظمِ اعلیٰ بھی رہے۔ آپ یہ فرمائیے کہ مولینا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی سے آپ کب اور کیونکر متأثر ہوئے؟

جواب: مولینا مودودی سے میرا اوّلین تعارف تو اسی زمانے میں ہوگیا تھا، جب میں حصار میں گورنمنٹ ہائی سکول کا طالب علم تھا۔ ان دنوں میرا عملی تعلق تو مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے تھا، اور میں ضلع حصار کی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا جنرل سیکرٹری تھا، لیکن مولانا مودودی کے بھی کچھ کتابچے پڑھنے میں آئے۔ اور میں نے اپنے دل میں ان کی جانب کشش محسوس کی۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب ان دنوں میکلیگن کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے۔ وہ جب چھٹیوں میں آتے تو میں انہیں مولانا مودودی کی کتب بڑے انہماک سے پڑھتے دیکھتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ان کتب کے مفصّل نوٹس بھی تیار کرتے۔ دوسری طرف میں اپنے سکول کے ماحول، سٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم لیگ کے حلقوں میں یہ دیکھتا کہ مولانا مودودی کو بڑی تیز و تند تنقید کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ یہ ۴۷-۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ جو کچھ میں اب عرض کرنے لگا ہوں وہ کچھ اچھا تو نہیں لگتا، لیکن اس دَور کے حالات کے بیان کے سلسلے میں ناگزیر ہے کہ میرے ایک ساتھی مولانا کو مودودی کی بجائے مردودی کہا کرتے تھے۔ اس پر میری ان سے جھڑپ ہو جاتی تھی۔ اگرچہ میں عملاً مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے وابستہ تھا، اور تحریک پاکستان کے لئے اپنی بساط کے مطابق کام کر رہا تھا، لیکن میں مولانا مودودی کا دفاع کیا کرتا

ہندوستان سے ایک خط

شعبۂ علومِ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ — انڈیا

جنابِ من : سلام و تحیات !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجوزہ ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس لاہور شرکت کا دعوت نامہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے سیکرٹری اور ڈپٹی رجسٹرار جناب عبدالخالق قاضی کے توسط سے ملا۔ جس کے لئے میں آپ کا انتہائی ممنون و مشکور

آپ کی یہ انجمن قرآن مجید کی حکیمانہ تعلیمات کی تشہیر و اشاعت کے کام کو جس جذبۂ صادق اور اعلیٰ پیمانہ پر انجام دے رہی ہے اس کے لئے آپ میری اور مسلمانا کی جانب سے لائق صد مبارک باد ہیں اور اس کارِ خیر کے لئے بارگاہِ ایزدی میں یقیناً کے مستحق ہوں گے۔ اِنْ شاء اللہ تعالیٰ ۔

علی گڑھ میں آپ کے مختصر قیام کے دوران آپ سے اپنی حاضری کے موقع پر جو با گفتگو ہوئی۔ میپر ریڈ میکلسٹ سوسائٹی کے اجتماعِ خاص اور کینیڈی ہال میں یونیورسٹی اہتمام آپ کے خطابِ عام کے نقوش ابھی تک دل و دماغ پر مرتسم ہیں۔ آپ نے اپنے میں "سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلابی پہلو" پر جس مدلل، دلنشیں اور علمی اندا روشنی ڈالی وہ میرے جیسے اسلامیات کے طالب علم کے لئے بڑی مفید اور متاثر کن ادھر آپ کی عنایت کی ہوئی چند تصانیف سے بھی استفادہ کر رہا ہوں۔ خدا ایسے بزرگ و سب کی زندگی کو "صبغۃ اللہ" کی رنگینی عطا فرمائے، اور قرآن سے حقیقی معنوں علمی و عملی محاذ پر استفادہ کی توفیق بخشے، آمین ۔

آپ کی مجوزہ ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس لاہور میں شرکت سے مجھے بے حد ہوگی۔ کیونکہ یہ میرے لئے بحیثیت مسلمان سعادت اور اسلامیات کے طالب علم کی حیثیت انتہائی فائدے کا باعث ہوگی۔ اس لئے میں اس موقع پر ضرور حاضری دوں گا۔ آپ سے گ ہے کہ آپ براہِ کرم مجھے جلد از جلد اجلاس کے موضوعات اور دیگر تفاصیل سے آگاہ عنایت ہوگی۔ تاکہ میں کانفرنس کے لئے اپنا مقالہ تیار کر سکوں ۔

اس سلسلے میں اگر کوئی خدمت میرے لائق یہاں کیلئے ہو تو ضرور مطلع فرمائیں مجھے خوشی ہو گ کہ آپ مع اربابِ انجمن کے بخیر ہوں گے ! والسلام مع الاکرام : نیاز مند (ڈاکٹر) اختر

کام" کے عنوان سے اسلامی جمعیت طلبہ کے دعوتی لٹریچر کا اب بھی ایک اہم حصّہ ہے۔
یوں روابط بڑھتے چلے گئے اور مولانا بھی مجھ پر زیادہ سے زیادہ شفقت فرمانے لگے۔ مولانا طلبہ کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ان دنوں لاہور میں جمعیت قائم تو تھی، لیکن فعال نہ تھی۔ یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ پنجاب میں بالعموم اور لاہور میں بالخصوص اسلامی جمعیت طلبہ کا عوامی دور شروع کرنے والا طالب علم میں ہی تھا۔ اگرچہ اس دور کا عوامی مرحلہ بہت محدود تھا۔ لیکن جمعیت کو جمود کی کیفیت سے نکال کر فعالیت کی طرف بڑھانے میں میری کوششوں کو زیادہ دخل تھا۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ مولانا مودودی کی تصانیف سے مجھے ایسا شغف ہوا کہ میں نے ان کا بغور مطالعہ کیا۔ اور میں نے بہت جلد مولانا کی تمام تصانیف پڑھ لیں۔ یہ شاید مناسبتِ ذہنی کی وجہ سے تھا کہ میں نے ان کتابوں کو ہضم کیا اور مولانا کے استدلال کا جو نہج تھا وہ بھی میرے ذہن نے محفوظ کر لیا۔ مولانا کی تحریروں میں بالخصوص ایک تحریکیت تھی، اور دین کا ایک ہمہ گیر تصور، ایک انقلابی تصور تھا۔ اور انہی پہلوؤں کی طرف میں خصوصیت سے متوجّہ ہوا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں مولانا کی تصانیف کا حافظ ہوگیا۔ اس حد تک کہ جمعیت یا ایسی ہی مختلف تقریبات میں اُن کے درس کی ذمّہ داری مجھ پر تھی۔ اجتماعی مطالعے کے ضمن میں تو میں یہ سمجھتا تھا اور دیگر لوگ بھی مجھے یہ تاثّر دیتے تھے کہ میں نے ان کتابوں کو نہ صرف خود بھی سمجھ لیا، بلکہ مجھ میں دوسروں کو سمجھانے کی استعداد بھی پیدا ہوگئی ہے۔

س : اپنی تحریروں کے علاوہ مولانا نوجوان ذہن کی تربیت کیسے کرتے تھے، اور نوجوانوں کے اچھّے کاموں کو کیسے سراہتے تھے، اور اُن کی غلطیوں پر کیسے سمجھاتے تھے، اور فہمائش کرتے تھے؟

ج : اصل میں اب یہ معاملات اتنے پُرانے ہوگئے کہ میں اس سوال کا جواب زیادہ تفصیل سے نہیں دے سکتا۔ البتّہ یہ تاثّر سا ذہن میں اب تک محفوظ ہے کہ مولانا نوجوانوں سے انتہائی مشفقانہ انداز برتتے تھے۔ نوجوانوں کو خاص طور پر یہ احساس ہوتا تھا کہ مولانا اپنے اور نوجوانوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہنے دیتے۔ نوجوان بڑی آزادی کے ساتھ جو چاہتے سوال کرتے اور ان محفلوں میں ہلکی پھلکی گفتگو (LIGHT TALK) کا عنصر بھی شامل ہوتا تھا۔ نوجوان کوئی ثقالت یا بوجھل پن محسوس نہ کرتے تھے۔ میں نے دو مرتبہ اسلامی جمعیت طلبہ کے تحت تربیت گاہیں منعقد کیں، اور دونوں مرتبہ میں ہی ان کا ناظم تھا۔ ان میں مولانا مودودی نے

تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان میں بالعموم اور مشرقی پنجاب میں بالخصوص مسلمانوں کے
قتلِ عام کا سلسلہ شروع ہوا تو میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ بلکہ ۱۲ر جولائی ۱۹۴۷ء کو
نتیجہ بھی نکل آیا تھا۔ ہمارے ہاں عید الفطر کے فوراً بعد ہندوؤں کے حملے شروع ہوئے، اور
تقریباً ڈیڑھ ماہ ہم نے حصار میں محصور ہو کر بسر کئے۔ بھائی جان نجینئرنگ کے سالِ آخر کا امتحان
کر واپس آ چکے تھے۔ ان دنوں ہم دونوں نے مشترکہ طور پر مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن
کی کچھ اقساط کا مطالعہ کیا جو "ترجمان القرآن" میں شائع ہوئی تھیں۔ اگرچہ بھائی جان عمر
میں بھی مجھ سے بڑے تھے اور تعلیم میں بھی مجھ سے آگے تھے۔ لیکن عربی زبان پر مجھے اُن کی نسبت
زیادہ دسترس حاصل تھی کیونکہ میں نے میٹرک میں عربی زبان کا مضمون لے رکھا تھا اور مجھے
اس سے خاصا شغف تھا۔ ہم محلّے کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور اکٹھے مل کر تفہیم کا مطالعہ کرتے
قرآن مجید سے میرا پہلا علمی تعارف تفہیم القرآن کی اقساط سے ہوا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ
اُن دنوں اِن میں سورۂ یوسف کی تفسیر شائع ہو رہی تھی، پاکستان آنے پر میں نے گورنمنٹ
کالج لاہور میں ایف۔ ایس۔ سی میں داخلہ لیا۔ ان دنوں میرا قیام کرشن نگر میں اپنے ایک
عزیز کے ہاں تھا۔ اس محلّے میں ایک حلقہ ہمدردانِ جماعتِ اسلامی قائم ہوا۔ اس حلقے کے
قیام میں میں نے بڑھ چڑھ حصہ لیا۔ اب جماعتِ اسلامی اور مسلم لیگ میں قبل از تقسیمِ ملک کا تضاد
اگر کوئی تھا، تو ختم ہو چکا تھا۔ کیونکہ میرے ذہن میں تحریکِ پاکستان کا منطقی نتیجہ تو اسلامی نظام
کا قیام تھا۔ اصولی طور پر دونوں میں مطمحِ نظر کا فرق مٹ چکا تھا۔

جب میں ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے لئے میڈیکل کالج میں داخل ہوا تو ہاسٹل میں منتقل
ہو گیا اور یہاں اسلامی جمعیتِ طلبہ سے میرا تعلق قائم ہوا۔ ان دنوں یہ چھوٹی سی تنظیم تھی،
اس لئے مجھ جیسے ناکارہ لوگوں کو بھی شاید کچھ جلدی سے آگے بڑھنے کا موقع مل
گیا۔ میں ایک سال تک میڈیکل کالج کی جمعیت کا ناظم رہا، اور دوسرے سال جمعیتِ لاہور
اور جمعیتِ پنجاب کا ناظم بن گیا، اور پھر پوری جمعیت کا ناظم ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا
مودودی سے میرا قریبی ربط رہا۔ ان سے اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہوا کہ رات کے
گیارہ بجے میں کسی مشورے کے لئے حاضر ہوا، اور مولانا کی خوابگاہ میں ملاقات ہوئی۔ مولانا
بڑی شفقت فرماتے تھے۔ میں جب پنجاب کی جمعیت کا ناظم تھا تو میں نے جنوری یا فروری ۱۹۵۲ء
میں حرکت علی ؓ اسلامیہ ہال میں ایک تقریر کی جسے مولانا نے بہت پسند فرمایا تھا۔ یہ تقریر "ہم اور ہمارا

س :- جن دنوں مولانا ملتان جیل میں نظر بند تھے، آپ کی ان سے ملاقات ہوئی تھی، اس ملاقات میں مولانا سے آپ کی کیا گفتگو ہوئی؟

ج : یہ قدرے تفصیل طلب سوال ہے۔ میں نے اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب جماعت کی باقاعدہ رکنیت اختیار کی تو اس سے کچھ پہلے ہی، طالب علمی کے آخری ایام میں کچھ اس طرح کا سوال ہمارے سامنے آیا کہ یہ طریق کار جس پر جماعت اسلامی عمل پیرا ہے، صحیح اور نتیجہ خیز بھی ہے یا اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ جماعت اسلامی نے پاکستان میں اپنی جدّوجہد کو ابتداءً دو چیزوں پر مرتکز کیا تھا۔ ایک یہ کہ اس ملک کا دستور اسلامی خطوط پر بنے تاکہ پاکستان ابتدا ہی سے کم از کم نظری خطوط پر اسلامی ریاست دکھائی دے اور لادینی ریاست کی صورت اختیار نہ کر پائے۔ دوسرے یہ کوشش کی جائے کہ یہاں اقتدار پر ایسے لوگ فائز ہوں، جو نہ صرف دین کے قیام کے دعویدار ہوں بلکہ اس کے لئے دل سے خواہش مند بھی ہوں اور پھر یہ بھی ہو کہ وہ ضروری صلاحیتوں سے بہرہ ور بھی ہوں۔ جہاں تک پہلی کوشش کا تعلق ہے، اگرچہ اس کے لئے طویل جدّوجہد اور مطالبات سب کچھ ہوتا رہا لیکن سات سال کی محنت کا نتیجہ بھی سامنے نہیں آرہا تھا۔ ساتھ ہی یہ ہوا کہ جماعت اسلامی نے ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے انتخابات میں حصّہ لیا، تو اس کا نتیجہ بھی مایوس کن نکلا۔ ظاہر ہے کہ لوگوں نے یہ بات سوچنا شروع کی کہ آیا ہماری بنیادی اپروچ میں کوئی خرابی تو نہیں اور آیا جس پالیسی پر ہم گامزن ہیں، اس پر نظر ثانی کی ضرورت تو نہیں۔ اس ضمن میں میرے پیش نظر وہ سوال بھی تھا جو کسی صاحب نے مولانا سے کیا تھا، اور مولانا کا وہ باقاعدہ جواب بھی تھا جو "ترجمان القرآن" میں چھپا تھا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ تحریک پاکستان میں مولانا نے اور جماعت اسلامی نے حصّہ نہیں لیا تھا۔ اس وقت ان کا موقف یہ تھا کہ جب تک نیچے سے معاشرے کی اصلاح کا عمل جاری نہ ہو، اوپر کی سطح پر تبدیلی رُونما نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اسلامی انقلاب لانے کے لئے اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ استعمال کیا گیا تو وہ بار آور نہ ہو گا۔ اب یہاں آکر کچھ یوں محسوس ہوا کہ نیچے کی سطح سے تبدیلی کی بجائے اوپر کی سطح سے تبدیلی کا مختصر اور آسان نسخہ (شارٹ کٹ) بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ اس لئے ملتان جیل میں مولانا سے جب میں نے ملاقات کی تو اس وقت یہ مسئلہ بڑی شدّت کے ساتھ میرے ذہن میں تھا۔ میں نے اس پر بہت

ہمیں حدیث کا درس دیا تھا۔ درس کے دوران اور اس کے علاوہ بھی شام کے اوقات میں حصولِ معلومات کے لئے سوال و جواب ہوتے تھے۔ ماحول میں گھٹن کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ نوجوان کھل کر بات کرتے تھے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مولانا زیادہ فراخدلی سے ساتھ نوجوانوں کی تعریف نہ کرتے تھے۔ تحسین فرماتے تو نپے تلے انداز میں۔ شاید اس میں احتیاط کا یہ پہلو ہو کہ کوئی نوجوان اپنے بارے میں کسی غلط فہمی، کسی زعم میں مبتلا نہ ہو جائے۔ جہاں تک فہمائش یا روکنے ٹوکنے کا تعلق ہے، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ نوجوانوں نے مولانا کی روک ٹوک کو کبھی برا محسوس کیا ہو۔ اس کے برعکس ہمارے بعض دوسرے مربّین اور مدرّسین کے معاملے میں یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ جب ناراض بھی ہوتے تو اُن کی ناراضگی حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جاتی اور اگر تعریف پہ آتے تو افراط سے کام لیتے۔ اس کے برعکس مولانا بہت میانہ روی اختیار کرتے تھے۔

س : نوجوان طلباء کے نزدیک مولانا کی نمایاں ترین صفت کون سی تھی؟

ج : اس سوال کے جواب میں، مَیں طلباء کی نمائندگی کرنے کا تو مدّعی نہیں ہو سکتا۔ البتہ مَیں اپنا نقطۂ نظر بیان کر سکتا ہوں۔ جیسا کہ مَیں نے پہلے بھی عرض کیا میرے نزدیک مولانا کی تحریروں کے ذریعے دین کی دعوت کا انقلابی پہلو، دین کا اجتماعی تصوّر سب سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ جہاں تک دین کے انفرادی تصوّر اور ذاتی زہد و تقویٰ کا تعلق ہے تو یہ نہ صرف ہمارے معاشرے میں پہلے بھی موجود تھا۔ بلکہ جہاں تک افراد کا تعلق ہے، ہمارے ہاں بہت اعلیٰ نمونے پہلے ہی پائے جاتے تھے۔ آج تو اس طرح کے نمونوں کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔ مولانا مودودی نے جو بات پیش کی وہ ایک اجتماعی تصوّر تھا کہ دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اور دین پوری زندگی پر غلبہ حاصل نہ کرے، اُس وقت تک منشائے خداوندی پورا نہ ہو گا۔ اور اس مقصد کے لئے ایک منظم جدّوجہد کی ضرورت ہے۔ اسے آپ تحریک، دعوت یا دعوتِ اسلامی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہرحال یہ وہ پہلو تھا جو ہمارے خیال میں کافی عرصے تک اوجھل رہا تھا۔ اور اس بات کو ایک طویل عرصہ کے بعد پوری وضاحت کے ساتھ مولانا مودودی نے پیش کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے لئے انہوں نے عملی جدّوجہد اور ایک منظم کوشش کا آغاز کیا۔ میرے نزدیک، اور مَیں سمجھتا ہوں اس وقت کے نوجوان طلباء کے نزدیک مولانا کی شخصیت کا یہی نمایاں ترین پہلو تھا۔

بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
آسودۂ ساحل تو ہے مگر، شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں!
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوتے ہیں
جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

علاوہ ازیں رئیس امروہوی صاحب کا ایک قطعہ 'جنگ' میں شائع ہوا تھا۔ اُسے بھی میں نے 'عزم' میں بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا، لیکن اس تصرف کے ساتھ کہ رئیسؔ تخلص کے نیچے زیر لگا کر میں نے مفہوم حسبِ حال بنا دیا تھا۔ قطعہ یہ ہے:

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے ٭ بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے!
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی، فلاکتوں کے نشان باقی ٭ قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے!
رئیسِ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں ٭ جسے سمجھتے ہو آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

س : ڈاکٹر صاحب! آپ نے اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک رہ کر کیا کھویا اور کیا پایا؟

ج : اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک ہو کر میں نے کھویا کچھ نہیں، پایا ہی پایا ہے۔ ویسے دُنیوی اعتبار سے کہا جائے تو بہت کچھ کھویا بھی، لیکن میں اسے کھونا نہیں بلکہ پانا ہی پانا سمجھتا ہوں۔

س : یعنی اس زمانے میں آپ اپنی تعلیم پر زیادہ توجہ نہ دے سکے؟

ج : جی ہاں! جدید اکاؤنٹنگ (ACCOUNTING) دُہرے اُصول پر مبنی ہے، یعنی ہر کریڈٹ (CREDIT) کے مقابلے پر ڈیبٹ (DEBIT) لازماً ہوتا ہے۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو میرے کھاتے میں ڈیبٹ ہی کا اندراج ہوا ہے۔ یعنی یہ کیفیت ڈاکٹر میرا کیریئر (CAREER) جتنا شاندار ہونا چاہیئے تھا، اتنا نہ ہو سکا۔ میں طالب علمی کے دور میں ذہین اور محنتی طلبہ کی صف میں شامل تھا۔ پرائمری جماعت میں مجھے وظیفہ ملا، مڈل

سوچا تھا، اور میری خواہش تھی کہ میں اس مسئلے پر مولانا سے مفصّل تبادلۂ خیال کر لوں۔ تاہم میں ایسا نہ کر پایا، کیونکہ ایک تو ملاقات کے لئے وقت مختصر سا تھا، اور دوسرے مولینا سے ملاقات کرنے والے اور بھی ساتھی تھے۔ اندریں حالات میں مولانا سے صرف ایک سوال ہی پوچھ پایا کہ "مولانا قیامِ پاکستان کے بعد آپ نے یہاں اسلامی انقلاب لانے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، کیا آپ اس پر اب بھی عمل پیرا رہنے کا فیصلہ کئے ہوئے ہیں، یا کچھ نظرِ ثانی کر کے تقسیمِ ملک سے پہلے کے طریقِ کار کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں" مولانا کا جواب بہت مختصر تھا۔ "ابھی موجودہ طریقِ کار کے لئے دروازے بند نہیں ہو رہا"۔ اس سے ایک تو یہ بات سامنے آئی کہ خود مولانا کو ان دو جُداگانہ طریقِ کار کا اعتراف تھا۔ دوسرے یہ کہ مولانا نئے طریقِ کار کے بارے میں کچھ زیادہ پُرامید نہ تھے اگرچہ وہ اس سے ابھی قطعی مایوس بھی نہ ہوئے تھے۔ میں نے اپنے سوال کے اس مختصر جواب پر ہی اکتفا کیا۔ اس سے زیادہ دلیل اور حُجّت کا نہ اس مختصر ملاقات میں موقع تھا اور نہ ضرورت اور نہ ہی میرا یہ مقام تھا۔ کہ اس سے زیادہ بحث کر سکتا۔

س : ۱۹۵۳ء میں مولانا کو فوجی عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ اُس وقت آپ اسلامی جمعیّت الطلبہ کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ پھانسی کی سزا کی خبر سن کر آپ کے کیا تأثرات تھے؟ ج : تأثرات کا اندازہ تو آپ خوب لگا سکتے ہیں، اس لئے کہ ۱۹۵۳ء میں ابھی میرا وہ اختلافی ذہن نہیں بنا تھا، جس کا میں نے اس سے پہلے سوال کے جواب میں ذکر کیا ہے۔ ان دنوں ہماری جماعت اور تحریک نئے طریقِ کار پر شدّت اور یکسوئی کے ساتھ سرگرمِ عمل تھی۔ ہماری نگاہوں میں مولانا مودودی کا جو مقام اور مرتبہ تھا اسے اس پس منظر میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک داعئ حق، داعئ دین اور خادمِ رسول اللہ کو پھانسی کی سزا دینے پر جس قسم کے جذبات ہو سکتے ہیں، وہی میرے جذبات تھے۔ میں اسلامی جمعیّت طلبہ کا فعّال کارکن تھا اور جمعیّت کے زیرِ اہتمام ہم 'عزم' کے نام سے ایک ہفتہ وار یا شاید پندرہ روزہ پرچہ نکالتے تھے، میں اس پرچے کا مدیر بھی تھا۔ ان دنوں کے دو تین شمارے میرے احساسات کی پُوری پُوری ترجمانی کرتے ہیں کیونکہ میں نے ہی ان شماروں کو مرتب کیا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ ایک تو بڑے طمطراق کے ساتھ میں نے جگرؔ مرادآبادی مرحوم کی یہ غزل شائع کی تھی ؎

یہ صحن و رَوِش یہ لالہ و گُل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جُنوں کے پردے میں تعمیرِ گُلستاں ہوتے ہیں

ہی اُجاگر ہوئی ہیں ـــــ مختصر یہ کہ جمعیت سے تعلق کے باعث مجھے دین کا جو تصوّر ملا، جدّوجہد کا جو جذبہ مجھ میں پیدا ہوا، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے بندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ معمولی سے معمولی خسارے کی نسبت مجھے مجموعی اعتبار سے بہت زیادہ فائدہ ہوا۔

س : مولانا کی نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی سے ایک زمانہ واقف ہے۔ اِس ضمن میں اگر آپ کو دو، تین واقعات یاد ہوں تو براہِ کرم ہمیں بھی سُنا دیجئے!

ج : اس کے لئے ذہن پر زور دینا ہوگا۔ ویسے جمعیت طلبہ کی تربیت گاہوں کے دوران تو اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے رہے۔ ہاں! مجھے یاد آیا، تربیت گاہ کا آخری دن تھا اور ہم نے اساتذہ کی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ مَیں نے مولانا مودودی سے گذارش کی، مولینا! کل کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا۔ جواب ملا، ٹھیک ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی پوچھا: پھر مَیں بھی کچھ لے کر آؤں۔ مجھے کچھ لینے ہی سوجھا اور مَیں بولا، مولانا! ہم مرغی پکا رہے ہیں۔ آپ کوئی مقابلے کی چیز لے کر آئیے۔ مولانا نے سوچ کر فرمایا کہ مرغی کے مقابلے کی چیز تو بلی ہے۔ اس پر محفل زعفران زار بن گئی۔

ایک مرتبہ ہم نے اُن سے یہ کہا کہ مولانا! اپنے کچھ حالاتِ زندگی آکر بتائیے گا۔ اِس کے لئے ہم نے ایک باقاعدہ نشست رکھی تھی، اور مولانا نے بڑی فراخدلی سے اپنے حالاتِ زندگی سنائے بھی تھے۔ خیر ہمیں فوراً جواب ملا تھا۔ کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مَیں اپنا مولود شریف خود پڑھوں۔

س : مولانا کے خالص علمی اور تحقیقی کام کے بارے میں آپ کی رائے؟

ج : جیسا کہ مَیں عرض کر چکا ہوں، میرے نزدیک مولانا کا اصل مقام ایک داعی کا ہے، تحقیق کا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کچھ غلط سا رواج ہو گیا ہے، کہ اگر کسی شخص سے محبت ہو تو پھر جب تک اُس کے ہر پہلو کو کامل ثابت نہ کیا جائے، چین نہیں آتا۔ حالانکہ اگر کوئی شخص کسی ایک شعبے میں کوئی نمایاں کام سرانجام دے دے تو یہ بھی اُس کی عظمت کیلئے کافی ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں انسان کو یا تو مجموعی طور پر ٹھکرا دیا جاتا ہے ــــــ WHOLE SALE CONDEMNATION ہوتی ہے" یا پھر اسے تمام صفات، تمام عظمتوں کا حامل قرار دیا جاتا ہے! لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک چیز واضح کر دوں۔ آپ کو مخالفت اور اختلاف کے فرق کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ مَیں مولانا کا مخالف نہیں، البتہ اختلاف کا حق تو مجھے

میں بھی میں نے وظیفہ حاصل کیا۔ میٹرک میں میری پوزیشن مشترکہ پنجاب میں چوتھی تھی۔ ایف
ایس۔سی میں بھی میں نے وظیفہ حاصل کیا۔ میڈیکل کالج کے سال اوّل میں، میں فرسٹ تھا
چنانچہ سیکنڈ ائیر میڈیکل کالج میں میرے پاس دو سکالرشپ تھے۔ ایک ایف۔ایس۔سی کی
بنیاد پر اور دوسرا فرسٹ ائیر میڈیکل کالج کے امتحان کی بنیاد پر۔ اس کے بعد توجّہ منقسم
ہو گئی۔ منقسم کا لفظ بھی صحیح نہیں ہوگا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ میری ساری نہیں تو اکثر و بیشتر توجہ
تحریک اور دعوت پر مرتکز ہو کر رہ گئی۔ ماضی کی سو فیصد کے مقابلے میں اب تعلیم پہ میری توجہ
فقط دس یا پندرہ فیصد رہ گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے، لیکن یہ اللہ کا فضل ہے کہ کسی امتحان میں ناکامی
میرے تعلیمی ریکارڈ پر موجود نہیں۔ بہرحال ڈاکٹری کا پیشہ جس وابستگی اور توجّہ کا متقاضی
تھا، وہ میں اُسے نہ دے سکا۔ چنانچہ یہ ڈیبٹ (D E B I T) اندراج تھا، لیکن مجھے اس
پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے پر کریڈٹ (C R E D I T) کے خانے میں اندراج میرے
نزدیک بہت زیادہ وقیع اور قابلِ قدر ہے۔ جمعیّت ہی کے زمانے میں مجھے دین کا وہ انقلابی تصور
حاصل ہوا، جو میری زندگی کی عزیز ترین متاع ہے، اس کے لئے جدّوجُہد کرنے کا ایک گراں مایہ
جذبہ ملا، جسے میں اب تک سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ علاوہ ازیں اس وابستگی کے
باعث میں نے بولنے کا، تقریر کرنے کا فن سیکھا، ورنہ میں شرمیلے قسم کے طلباء میں سے تھا۔
ایف۔ایس۔سی کی تکمیل تک میں نے تقریروں، ڈیبیٹس (D E B A T E S) وغیرہ میں کبھی
حصّہ نہ لیا تھا۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں نے بولنا بھی سیکھا۔ ۱۹۵۱ء میں جمعیّت
کے سالانہ اجتماع کی صدارت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے فرمائی تھی۔ یہ تقریب
وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس اجتماع میں، میں نے اپنی پہلی تقریر کی جس
پر اصلاحی صاحب نے بہت تحسین آمیز تبصرہ فرمایا۔ جماعت کے حلقوں کو بھی میری اس تقریر
پر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہمیں ایک نوجوان مقرّر میسّر آگیا ہے۔ ’عزم‘ کے حوالے سے مجھے قلم
چلانے کی بھی مشق حاصل ہوئی۔ اگرچہ بعد میں مجھے بہت کم مواقع ملے اور میری یہ صلاحیّت پوری
طرح پروان نہ چڑھ سکی۔ البتّہ یہ ضرور ہے کہ جب طبیعت کسی خیال کے اظہار کی طرف مائل ہوتی
ہے تو مجھے قلم کے عجز کا احساس نہیں ہوتا۔ میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ مجھے مافی الضمیر کے اظہار
پر قدرت حاصل نہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ لکھنا مجھے اتنا آسان معلوم نہیں ہوتا جتنا بولنا
یا تقریر کرنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ صلاحیتیں جمعیّت کے ساتھ منسلک رہنے کے باعث

جاگر ہوئی ہیں ـــــ مختصر یہ کہ جمعیت سے تعلق کے باعث مجھے دین کا جو تصوّر ملا، جدّوجہد وجذبہ مجھ میں پیدا ہوا، اسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے بندہ یہ کہہ سکتا ہے کہ معمولی سے معمولی رے کی نسبت مجھے مجموعی اعتبار سے بہت زیادہ فائدہ ہوا۔

س : مولانا کی نکتہ آفرینی اور حاضر جوابی سے ایک زمانہ واقف ہے، اِس ضمن اگر آپ کو دو، تین واقعات یاد ہوں تو براہِ کرم ہمیں بھی سُنا دیجئے!

ج : اس کے لئے ذہن پر زور دینا ہوگا۔ ویسے جمعیت طلبہ کی تربیت گاہوں کے دوران قسم کے واقعات اکثر پیش آتے رہے۔ ہاں! مجھے یاد آیا، تربیت گاہ کا آخری دن تھا اور نے اساتذہ کی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ مَیں نے مولانا مودودی سے گذارش کی، مولینا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے گا۔ جواب ملا، ٹھیک ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی پوچھا: پھر مَیں پہلے کر آؤں۔ مجھے کچھ لیتے ہی سوجھا اور مَیں بولا، مولانا! ہم مرغی پکا رہے ہیں۔ آپ مقابلے کی چیز لے کر آئیے۔ مولانا نے سوچ کر فرمایا کہ مرغی کے مقابلے کی چیز تو پتّی ہے۔ اس زعفران زار بن گئی۔

ایک مرتبہ ہم نے اُن سے کہا کہ مولانا! اپنے کچھ حالاتِ زندگی آکر بتائیے گا۔ اِس کے لئے ایک باقاعدہ نشست رکھی تھی، اور مولانا نے بڑی فراخدلی سے اپنے حالات زندگی ے بھی تھے۔ خیر ہمیں فوراً جواب ملا تھا۔ کیا آپ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مَیں اپنا مولود شریف پڑھوں۔

س : مولانا کے خالص علمی اور تحقیقی کام کے بارے میں آپ کی رائے؟

ج : جیسا کہ مَیں عرض کر چکا ہوں، میرے نزدیک مولانا کا اصل مقام ایک کا ہے، تحقیق کا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں کچھ غلط سا رواج ہو گیا ہے، کہ اگر کسی شخص سے ہو تو پھر جب تک اُس کے ہر پہلو کو کامل ثابت نہ کیا جائے، چین نہیں آتا۔ حالانکہ اگر شخص کسی ایک شعبے میں کوئی نمایاں کام سرانجام دے دے تو یہ بھی اُس کی عظمت کیلئے ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں انسان کو یا تو مجموعی طور پر ٹھکرا دیا جاتا ہے ـــــ WHOLE SALE CONDEMNAT ہوتی ہے یا پھر اسے تمام صفات، تمام عظمتوں کا اہل قرار دیا جاتا ہے! لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ایک چیز واضح کر دوں۔ آپ کو مخالفت اور فرق کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ مَیں مولانا کا مخالف نہیں، البتہ اختلاف کا حق تو مجھے

میں بھی میں نے وظیفہ حاصل کیا۔ میٹرک میں میری پوزیشن مشترکہ پنجاب میں چوتھی تھی۔ ایف ایس۔سی میں بھی میں نے وظیفہ حاصل کیا۔ میڈیکل کالج کے سال اوّل میں، میں فرسٹ تھا۔ چنانچہ سیکنڈ ایئر میڈیکل کالج میں میرے پاس دو سکالرشپ تھے۔ ایک ایف۔ایس۔سی کی بنیاد پر اور دوسرا فرسٹ ایئر میڈیکل کالج کے امتحان کی بنیاد پر۔ اس کے بعد توجّہ منقسم ہوگئی، منقسم کا لفظ بھی صحیح نہیں ہوگا۔ یوں کہنا چاہیئے کہ میری ساری نہیں تو اکثر و بیشتر توجّہ تحریک اور دعوت پہ مرتکز ہوکر رہ گئی۔ ماضی کی سو فیصد کے مقابلے میں اب تعلیم پہ میری توجّہ فقط دس، پندرہ رہ گئی۔ نتیجہ ظاہر ہے، لیکن یہ اللہ کا فضل ہے کہ کسی امتحان میں ناکامی میرے تعلیمی ریکارڈ پہ موجود نہیں۔ بہرحال ڈاکٹری کا پیشہ جس وابستگی اور توجّہ کا متقاضی تھا، وہ میں اُسے نہ دے سکا۔ چنانچہ یہ ڈیبٹ (DEBIT) اندراج تھا، لیکن مجھے اس پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے پر کریڈٹ (CREDIT) کے خانے میں اندراج میرے نزدیک بہت زیادہ وقیع اور قابلِ قدر ہے۔ جمعیت ہی کے زمانے میں مجھے دین کا وہ انقلابی تصوّر حاصل ہوا، جو میری زندگی کی عزیز ترین متاع ہے۔ اس کے لئے جدّوجہد کرنے کا ایک گراں مایہ جذبہ ملا، جسے میں اب تک سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔ علاوہ ازیں اس وابستگی کے باعث میں نے بولنے کا۔ تقریر کرنے کا فن سیکھا، ورنہ میں شرمیلے قسم کے طلباء میں سے تھا اور ایف۔ایس۔سی کی تکمیل تک میں نے تقریروں، ڈیبیٹس (DEBATES) وغیرہ میں کبھی حصّہ نہ لیا تھا۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں نے بولنا بھی سیکھا۔ ۱۹۵۱ء میں جمعیت کے سالانہ اجتماع کی صدارت مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے فرمائی تھی۔ یہ تقریب وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس اجتماع میں، میں نے اپنی پہلی تقریر کی جس پر اصلاحی صاحب نے بہت تحسین آمیز تبصرہ فرمایا۔ جماعت کے حلقوں کو بھی میری اس تقریر پر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ہمیں ایک نوجوان مقرر میسّر آگیا ہے۔ "عزم" کے حوالے سے مجھے قلم چلانے کی بھی مشق حاصل ہوئی۔ اگرچہ بعد میں مجھے بہت کم مواقع ملے اور میری یہ صلاحیت پوری طرح پروان نہ چڑھ سکی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جب طبیعت کسی خیال کے اظہار کی طرف مائل ہوتی ہے تو مجھے قلم کے عجز کا احساس نہیں ہوتا۔ میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ مجھے مافی الضمیر کے اظہار پر قدرت حاصل نہیں۔ اب تو یہ حال ہے کہ لکھنا مجھے اتنا آسان معلوم نہیں ہوتا جتنا بولنا یا تقریر کرنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ صلاحیتیں جمعیت کے ساتھ منسلک رہنے کے باعث

وغیرہ وغیرہ ہوتا تھا۔ چنانچہ اب یہ ضروری نہیں رہا کہ ایک شخص کو بہمہ صفت موصوف ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔

س : ۱۹۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی کے بعد آپ نے مولانا سے کبھی ملاقات کی یا ملاقات کا کبھی ارادہ کیا؟

ج : ۱۹۵۷ء میں جب میں جماعت اسلامی سے مستعفی ہوا تو اس کے بعد تقریباً پانچ برس تک مولانا سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ مستعفی ہونے کے بعد جن دنوں میں ساہیوال (سابقہ منٹگمری) میں تھا، مولانا کسی سفر پر جا رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر اور بہت سے لوگوں کی طرح میں بھی گیا تھا۔ سرسری سی گفتگو کا موقع مل گیا تھا، لیکن میں اسے ملاقات قرار نہ دوں گا۔ البتہ مجھے ایک بات سُن کر بڑی خوشی ہوئی کہ مولانا ایک بار منٹگمری آئے تو انہوں نے شیخ محمد آزاد صاحب کے ہاں قیام فرمایا تھا۔ شیخ صاحب اگرچہ جماعت کے رُکن تو تھے نہیں، صالح نوجوان تھے۔ انہیں جماعت سے دلچسپی تھی۔ اس قیام کے دوران لوگوں نے مولانا سے کہا، مولانا! اس شہر میں جماعت بالکل مردہ سی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد کے آنے پر اس میں کچھ حرکت پیدا ہوئی، جماعت کی ایک حیثیت بنی۔ اب وہ جماعت کو چھوڑ گئے ہیں اس پر مولانا کا جو تأثر مجھ تک پہنچا وہ یہ تھا کہ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر گہرے صدمے کے ساتھ فرمایا: "ہاں! مجھے بھی اُس سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت ہے، بہرحال اختلاف ہونا تھا سو ہوگیا!"

میں اپنے والدین کے ہمراہ ۱۹۶۲ء میں پہلی بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے جا رہا تھا۔ دل میں شدت سے یہ جذبہ پیدا ہوا کہ مولانا سے ملاقات کر کے حج پر روانہ ہوں۔ چنانچہ میں مولانا کی خدمت میں لاہور حاضر ہوا اور عرض کی "مولانا! جہاں تک اختلاف کا تعلق ہے وہ تو اسی طرح قائم ہے۔ بلکہ میں اپنی سوچ پر پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ قائم ہوں، البتہ میرے دل میں آپ کے لئے جو محبت اور ادب پہلے تھا، وہ روحانی طور پر اب بھی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے دل میں میرے متعلق کسی اعتبار سے بھی کوئی مَیل نہ رہے۔" مولانا نے مجھے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا: "میرے دل میں تمہارے متعلق کوئی مَیل نہیں ہے۔" اس کے بعد میں حج پر روانہ ہوگیا۔ اتفاق سے یہ وہی سال تھا جب سعودی عرب اور مصر کے مابین اختلافات نے اس حد تک شدت اختیار

حاصل ہے ۔ تو میرے نزدیک مودودی صاحب کا اصل مقام ایک داعیٔ دین کا ہے ۔ مولانا کے تحقیقی کام کے متعلق میری اب جب کہ زمانۂ طالب علمی کی نسبت میرے ذہن میں پختگی پیدا ہوئی ہے ۔۔۔ رائے یہ ہے کہ جہاں تک اعلیٰ فلسفیانہ سطح کا تعلق ہے، جس میں ما بعد الطبیعیات اور اس سے متعلق امور بیان ہوتے ہیں اور جو علمِ کلام کا اصل موضوع ہے تو اس میدان میں مولانا مودودی صاحب نے قدم بھی نہیں رکھا ۔ مولانا کی کتاب " جبر و قدر " درحقیقت ایک طرح سے صحافتی قسم کا ۔۔۔۔ مواد جمع کرنے کا انداز لئے ہوئے ہے ۔ اسے تصنیف کی بجائے تالیف کہنا زیادہ بہتر ہوگا ۔ اس میں کوئی فیصلہ کن اور مُدلّل بات سامنے نہیں آتی ۔ پھر یہ کہ اسلام کو نظامِ زندگی یا مکمّل ضابطۂ حیات ماننے والے سوشل تھنکر (SOCIAL THINKER) کی حیثیت سے مولانا مودودی کا ایک مقام ہے ۔

انسانی زندگی کو اگر ہم تین شعبوں یعنی سیاسی، سماجی اور اقتصادی میں تقسیم کریں تو پھر معلوم ہوگا کہ مولانا نے سب سے زیادہ مطالعہ سیاسی شعبے یعنی اسلام کے سیاسی نظام کا کیا ہے، اور یہی ان کی تصانیف کا اصل اور اہم موضوع ہے ۔ میری محدود معلومات کی حد تک دستور اور قانون کے موضوع پر کوئی اور مفکر اور مصنّف ایسا نہیں جسے مولانا کے مقابل کھڑا کیا جا سکے ۔ اسلام کے سماجی پہلو پر بھی مولانا کو خاصی دسترس حاصل ہے اور اس پہلو پر مولانا نے اچھا مواد پیش کیا ہے ۔ البتّہ یہ دسترس اس حد تک نہ تھی کہ اسے اسلام کے سیاسی نظام کی دسترس کا ہم پلّہ قرار دیا جا سکے ۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے اور اس سے ہر شخص کو بہرحال اختلاف کا حق حاصل ہے کہ معاشی معاملات کے ضمن میں مولانا کی سوچ اس حد تک آگے نہ بڑھ سکی، جس حد تک اُسے آگے بڑھنا چاہیئے تھا ۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ مولانا چونکہ سائنس کے طالب علم کبھی نہ تھے ۔ سائنسی موضوع پر اُن کی تحریروں میں تشنگی در آئی ہے ۔ مثلاً اگر نظریۂ ارتقاء پر مولانا کچھ نہ لکھتے تو اور بات تھی اور چونکہ انھوں نے لکھا ہے تو اسے فنی اعتبار سے مدلّل ہونا چاہیئے تھا ۔ البتّہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر کچھ پھبتیاں انہوں نے ضرور کسی ہیں ۔ علمی تحقیق کا تو اس میں رنگ ہے ہی نہیں ۔ لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ آج کل علم کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ہمہ جہتی علم اب کسی شخص کے بس کی بات نہیں ۔ علم کی شاخیں اب بہت پھیل چکی ہیں اور وہ دَور لد گیا جب ایک ہی شخص بیک وقت ریاضی دان، فلسفی، مُفسّر، متکلم، منطقی، ہیئت دان

کی بنا پر ماند پڑ گئے۔

س : جب آخری دنوں آپ امریکہ میں تھے ......؟

ج : جی ہاں! مَیں بتاتا ہوں۔ جماعت کے مذکورہ بالا دو اقدامات کے بعد تو مولانا مودودی صاحب سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ موچی دروازہ کے باہر مَیں نے اُن کی ایک تقریر ضرور سُنی تھی۔ کچھ عرصے سے مجھ تک ایسی اطلاعات پہنچ رہی تھیں جن سے یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے مولانا مودودی صاحب اب اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ موجودہ طریق کار نتیجہ خیز نہیں ہوگا اور ہمیں سابقہ طریق کار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ لہٰذا میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ مَیں مولانا سے پھر ملاقات کروں۔ میرا خیال تھا کہ ملکی معاملات اور اپنی صحت کی کیفیت کے پیشِ نظر جماعت کی قیادت کو دوبارہ سنبھالنا مولانا کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ لیکن اگر وہ اپنی موجودہ سوچ کو کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیں تو اس طرح موجودہ قیادت کو رہنمائی مل جائے گی۔ جو جماعت کے اندر اُبھر رہی ہے، اور ہو سکتا ہے اس سے مفید نتائج برآمد ہوں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں اس طرح کی فضا ہے کہ ملنے ملانے سے طرح طرح کے خیالات اور افواہیں پھیلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ خواہش کے باوجود مَیں ملاقات سے گریز ہی کرتا رہا۔ البتہ جب علاج کے سلسلے میں مولانا امریکہ گئے اور مجھے بھی ایک دعوت نامہ ملا، تو میرے دل میں ایک خیال پیدا ہوا کہ مولانا سے بفیلو میں ملاقات کی جائے۔ مَیں نے اپنے بعض احباب سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن مشیتِ الٰہی کو یہ منظور نہ تھا۔ مَیں ۳ ستمبر کو ٹورنٹو پہنچا اور بس اگلے روز مولانا کا اپریشن ہو گیا۔

میرے دوستوں نے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی صاحب سے مسلسل رابطہ قائم رکھا اور ان سے میری ملاقات کے لئے وقت مانگتے رہے۔ ہمیشہ یہی اطلاع ملتی رہی کہ مولانا کی طبیعت ملاقات کے قابل نہیں، اور ڈاکٹروں نے شدید پابندی عاید کر رکھی ہے، کہ مولانا سے قریب ترین اعزہ کے علاوہ اور کوئی نہ ملے۔ مَیں جب شکاگو جانے لگا تو مجھے بتایا گیا کہ مولانا کی طبیعت کچھ بہتر ہو گئی ہے اور دو، ایک روز بعد ملاقات ممکن ہو سکے گی۔ ابتدا میں میرا پروگرام شکاگو سے سیدھا نیویارک جانے اور وہاں سے وطن لوٹنے کا تھا۔ تازہ اطلاع ملنے پر مَیں نے اپنے پروگرام میں تبدیلی کی اور شکاگو سے ٹورنٹو واپسی کا ٹکٹ لیا کہ وہاں سے بفیلو بہت قریب پڑتا ہے لیکن

کی کہ مصر سے ہر سال جو غلافِ کعبہ آیا کرتا تھا اور زیرِ بحث سال بھی آیا تھا اسے سعودیوں نے قبول نہ کیا۔ جو مصری حج کی نیت سے احرام باندھ کر ایک مصری جہاز سے آئے تھے وہ حج کئے بغیر احتجاجاً واپس چلے گئے۔ اسی سال رابطہ عالمِ اسلامی کا تاسیسی اجلاس ہونا تھا۔ حج پر میری روانگی کے وقت تک مولانا کو اس اجلاس میں شمولیت کا دعوت نامہ موصول ہوا تھا، اور نہ ہی اس کے کوئی آثار نظر آتے تھے۔ لیکن بعد میں دعوت نامہ موصول ہو گیا۔ مولانا کی آمد کا جب مجھے علم ہوا تو میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ وہ سعودی عرب کے مہمان تھے۔ مجھے یاد ہے منیٰ میں جب میں حاضر ہوا تو مولانا اپنے خیمے سے باہر احرام باندھے بیٹھے تھے۔ انہی دنوں پاکستان میں کوئی انتخابات، غالباً بی۔ ڈی کے انتخابات ہوئے تھے۔ ان میں جماعت کو شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور اس کی خبریں ابھی تازہ تازہ مولانا تک پہنچی تھیں۔ بعض اور وجوہات بھی تھیں، مثلاً مدینہ یونیورسٹی کی جو سکیم لے کر گئے تھے، اسے علمائے حجاز نے تقریباً کُلی طور پر ردّ کر دیا تھا۔ چنانچہ مولانا ایک صدمے کی سی کیفیت سے دوچار تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے سوچا، لوہا گرم ہے، پھر کوشش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں جب میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ڈرتے ڈرتے وہی سوال کر دیا کہ مولانا! کیا آپ اب بھی یہ سوچنے پر آمادہ نہیں کہ موجودہ طریق کار نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار مولانا کے جواب میں قدرے تلخی کا انداز دیکھا۔ انہوں نے فرمایا: "یہی بات میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اب بھی آپ لوگ سمجھ نہیں پا رہے"۔ یہ جواب سُن کر میں نے محسوس کیا کہ اس موضوع پر مزید گفتگو بیکار ہے!

[آپ مناسب سمجھیں تو نقل کریں، نہ سمجھیں تو نہ کریں] ہوا یوں کہ ۱۹۶۳ء میں حج سے واپسی کے فوراً بعد جماعت نے دو ایسے اقدامات کئے جن کے باعث مجھے جماعت سے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ اور مولانا کے ساتھ دلی تعلق کی پہلی سی کیفیت باقی نہ رہی۔ ایک اقدام کا تعلق تو میرے نزدیک سیاسی میدان میں بے اُصولی کی انتہا تھا۔ یعنی صدر ایوب کے مقابلے پر حسین شہید سہروردی کے ساتھ اشتراک کیا گیا ـــ حالانکہ موصوف جماعت کے نظریات اور اصولوں سے دُور، بلکہ بہت دُور تھے۔ دوسرے غلافِ کعبہ کی تشہیر مشرکانہ، اور اگر اسے آپ بہت سخت لفظ خیال کریں تو اوہام پرستانہ حرکت ضرور تھی۔ جماعت سے علیحدگی کے باوجود کم از کم پانچ سال تک محبت کے جو جذبات میرے دل میں موجزن رہے، وہ ان دو واقعات

س : جماعت سے علیحدگی کے بعد آپ نے کرشن نگر (لاہور) میں رہائش اختیار کی تھی۔ مشقِ سخن کا سلسلہ تو خیر ہمیشہ ہی رہا۔ لیکن ان دنوں آپ مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ حکمّی کی مشقت بھی کیا کرتے تھے۔ اس واقعے کا تعلق اس مشقت سے ہے۔ ہمارا گھر آپ کے پڑوس ہی میں تھا۔ اُن دنوں آپ ہمارے ڈاکٹر بھی تھے۔ میرا بڑا لڑکا، وہی نورالعظیم جس کا نام سُن کر آپ کبھی کبھی فرماتے تھے: "نام تو بڑا زبردست رکھا ہے"۔ خیر! میرے بڑے لڑکے کو جب تیز بخار ہو جاتا تو کبھی کبھی عجیب سا دورہ پڑ جاتا تھا۔ ایک روز صبح کے وقت اُسے تیز بخار چڑھا، میں دفتر میں تھا، میری اہلیہ اُسے گود میں اُٹھا کر بھاگم بھاگ آپ کے مطب پہنچی۔ آپ نے معائنے کے بعد دوا دی۔ جب ظہر کی نماز کا وقت ہوا اور آپ مسجد کی جانب نماز کے لئے ہمارے گھر کے آگے سے گذرے تو ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میری اہلیہ نے دروازے کی دراز میں سے جھانک کر دیکھا تو آپ فرما رہے تھے: "بہن! نور کے جُوتے پکڑ لیجئے، یہ مطب ہی میں رہ گئے تھے۔!"

ج : مجھے تو یاد نہیں۔

س : ظاہر ہے خدا کی راہ پر چلنے والے اپنی نیکیاں کب یاد رکھتے ہیں۔

(بشکریہ قومی ڈائجسٹ)

شکاگو ہی میں اگلے دن مولانا کے انتقال کی خبر ملی۔ اگرچہ وقت بہت تنگ تھا لیکن اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ ہوائی جہاز میں نشست مل گئی۔ چھ سات رفقاء کے ہمراہ میں بھی بفیلو پہنچ گیا اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک جنازہ پہلے ہو چکا ہے۔ وہاں جو حالت میں نے دیکھی اس نے طبیعت پر ایک عجیب کیفیت طاری کی۔ کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ کیسی شخصیت اس جہان سے اٹھ گئی ہے۔ ع

"مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور!"

میں سوچنے لگا۔ مولانا اگر اس وقت پاکستان میں ہوتے تو وہاں پر ایک قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی ہوتی۔ امریکہ میں لاش گھر لانا، جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ ڈاکٹر احمد فاروق مودودی صاحب نے بہت ہمت سے کام لے کر کسی نہ کسی طرح اجازت حاصل کر لی۔ یہ اجازت بہت تھوڑی دیر کے لئے تھی۔ جب ہم پہنچے تو FUNERAL HOME کے عملۂ تدفین کو میت لینے کے لئے آجانا چاہئے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے ان کے آنے میں دیر ہو گئی اور یوں مجھے نمازِ جنازہ پڑھانے کا موقع مل گیا۔ جو لوگ نمازِ جنازہ پہلے پڑھ چکے تھے، ان کی اکثریت بھی دوبارہ شریک ہو گئی۔ کل نفری بھی کوئی ۳۰، ۳۵ افراد پر مشتمل ہو گی۔ اس کے بعد ہمارے سامنے ہی FUNERAL HOME والے مولانا کی میت لے کر چلے گئے۔ چنانچہ آخری ملاقات "زندہ مودودی" سے تو نہ ہو سکی اور دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ تاہم میں اسے بھی اللہ کا فضل سمجھتا ہوں کہ نمازِ جنازہ نہ صرف پڑھائی، بلکہ اُن کا آخری دیدار بھی جی بھر کے اور بہت قریب سے کیا کہ وہاں کوئی ہجوم نہ تھا۔

س : ڈاکٹر صاحب! چند روز پہلے میں نے جب آپ سے انٹرویو کا ذکر کیا تو مجھے کچھ ڈر سا لگ رہا تھا۔

ج : کیوں؟

س : اس لئے کہ ۱۹۵۷ء میں جماعت سے الگ ہونے والے آپ کے ایک بزرگ ساتھی سے جب میں نے "خصوصی نمبر" کے لئے انٹرویو کی درخواست کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ آپ سے انٹرویو کے لئے جونہی بات کی، اور آپ نے جب بلا تأمل فرمایا۔ ہاں ہاں! ضرور ضرور! تو مجھے آپ کی عظمت کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔

ج : کون سا واقعہ؟

تحقیق و تفسیر — بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — قسط دوم

محمد یونس ایم-اے

قرآن اور آثارِ کائنات

حیات بعد الموت اور آخرت

نظامِ شمسی اور کہکشانی نظام: امکان آخرت اور دلیل توحید

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝

"اچھا تو کیا انہوں نے کبھی اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا؟ کس طرح ہم نے اسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے!"

یہاں آسمان سے مراد عالم بالا ہے جسے انسان شب و روز اپنے اوپر چھایا ہوا دیکھتا ہے۔ جس میں دن کو سورج چمکتا اور رات کو چاند اور بے حد و حساب تارے روشن نظر آتے ہیں۔ جسے آدمی برہنہ آنکھ سے دیکھے تو حیرت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر دوربین لگا لے تو ایک وسیع و عریض کائنات اُس کے سامنے آتی ہے جو ناپید اکنار ہے، کہیں سے شروع ہو کر کہیں ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ ہماری زمین سے لاکھوں گنے بڑے عظیم الشان سیارے اس کے اندر گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں۔ ہمارے سورج سے ہزاروں درجہ زیادہ روشن تارے اس میں چمک رہے ہیں۔ ہمارا یہ پورا نظامِ شمسی اس کی طرف ایک کہکشاں (GALAXY) کے کونے میں پڑا ہوا ہے۔ تنہا اسی ایک کہکشاں میں ہمارے سورج جیسے کم از کم تین ارب دوسرے تارے (ثوابت) موجود ہیں، اور اب تک کا انسانی مشاہدہ ایسی ایسی دس لاکھ کہکشانوں کا پتہ دے رہا ہے۔ ان لاکھوں کہکشانوں میں سے ہماری قریب ترین ہمسایہ کہکشاں اتنے فاصلے پر واقع ہے کہ اس کی

بارارب سال نوری (LIGHT YEAR) کی مسافت سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا اور یہاں انسان کے بنائے ہوئے آلات کی گرفت میں آنا صریحاً اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کہکشاں سے لے کر زمین تک کی پوری دُنیا مسلسل ایک ہی مادّے سے بنی ہوئی ہے ایک ہی طرح کی قوتیں اس میں کارفرما ہیں اور کسی فرق و تفاوت کے بغیر وہ سب ایک ہی طرح کے قوانین پر کام کر رہی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شعاعیں نہ یہاں تک پہنچ سکتی تھیں اور نہ ان آلات کی گرفت میں آ سکتی تھیں جو انسان نے زمین اور اس کے ماحول میں کام کرنے والے قوانین کا فہم حاصل کر کے بنائے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا اس پوری کائنات کا خالق و مالک اور حاکم و مُدبّر ہے۔ (سورۂ قٓ۔ حاشیہ۔ ۸، تفہیم القرآن جلد پنجم)

انشقاق قمر اور قرب و امکان قیامت

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ (القمر۔ ۱)

"قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا!"

یعنی چاند کا پھٹ جانا اس بات کی علامت ہے کہ وہ قیامت کی گھڑی جس کے آنے کی تم لوگوں کو خبر دی جاتی رہی ہے، قریب آ لگی ہے اور نظامِ عالم درہم برہم ہونے کا آغاز ہو گیا ہے۔ نیز یہ واقعہ کہ چاند جیسا ایک عظیم کرہ شق ہو کر دو ٹکڑے ہو گیا، اس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ جس قیامت کا تم سے ذکر کیا جا رہا ہے، وہ برپا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب چاند پھٹ سکتا ہے تو زمین بھی پھٹ سکتی ہے، تاروں اور سیّاروں کے مدار بھی بدل سکتے ہیں اور افلاک کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی چیز ازلی و ابدی اور دائم و مستقل نہیں ہے کہ قیامت برپا نہ ہو سکے۔

معترضین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کُرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں۔ اور سینکڑوں میل کے فاصلہ تک ایک دوسرے سے دُور جانے کے بعد پھر باہم جڑ جائیں۔ لیکن درحقیقت یہ اعتراض بے وزن ہے۔ جہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے۔ قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی۔ لیکن موجودہ دَور میں سیّاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو

روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے چل کر دس لاکھ سال میں زمین تک پہنچتی ہے۔ یہ تو کائنات کے صرف اس حصّے کی وسعت کا حال ہے، جو اب تک انسان کے علم اور اس کے مشاہدہ میں آیا ہے۔ خدا کی خدائی کس قدر وسیع ہے، اس کا کوئی اندازہ ہم نہیں کرسکتے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان کی معلوم کائنات، اس پوری کائنات کے مقابلے وہ نسبت بھی نہ رکھتی ہو، جو قطرے کو سمندر سے ہے۔ اس عظیم کارگاہِ ہست و بود کو جو خدا وجود میں لایا ہے، اس کے بارے میں زمین پر رینگنے والا یہ چھوٹا سا حیوانِ ناطق جس کا نام انسان ہے۔ اگر یہ حکم لگائے کہ وہ اسے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا نہیں کرسکتا تو یہ اس کی اپنی عقل کی تنگی ہے۔ کائنات کے خالق کی قدرت اس سے کیسے تنگ ہو جائے گی؟ (سورہ ق۔ حاشیہ ۷ تفہیم القرآن جلد پنجم)

اپنی اس حیرت انگیز وسعت کے باوجود یہ عظیم الشّان نظامِ کائنات ایسا مسلسل اور مستحکم ہے اور اس کی بندش اتنی چست ہے کہ اس میں کسی جگہ کوئی دراڑ یا شگاف نہیں ہے اور اس کا تسلسل کہیں جاکر ٹوٹ نہیں جاتا۔ اس چیز کو ایک مثال سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ جدید زمانے کے ریڈیائی ہیئت دانوں نے ایک کہکشانی نظام کا مشاہدہ کیا ہے جسے وہ منبع ۳ ج (SOURCE 3C ۲۹۵) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ان کا اندازہ یہ ہے کہ اس کی جو شعاعیں اب ہم تک پہنچ رہی ہیں، وہ چار ارب سال سے بھی زیادہ مدّت پہلے اس میں سے روانہ ہوئی ہوں گی۔ اس بعید ترین فاصلے سے ان شعاعوں کا زمین تک پہنچنا آخر کیسے ممکن ہوتا۔ اگر زمین اور اس کہکشاں کے درمیان کائنات کا تسلسل کسی جگہ سے ٹوٹا ہوا ہوتا اور اس کی بندش میں کہیں شگاف پڑا ہوا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرکے دراصل یہ سوال آدمی کے سامنے پیش کرتا ہے کہ میری کائنات کے اس نظام میں جب تم ایک ذرا سے رخنے کی نشاندہی نہیں کرسکتے، تو میری قدرت میں اس کمزوری کا تصوّر کہاں سے تمھارے دماغ میں آگیا کہ تمھارے مہلتِ امتحان ختم ہو جانے کے بعد تم سے حساب لینے کے لیے میں تمھیں پھر زندہ کرکے اپنے سامنے حاضر کرنا چاہوں تو نہ کرسکوں گا۔

یہ صرف امکانِ آخرت ہی کا ثبوت نہیں ہے، بلکہ توحید کا ثبوت بھی ہے۔

کے ساتھ جوڑ کھاتی چلی جائے، اور کبھی ان کی مصلحتوں کے درمیان تصادم نہ ہونے پائے۔

(۲) زمین کے اس عظیم الشان کُرے کا فضائے بسیط میں معلق ہونا، اس کی سطح پر اتنے بڑے بڑے پہاڑوں کا ابھر آنا، اس کے سینے پر ایسے ایسے زبردست دریاؤں کا جاری ہونا، اس کی گود میں طرح طرح کے بے حد و حساب درختوں کا پھلنا، اور پیہم انتہائی باقاعدگی کے ساتھ رات اور دن کے حیرت انگیز آثار کا طاری ہونا، یہ سب چیزیں اس خدا کی قدرت پر گواہ ہیں جس نے انہیں پیدا کیا ہے۔ ایسے قادرِ مطلق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی عطا نہیں کر سکتا، عقل و دانش کی نہیں، حماقت و بلادت کی دلیل ہے۔

(۳) زمین کی ساخت میں، اس پر پہاڑوں کی پیدائش میں، پہاڑوں سے دریاؤں کی روانی کا انتظام کرنے میں، پھلوں کی ہر قسم میں دو دو طرح کے پھل پیدا کرنے میں، اور رات کے بعد دن، اور دن کے بعد رات باقاعدگی کے ساتھ لانے میں جو بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ پکار پکار کر شہادت دے رہی ہیں کہ جس خدا نے تخلیق کا یہ نقشہ بنایا ہے وہ کمال درجے کا حکیم ہے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں خبر دیتی ہیں کہ یہ نہ تو کسی بے ارادہ طاقت کی کارفرمائی ہے اور نہ کسی کھلنڈرے کا کھلونا۔ ان میں سے ہر ہر چیز کے اندر ایک حکیم کی حکمت اور انتہائی بالغ نظری کام کرتی نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد صرف ایک نادان ہی ہو سکتا ہے جو یہ گمان کرے کہ زمین پر انسان کو پیدا کر کے اور اسے ایسی ہنگامہ آرائیوں کے مواقع دے کر وہ اس کو یونہی خاک میں گم کر دے گا۔

(سورۃ الرعد۔ حاشیہ ۸ تفہیم القرآن جلد دوم)

ساری زمین کو اس نے یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا ہے، بلکہ اس میں سے بے شمار خطّے پیدا کر دیئے ہیں، جو متصل ہونے کے باوجود شکل میں، رنگ میں، مادّۂ ترکیب میں، خاصیتوں میں، قوّتوں اور صلاحیتوں میں، پیداوار اور کیمیاوی، یا معدنی خزانوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان مختلف خطّوں کی پیدائش اور ان کے اندر طرح طرح کے اختلافات کی موجودگی اپنے اندر اتنی حکمتیں اور مصلحتیں رکھتی ہے کہ اُن کا شمار نہیں ہو سکتا۔ دوسری مخلوقات سے قطع نظر، صرف ایک انسان

معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک کرہ اپنے اندر کی آتش فشانی کے باعث پھٹ جائے، اور اس زبردست انفجار سے اس کے دو ٹکڑے دور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز مقناطیسی قوت کے سبب سے وہ ایک دوسرے سے ساتھ آملیں۔ (سورۃ القمر۔حاشیہ ا - تفہیم القرآن جلد پنجم)

عالم ارضی سے توحید اور حیات بعد الموت پر استدلال

وَ هُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَ اَنْهٰرًا ؕ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الرعد - ۳)

"اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے، اس میں پہاڑوں کے کھونٹے گاڑ رکھے ہیں اور دریا بہا دیئے ہیں۔ اس نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کئے ہیں، اور وہی دن پر رات طاری کرتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں، اُن لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔"

اجرام فلکی کے بعد عالم ارضی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور یہاں بھی خدا کی قدرت اور حکمت کے نشانات سے انہی دونوں حقیقتوں یعنی توحید اور آخرت پر استشہاد کیا گیا ہے، جن پر پچھلی آیات میں عالم سماوی کے آثار سے استشہاد کیا گیا تھا۔ ان دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اجرام فلکی کے ساتھ زمین کا تعلق، زمین کے ساتھ سورج اور چاند کا تعلق زمین کی بے شمار مخلوقات کی ضرورتوں سے پہاڑوں اور دریاؤں کا تعلق، یہ ساری چیزیں اس بات پر کھلی شہادت دیتی ہیں کہ ان کو نہ تو الگ الگ خداؤں نے بنایا ہے، اور نہ مختلف با اختیار خدا ان کا انتظام کر رہے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ان سب چیزوں میں باہم اتنی مناسبتیں اور ہم آہنگیاں اور موافقتیں نہ پیدا ہو سکتی تھیں اور نہ مسلسل قائم رہ سکتی تھیں۔ الگ الگ خداؤں کے لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مل کر پوری کائنات کے لئے تخلیق و تدبیر کا منصوبہ بنا لیتے جس کی ہر چیز زمین سے لے کر آسمانوں تک ایک دوسرے

صرف صورت بدلی جاسکتی ہے۔ مگر ہر تغیر کے بعد مادّہ، مادّہ ہی رہتا ہے اور اُس کی مقدار میں کوئی کمی وبیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالمِ مادّی کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جوہری توانائی (ATOMIC ENERGY) کے انکشاف نے اس پورے تخیّل کی بساط الٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ راز کھل گیا ہے کہ قوّت مادّے میں تبدیل ہوتی ہے، اور مادّہ پھر قوّت میں تبدیل ہوجاتا ہے، حتّٰی کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیولیٰ۔ اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون (SECOND - LAW OF THERMODYNAMICS) نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالمِ مادّی نہ ازلی ہوسکتا ہے نہ ابدی۔ اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیئے۔ اس لئے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پہ اُٹھ کر قیامت کا انکار کرے گا؟ (سورۂ روم۔ حاشیہ ۶)

ایک صاحب کے استفسار پہ فرماتے ہیں:

حرکیاتِ حرارت کے دوسرے قانون کو جن الفاظ میں سائنس کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، ان میں آپ نے یہ مضمون تلاش کرنے کی کوشش کی کہ: "یہ عالم مادّی نہ ازلی ہوسکتا ہے نہ ابدی!" اور ظاہر بات ہے کہ یہ مضمون آپ کو کسی کتاب سے نہ مل سکتا تھا۔ اس لئے کہ دراصل یہ تو ایک نتیجہ ہے جو اس قانون سے نکلتا ہے نہ کہ اصل قانون یہی ہو کہ یہ کائنات ازلی و ابدی نہیں ہے۔ آپ براہِ کرم اس قانون پہ غور کریں۔ اس کی رُو سے جو حرارت گرم تر سے سرد تر کی طرف منتقل ہوتی ہے، وہ پھر کبھی اپنے اصل منبع کی طرف واپس نہیں جاتی، بلکہ سرد سے سرد تر کی طرف منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حرارت کا اصل منبع اس درجۂ حرارت پہ آجاتا ہے جس پر اس سے متصل کم حرارت رکھنے والے اجسام کا ہو۔ اور اس منبع سے مزید حرارت حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں رہتا، اِلّا یہ کہ کہیں خارج سے اس میں مزید حرارت بہم پہنچانے کا انتظام کیا جائے۔ یہی چیز اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ کائنات میں جو بھی منبع حرارت ہے، وہ مسلسل حرارت منتقل کرتا چلا جارہا ہے اور کوئی حرارت اس کی طرف واپس نہیں جارہی۔ اس طرح یہ منبع آخرکار ایک روز حرارت سے خالی ہوجائے گا۔

سلہ مکاتیب سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ حصّہ دوم، مکتوب ...

ہی کے مفاد کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی مختلف اغراض و مصالح اور زمین کے ان خطوں کی گوناگونی کے درمیان جو مناسبتیں اور مطابقتیں پائی جاتی ہیں، اور ان کی بدولت انسانی تمدن کو پھلنے پھولنے کے جو مواقع بہم پہنچے ہیں۔ وہ یقیناً کسی حکیم کی فکر اور اس کے سوچے سمجھے منصوبے اور اس کے دانشمندانہ ارادے کا نتیجہ ہیں۔ اسے محض ایک اتفاقی حادثہ قرار دینے کے لئے بڑی ہٹ دھرمی درکار ہے۔

(سورہ الرعد۔ حاشیہ ۹ تفہیم القرآن جلد دوم)

اٹامک انرجی، سیکنڈ لاء آف تھرموڈائنامکس اور قیامت

مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ (الروم-۸)

"اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو جو اُن کے درمیان ہیں برحق اور ایک مقرر مدت ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔"

دوسری حقیقت جو اس کائنات کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لئے بھی ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لئے ایک عمر مقرر ہے، جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے۔ اور یہی معاملہ بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں، وہ سب محدود ہیں، ایک وقت تک ہی کام کر رہی ہیں اور کسی وقت پر انہیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اس نظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث ان فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی، جو دنیا کو ازلی و ابدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے عالم کے حدوث و قدم کی اس بحث میں، جو ایک مدت دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی۔ قریب قریب حتمی طور پر اپنا ووٹ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے۔ اب دہریوں کے لئے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعویٰ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیل پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا

لسی، مکھن، کھویا، پنیر اور صرف طرح کی مٹھائیاں بناتا ہے۔ ان کا گوشت کھاتا ہے، ان کی چربی استعمال کرتا ہے، ان کی اُون اور بال اور کھال اور آنتیں اور ہڈی اور خون اور گوبر، ہر چیز اس کے کام آتی ہے۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے خالق نے زمین پر اس کو پیدا کرنے سے بھی پہلے اس کی ان بے شمار ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ جانور اس خاص نقشے پر پیدا کر دیئے تھے تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے۔ (سورۃ المومن حاشیہ ۱۱۰)

پھر زمین کا تین چوتھائی حصّہ پانی سے لبریز ہے اور صرف ایک چوتھائی خشکی پر مشتمل ہے۔ خشک حصّوں کے بھی بہت سے چھوٹے اور بڑے رقبے ایسے ہیں جن کے درمیان پانی حائل ہے۔ کرّۂ زمین کے اِن خشک علاقوں پر انسانی آبادیوں کا پھیلنا اور پھر ان کے درمیان سفر و تجارت کے تعلقات کا قائم ہونا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ پانی اور سمندروں اور ہواؤں کو ایسے قوانین کا پابند بنایا جاتا جن کی بدولت جہاز رانی کی جا سکتی، اور زمین پر وہ سروسامان پیدا کیا جاتا، جسے استعمال کر کے انسان جہاز سازی پر قادر ہوتا۔ کیا یہ اس بات کی صریح علامت نہیں ہے کہ ایک ہی قادر مطلق ربّ حکیم و رحیم ہے جس نے انسان اور زمین اور پانی اور سمندروں اور ہواؤں اور ان تمام چیزوں کو جو زمین پر ہیں، اپنے خاص منصوبے کے مطابق بنایا ہے۔ بلکہ اگر انسان صرف جہاز رانی ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے تو اس میں تاروں کے مواقع اور سیاروں کی باقاعدہ گردش سے جو مدد ملتی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ زمین ہی نہیں آسمانوں کا خالق بھی وہی ایک ربّ کریم ہے۔

اس کے بعد اس بات پر بھی غور کیجیے کہ جس خدائے حکیم نے اپنی اتنی بے شمار چیزیں انسان کے تصرّف میں دی ہیں اور اس کے مفاد کے لئے یہ کچھ سامان فراہم کیا ہے، کیا بسلامتی ہوش و حواس آپ اس کے متعلق یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ معاذ اللہ ایسا آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ہوگا کہ وہ انسان کو یہ سب کچھ دے کر کبھی اس سے حساب نہ لے گا؟

(سورۂ مومن حاشیہ ۱۱۰)

زمین پر پانی کی مقدار۔ توحید و آخرت پر استدلال

اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْکَبُوْا مِنْھَا وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ ۝ وَلَکُمْ فِیْھَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْھَا حَاجَۃً فِیْ صُدُوْرِکُمْ وَعَلَیْھَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ ۝ وَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰہِ تُنْکِرُوْنَ ۝

"اللہ ہی نے تمہارے لئے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ اُن کے اندر تمہارے لئے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو، ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کئے جاتے ہو۔ اللہ اپنی یہ نشانیاں تمہیں دکھا رہا ہے، آخر تم اس کی کن کن نشانیوں کا انکار کرو گے؟"

مطلب یہ ہے کہ اگر تم محض تماشا دیکھنے اور دل بہلانے کے لئے معجزے کا مطالبہ نہیں کر رہے ہو، بلکہ تمہیں صرف یہ اطمینان کرنے کی ضرورت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن باتوں کو ماننے کی دعوت تمہیں دے رہے ہیں (یعنی توحید و آخرت) وہ حق ہیں یا نہیں، تو اس کے لئے خدا کی یہ نشانیاں بہت کافی ہیں، جو ہر وقت تمہارے مشاہدے اور تجربے میں آ رہی ہیں۔ حقیقت کو سمجھنے کے لئے ان نشانیوں کے ہوتے کسی اور نشانی کی کیا حاجت رہ جاتی ہے۔ یہ معجزات کے مطالبے کا تیسرا جواب ہے۔ یہ جواب بھی اس سے پہلے متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا، اور ہم اس کی تشریح اچھی طرح کر چکے ہیں۔ (جلد اوّل الانعام ۲۶، ۲۷ ـ جلد دوم یونس ۱۰۵ ـ الرعد ۱۵ تا ۲۰ جلد سوم الشعراء ۳، ۴، ۵)

زمین پر جو جانور انسان کی خدمت کر رہے ہیں، خصوصاً گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ اور گھوڑے، ان کو بنانے والے نے ایسے نقشے پر بنایا ہے کہ یہ بآسانی انسان کے پالتو خادم بن جاتے ہیں اور ان سے اس کی بے شمار ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اُن پر سواری کرتا ہے، ان سے باربرداری کا کام لیتا ہے، انہیں کھیتی باڑی کے کام میں استعمال کرتا ہے، اُن کا دودھ نکال کر اسے پیتا بھی ہے اور اس سے دہی

تَنْتَشِرُوْنَ ۝ (الروم - ۲۰)

"اُس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اُس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔
پھر یکایک تم بشر ہو کر (زمین میں) پھیلتے چلے جا رہے ہو!"

جو خدا ہر آن تمہاری آنکھوں کے سامنے یہ کر رہا ہے، وہ آخر انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ زندگی بخشنے سے عاجز کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ہر وقت انسانوں، اور حیوانات میں سے فضلات (WASTE MATTER) خارج کر رہا ہے۔ جن کے اندر زندگی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ وہ ہر لمحے بے جان مادّے (DEAD MATTER) کے اندر زندگی کی روح پھونک کر بے شمار جیتے جاگتے حیوانات، نباتات اور انسان وجود میں لا رہا ہے۔ حالانکہ بجائے خود ان مادّوں میں، جن سے ان زندہ ہستیوں سے جسم مرکّب ہوتے ہیں، قطعاً کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ ہر آن یہ منظر تمہیں دکھا رہا ہے کہ بنجر پڑی ہوئی زمین کو جہاں پانی میسّر آیا، اور یکایک وہ حیوانی اور نباتی زندگی کے خزانے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کارخانۂ ہستی کو چلانے والا خدا انسان کے مر جانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے سے عاجز ہے تو حقیقت میں وہ عقل کا اندھا ہے۔ اس کے سر کی آنکھیں جن ظاہری مناظر کو دیکھتی ہیں، اس کی عقل کی آنکھیں ان کے اندر نظر آنے والے روشن حقائق کو نہیں دیکھتیں:۔ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ۝ (سورۃ الصّٰفّٰت - ۱۱)
:" اُن کو تو ہم نے لیسدار گارے سے پیدا کیا ہے!"

یعنی یہ انسان کوئی بڑی چیز تو نہیں ہے، مٹی سے بنایا گیا ہے اور پھر اسی مٹی سے بنایا جا سکتا ہے۔ لیسدار گارے سے انسان کی پیدائش کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اوّل کی پیدائش مٹی سے ہوئی تھی، اور پھر آگے نسل انسانی اس پہلے انسان کے نطفے سے وجود میں آئی۔ اور یہ بھی ہے کہ ہر انسان لیسدار گارے سے بنا ہے۔ اس لئے کہ انسان کا سارا مادّہ وجود زمین ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جس نطفے سے وہ پیدا ہوا ہے، وہ غذا سے بنتا ہے۔ اور استقرارِ حمل کے وقت سے مرتے دم تک اس کی پوری ہستی جن اجزاء سے مرکّب ہوتی ہے، وہ سب ہی غذا سے فراہم ہوتے ہیں۔ یہ غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتی، آخر کار اس کا ماخذ وہ مٹی ہے جو پانی کے ساتھ مل کر اس قابل

بارش سے مردہ زمین میں نباتات کا اُگنا۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ط
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ٥ (النحل - ٦٥)

"(تم ہر برسات میں دیکھتے ہو کہ) اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور یکایک مردہ پڑی ہوئی زمین میں اس کی بدولت جان ڈال دی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے سننے والوں کے لئے۔"

یہ منظر ہر سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتا ہے کہ زمین بالکل چٹیل میدان پڑی ہوئی ہے، زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں۔ نہ گھاس پھونس ہے، نہ بیل بوٹے نہ پھول پتی اور نہ کسی قسم کے حشرات الارض۔ اتنے میں بارش کا موسم آگیا اور ایک چھینٹے پڑتے ہی اسی زمین سے زندگی کے چشمے اُبلنے لگے۔ زمین کی تہوں میں دبی ہوئی بے شمار جڑیں یکایک جی اٹھیں اور ہر ایک کے اندر سے وہی نباتات پھر برآمد ہوگئیں جو پچھلی برسات میں دیکھے گئے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی زندگی میں بار بار تم دیکھتے رہتے ہو اور پھر بھی تمہیں نبی کی زبان سے یہ سن کر حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس حیرت کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ تمہارا مشاہدہ بے عقل حیوانوں کا سا مشاہدہ ہے۔ تم کائنات کے کرشموں کو تو دیکھتے ہو، مگر ان کے پیچھے خالق کی قدرت اور حکمت کے نشانات نہیں دیکھتے۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ نبی کا بیان سن کر تمہارا دل نہ پکار اٹھتا کہ فی الواقع یہ نشانیاں اس کے بیان کی تائید کر رہی ہیں۔

(سورہ النحل - حاشیہ الف ۵۳، تفہیم القرآن جلد دوم)

نبی کہتا ہے تم مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ تم اسے ایک انہونی بات قرار دیتے ہو، مگر زمین ہر بارش کے ہر موسم میں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اعادۂ خلق نہ صرف ممکن ہے، بلکہ روز تمہاری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے (حاشیہ ۵۹)

حیات بعد الموت کا اثبات

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ

بادلوں کی شکل میں جمع کرتی ہے۔ ان بادلوں کو لے کر روئے زمین کے مختلف حصّوں
میں پھیل جاتی ہے، اور اس طرف سے جو وقت مقرّر ہے ٹھیک اس وقت ایک ایک قطرے
کو اسی شکل میں جس میں وہ پہلے تھا، زمین واپس پہنچا رہی ہے۔ یہ منظر جو آئے دن
انسان کی آنکھوں کے سامنے گذر رہا ہے، اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ مرے ہوئے
انسانوں کے اجزائے جسم بھی اللہ تعالیٰ کے ایک اشارے پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اور ان
انسانوں کو اس شکل میں پھر اٹھا کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ جس میں وہ پہلے موجود تھے۔ یہ اجزاء
خواہ مٹی میں ہوں یا پانی میں، یا ہوا میں، بہرحال رہتے اسی زمین اور اس کے
ماحول ہی میں ہیں۔ جو خدا پانی کے بخارات کو ہوا میں منتشر ہو جانے کے بعد پھر اس ہوا
کے ذریعے سے سمیٹ لاتا ہے، اور انہیں پھر پانی کی شکل میں برسا دیتا ہے، اس کے
لئے انسانی جسموں کے بکھرے ہوئے اجزاء کو ہوا، پانی اور مٹی میں سے سمیٹ لانا
اور پھر سابق شکلوں میں جمع کر دینا آخر کیوں مشکل ہو؟

(سورہ الذاریات حاشیہ ۴ تفہیم القرآن جلد پنجم)

اعمال کا ریکارڈ۔ ریڈیو اور ٹی وی سے استدلال

اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ۝
مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ۝ (قٓ۔ ۱۷، ۱۸)

"(اور ہمارے اس براہِ راست علم کے علاوہ) دو کاتب اس کے دائیں
اور بائیں بیٹھے ہر چیز ثبت کر رہے ہیں۔ کوئی لفظ اس کی زبان سے
نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لئے ایک حاضر باش نگران موجود
نہ ہو!"

یعنی ایک طرف تو ہم خود براہِ راست انسان کی حرکات و سکنات اور اس کے
خیالات کو جانتے ہیں۔ دوسری طرف ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہیں جو اس کی ایک
ایک بات کو نوٹ کر رہے ہیں، اور اس کا کوئی قول و فعل ان کے ریکارڈ سے نہیں
چھوٹتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی عدالت میں انسان کی پیشی ہوگی
اس وقت اللہ کو خود بھی معلوم ہوگا کہ کون کیا کر کے آیا ہے، اور اس پر شہادت دینے

ہوتی ہے کہ انسان کی خوراک کے لئے غلّے اور ترکاریاں اور پھل نکالے، اور ان حیوانات کو پرورش کرے جن کا دودھ اور گوشت انسان کھاتا ہے۔

پس بنائے استدلال یہ ہے کہ مٹی اگر حیات قبول کرنے کے لائق نہ تھی تو تم آج کیسے زندہ موجود ہو؟ اور اگر اس میں زندگی پیدا کئے جانے کا آج امکان ہے جیسا کہ تمھارا موجود ہونا خود اس کے امکان کو صریح طور پر ثابت کر رہا ہے، تو کل دوبارہ اس مٹی سے تمھاری پیدائش کیوں ممکن نہ ہوگی؟ (سورۃ الروم۔ حاشیہ ۵۲۔ جلد سوم)

بارش کا نظام۔ حیات بعد الموت پر استدلال

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ۙ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۙ فَالْجٰرِيٰتِ يُسْرًا ۙ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۙ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۙ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۙ (الذّٰریٰت۔ ا تا ۶)

"قسم ہے ان ہواؤں کی جو گرد اڑانے والی ہیں، پھر پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھانے والی ہیں، پھر سبک رفتاری کے ساتھ چلنے والی ہیں، پھر ایک بڑے کام (بارش) کی تقسیم کرنے والی ہیں، حق یہ ہے کہ جس چیز کا تمھیں خوف دلایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور جزائے اعمال ضرور پیش آنی ہے۔!"

منکرین آخرت زندگی بعد موت کو جس بنا پر غیر ممکن سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ جب ہم مرکر خاک میں رل مل جائیں گے، اور ہمارا ذرہ ذرہ جب زمین میں منتشر ہو جائے گا، تو کیسے ممکن ہے کہ یہ ہمارے منتشر اجزائے جسم پھر اکٹھے ہو جائیں اور ہمیں دوبارہ بنا کھڑا کیا جائے۔ اس شبہ کی غلطی ان چاروں مظاہر کائنات پر غور کرنے سے خود بخود رفع ہو جاتی ہے، جنھیں آخرت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورج کی شعاعیں روئے زمین کے ان تمام ذخائر آب پر اثر انداز ہوتی ہیں جن تک ان کی حرارت پہنچتی ہے۔ اس عمل سے پانی کے بے حد و حساب قطرے اڑ جاتے ہیں اور اپنے مخزن میں باقی نہیں رہتے۔ مگر وہ فنا نہیں ہو جاتے، بلکہ بھاپ بن کر ایک ایک قطرہ ہوا میں محفوظ رہتا ہے۔ پھر جب خدا کا حکم ہوتا ہے تو یہی ہوا ان قطروں کی بھاپ کو سمیٹ لاتی ہے، اس کو کثیف

کہ آخر زمین کیسے بولنے لگے گی۔ لیکن آج علوم طبیعی کے اکتشافات اور سینما، لاؤڈ اسپیکر ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیپ ریکارڈر، الیکٹرانکس وغیرہ ایجادات کے اس دور میں یہ سمجھنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ زمین اپنے حالات کیسے بیان کرے گی۔ انسان اپنی زبان سے جو کچھ بولتا ہے اس کے نقوش ہوا میں، ریڈیائی لہروں میں، گھروں کی دیواروں اور ان کے فرش اور چھت کے ذرّے ذرّے میں۔ اور اگر کسی سڑک یا میدان یا کھیت میں آدمی نے بات کی ہو تو ان سب کے ذرّات میں ثبت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس وقت چاہے ان ساری آوازوں کو ٹھیک اسی طرح ان چیزوں سے دُہروا سکتا ہے۔ جس طرح کبھی وہ انسان کے منہ سے نکلی تھیں۔ انسان اپنے کانوں سے اس وقت سُن لے گا کہ یہ اسکی اپنی ہی آوازیں ہیں، اور اس کے جاننے والے پہچان لیں گے کہ جو کچھ وہ سُن رہے ہیں وہ اسی شخص کی آواز اور اسی کا لہجہ ہے۔ پھر انسان نے زمین پر جہاں جس حالت میں بھی کوئی کام کیا ہے، اس کی ایک ایک حرکت کا عکس اس کے گردوپیش کی تمام چیزوں پر پڑا ہے اور اس کی تصویریں ان پر نقش ہو چکی ہیں۔ بالکل گھپ اندھیرے میں بھی اس نے کوئی فعل کیا ہو تو خدا کی خدائی میں ایسی شعاعیں موجود ہیں، جن کے لئے اندھیرا اور اُجالا کوئی معنی نہیں رکھتا، وہ ہر حالت میں اس کی تصویر لے سکتی ہیں۔ یہ ساری تصویریں قیامت کے روز ایک متحرک فلم کی طرح انسان کے سامنے آجائیں گی اور یہ دکھا دیں گی کہ وہ زندگی بھر کس وقت، کہاں کہاں کیا کچھ کرتا رہا ہے۔ (سورۃ الزلزال حاشیہ ۴ تفہیم القرآن جلد ششم)

کے لئے دو گواہ بھی موجود ہوں گے جو اس کے اعمال کا دستاویزی ثبوت لاکر سامنے رکھ دیں گے۔ یہ دستاویزی ثبوت کس نوعیت کا ہوگا۔ اس کا ٹھیک ٹھیک تصور کرنا تو ہمارے لئے مشکل ہے، مگر جو حقائق آج ہمارے سامنے آرہے ہیں، انہیں دیکھ کر یہ بات بالکل یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جس فضا میں انسان رہتا اور کام کرتا ہے اس میں ہر طرف اس کی آوازیں، اس کی تصویریں، اور اس کی حرکات و سکنات کے نقوش ذرّے ذرّے پر ثبت ہو رہے ہیں۔ اور ان میں سے ہر چیز کو بعینہٖ انہی شکلوں آوازوں میں دوبارہ اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے کہ اصل اور نقل میں ذرّہ برابر فرق نہ ہو۔ انسان یہ کام نہایت ہی محدود پیمانے پر آلات کی مدد سے کر رہا ہے۔ لیکن خدا کے فرشتے نہ ان آلات کے محتاج ہیں نہ ان قیود سے مقیّد۔ انسان کا اپنا جسم اور اس کے گرد و پیش کی ہر چیز ان کی ٹیپ اور ان کی فلم ہے، جس پر ہر آواز اور ہر تصویر کو اس کی نازک ترین تفصیلات کے ساتھ جوں کی توں ثبت کر سکتے ہیں۔ اور قیامت کے روز آدمی کو اس کے اپنے کانوں سے اس کی اپنی آوازیں اس کی وہ باتیں سنوا سکتے ہیں جو وہ دنیا میں کرتا تھا، اور اس کی اپنی آنکھوں سے اس کے اپنے تمام کرتوتوں کی چلتی پھرتی تصویریں دکھا سکتے ہیں، جن کی صحت سے انکار کرنا اس کے لئے ممکن نہ رہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ آخرت کی عدالت میں کسی شخص کو محض اپنے ذاتی علم کی بنا پر سزا نہ دیدے گا، بلکہ عدل کی تمام شرائط پوری کر کے اس کو سزا دے گا۔ اس لئے دنیا میں ہر شخص کے اقوال و افعال کا مکمل ریکارڈ تیار کرایا جا رہا ہے۔ تاکہ اس کی کارگذاریوں کا پورا ثبوت ناقابلِ تردید شہادتوں سے ہو جائے۔

سورۃ الزلزال آیات ۱ تا ۴ میں فرمایا: "جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی۔ اور زمین اپنے اندر کے سارے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی اور انسان کہے گا کہ یہ اس کو کیا ہو رہا ہے، اس روز وہ اپنے (اوپر گذرے ہوئے) حالات بیان کرے گی"! (سورۃ قٓ۔ حاشیہ ۲۱۔ تفہیم القرآن جلد پنجم)

زمین کے متعلق یہ بات کہ وہ قیامت کے روز اپنے اوپر گذرے ہوئے سب حالات اور واقعات بیان کرے گی، قدیم زمانے کے آدمی کے لئے تو بڑی حیران کن ہوگی

ماہنامہ

میثاق

اشاعت خصوصی — مئی ۱۹۸۰ — مشتمل

[illegible] القرآن

یعنی

ڈاکٹر اسرار احمد

نی سورۃ توبہ کی آیات ۹۸ تا ۱۲۹ کے درس پر مشتمل تقاریر جو ریڈیو پاکستان

سے جنوری تا اپریل ۸۰ء ہر جمعہ کی صبح نشر ہوئیں ۔

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

الحمد للہ کہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی دو اہم تصانیف جنکا شدت سے انتظار تھا طبع ہوگئی ہیں!

(۱)

اسلامی ریاست

مشتمل بر

- چند بنیادی مباحث
- شہریت کے حقوق و فرائض
- غیر مسلموں کے حقوق
- اطاعت کے شرائط اور حدود
- کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

۱۸ × ۲۲/۸ کے ۲۷۶ صفحات اعلیٰ سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت

مجلد مع ڈسٹ کور : قیمت -/۲۰

(۲)

پاکستانی عورت

دوراہے پر

صفحات ۱۸۴ : قیمت -/۱۰

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور (فون: ۸۵۲۶۱۱)

(١)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّ یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۹۸﴾ وَ مِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَیُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۹﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۹۸ تا ۹۹ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے : اور ان بدّوؤں میں ایسے بھی ہیں جنھیں وہ انفاق جو وہ کرتے ہیں (خواہ مخواہ کا) تاوان نظر آتا ہے، اور وہ تمہارے لئے گردشوں کی آس لگائے بیٹھے ہیں (حالانکہ) بُری گردش کی زد میں وہ خود ہیں اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے — اور ان بدّوؤں ہی میں سے وہ بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر پختہ ایمان رکھتے ہیں، اور جو انفاق وہ کرتے ہیں اُسے اللہ کے قرب اور رسولؐ کی دُعاؤں کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ وہ یقیناً ان کے حق میں سبب قُرب ہے۔ عنقریب اللہ انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے!

سورہ توبہ کی آیات ۷ تا ۲۴ کے علاوہ جو فتح مکّہ سے متصلاً قبل یا اس کے فوراً بعد نازل ہوئیں بقیہ پوری سورۂ توبہ ۹ھ میں سفرِ تبوک سے متصلاً قبل یا اس کے دوران یا اس کے فوراً بعد نازل ہوئی۔ چنانچہ اس کا آخری حصّہ جو گیارھویں پارے میں شامل ہے اواخر ۹ھ میں تبوک سے واپسی کے بعد نازل ہوا —!

ظاہر ہے کہ اس وقت نہ صرف یہ کہ ایک محکم اور وسعت پذیر اسلامی ریاست قائم ہو چکی تھی۔ بلکہ مسلمانوں نے ایک باقاعدہ اُمّتِ مسلمہ کی صورت اختیار کر لی تھی، جس کی نفری روز بروز بڑھ رہی تھی۔ لیکن فطری اور منطقی طور پر اس افزونی و فزونگی کا معیار یکساں نہ تھا — اور مسلمانوں کی جماعت میں کافی مختلف النوع اور متفاوت المرتبہ لوگ شامل ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان میں ایک تقسیم تو یہ تھی کہ اوّلاً مہاجرین مکّہ تھے، پھر انصارِ مدینہ اور پھر اردگرد کے قبائل کے بادیہ نشین۔ یہ تقسیم اگر ایک جانب خالص ارضی و جغرافیائی تھی، تو

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۹ | مئی ۱۹۸۰ء | عدد ۵

تقدیم

'میثاق' کی پیش نظر اشاعت خصوصی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کے موقع پر شائع ہو رہی ہے اور اس میں راقم کی چودہ تشری تقاریر یکجا بدیہ قارئین کی جارہی ہیں۔ ان مربروں کو اس طرح یکجا شائع کرنے کا خیال اس لئے آیا کہ سورۂ توبہ کے اس حصے میں ایمان حقیقی کے تقاضوں کے پس منظر میں منافقت کی اصل حقیقت پوری طرح بے نقاب ہوگئی ہے اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن حکیم میں 'نفاق' کے موضوع پر یہ مقام ''ذروۂ سنام'' یا 'CLIMAX' کی حیثیت رکھتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس مہلک مرض کی صحیح پہچان عطا فرمائے اور اس سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

اس اشاعت کے آخر میں بطور ضمیمہ ''ایک اکیڈمی تعلیمی سکیم'' کا تعارف شامل کیا جا رہا ہے قارئین سے استدعا ہے کہ اسے بغور پڑھیں اور اپنے جگر گوشوں کو اللہ کے دین متین اور کتاب مبین کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے ارادے سے ہمارے حوالے کریں............ تاکہ وہ ان کے لئے بہترین صدقہ جاریہ بن سکیں۔

والسلام من اتبع الہدیٰ!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

پبلشر: ڈاکٹر اسرار احمد ✱ طابع: رشید احمد چوہدری

مطبع: مکتبہ جدید پریس، شارع فاطمہ جناح، لاہور

مقام اشاعت ۳۶ - کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور فون: ۸۵۲۶۱۱ — ۸۵۲۶۸۳

جذبات سے پوری طرح آگاہ ہو کر گویا "علیٰ وجہ البصیرت" معاملہ کر سکیں۔ بلکہ تحریکی و انقلابی نفسیات کے ضمن میں مسلمانوں کو ایک ابدی رہنمائی بھی حاصل ہو جائے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کے آخری حصے میں یہ مضامین پوری تفصیل اور نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ ٭

اعراب یعنی عرب کے بادیہ نشین متذکرہ بالا تقسیموں میں سے مکانی و زمانی دونوں تقسیموں کے اعتبار سے تو آخری نمبر پر تھے ہی یعنی مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ کے بعد —— واقعہ یہ ہے کہ معنوی تقسیم کے اعتبار سے بھی اکثر و بیشتر ان کا نمبر آخر ہی میں آتا تھا۔ چنانچہ یہی بات ہے جو زیرِ درس آیات سے متصلاً قبل والی آیت میں فرمائی گئی تھی یعنی:

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ

یعنی "یہ بادیہ نشین کفر اور نفاق میں بھی (دوسرے طبقات کے مقابلے میں) زیادہ پختہ اور شدید ہیں، اور جو کچھ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اُس کے فہم و ادراک سے بھی کچھ زیادہ ہی محروم اور تہی دست ہیں!" اس کی وجہ بھی بادنیٰ تأمل سمجھ میں آجاتی ہے کہ ایک تو شہروں کے مہذب اور متمدن لوگوں کے مقابلے میں دیہاتی یوں بھی کچھ زیادہ ہی اُجڈ اور سخت و کرخت ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم آغازِ وحی کے بعد تیرہ سال مکے میں مقیم رہے اور دس سال مدینے میں۔ لہٰذا اہالیانِ مکہ و مدینہ کو آپؐ کی صحبت کا فیض اور قرب کی برکتیں مسلسل حاصل ہوتی رہیں۔ جن سے صادق الایمان لوگوں نے تو بھرپور فائدہ اٹھایا ہی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ بالکل محروم کافر و منافق بھی نہ رہے۔ چنانچہ خواہ وہ زبان سے ایمان نہ لائے تاہم ان کے دل بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و حقانیت کے پورے معترف رہے اور ان کی آنکھیں بھی آپؐ کے رُوئے انور کے جمالِ جہاں تاب اور آپؐ کے اخلاقِ حسنہ اور خصائلِ کریمانہ کی ضیا پاشیوں سے مستفید ہوتی رہیں۔ جبکہ عرب کے عام بادیہ نشین ان سے محروم تھے۔ لہٰذا ان میں سے جو کافر یا منافق تھے ان کے کفر و نفاق کی شدت کا کیا ٹھکانہ۔!!

آیت ۹۸ میں اسی شدتِ نفاق کی نقشہ کشی کی گئی ہے کہ یہ بدو کسی وقتی یا فوری سی تحریک کی بنا پر یا کسی مصلحت کے تحت ایمان تو لے آئے، لیکن ان پر اسلام کی جانب سے عائد کردہ پابندیاں سخت شاق گذر رہی ہیں۔ پنج وقتہ نمازوں کا معاملہ

دوسری جانب اس میں ایک زمانی تدریج بھی تھی۔ یعنی سب سے پہلے ایمان لانے والے تھے مہاجرین
ان کے بعد نمبر تھا انصار کا۔ اور پھر نوبت آئی تھی اہلِ بادیہ کی، اور اسی سبب سے ان کے مابین
ایک فطری فرق مراتب بھی تھا۔ پھر ایک دوسری تقسیم حقیقی و معنوی تھی۔ یعنی پہلا نمبر تھا صادق الایمان
اور راسخ الیقین لوگوں کا۔ اور ان میں بھی "اَلْقِدَمُ فَالْقِدَمُ!" کے مطابق اولیت
حاصل تھی السابقون الاولون کو۔ اور ان کے بعد درجہ تھا متبعین باحسان کا۔ دوسرے
نمبر پر تھے سچے لیکن ضعیف الایمان لوگ۔ پھر ان کے بھی بہت سے درجے تھے ـــ
چنانچہ ایک وہ بھی تھے جن سے کبھی کبھی خطا سرزد ہو جاتی تھی یا کوتاہی کا ارتکاب ہو جاتا
تھا۔ پھر وہ تھے جن میں نیکی اور بدی کا امتزاج کچھ مستقل سا نظر آتا تھا۔ گویا ان کی شخصیتوں
میں خیر و شر کے دھارے "مرجَ البَحرَینِ یَلتَقِیٰنِ" کی سی کیفیت کے ساتھ مسلسل
رواں تھے ـــ اور آخری نمبر پر وہ تھے جن کے دلوں میں کوئی فساد یا نیتوں میں کوئی فتور
تو نہ تھا۔ گویا نفاق سے تو وہ بری تھے لیکن اُن کے ایمان کی نوعیت بس یہ تھی کہ یا تو انہوں
نے رُخ کو بدلتے دیکھ کر انہوں نے بھی اسلام کی طرف رُخ کر لیا تھا یا قبائلی نظام کے
تحت اس لئے ایمان لے آئے تھے کہ ان کے قبیلے کے سرکردہ لوگوں (ELDERS
OF THE CLAN) نے اسلام لے آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ گویا ایمانِ حقیقی کی جڑیں
ابھی ان کے قلوب تک پہنچ ہی نہ سکی تھیں، بمصداق الفاظِ قرآنی قَالَتِ الْاَعْرَابُ
اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ط!
(الحجرات: ۱۴) :" یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ اے نبی! کہہ دیجئے تم ایمان نہیں لائے ہو
بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یا ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے، اور ابھی ایمان تمہارے دلوں
میں داخل نہیں ہوا!" ـــ اور سب سے آخر میں نمبر آتا تھا منافقین کا ـــ اور ظاہر ہے کہ ان
میں بھی درجوں اور مرتبوں کا بہت فرق موجود تھا بقول شاعر ؎

نہ ہر زن زن است، نہ ہر مرد، مرد ٭ خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

اب ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک جامع اور بھرپور تبصرہ اُمتِ مسلمہ کے جسدِ ملی میں
شامل ان مختلف عناصر پر ایسا کر دیا جائے جس سے نہ صرف یہ کہ موجود الوقت مخلص
مسلمانوں اور خاص طور پر ان کے ذمہ دار حضرات کو ایک گہری بصیرت حاصل ہو جائے،
اور وہ مختلف عناصر و طبقات کے ساتھ ان کو پوری طرح پہچان کر اور ان کے باطنی احساسات

(۲)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ړ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ڀ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۣ لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ۝

یہ سورۂ توبہ کی آیات عنا، علنا ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے: "اور سب سے پہلے سبقت کرنے والے مہاجرین اور انصار میں سے، اور جنہوں نے ان کی پیروی کی نیکی کے ساتھ۔ اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔ اور اس نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں، جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی، جن میں وہ رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔ یہ بڑی کامیابی ہے — اور جو تمھارے ارد گرد بدو ہیں ان میں بھی منافق ہیں اور مدینہ والوں میں بھی۔ یہ منافقت میں بہت مشّاق ہوئے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں۔ عنقریب ہم انہیں دو بار سزا دیں گے، اور پھر وہ عذاب کی طرف لوٹا دیئے جائیں گے!"

گذشتہ درس میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے مدنی دَور اور اس کے بھی بالخصوص آخری زمانے میں اُمّتِ مسلمہ کے جسدِ ملّی میں کافی مختلف النّوع عناصر جمع ہو گئے تھے۔ اس لئے کہ اسلام تو ایک قانونی حیثیت ہے جو کلمۂ شہادت ادا کرتے ہی کسی بھی انسان کو حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اگر وہ ارکانِ اسلام کا پابند رہتا ہے اور شعائرِ اسلامی کا احترام کرتا ہے تو یہ قانونی حیثیت برقرار رہتی ہے خواہ اپنی دلی کیفیات کے اعتبار سے وہ پکا منافق ہی کیوں نہ ہو۔ سورۂ توبہ میں نفاق کا مضمون بہت تفصیل اور وضاحت کے ساتھ وارد ہوا ہے اور منافقین کے ظاہری احوال بھی تفصیل سے بیان ہوئے ہیں اور ان کی باطنی کیفیات اور قلبی احساسات کی بھی پردہ کشائی فرمائی گئی ہے۔ اسی ضمن میں فوری تقابل کے طور پر مسلمانوں کے جسدِ ملّی میں شامل جملہ عناصر پر اجمالی

تو وہ جیسے تیسے نبھا لیتے ہوں گے، اور نہ بھی نبھانے ہوں تو آخر دیہات میں کون سے محتسب موجود تھے جو نگرانی کرتے۔ البتہ زکوٰۃ کا معاملہ ان کے حق میں ٹیڑھی کھیر بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے لئے تو ظاہر ہے کہ سال بہ سال آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تحصیلدار آ جاتے تھے اور انہیں خواہی نخواہی زکوٰۃ ادا کرنی ہی پڑتی تھی۔ چنانچہ اس کے ضمن میں فرمایا کہ بیورا دے تو دیتے ہیں لیکن بالکل ایسے جیسے چٹی بھرنی پڑ رہی ہو یا تاوان ادا کرنا پڑ گیا ہو۔ اگلے الفاظ نے ان کی باطنی کیفیت کو اور واضح کر دیا کہ اب ان کی واحد آس یہ ہے کہ گردشِ فلک کا کوئی چکر ایسا چلے کہ مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار ختم ہو اور یہ اس خواہ مخواہ کے تاوان سے نجات پائیں۔ چنانچہ بعد کے حالات نے بالکل یہی نقشہ پیش بھی کر دیا کہ جیسے ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا ان بادیہ نشینوں میں ایک عام بغاوت پیدا ہو گئی، اور ان میں سب سے بڑی تعداد مانعینِ زکوٰۃ ہی کی تھی۔ اُس وقت اِس آیۂ مبارکہ کے آخری الفاظ یعنی "عَلَیْهِمْ دَائِرَةُ السَّوْءِ!" یعنی "بری گردش ان ہی پر ہے!" صورتِ واقعہ کا رُوپ دھار کر سامنے آئے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آہنی عزم اور صادق الایمان مسلمانوں بالخصوص "سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ" خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تلواروں نے سیلاب کا رُخ موڑ کر رکھ دیا ؛

آیت ۹۹ نے تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کر دیا۔ یعنی یہ کہ یہ کیفیت تمام کے تمام بدوؤں کی نہیں ہے۔ اُن میں سے ایسے صادق الایمان لوگ بھی موجود ہیں جو زکوٰۃ و صدقات ادا کرتے ہوئے اور انفاق فی سبیل اللہ کی سعادت حاصل کرتے ہوئے دِلی مسرت محسوس کرتے ہیں، اور جن کے نزدیک اس انفاق کے ذریعے حاصل ہونے والے قربِ و رضائے الٰہی اور رضا و دُعائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قیمتی چیز کوئی اور ہے ہی نہیں۔ آخر میں ایسے لوگوں کو بشارت دے دی گئی کہ وہ مطمئن رہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا انہیں بھرپور طور پر حاصل ہو گئی — اور رحمتِ خداوندی انہیں اپنے سائے میں لے لے گی۔ ؛

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہونے کی سعادت عطا فرمائے۔

آمین یا ربّ الاوّلین والآخرین !

یا لوگوں کی مخالفت اُسے ہراساں نہ کرسکے اور وہ "ہرچہ بادا باد" کے انداز میں اپنی کشتی کو موجوں کے حوالے کردے۔ جس انسان میں یہ دونوں اوصاف موجود ہوں وہ دعوتِ اسلامی کے ضمن میں السّابقون الاوّلون" میں شامل ہوجاتا ہے، اور دعوتِ حق جیسے ہی اس کے کانوں تک پہنچتی ہے وہ بالکل اسی طرح حاضر ہوجاتا ہے جیسے کوئی نمازی جو گھر پر صرف اذان کے انتظار میں رُکا ہوا ہو، اور جیسے ہی اذان کی آواز اس کے کان میں پڑے فوراً مسجد کی جانب روانہ ہوجائے۔ اِسی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے قرآنِ حکیم میں سورۂ مائدہ کی اُس آیت میں جس سے ساتویں پارے کا آغاز ہوتا ہے یعنی

وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ (۸۴)	اور جب وہ سنتے ہیں جو اترا ہے رسولؐ پر تو تو دیکھے ان کی آنکھوں کو کہ ان سے آنسو بہہ نکلتے ہیں حق کی اس پہچان کی وجہ سے جو انہیں حاصل ہوئی۔ پکار اٹھتے ہیں اے ربّ ہمارے ہم ایمان لائے پس لکھ لے ہمارے نام گواہی دینے والوں کے ساتھ ــــ!!

اور اسی کی جانب اشارہ ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۹۳ کے ان الفاظ میں کہ:

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۝	(یعنی وہ کہتے ہیں) اے ربّ ہمارے! ہم نے سُنا ایک پکارنے والے کی پکار کو کہ مُنادی کر رہا ہے ایمان کی۔ پس ہم ایمان لے آئے!

الغرض مومنینِ صادقین میں اوّلین درجہ ان السّابقون الاوّلون کا ہے۔ اور یہی ہیں کہ جن کے بارے میں سورۂ واقعہ میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝	اور سبقت کرنے والے تو سبقت کرنے والے ہیں ہی۔ یہی ہوں گے مقربینِ بارگاہِ ربّانی!

گویا جنھوں نے یہاں ایمان میں سبقت کی وہی وہاں جنّت میں سب سے اعلیٰ رتبوں پر فائز ہوں گے؟

ان کے بعد نمبر آتا ہے "مُتَّبِعِيْنَ بِاِحْسَانٍ" کا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو السّابقون الاوّلون کی پیروی کرتے ہیں اور انہیں دیکھ کر ایمان لاتے ہیں۔ اس قدرے قلیل تاخیر

تجزیہ کیا جارہا ہے تاکہ مسلمانوں میں ایک عام بصیرت پیدا ہوجائے، اور وہ لوگوں کو پہچان سکیں کہ کون کیا ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے دو انتہاؤں کا ذکر کیا گیا۔ یعنی ایک جانب مومنین صادقین اور دوسری جانب منافقین۔ پھر مومنینِ صادقین کے بھی دو گروہوں کی جانب اشارہ کیا گیا، یعنی ایک جانب مہاجرینِ مکہ اور دوسرے انصارِ مدینہ ــــ اور منافقین کے بھی دو ہی گروہوں کی نشاندہی کی گئی یعنی ایک منافقینِ مدینہ اور دوسرے بادیہ نشین منافقین اور اہم ترین یہ کہ مومنینِ صادقین کے بھی دو درجوں یا مرتبوں کا تعین کیا گیا یعنی ایک السّابقون الاوّلون اور دوسرے متبعین باحسان ــــ

اس طرح مومنینِ صادقین کے ضمن میں گویا دو تقسیمیں سامنے آئیں۔ ایک ظاہری دوسری معنوی۔ ظاہری تقسیم کے اعتبار سے مومنین صادقین مہاجرین اور انصار میں منقسم تھے اور معنوی تقسیم کے اعتبار سے السّابقون الاوّلون اور متبعین باحسان میں۔ ان میں سے پہلی تقسیم تو مشہور و معروف ہے اور اس کے ضمن میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں، البتہ دوسری تقسیم وضاحت طلب ہے:

السّابقون الاوّلون سے مراد وہ صحابہ کرامؓ ہیں جنھوں نے جیسے ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سُنی فوراً لبیک کہی اور اس کو ماننے میں کسی ہچکچاہٹ یا شش و پنج کو کاٹ نہ بننے دیا۔ یہ کیفیت اپنے آخری نقطۂ عُروج پر نظر آتی ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں جن کے بارے میں خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت موجود ہے کہ میں نے جس کسی کے سامنے اپنی دعوت پیش کی اس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا خواہ ایک لمحہ کیلئے ہو سوائے ابوبکرؓ کے کہ اُس نے قطعاً کوئی توقف نہ کیا اور فوراً میری تصدیق کی۔ اس کے لئے ظاہر ہے کہ دو چیزیں ضروری ہیں: ایک یہ کہ انسان کی فطرت اپنی صحت و سلامتی پر بہ تمام و کمال برقرار ہو۔ گویا اس کی فطرت کا روغن الیسا صاف و شفاف ہو کہ خود بخود بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو خواہ ابھی آگ نے اسے چھُوا بھی نہ ہو، بفحوائے الفاظِ قرآنی: " یَکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ؕ ــــ اور اگر آگ چھُوئے تو کیا ہی کہنے یہ " نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ " کے مصداق ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان میں جرأت و شجاعت کا مادّہ بھی موجود ہو کہ جب کسی چیز کا حق ہونا اس پر منکشف ہوجائے تو پھر ماحول کی ناسازگاری

نے کہا بھی اس وقت تھا جب حکومتِ وقت نے انہیں گرفتار کر کے قید خانے میں ڈالا ہوا تھا اور ہر طرح کی تعذیب و اذیّت ان پر روا رکھی جا رہی تھی ؞

آخر میں ان صادق الایمان لوگوں کی اُخروی جزاء کا ذکر بھی فرما دیا گیا۔ یعنی باغات میں داخلہ، اور اُن میں ہمیشہ کا قیام، جن کے دامن میں ندّیاں بہتی ہوں گی ۔ ساتھ ہی وضاحت فرما دی گئی کہ اصل اور بڑی کامیابی اسی جنّت کا حصول ہی ہے۔ ؞

اگلی آیت میں منافقین کا ذکر ہے، اور ان کے ضمن میں وضاحت فرما دی گئی ہے کہ اب وہ اپنی منافقت میں اتنے منجھ گئے اور اپنے دوغلے کردار کے اتنے مشاق و ماہر بن گئے ہیں کہ اُن کو پہچاننا آسان کام نہیں رہا۔ مَرَدَ کے معنی امام راغب اصفہانی نے تو بیان کئے ہیں: "تَعَرِّیْ عَنِ الْخَیْرَاتِ" یعنی نیکیوں اور بھلائیوں سے بالکل عاری ہو جانا۔ ویسے اکثر مفسّرین نے یہاں اسے مَرَنَ کے مفہوم میں لیا ہے یعنی عادی و خوگر ہو جانا۔ بہرحال مراد یہی ہے کہ سالہا سال کی مشق کے باعث اپنی کمزوریوں کو چھپانے اور اپنے سازشی ذہن پر مصلحانہ رنگ کا ملمع کرنے میں ان منافقین کی مہارت اب اتنی بڑھ چکی ہے کہ ’’اے مسلمانو! تم انہیں نہیں پہچان سکتے‘‘۔ لیکن اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا، اس لئے کہ اللہ انہیں خوب پہچانتا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ اصل معاملہ تو اسی سے ہے۔ اہلِ ایمان کو جزا بھی وہی دینے والا ہے، اور اہلِ کفر و نفاق کی سزا کا معاملہ بھی اصلاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا وہ خواہ کتنے ہی ماہر و مشّاق ہو جائیں اور کیسے ہی خوشنما لباس میں اپنے اصل گھناؤنے کردار کو چھپانے کی کوشش کریں اللہ کی نگاہوں سے کسی طرح نہیں چھپ سکتے۔ وہ انہیں دو مرتبہ سزا دے گا۔ اور بالآخر جہنّم کے عذابِ عظیم میں جھونک دے گا۔ دو مرتبہ کے عذابوں کے بارے میں مفسّرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ لیکن جس مفہوم پر زیادہ اتّفاق ہوا ہے وہ یہ کہ پہلا عذاب اس دُنیا کی رسوائی کا ہے۔ اور دوسرا عذاب عالمِ برزخ کا اور اس کے بعد یومِ قیامت سے آغاز ہوگا اصل عذابِ عظیم کا ؞

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے عذاب سے محفوظ رکھے اور دُنیا اور آخرت دونوں کی رسوائی سے بچائے ـــ بالخصوص نفاق کے روگ سے ہمارے قلوب کو پاک کردے۔ آمین ـــ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کی ذہنی و فکری صلاحیتیں اتنی چاق و چوبند نہ ہوں جتنی السّابقون الاوّلون کی۔ چنانچہ حق کے پہچاننے ہی میں انہیں کچھ دیر لگ جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان میں پہل کرنے کی جرأت نہ ہو لیکن جب وہ لوگوں کو سبقت کرتے دیکھ لیں، اور ان کے سامنے کچھ لوگ حق کے لئے تکالیف و مصائب برداشت کر کے ایک نمونہ پیش کر دیں تو پھر ان کی ہچکچاہٹ بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ پیش قدمی کرتے ہیں اور حق کو قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ واضح رہے کہ ان کی ابتدائی ہچکچاہٹ بالکل عارضی ہوتی ہے اور جب وہ ایک بار دعوتِ حق پر لبّیک کہہ دیتے ہیں تو پھر ان میں کوئی تذبذب باقی نہیں رہتا، اور تن من دھن اللہ کی راہ میں نثار کرنے کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔ اُن کی اسی کیفیت کو "بِاِحْسَانٍ" کے الفاظ سے واضح فرمایا یعنی یہ کہ ان کا یہ اتباع باحسن وجود ہوتا ہے اور اس میں کوئی نفاق یا دوغلا پن تو دور رہا۔ کسی ضعف اور کمزوری کی آمیزش بھی نہیں رہتی۔

مؤمنین صادقین کی ان دونوں جماعتوں کے بارے میں فرمایا کہ: اللہ اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے!"۔ یہ تعریف وتحسین کے وہ سب سے اعلیٰ وارفع الفاظ ہیں جو اللہ اپنے پسندیدہ بندوں کے لئے استعمال فرماتا ہے۔ اُن کا ایک عام مفہوم تو وہ ہے جو ظاہر الفاظ سے بھی عیاں ہے اور ویسے بھی مشہور و معروف ہے یعنی اللہ اپنے بندے کے ایمان و اسلام، اطاعت و فرمانبرداری اور اس کی راہ میں سرفروشی و جانفشانی سے راضی ہو گیا، اور بندہ اس جزا اور اجر و ثواب پر پوری طرح راضی ہو جائے گا جو اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے عطا فرمائے گا۔ لیکن اس کا ایک نسبتاً گہرا مفہوم بھی ہے اور وہ ہے باہمی رضا کا ایک دو طرفہ تعلّق جو ایمانِ حقیقی کے نتیجے میں بندے اور ربّ کے مابین پیدا ہو جاتا ہے اور جسے "مقامِ تسلیم و رضا" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کے بارے میں علّامہ اقبال مرحوم نے بالکل بجا طور پر کہا ہے کہ سے

"بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا ؛ چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا!"

واقعہ یہ ہے کہ اس نسبت و تعلّق کے پیدا ہو جانے سے جو ذہنی سکون اور قلبی اطمینان انسان کو حاصل ہو جاتا ہے، اس سے اس کی یہ دُنیوی زندگی بھی جنّت کا نمونہ بن جاتی ہے۔ جیسے کہ نہایت عارفانہ قول ہے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہ "ان جنّتی معی!" یعنی "میری جنّت میرے پاس موجود ہے!"۔ واضح رہے کہ یہ جملہ امامِ موصوف

توبہ قبول فرماتا اور ان کے صدقات کو شرفِ قبولیت بخشتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے، ان سے کہہ دیجئے کہ عمل کرو، آئندہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہلِ ایمان تمہارا طرزِ عمل بہ نگاہ رکھیں گے۔ پھر عنقریب ہی غائب و حاضر سب کے جاننے والے کے حضور تمہاری پیشی ہوگی اور وہ تمہیں جتلا دے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہتے تھے۔ اور کچھ اور بھی ہیں جن کا معاملہ اللہ کے فیصلے تک ملتوی کیا جاتا ہے۔ وہ یا تو ان کو سزا دے گا، یا اُن کی توبہ قبول فرمائے گا۔ اور اللہ جاننے والا، حکمت والا ہے!"

مومنینِ صادقین اور منافقین کے بین بین کے جن لوگوں کا ذکر ان آیاتِ مبارکہ میں وارد ہوا ہے۔ قرآن حکیم نے تو اگرچہ انہیں کسی مخصوص نام سے موسوم نہیں کیا لیکن ان کے جن حالات و کیفیات کا ذکر یہاں ہوا ہے۔ ان کے پیشِ نظر انہیں "ضعفاء" کے نام سے موسوم کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ لوگ اگرچہ سچے بھی تھے اور مخلص بھی لیکن انہیں "ضعفِ ارادہ" کا مرض لاحق تھا۔ اور ان کے اس نفسیاتی کسل اور عملی تساہل کے باعث نفس اور شیطانِ لعین دونوں کو وسوسہ اندازی کا موقع مل جاتا تھا۔ چنانچہ کبھی یہ ترغیباتِ نفسانی کے زیر اثر کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتے تھے، اور کبھی جہاد و قتال اور انفاق فی سبیل اللہ کے مواقع پر تذبذب کا شکار ہو جاتے تھے اور اس طرح گویا بظاہر احوال اُن کا طرزِ عمل منافقین کے مشابہ ہو جاتا تھا، اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اُن کے اندر ایمان کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھتی تھی، اور یہ راسخ الایمان لوگوں کے شانہ بشانہ اقامتِ دین کی جدّوجہد اور اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی میں پوری سرفروشی و جانفشانی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے ان کے ضمن میں نہایت سلیس لیکن حد درجہ فصیح الفاظ استعمال فرمائے کہ: خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَيِّئًا ط یعنی انہوں نے کچھ نیکیاں اور کچھ بدیاں دونوں ساتھ ساتھ کمائی ہیں، اور اپنی شخصیتوں میں خیر اور شر اور اپنے نامۂ اعمال میں بِرّ و اثم کو گڈمڈ کر دیا ہے ——!!

البتہ جو چیز انہیں منافقوں سے ممیّز کر دیتی ہے وہ ان کی جانب سے "اعترافِ تقصیر" ہے۔ یہ نکتہ اہم ہے اس لئے کہ ظاہر و باطن دونوں اعتبارات سے ضعفِ

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا
عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا
وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ
يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ
اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ
رَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ
اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۰ میں مومنین صادقین کی چار جماعتوں یعنی: —— السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ کے ذکر اور آیت ۱۰۱ میں منافقین کے دو گروہوں یعنی منافقینِ مدینہ اور منافقین اہلِ بادیہ کے تذکرے کے بعد اب آیت ۱۰۲ سے آیت ۱۰۶ تک کچھ ایسے لوگوں کا ذکر ہے جو ان دو انتہاؤں کے بین بین تھے۔ آیات کا ترجمہ یہ ہے:

”اور کچھ دوسرے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرلیا ہے۔ انہوں نے گڈمڈ کرلیا ہے ایک نیک کام کو دوسرے برے کام کے ساتھ۔ اُمید ہے کہ اللہ ان پر عنایت فرمائے، بےشک اللہ بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ (اے نبیؐ!) آپ ان کے اموال میں سے صدقہ وصول کرلیں۔ اس طرح آپ ان کو پاک بھی کریں گے اور ان کی صحیح نشو و نما بھی ہوگی، اور ان کے لئے دُعا بھی کیجئے۔ یقیناً آپ کی دعا ان کے حق میں باعثِ تسکین ہے اور اللہ سُننے والا، جاننے والا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی

ہی ہوتی ہے۔ یعنی دُنیا اور اُس کے مال و منال کی محبت۔ چنانچہ یہی نجاست ہے جو زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے دُھل جاتی ہے۔ نتیجۃً قلبِ انسانی از سرِ نو صاف و شفاف ہوجاتا ہے اور اس میں انوارِ ایمانی پھر پوری شدت کے ساتھ منعکس ہوجاتے ہیں، اور انسان بِرّ و تقویٰ، ایمان و احسان اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی راہ پر دوبارہ عزم و ہمت کے ساتھ گامزن ہوجاتا ہے۔ اسی عمل یا PHENOMENON کا نام "تزکیہ" ہے۔ (۲) دوسرا حکم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ملا کہ ان ضعفاء کے حق میں دعا کیجئے۔ یہ معاملہ بھی منافقین کے بالکل برعکس ہے۔ ان کے بارے میں آیت ۸۴ میں یہ حکم وارد ہوچکا ہے کہ: نہ آپ ان میں سے کسی کی موت پر دعا کریں یعنی نمازِ جنازہ ادا فرمائیں نہ ان میں سے کسی کی قبر پر تشریف لے جائیں!۔ اس لئے کہ اگرچہ قانونی اعتبار سے منافق مسلمان ہی شمار ہوتا ہے اور قانونی اسلام ہی کی حالت میں اس کی موت واقع ہوتی ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ کفر پر مرتا ہے۔ اس کے برعکس ہے معاملہ ضعفاء کا کہ اگرچہ بظاہر ان کا طرزِ عمل منافقین کے مشابہ ہوجاتا ہے، لیکن باطن کے اعتبار سے زمین و آسمان کا فرق ہے اس لئے کہ اُن کی نیت میں فتور نہیں ہوتا اور ان کے دل میں ایمان موجود ہوتا ہے! اس دعائے رسول ؐ کی حکمت بھی واضح فرمادی کہ: "اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ" یعنی آپؐ کی دُعا اُن کے لئے وجہِ تسکین ہے، اور اس کے ذریعے ان کو تثبیتِ قلبی حاصل ہوگی۔ اور ان کا وہ ایمان جو کبھی کبھی متزلزل ہوجاتا ہے از سرِ نو راسخ و متمکن ہو جائے گا ـــــ آیت ۱۰۴ میں وضاحت فرمادی کہ خواہ زکوٰۃ و صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی قبولیت کا مسئلہ ہو، خواہ رسول ؐ کی دُعا ـــــ یہ سب اللہ ہی کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کے مظاہر ہیں ؛

آیت ۱۰۵ میں ذرا تنبیہی انداز اختیار فرمایا گیا کہ اللہ کے اس فضل و کرم اور اس کی شانِ غفاری و ستاری اور رحیمی و کریمی سے دھوکا کھاکر عمل سے بے پروا مت ہوجاؤ۔ اصل فیصلہ کن چیز تمہارا آئندہ کا طرزِ عمل ہے: "اِعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ" (عمل کرو۔ اللہ بھی تمہارے عمل کو دیکھے گا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان بھی دیکھیں گے!) تمہارا

ایمان اور نفاق کی سرحدیں بالکل "مردی و نامردی قدمے فاصلہ دارد" کے مصداق ایک دوسرے سے بالکل متصل ہیں۔ لہٰذا اُن کے مابین حدِ فاصل کی تعیین بہت ضروری ہے۔ اور وہی حدِ فاصل ہے جو یہاں "اِعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ" کے الفاظ میں وارد ہوئی۔ یعنی وہ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر جھوٹے بہانوں کے پردے نہیں ڈالتے۔ اپنی لغزشوں کی خوشنما توجیہات نہیں کرتے۔ اپنی تقصیروں کے لئے عذراتِ لنگ نہیں تراشتے بلکہ صاف اقرار کر لیتے ہیں کہ ہم سے خطا ہوئی اور کمزوری کا اظہار ہوا۔ جس کے لئے ہم عفو و درگذر کے خواستگار ہیں۔ آیاتِ زیرِ درس ایسے لوگوں کے حق میں نویدِ جانفزا اور نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ اس لئے کہ شہنشاہِ ارض و سمٰوات نے انہیں بھرپور امید دلائی ہے کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے گی اور انہیں معاف کر دیا جائے گا۔ کلمۂ "عسٰی" اصلاً تو عربی میں "شاید" کے مفہوم کا حامل ہے۔ لیکن جب یہ شاہانہ اندازِ کلام کے ضمن میں آتا ہے تو اس میں حتمی وعدے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے ــــــ !!

آگے ان ضعفاء کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض اہم ہدایات دی گئی ہیں: (۱) اوّلین اور اہم ترین یہ کہ ان کے اموال میں سے زکوٰۃ و صدقات وصول فرمائیں۔ واضح رہے کہ اسی سورۂ مبارکہ کی آیات ۵۳، ۵۴ میں بیان ہو چکا ہے کہ منافقین کا صدقہ و انفاق مقبول نہیں مردود ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے اسے اپنے نفاق کو چھپانے کے لئے پردہ اور اوٹ بنا لیا ہے:

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝

یعنی "کہہ دیجئے (اے نبیؐ) کہ خواہ تم دلی آمادگی سے انفاق کرو، خواہ مارے باندھے کو، یہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ اس لئے کہ تم (ایمان کی) حدود سے نکل چلے ہو!"

اس کے برعکس ہے معاملہ ضعفاء کا۔ ان کے ضمن میں تاکیدی حکم ہو رہا ہے کہ ان سے زکوٰۃ و صدقات وصول کریں اور ساتھ ہی اس کی حکمت بیان کی جا رہی ہے کہ اس طرح ان کی تطہیر بھی ہو گی اور تزکیہ بھی۔ تطہیر کے معنی نجاست اور گندگی سے نجات پانا ہے اور تزکیہ اس کا نتیجہ ہے یعنی نشو و نما کے فطری عمل میں افزونی اور اضافہ۔ دین کے راستے میں انسان سے جس کمزوری کا اظہار ہوتا ہے، اُس کا آخری سبب حُبِّ عاجلہ

ن بین ہیں اکثر ضعفاء — جن کی کثرت تعداد ہی کے باعث ان کا ذکر نہایت تفصیل کے
ہ تفصیل ہوا یوری چار آیات میں یعنی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۵ — !!!
اللہ تعالیٰ ہمیں نفاق اور ضعفِ ایمان کی ان تمام کیفیات سے بچائے — اور
مومنین صادقین کے زمرہ میں شامل فرمائے۔ آمین یا ربّ العٰلمین !

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

(۴)

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا یَزَالُ بُنْیَانُهُمُ الَّذِیْ بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّاۤ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ ﴿۱۱۰﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۰۷ تا ۱۱۰ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"اور وہ لوگ جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس لئے کہ (اسلام کو) نقصان پہنچائیں، اور کفر کی تقویت کا ذریعہ بنیں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور کمین گاہ فراہم کریں ان کے لئے جو پہلے ہی اللہ اور اُس کے رسول سے (علانیہ) جنگ کر چکے ہیں۔ وہ لازماً قسمیں کھائیں گے کہ ہمارا ارادہ سوائے بھلائی کے اور کچھ نہ تھا، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ نہ

عمل جانتے والا کہ تم نے اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوئی کوشش کی یا نہیں اور تلافیٔ مافات کی کوئی سعی کی یا نہیں ـــــ گویا اللہ کے عفو و درگذر، اور رحم و کرم کی کوئی قدر کی یا نہیں ـــ!!

آخر میں یہ مشفقانہ اور مربیانہ تہدید نہایت شدید ہو گئی کہ دنیا والوں کو تو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ لیکن آخری اور فیصلہ کن سابقہ تو پیش آنے والا ہے اس ذات سے جو ہر کھلے اور چھپے، اور ظاہر و غائب کی جاننے والی ہے: لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ط (نہیں مخفی اللہ سے کوئی بھی چیز خواہ زمین میں ہو خواہ آسمانوں میں) پھر وہ تمہارا سارا کیا دھرا تمہارے سامنے رکھ دے گا ـــ!!

آیت ۱۰۶ میں بعض معین حضرات کا ذکر ہے جن کے معاملے کو قدرے موخر کر دیا، اور مغفرت کی واضح بشارت کے بجائے ان کو فی الحال "بین الخوف والرجاء" معلق کر دیا گیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں معاف کر دیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سزا دی جائے۔ ان حضرات کی توبہ کی قبولیت کا واشگاف اعلان بعد میں آیت ۱۱۸ میں وارد ہوا۔ لہٰذا ان حضرات کا تفصیلی ذکر اسی آیۂ مبارکہ کے ذیل میں ہو گا!!

یہاں اس قدر جان لینا چاہیئے کہ جیسے مومنینِ صادقین کے بہت سے مراتب و مدارج ہیں، اور اسی طرح نفاق کے بھی بہت سے مدارج ہیں۔ بالکل اسی طرح ضعفاء میں بھی بہت فرقِ مراتب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ان کا سب سے نچلا درجہ تو وہ ہے جو سورۂ حجرات کی آیت ۱۴ میں بیان ہوا جس میں ایمان کی کلی نفی کے ساتھ صرف اسلام کا اثبات ہے۔ لیکن ساتھ ہی نفاق کی بھی نفی ہے۔ اس لیئے ان کی اطاعت کو شرفِ قبول عطا فرمایا گیا ہے۔ جب کہ منافقین کا کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہو سکتا، گویا کہ یہ تو قانونی اسلام کی وہ صورت ہے جس میں دل میں نہ تو مثبت طور پر ایمان ہی متحقق ہے نہ منفی طور پر نفاق ـــ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ بالکل دوسری انتہا پر وہ لوگ ہوں گے جن سے صرف کبھی کبھار کوئی کوتاہی ہو جاتی ہو، ورنہ اکثر و بیشتر ان کا طرزِ عمل بالکل وہی ہو جو مومنینِ صادقین کا ہونا چاہیئے۔ ایسے لوگوں کی کوتاہیوں پر بظاہر عتاب زیادہ شدید ہوتا ہے۔ گویا کہ انہیں بھرپور طور پر احساس دلایا جاتا ہے کہ تم اور یہ تقصیر؟ ـــ!!

آیت ۱۰۲ میں دراصل اسی قسم کے لوگوں کا ذکر ہے ـــ اور ان دونوں کے

کو دو آتشہ بنانے کی غرض سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست بھی کی کہ ایک بار آپؐ وہاں نماز پڑھا کر گویا اس کا افتتاح بہ نفسِ نفیس فرمادیں تو آنحضورؐ نے بہ لطائف حیل ان کو ٹال دیا کہ فی الحال میں غزوۂ تبوک کی تیاریوں میں مصروف ہوں وہاں سے واپس آکر دیکھا جائے گا۔ گویا آپ منتظر تھے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اُن کی سازش کا پردہ چاک فرمادے، اور اُن کی اصل حقیقت وانکشاف فرمادے۔ تاکہ اُن کے خلاف اقدام کیا جا سکے۔ چنانچہ یہی وہ مقصد ہے جو سفرِ تبوک سے واپسی کے دوران اِن آیاتِ مبارکہ کے نزول سے پورا ہو گیا۔ نتیجۃً آپ نے واپس مدینہ پہنچ کر جو پہلا کام کیا وہ یہی تھا کہ اس نام نہاد مسجد کو گرادیا گیا، اور بعد میں ہمیشہ کے لئے اسلامی ادب میں "مسجدِ ضرار" ایک اصطلاح بن گئی ہر سازشی اڈے اور تخریبی مرکز کے لئے!

"ضرار" — ضرر سے باب مفاعلہ ہے، جس سے لفظ عناد اور عداوت و دشمنی میں مبالغے کی کیفیت بھی سامنے آتی ہے اور ضد اور ہٹ دھرمی کی بھی۔ گویا اس ایک لفظ میں نفاق کی تمام ظاہری اور باطنی کیفیات کو جمع کر لیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں منافقوں کا سب سے بڑا اور نمایاں وصف یہی بیان ہوا ہے کہ وہ جھوٹ بولنے میں نہایت بے باک ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جھوٹی قسمیں کھانے میں بھی بہت جری ہوتے ہیں۔ سورۂ منافقون میں فرمایا گیا: "اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً!" (انہوں نے قسموں کو اپنے لئے ڈھال بنالیا ہے!) اور جب بھی باز پرس ہوتی ہے تو جھوٹی قسمیں کھا کر چھوٹنے کی سعی بلیغ کرتے ہیں۔ وہی بات یہاں بھی بیان ہوئی کہ اس "مسجدِ ضرار" کی تعمیر پر بھی وہ تو قسمیں کھا کھا کر یہی کہیں گے کہ ہماری نیت نیک تھی اور سوائے خیر و صلاح کے ہمیں اور کچھ مطلوب نہ تھا لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ واضح رہے کہ حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام میں بھی منافقین کی اوّلین اور نمایاں ترین علامت کذب بیانی اور دروغ گوئی ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

آیت ۱۰۸ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کی توثیق وارد ہوئی کہ اس نام نہاد مسجد میں آپؐ کا تشریف لے جانا ہرگز مناسب نہ ہوتا۔ اوّل تو آپؐ کا اصل مرکز آپؐ کی اپنی مسجد ہے ہی اور اگر فاصلے کا عذر ہو تو نواحِ مدینہ میں مسجدِ قبا موجود ہے جس کی اساس اوّل روز سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اور جس میں وہ لوگ ہیں جنھیں صفائی

نبی !) آپ اس میں کبھی کھڑے ہونا بھی گوارا نہ فرمائیں۔ وہ مسجد کہ جس کی بنیاد اوّل روز سے تقویٰ پر رکھی گئی تھی، زیادہ حقدار ہے کہ آپ اُس میں کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاکیزگی کو بہت ہی عزیز رکھتے ہیں، اور اللہ انہیں عزیز رکھتا ہے جو پاکیزگی سے شدید محبت رکھتے ہیں۔ (ذرا سوچو!) کیا وہ شخص بہتر ہوگا جس نے اپنی عمارت کی اساس اللہ کے تقویٰ اور رضا جوئی پر رکھی یا وہ جس نے اپنی عمارت کی اساس کسی ایسے کنارے پر رکھی جو بیٹھ کر کھوکھلا ہو چکا تھا، اور بس گرا ہی چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ اس کے سمیت جہنم کی آگ میں جا گرا۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے اب ہمیشہ کے لئے ان کے دلوں میں بے یقینی کی جڑ بن کر جمی رہے گی (جس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی) سوائے اس کے کہ اُن کے دل ہی پاش پاش ہو جائیں اور اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا!"

ان آیات مبارکہ میں منافقین مدینہ کی ایک نہایت عیارانہ سازش کا ذکر ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنی مذموم سرگرمیوں کے لئے ایک اڈا اور اپنے باہمی رابطے کے لئے ایک مرکز تعمیر کیا لیکن اُسے نام مسجد کا دیا تاکہ کسی کے لئے اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نام نہاد مسجد مدینہ منورہ کے نواح میں کہیں مسجدِ قبا کے آس پاس تعمیر کی گئی ہوگی۔ اس لئے کہ مدینے کے مرکز میں تو مسجد نبوی موجود تھی جو ایمان و اسلام کا مرکز بھی تھی اور بر و تقویٰ کا گہوارہ بھی، اور اہلِ ایمان کی محبتوں اور عقیدتوں کا مرجع بھی تھی اور اُن کے جملہ اجتماعی معاملات کے طے پانے کا مقام بھی۔ گویا وہی اس اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ بھی تھی اور گورنمنٹ ہاؤس بھی ——— اور ظاہر ہے کہ وہاں منافقوں کے لئے کسی بھی درجے میں عمل دخل کا حصول ممکن نہ تھا، اور وہاں ان کی کچھ پیش نہ جا سکتی تھی۔ چارو ناچار انہوں نے ابو عامر راہب کے مشورے سے طے کیا کہ نواح مدینہ میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنائیں تاکہ وہ اُن کے باہمی رابطے کا مرکز بھی بن سکے اور اِدھر اُدھر سے آنے والے دشمنانِ ایمان و اسلام کی خفیہ قیام گاہ کا کام بھی دے سکے۔ اب ظاہر ہے کہ اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مومنین صادقین کی نگاہ حقیقت بیں سے ان کے اصل عزائم مخفی نہ تھے۔ تاہم چونکہ وہ قانوناً مسلمان تھے، اور یہی اس عمارت کو بھی انہوں نے ظاہری صورت مسجد ہی کی دی تھی لہٰذا اُن کے خلاف کوئی فوری اقدام مناسب نہ تھا۔ البتہ جب انہوں نے اپنی عیارانہ

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (البقرہ آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اس کے برعکس کفّار و منافقین کی تعمیر خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مضبوط اور شاندار کیوں نہ ہو ان کے نظریات و عقائد کی بے اصلی اور ان کے مقاصد و عزائم کی بے ثباتی کی بنا پر عالم حقیقت میں ایک ایسے گھروندے کے مانند ہے جس کی بنیاد کسی ندی نالے کے ایسے کھوکھلے کنارے پر رکھ دی گئی ہو جس کے نیچے سے پانی کے بہاؤ نے مٹی نکال دی ہو اور اب وہ ایک معلق کنگرے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی عمارت پر خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ صرف کی گئی ہو اور کیسا ہی حسین رنگ و روغن اس پر کیوں نہ مل دیا گیا ہو اسے کوئی ثبات یا دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ وقت آنے پر وہ گرے گی، اور سیدھی جہنم کی تہہ میں جا بیٹھے گی۔

اور اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر حقیقت یہ کہ ایسی عمارتیں خواہ ظاہری اعتبار سے ڈھے بھی جائیں ان کی وہ جڑیں جو اُن کے تعمیر کرنے والوں کے دلوں اور ذہنوں میں ہوتی ہیں، جوں کی توں برقرار رہتی ہیں — بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کی جڑیں سرطان کے مانند ان کے قلوب و اذہان کے ریشے ریشے میں اس طرح پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہ پھر ان کا نکالنا کسی طرح ممکن ہی نہیں رہتا سوائے اس کے کہ ان کے دلوں ہی کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ بات ۹ھ میں اس وقت کہی جا رہی ہے جب نفاق کا مرض منافقین کے دلوں اور ذہنوں میں فی الواقع اسی کیفیت کے ساتھ سرایت کر چکا تھا اور اس کی جڑیں ان کی سیرتوں اور شخصیتوں میں اسی طور سے پیوست ہو چکی تھیں۔ جس کا نقشہ کھینچا گیا سورۂ منافقون کی اس آیت میں کہ: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ٥ یعنی — "یہ اس لئے کہ وہ ایمان تو لائے تھے لیکن پھر کفر میں مبتلا ہو گئے۔ نتیجۃً ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور اب وہ فہم و تفقّہ سے بالکل عاری ہو چکے ہیں!"

آخری الفاظ۔ یعنی "تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ!" میں صنعتِ لفظی اور حسنِ معنوی کا ایک عجیب امتزاج پایا جاتا ہے۔ مزید برآں ان کے صوتی اثرات سے کیفیتِ تاثیر دو بالا ہو جاتی ہے۔ منافقین کے اندازوں کے برعکس — اور اُن کی توقعات کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے جو روز افزوں ترقّی اسلام کو عطا فرمائی اور جس طرح قدم قدم پر فتح و کامیابی

اور پاکیزگی انتہائی عزیز ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ اہلِ قُبا سے جب لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی صفائی و پاکیزگی سے محبت و الفت کا اس قدر شدّ و مدّ سے ذکر فرمایا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ حوائجِ ضروریہ سے فراغت کے بعد پہلے مٹی کے ڈھیلوں سے استنجا کرتے ہیں اور پھر پانی سے بھی طہارت حاصل کرتے ہیں ـــــ بہرنوع آنحضورؐ سے فرمایا گیا کہ اگر آپؐ کا اُدھر سے گذر ہو ہی جائے تو مسجد قبا اصل حقدار ہے اس کی کہ آپؐ اس میں رونق افروز ہوں نہ کہ یہ نام نہاد مسجدِ ضرار ـــــ !!

آیات ۱۰۹، ۱۱۰ میں ایک عجیب حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور وہ یہ کہ ہر عمارت جو اس زمین پر بنتی ہے۔ اس کی بنیادیں دو ہوتی ہیں: ایکؔ ظاہری اور مادّی بنیاد جو زمین پر یا اس میں قائم ہوتی ہے اور اینٹ گارے ایسی مادّی چیزوں سے بنی ہوتی ہے اور دوسؔری فکری یا نظریاتی بنیاد، جو اس تعمیر کے اٹھانے والوں کے دلوں اور ذہنوں میں ہوتی ہے --- اور ان کی نیتوں اور ارادوں ـــــ اور عزائم و مقاصد پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ بندۂ مومن کی ہر تعمیر کی اصل اساس اللہ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی و رضا جوئی کے نصب العین پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا ظاہری و مادّی اعتبار سے سادگی کے باوصف اسے دوام و ثبات نصیب ہوتا ہے، بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

"ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام ∴ جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام"!

اس کی اعلیٰ ترین اور نمایاں ترین مثال خانہ کعبہ کی تعمیر ہے جسے اُس کے مقدس معماروں یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیٰ نبیّنا وعلیہما الصّلوٰۃ والسّلام نے جن ارادوں اور اُمنگوں سے اُٹھایا وہ اُن کی اُس دُعا سے ظاہر ہے جو اُس کی تعمیر کے وقت اُن کے دلوں کی گہرائیوں سے اُبھر کر اُن کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھی:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥ (البقرہ آیات ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اس کے برعکس کفار و منافقین کی تعمیر خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مضبوط اور شاندار کیوں نہ ہو ان کے نظریات و عقائد کی بے اصلی اور ان کے مقاصد و عزائم کی بے ثباتی کی بنا پر عالمِ حقیقت میں ایک ایسے گھروندے کے مانند ہے جس کی بنیاد کسی ندی نالے کے ایسے کھوکھلے کنارے پر رکھ دی گئی ہو، جس کے نیچے سے پانی کے بہاؤ نے مٹی نکال دی ہو اور اب وہ ایک معلّق کنگرے سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی عمارت پر خواہ کتنی ہی محنت کیوں نہ صرف کی گئی ہو اور کیسا ہی حسین رنگ و روغن اس پر کیوں نہ مل دیا گیا ہو اسے کوئی ثبات یا دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ وقت آنے پر وہ گرے گی، اور سیدھی جہنّم کی تہہ میں جا بیٹھے گی ؛

اور اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر حقیقت یہ کہ ایسی عمارتیں خواہ ظاہری اعتبار سے ڈھے بھی جائیں ان کی وہ جڑیں جو اُن کے تعمیر کرنے والوں کے دلوں اور ذہنوں میں ہوتی ہیں، جوں کی توں برقرار رہتی ہیں ـــــ بلکہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ان کی جڑیں سرطان کے مانند ان کے قلوب و اذہان کے ریشے ریشے میں اس طرح پیوست ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کہ پھر ان کا نکالنا کسی طرح ممکن ہی نہیں رہتا سوائے اس کے کہ ان کے دلوں ہی کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے۔ واضح رہے کہ یہ بات ۹ھ میں اس وقت کہی جا رہی ہے جب نفاق کا مرض منافقین کے دلوں اور ذہنوں میں فی الواقع اسی کیفیت کے ساتھ سرایت کر چکا تھا اور اس کی جڑیں ان کی سیرتوں اور شخصیتوں میں اسی طور سے پیوست ہو چکی تھیں۔ جس کا نقشہ کھینچا گیا سورۂ منافقون کی اس آیت میں کہ : ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ٥ یعنی ـــ "یہ اس لئے کہ وہ ایمان تو لائے تھے لیکن پھر کفر میں مبتلا ہو گئے۔ نتیجۃً ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور اب وہ فہم و تفقّہ سے بالکل عاری ہو چکے ہیں!"

آخری الفاظ ـ یعنی "تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ!" میں صنعتِ لفظی اور حُسنِ معنوی کا ایک عجیب امتزاج پایا جاتا ہے۔ مزید برآں ان کے صوتی اثرات سے کیفیتِ تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے۔ منافقین کے اندازوں کے برعکس ـــ اور اُن کی توقعات کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے جو روز افزوں ترقی اسلام کو عطا فرمائی اور جس طرح قدم قدم پر فتح و کامیابی

اور پاکیزگی انتہائی عزیز ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ اہلِ قُبا سے جب لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگوں کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی صفائی و پاکیزگی سے محبت و الفت کا اس قدر شدّومدّ سے ذکر فرمایا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ حوائج ضروریہ سے فراغت کے بعد پہلے مٹی کے ڈھیلوں سے استنجا کرتے ہیں اور پھر پانی سے بھی طہارت حاصل کرتے ہیں ـــــ بہرنوع آنحضورؐ سے فرمایا گیا کہ اگر آپؐ کا اُدھر سے گذر ہو ہی جائے تو مسجد قبا اصل حقدار ہے اس کی کہ آپؐ اس میں رونق افروز ہوں نہ کہ یہ نام نہاد مسجدِ ضرار ـــــ !!

آیات ۱۰۹، ۱۱۰ میں ایک عجیب حقیقت پر سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور وہ یہ کہ ہر عمارت جو اس زمین پر بنتی ہے۔ اس کی بنیادیں دو ہوتی ہیں : ایکؔ ظاہری اور مادّی بنیاد جو زمین پر یا اس میں قائم ہوتی ہے اور اینٹ گارے ایسی مادّی چیزوں سے بنی ہوتی ہے اور دوسریؔ فکری یا نظریاتی بنیاد، جو اس تعمیر کے اٹھانے والوں کے دلوں اور ذہنوں میں ہوتی ہے ـــــ اور ان کی نیتوں اور ارادوں ـــــ اور عزائم و مقاصد پر مشتمل ہوتی ہے۔ چنانچہ بندۂ مومن کی ہر تعمیر کی اصل اساس اللہ کے تقویٰ اور اس کی خوشنودی و رضا جوئی کے نصب العین پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا ظاہری و مادّی اعتبار سے سادگی کے باوصف اسے دوام و بقا نصیب ہوتا ہے، بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

"ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام ✣ جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام!"

اس کی اعلیٰ ترین اور نمایاں ترین مثال خانہ کعبہ کی تعمیر ہے جسے اُس کے مقدس معماروں یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیٰ نبیّنا و علیہما الصّلوٰۃ والسّلام نے جن ارادوں اور اُمنگوں سے اُٹھایا وہ اُن کی اُس دُعا سے ظاہر ہے جو اُس کی تعمیر کے وقت اُن کے دلوں کی گہرائیوں سے اُبھر کر اُن کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھی :

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمٰعِيلُ ۖ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ

کچھ دینا بھی پڑتا ہے ۔۔ اور تجارت سے اگر نفع مقصود ہو تو کچھ نہ کچھ سرمایہ بھی لگانا پڑتا ہے اور پھر جسم و جان کی محنتیں اور صلاحیتیں بھی صرف کرنی پڑتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں عبد و معبود کے مابین دو طرفہ معاملات کے باطنی و قلبی پہلوؤں یعنی محبت و انابت، صبر و شکر، تسلیم و رضا وغیرہ کی وضاحت کے لئے لطیف پیرایہ ہائے بیان اختیار کئے ہیں وہاں اس کے ظاہری اور عملی پہلوؤں کی تعبیر کے لئے تجارت اور بیع و شرا کی آسان اور جانی پہچانی تشبیہوں کو ذریعہ بنایا ہے ؛

اللہ اور آخرت پر ایمان کا اصل حاصل یہی ہے کہ انسان اُخروی نجات اور فوز و فلاح کے حصول یعنی جہنم سے چھٹکارا پانے اور جنت میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے اس دنیا میں اپنا جسم و جان اور مال و منال سب اللہ کے حوالے کر دے ، اور پھر اس کی جانب سے ان سب کا امین بن کر اُن میں اس کی مرضی کے مطابق تصرّف کرے اور جہاں اس کا اشارہ پائے انہیں صرف کر کے سرخرو ہو جائے۔ گویا یہ ایک نہایت وسیع اور ہمہ جہتی معاملہ ہے ایمان کے بعد انسان اپنے جسم و جان اور مال و منال میں جو تصرّف کرتا ہے اس کا مالکِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہونا لازمی ہے، ورنہ ایک خیانت تصوّر ہوگی بقول شیخ سعدیؒ : ے

"ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست ؛ در حقیقت مالکِ ہر شے خداست !"

چنانچہ انسان جو لقمہ بھی خود اپنے یا اپنے اہل و عیال کے منہ میں ڈالتا ہے وہ بھی دراصل اذنِ ربّ کے تحت ہے بفحوائے فرمانِ نبویؐ : "وانّ لنفسك عليك حقّا وانّ لزوجك عليك حقّا" ...... (الحدیث) یعنی تم پر تمہارے نفس کا بھی حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی حق ہے ، وقس علیٰ ذلك - تاہم اس معاملے میں ایمان کا اصل تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے جسم و جان اور مال و منال کا صرف قدر قلیل اپنے اور اپنے اہل و عیال کی قوتِ لایموت کے لئے مختص کرنے کے بعد باقی جو بھی بچے اسے ہر دم اللہ اور اس کے دین کے لئے صرف کرتا رہے بفحوائے الفاظِ قرآنی : "وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ !" یعنی (اے نبی !) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا کچھ صرف کریں کہہ دیجئے کہ جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو !۔ اور اس کا نقطۂ عروج (x ۸ ۱۴ / ۷ ۷) یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو تو انسان گھر بار، مال و منال اور اہل و عیال سب سے

نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کے قدم چومے اس سے منافقین کے دلوں پر جو بیتی ہوگی اور رنج و غم کے جو پہاڑ ٹوٹے ہوں گے اُن کی حسین ترین تعبیر "تَقَطَّعَ قُلُوْبُھُمْ" میں جھلک رہی ہے۔ بالکل یہی انداز ہے سورۂ آلِ عمران میں وارد شدہ الفاظ: "قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِکُمْ!" کا کہ اب تم اپنے غیظ و غضب اور بغض و عناد کی آگ میں خود ہی جل مرو اور ناکامی و نامرادی کے رنج و غم کی بھٹی میں آپ بھسم ہو جاؤ۔!! اعاذنا اللہ من ذٰلک، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(۵)

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۱ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"بے شک خرید لئے ہیں اللہ نے ایمان والوں سے اُن کی جانیں اور اُن کے اموال اس قیمت پر کہ اُن کے لئے جنّت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، چنانچہ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ وعدہ ہو چکا اس کے ذمّے سچّا، تورات میں بھی، انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہو سکتا ہے! پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے، اور واقعہ یہ ہے، بڑی کامیابی یہی ہے!"

یہ آیۂ مبارکہ بلاشبہ قرآنِ حکیم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ قرآن کے اعجاز کا کمال یہ ہے کہ وہ اعلیٰ ترین علمی حقائق کو نہایت سادہ الفاظ میں پیش کرتا ہے اور عامۃ النّاس سے بالکل اُن کی ذہنی سطح کے مطابق کلام فرماتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسا کوئی انسان نہیں ہو سکتا جو تجارت و کاروبار، بیع و شرا اور خرید و فروخت ایسے معاملات کو نہ سمجھتا ہو اور کوئی عامی سے عامی انسان بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو یہ نہ جانتا ہو کہ جہاں کچھ 'لینا' مقصود ہو وہاں

وہاں تجارت اور بیع و شراء کے عام فہم الفاظ کے بجائے فلسفہ و حکمتِ قرآنی کی ایک نہایت اہم اصطلاح یعنی "خلافتِ انسانی" کے حوالے سے بات کی گئی ہے، سورۂ حدید کی ابتدائی چند آیات میں ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کا ذکر نہایت رفعتِ شان کے ساتھ اعلیٰ ترین علمی سطح پر ہوا ہے اور اس کے بعد ساتویں آیت میں ایمان باللہ کے عملی تقاضوں کو حد درجہ جامعیت اور کمالِ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ایک آیت میں بایں الفاظ سمو دیا گیا کہ:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ	(یعنی، ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور کھپاؤ اور صرف کرو ان تمام چیزوں میں سے

جن میں اُس نے تمھیں خلافت کا حامل بنا دیا ہے!

اور پھر آتا ہے اسی وعدۂ ربّانی کا ذکر جو آیت زیرِ درس میں نہایت مؤکّد و مکرّر صورت میں وارد ہوا ہے ـــ یعنی: "فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝" (یعنی جو ایمان لے آئیں اور اس کے عملی تقاضے یعنی انفاقِ مال اور بذلِ نفس سے عہدہ برآ ہو جائیں اُن کے لئے بہت بڑا اجر و ثواب ہے!) ـــ آیتِ زیرِ درس میں اس ضمن میں جو تاکید آئی ہے یعنی یہ کہ یہ وعدہ برحق ہے، اس کا ذمّہ دار اللہ ہے، یہ تورات اور انجیل اور قرآن تینوں کتابوں میں وارد ہوا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کا پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے، تو اس کا سبب یہ ہے کہ بندے اور ربّ کے مابین یہ بیع و شرا نقد نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیّت گویا بیع سَلَم کی ہے جس میں ایک فریق کی جانب سے مکمل ادائیگی فوری طور پر ہو جاتی ہے اور دوسرے فریق کی جانب سے اس کے معاوضے کی ادائیگی ایک وقتِ معیّن کے لئے مؤخّر ہوتی ہے۔ اس میں ظاہر ہے کہ دار و مدار فریقِ ثانی کے قابلِ اعتماد ہونے کے یقین پر ہے، اور اس کا براہِ راست تعلّق خود نفسِ ایمان سے ہے۔ گویا جتنا جتنا ایمان بڑھتا چلا جائے گا اُتنا ہی اللہ کی ذات پر اعتماد اور "اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ!" پر یقین میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور اتنی ہی اللہ کے ساتھ اس بیع و شراء میں شدّت بھی بڑھتی چلی جائے گی اور اس میں مزید نکھار آتا چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ انسان "نقدِ جان" کے عوض آخرت کی "حیاتِ دوام" کا سودا چکانے میں کوئی باک محسوس نہ کرے گا، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ	(یعنی، جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں

منہ موڑ کر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھے اور قتال فی سبیل اللہ کے لئے میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے اور اگر اللہ تعالیٰ جان کا نذرانہ قبول فرمائے تو اسے سب سے بڑی کامیابی اور سعادت سمجھے ورنہ منتظر رہے کہ کب وہ وقت آئے کہ وہ جان کا نذرانہ پیش کر کے سرخرو اور گردن کٹا کر سبکدوش ہو جائے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝	(یعنی) اہلِ ایمان میں وہ جوانمرد ہیں جنھوں نے پورا کر دکھایا وہ عہد جو انھوں نے اللہ سے کیا تھا۔ چنانچہ ان میں سے وہ بھی ہیں جو اپنا نذرانہ پیش کر چکے ہیں اور وہ بھی ہیں جو اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہرحال انھوں نے (اپنے معاہدے میں) سرِمو کوئی تبدیلی نہیں کی!"

یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم از کم دو مقامات پر ضرور وارد ہوتے ہیں اور ہر اہم آیت کا کوئی نہ کوئی مثنیٰ ضرور ہوتا ہے۔ اس اصول کو ملحوظِ نظر رکھ کر نظر دوڑائی جائے تو اس آیۂ مبارکہ کا مثنیٰ سورۂ صف کی آیات ۱۰، ۱۱ میں ملتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ یہاں بیع و شرا کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور وہاں لفظ تجارت وارد ہوا ہے۔ یہاں کامیابی کی آخری منزل یعنی حصولِ جنت کا ذکر ہے۔ وہاں اس کے ابتدائی مرحلے یعنی جہنم سے نجات پانے کی بات ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح وارد ہوئی ہے اور یہاں اس کی بلند ترین چوٹی (ذروۂ سنام) قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝	(یعنی) اے اہلِ ایمان! کیا میں تمھاری رہنمائی کروں اس تجارت کی جانب جو تمھیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اپنی جانوں اور اپنے اموال کے ساتھ۔ یہی بہتر ہے تمھارے حق میں اگر تم واقعی صاحبِ علم و فہم ہو!

مزید غور کیا جائے تو یہی مضمون سورۂ حدید میں ایک بلند تر سطح پر وارد ہوا ہے چنانچہ

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ ط یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ

(یعنی - اے نبیؐ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں اصل میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں - اُن کے ہاتھوں کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے! (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ)

اللّٰھم ربّنا اجعلنا منھم ـــــ آمین ثم آمین ـــــ !!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(٦)

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاھُوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۱۲)

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۲ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"اللہ کی طرف پلٹنے والے، اُس کی بندگی کا حق ادا کرنے والے، شکر و ثناء میں مشغول رہنے والے، اُس کے لئے سب سے مُنہ موڑ لینے والے، رکوع و سجود میں مشغول رہنے والے نیکی کا حکم دینے والے اور بدی سے روکنے والے اور اللہ کی حُدود کی حفاظت کرنے والے اور (اے نبیؐ!) ایسے اہلِ ایمان کو خوشخبری سُنا دیجئے!"

اس آیۂ مبارکہ کے مفہوم کی تعیین میں ایک اشکال ہے اور وہ یہ کہ اس کا آخری ٹکڑا یعنی "بشّرِ المومنین" تو کلامِ انشائیہ پر مشتمل ہے اور ایک مکمّل جملہ ہے جو ماسبق سے حرفِ عطف 'واؤ' کے ذریعے جڑا ہوا ہے لیکن پہلا اور بڑا حصّہ بہت سے اسمائے صفات پر مشتمل ہے، جنھیں اگر مبتداء قرار دیا جائے تو خبر کو محذوف ماننا پڑتا ہے۔ خالص نو اعد کی رُو سے یہ دونوں صورتیں یکساں ممکن ہیں۔ چنانچہ بعض حضرات نے اسے مبتدا مانا ہے اور خبر کو محذوف قرار دیا ہے۔ گویا ان کے نزدیک تالیفِ کلام یوں ہے کہ ان صفات کے حامل لوگ ہی حقیقتاً مومن ہیں اور اے نبیؐ! آپ انہیں بشارت دیجئے! یہ تعبیر بھی بجائے خود نہایت اعلیٰ ہے اور اس معنی میں یہ آیت سورۂ انفال کی آیات ۲ تا ۴ کا مثنیٰ بن جائے گی، جہاں ایمان حقیقی کے ایسے ہی ثمرات و لوازم کے ذکر کے بعد فرمایا گیا کہ: "اُولٰٓئِکَ

اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ — انہیں مردہ مت کہو۔ حقیقتاً وہ زندہ ہیں اگرچہ تمہیں اس کا شعور حاصل نہیں!"

اور بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

"برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ٭ ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی!"

آگے اس یقین کا نتیجہ سامنے آتا ہے "استبشار" یعنی خوشی منانا یا خوشخبری حاصل کرنا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اصل کسوٹی ہے انسان کے خلوص یا عدم خلوص کی۔ اگر اللہ کے ساتھ اس سودے سے انشراحِ صدر اور انبساطِ قلب کی کیفیت حاصل ہو تو یہ دلیل ہے یقین واقعی اور ایمانِ حقیقی کی اور ثبوت ہے جہاد و قتال فی سبیل اللہ اور اللہ کی راہ میں انفاقِ مال اور بذلِ نفس کے مبنی بر خلوص و اخلاص ہونے کا۔ جیسے کہ بالکل بے ساختہ الفاظ نکلے تھے حضرت خبیبؓ بن عدی کی زبان سے جب کفار ان کو شہید کرنے کے درپے تھے اور نیزے کی انی ان کے جگر میں چبھوئی گئی تھی کہ "فُزْتُ وَ رَبِّ الْكَعْبَةِ" یعنی — رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا!" — کاش کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اسی ایمان و یقین اور خلوص و اخلاص کی کوئی رمق عطا فرما دے ع: "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!"

آیت کے آخری حصے میں وارد شدہ الفاظِ مبارکہ: "بِبَيْعِكُمُ" اور "بَايَعْتُمْ بِهٖ" ہی سے نظامِ دین کی ایک اہم اصطلاح "بیعت" نکلی ہے، جو بدقسمتی سے اس دور میں بہت حد تک نہ صرف متروک بلکہ بدنام بھی ہو گئی ہے۔ حالانکہ قرآن اور حدیث کی اصل اصطلاح بھی یہی ہے، سیرت النبیؐ میں بھی یہ لفظ بار بار وارد ہوا ہے اور اسی پر بعد میں نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ استوار ہوا تھا۔ یہاں تک تو یہ اصطلاح اپنے پورے مفہوم کے ساتھ رہی لیکن بعد میں جب مسلمانوں کی سیاسی و دینی قیادت منقسم ہو گئی تو پھر اس کا استعمال محدود مفہوم میں صرف "بیعتِ ارشاد" کے لئے ہونے لگا۔ اب ضرورت ہے کہ دوبارہ اس اصل ثابت کی جانب رجوع کیا جائے اور مسلمان اپنی جملہ اجتماعی و تنظیمی ہیئتیں اسی پر استوار کریں — یہ بھی واضح رہے کہ اللہ کے ساتھ یہ بیع و شراء اگرچہ بندے اور ربّ کے مابین خالص نجی معاملہ ہے لیکن عالمِ واقعہ میں اس کی صورت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا آپؐ کے نائبین میں سے کسی کے ہاتھ پر "بیعت" ہی کی ہوگی جیسے کہ ارشاد ہوا سورۂ فتح کی آیت ۱۰ میں "بیعتِ رضوان" کے ضمن میں کہ:

میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہ ہمارے دین میں چوٹی کا عمل یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں: "ذُرْوَۃُ السَّنَام" بھی ہے، اور بِرّ و تقویٰ کے قرآنی تصوّر کی رُو سے خیرِ اعلیٰ یعنی HIGHEST VIRTUE یا SUMMUM BONUM بھی بفحوائے الفاظِ قرآنی: (البقرہ: ۱۷۷)

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

(یعنی) بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، تکلیف و اذیت میں اور جنگ و قتال میں، یہی ہیں درحقیقت سچے اور یہی ہیں فی الواقع متقی۔

یا :- اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (الصّف: ۴)

(یعنی) "اللہ تو محبت کرتا ہے ان سے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر جنگ کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں!"

لیکن ظاہر ہے کہ یہ چوٹی کا عمل اسی شخص کی جانب سے قبول ہوگا جو ایک جانب عمل کے بھی دوسرے اساسی و بنیادی تقاضے ادا کر رہا ہو اور دوسری جانب اُس کا یہ سارا معاملہ عملی ہی عملی اور ظاہری ہی ظاہری نہ ہو بلکہ اُس کا باطن بھی ایمان سے منوّر ہو اور اُس کے قلب و ذہن میں ایمانی کیفیات و احساسات موجود ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ بندۂ مومن کی مکمل شخصیت کی پوری تصویر کشی کے لئے آیۂ زیرِ درس میں ایمان کے باطنی ثمرات و لوازم کو بھی نمایاں کر دیا گیا اور اُس کے ظہورِ خارجی کے بھی بنیادی اور اساسی پہلوؤں کو اُجاگر کر دیا گیا۔ تاکہ ان دونوں آیات کے مجموعے سے قرآن کے انسانِ مطلوب کا پورا کردار بیک وقت نگاہوں کے سامنے آجائے:

اس ضمن میں سب سے پہلا وصف توبہ ہے، جس کے معنی ہیں پلٹنا اور رجوع کرنا۔ اس معنی میں اس سے مراد کفر و شرک کو چھوڑ کر اوّلاً ایمان لانا بھی ہے ––– اور گناہ و معصیت کو ترک کر کے تجدیدِ ایمان کرنا بھی۔ گویا توبہ اور ایمان لازم و ملزوم ہیں، جیسے فرمایا سورۂ الفرقان کی آیت ۷۰ میں: "اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا" یعنی: "سوائے اُس کے جس نے توبہ کی اور جو ایمان لایا یا جس نے ایمان کی تجدید کی اور عمل کیا اچھا!" ––– الغرض توبہ ایمان و اسلام کے دائرے میں داخلے کا عنوانِ اوّلین بھی ہے اور سلوک کی راہ کا پہلا قدم بھی!––

هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط یعنی "یہی لوگ حقیقتاً مومن ہیں!" — لیکن اکثر حضرات کے نزدیک یہاں مبتدا محذوف ہے اور مذکورہ صفاتِ حسنہ سب اُس کی خبر ہیں اور کلام کی تالیف گویا یوں ہے کہ : اُولٰٓئِكَ هُمُ التَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ ...... الخ (یعنی یہی لوگ ہیں توبہ کرنے والے، عبادت کا حق ادا کرنے والے، حمد کے ترانے الاپنے والے ..... الخ) — یہ تعبیر اس اعتبار سے نہایت وقیع ہے کہ اس طرح اس آیتِ مبارکہ کا ایک نہایت گہرا اور معنی خیز ربط و تعلق آیتِ سابقہ کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے — اور اس ربط و تعلق سے فلسفہ وحکمتِ دین کا وہ پہلو سامنے آتا ہے جو نہایت اہم اور اساسی ہونے کے باوجود اکثر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں نہایت یک رُخی شخصیتیں وجود میں آتی ہیں ؛

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دین اصلاً تو نام ہے عبد و معبود کے مابین ایک واقعی اور حقیقی تعلق کا۔ لیکن یہ تعلق یک رُخا نہیں بلکہ ہمہ پہلو اور ہمہ جہتی ہونا چاہیے۔ یعنی علمی بھی اور عملی بھی، ظاہری بھی اور باطنی بھی، عقلی بھی اور جذباتی بھی، گویا ایک جانب انسان کے ایمان و یقین، عشق و محبت، توکل و اعتماد، صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی ذات بن جائے تو دوسری جانب اس کے جملہ اعضاء و جوارح بھی اسی کے ساتھ مشغول رہیں، چنانچہ زبان پر اسی کے ترانے جاری رہیں، ہاتھ پاؤں اسی کے احکام بجا لانے میں مصروف رہیں اور اس کا محبوبِ حقیقی اور اس کی کل سعی و جُہد اور بھاگ دوڑ کا مطلوب و مقصودِ اصلی صرف اللہ بن جائے، اور انسان اس صبغۃ اللہ میں رنگ کر بالکل یک رنگ اور یکسو ہو جائے۔ لیکن اکثر و بیشتر عملاً یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے مزاج یک رُخے ہوتے ہیں۔ چنانچہ کچھ فعّال، اور خارج پسند لوگ یعنی EXTROVERTS ہوتے ہیں جو عملی میدان میں تو خوب سرگرم رہتے ہیں لیکن باطنی کیفیات سے کم و بیش محروم رہ جاتے ہیں، جبکہ دوسرے لوگ دروں بین یعنی ENTEROVERTS ہوتے ہیں جو داخلی کیفیات میں اس درجہ مگن ہو جاتے ہیں کہ عملی تقاضے ادا ہونے سے رہ جاتے ہیں ——!!

آیۂ ماسبق میں دین کے عملی پہلوؤں میں سے بھی چوٹی کا عمل نہایت شدّ و مدّ کے ساتھ مذکور ہوا تھا، یعنی : يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۝ یعنی "اللہ کی راہ میں جنگ کرنا، اور کفّار کو قتل کرنا اور خود بھی جامِ شہادت نوش کرنا!" — اس

لُبّ لُباب بھی ہے اور ان سب کے گرد ایک حفاظتی فصیل کی حیثیت بھی رکھتا ہے، اور اس کے اوپر تو بس اب ایک ہی وصف اور ہے، اور وہ ہے جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ جس کا ذروۂ سنام ہے قتال و مقاتلہ فی سبیل اللہ جس پر نہایت جامع اور عظیم الشان آیت آیۂ زیرِ درس سے متصلاً قبل وارد ہو چکی ہے ❊

مبارک ہیں وہ لوگ جو ان اوصافِ حسنہ کو بقدرِ ہمت و ظرف اپنی سیرتوں اور شخصیتوں میں جمع کر لیں - اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ ـــ آمین، ❊

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

(۷)

مَا كَانَ لِلنَّبِیِّ

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ یَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِیْنَ وَلَوْ كَانُوْۤا اُولِیْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَاۤ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى یُبَیِّنَ لَهُمْ مَّا یَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۱۶﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۱۳ تا ۱۱۶ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"نبیؐ اور مومنوں کے شایانِ شان نہیں ہے کہ وہ مشرکوں کے لئے مغفرت طلب کریں خواہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں جب کہ ان پر واضح ہو چکا کہ وہ جہنمی ہیں اور ابراہیمؑ کی اپنے باپ کے حق میں مغفرت کی درخواست صرف اس وعدے کی وجہ سے تھی جو وہ اس سے کر چکا تھا۔ پھر جب اس پر بھی واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اُس سے اظہارِ بیزاری کر دیا۔ یقیناً ابراہیم بہت ہی رقیق القلب اور حلیم الطبع تھا ـــ اور کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد اس وقت تک گمراہ نہیں کرتا

دوسرا وصف عبادت ہے، جو بندگی اور پرستش دونوں کو محیط ہے' اور از روئے قرآن یہی غایتِ حیاتِ دُنیوی ہے۔ بمصداقِ الفاظِ قرآنی: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ۝" — اور بقول شیخ سعدیؒ ؎

"زندگی آمد برائے بندگی ❊ زندگی بے بندگی شرمندگی"

واضح رہے کہ عبادت کے قرآنی مفہوم میں دو اجزاء برابر کے شریک ہیں، ایک اللہ کی اطاعت کلی اور دوسرے اس کی شدید محبت —!!

تیسرا وصف حمد ہے، اور یہ بھی مجموعہ ہے شکر و ثناء اور تعریف و توصیف دونوں کا شکر کسی منعم و محسن کے ایسے انعام و احسان پر کیا جاتا ہے جس کا فیض شکر کرنے والے کی ذات کو براہِ راست پہنچے جبکہ تعریف و توصیف کسی بھی صاحب حسن و کمال کی کی جائے گی، خواہ اس کے حسن و کمال سے تعریف کرنے والے کی ذات کو کوئی براہِ راست فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔

چوتھا وصف سیاحت ہے، پرانے زمانے میں اس کا مفہوم تھا بن باس لے لینا اور اللہ سے لو لگانے کی خاطر گھر بار، اہل و عیال، مال و منال اور آرام و آسائش سے بالکلیہ مُنہ موڑ کر جنگلوں میں نکل جانا اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا دَرّوں میں جا دھونی رمانا۔ اسلام میں اس کی آخری شکل یعنی رہبانیت تو حرام کر دی گئی ہے، البتہ اس کی روح برقرار ہے اور اس کا ظہور روزہ و اعتکاف اور تحصیل علم دین یا تبلیغ و اشاعتِ دین اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لئے گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس کا خصوصی ذکر آگے آیت ۱۲۲ میں آ رہا ہے!

پانچویں اور چھٹے اوصاف رکوع و سجود ہیں جو عبارت ہیں نماز سے۔ جو از روئے فرمانِ نبویؐ دین کا ستون بھی ہے اور بندۂ مومن کی معراج بھی — اور اس میں بھی جہاں فرض نمازیں مراد ہیں وہاں نفلی نمازوں کی جانب بھی اشارہ موجود ہے۔

اسی طرح ساتویں اور آٹھویں اوصاف یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں یعنی نیکی کی اشاعت و تبلیغ، دعوت و تلقین اور جہاں ممکن ہو اس کی بالفعل ترویج و تنفیذ — اور بدی کی تردید و مذمت اور اس کے خلاف وعظ و نصیحت ... اگر زور چلے تو اس کا بالجبر استیصال اور بیخ کنی — !!

نواں اور آخری وصف ہے حفاظتِ حدودِ الٰہی — اور یہ گویا ان جملہ اوصاف کا

ن امتحان یہی ہے، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎
ل و دولتِ دُنیا، یہ رشتہ و پیوند ∴ بُتانِ وہم و گماں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
یہ ہے کہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۶ میں دُخولِ جنّت کی شرائط کے ضمن میں اس
ن میں کامیابی کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے کہ :

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا	(یعنی) کیا تم نے یہ گمان کیا تھا کہ یونہی چھوڑ
يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ	جاؤ گے ؟ حالانکہ ابھی تو اللہ نے دیکھا ہی
وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	نہیں کہ تم میں سے کن لوگوں نے جہاد کا حق ادا
وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ	کیا اور اللہ اور اس کے رسول، اور اہلِ ایمان کے
وَلِيْجَةً ط (سورۂ توبہ آیت ۱۶)	سوا کسی کو دلی دوست نہ بنایا !

کیفیت کا نقطۂ عُروج یہ ہے کہ بندۂ مومن کی زبان سے کسی مشرک کے حق میں دعائے
رت بھی نہ نکلے، خواہ وہ کتنا ہی قریبی رشتہ دار حتیٰ کہ باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے
رک اللہ تعالیٰ کی جناب میں بہت بڑی گستاخی ہی نہیں کھُلی بغاوت ہے۔ یہی وجہ ہے
زرُوئے قرآنِ حکیم یہ ناقابلِ معافی جُرم ہے، جیسے کہ دو بار فرمایا سورۂ نساء میں کہ : اِنَّ
لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ط یعنی : " اللہ اسے تو
نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے، ہاں اس سے کمتر گناہ جس کے چاہے گا بخش
ے گا ! " جب کہ مشرک کے حق میں استغفار کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ شرک کو قابلِ معافی تصور سمجھا
ے جو نصِّ صریح کے خلاف ہے۔ الغرض عقل و نقل دونوں کا تقاضا ہے کہ بندۂ مومن کسی
ک کے حق میں دُعائے مغفرت نہ کرے خواہ وہ اُس کا کتنا ہی عزیز قرابت دار کیوں نہ ہو۔
اس قاعدۂ کلیہ میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ کوئی شخص اگرچہ فی الوقت
ے کی آلائش میں ملوث ہو لیکن ابھی اُس کی جانب سے مایوسی نہ ہوئی ہو اور کسی بھی درجے
یہ اُمید باقی ہو کہ شاید وہ راہِ راست پر آجائے اور شرک سے توبہ کرلے تو ایسے شخص کے حق
دُعائے مغفرت غلط نہ ہو گی۔ اس لئے کہ اصلاً اُس سے مراد دُعائے ہدایت ہو گی، گویا اس
رت میں : " اے ربّ ! میرے فلاں عزیز کو معاف فرما دے ! " کے معنی یہ ہوں گے
: " اے اللہ ! اسے توبہ کی توفیق بخش دے اور راہِ ہدایت پر گامزن فرما دے ! " اور
ہر ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ جب یہ بات پورے طور پر کھُل جائے کہ

جب تک کہ ان پر وہ سب کچھ واضح نہ کر دے جس سے انہیں بچنا ہے! بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ یقیناً اللہ ہی کے لئے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی، وہی جِلاتا ہے اور وہی مارتا ہے، اور اللہ کے سوا تمھارا نہ کوئی حامی ہے نہ مددگار!"—————— صدق اللہُ العظیم !!

اللہ تعالیٰ اور اہلِ ایمان کے مابین جس کُلّی بیع و شراء کا ذکر آیت ۱۱۱ میں ہوا ر اُسی کی مناسبت سے اہل ایمان کے جن خصائص و اوصاف کا ذکر آیت ۱۱۲ میں وا ان سب کا ایک منطقی نتیجہ یہ بھی ہے کہ بندۂ مومن کی الفت و محبّت اور نفرت و داوت کا معیارِ واحد مرضیٔ مولا بن جائے۔ جیسے کہ فرمایا گیا سورۂ فتح کی آخری آیت یں کہ: "مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" جتی: "اللہ کے رسول محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم!) اور اُن کے ساتھی (اہلِ ایمان) نہایت سخت ہیں کفّار کے حق میں اور حد درجہ رحیم و شفیق ہیں آپس میں!"— یا جیسے کہ اشارہ فرمایا گیا سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ میں: "اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ" کے معجز نما الفاظِ مبارکہ کے ذریعے جن کی نہایت خوبصورت ترجمانی کی ہے علّامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس شعر میں کہ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم ؛ رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن!

اور یہی ہے وہ حقیقت جسے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان فرمایا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اس حدیثِ مبارک میں کہ: مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَ مَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ! یعنی: "جس نے محبّت کی تو صرف اللہ کے لئے کی، اور کسی سے بُغض رکھا تو صرف اللہ کے لئے رکھا، اور کچھ دیا تو اللہ کے لئے دیا۔ اور روکا تو اللہ کے لئے روکا، اُس نے ایمان کی تکمیل کر لی!"—

ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کے اِن دو طرفہ تقاضوں یعنی "اَلْحُبُّ لِلّٰهِ!" اور "اَلْبُغْضُ فِي اللّٰهِ!" میں سے مثبت تقاضا یعنی اللہ کے لئے کسی سے محبّت کرنا اس قدر دشوار نہیں ہے جتنا کہ منفی تقاضا یعنی غیرت و حمیّتِ دینی کی تلوار سے جُملہ دوستیوں، رشتہ داریوں، دیرینہ تعلّقات، طبعی الفتوں اور قلبی محبّتوں کو کاٹ پھینکنا مشکل ہے— اور واقعہ یہ ہے کہ کسی بندۂ مُوحّد کے لئے توحید کے امتحانات میں سب سے

شفقت تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے حق میں تو آپؐ : عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ کے مصداقِ کامل تھے ہی لیکن بسا اوقات کافر و منافق بھی آپؐ کی طبعی رأفت و رحمت سے غلط فائدہ اٹھا لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں دو بار آپؐ کو تاکید فرمائی گئی کہ :

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنَافِقِينَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ

(یعنی) "اے نبیؐ! کافروں اور منافقوں سے جہاد کیجئے اور اُن پر سختی کیجئے!"—

اور ہم کہتے ہیں کہ اسی : "اَوَّاهٌ حَلِيمٌ" کی شانِ رفیع کا پرتوِ کامل موجود تھا صدیقِ اکبر حضرت ابوبکرؓ کی سیرت و شخصیت میں! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ!) ❊

آیت ۱۱۵ میں اُن اہلِ ایمان کی دلجوئی ہے جو اسی طبعی رأفت و رحمت کے باعث اپنے مشرک اعزّہ و اقارب کے حق میں دُعائے مغفرت کرتے رہے ہوں گے اور اِن آیات کے نزول پر نہایت پریشان و پشیمان ہو گئے ہوں گے۔ اُنہیں تسلی دے دی گئی کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ کسی کو ہدایت دینے کے بعد اُس سے کسی ایسی تقصیر کے باعث سلبِ توفیق کر کے اُسے گمراہی کے حوالے کر دے جس کی ممانعت کی صراحت نہ کر دی گئی ہو گویا گذشتہ را صلوٰۃ، آئندہ را احتیاط!— بالکل یہی انداز ہے اُس آیت کا جو تحویلِ قبلہ کے ضمن میں نازل ہوئی کہ : مَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ! یعنی: "تمہارے ایمان اللہ تعالیٰ ضائع کرنے والا نہیں ہے!"— تم اپنے دلوں میں خواہ مخواہ کی تشویش کو راہ نہ پانے دو۔ اور بالکل یہی بات ہے جو شراب کی آخری اور قطعی حرمت کا حکم نازل ہونے پر فرمائی گئی کہ اس حکمِ تحریم کے نزول سے قبل اگر کوئی شراب پیتا رہا تو اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اگرچہ ایسے بھی بے شمار لوگ تھے جنہوں نے ابتدائی اشاروں ہی سے پوری بات پا لی تھی اور بہت پہلے مے نوشی ترک کر دی تھی۔ بلکہ وہ بھی تھے جو اس اُمّ الخبائث کی آخری حرمت کے شدت سے منتظر تھے یعنی حضرت عمرؓ جو: "الّذی وافق رأیهٗ بالوحی والکتٰب" ہی نہیں: "الّذی وافق الوحی والکتٰب برأیه" کے مصداقِ اتم تھے! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ)

اللہ ہر چیز کا علمِ کامل رکھتا ہے۔ یعنی وہ ہر شخص سے معاملہ اس علمِ کامل کی بنیاد پر کرے گا کہ کب کوئی حقیقت اُس پر منکشف ہوئی اور اس انکشافِ حق کے بعد اس نے

وہ کفر اور شرک پر اڑ گیا ہے تو اس صورت میں اس کے لئے دُعا کے معنی یہ ہیں کہ رشتہ داری کے تعلّق کو خدا کی وفاداری کے تعلّق سے زیادہ اہم اور قوی سمجھا جا رہا ہے۔ گویا حمیّتِ جاہلی حمیّتِ دینی سے بڑھ کر ہے ـــ اور ظاہر ہے کہ اسے ایمان کے ساتھ کوئی مناسبت حاصل نہیں ہے ـــ!!

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا اپنے والد کے حق میں استغفار دراصل اسی استثناء کے تحت تھا ـــ اور اُصولاً اس کے ضمن میں کسی وضاحت کی ضرورت نہ تھی لیکن چونکہ قرآنِ حکیم میں آنجناب کی جو بعض دعائیں نقل ہوئی ہیں اُن میں اپنے والد کے لئے مغفرت کی درخواست بھی شامل ہے جیسے سورۂ شعراء میں ہے کہ : وَاغْفِرْ لِأَبِيْ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الضَّالِّيْنَ ٥ یعنی: "مغفرت فرما دے میرے باپ کی، یقیناً وہ گمراہوں میں سے ہے"۔ یا سورۂ ابراہیم میں کہ : رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ٥ یعنی :"اے ربّ ہمارے! بخش دیجو مجھے بھی اور میرے والدین کو بھی اور جملہ اہلِ ایمان کو بھی جس دن کہ حساب قائم ہوگا!"۔ اس سے ایک مغالطہ پیدا ہو سکتا تھا جس کے سدِّباب کے لئے اس مقام پر وضاحت فرما دی گئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا یہ استغفار اوّلاً تو ایک وعدے کی بنا پر تھا جو انہوں نے اپنے والد سے کر لیا تھا جس کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ مریم میں بھی ہے اور سورۂ ممتحنہ میں بھی اور پھر یہ جاری بھی صرف اُس وقت تک رہا جب تک کہ انھیں یہ یقین نہ ہو گیا کہ میرا باپ کفر اور شرک پر اس درجہ اڑ گیا ہے، اور اُس کے دل میں اپنے مزعومہ معبودوں کی محبّت نے اس درجہ گھر کر لیا ہے کہ وہ اِلٰہِ واحد و قہّار کا دشمن بن چکا ہے اور اب اُس کے راہِ راست پر آنے کی کوئی اُمّید باقی نہیں رہی۔ چنانچہ جیسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السّلام پر یہ حقیقت منکشف ہوئی اُس مُوحّدِ خالص نے فوراً اپنے والد سے اعلانِ براءت کر دیا اب اگر ابراہیم علیہ السّلام کو اس حقیقت کے ادراک و شعور میں کچھ دیر لگی تو وہ صرف اس لئے کہ وہ طبعاً نہایت حلیم و رحیم اور شفیق و رفیق تھے ـــ اور طبیعت کی نرمی اور دل کی رِقّت اور خلقِ خدا پر رحمت و شفقت ظاہر ہے کہ نہایت محمود صفات ہیں نہ کہ مذموم اور اگر ان کی بنا پر کہیں کسی معاملے میں حدِّ اعتدال سے کسی قدر تجاوز ہو جائے تو یہ یقیناً قابلِ عفو ہے۔ چنانچہ یہی وصف ہمارے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ذاتِ بابرکات میں بھی نہایت شدّت کے ساتھ موجود تھا ـــ اور آپؐ کُل خلقِ خدا کے لئے سراپا رحمت و

کی جانب متوجّہ ہوا تاکہ وہ بھی اُس کی جناب میں توبہ کریں۔ یقیناً اللہ ہی ہے بہت توبہ کا قبول فرمانے والا، رحم کرنے والا!" ـــــ صدق اللہ العظیم

غزوۂ تبوک کے دوران پیش آمدہ حالات و واقعات پر مفصّل تبصرے کے بعد جس میں بالخصوص منافقین کے نفاق کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا گیا۔ اب ان آیات میں اہلِ حق پر اللہ کی رحمت و شفقت، فضل و کرم اور ان کی جملہ کوتاہیوں اور تقصیروں کے ضمن میں عفوِ عام کا اعلان ہو رہا ہے ـــــ!!

اس سلسلے میں لفظِ 'توبہ' جو ان آیات میں بتکرار و اعادہ وارد ہوا خصوصی توجّہ کا مستحق ہے، اس اعتبار سے بھی کہ یہی وہ مقام ہے جس کی بنا پر اس عظیم سورت کا مشہور اور معروف ترین نام ہی 'سورۂ توبہ' قرار پایا ـــــ اور اس اعتبار سے بھی کہ یہ قرآن حکیم کی ان متعدد اصطلاحات میں سے ہے جو لفظاً تو اللہ اور بندے دونوں کے لئے مشترک طور پر استعمال ہوتی ہیں لیکن ان کے مفہوم میں نسبت کے اس اختلاف سے زمین و آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ جیسے 'تشکر' کہ جب بندے کے لئے آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے احسان مندی کے اور جب اللہ کے لئے آئے گا تو اس کا مفہوم ہوگا قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا۔ اسی طرح توبہ کا لفظ جب بندے کے لئے آئے گا تو اس کے معنی ہوں گے: "بندے کا گناہ و معصیت کو ترک کر کے پشیمانی کے جذبات اور عفو و درگذر کی درخواست کے ساتھ اللہ کی جناب میں متوجّہ ہونا!" ـــــ اور جب اللہ کے لئے استعمال ہوگا تو اُس کے معنی ہوں گے: "اللہ کا اپنی رحمت و شفقت اور عنایت و کرم کے ساتھ بندے کی جانب متوجّہ ہونا!" ـــــ یہی وجہ ہے کہ بندوں کے لئے استعمال کے موقع پر 'توبہ' کے ساتھ صلہ آتا ہے 'اِلیٰ' کا اور اللہ کے لئے استعمال کے موقع پر صلہ آتا ہے 'علیٰ' کا۔ جیسا کہ ان دو آیات میں چار بار ہوا ÷

دوسری اہم حقیقت جو ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ قبولیّتِ توبہ کے اس اعلان میں اصل معاملہ تو اُن تین انصاری صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا تھا، جن کا ذکر آیت ۱۱۸ میں وارد ہوا۔ لیکن قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کا اعجازِ کلام کہ آیت ۱۱۷ میں اس اعلانِ عفو کے لئے ایک شاندار تمہید بھی آ گئی اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور سراپا صبر اور پیکرِ صدق و صفا مہاجرین و انصار

اپنا طرزِ عمل بدل لیا یا نہیں، گویا محاسبۂ اُخروی کا معاملہ دُنیا میں چلنے والی اندھے کی لاٹھی کا سا نہیں ہے۔

آیاتِ سابقہ میں چونکہ سارا معاملہ توحید کی حمایت و حمیّت اور شرک سے بیزاری و نفرت کا زیرِ بحث آیا ہے۔ لہٰذا آیت ۱۱۶ میں توحیدِ کامل کا بیان نہایت جامع اور پُرشکوہ الفاظ میں وارد ہوا یعنی: "اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی، وہی جِلاتا بھی ہے اور وہی مارتا بھی ہے، اور تمہارے لئے اس کے سوا نہ کوئی حمایتی یا پشت پناہ ہے نہ معاون و مددگار!" وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

(۸)

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۱۷ تا ۱۱۸ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

"اللہ نے نظرِ کرم فرمائی اپنے نبیؐ پر اور ان مہاجرین اور انصار پر جنہوں نے نہایت مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد کہ قریب تھا کہ ان میں سے بعض کے دل کجی کی جانب مائل ہو جائیں۔ پھر اللہ نے ان پر عنایت فرمائی۔ یقیناً وہ ان کے حق میں نہایت مہربان رحم فرمانے والا ہے، اور ان تین اشخاص پر بھی جن کا معاملہ مؤخر کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی پوری وسعت کے باوصف ان پر تنگ ہو گئی اور انہیں اپنی جانیں ضیق میں محسوس ہونے لگیں، اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ (کی پکڑ) سے بچنے کے لئے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کی (رحمت کے) سوا اور کوئی نہیں۔ تب اللہ ان

ے قابلِ تحسین پہلو کی جانب گویا پیشگی اشارہ کر دیا گیا۔ فصلّی اللّٰہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلّم تسلیمًا کثیرًا کثیرًا ط ۞

اس کے بعد نمبر آیا مہاجرین وانصار کا۔ ان میں سے بھی اگر کسی سے بربنائے طبعِ بشری کوئی خطا یا تقصیر ہوئی ہو تو اس کے ضمن میں بھی عفوِ عام کا اعلان کر دیا گیا بلکہ اس سے بڑھ کر اُن کو بھرپور شاباش بھی دی گئی اور ان کے ثبات واستقلال اور سرفروشی و جانفشانی گویا فی الجملہ صبر و مصابرت پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے گئے۔ چنانچہ اندازِ بیان وہ اختیار کیا گیا جو سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے آخری اور مشکل ترین امتحان کے ضمن میں اختیار کیا گیا ہے۔ یعنی: اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ ! "یقینًا یہ ایک بہت کٹھن آزمائش تھی !"— بالکل وہی بات یہاں فرمائی کہ غزوۂ تبوک پورے کا پورا "سَاعَةِ الْعُسْرَةِ" کا مصداقِ کامل تھا۔ اس لئے کہ ایک وقت کی عظیم ترین عسکری قوت سے مقابلہ تھا۔ پھر قحط کا عالم اور اس پر مستزاد شدید گرمی کا موسم— اور نہایت بعید مسافت اور طویل سفر جس کے دوران وہ وقت بھی آیا کہ پورے دن کے راشن کے طور پر دو دو مجاہدوں میں ایک ایک کھجور تقسیم کی گئی اور نوبت یہاں تک بھی پہنچی کہ ایک ہی کھجور کو متعدد مسلمان باری باری صرف چوس کر پانی پی لیتے۔ اور خود پانی کے ضمن میں نوبت یہاں جا رسید کہ سواری کے اونٹوں کے فضلات کو نچوڑ کر جو قدرِ قلیل حاصل ہوا اسی پر قناعت کرنا پڑی۔ ان حالات میں بھی جنہوں نے صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا اُن پر اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کا کیا ٹھکانہ ہے؟ اگر کبھی بربنائے طبعِ بشری کسی کی ہمت جواب دیتی محسوس ہوئی تو قطعًا قابلِ تعجب بات نہیں۔ بلکہ قابلِ تحسین پہلو یہ ہے کہ اس کیفیت نے اُن کے سمندِ شوق کے لئے تازیانے کا کام کیا اور: ع
"رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور!" کے مصداق اُن کے مراتبِ عالیہ بلند سے بلند تر ہو گئے — !! (رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم)

— "خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!" —

اور پھر ذکر آیا ان تین انصاری صحابہؓ یعنی کعب ابن مالک، بلال ابن اُمیّہ اور مرارہ ابن ربیع رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا جو بلا شبہ مومنین صادقین میں سے تھے اور ان کا ماضی بے داغ تھا۔ لیکن تبوک کے موقع پر اُن سے تساہل کا ظہور ہوا اور وہ اللہ

سے متعلق بعض نہایت اعلیٰ لیکن حد درجہ لطیف مضامین بھی بیان ہو گئے۔ چنانچہ ان کے حق میں اللہ کی رحمتوں اور عنایتوں کا ذکر بھی شاندار الفاظ میں ہو گیا اور ان کی خطاؤں سے درگذر کا اعلان بھی ہو گیا۔ اگرچہ ایسے معجزانہ انداز میں کہ بظاہر الفاظ تادیب و تنبیہ بھی موجود ہے لیکن بباطن شفقت و عنایت اور تعریف و توصیف ہی نہیں بلکہ تحسین و آفرین کا پہلو غالب ہے ؛

جہاں تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے تو آپؐ کی ذاتِ اقدس پر تو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور عنایتوں کی بدلیاں ہر آن برستی ہی رہتی تھیں اور اللہ کا فضل و کرم آپؐ کے تو ہر دم ہی شاملِ حال رہتا تھا جیسے کہ فرمایا سورۂ بنی اسرائیل میں کہ: "اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا ۝ یعنی: "(اے نبیؐ!) یقیناً اللہ کا فضل آپ پر بہت بڑا ہے!" یہاں بھی آغازِ کلام گویا اسی حقیقت کے اعادے سے ہوا۔ البتہ ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ کی ذات بابرکات میں رأفت و رحمت کے غلبے اور آپؐ کی سیرتِ مطہرہ میں شرافت و مروّت کے کوٹ کوٹ کر بھرے ہونے کے باعث تبوک کے لئے روانگی سے قبل جو صورت پیدا ہوئی تھی کہ آپؐ نے منافقوں کی جھوٹی معذرتوں کو محض اپنی طبعی شرافت و مروّت کی بنا پر قبول فرما لیا اور ان کے جھوٹ کے پردے کو اسی وقت چاک کر دینے سے محض اپنی نرم خوئی و حیا پسندی کی بنا پر احتراز فرمایا تو اس پر ایک گرفت اسی سورت کی آیت ۴۳ میں وارد ہوئی تھی بایں الفاظ کہ: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ یعنی: "اللہ آپ کو معاف کرے یا اللہ نے آپ کو معاف فرما دیا۔ آپ نے ان کو اجازت کیوں دے دی، یہاں تک کہ کھل جاتا آپ پر کہ کون سچے ہیں اور پہچان لیتے آپ جھوٹوں کو!" اور اگرچہ خود اس گرفت میں بھی پیشگی معافی کا ذکر موجود تھا، اس لئے کہ "عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ!" کو جملہ خبریہ مانا جائے تب بھی یہ اللہ کا انشاء ہے خود اپنی ہی جانب گویا مضمون واحد ہے ___ تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسّاس قلب کی گہرائیوں میں ہو سکتا ہے کہ کوئی احساس اس کا باقی رہ گیا ہو تو اس آیۂ مبارکہ کے اوّلین الفاظ نے اس کو بالکل محو کر دیا۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس سے متصلاً قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں "اَوَّاهٌ حَلِيْمٌ" کے الفاظ لا کر جو یقیناً تعریف و تحسین کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ آنحضورؐ کے متذکرہ طرزِ عمل

بصرے اوران کی توبہ کی قبولیّت کے اعلان کے بعد یہ آیۂ کریمہ نہایت جامع ہدایت کے طور پر وارد ہوئی ہے ۔ اور اس میں اہلِ ایمان کو دو اقدار کی جانب توجّہ دلائی گئی ہے : ایک منفی قدر ہے یعنی تقویٰ ، اور دوسری مثبت ہے یعنی صدق- اور یہ قرآنِ حکیم کے عام اسلوب کے مطابق ہے، یعنی یہ کہ اکثر کلام کا آغاز کسی نفی سے ہوتا ہے اور پھر اثبات وارد ہوتا ہے جیسے : لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ‘ یا جیسے : ”لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ...... (الیٰ اٰخر الاٰیہ)

’تقویٰ‘ کے لفظی معنی ’بچنے‘ کے ہیں - اور اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ اس کی ناراضی اور سزا و عقوبت سے بچنے کی کوشش کی جائے اور اس کے لئے گناہ و معصیت اور اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے بچا جائے- اس اعتبار سے بمقابلہ صدق و احسان اسے ایک منفی قدر قرار دیا جا سکتا ہے- اگرچہ اپنے نتائج کے اعتبار سے یہ ایک قوّتِ محرّکہ یعنی (DRIVING FORCE) بن جاتا ہے، جو انسان کو : ع ؎ — ”ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — کے مصداق اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند تر مراتب کی جانب پیش قدمی پر ابھارتا رہتا ہے، جیسے کہ فرمایا سورۂ مائدہ کی آیت ۹۳ میں کہ :

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(یعنی) ”جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ان پر کوئی گناہ نہیں اس پر جو وہ پہلے کھا پی چکے- جب کہ انہوں نے بعد میں تقویٰ اختیار کر لیا اور ایمان کی راہ اختیار کی اور اچھے عمل کئے، پھر مزید تقویٰ اختیار کیا اور ایمان میں اور آگے بڑھے، پھر مزید تقویٰ اختیار کیا اور درجۂ احسان پر فائز ہو گئے اور اللہ کے محبوب تو محسنین ہی ہیں !“

گویا اسلام، ایمان اور احسان کے مراتبِ ثلاثہ جن کا بیان ’حدیثِ جبریلؑ‘ میں آیا ہے ان کی جانب پیش قدمی رُوحِ تقویٰ ہی کے زیرِ اثر ممکن ہے اور یہ اللہ کا تقویٰ ہی ہے جو ہر مرحلے پر انسان کا ساتھ بھی دیتا ہے اور بلند تر مراتب کی جانب پیش قدمی پر اسے

کی راہ میں جنگ کے لئے نکلنے کی سعادت سے محروم رہ گئے۔ تاہم تبوک سے واپسی
نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پیچھے رہ جانے والوں سے باز پرس کی تو انہوں نے مناف
طرح جھوٹے بہانے تراشنے اور جھوٹی قسموں کو اپنے لئے ڈھال بنانے کی بجائے اپنی خ
تقصیر کا صاف اعتراف کر لیا۔ نتیجۃً آنحضورؐ نے ان کے لئے مکمّل سماجی انقط
(COMPLETE SOCIAL BOYCOTT) کی سزا تجویز کی جو اُن
حق میں ایک جانب تو خطا کی سزا تھی اور دوسری جانب ایمان کا امتحان اور
اخلاص کی آزمائش۔ یہ سزا پورے پچاس دن جاری رہی اور اس کی شدّت میں
بروز اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن اللہ کے فضل و کرم سے یہ حضرات اس میں مکمّل طو
اور سرخرو ہوئے۔ لہٰذا ان کی معافی کی بشارت نازل ہوگئی۔ یہ سیرتِ مُطہرہ کا
نہایت سبق آموز واقعہ ہے اور حضرت کعب ابن مالکؓ نے اسے نہایت تفصیل
بیان کیا ہے جس کا مطالعہ کتبِ حدیث میں کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کا اصل حاصل
لُبِّ لُباب وہ ہے جو اس حدیثِ نبویؐ میں بیان ہوا کہ: "کلّ بنی آدم خطّاؤن
خیرُ الخطّائین التوّابون" (یعنی تمام انسان انتہائی خطا کار ہیں، ان خطا
میں بہتر لوگ وہ ہیں جو بار بار توبہ کریں!) اور واقعہ یہ ہے کہ اللہ کو اپنے خطا کار بند
کی توبہ بہت ہی پسند ہے، اور وہ بہت ہی توبہ کا قبول فرمانے والا اور رحم کرنے وا
بقول علّامہ اقبال مرحوم ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے ❊ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم
وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

(۹)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۹ ہے، اور اس کا ترجمہ یہ ہے:
"اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچّے لوگوں کے ساتھی بنو!"
منافقین کے نفاق کا پردہ چاک کرتے اور ضعیف الایمان لوگوں کے ضعف ا

پوری طرح رچا بسا ہوا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ 'صدّیق' — 'صدق' سے 'فِعّیل' کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں "پیکرِ صدق و صفا یا سراپا سچائی اور مجسم راستبازی!" جیسے کہ ایک متفق علیہ روایت میں الفاظ وارد ہوئے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ "وانّ الرّجل لیصدق حتّٰی یکتب عند اللہ صدّیقًا!" — (یعنی ایک شخص سچ پر کاربند رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں اس کا نام صدّیقین کی فہرست میں درج ہو جاتا ہے!) — اب ظاہر ہے کہ جو خود سراپا صدق ہوگا وہ ہر سچائی کی تصدیق کے لئے بھی ہمہ تن اور ہمہ وقت تیار رہے گا۔ اس لئے کہ یہ عقلاً محال ہے کہ جو خود سچا ہو، اور جس کا اپنا موقف سچائی اور راستبازی پر قائم ہو وہ سچائی کا والہ و شیدا نہ ہو۔ یہاں تک کہ کوئی صداقت اس کے سامنے پیش کی جائے اور وہ اسے ردّ کر دے۔ اس کے برعکس ایسے شخص میں سچائی اور راستبازی کے لئے شدید جنسیت پیدا ہو جانا لازمی ہے اور وہ ہر سچائی کو لبیک کر قبول کرے گا، اور ہر صداقت کی بڑھ کر تصدیق کرے گا۔ اور اس راہ میں نہ اپنی جھوٹی 'انا' کو حائل ہونے دے گا نہ کسی پرخود غلط خودی کو — نہ کسی مصلحت کو آڑے آنے دے گا نہ کسی مفاد کو۔ نہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے گا نہ کسی اندیشے کو، نہ کسی سے کٹنا اُسے گراں معلوم ہوگا نہ کسی سے 'جُڑنا'۔ نہ کوئی ترک اسے بھاری محسوس ہوگا نہ اختیار، نہ کوئی امر کٹھن نظر آئے گا نہ کوئی نہی — بلکہ 'صدق' اور 'صداقت' کے ساتھ اُس کا خلوص و اخلاص ان سب مراحل کو آسان بنا دے گا — یہی وجہ ہے کہ علّامہ آلوسیؒ صاحبِ تفسیر 'روح المعانی' — صدّیق کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "المتقدم فی التصدیق المبالغ فی الصّدق و الاخلاص فی الاقوال و الافعال!" (یعنی وہ شخص جو تصدیق میں پہل کرے اور خود اپنے اقوال و افعال میں حد درجہ سچا اور مخلص ہو!) — اور یہ وہی بات ہے جسے قرآن نے سورۂ زمر کی آیت ۳۳ میں حد درجہ اختصار و جامعیت اور کمال فصاحت و بلاغت کے ساتھ یوں تعبیر فرمایا: وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖ (یعنی وہ شخص جو خود بھی صداقت پر قائم رہا اور ہر سچائی کی تصدیق بھی کرتا رہا!) — یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ نبوت اور صدّیقیت کا کیسا چولی دامن کا ساتھ ہے، اور کیوں سورۂ مریم میں حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علٰی نبیّنا و علیہما الصّلوٰۃ والسّلام کے ذکر میں فرمایا: اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (یعنی وہ یقیناً صدّیق نبی تھے!) او

اُبھارتا اور اُکساتا بھی رہتا ہے ــــ!!

ان اعلیٰ مراتب کے بیان کے ضمن میں آیت زیرِ درس میں (ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں کے مصداق "صادقین" کی اصطلاح - گویا) صدق کا وصف لایا گیا ہے۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قرآن حکیم کی نہایت اہم اور اساسی اصطلاح ہے۔ چنانچہ کہیں تو قرآن مجید اسے حقیقی مومن کی تعبیر کے لئے استعمال کرتا ہے جیسے سورۂ حجرات کی آیت ۱۵ میں یعنی :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝	(یعنی "مومن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائیں اللہ اور اُس کے رسول پر، پھر شک میں نہ پڑیں اور جہاد کریں اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور اموال کے ساتھ، صرف یہی لوگ سچے ہیں!" (سورہ حجرات آیت : ۱۵)

کہیں اسی سے تعبیر کیا جاتا ہے حقیقت بِرّ و تقویٰ کو، جیسے کہ آیۂ بِرّ میں جہاں نیکی کے ایک محدود تصور کی نفی اور حقیقتاً نیک اور متقی لوگوں کے اوصاف کی تفصیلی وضاحت کے بعد فرمایا: "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝" (یعنی یہی لوگ ہیں واقعۃً سچے اور یہی ہیں حقیقتاً متقی!) - اسی طرح ایمانِ حقیقی کے لازمی ثمرے یعنی اللہ کی راہ میں گردن کٹوا دینے کو حقیقی کامیابی سمجھنے کو تعبیر فرمایا گیا ہے اسی وصف صدق سے جیسے سورۂ احزاب کی آیت ۲۳ میں یعنی: "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ" (یعنی ــ اہلِ ایمان میں وہ جواں مرد ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا وہ معاہدہ جو انہوں نے اپنے ربّ سے کیا تھا۔ پس اُن میں وہ بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے اور وہ بھی ہیں جو اس کے انتظار میں ہیں۔ بہرحال انہوں نے سرِمو کوئی تبدیلی نہیں کی۔ تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا بھرپور بدلہ دے گا!"

گویا ایمانِ حقیقی اور اُس کے جملہ ثمرات و نتائج کی تعبیر کے لئے قرآن مجید کا اساسی اور بنیادی لفظ 'صدق' ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کی رُو سے انبیائے کرام کے بعد سب سے اُونچا درجہ 'صدیقین' ہی کا ہے، جن کی شخصیت اور سیرت و کردار میں سچ

اور پھر آیت ۱۱ میں پردہ اٹھادیا کہ سچوں سے مراد حقیقی مومن ہیں اور جھوٹوں سے منافق - چنانچہ ارشاد ہوا :

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝ (یعنی) اللہ لازماً ظاہر کرکے رہے گا کہ کون ہیں سچے مومن ــــ اور کون ہیں منافق!

سورۂ توبہ چونکہ نفاق کے موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام یعنی چوٹی ہے اور اس میں اس مرض کی علامات اور اس کی ہلاکت خیزیاں تفصیلاً بیان ہوئی ہیں لہٰذا اب خاتمۂ کلام پر (واضح رہے کہ اس کے بعد اب صرف دس آیتیں اس سورت کی باقی ہیں!) نہایت جامع بات کہہ دی گئی کہ :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ۝

(۱۰)

مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَــٔـُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

یہ سورۃ توبہ کی آیات ۱۲۰ تا ۱۲۱ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"مدینہ کے باشندوں اور اس کے گرد و نواح کے بدّوؤں کے لئے ہرگز مناسب نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول سے (علیحدہ ہو کر) پیچھے بیٹھ رہیں، نہ یہ کہ اس کی جان سے بڑھ کر اپنی جان کو عزیز رکھیں۔ یہ اس لئے کہ اللہ کی راہ میں جو پیاس، تھکان

یہیں سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ کیوں حضرت یوسف علیہ السّلام کو اُن کے زنداں کے ساتھیوں نے: "یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ !" کے الفاظ سے خطاب کیا، اور کیوں قرآن حکیم نے حضرت مریم سلامٌ علیہا کو "صدّیقہ" قرار دیا۔ اور کیوں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جدّ امجد حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کے لئے: "صادق الوعد" کے الفاظ استعمال ہوئے، اور کیوں خود آپؐ کو قریش نے: "الصّادق الامین" کا خطاب دیا۔ (صلّی اللہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ وسلّم ــــ !!)

آیتِ زیرِ درس میں یہ لفظ منافقین کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے جن کا سب سے نمایاں وصف از رُوئے قرآنِ حکیم و احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام 'کِذب' ہی ہے ــ جیسے کہ سورۂ منافقون کی پہلی آیت میں فرمایا:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۞	یعنی (اے نبیؐ!) جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں ــ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اُس کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں!

بلکہ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے نفاق اور ضُعفِ ایمان کے مابین حدِ فاصل بھی جھوٹے بہانے اور جھوٹی قسمیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہایت مستند احادیث میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان وارد ہوا کہ: "منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بولتا ہے جھوٹ بولتا ہے، جب وعدہ کرتا ہے خلاف ورزی کرتا ہے اور جب امین بنایا جاتا ہے خیانت کرتا ہے"۔ اور ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں اوصاف 'کذب' ہی ہیں۔ پہلا 'کذب' قولی ہے اور باقی دونوں 'کذب' عملی ــــــ !!!

ایمان اور نفاق کو صدق و کذب سے تعبیر کرنے کے ضمن میں غالباً اہم ترین مقام سورۂ عنکبوت کا پہلا رکوع ہے جہاں ابتلاء و آزمائش کی حکمت آیت ۳ میں تو اِن الفاظ میں وارد ہوئی کہ:

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۞	(یعنی) اللہ کھول کر رکھ دے گا کہ کون سچے ہیں ــــ اور کون جھوٹے!

تکلیف بھی انسان جھیلتا ہے اور مشقت بھی اٹھاتا ہے اس کا پورا پورا اجر و ثواب اللہ کے یہاں اس کو مل جائے گا! چنانچہ راہِ خدا میں اگر انھیں بھوک اور پیاس سے سابقہ پیش آتا ہے . یا جسمانی مشقت کے باعث کوئی تکان اُن پر طاری ہوتی ہے، یا وہ کوئی ایسا اقدام کرتے ہیں جس سے اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں کو تکلیف یا نقصان پہنچے، یا اللہ کی راہ میں حسبِ توفیق کم یا زیادہ مال وہ خرچ کرتے ہیں، یا دشمن سے مڈبھیڑ یا اس کے تعاقب میں کسی وادی کو عبور کرتے ہیں تو اُن کی یہ سرفروشیاں اور جانفشانیاں ضائع جانے والی چیز نہیں ہیں اور معاملہ وہ نہیں ہے کہ ع "مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی!" — بلکہ ان سب کا اندراج اُن کے نامۂ اعمال میں ہو رہا ہے . اور ہر ہر عمل کے بدلے میں ایک ایک نیکی اُن کے حساب میں درج ہو رہی ہے۔ پس کا پورا پورا اجر و ثواب انہیں مل کر رہے گا۔ بلکہ یہ سب کچھ ہے ہی اس لئے کہ اللہ اہل ایمان کے درجات بلند فرمائے اور اُن کی ان سرفروشیوں کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر بدلہ انہیں عطا فرمائے! — گویا بات وہی ہے جو اس سے پہلے آیت ۱۱۱ میں ان الفاظ میں وارد ہو چکی ہے کہ:

"اللہ نے اہل ایمان سے اُن کے جان و مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔ چنانچہ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پس قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ وعدۂ حق ہے اللہ کے ذمے تورات، انجیل اور قرآن سب کی رُو سے، اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدے کا وفا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ پس خوشیاں مناؤ اور خوش خبریاں حاصل کرو اُس سودے پر جو تم نے اُس سے کیا ہے اور حقیقت میں یہی بڑی کامیابی ہے!"

یہاں اصل سوال جو پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ غزوۂ تبوک حیاتِ طیبہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دوران کے سلسلۂ غزوات کی آخری کڑی ہے — اور آیاتِ زیرِ درس کے بارے میں یہ بات قطعی اور حتمی طور پر معلوم ہے کہ یہ غزوۂ تبوک سے واپسی کے بعد نازل ہوئیں۔ تب اس مقصد کے لئے اہل ایمان کو جہاد و قتال فی سبیل اللہ اور اللہ کی راہ میں سرفروشی اور جانفشانی پر اکسایا جا رہا ہے؟ اس کا جواب مضمر ہے ختمِ نبوت کے ثمرات و لوازم میں جو انبیاء و رُسل علیہم السلام کی مقدس جماعت میں آپ کا طرۂ امتیاز ہے یعنی ان ثمرات و لوازم میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کی بعثت صرف اہل عرب کی طرف نہ تھی بلکہ پوری نوعِ انسانی اور اس سے بھی بڑھ کر کل جن و انس کی جانب تھی نیز ہوئے

یا بھوک بھی اُن کو لاحق ہوتی ہے اور کفار کو زک پہنچانے والا جو راستہ بھی وہ اختیار کرتے ہیں اور دشمن کو جو چرکا بھی وہ لگاتے ہیں، اِن سب کے بدلے میں اُن کے (نامۂ اعمال میں) ایک نیکی کا اندراج ہوتا ہے اور اللہ احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا اجر ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ اور (اللہ کی راہ میں) جو بھی چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور جس وادی کو بھی وہ طے کرتے ہیں ان سب کا اندراج ہوتا رہتا ہے تاکہ اللہ انہیں اُن کی جانفشانیوں کا بہترین اجر عطا فرمائے۔" صدق اللہ العظیم ٥

جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے یہ خاتمۂ سورت کی آیات ہیں اور ان میں ان طویل مباحث کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب دوبارہ بیان کیا جا رہا ہے جو اس سورۂ مبارکہ میں بیان ہوئے ہیں۔ اہلِ مدینہ اور آس پاس کے بدّوؤں میں سے جو لوگ نفاق کے روگ میں مبتلا تھے یا جنہیں وقتی طور پر ضعفِ ایمان لاحق ہوگیا تھا ان کے طرزِ عمل پر نہایت مفصّل تبصرہ اس سورت میں آچکا ہے۔ اب آخری بار ایسے دلنشیں پیرائے میں ملامت کی جا رہی ہے جس سے اگر کسی کے دل میں ایمان کی کوئی دبی ہوئی چنگاری کہیں موجود ہو تو بھڑک اٹھے اور اس کی غیرتِ ایمانی اور حمیّتِ دینی از سرِ نو جاگ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انداز زجر و توبیخ کا نہیں مشفقانہ و مربّیانہ ملامت کا ہے کہ مدینہ کے رہنے والے ہوں یا آس پاس کے بدّو کسی کے لئے بھی ہرگز زیبا نہ تھا نہ یہ مناسب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی مومنینِ صادقین تو سفر کی صعوبتیں بھی جھیل رہے ہوں اور شدید مشقتیں برداشت کر رہے ہوں اور ہر طرح کے خطرات سے دوچار ہوں اور جان کی بازی بھی لگائے ہوئے ہوں اور ان کے نام کا کلمہ پڑھنے والے اور زبانی غلامی کا دم بھرنے والے گھروں کی آسائشوں سے متمتع ہو رہے ہوں اور آرام و عافیت میں دن گذار رہے ہوں۔ گویا انہیں اپنی جان اور اپنا عیش و آرام نبیؐ کی جان سے زیادہ پیارا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ طرزِ عمل ایمان کے ساتھ ہرگز کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اگر ایمان و اسلام کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص سے کسی وقتی سبب کے باعث یہ طرزِ عمل ظاہر ہوا ہو تو اسے فوراً متنبّہ ہو کر اصلاح کی طرف متوجہ ہو جانا چاہئے ایسا نہ ہو کہ یہ کیفیت شخصیت میں راسخ ہو جائے اور بالآخر توبہ کی توفیق سلب کر لی جائے ::

اِس کے بعد ساتھ ہی ترغیب و تشویق کے انداز میں فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جو

تبلیغ کا حق ادا کر کے بھی اتمامِ حجت کر دیا اور جزیرہ نمائے عرب پر اللہ کے دین کا جھنڈا بھی لہرا دیا۔ خواہ اس میں آپؐ کو کیسی ہی مصیبتیں جھیلنی پڑیں اور مشقتیں برداشت کرنی پڑیں، اور کیسی ہی مشکلات و موانع کا سامنا کرنا پڑا۔ اب اگر آپؐ کی بعثت صرف عرب کی طرف ہوتی تو گویا آپؐ کا مشن مکمّل ہو گیا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں تھا بلکہ آپؐ کی بعثت تمام انسانوں اور پورے کرۂ ارضی کے لیے تھی لہٰذا اس اعتبار سے گویا آپؐ کے مشن کا صرف ایک مرحلہ مکمّل ہوا تھا۔ اصل اور عظیم تر مرحلہ ابھی باقی تھا، بقول علاّمہ اقبالؔ مرحوم ؎

"وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے ÷ نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!"

واضح ہے کہ اس شعر کے مصرعِ ثانی میں علاّمہ مرحوم نے وہی لفظ استعمال فرمایا ہے جو سورۂ صف اور سورۂ توبہ دونوں میں زیرِ حوالہ آیت کے متّصل آیات میں وارد ہوا ہے یعنی: وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ○ اور وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ○ — مزید یہ کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" میں واضح کیا ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا یہ تمام و کمال ظہور اُس وقت ہو گا جب پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کا جھنڈا اُسی طرح لہرانے لگے گا جیسے آنحضورؐ نے اپنی حیاتِ طیّبہ میں جزیرہ نمائے عرب پر لہرا دیا تھا۔ قصّہ مختصر صلح حدیبیہ کے بعد ملوک و سلاطین کے نام دعوتی خطوط سے آپؐ نے اپنی جدوجہد کے اِس مرحلۂ ثانی کا آغاز فرمایا تھا۔ اسی کے نتیجے میں غزوۂ موتہ واقع ہوا اور پھر سفرِ تبوک سے گویا آپؐ نے اپنی بعثت کے اس عالمی یا بین الاقوامی مرحلے (INTERNATIONAL PHASE) کا شاندار افتتاح بہ نفسِ نفیس فرما دیا — اور اس کی تکمیل کو اُمّت کے حوالے کر کے "اَللّٰھُمَّ فِی الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی!" کہتے ہوئے محبوبِ حقیقی کی جانب مراجعت فرمائی! — یہ ہے وہ سبب جس کی بنا پر غزوۂ تبوک سے واپسی پر جملہ اہلِ ایمان کو از سرِ نو اپنے باطن میں جھانکنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اور جن سے بھی اس مرحلے پہ کسی کوتاہی یا تقصیر کا ظہور ہوا انہیں آئندہ کے لیے اصلاح کی ترغیب دی جا رہی ہے اور اہلِ ایمان کے ساتھ اللہ کے وعدے کو مزید مؤکّد کیا جا رہا ہے تاکہ اہلِ ایمان باطل کے استیصال اور اللہ اور اُس کے

الفاظِ قرآنی : وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝ یعنی "ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر!" اور - وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ۝ یعنی : "ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر!" اس پر مستزاد یہ کہ چونکہ آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسول آنے والا نہیں ہے لہٰذا آپؐ کی بعثت موقت نہیں ہے بلکہ دائمی ہے تا قیامِ قیامت! - یہ ہوا ختمِ نبوت کا ایک دوسرا پہلو جسے صحیح تر الفاظ میں اتمامِ نبوت اور تکمیلِ رسالت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے - یہ بھی ہے کہ آپ صرف بشیر و نذیر، داعی و مبلغ، مربی و مزکی اور معلم و شاہد بن کر نہیں آئے بلکہ اس عظیم مقصد کے ساتھ مبعوث ہوئے ہیں کہ دینِ حق کو بالفعل قائم و نافذ — گویا تمام ادیان اور کل کے کل نظامِ زندگی پر غالب کر دیں - چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید میں تین مقامات پر ان الفاظِ مبارکہ کے ذریعے واضح کی گئی کہ :

هُوَ الَّذِيۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ؕ	(یعنی، وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ (یعنی قرآنِ حکیم) اور دینِ حق (یعنی اسلام

کا نظامِ عدلِ اجتماعی) دے کر تاکہ غالب کر دیں اسے کل کے کل دین پر!"

— یہ الفاظِ مبارکہ سورۂ صف میں بھی وارد ہوئے ہیں اور سورۂ فتح میں بھی، بغیر اس کے کہ ایک شوشے کا بھی فرق ہو اور ہماری اس وقت کی بحث کے اعتبار سے اہم ترین بات یہ ہے کہ یہی الفاظ جوں کے توں وارد ہوئے ہیں زیرِ درس سورت یعنی سورۂ توبہ کی آیت ۳۳ میں بھی - اس پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے : 'ایک بعثتِ خصوصی الیٰ اہل العرب' اور دوسرے 'بعثتِ عمومی الیٰ کافۃ الناس و الیٰ یوم القیامہ'! - چنانچہ آپؐ کے ابتدائی دعوتی خطبوں میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ : واللہ الذی لا الٰہ الا ھو، انی لرسول اللّٰہ الیکم خاصۃً و الی الناس کافۃً" یعنی : "اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے، میں اللہ کا رسول اور فرستادہ ہوں تمہاری طرف بالخصوص اور پوری نوعِ انسانی کی طرف بالعموم!" - ان میں سے بعثتِ خصوصی کے فرائض تو آپؐ نے بہ نفسِ نفیس خود ادا فرما دیئے اور اہلِ عرب

کا ذکر ہے اس کا مفہوم متعین ہوتا ہے قتال فی سبیل اللہ کے لئے نکلنا۔ چنانچہ چھٹے رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہ اصطلاح جُوں کی تُوں وارد ہوئی ہے اور اس میں ہرگز دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ وہاں اس سے مراد ہے سفرِ تبوک کے لئے گھروں سے نکلنا یعنی : یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ ط اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ ط (الآیہ) یعنی

"اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کو کہا گیا تو تم زمین کے ساتھ چمٹ کر رہ گئے، کیا تم آخرت کے مقابلے میں دُنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے ہو؟"

اشکال در اشکال یہ کہ اگر آیتِ زیرِ درس میں "نفر فی سبیل اللہ" کو غزوۂ تبوک سے متعلق مانا جائے تو اس کے معنی یہ بنتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے لئے تمام اہلِ ایمان کا نکلنا ضروری نہ تھا۔ حالانکہ معلوم ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران سفرِ تبوک ہی پہلا اور آخری۔ گویا واحد موقع ہے جب کہ نفیرِ عام تھی ___ اور ہر صاحبِ ایمان کے لئے نکلنا لازم کر دیا گیا تھا ___ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ نہیں نکلے اُن سے شدید باز پُرس ہوئی جس کا مفصل بیان آیاتِ سابقہ میں آ چکا ہے ؀

اس مشکل کا ایک حل بعض حضرات نے یہ نکالا ہے کہ یہ آیت ہے تو قتال فی سبیل اللہ ہی سے متعلق ___ لیکن اس میں ذکر غزوہ تبوک کا نہیں ہے بلکہ یہاں ایک مستقل قانون بیان ہو رہا ہے کہ قتال فی سبیل اللہ کے لئے نفیرِ عام ہمیشہ نہیں ہوتی۔ غزوۂ تبوک تو ایک استثنائی واقعہ تھا ___ ورنہ ظاہر ہے کہ عام حالات میں جنگ کے لئے تمام مسلمانوں کا نکلنا لازمی نہ ہو گا، گویا یہ فرضِ کفایہ رہے گا۔ اب اگر امام بھی جنگ کے لئے نکلے تو جو اہلِ ایمان اس کے ساتھ نکلیں گے وہ اس کی صحبت سے فیضیاب ہوں گے، اور اس طرح دین کا جو علم و فہم انہیں حاصل ہو گا اسے واپسی پر ان لوگوں تک بھی منتقل کریں گے جو جنگ کے لئے نہیں نکلے تھے، اور اگر امام خود نہ نکلا ہو تو جو لوگ اس کے ساتھ رہ جائیں گے انہیں تفقہ فی الدین کے حصول کا موقع ملے گا اور وہ اپنے مجاہد بھائیوں کو اُن کی واپسی پر اس سے بہرہ ور کر سکیں گے۔ یہ مفہوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران کے غزوات اور سرایا پر تو پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ اشکال باقی رہتا ہے کہ کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ ابدی ضابطہ ہے۔ حالانکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس کی نوبت شاذ ہی آئی

دین کے دشمنوں کی سرکوبی کے لئے از سرِنو کمرِ ہمت کس لیں — اور اللہ کی راہ میں سرفروشی و جاں فشانی کا نئے سرے سے عزمِ مصمم کر لیں، اور پوری طرح مطمئن رہیں کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے — اُن کی محنت و ایثار کا بھرپور صلہ انہیں مل کر رہے گا اور اس راہ میں ہر ہر قدم پر اُن کے نامۂ اعمال میں ایک ایک نیکی کا اندراج ہوتا رہے گا — اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے وعدوں پر یقینِ کامل عطا فرمائے — اور اپنے دینِ حق کی سربلندی کے لئے ایثار و قربانی کی توفیق بخشے۔ "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!"

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۱۱)

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْٓا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۲ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے:

"اور اہلِ ایمان کے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ سب کے سب نکل کھڑے ہوں، پس کیوں نہ نکلی ہر گروہ میں سے ایک جماعت تاکہ فہم حاصل کریں دین کا اور خبردار کریں قوم کو جب ان کے پاس لوٹ کر آئیں تاکہ وہ بھی پرہیزگاری کی روش اختیار کریں۔"

یہ آیۂ مبارکہ "مشکلات القرآن" میں سے ہے، اور اس کے مفہوم و مدلول کے قطعیت کے ساتھ متعین کرنے میں ایک مشکل حائل ہے اور وہ یہ کہ اس میں اللہ کی راہ میں نکلنے کا جو ذکر آیا ہے اُس سے مراد اللہ کی راہ میں جنگ کے لئے نکلنا ہے یا دین کا علم حاصل کرنے کے لئے نکلنا۔ اس لئے کہ اگر توجہ کو صرف اس آیت اور اس کے الفاظ پر مرتکز کر دیا جائے تو اس کا موضوع جو کافی وثوق کے ساتھ متعین ہوتا ہے وہ ہے دین کے علم و فہم کے حصول کے لئے نکلنا — لیکن اگر سیاق و سباق کو دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ سورۂ توبہ کا اکثر و بیشتر حصہ متعلق ہے قتال فی سبیل اللہ سے اور اس کا جو سلسلۂ کلام چھٹے رکوع کی پہلی آیت سے شروع ہوا ہے اور جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اس کا مرکز و محور تو ہے ہی غزوۂ تبوک — اس اعتبار سے آیت زیرِ درس میں جس نفر فی سبیل اللہ

آتے اور مدینے میں رہ کر صحبتِ نبویؐ اور آپؐ کی تعلیم و تلقین اور تربیت و تزکیہ سے فیض یاب ہوتے اور پھر لوٹ کر اپنی اپنی آبادیوں یا اپنے اپنے قبیلے میں دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دیتے۔ تاکہ وہ لوگ بھی ایمان اور اسلام کی حقیقتوں سے بہرہ ور ہوتے اور ان میں بھی تقویٰ و احسان کی کیفیات اور جہاد و انفاق کے جذبات پروان چڑھتے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ اس آیتِ مبارکہ کے ایک ایک لفظ کا حق ادا ہوجاتا ہے بلکہ اس کا ایک ربط بھی سلسلۂ کلام کے ساتھ قائم ہوجاتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب !!

"نفر فی سبیل اللہ" کے اس مفہوم کی تعیین کے علاوہ اس آیۂ مبارکہ میں دو اصطلاحات بہت اہم وارد ہوئی ہیں۔ ایک تفقہ فی الدّین دوسرے انذار! ـــ فقہ کے اصل معنی ہیں سمجھ، فہم اور شعور! گویا تفقہ فی الدّین کے معنی ہوئے ایسی کیفیّت کے حصول کی کوشش کہ دین کی اصل حقیقت انسان کے فہم و شعور میں رچ بس جائے اور اس کے اندر ایک گہری بصیرتِ دینی پیدا ہوجائے۔ ہمارے ہاں دین کے اوامر و نواہی، یعنی فرائض و واجبات اور مکروہات و محرّمات کے تفصیلی علم کے لئے 'فقہ' کی جو اصطلاح رائج ہوگئی ہے اُس کے باعث اکثر و بیشتر اس لفظ کے اصل و وسیع مفہوم سے محرومی اور محجوبیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ شریعتِ اسلامی کی ان تفاصیل اور فروعات کا علم بھی یقیناً تفقہ فی الدّین کا ایک جُزو ہے اور آیتِ زیرِ درس کا جو ربط آیت ۹۷ سے بیان ہوا ہے اور اس میں "حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ" کے جو الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں اِس سے تو اس حقیقت کی جانب خصوصی اشارہ بھی ملتا ہے۔ تاہم یہ ہے "تفقہ فی الدّین" کا ایک جُزو ہی، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ نگاہیں کُل پر مرتکز رہیں ـــ ورنہ ہوسکتا ہے کہ جُزو کُل کے لئے بمنزلۂ حاسب بن جائے۔ اب ظاہر ہے کہ علمِ دین کے مختلف شعبوں کے اعتبار سے دیکھا جائے جیسے تفسیر، حدیث، احکام اور کلام وغیرہ تو ان میں اصل اور کُل کی حیثیت یقیناً علمِ قرآن ہی کو حاصل ہے باقی تمام یا فروع ہیں یا اجزاء ـــ یہی وجہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں آنحضورؐ کی دُعا: "اَللّٰھُمَّ فَقِّہْہُ فِی الدِّیْنِ" یعنی (اے اللہ اس نوجوان کو تفقہ فی الدّین عطا فرما!) کا ظہور اسی صورت میں ہوا کہ وہ کتاب

ہے کہ امام وقت خود قتال کے لئے نکلا ہو۔ خلفائے ثلاثہ یعنی ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہم کا تو اپنے عہدِ خلافت میں جنگ کے لئے نکلنا ہوا ہی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت میں بھی کوئی جنگ کفّار کے ساتھ نہیں ہوئی ــــ اور زمانۂ مابعد میں تو مسلمانوں کی سیاسی و عسکری قیادت اور علمی و روحانی سیادت کبھی شاذ ہی کسی فردِ واحد میں جمع ہوئی ہیں ؛

اس اشکال کے حل کی ایک دوسری صورت جس سے قلب کو قدرے زائد اطمینان حاصل ہوتا ہے یہ ہے کہ اسے دین کے علم و فہم اور تفقہ فی الدّین کے حصول کے لئے جماعتوں کی صورت میں گھروں سے نکلنے ہی سے متعلق مانا جائے اور سیاق و سباقِ کلام کے اعتبار سے اس کا سلسلہ مربوط مانا جائے ان آیات سے جن میں بدّوؤں ــــ اور دیہاتیوں کے نفاق کے مرض میں زیادہ شدّت اور عمومیّت کے ساتھ مبتلا ہونے کا ذکر ہے جیسے کہ آیت ۹۷ میں فرمایا گیا : اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ نِفَاقًا وَّ اَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ یعنی ("یہ بدّو کفر اور نفاق میں بھی زیادہ شدید ہیں اور اللہ نے اپنے رسول پر جو کچھ نازل فرمایا ہے اُس کے قواعد و ضوابط سے اُن کی ناواقفیّت بھی زیادہ قرینِ قیاس ہے، اور اللہ جاننے والا ہے، حکمت والا!")۔

ــــ اب ظاہر ہے کہ اہلِ مدینہ اور اردگرد کے بادیہ نشینوں کے مابین اصل فرق و تفاوت اسی بنا پر تھا کہ اہلِ مدینہ مسلسل حضورؐ کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے اور آپؐ کی تعلیم و تلقین اور تربیت و تزکیہ سے بہرہ ور ہونے کا موقع انہیں وافر طور پر ملتا تھا۔ لہٰذا اُن کے قلوب و اذہان بھی نورِ ایمان سے منوّر ہوتے چلے گئے اور ان میں جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جذبہ بھی پروان چڑھتا چلا گیا۔ بخلاف بدّوؤں کے جنہیں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فیضانِ صحبت سے بہت کم حصّہ مل سکا۔ نتیجتاً اُن میں سے بہت سوں کے باطن بھی تاریک رہ گئے، اور ان میں نہ جذبۂ جہاد پروان چڑھ سکا نہ ذوقِ شہادت !! ــــ آیت زیرِ درس میں اس مسئلے کا حل تجویز کیا جا رہا ہے اور وہ بھی قدرے ملامت کے انداز میں کہ یہ صورت اہلِ ایمان کو فوری اختیار کر لینی چاہئے تھی کہ ہر آبادی یا قبیلے میں سے کچھ دنوں کے لئے اپنے اہل و عیال اور گھر بار سے نکل کر

احکام کی نافرمانی سے اور آخرت میں عذابِ جہنّم سے! ❖

اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ آیتِ مبارکہ مسلمانوں کے نظامِ تعلیم و تربیت کے لئے ایک فرمانِ شاہی (ROYAL DECREE) کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اس کے اصول و مقاصد کے ضمن میں ابدی رہنما دستور (ETERNAL-GUIDE) کی حیثیت بھی! — خلافتِ راشدہ کے خاتمے کے بعد جب ہمارے اجتماعی ادارے منقسم ہوئے تو اوّلاً سیاست دین سے آزاد ہوئی اور یہ آیۂ مبارکہ دینی تعلیم و تربیت کے نظام کا عنوان بن گئی۔ یہاں تک تو معاملہ کسی قدر غنیمت تھا لیکن بعد میں تقسیم در تقسیم کا یہ عمل اور آگے بڑھا اور خود دینی تعلیم و تربیت نہ صرف مدرسہ و خانقاہ کے جُدا جُدا اداروں کی صورت میں منقسم ہو گئی۔ بلکہ ان کے مابین چشمک بھی پیدا ہو گئی تو حالات زیادہ دگرگوں ہو گئے ❖

دَورِ حاضر میں دین کی اُس وحدتِ کلّی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے جو جماعتیں اور تحریکیں سرگرمِ عمل ہیں۔ اُن کے نظامِ تعلیم و تربیت کے لئے بھی یہی آیۂ مبارکہ نہ صرف یہ کہ جامع ترین عنوان بن سکتی ہے۔ بلکہ اس میں اس کے تمام رہنما اصول (GUIDING-PRINCIPLES) بھی موجود ہیں اور اس کے لئے نہایت زوردار ترغیب و تحریک بھی۔ دین کے علم و فہم کے حصول کے لئے گھروں سے نکلنے کے ضمن میں ایک نہایت پیاری حدیث بھی وارد ہوئی ہے جس کی رُو سے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا:

"من سلك طريقًا يلتمس فيه علمًا سهّل الله له به طريقًا الى الجنّة ۔ وما اجتمع قومٌ في بيتٍ من بيوت الله يتلون كتابَ الله ويتدارسونهٗ بينهم الّا نزلت عليهم السكينةُ وغشيتهم الرّحمةُ وحفّتهم الملٰئكة وذكرهم الله فيمن عندهٗ!"

یعنی جو کوئی کسی راستے پر چلتا ہے علم کے حصول کی خاطر، اللہ اس کے طفیل اس کے لئے جنّت کا راستہ آسان کر دیتا ہے — اور جب کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر قرآن پڑھتے اور اسے آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہیں تو اُن پر سکینت کا نزول ہوتا ہے، اور رحمتِ خداوندی انہیں اپنے سائے میں لے لیتی ہے، اور ملائکہ اُن کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ اُن کا ذکر اپنے مقرّبین کی محفل میں کرتا ہے!

اللہ کی تفسیر و تاویل کے سب سے بڑے عالم اور اس اعتبار سے "حبرُ الاُمّہ" بن گئے۔ چنانچہ بعض روایات میں اس دُعا کے ساتھ یہ دوسرا ٹکڑا بھی وارد ہوا ہے کہ: "وَ عَلِّمْهُ التَّاْوِیْلَ" یعنی (اس میں اپنی آیاتِ مبارکہ کی تاویل کی استعداد پیدا فرما دے!) — دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس دُعائے مبارک کے کسی عشرِ عشیر کا مصداق بنا دے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ ——!!

دوسرا اہم لفظ "انذار" ہے جس کے معنی ہیں خبردار کرنا۔ یہ لفظ جہاں دعوت و تبلیغ دین کے ضمن میں اساسی اہمیت کا حامل ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی: "یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ" یعنی: [اے لحاف لپیٹنے والے (صلی اللہ علیہ وسلم) اٹھو اور لوگوں کو خبردار کرو!]۔ اسی طرح تعلیمِ دین کے ضمن میں بھی اصل الاصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا قرآن کی رُو سے تعلیم کے معنی لوگوں کے اذہان میں معلومات کا خزانہ جمع کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد لوگوں کو زندگی کے اصل حقائق[1] سے باخبر کرنا اور اُن کی سعی و جہد کے رُخ کو دُنیا سے پھیر کر آخرت کی طرف موڑ دینا ہے گویا بقولِ شاعر ؎

علم چہ بود؟ آں کہ رہ بنمایدت ٭ زنگِ گمراہی ز دل بزدایدت!

یعنی اصل علم کیا ہے؟ — وہ جو صحیح راستہ دکھائے اور غفلت کے زنگ کو دُور کر کے اُسے از سرِ نو صیقل کر دے! — اس ضمن میں بھی واضح رہنا چاہئے کہ اصل اہمیت قرآنِ حکیم ہی کی ہے۔ جیسے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ" یعنی (اِن دلوں پر بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسے لوہے پر زنگ لگ جاتا ہے اگر اس پر پانی پڑ جائے!) — اِس پر صحابہؓ نے سوال کیا: "فَمَا جِلَاءُهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ" یعنی (اے اللہ کے رسول! پھر اُس کا صیقل کیا ہے؟) — تو آپؐ نے فرمایا: "كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْاٰنِ" یعنی (موت کو کثرت سے یاد کرنا اور قرآن مجید کی تلاوت!) — اس انذار کا نتیجہ آیتِ زیرِ درس میں آیا: "لَعَلَّهُمْ یَحْذَرُوْنَ" کے الفاظ میں۔ حذر کے معنی وہی ہیں جو تقویٰ کے یعنی بچنا — دُنیا میں اللہ کے

[1] جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر ٭ تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ!

کہ فتنہ بالکل فرو ہوجائے اور دین اللہ ہی کے لئے ہوجائے!) ــ اور جو زیادہ مؤکد صورت میں وارد ہوا ہے سورۂ انفال کی آیت ۳۹ میں جہاں دین کے ساتھ "کُلُّہٗ" کا اضافہ ہوگیا۔ یعنی: "وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ !" ــ (اور جنگ جاری رکھو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لئے ہوجائے!) ــ پھر یہی مضمون ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں آیت ۳۳ میں انتہائی عمومیت کے انداز میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقصدِ بعثت کی وضاحت کے ضمن میں بھی آچکا ہے یعنی: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ ــ یعنی: "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو الھدیٰ (یعنی قرآن مجید) اور دین حق دے کر، تاکہ غالب کردے اسے تمام کے تمام ادیان یا کُل کے کُل دین پر ــ خواہ یہ کتنا ہی ناگوار ہو مشرکوں کو!" ــــــ اور بالخصوص کفّار اہلِ کتاب کے ضمن میں مزید وضاحت کے ساتھ وارد ہوا ہے آیت ۲۹ میں یعنی: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ :ــ "یعنی اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں سے جنگ کرو جو نہ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان لاتے ہیں، نہ حرام جانتے ہیں جسے حرام کیا اللہ اور اس کے رسولؐ نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین حق کی اطاعت، یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں اپنے ہاتھ سے چھوٹے بن کر!" ــــــ اب ظاہر ہے کہ اس حکمِ قتال مع الکفّار پر عمل: "الاقدم فالاقدم" اور "الاقرب فالاقرب" کے اصول کے مطابق ہی ممکن ہے۔ چنانچہ اس کی وضاحت آیتِ زیرِ درس میں ہوگئی: "اَلَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ" کے الفاظ سے ــــ اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جنگ تو مکروہ چیز ہے اور نیکی اور خدا ترسی سے اس کی کوئی مناسبت نہیں تو ان کے لئے وضاحت فرمادی آیت کے آخری ٹکڑے میں کہ قرآن کے تصوّرِ بِرّ و تقویٰ کی رُو سے اللہ کی راہ میں جنگ کرنا ہی عین تقویٰ بلکہ نیکی اور تقویٰ کی معراج یا "ذروۂ سنام" ہے۔ یہ وہی بات ہے جو سورۂ بقرہ میں آیۂ بِرّ میں وارد ہوچکی ہے جہاں نیکی کے عملی مظاہر میں سب سے اعلیٰ مظہر اللہ کی راہ میں جنگ کے موقع پر صبر و مصابرت کے

اس حدیث شریف کے پہلے ٹکڑے میں تو گویا دین کے فہم و شعور کے حصول کے لئے دیار دور کے لئے نکلنے کی فضیلت کا ذکر ہو گیا ــــ اور دوسرے اور طویل تر حصے میں خود اپنے ہی شہر کے کسی درسِ قرآن کے حلقے کی شمولیت کے لئے گھر سے نکلنے کی فضیلت مذکور ہو گئی ـــــــ !! و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العلمین

(۱۲)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۲۳﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۳ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

"اے ایمان والو! جنگ کرو اپنے آس پاس کے کافروں سے، اور چاہیئے کہ وہ تمہارے اندر سختی محسوس کریں، اور جان رکھو کہ اللہ کی معیت متقیوں کو حاصل ہوتی ہے! ـــــ!!"

جہاں تک عمومیتِ الفاظ پر مبنی تاویلِ عام کا تعلق ہے اس آیۂ مبارکہ میں قطعاً کوئی اشکال نہیں ہے۔ اس لئے کہ کفر اور اسلام بدیہی طور پر ایک دوسرے کی ضد ہیں اور منطقی طور پر ان کے مابین بقائے باہمی خارج از بحث ہے۔ گویا ایک "بالقوہ جنگ" (POTENTIAL WAR) کی حالت تو اُن کے مابین ہر حال میں موجود ہی رہتی ہے، جب بھی اہلِ ایمان کے لئے ممکن ہو نظامِ باطل کے استیصال کے لئے اقدام کرنا ان کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ صرف اس صراحت کے ساتھ کہ بمصداق الفاظِ قرآنی "لا اکراہ فی الدّین" یعنی: "دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے!" ــ افراد کو دین و مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہیں کیا جائے گا، البتہ اہلِ ایمان کی جنگ رہے گی جب تک کہ خدا کی بغاوت پر مبنی نظام کو بیخ و بُن سے اکھیڑ کر نظامِ اجتماعی کُل کا کُل اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کے اُصول پر اُستوار نہ ہو جائے ـــ بالفاظِ دیگر دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے نہ ہو جائے ـــ گویا تاویلِ عام کے اعتبار سے اس آیۂ مبارکہ کا مفہوم وہی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ کا ہے یعنی: "وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ !" (اور جنگ کرتے رہو اُن سے یہاں تک

کا لفظ ضرور آیا ہے۔ یعنی اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۷۳ میں اور سورۂ تحریم کی آیت ۹ میں، جن کے الفاظ میں ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے یعنی: "یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ وَمَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝": "اے نبی! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو اور اُن پر سختی کرو، اُن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے!" ــــ اب یہ ظاہر ہے کہ جہاد اور قتال کے مابین نہایت عظیم فرق ہے۔ جہاد کا معنیٰ بذلِ جہد میں مبالغہ اور فریقِ مخالف کی کوششوں کو ناکام کرنے کی بھرپور سعی ہے۔ گویا منافقین پر ملامت و سرزنش میں بھی سختی کی جا سکتی ہے اور ان کی چالوں اور سازشوں کا توڑ کرنے کے لئے بھی پوری سعی و جُہد سے کام لیا جائے گا۔ لیکن ان کے ساتھ قتال کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اِلاّ آنکہ وہ کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آئیں اور اس طرح اسلام کے نظامِ حدود و تعزیرات کی زد میں آجائیں ــــ!!

بعض دوسرے مفسرین نے آیت زیرِ درس میں کفار سے مراد سلطنتِ رُوما لی ہے جس کے ساتھ پہلا تصادم ۸ھ میں غزوۂ موتہ کی صورت میں ہو چکا تھا ــــ اور دوسرا یہ سفرِ تبوک تھا جو اُن ہی کے مقابلے کے لئے کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس کے دوران مسلح تصادم کی نوبت نہیں آئی۔ یہ تاویل سورۂ توبہ کے سیاق و سباق سے پوری مناسبت رکھتی ہے اور منافقین کے ذکر میں اس حکمِ قتال مع الرّوم کا اعادہ اس مناسبت سے ہوا ہے کہ سلطنتِ روما کی عظمت و سطوت کے پیشِ نظر یہ حکم منافقوں پر بہت گراں تھا ــــ اور یہ مرحلہ ان کے لئے نہایت کٹھن ثابت ہو رہا تھا۔ چنانچہ ان کی اِسی کیفیت کا تفصیلی ذکر بعد والی آیات میں آ رہا ہے:

تاہم اس سے بھی زیادہ انسب تاویل یہ ہے کہ یہاں کُفّار سے مراد مشرکینِ عرب ہیں۔ جن پر پورے اکیس برس کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے کامل اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ اور اب اللہ تعالیٰ کی مستقل سُنّت کے مطابق اللہ کی جانب سے آخری اور فیصلہ کن عذابِ استیصال کا حکم صادر ہو چکا تھا جو اس سورۂ مبارکہ کے بالکل آغاز میں آیت ۵ میں وارد ہوا ہے، یعنی: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَخُذُوْھُمْ وَاحْصُرُوْھُمْ وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ: یعنی: "جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو قتل کرو مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ اور انہیں پکڑو اور ان

مطابہ کو قرار دیا گیا : بمصداقِ الفاظِ قرآنی : "وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ" ۔ اور خصوصاً صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں، اذیت و تکلیف میں، اور جنگ کے وقت : "اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ o" ۔ "یہی لوگ ہیں حقیقتاً راست باز اور یہی ہیں واقعۃً متقی !" ۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم میں اس مضمون کے اعتبار سے نقطۂ عروج (CLIMAX) ہے سورۂ صف کی آیت ۴
یعنی : اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ
یعنی : "اللہ تو محبت کرتا ہے اپنے ان بندوں سے جو جنگ کرتے ہیں اس کی راہ میں ایسے صف بستہ ہو کر جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں !"

الغرض یہ تو ہے اس آیۂ مبارکہ کا مفہوم تاویلِ عام کے اعتبار سے اور اس میں ہرگز کوئی اشکال نہیں ہے ۔ البتہ تاویلِ خاص کے پہلو میں ایک اشکال موجود ہے اور وہ یہ کہ جس سلسلۂ کلام میں یہ آیت یہاں وارد ہوئی ہے اس کے اعتبار سے "کفار" سے مراد کون لوگ ہیں ؟

اس ضمن میں ایک بہت بڑی ٹھوکر جو دورِ حاضر کے بعض جدید مفسرین نے کھائی ہے وہ تو یہ ہے کہ یہاں کفار سے مراد منافق ہیں ۔ یہ دھوکہ انہیں اس وجہ سے لگا کہ سورۂ توبہ کے اس حصے میں سب سے زیادہ گفتگو منافقین ہی کے بارے میں ہوئی ہے ۔ لیکن وہ یہ بھول گئے کہ منافقین کے ساتھ قتال نہ کبھی ہوا ہے نہ عقلی و منطقی طور پر ہونا ممکن ہے ۔ اس لئے کہ قانونی اعتبار سے منافق مسلمان ہی شمار ہوتے ہیں اور انہیں کلمۂ اسلام کی ڈھال حاصل ہوتی ہے جو گویا سلامتی ہی کا کلمہ ہے ! چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ کے دوران منافقوں سے جنگ کا تو ذکر ہی کیا کسی ایک منافق کو بھی قتل نہیں کیا گیا ۔ حتیٰ کہ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کے بارے میں حضرتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کئی مواقع پر قتل کی باصرار اجازت چاہی پھر بھی نہ ملی ۔ بلکہ منافقین کے بارے میں تو آنحضورؐ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ ان کے صریحاً جھوٹے بہانوں کو بھی بلا ردّ و قدح قبول فرمالیا کرتے تھے !

واضح رہے کہ یہ بات سرسری اہمیت کی نہیں ہے بلکہ اسلام کے دستوری و قانونی نظام کا اہم تقاضا ہے ۔ ہاں منافقین کے ذکر کے ساتھ قرآن مجید میں دو مقامات پر "جہاد"

رتبہ حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ کڑوی گولی تمہیں نگلنی ہی ہو گی ۞
وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(۱۳)

وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّقُوْلُ
اَیُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖۤ اِیْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ
هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ
رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّهُمْ
یُفْتَنُوْنَ فِیْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ
یَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ
هَلْ یَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

یہ سورۂ توبہ کی آیات ۱۲۴ تا ۱۲۷ ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے :

"اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے تو اِن میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: "اس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا؟" پس جو (حقیقتاً) ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو اس نے (یقیناً) اضافہ کیا ہے، اور وہ (اس سے) بشارت پاتے ہیں۔ البتہ جن کے دلوں میں روگ ہے اُن کی نجاست میں اُس نے ایک نجاست اور بڑھا دی (یہاں تک کہ) وہ کفر ہی کی حالت میں مرے کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ آزمائش میں مبتلا کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ توبہ کرتے ہیں نہ یاد دہانی حاصل کرتے ہیں ـــ اور جب کوئی سورت اُتاری جاتی ہے تو وہ (کن انکھیوں سے) ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کسی کی نگاہ تو تم پر نہیں ہے، پھر کھسک جاتے ہیں (اصل میں تو) اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے، اِس لئے کہ یہ سمجھ سے کام نہیں لیتے۔!" صدق اللہ العظیم!!

اِن آیاتِ مبارکہ میں منافقین کے ظاہر و باطن کی ایک بھرپور عکاسی کی گئی ہے

کو گھیرو اور اُن کی گھات میں بیٹھو ہر گھات والی جگہ پر!" ـــــــ ظاہر ہے کہ یہ حکم ان منافقوں پر بہت شاق تھا جنھوں نے تاحال اہلِ ایمان اور کفّار دونوں سے میل جول برقرار رکھا ہوا تھا اس انتظار میں کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ تاکہ اگر آخر فتح اہلِ ایمان کی ہو تو ہم ان سے کہہ سکیں کہ "اِنَّا کُنَّا مَعَکُمْ !" (ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہی تھے!) ـــ اور اگر معاملہ برعکس ہو اور کفّار کا پلڑا بھاری رہے تو ہمارے یہ تعلقات کام آئیں اور ہم ان کے ساتھ کی ہوئی وفاداریوں کا واسطہ دے سکیں۔ مزید برآں ان میں سے بہت سوں کے حقیقی دلی تعلقات بھی کفّار اہلِ کتاب اور مشرکین کے ساتھ تھے اور یہ سورۂ مبارکہ اب ان کے حق میں سیف قاطع بن کر نیام سے باہر آ چکی تھی۔ ان کے اس پس و پیش اور ردّ و قدح کے پس منظر میں آیتِ زیرِ درس ایمانِ حقیقی، اور یقینِ قلبی اور برّ و تقویٰ کے عملی تقاضوں کی وضاحت کرتے ہوئے سامنے آتی ہے ـــ اور دوٹوک انداز میں بیان کرتی ہے کہ اگر کسی مسلمان کے دل میں کفّار و مشرکین کے لئے کوئی نرم گوشہ تاحال موجود ہے تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ مومنینِ صادقین کی شان تو وہ ہے جو سورۂ فتح میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ: "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ !" ـــ یعنی: "(کافروں کے حق میں نہایت سخت اور آپس میں یعنی اہلِ ایمان کے حق میں نہایت رحم دل اور نرم خُو!)" ـــ اور سورۂ مائدہ میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ: اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ۵ یعنی: "نہایت نرم دل اہلِ ایمان کے لئے اور نہایت زور آور اور زبردست کفّار کے حق میں!" ـــ وہی بات آیتِ زیرِ درس میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ: "وَلْیَجِدُوْا فِیْکُمْ غِلْظَۃً: اور چاہیئے کہ وہ تمہارے اندر سختی اور شدّت محسوس کریں!" ـــ اور آخر میں کان کھول دینے کے انداز میں فرمایا کہ سُن رکھو اور جان لو کہ حقیقی تقویٰ اور خدا ترسی کا تقاضا یہی ہے، اور اللہ کی نصرت و حمایت اور تائید و توفیق یعنی فی الجملہ اس کی معیّت صرف اہلِ تقویٰ کو حاصل ہوتی ہے! ـ اگر اللہ سے تعلق جوڑنا چاہتے ہو تو اس کے لئے نہ صرف کفر اور شرک سے اظہارِ براءت اور کفّار و مشرکین سے اعلانِ لاتعلقی کرنا ہو گا بلکہ اپنے ہاتھوں سے انہیں قتل کرنا ہو گا۔ خواہ وہ قریب ترین اعزّہ و اقارب اور قدیم ترین احباب اور اولیاء ہی کیوں نہ ہوں۔ الغرض اللہ اور اُس کے رسولؐ کے نزدیک مومنِ صادق کا

اپنی کوتاہیوں اور تقصیروں پر پردہ ڈالنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں اور یہ معاملہ رفتہ رفتہ جھوٹی قسموں تک پہنچ جاتا ہے جنھیں وہ : اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً کے مصداق نظمِ سمع و طاعت کی خلاف ورزی پر باز پرس اور سرزنش سے بچنے کیلئے ڈھال بنالیتے ہیں — اور یہ ہے وہ مقام جہاں سے "ضعفِ ایمان" کی سرحد ختم اور 'نفاق' کی حد شروع ہوجاتی ہے — پھر جس طرح امراضِ جسمانی کے ارتقائی مراحل ہوتے ہیں جیسے ٹی بی کی پہلی، دوسری اور تیسری STAGES اسی طرح یہ مرضِ نفاق بھی بڑھتا رہتا ہے اور گھناؤنے سے گھناؤنا تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اوّلاً منافقین کے دلوں میں مومنینِ صادقین سے بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے کہ یہ ایمان و اسلام اور جہاد و قتال کے ضمن میں جانفشانی اور سرفروشی سے کام کیوں لے رہے ہیں۔ کیوں نہیں ہماری ہی طرح عُضوِ مُعطّل بن کر بیٹھ رہتے۔ تاکہ ہماری بے عملی بھی زیادہ نمایاں نہ ہو۔ اور پھر بالآخر وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ ع "بازی بازی باریش بابا ہم بازی!" کے مصداق وہ اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فقرے چست کرنے شروع کر دیتے ہیں اور آیات و سُوَرِ قرآنی کے تمسخر و استہزاء سے بھی نہیں چوکتے چنانچہ منافقت کی ٹی بی کی یہ ہے وہ آخری اور تیسری سٹیج جس کا نقشہ کھینچا گیا ہے آیات زیرِ درس میں جو سورۂ توبہ کی بھی اختتامی آیات میں سے ہیں اور مرضِ نفاق کے بھی نقطۂ عروج (CLIMAX) کو بیان کر رہی ہیں۔

قرآنِ حکیم نے اپنا جو ابتدائی تعارف سورۂ بقرہ کے آغاز میں کر دیا ہے اس میں بھی یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں کہ : يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ یعنی "(اللہ) اسی کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی کے ذریعے بہتوں کو ہدایت دیتا ہے"— اس لئے کہ ہدایت و ضلالت کا معاملہ یک طرفہ نہیں ہے بلکہ دو طرفہ ہے۔ یعنی ایک جانب بندے کی طلب ہوتی ہے اور دوسری جانب اللہ کی توفیق و تیسیر! گویا بندہ اگر طالبِ ہدایت اور جویائے حق ہو اور اس کے لئے فی الواقع محنت کرے تو اللہ اس کے لئے ہدایت کے راستے لازماً کھول دیتا ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی : وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ! — لیکن اگر انسان طالب ہی زیغ و ضلالت کا ہو اور خواہشات و شہوات نے اُس کے فہم و شعور پر دبیز پردے

اور اس طرح گویا ایک آئینہ اُن کے سامنے رکھ دیا گیا ہے جس میں وہ اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ منافقین دو قسم کے تھے: ایک وہ جن کے باطن میں ایمانِ حقیقی کی کوئی کرن کبھی چمکی ہی نہ تھی اور حلاوتِ ایمانی کی کوئی رمق انہیں کبھی نصیب ہوئی ہی نہ تھی۔ گویا اسلام میں اُن کا داخلہ ہوا ہی دھوکے اور سازش کے تحت تھا جیسے کہ ذکر ہوا ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷۲ میں: وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ یعنی اہلِ کتاب میں سے بعض نے یہ سازش کی کہ صبح کو ایمان کا اعلان کر دو اور شام کو ارتداد اختیار کر لو تاکہ ایمان کی جو دھاک بیٹھ گئی ہے کہ جو بھی اس کا مزہ چکھ لیتا ہے وہ پھر کسی بھی صورت میں اس سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتا، وہ ختم ہو جائے اور اس طرح شاید کہ سچے مومنوں میں سے بھی بعض کا یقین متزلزل ہو جائے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ اس قرارداد کے تحت اسلام میں داخل ہوئے انہیں ایک لحظے کے لئے بھی ایمانِ حقیقی کی دولت نصیب نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن کا یہ دُخول و خرُوج سورۂ مائدہ کی آیت ۶۱ میں وارد شدہ اِن الفاظ کا کامل مصداق ہے کہ: "وَقَد دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ (یعنی "وہ کفر کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے اور اُس کے ساتھ ہی نکل گئے!")۔ گویا اس دُخول و خرُوج کے مابین جو چند ساعتیں انہوں نے بسر کیں اُن کے دوران وہ قانوناً تو مسلمان تھے لیکن حقیقتاً کٹر منافق بلکہ کافر!! — دوسری قسم کے منافق وہ تھے جن کا اسلام میں داخلہ تو کسی سازش یا بدنیّتی کے تحت نہیں تھا بلکہ انہوں نے اسلام قبول تو کسی وقتی سے داخلی جذبے یا فوری قسم کی خارجی تحریک کے زیرِ اثر کم و بیش نیک نیّتی ہی سے کیا تھا۔ لیکن اُن کی شخصیتیں مریض تھیں اور انہیں 'ضعفِ ارادہ' کا مرض لاحق تھا چنانچہ جب اسلام و ایمان کے تقاضے ان کے سامنے آئے — اور دین کے مطالبات کو پورا کرنے کا وقت آیا تو ان کی ہمّتیں جواب دے گئیں اور وہ صبر و ثبات اور استقامت و استقلال کا ثبوت نہ دے سکے۔ معاملہ یہیں تک رہتا تو غنیمت تھا اس لئے کہ یہ لازماً نفاق نہیں ہے بلکہ اسے 'ضعفِ ایمان' قرار دیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کیا جاتا رہے اور اصلاح کی سعیٔ پیہم جاری رکھی جائے لیکن کچھ لوگ دوسری روش اختیار کرتے ہیں اور جھوٹے بہانوں اور مَعذراتِ لنگ کے ذریعے

جواب طلبی کے مواقع پر یہ قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان واسلام کا ثبوت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن حقیقی اور باطنی اعتبار سے یہ ان کٹر کافروں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں جن کے حق میں نہ کوئی وعظ و تذکیر مفید ہوتی ہے، نہ زجر و ملامت گویا: —
"سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ کے مصداقِ کامل —— یعنی: "برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ انہیں متنبہ کریں خواہ نہ کریں، یہ ماننے والے نہیں ہیں۔ اللہ نے اُن کے دلوں، اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ چکا ہے، اور یہ عذابِ عظیم ہی کے سزاوار ہو چکے ہیں!"

آیت ۱۲۷ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں اور محفلوں میں ان منافقین کے رویے کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قانوناً اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرائے رکھنے کے لئے انہیں جمعہ و جماعات میں حاضری تو دینی پڑتی تھی لیکن یہ سب کچھ بہ رست باندھے کو ہوتا تھا لہٰذا ہر آن وہاں سے کھسک جانے کا موقع تلاش کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ کبھی کوئی جھوٹا عذر تراش کر چل دیتے تھے۔ کبھی ویسے ہی بلا اجازت کھسک جاتے تھے، جس کا ذکر ہے سورۂ نور کی آیت ۶۳ میں کہ: "قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ يَتَسَلَّلُوْنَ مِنْكُمْ لِوَاذًا" (اللہ خوب جانتا ہے تم میں سے ان لوگوں کو جو آنکھ بچا کر کھسک جاتے ہیں!) —— یہ معاملہ اس وقت انتہا کو پہنچ جاتا تھا جب قتال یا انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب پر مشتمل آیات نازل ہوتی تھیں۔ اس وقت وہ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتے تھے کہ مومنین صادقین میں سے کسی کی نگاہ تو ہم پر نہیں اور جیسے ہی اطمینان ہو جاتا تھا کہ اہلِ ایمان کی توجہ کسی دوسری طرف ہے تو وہ رخصت ہو جاتے تھے۔ آخر میں فرمایا کہ وہ سمجھتے ہوں گے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہے۔ حالانکہ وہ بدبخت قانونِ خداوندی کی زد میں آ چکے ہیں اور بارگاہِ خداوندی سے دھتکارے جا چکے ہیں۔ گویا اصل میں وہ نہیں پھرے، اللہ نے اُن کے دلوں کو پھیر دیا ہے۔ اس اندازِ بیان سے یہ مغالطہ نہ ہو کہ ان کی گمراہی کا ابتدائی سبب اللہ کا فیصلہ ہے —— اس لئے کہ سورۂ صف کی آیت

ڈال دیئے ہوں جس کی جانب اشارہ ہے آیاتِ زیرِ درس کے آخری الفاظ یعنی:
" بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ! میں یعنی "بوجہ اس کے کہ وہ عقل و فہم سے
کام نہیں لیتے!" — تو ہر سیدھی بات بھی انہیں اُلٹی نظر آتی ہے، یہاں تک قرآن مجید
کی آیاتِ بیّنات سے بھی اُس کے پلّے ضلالت و گمراہی کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا — چنانچہ
یہی وہ حقیقت ہے جسے منافقین نے قرآن کے استہزاء کی بنیاد بنا لیا — یعنی یہ کہ
جب کوئی نئی سورت یا آیتیں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوتیں اور آپ انہیں
مسلمانوں کو سُناتے، تو یہ منافق اپنی محفلوں میں مذاقاً ایک دوسرے سے کہتے: "کہو بھئی!
اِس نئی سورت سے کس کس کے ایمان میں اضافہ ہوا!" — اور پھر جو اُن قہقہوں کے
ساتھ جو فقرے بازی کی جاتی ہوگی اُس کا تصوّر تو بخوبی کیا جا سکتا ہے لیکن "نقلِ کفر،
کفر نباشد" کے باوجود اسے زبان سے دُہرانا کسی صاحبِ ایمان کے لئے ممکن نہیں!
اس پر اللہ کے جس غضب کا اظہار ہوا وہ لفظ 'رِجس' سے بخوبی نمایاں ہو جاتا ہے
گویا ان منافقوں کا دلی روگ اب اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ ان کے قلوب گلے سڑے
متعفّن گوشت کے لوتھڑے بن گئے ہیں اور اب اعلیٰ سے اعلیٰ عقلی و روحانی غذا
بھی: "ہر کہ در کانِ نمک رفت، نمک شد!" کے مصداق اُن کے باطن کی گندگی ہی
میں اضافے کا موجب بن سکتی ہے — اور ان کا واحد انجام اب یہ ہے کہ انہیں اسی
حالت میں موت آئے، جو بظاہر اسلام اور بباطن بدترین کفر ہے!!!۔

آیت ۱۲۶ میں ابتلاء و آزمائش کی حکمت کی جانب اشارہ ہے۔ اہلِ ایمان
پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے ابتلاؤں اور امتحانات کا وُرود اسی لئے ہوتا ہے کہ جن کے
فکر و عمل میں کوئی کجی راہ پا رہی ہو وہ اس پر متنبہ ہو جائیں اور اگر خلوص و اخلاص کی
کوئی رمق موجود ہو تو فوراً اصلاح پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس اعتبار سے امتحان و
آزمائش اللہ کی نعمت ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جن کے باطن کا نور بالکل ہی بجھ چکا ہو
اور جن کا خرمنِ ایمان اس طرح جل کر راکھ ہو چکا ہو کہ کہیں کوئی دبی ہوئی چنگاری
بھی باقی نہ رہی ہو ان کے حق میں یہ نعمتِ خداوندی مفید نہیں رہتی — اور انہیں نہ
توبہ کی توفیق نصیب ہوتی ہے، نہ اُن پے بہ پے امتحانات اور آزمائشوں سے یہ کوئی
سبق ہی حاصل کرتے ہیں۔ گویا بظاہر اگرچہ یہ مسلمانوں میں شامل ہیں اور ربا زپرس اور

حق میں رحمت بن کر مبعوث ہوئے ہیں بفحوائے نصِ قرآنی: "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝" ۔ لیکن اہل ایمان کے حق میں تو اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپؐ کی بعثت اللہ کا سب سے بڑا احسان ہے۔ جیسے کہ فرمایا سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ میں کہ: "لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ" (یقیناً اللہ نے بہت بڑا احسان فرمایا ہے اہل ایمان پر کہ مبعوث کیا ان میں ایک رسولؐ، خود ان ہی میں سے جو پڑھ کر سناتا ہے انہیں اُس کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی!) — ذرا بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو سورۂ آلِ عمران کی یہ آیت سورۂ توبہ کی زیرِ درس آیت کا ہر اعتبار سے مثنیٰ نظر آتی ہے۔ اس لئے کہ دونوں میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو اللہ تعالیٰ کے احسانِ عظیم سے تعبیر فرمایا گیا، دونوں میں آپ کی: "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" ہونے کی صراحت وارد ہوئی اور دونوں میں آپؐ کی تین تین شانوں کا ذکر ہے۔ ایک میں تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفوس اور تعلیمِ کتاب و حکمت کا — اور دوسری میں: "عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ" — "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ" — اور — "بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ" کا۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم کی بعض دوسری آیات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں: "مِنْكُمْ" یا "مِنْهُمْ" کے الفاظ سے جس حقیقت کی جانب اشارہ ہوتا ہے وہ ان دونوں آیات میں "مِنْ اَنْفُسِكُمْ" اور "مِنْ اَنْفُسِهِمْ" کی صورت میں ظہور و انکشاف کے آخری رتبے کو پہنچ گئی ہے — اور اس میں آپ کی ذاتِ اقدس سے 'اپنائیت' اور 'قرب' کا احساس جس شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے اور اس میں کیف و سرور کی جو کیفیت مضمر ہے اسے ہر حساس، اور صاحبِ قلبِ زندہ انسان بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ اس قرب اور یگانگت کے رتبے بے شمار ہیں۔ مثلاً جملہ مخلوقات کے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ حضورؐ بھی ان ہی میں سے ہیں۔ اس سے بڑھ کر معاملہ ہے عالمِ انسانیت کا کہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار ہے یہ بات کہ آپؐ اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر فضیلت حاصل ہوئی اہلِ عرب کو کہ آپؐ ان میں سے ہیں، پھر درجہ بدرجہ نمبر ہے قریش اور بنی ہاشم

ـــ۵ میں ہدایت و ضلالت کا جو مکمل ضابطہ بیان ہوا ہے اس میں یہ صراحت موجود ہے کہ " فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ " (یعنی جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے اُن کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا!) ـــ گویا یہاں یہ وضاحت فرما دی گئی کہ یہ منافق اللہ کے اس اٹل قانون کی زد میں آ چکے ہیں اور اب انکا لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ اعاذنا اللہ من ذالك!

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

(۱۴)

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۞

یہ سورۂ توبہ کی آخری دو آیات (۱۲۸ تا ۱۲۹) ہیں اور ان کا ترجمہ یہ ہے:

"(لوگو!) آ گیا ہے تمہارے پاس ایک رسول، خود تم ہی میں سے، بہت گراں گذرتا ہے اس پر تمہارا کسی بھی تکلیف میں مبتلا ہونا، حد درجہ خواہش مند ہے وہ تمہارے حق میں (ہر خیر اور بھلائی کے لئے!) اہل ایمان پر نہایت شفیق اور مہربان۔ پھر بھی (اے نبیؐ!) اگر یہ منہ موڑ لیں تو کہہ دیجئے: میرے لئے تو اللہ کافی ہے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں، اُسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہی مالک ہے عرشِ عظیم کا!"

سورۂ توبہ کی ان آخری دو آیات میں سے پہلی میں بظاہر عموم الفاظ کے اعتبار سے تو خطاب ہے تمام مسلمانوں سے لیکن سیاقِ کلام کے اعتبار سے اصل روئے سخن ہے منافقین کی جانب ـــــــ اور دوسری میں بظاہر خطاب ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکن اس میں بھی ایک تعریض ہے ان ہی منافقین پر اور عتاب شدید ہے ان کے حق میں باسلوبِ اعراض ـــــــ!!

یوں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کل جہان والوں بلکہ تمام جہانوں کے

دنوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن
توبہ الفاظ قرآن مجید میں پورے آٹھ بار اسی طرح جوڑوں کی صورت میں آئے
آیتِ زیرِ درس میں نبی اکرمؐ کی شان میں بھی ساتھ ساتھ وارد ہوئے ہیں اور
حدید میں متبعین حضرت مسیح علیہ السلام کے ذکر میں بھی: "رأفۃ و رحمۃ" کی
ات لازم و ملزوم کی حیثیت سے آئی ہیں ؂

بہرحال یہ آیتِ مبارکہ جہاں اہلِ ایمان کے حق میں نویدِ جانفزا کی حیثیت
تی ہے وہاں منافقین کی بدبختی کا مرثیہ بھی نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ
ن میں ہے کہ: ع : چہ سود از رہبرِ کامل تہیدستان قسمت را!
مصداق ایسے رحیم و کریم اور شفیق و ودود پیغمبر کی صحبت کے مواقع حاصل ہونے
بود محروم کے محروم رہ گئے — اور آپؐ کی رأفت و رحمت اور شفقت و مروت
انتیجہ یہ نکلا کہ خود آپؐ پر بھی فقرے چست کرنے سے باز نہ آئے اور "نوبت
بجا رسید!" کہ آیاتِ الٰہی بھی ان کے تمسخر و استہزاء کا ہدف بن گئیں، فعلیھم
اللّٰہ و الملٰئکۃ و الناس اجمعین —!!

آخری آیت میں خطاب کا رُخ تو ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب لیکن
س میں مضمر عتاب ہے ان ہی ملعون منافقین کی طرف کہ اے نبی! اگر اس سارے وعظ و
نصیحت اور تنبیہ و تذکیر کے باوجود یہ لوگ اپنا رخ موڑے ہی رہیں تو آپؐ بھی ان کی
ب توجہ نہ فرمائیں اور ان کے کان کھول دیں کہ مجھے نہ کسی کی نصرت کی ضرورت
نہ مدد کی، میرے لئے تو میرا اللہ کافی ہے۔ بقولِ شاعر: ع

"کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!"

کسی کا یہ خیال ہے کہ میرے مشن کی تکمیل اور اللہ کے دین کے غلبے کا دارومدار اس
کی مدد یا نصرت پر ہے تو وہ سخت مغالطے میں مبتلا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو مکی سورتوں
میں سے سورۂ عنکبوت کے آغاز میں ان الفاظ میں وارد ہوئی کہ: "وَمَنْ جَاهَدَ
فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝" (یعنی جو کوئی جہاد کرتا
ہے تو وہ جہاد کرتا ہے اپنے ہی بھلے کو۔ اور اللہ تو بے نیاز ہے تمام جہانوں سے!) —
یہی بات ہے جو زیرِ درس سورت کے چھٹے رکوع کے آغاز میں فرمائی گئی تھی جہاں سے

کا کہ آپؐ ان میں سے ہیں ــــ دوسری طرف ایک فخر حاصل ہے جملہ انبیاءؑ و رسلؑ کو کہ آپؐ ان ہی کی مقدس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک فخر حاصل ہے ہر صاحب ایمان کو کہ اسے آپؐ کے دامن سے وابستگی کا شرف بھی حاصل ہے اور "ہم ی... سے ... ہونے کا وہ مسرور کن احساس بھی جو لفظ 'ایمان' کے اشتراک کی بنا پر ابھرتا ہے یعنی: "اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ"

البتہ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ یہ سب تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ وہ ہے جس کی رو سے حضورؐ کسی کے بھی نہیں، صرف اللہ کے ہیں جس کی تعبیر: "لِیْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ ..." کے الفاظ میں اور جس کا ظہور ہوا عالم علوی میں بھی جہاں سدرۃ المنتہیٰ پر جبریل علیہ السلام کو بھی پیچھے رہ جانا پڑا اور اس عالم ارضی میں بھی جہاں ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی: "و لو کنت متخذاً خلیلاً غیر ربی لاتخذت ابا بکرٍ خلیلاً ولکن اخوۃ الاسلام[1]" پر اکتفا کرنا پڑا۔ یعنی: "اگر میں اللہ کے سوا کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر (رضؓ) کو بناتا۔ لیکن میرا خلیل تو بس اللہ ہی ہے، ہاں اخوتِ دینی میں ابوبکرؓ سب پر فائق ہیں!"

الغرض کسی صاحبِ ایمان کے لئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں: "مِنْ اَنْفُسِكُمْ" کے الفاظ ہی حد درجہ کیف اور سرور کے حامل ہیں۔ یہاں ان پر اضافہ ہے "عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ!" کا ــ پھر: "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ!" کا اور سب سے بڑھ کر: "بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ!" کا ــ اور ان کے مابین ربط معنوی یہ ہے کہ "عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ!" کا تعلق صفتِ رافت سے ہے۔ اور "حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ!" کا صفتِ رحمت سے ــ اور ان کے مابین ربط و تعلق یہ ہے کہ اگر کسی کو کسی دوسرے کی تکلیف کا احساس اپنے دل میں ہو بقولِ شاعر

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ ؎ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

تو یہ رافت ہے۔ (فارسی میں اس کا صحیح ترین ترجمہ 'ہمدردی' ہے!) اور جب وہ ہمہ تن اس تکلیف کو دور کرنے کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے تو یہ رحمت ہے۔ تو

---

[1] اخرجہ الشیخان رح عن ابی سعید الخدری رضؓ۔

اللہ کے ہاتھ میں ہے اور "از ماہ تا بہ ماہی!" سب پر اسی کا بلا شرکتِ غیرے تسلّط و استیلاء قائم ہے۔ تو اب جو صرف اُسی کا ہوگیا اور وہ بھی اس کا ہوگیا اس کی عظمتِ شان اور عُلوِّ مرتبت کے بارے میں کیا تصوّر تم قائم کروگے؟

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۵

اسلام، مسلمان اور قرآن حکیم

اشعارِ اقبال کی روشنی میں

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

بایاں تش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری

◉

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست او — زندہ و پائندہ و گویاست او

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

غزوۂ تبوک کا ذکر شروع ہوا تھا یعنی: "اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ" [یعنی اگر تم اِن کی مدد نہ کرو گے تو اللہ نے تو ان کی مدد کی تھی اس وقت بھی جب نکال دیا تھا انہیں کافروں نے (جب کہ ان کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر نہ تھا بلکہ وہ کل دو نفر تھے اور) آپؐ دو میں کے دوسرے تھے۔ جب کہ وہ دونوں غار میں تھے!] —— واضح رہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "حَسْبِيَ اللّٰهُ" کہنے کا حکم قرآن مجید میں دوبارہ ہوا ہے۔ ایک آیت زیرِ درس ہیں اور دوسرے سورۂ زمر کی آیت ۳۸ میں، اور دو ہی مرتبہ "حَسْبُنَا اللّٰهُ" کے الفاظ اہلِ ایمان کے قول کی حیثیت سے نقل ہوئے ہیں۔ ایک زیرِ درس سورت ہی کی آیت ۵۹ میں اور دوسرے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۷۳ میں —— اور واقعہ یہ ہے کہ بندۂ مومن کے قلب کو ہر طرح کے حالات میں ثبات وسکون عطا کرنے کی تاثیر میں ان کلماتِ مبارکہ سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ آگے فرمایا: "لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ!" (اس کے سوا کوئی معبود نہیں میرا تمام تر توکل اُسی کی ذات پر ہے!) لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط کلمۂ توحید ہے، اور جس طرح ایک حدیثِ نبویؐ کی رُو سے ایمان کے بہت سے شعبے ہیں، جن میں سے بلند ترین تو ہے کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" اور ادنیٰ ترین ہے: "راستے سے کسی اذیت بخش چیز کو ہٹا دینا!" —— اسی طرح توحید کے شجرۂ طیبہ کی بھی بہت سی فروع ہیں جن میں "توحید فی العقیدہ" بھی لازماً شامل ہے اور "توحید فی الطلب" بھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ توحید کا لبِّ لباب ہے "توحید فی التوکل!" —— بفحوائے الفاظِ قرآنی: "اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ط" (یعنی مت سمجھو میرے سوائے کسی اور کو اپنا سہارا یا کارساز!) —— کلمۂ توحید اور توکل علی اللہ کا یہی ربط وتعلق سورۂ تغابن کی آیت ۱۳ میں بھی وارد ہوا ہے یعنی: "اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ" (یعنی اللہ وہ ہے جس کے سوائے کوئی معبود نہیں اور اہلِ ایمان کو تو بس اُسی پر توکل کرنا چاہیئے!) —— اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایمان کے اس لازمی تقاضے پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر میں فرمایا: "وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝" —— لوح وقلم اور عرش وکرسی وہ حقائق ہیں کہ جن کی کُنہ تک پہنچنا انسان کے بس سے باہر ہے مختصر مراد یہ کہ اس کل کون ومکان کا اقتدارِ مطلق اور اختیارِ کلی صرف اور صرف

ستھے یا نہیں؟"

مالٹہ کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشا دارالعلوم میں تشریف فرما تھے، علما کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ وہ ہم نے تو مالٹہ کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔" یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علما کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں، وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

نباضِ اُمت نے ملت مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایام زندگی میں ضعف و علالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود اس کے لئے سعی پیہم فرمائے بذاتِ خود درس قرآن شروع کرایا، جس میں تمام علمائے شہر اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی جیسے علما بھی شریک ہوتے تھے اور عوام بھی، اس ناکارہ کو اس درس میں شرکت کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر اس واقعے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی عمر ہی گنتی کے چند ایام تھے۔

"آں قدح بشکست وآں ساقی نماند"

آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے۔ قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا ــــ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔"

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

کا ایک سبق آموز واقعہ

بروایت مولانا مفتی محمد شفیعؒ

"عوامی درسِ قرآن"

کی ضرورت و اہمیت

ماخوذ از: وحدت امت، ——— تالیف مولانا مفتی محمد شفیعؒ

شائع کردہ ——— مکتبہ المنبر ——— لائل پور

"شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس اللہ سرہٗ مالٹہ کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تشریف لائے تو علما، کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے بہت اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں، کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہ' و تعالےٰ کے لیئے امت کی صلاح فلاح کے گرد گھومتی تھیں۔ مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جو انکی زبان مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقصد کا پتہ دیتا ہے۔ فرمایا "الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے"۔ جیل کی تنہائیوں میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقا نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہیئے تو فرمایا "اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف و محنت اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے زیرِ اہتمام

قرآن اکیڈمی

۳۶ ۔ کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور (فون ۸۵۲۶۱۱ / ۸۵۲۶۸۳) میں

ایک نئی تعلیمی اسکیم

میٹرک + ادیب عربی
+ دینی تعلیم و تربیّت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

"قرآن اکیڈمی" کے قیام کی تجویز اوّلاً جون ۱۹۶۷ء میں ماہنامہ "میثاق" لاہور کے "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں شائع شدہ اس تحریر میں سامنے آئی تھی جو اب "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔ اس تحریر میں پیش کردہ نقشۂ کار کے مطابق راقم الحروف نے ۱۹۶۸ء میں تنہا کام کا آغاز کر دیا۔ اور ایک جانب لاہور میں متعدد حلقہ ہائے مطالعہ قرآن قائم

ملت کے ایک اور عظیم فرزند

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

کی رائے جو اس دور میں ظاہر ہوئی جب وہ تمیع اسلامیان ہند کی آنکھ کا تارا تھے اور انہوں نے ابھی انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار نہ کی تھی:

"اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جاسکتا ہے کہ علمائے حق و مرشدینِ کاملین کا فقدان اور علمائے سُوء و مفسدین دجالین کی کثرت ——— رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ٥

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیئے کہ " لا یصلح اٰخر ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا " یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہوسکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں !!

مولانا ابوالکلام آزاد

ماخوذ از " البلاغ " جلد اول شمارہ اول مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء

اے اور ایم ایس سی کی ڈگریوں کے حامل ہوں ۔ " تعلیم و تعلّمِ قرآن " ہی
کو زندگی کا اصل مقصد اور تامینِ حیات اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا اصل مصرف
قرار دے کر ڈیرہ لگا کر بیٹھ رہیں اور گھٹنے زمین پر ٹیک کر کام شروع کر دیں ۔
اور اللہ چاہے گا تو وُہ وقت ضرور آئے گا اور ایسے باہمت نوجوانوں ضرور
میسر آئیں گے ۔ تاہم ابھی اسے ' اُمّیدِ فردا ' ہی کی حیثیّت حاصل ہے ۔

سر دست جو تمہیدی کام شروع کر دیئے گئے ہیں ان میں سے ایک تو وہ
ہے جس کا آغاز گذشتہ سال ہو گیا تھا یعنی ایک " دارالمقامہ " کا قیام جس میں
یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم طلبہ مقیم ہیں اور انہیں شام کے اوقات میں عربی زبان
اور قرآن و حدیث سے روشناس کرایا جا رہا ہے ۔ اس اُمید پر ہے کہ یہ " دارالمقامہ "
ان شاء اللہ العزیز قرآن اکیڈمی کے اصل منصوبے کے لئے ' نرسری ' کا کام دے گا
اور یہیں سے متذکرہ بالا باہمت نوجوان مل جائیں گے ۔

اس سال اس سے بھی ذرا نیچے اتر کر ایک نئی تعلیمی سکیم کا آغاز کیا جا رہا
ہے ـــــ اور وہ یہ کہ ان شاء اللہ ۱۵ مئی ۸۳ء سے کچھ مڈل پاس طلبہ سے
ایک ' اقامتی درس گاہ ' کا آغاز کیا جائے گا جنہیں اصلاً تو دو زبانیں پختہ طور پر
پڑھائی جائیں گی یعنی عربی اور انگریزی ۔ اور ان کے علاوہ میٹرک کے لازمی مضامین
یعنی اسلامیات ، اُردو اور مطالعۂ پاکستان اور اختیاری مضامین میں سے جنرل
سائنس اور جنرل ریاضی لازمی طور پر اور اسلامیات ، اسلامی تاریخ اور شہریّت
(سوکس) میں سے کوئی ایک مضمون پڑھایا جائے گا ۔ اور دو سال میں پرائیویٹ
میٹرک کا امتحان دلوا دیا جائے گا اور اگلے سال ادیب عربی کا امتحان دلوا دیا جائے
گا ۔ اس طرح صرف ایک اضافی سال کے صَرف سے دینی اور دنیوی دونوں میدانوں
میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا راستہ کھل جائے گا ۔ اور اگر اللہ کو منظور ہوا تو اسی اسکیم
کو آگے بڑھا کر ایک جانب بی اے اور دوسری جانب فاضل عربی کے امتحانات
دلوائے جائیں گے ۔

کئے اور دوسری جانب طباعت و اشاعت کے سلسلے کو بھی تیز تر کر دیا۔

الحمدللہ کہ راقم کے بعض ہم خیال احباب نے ۱۹۷۲ء میں "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کی تاسیس کا مرحلہ طے کر لیا۔ اور راقم کے لئے معاملہ وہ ہو گیا کہ سے "گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں۔ یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں" ثم الحمدللہ کہ انجمن کے زیر اہتمام ۱۹۷۶ء میں 'قرآن اکیڈمی' کی تعمیر کا آغاز ہو گیا۔ جس کا سنگ بنیاد ۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ کو رکھ دیا گیا۔

ان سطور کی تحریر کے وقت تک بفضلہ تعالیٰ وعونہٖ 'قرآن اکیڈمی' کا کُل تعمیری منصوبہ تین چوتھائی سے زیادہ مکمل ہو چکا ہے اور اس پر لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں!!

جن مقاصد کے حصول کے لئے 'قرآن اکیڈمی' قائم کی جا رہی ہے ان ہی کے لئے ایک کوشش موجودہ صدی کے بالکل آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے مجوزہ "دارالارشاد" کی شکل میں ہوئی تھی جو بالکل ناکام رہی پھر لگ بھگ ربع صدی بعد ایک دوسری کوشش کا نتیجہ علامہ اقبال مرحوم کے مجوزہ "دارالاسلام" (پٹھان کوٹ) کی صورت میں سامنے آیا۔ جسے ایک اسلامی تحریک کے مرکز ہونے کی سعادت تو حاصل رہی لیکن اس کی تعمیر سے جو مقاصد اصلاً پیش نظر تھے ان کی جانب کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ اب یہ تیسری کوشش راقم کے زیر اہتمام ہو رہی ہے اور اس کے بھی اصل مقاصد کی طرف پیش قدمی کا تو آغاز بھی تاحال نہیں ہو سکا۔ البتہ بعض تمہیدی کاموں کا آغاز ہو گیا ہے ________ اور آئندہ کے لئے دعا ہے کہ

" میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو
میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر!! "

"اصل مقصد کی جانب پیش قدمی" تو راقم کے نزدیک اس وقت ہوگی جب کچھ جدید تعلیم سے فارغ التحصیل طلبہ [illegible]

لاہور

میں

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاہور

اور ان کے رفقاء کار کے

درسِ قرآن

کا

پروگرام

ساتھ ہی ان کی دینی و اخلاقی تربیت کا بھرپور اہتمام کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ ان میں نہ صرف صحیح اسلامی اخلاق پیدا ہوں بلکہ اعلائے کلمۃ اللہ کی سعی کا جذبہ اور حصولِ مرتبۂ شہادت کا شوق پیدا ہو۔ تاکہ ان میں سے ایک طرف اعلیٰ معیار کے محققین و مصنفین پیدا ہو سکیں تو دوسری طرف دعوت و تحریک اسلامی کو مخلص کارکن مہیا ہو سکیں۔ وَاِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِيَسِيْر!! —— !!

اب ضرورت ہے کہ دینی ذوق و شوق کے حامل حضرات اپنے جگر گوشوں کو اللہ کے دینِ متین اور کتابِ مبین کی خدمت کے لئے وقف کرنے کی نیت اور ارادے کے ساتھ اس درس گاہ میں داخل کریں اپنی جگہ ہم پوری کوشش کریں گے کہ ان کی امانتوں کی مناسب نگہداشت ہو اور اگر ہم بالفرض بچوں میں خدمتِ دین کا جذبہ کما حقہٗ پیدا نہ کر سکیں تب بھی وہ دنیا کے لئے بالکل نکمے نہ بن کر رہ جائیں بلکہ عربی یا اسلامک اسٹڈیز یا اسلامک ہسٹری یا پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر کے اپنا آئندہ راستہ خود تجویز کر سکیں۔

یہ "ثانوی درسگاہ" آفاقی ہوگی۔ اور اس میں درس و تدریس ہی کا نہیں بلکہ قیام و طعام کا اہتمام بھی ان شاء اللہ معیاری سطح پر کیا جائے گا۔ لہٰذا اس میں داخل ہونے والے طلبہ سے ڈھائی صد روپے ماہانہ وصول کئے جائیں گے۔ البتہ جو والدین اس اسکیم میں حصہ لینے کے دل سے خواہشمند ہوں اور ان کے بچے بھی ذہین اور باصلاحیت ہوں اور والدین خرچ برداشت نہ کر سکتے ہوں تو ان کو انجمن کُل یا نصف اخراجات کی حد تک وظیفہ دے گی۔

ماڈل ٹاؤن لاہور یا اس کے قرب و جوار میں رہائش پذیر طلبہ جو صبح شام دونوں وقت درسگاہ میں حاضر ہو سکیں اور صرف دوپہر اور رات کو گھر جائیں ان کو درسگاہ میں اقامت سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا اور ان سے صرف ٹیوشن فیس پچاس روپیہ ماہوار وصول کی جائے گی۔ اور اس کے لئے بھی ضرورتمند طلبہ کو وظائف دیئے جائیں گے۔ —— اب جو حضرات اپنے بچوں کو اس درسگاہ میں داخل کرانے کے خواہشمند ہوں وہ اپنی پہلی فرصت میں [illegible]

اکٹر صاحب کے رفقائے کار کے درس کا پروگرام

	وقت	مدرس	مقام
[illegible]	دس بجے صبح	ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب	ڈینٹل کالج وہسپتال نزد بادشاہی مسجد
[illegible]	بعد نماز عصر	"	کامن روم [illegible] انجینئرنگ یونیورسٹی دیانت [illegible]
[illegible]	بعد نماز مغرب	"	مینک ڈاکٹر [illegible] [illegible] خواجہ وسن پورہ
[illegible]	$7\frac{1}{2}$ بجے صبح	"	[illegible] شاد باغ
[illegible]	بعد مغرب	پروفیسر [illegible]	[illegible] فاروق [illegible]
[illegible]	"	"	جامع [illegible] اکھاڑہ بوٹاں مسلم [illegible] برانڈرتھ روڈ
[illegible]	۱ بجے صبح	چوہدری رحمت اللہ بٹر	[illegible] شاد عالم مارکیٹ
[illegible]	بعد نماز فجر	"	مسجد میاں میتے والی، نئی آبادی ڈھولنوال
[illegible]	بعد مغرب	"	جامع مسجد فاروقیہ، نوراللہ کالونی ملتان روڈ
[illegible]	بعد نماز عصر	محمد اکرم خاں صاحب	تعلیم الاسلام ماڈل سکول، یثرب پارک " "
[illegible]	بعد مغرب	شکیل احمد قریشی	[illegible] کوثر روڈ، اسلام پورہ

ڈاکٹر اسرار احمد

لاہور میں ہر ہفتے تین درسِ قرآن اور ایک خطبہ جمعہ دیتے ہیں

(۱)

ہر بدھ کو بعد نماز مغرب

جامع مسجد جی۔او۔آر نمبر (۱) میں

جہاں حال ہی میں سورۂ بقرہ کے درس کا آغاز ہوا ہے۔

(۲)

ہر جمعہ کو صبح ۹ بجے

جامع مسجد شہداء، ریگل چوک میں

جہاں اب بحمد اللہ بائیسواں پارہ زیرِ درس ہے۔

(۳)

ہر جمعہ کو ساڑھے بارہ بجے دن

جامع مسجد دار السلام، باغ جناح میں

جہاں خطبہ جمعہ میں چیدہ چیدہ مقامات سے قرآن حکیم کا بیان ہوتا ہے۔

(۴)

ہر ہفتہ کو بعد نماز مغرب

قرآن اکیڈمی (۳۶۔کے) ماڈل ٹاؤن میں

جہاں سورہ آل عمران کا آغاز ہو رہا ہے۔

وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جون ۱۹۸۰ء

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے - ماڈل ٹاؤن - لاہور

(فون : 852683 - 852611)

چندہ سالانہ -/۲۰ —————— قیمت فی شمارہ -/۲

جمعہ	بعد نماز عصر	محمد شفیق حجازی صاحب	الجنت، مکان نمبر ۱۵ اسٹریٹ نمبر ۱۲	چوہان روڈ
جمعرات	بعد مغرب	سید خالد ظہیر صاحب	۶-ایل، نزد ڈونگی گراؤنڈ	سمن آباد
بدھ	۱۱ بجے دن	〃 〃 〃	شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن	جامعہ پنجاب
اتوار	بعد نماز عشاء	〃 〃 〃	مسجد ہاسٹل نمبر ۷	جامعہ پنجاب
جمعرات	بعد نماز مغرب	چوہدری غلام محمد صاحب	مسجد بدر، احمد بلاک	گارڈن ٹاؤن
روزانہ	بعد نماز فجر	〃 〃 〃	جامع مسجد، پی ڈبلیو ڈی کالونی	وحدت روڈ
منگل	بعد مغرب	سید امین الرحیم صاحب	نمبر ۱۸۱ پی،	گلبرگ نمبر ۳
بدھ	〃	〃 〃 〃	نمبر ۱۲ ڈی،	گلبرگ نمبر ۲
جمعہ	بعد نماز عصر	چوہدری محمد حنیف ورک	مسلم مسجد، کراچی محلہ سرفراز رفیقی روڈ	صدر
جمعرات	بعد مغرب	〃 〃 〃	نمبر ۶۹، علامہ اقبال روڈ	گڑھی شاہو
روزانہ	بعد نماز فجر	جناب الطاف حسین صاحب	مسجد دارالسلام،	باغ جناح
اتوار اور پیر	بعد نماز عصر	〃 〃 〃	جامع مسجد ٹیگور پارک	میکلوڈ روڈ
پیر	بعد نماز عشاء	〃 〃 〃	جامع مسجد محکمہ اوقاف نزد ہائی اسکول	مزنگ اڈہ

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

الحمدللہ ثم الحمدللہ ! کہ ان سطور کا ناچیز راقم نہ دیوبندی ہے نہ بریلوی، بلکہ عام متداول معنوں میں نہ حنفی ہے نہ اہلِ حدیث بلکہ بفحوائے الفاظ قرآنی : ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ ھٰذَا (الحج) اور وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ (حٰم السجدۃ) صرف اور صرف مسلمان ہے اور اس کے نزدیک سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ : وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (البقرۃ) اور تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ (یوسف) کے مصداق اللہ تعالےٰ اسلام پر ہی خاتمہ بالخیر فرمادے اور آخرت میں خالصتہً اپنے فضل وکرم سے اپنے نیک بندوں کے ساتھ شامل فرمادے !۔۔ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ط

اس کے یہ معنیٰ بہر حال نہیں ہیں کہ راقم موجودہ مختلف مسلمان جماعتوں اور گروہوں (فرقوں کا لفظ طبیعت پر گراں گذرتا ہے !) کی دینی خدمات یا اُن کے اعاظم و اکابر کے دینی مرتبہ ومقام کا منکر ہے۔ ماضی میں جماعتِ اہل حدیث نے ابطالِ شرک اور ردِّ بدعات کے ضمن میں جس مجاہدانہ کردار کا مظاہرہ کیا ہے راقم اس کا معترف ہی نہیں تہِ دل سے قدر دان ہے۔ اگرچہ اس کے نزدیک اب اہلِ حدیث حضرات بھی 'جماعت' نہیں رہے بلکہ 'فرقہ' بن گئے ہیں۔ اسی طرح دارالعلوم دیوبند جس طرح صنم خانۂ ہند میں قال اللہ تعالیٰ و قال الرّسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کا عظیم مرکز اور جہادِ حرّیت و استخلاصِ وطن کا اہم مورچہ بنا اس کا بھی ایک نہایت گہرا نقش راقم کے لوحِ قلب پر کندہ ہے اور اُس کے مؤسّسین و اکابر کے خلوص و اخلاص اور تقویٰ و تدیّن اور ان کی عظمتِ کردار کے تصوّر ہی سے راقم کا سر بے اختیار جھک جاتا ہے : ؏

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را !"

یہی وجہ ہے کہ راقم کے قلم سے جولائی ۱۹۶۲ء کے 'میثاق' میں جو مفصل مضمون

وَقَدۡ اَخَذَ مِيۡثَاقَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

۲۰	جون ۱۹۸۰ء	عدد ۶

مشمولات

ر : ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع : رشید احمد چوہدری

مطبع : مکتبہ جدید پریس ، شارع فاطمہ جناح ، لاہور

مولانا محمود الحسنؒ کے بعد شیخ الحدیث مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہدِ حریت مولانا حسین احمد مدنیؒ، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مبلغ ملت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے تمام علمی و روحانی، مذہبی و سیاسی اور دعوتی و تبلیغی سلسلوں کا اصل منبع دیوبند ہی ہے۔ حتیٰ کہ اوپر ہی کی مثال کیمطابق حقیقت یہ ہے کہ برصغیر کی اکثر دینی درسگاہوں اور دینی و مذہبی تحریکوں کا تعلق بھی دیوبند کے ساتھ وہی ہے جو دنیا بھر کی مساجد کا خانہ کعبہ کے ساتھ اور برصغیر کے مذہبی عناصر میں سے صرف ان کو چھوڑ کر جن کی مذہبیت بس عرس و میلاد اور فاتحہ و درود تک محدود ہے بقیہ تمام فعال مذہبی عناصر تحریک دیوبند ہی کی مختلف شاخوں سے متعلق و منسلک ہیں۔

بات چل ہی نکلی ہے تو اس ذکر میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء کے 'میثاق' میں راقم کے قلم سے پورے دس صفحات پر پھیلی ہوئی تحریر شائع ہوئی (از ص۱۵ تا ص۲۴) جس کا پورا تانا بانا حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کی عظمت کے مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہے جن کی بنا پر راقم کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ کم از کم برِ صغیر ہند و پاک کی حد تک چودھویں صدی ہجری کے اصل مجدد آں محترم ہی تھے!

دارالعلوم دیوبند اور اُس کے اکابر کے ساتھ اسی قلبی تعلق کا نتیجہ تھا کہ جیسے ہی سننے میں آیا کہ صد سالہ اجلاس (جشن ؟) منعقد ہو رہا ہے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ اس میں شرکت کی جائے۔ لیکن پھر اس خیال نے خواہش کو دبا دیا کہ تم نہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل نہ اس کے انتظام و اہتمام کے ذمہ دار حضرات سے تمہاری کوئی راہ و رسم —— آخر شرکت ہو تو کس بنیاد پر ——!!

اسی اثناء میں (فروری ۱۹۸۰ء میں) اللہ تعالیٰ کی مشیت اور رفیقِ مکرم قاضی عبدالقادر صاحب کی مستعدی کی بناء پر ہندوستان کا سفر ہو گیا۔ اور ۱۲ر فروری کو رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہؒ کی حاضری اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے طویل اور بے تکلف ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس موقع پر بعض دوسرے نہایت قیمتی مشوروں کے ساتھ حضرت مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ: تم دارالعلوم کے اجلاس میں ضرور شرکت کرو! میں نے عرض کیا حضرت! میں وہاں کس

شائع ہوا تھا (جو بعد میں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام !" کے نام سے طبع ہوا اور گویا مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کا MANIFESTO بن گیا !) اس میں ہندوستان میں انگریزی استعمار اور مغربی تہذیب کے خلاف مدافعت کی اوّلین کوششیں اور اُن کا ماحصل !" کے عنوان سے یہ الفاظ موجود ہیں :

> پہلی قسم کی کوشش وہ تھی جسے بقول مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اصحاب کہف کی سنت کا اتباع کہا جا سکتا ہے اور جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ زندگی کی شاہراہ سے ہٹ کر کونوں کھدروں میں بیٹھ جاؤ اور اپنے دین و ایمان کو بچانے کی فکر کرو۔ اس قسم کی کوششیں اگرچہ بظاہر ذہنی فراریت کا مظہر نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت ان کی اساس خالص حقیقت پسندی اور اس اعتراف پر تھی کہ مغرب کی اس یلغار کے کھلے مقابلے کی سکت اس وقت عالم اسلام میں نہیں ہے لہذا ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ یہ کہ اس سیلاب کے راستے سے ہٹ جایا جائے ، اور ہر طرح کے طعن و استہزا کو انگیز کرتے ہوئے ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ کامیابی بھی تھوڑی بہت اگر کسی کو ہوئی تو صرف اسی طریق کار کے اختیار کرنے والوں کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں امّت کے ایک حصّے کا ایمان بھی سلامت رہ گیا۔ مادہ پرستی کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روحانیت کی شمعیں بھی کہیں کہیں جلتی رہ گئیں اور قال اللّٰہ و قال الرسولؐ کی صداؤں میں دین و شریعت کا ڈھانچہ بھی محفوظ رہ گیا ——— : اس قسم کی کوشش کا مظہر اتم برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تھا جو کہنے کو تو صرف ایک درس گاہ تھا لیکن واقعتہً اس کی حیثیت ایک عظیم تحریک سے کسی طرح کم نہ تھی ———!

پھر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں "اسلام کی تاریخ میں عقل اور نقل کی کش مکش کے دو دور !" کے ضمن میں "دورِ ثانی" سے بحث کرتے ہوئے سرسیّد مکتبِ فکر کی "عقلیتِ جدیدہ" کے بعد راقم نے لکھا :

> متذکرہ بالا جدید مذہبی عقلیت کے مقابلے میں اسلام کے نقل کے دفاع کا سب سے بڑا مرکز دیوبند بنا - جس نے قال اللّٰہ وقال الرسولؐ کے حصار میں محصور ہو کر مذہب کا تحفظ کیا اور اس قول میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ دیوبند ایک درسگاہ و دارالعلوم ہی نہیں ایک عظیم تحریک ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کی حفاظت کا موثر رول ادا کیا اور جس سے متعدد علمی و عملی سوتے پھوٹے - چنانچہ شیخ الہند

فیروز پور روڈ فون کیا لیکن مولانا عبید اللہ صاحب سے رابطہ نہ ہو سکا۔ پھر اُن کے چھوٹے بھائی مولانا فضل رحیم صاحب کو نیلہ گنبد فون کیا۔ اللہ کا کرنا کہ وہ مل گئے اور جب میں نے مدّعا بیان کیا تو وہ سراپا تواضع بن گئے اور انہوں نے میرے ارادۂ سفر پر حد درجہ مسرّت کا اظہار کیا ــــ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ابھی دو گھنٹے بعد بڑے بھائی صاحب (مولانا عبید اللہ صاحب) ویزا کی تمام درخواستیں لے کر اسلام آباد جا رہے ہیں آپ پاسپورٹ اور فوٹو وغیرہ ایئر پورٹ پر ہی لے آئیں۔ چنانچہ میں بھاگتا دوڑتا گھر سے روانہ ہوا۔ راستے میں "ایک منٹ میں تین فوٹو!" والوں سے فوٹو کھنچوایا اور ایئر پورٹ پہنچا ــــ وہاں عجیب پریشانی ہوئی، میری فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہو گیا اور وہاں نہ مولانا عبید اللہ نظر آئے نہ مولانا فضل رحیم ــــ اسی کش مکش میں تھا کہ اندر جاؤں یا مزید انتظار کروں کہ مولانا عبید اللہ داخل ہوتے نظر آئے، دوڑ کر ان کے پاس پہنچا ــــ اور جلدی سے اپنا پاسپورٹ، فوٹو اور فیس ویزا وغیرہ کے لئے ڈیڑھ صد روپے ان کے حوالے کئے اور ویزا کی درخواست پر اپنے دستخط کرنے کا 'مختار نامہ' زبانی انہیں دیا اور بھاگتا ہوا اپنے ہوائی جہاز کی جانب روانہ ہو گیا۔

ابھی ایک خیال یہ باقی تھا کہ چونکہ میں ایک ماہ قبل ہی ہندوستان ہو آیا تھا لہٰذا شاید کہ ہندوستان کے سفارت خانے والے اعتراض کر دیں ــــ لیکن مشیّتِ ایزدی نے سارے مراحل طے کرا دیئے ــــ اور ۱۹ مارچ کو ایک سپیشل ٹرین کے ذریعے لاہور سے دیوبند کے لئے روانگی ہو گئی ــــ اسی ٹرین میں علقۂ دیوبند کے بہت سے اکابر علماء اور اعاظم صلحاء موجود تھے ــــ اور آٹھ سو یا ایک ہزار کے لگ بھگ نفری میں سے باقی سبھی مجھ سے تو بہرحال اعلم بھی تھے اور افضل بھی۔ ایسے اصحابِ علم و فضل کی "ہم سفری" بجائے خود بہت دل خوش کن اور سرور آمیز تھی ــــ اس لئے کہ اپنا تو حال وہی ہے کہ:

أُحبّ الصّالحین ولستُ منهم ؎ لعل الله یرزقنی صلاحًا

دینی جماعتوں اور گروہوں میں سے اجتماعات اور اجتماعی معاملات میں سلیقہ نظم و ضبط اور حسنِ انتظام و انصرام کی اعلیٰ ترین مثالیں تو اس دور میں غالباً جماعتِ اسلامی ہی نے قائم کی ہیں۔ تبلیغی جماعت کے اجتماعات اگرچہ ویسے آراستہ و

حیثیت سے جاؤں، وہاں کی شمولیت کے دعوت نامے تو صرف فارغ التحصیل حضرات کو بھیجے گئے ہیں۔ اس پر مولانا نے فرمایا کہ اس کی فکر تم مت کرو، دعوت نامہ پہنچ جائے گا۔ میں نے مزید ہمت کر کے عرض کیا کہ حضرت ایک شرط ہے' اور وہ یہ کہ وہاں میرا قیام آپ کے ساتھ رہے، اس لئے کہ میرا کسی سے تعارف نہیں ہے۔ یہ میں کہنے کو تو کہہ بیٹھا لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ: "ایاز قدرِ خود بشناس!" یہ کچھ زیادہ ہی جسارت ہے، لیکن ع: "اِک بندۂ عاصی کی اور اتنی مدارتیں!" کے مصداق اُدھر سے اس کی بھی منظوری ہو گئی —— تو معاً خیال آیا کہ شاید اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص ہی حکمت پوشیدہ ہے —— اگلے روز لکھنؤ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بھی اس کی پوری شدّ و مدّ سے تائید کی اور چونکہ وہ نہ صرف دار العلوم کی مجلسِ شوریٰ کے رکن تھے بلکہ اجلاسِ صد سالہ کی منتظمہ میں بھی شریک تھے، لہٰذا انہوں نے دیوبند فوراً خط لکھ دیا کہ اس عاجز کے نام دعوت نامہ ارسال کر دیا جائے۔

پاکستان واپس آیا تو طویل غیر حاضری کے باعث کاموں کا انبار جمع ملا اور اُن میں کچھ ایسا مصروف ہوا کہ بظاہر فوراً ہی ایک اور غیر ملکی سفر ناممکن سا نظر آیا۔ اوّل اوّل تو اس خیال سے اطمینان سا ہو جاتا رہا کہ پتہ نہیں دعوت نامہ آتا بھی ہے یا نہیں؟ لیکن جب وہ بھی موصول ہو گیا تو ایک جانب ایفائے وعدہ کی فکر دامنگیر ہوئی اور دوسری جانب اپنی معمول کی مصروفیات اور ان پر مستزاد ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس اور انجمن کے سالانہ اجلاسِ عام کے معاملے گھیراؤ کئے نظر آئے۔ میں اسی کش مکش میں تھا کہ جامعہ اشرفیہ لاہور کے مہتمم مولانا عبید اللہ صاحب کی جانب سے ویزا کی درخواستوں کے ضمن میں جس آخری تاریخ کا اعلان کیا گیا تھا وہ گذر گئی۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ: "وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ!" کیسی اٹل حقیقت ہے، یہ ہم ہی ہیں جو: "وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝" کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ اعلان شدہ تاریخ گذر چکی تھی اور میں گیارہ بجے کی پرواز سے کراچی جانے والا تھا کہ نو بجے کے لگ بھگ دل میں شدید ندامت کا احساس ہوا کہ مولانا علی میاں مدظلہ، نے کیسی محبت بھری دعوت دی: پھر مولانا نعمانی مدظلہ' نے دعوت نامہ بھی بھجوا دیا —— اور تم ہو کہ پھر بھی نہیں جا رہے —!! —— میں نے فوراً جامعہ اشرفیہ

'اجلاسِ صد سالہ' کے لئے جو وسیع و عریض پنڈال بنایا گیا تھا وہ دیوبند سے سہارنپور کی جانب ڈھائی تین میل کے فاصلے پر ریلوے لائن سے بالکل متصل واقع تھا اور عارضی 'دارالعلوم ہالٹ' کا مقصد ظاہر ہے کہ یہی تھا کہ ریل کے ذریعے آنے والے لوگ یہیں اُتر جائیں اور ڈھائی تین میل کے سفر سے بچ جائیں۔ لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ 'کارکنانِ استقبالیہ' میں سے کوئی ایک صاحب ہی ہالٹ پر موجود ہوتے جو بلا سے "خوش آمدید" نہ کہتے اتنا تو فرما دیتے کہ یہیں اُتر جاؤ۔ ہماری سپیشل ٹرین کوئی آدھی رات کو بھی نہ آئی تھی بلکہ ایسے وقت ہالٹ پر پہنچی تھی کہ ہم نے گاڑی سے اُتر کر کچے پلیٹ فارم پر فجر کی نماز باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد کافی دیر اسی "حالتِ منتظرہ" میں گذر گئی کہ "کارکنانِ استقبالیہ" یا "رہنمایانِ قافلہ" کی جانب سے کوئی ہدایت ملے۔ لیکن وہاں غالباً کوئی مقامی کارکن موجود ہی نہیں تھا لہٰذا قافلے کے رہنما بھی متردّد رہے ——— اور اُدھر ریلوے والوں نے یہ دیکھ کر کوئی اترنے کا نام ہی نہیں لیتا، گاڑی چلا دی اور چند منٹوں میں دیوبند کے مستقل سٹیشن پر لے جا کر کھڑی کر دی۔

اور وہاں وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ ایک لدی پھندی سپیشل ٹرین کے تمام کے تمام مسافر جب ایکدم پلیٹ فارم پر اترے تو فی الواقع تل دھرنے کو جگہ نہ رہی اور بالائی پل نے تو واقعۃً "پُل صراط" کی صورت اختیار کر لی۔ جُوں تُوں کر کے باہر پہنچے تو وہاں بھی نہ کوئی 'دفترِ استقبالیہ' تھا نہ کوئی رہنمائی کرنے والا کارکن ——— کارکنوں اور رہنماؤں کی اس "کم کوشی" کے پس منظر میں غریب قلیوں کا یہ کردار بہت ہی تابناک نظر آیا کہ انہوں نے اس دینی و مذہبی اجتماع میں شرکت کے لئے آنے والوں سے مزدوری لینے سے انکار کر دیا۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی، لیکن سب کے چہروں پر آنے والوں کے لئے محبت اور عقیدت کے جذبات نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے ——— راقم نے جب دل ہی دل میں اس صورتِ حال کا موازنہ وطنِ عزیز پاکستان کے حالات سے کیا تو یہ محسوس کر کے شدید ندامت ہوئی کہ ہمارا تو غریب بھی بالعموم ان جذبات و احساسات سے عاری ہو چکا ہے'

اب دارالعلوم یا اجتماع گاہ تک جانے کے لئے سواری کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اسٹیشن پر لے دے کر چند سائیکل رکشائیں تھیں جو "یک انار و صد بیمار" ——— کا

پیراستہ، تو نہیں ہوتے اور بظاہر وہاں درویشانہ بے قاعدگی ہی کا دور دورہ نظر آتا ہے تاہم وہاں انسان تھوڑی دیر ٹھہرے تو بخوبی اندازہ کرلیتا ہے کہ اس ماحول میں ایک مضبوط نظم کا تانا بانا موجود ہے اگرچہ ہے وہ "بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا!" کی قسم کا کہ اُس کے کاغذی یا دفتری قسم کے لوازم کہیں نظر نہیں آتے۔ رہا تبلیغی جماعتوں کے سفر یا گشت کا معاملہ تو وہ تو حد درجہ منظم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے گروپ کا بھی حسبِ ارشادِ نبوی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ والسّلام ایک امیر مقرر ہوتا ہے اور تمام شرکاء اس کی اطاعت بدل وجان کرتے ہیں — چونکہ تبلیغی جماعت ہمارے نزدیک حلقۂ دیوبند ہی کی ایک شاخ ہے لہٰذا توقع تھی کہ اس سفر اور اجلاس کے دوران بھی نظم وضبط اور حُسنِ انتظام کا وہی نقشہ نظر آئے گا۔ لیکن افسوس کہ صورت بالکل ہی مختلف بلکہ متضاد سامنے آئی۔

اس بدنظمی کا اوّلین مظاہرہ تو لاہور ریلوے اسٹیشن ہی پر ہو گیا تھا جہاں پاسپورٹوں کا حصول ہی ع "لانا ہے جوئے شیر کا!" کا مصداق بن گیا۔ وہ تو خدا بھلا کرے حج آفس نیلا گنبد والے حاجی افضل صاحب کا کہ وہ راقم کے کرم فرما ہیں اور سررشتہ پاسپورٹ سے وہ بھی کسی حیثیت سے منسلک تھے، ورنہ مجھ ایسے کمزور و ناتواں انسان کے لئے تو یہ مرحلہ ہی ناقابلِ عبور ہو جاتا — پھر چونکہ صرف اس قافلے کے لئے ایک سپیشل ٹرین جاری تھی اس لئے خیال تھا کہ گاڑی میں نشستیں باقاعدہ الاٹ ہوں گی۔ لیکن جب ایسا نہ ہوا تو دل کو تسلی دی کہ غالباً جو ٹرین اٹاری سے ملے گی اس میں اس کا اہتمام ہوگا۔ لیکن اٹاری میں امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کے مراحل طے ہونے کے بعد جب گاڑی میں سوار ہونے کا وقت آیا تو پھر وہی افراتفری نظر آئی — بلکہ سارے مراحل طے ہو جانے کے بعد بھی گاڑی لگ بھگ دو گھنٹے اس لئے کھڑی رہی کہ ریلوے کے ٹکٹوں کے پیسے پورے نہیں ہو رہے تھے۔ اس تاخیر کا اضافی نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور سے روزانہ کے معمول کے مطابق آنے والی گاڑی بھی آ گئی اور اس کے بھی بہت سے مسافر اسی "سپیشل ٹرین" میں سوار ہو گئے گویا گھمسان شدید سے شدید تر ہو گیا۔ اللہ اللہ کرکے گاڑی چلی اور رات بھر سفر کرکے علی الصبح دیوبند ریلوے اسٹیشن سے دو ڈھائی میل ورے عارضی طور پر تیار کئے

اسرار احمد

نشر القرآن

یعنی درسِ قرآن مجید پر مشتمل نشری تقاریر

۱۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۝ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝
کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

یہ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۸۵ ہے اور اس کا ترجمہ یہ ہے :

"ہر جاندار کو موت کا مزا لازماً چکھنا ہے اور قیامت کے دن تمہیں پورا پورا اجر دے دیا جائے گا۔ پس جو آگ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا اس نے بھرپور کامیابی حاصل کر لی ۔۔۔ اور یہ دُنیوی زندگی تو سوائے دھوکے کے سامان کے اور کچھ ہے ہی نہیں !"

سورۂ آلِ عمران اور سورۂ بقرہ دونوں کو آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشترک نام "الزھراوین" سے موسوم فرمایا ہے یعنی دو انتہائی روشن اور تابناک سورتیں۔ ان دونوں کے مابین بہت سی دوسری مشابہتوں کے ساتھ یہ امر بھی مشترک ہے کہ دونوں تقریباً مساوی نصفین میں منقسم ہیں۔ دونوں کے نصفِ اوّل میں روئے سخن اصلاً اہلِ کتاب کی جانب ہے اور نصفِ ثانی میں خطاب مسلمانوں سے ہے بحیثیت اُمتِ مُسلمہ ! اس فرق کے ساتھ کہ سورۂ بقرہ میں اہل کتاب میں سے تمام گفتگو یہود کے ساتھ ہوئی ہے اور سورۂ آلِ عمران میں اکثر و بیشتر نصاریٰ کے ساتھ۔ سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں سے خطاب یوں تو آیت ۱۰۰ ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور سورت کے اختتام تک چلتا ہے لیکن اس میں درمیانی آیات یعنی از آیت ۱۲۱ تا آیت ۱۸۰ تو ایک نہایت ہی مربوط اور مسلسل خطبے کی صورت میں ہیں جس میں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات پر نہایت بھرپور تبصرہ بھی ہے اور اُس کے معاً بعد مترتب ہونے والے اثرات کے ضمن میں مفصل ہدایات بھی۔ اس کے بعد چار آیات ہیں ایک مختصر حوالہ ہے یہو

مصداق بن کر رہ گئیں۔ الغرض افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم بپا ہو گیا۔ ادھر مقامی کارکن کوئی بھی نہیں جو کچھ تو بتائے کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ کافی دیر بعد مولانا اسعد مدنی نظر آئے جو دو تین کاریں ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے چن چن کر اپنے جاننے والوں (جن کی اکثریت بزرگ اور معمر علماءِ کرام پر مشتمل تھی!) کو گاڑیوں میں بٹھانا شروع کیا۔ باقی لوگوں کی جانب التفات کا ظاہر ہے کہ اس وقت کوئی موقع نہ تھا بہر حال جیسے تیسے ایک سائیکل رکشا حاصل کی اور سامان اس پر رکھ کر خود پیدل مارچ شروع کیا۔ دارالعلوم کا سیدھا راستہ جو قصبے کے اندر سے ہو کر گذرتا تھا حکومت نے بند کر دیا تھا۔ لہٰذا پورے قصبے کا چکر کاٹ کر اور ایک طویل مسافت طے کر کے دارالعلوم پہنچے تو وہاں بھی افراتفری و بدنظمی ـــــ معلوم ہوا کہ استقبالیہ کیمپ' دارالعلوم کی دوسری جانب ہے۔ وہاں پہنچے تو حکم ملا "نو بجے آئیے" اللہ اکبر! نظم وضبط اور قاعدہ و قانون کا یہ عالم اور ان ہنگامی حالات میں بھی دفتری اوقات کی اس شدت کے ساتھ پابندی! چاروناچار نو بجے تک باہر دھوپ ہی میں پڑے رہنے کے بعد جب دوبارہ "وقتِ موعود" پر حاضری دینے پہنچے تو نظر آیا کہ "مدعوئین" اور "مندوبین" کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ جنھوں نے اپنے طول اور جگہ کی قلت کے باعث کئی کئی بل کھائے ہوئے ہیں۔ ایک قطار میں کافی دیر کھڑے رہنے کے معلوم ہوا کہ یہ پاکستان کی نہیں بنگلہ دیش کی ہے ـــــ وہاں سے نکل کر دوسری میں آئے، لیکن بہت دیر کھڑے رہنے کے باوجود جب نظر یہ آیا کہ کام تو دائیں بائیں اور عقب سے آنے والوں کا ہو رہا ہے ـــــ اور قطار "زمیں جُنبد نہ جُنبد گل محمّد!" بنی جمی کھڑی ہے تو "مدعوئین" ـــــ اور "مندوبین" کی فہرست میں شامل ہونے کی کوشش ترک کر دینے ہی میں عافیت نظر آئی ـــــ اس کے بعد حاجی افضل صاحب ہی کی مہربانی سے کس طرح دارالعلوم کے طلبہ کے قیام کے کمروں میں سے ایک کمرے پر "بے ضابطہ" قبضہ کیا اور شام تک نظم وضبط اور حسنِ انتظام کے جو جو مظاہرے سامنے آئے ان کی داستان بڑی طویل ہے ـــــ کہ "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا!"

سہ پہر کو دارالعلوم کے مختلف شعبوں خصوصاً لائبریری کی سیر کی۔ بعد ازاں قصبے میں گھومے پھرے اور نمایاں تضادات کا مشاہدہ کیا۔ ایک جانب چھتے والی مسجد

زیرِ درس آیت جس کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ اُن میں رُوئے سخن دونوں جانب قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک طرف مومنینِ صادقین کے لئے ان الفاظِ مبارکہ میں بشارت ہے تو دوسری جانب یہود اور منافقین کے حق میں انہی میں تہدید و انذار بھی موجود ہے، اور سلسلۂ کلام سے علیحدہ کر کے اگر نگاہ کو صرف اس آیۂ مبارکہ ہی پر مرتکز کر دیا جائے تو یہ خود اپنی جگہ ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید، معاد اور رسالت میں سے انسان کے افعال و اعمال اور اخلاق و کردار پر مؤثر ہونے کے اعتبار سے اہم ترین ایمان، یعنی ایمان بالآخرہ کے بیان میں معجز نما فصاحت و بلاغت کی حامل ہے ؂

اس آیۂ مبارکہ کا آغاز ہوتا ہے ایک ایسی اٹل حقیقت یعنی UNIVERSAL-TRUTH کے ذکر سے جس کی تردید کا کوئی امکان ہی نہیں یعنی موت جو زندگی کی عظیم ترین حقیقت ہے، اور جس سے کسی ذی حیات کو رُستگاری نہیں سوائے اُس ذاتِ "حیّ و قیوم" کے جو خود موت اور زندگی دونوں کا خالق ہے، بعنوانِ الفاظِ قرآنی: "خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًاؕ !"۔ اس سے ایک تو رہنمائی ملتی ہے اُس حکمت کی جانب کہ گفتگو کا آغاز کسی ایسی بات سے کرنا چاہیئے جو متفق علیہ ہو اور جس سے انکار کی تاب و مجال مخاطب کو نہ ہو ــــ خواہ وہ ایک بالکل پیش پا اُفتادہ حقیقت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ واقعہ یہی ہے کہ جو چیزیں انسان کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ رہتی ہیں۔ اکثر و بیشتر ان ہی سے غفلت ہو جاتی ہے۔ دوسرا معاملہ الفاظ اور اُسلوبِ بیان کا ہے، اور ظاہر ہے کہ "کلامُ الملوک مُلوکُ الکلام !" کے مصداق شہنشاہِ ارض و سماوات سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے۔ ذرا غور کیجیئے کہ کُل چار الفاظ ہیں: "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ !" اور ان میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ بھی نہایت حسین و جمیل تراشیدہ ہیرے کے مانند ہے اور پھر بندش اور ترکیب کا کمال مستزاد ہے جس نے حُسنِ کلام کو دوبالا کر دیا ہے ــــ اور پھر سونے پر سہاگہ ہیں صوتی اثرات ب۔ ذرا غور سے کام لیا جائے تو معاملہ تو صرف انسانوں کا زیرِ بحث ہے لیکن الفاظ: "كُلُّ نَفْسٍ !" کے لائے گئے ہیں۔ ذرا تقابل کیجیئے کہ اگر یہاں الفاظ: "كُلُّ اِنْسَانٍ !" ہوتے تو بات اپنی جگہ پوری ہوتے ہوئے بھی کتنی پھیکی اور بے جان سی ہو جاتی ــــ "كُلُّ نَفْسٍ !" نے ایک اٹل اور ازلی و ابدی حقیقت کو ہمہ گیر وسعت بھی عطا کر دی ہے۔ پھر "ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ !" پر غور کیجیے، اس میں "بغیرِ حساب" کے الفاظ ملیں گے اور کہیں: "مَا يَشَآءُ !" کے ـــ جبکہ یہاں اُجرت کی مناسبت سے لفظ آیا ہے: "تُوَفَّوْنَ" کا ـــ اس لئے کہ: وَفّٰی يُوَفِّي کے معنی ہیں کسی کو

ایک تو 'چکھنا' ہی فصاحت و بلاغت کی معراج ہے۔ اس لئے کہ 'مرنے' اور 'موت کا مزا چکھنے' میں نتیجے کے اعتبار سے خواہ کوئی فرق نہ ہو، سامع یا قاری پر اثرات کے مترتب ہونے کے لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پھر یہ 'چکھنا' یہاں مذاق بذوق سے فعل کی صورت میں نہیں آیا بلکہ اسم فاعل کی صورت میں آیا جس میں تاکید اور زورِ کلام اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمے میں لازماً کا اضافہ کیا گیا ——— یعنی: "ہر جاندار کو موت کا مزہ لازماً چکھنا ہے!" ۔ واضح رہے کہ جملہ اسمیہ میں جو تاکید اور توثیق ہوتی ہے وہ جملہ فعلیہ میں نہیں ہوتی ——— !!

آگے فرمایا کہ تم سب کو اپنے کئے کا پورا پورا بدلہ قیامت کے روز مل جائے گا۔ قربان جائیے اس بلاغت کے کہ اس میں ایک جانب کفار و منکرین خواہ وہ مشرکین میں سے ہوں خواہ اہلِ کتاب میں سے۔ پھر خواہ یہود میں سے ہوں خواہ مارِ آستین منافقین میں سے، ان سب کے لئے شدید تہدید و وعید ہے ——— اور دوسری جانب مومنینِ صادقین کے لئے تسلّی بھی ہے اور دلجوئی بھی، گویا بشارت کا پورا سامان موجود ہے، اِس لئے کہ ان کے حق میں "یوم القیامہ" رحمتِ خداوندی کے ظہور کا دن ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی :

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ	(یعنی) اُس نے اپنے اوپر رحمت کو واجب کر لیا ہے۔ وہ لازماً جمع کرے گا تمہیں قیامت کے دن، اس میں ہرگز کوئی شک نہیں!

اہلِ ایمان تو درحقیقت اُسی دن کے اُمیدوار ہیں، اور ان کے سارے حوصلے اور ولولے اور تمام آرزوئیں اور اُمنگیں اُسی دن سے وابستہ ہیں، اس لئے کہ وہ ان کی اپنے ربّ سے ملاقات کا دن بھی ہے اور اپنے خالق و مالک اور محبوبِ حقیقی کے دیدار کا بھی۔ ان کے لئے اس دن کے ذکر میں دھمکی کا اثر نہیں بلکہ تسلّی و دلجوئی یعنی REASSURANCE کی کیفیت ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں اجر کی جمع اُجُور اور صیغۂ مضارع مجہول یعنی تُوَفَّوْنَ کے الفاظ بہت قابلِ توجہ ہیں اس لئے کہ 'اجر' کہتے ہیں کسی عمل کے بدلے کو جیسے مزدوری کی اُجرت یا کسی نیکی یا بدی کا ثواب یا عذاب، اور یہ لازماً حساب کتاب کی چیزیں ہیں جن میں عمل کی مقدار کی مناسبت ہی سے اُجرت ملتی ہے' بخلاف 'فضل' کے کہ اُس میں کسی حساب کتاب یا ناپ تول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ضمن میں تو کہیں کے علماء و عوام اور ان کے زیرِ اثر منافقین کی شرارتوں کا ——— اور اس کے بعد آتی ہے

اور آخرت میں بھی ـــ اور اللہ بے راہ کر دیتا ہے ظلم کرنے والوں کو، اور اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے ـــ !! ـــــــ صدق اللہ العظیم ۞

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ آسمانی کتابوں میں تمثیلات بکثرت بیان ہوئی ہیں، اس لئے کہ اُن کے مخاطب تمام انسان ہوتے ہیں جن میں اکثریت ان عوام الناس کی ہوتی ہے جو اعلیٰ علمی حقائق کو علمی اندازِ بیان اور فنی اصطلاحات کے حوالے سے تو نہیں سمجھ سکتے، ہاں اگر انہیں عام فہم تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے بات سمجھائی جائے تو سمجھ لیتے ہیں۔ اسی لئے ان تشبیہوں اور تمثیلوں کا ان کے تمام مشاہدات سے ماخوذ ہونا ضروری ہے۔ تورات میں تمثیلیں بہت کم ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام تر احکام و شرائع ہی کا مجموعہ ہے یعنی صرف کتاب و شریعت پر مشتمل ہے۔ اس کے برعکس انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے وارد ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ وہ کل کی کل حکمت اور معرفت پر مشتمل ہے اور ظاہر ہے کہ تمثیل کی ضرورت ایسے ہی اعلیٰ اور لطیف علمی حقائق کی وضاحت کے لئے پیش آتی ہے۔ قرآن چونکہ مجموعہ ہے دلائل و براہین، احکام و شرائع اور حکمت و معرفت سب کا، لہٰذا اس میں تمثیلات کی کثرت اتنی تو نہیں ہے جتنی انجیل میں ہے، لیکن جتنی تمثیلیں بھی اس میں وارد ہوئی ہیں وہ سب ہیں فصاحت و بلاغت کی معراج کی مصداق ـــ ان ہی میں سے دو تمثیلیں یہ ہیں جو اِن آیاتِ مبارکہ میں بیان ہوئیں ایک مثال ہے کلمۂ طیّبہ یعنی کلمۂ توحید کی ـــ اور دوسری مثال ہے کلمۂ خبیثہ یعنی کلماتِ شرکیہ کی ـــ !!

کلمۂ طیّبہ یا کلمۂ توحید کی مثال ایک ایسے مثمر درخت کی ہے جس کی جڑیں بھی مضبوط ہوں، اور زمین کی گہرائی میں اُتری ہوئی ہوں اور شاخیں بھی نہ صرف یہ کہ خوب پھیلی ہوئی ہوں بلکہ بلند بھی اتنی ہوں گویا کہ آسمان کو چھو رہی ہوں۔ واضح رہے کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق درخت کی غذا سے ہے۔ درخت ایک جانب تو زمین سے غذا حاصل کرتا ہے جس کے لئے جڑوں کا مضبوطی کے ساتھ جما ہوا اور زمین میں گہرا اترے ہونا ضروری ہے۔ دوسری جانب وہ فضا سے بھی غذا حاصل کرتا ہے جس کے لئے اُس کی شاخوں کا چاروں طرف خوب پھیلے ہونا بھی لازمی ہے اور زیادہ سے زیادہ بلند ہونا بھی تاکہ وہ تنازع للبقاء کے اُصول کے تحت آس پاس کے درختوں سے بلند تر ہو کر بلا روک ٹوک فضا سے غذا حاصل کر سکے۔ ان ہی دونوں چیزوں پر دارومدار

کوئی چیز پوری پوری دے دینا اور اس میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہ کرنا جس کی تاکید مزید کے لئے الفاظ آئے سورۂ ہود کی آیت ۱۰۹ میں: " وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ! " یعنی " ہم اُن کو اُن کے اعمال کا بدلہ دیں گے پُورا پُورا بغیر کسی کمی کے!" یہاں یہ عرض کرنے کی حاجت نہیں ہے کہ یہ الفاظ جب جرم و گناہ کی سزا کے ضمن میں آئیں تو کس درجہ لرزا دینے والے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ سَخَطِكَ ــــ وَعَذَابِكَ ــــ	اے رب! ہم تیری ناراضی اور سزا سے تیرے ہی عفو و درگذر اور جود و کرم کی پناہ میں آتے ہیں!

آخر میں فرمایا: جو آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا اُس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ (اے اللہ! ہمیں بھی ان ہی میں شامل فرما دے!)

آیت کا آخری ٹکڑا اہم ترین ہے اور یہ دراصل خلاصہ ہے ایمان بالآخرت کا، کہ اگر انسان کی آنکھیں اسی حیاتِ دُنیوی کی زینتوں اور رونقوں اور زیبائشوں اور آرائشوں میں اُلجھ کر رہ جائیں اور آخرت سے نسیان و ذہول لاحق ہو جائے تو پھر یہ ایک دھوکے کی ٹٹی اور بصیرتِ انسانی کے لئے پردہ اور حجاب بن جاتی ہے، اور اُس کا سارا ساز و سامان متاعِ غرور یعنی دھوکے کا سودا بن کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اگر انسان آخرت کو پیشِ نظر رکھے اور اسی کو اپنا مطلوب و مقصود بنائے، تو پھر یہی حیاتِ دُنیوی آنحضور صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے فرمانِ مبارک " اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ! " ــــ یعنی دُنیا آخرت کی کھیتی ہے کے مصداق ایک حقیقتِ کبریٰ کا رُوپ دھار لیتی ہے، اور انسان یہاں یہ سمجھ کر محنت کرتا ہے کہ یہاں بوؤں گا تو وہاں کاٹ سکوں گا، اور اس طرح رہبانیت اور ترکِ دُنیا کی جڑ کٹ جاتی ہے: ــــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

۲۔ سورۂ ابراہیم کی آیات ۲۴ تا ۲۷ کا ترجمہ یہ ہے:

" کیا تم نے غور نہیں کیا کیسے مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیّبہ کی ایک ایسے شجرۂ طیّبہ کے مانند جس کی جڑ مضبوطی سے جمی ہوئی ہو، اور اُس کی شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں اور وہ اپنا پھل اپنے ربّ کے حکم سے ہمیشہ بھرپور دیتا ہو ــــ اور اللہ لوگوں کے لئے ایسی تمثیلیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کر سکیں۔ اور کلمۂ خبیثہ کی مثال ایک شجرۂ خبیثہ کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی سے اُکھاڑ لیا جائے اور اسے کوئی ثبات حاصل نہ ہو۔ اللہ اہلِ ایمان کو قولِ ثابت کے ذریعے دُنیا میں بھی ثبات عطا فرماتا ہے

انبیاء و صدیقین، شہداء و صلحاء اور اتقیاء و ابرار کی سیرتوں اور شخصیتوں میں، جو اصل میں ثمرِ طیّب ہیں توحید کے کلمۂ طیّبہ ہی کے شجرۂ طیّبہ کا۔

اس کے برعکس معاملہ ہے مشرکانہ اوہام و عقائد کا، کہ اُن کے لئے نہ فطرتِ انسانی میں کوئی جڑ بنیاد موجود ہے، نہ ہی اس وسیع و عریض کائنات کے کسی گوشے سے انہیں کوئی تائید حاصل ہوتی ہے۔ گویا اُن کی مثال اُس جھاڑ جھنکاڑ کی سی ہے جو زمین پر ایسے ہی پھیل گیا ہو کہ نہ اُس کی جڑیں گہرائی میں اُتری ہوئی ہوں نہ شاخیں فضا میں بلند ہوں۔ چنانچہ اُس میں نہ پھول لگتے ہیں نہ پھل، نہ اُس کا کوئی سایہ ہی، ہو جس کے تلے کوئی تھکا ماندہ مسافر کسی وقت استراحت کر لے، نہ کسی کو کوئی غذا کا سامان ہی اُس سے حاصل ہوتا ہو — پھر یہ کہ اسے کوئی ثبات و قرار بھی حاصل نہیں، جہاں کسی نے ذرا سا ہاتھ لگایا اُس کی جڑیں زمین سے فوراً اُکھڑا ہو گئیں۔ جیسے کہیں اوپر ہی رکھی ہوئی تھیں — جب اُس کے برعکس ہے معاملہ کلمۂ توحید کے شجرۂ طیّبہ کا کہ اُسے زمین سے اُکھاڑنا آسان نہیں ہوتا۔ گویا جو لوگ فی الواقع توحید پر کاربند ہوں اور عقیدۂ توحید ان کے رگ و پے میں واقعۃً سرایت کر گیا ہو ان کو دنیا میں نہ کسی طرح ہراساں کیا جا سکتا ہے نہ خوف زدہ، اور نہ رنجیدہ نہ غمگین، اس لئے کہ توحید کا تو اصل ہی خوف اور غم دونوں سے نجات ہے بمصداقِ الفاظ قرآنی: "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے حقیقی دوستوں کے لئے نہ کوئی خوف ہے — اور نہ ہی وہ غم و اندوہ سے دوچار ہونے والے ہیں!" — اسی حقیقت کو یہاں ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ: يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ (یعنی اللہ توحید کے قولِ ثابت کے ذریعے اہلِ ایمان کو دُنیا میں بھی ثبات و استقلال عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی!) .. واضح رہے کہ یہی لفظ "تثبیت" وارد ہوا ہے سورۂ انفال میں جہاں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی مدد کے لئے فرشتوں کو بھیجا اس حکم کے ساتھ کہ: "فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا" یعنی "قدم جما دو اہلِ ایمان کے!" — گویا توحید کے کلمۂ طیّبہ کی بنا پر جیسے اہلِ ایمان کے قدم اس دُنیا میں معرکۂ حق و باطل میں جمے رہتے ہیں، ایسے ہی میدانِ حشر میں بھی پورے سکون و ثبات کے ساتھ جمے رہیں گے — اور پھر جنّت میں وہ پھلیں پھولیں گے اپنے ربّ کی رحمتوں اور شفقتوں کے سائے میں — اور اس کے برعکس ہے معاملہ مشرکین کا جن کے ضمن میں فرمایا: وَيُضِلُّ

ہے اُس کے پھل دینے کا۔ غذا اگر وافر بھی مل رہی ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ
عمدہ بھی مل رہی ہو تو ظاہر ہے کہ پھل بھی اچھے سے اچھا اور ہر موسم پر پورا اور بھر
بالکل یہی مثال کلمۂ توحید کی بھی ہے۔ اس کے تغذیہ و تقویت کا معاملہ بھ
اطراف سے متعلق ہے۔ ایک فطرتِ انسانی سے جو صالح زمین سے مشابہ ہے او
کی گہرائیوں میں توحید کے صاف ستھرے سوتے بہہ رہے ہوں۔ جہاں سے توحید فی
توحید فی العمل اور توحید فی الطلب سب کو غذا ملتی ہے۔ دوسرے آفاقی آیات و
سے، جن پر غور و فکر سے عقلِ انسانی توحید تخلیق اور توحید تدبیر کا سراغ پاتی ہے۔
دونوں کو قرآن مجید نے نہایت جامعیت و اختصار کے ساتھ تو ایک آیت میں اِ
جمع کیا کہ :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

(یعنی) "ہم عنقریب دکھائیں گے انہیں آیات آفاق میں بھی اور خود اُن کے میں بھی یہاں تک کہ یہ بات بالکل کھل

— اور علیحدہ علیحدہ ان اسالیب میں بیان کیا کہ کہیں تو اپنے من میں ڈوب کر
زندگی پانے کی تلقین فرمائی بحوالۂ الفاظ قرآنی : وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ
اور چونکہ اس کی صلاحیت و استعداد کم ہی لوگوں میں ہوتی ہے لہٰذا یہ مضمون ا
میں نسبتاً کم ملے گا آیاتِ آفاقی پر دعوتِ تعقل و تفکر کے مقابلے میں جس کا نہا
کثرت سے اعادہ ہوا ہے بالخصوص مکی سورتوں میں — اور جس کا نہایت جا
ہے سورۂ البقرہ کی آیت ۱۶۴ میں، جسے "آیتُ الآیات" قرار دیا جائے تو غلط
جس کا ترجمہ ہے : "یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، اور رات اور دن کے الٹ
میں، اور اُس کشتی میں جو لوگوں کی ضرورت کی چیزیں لے کر دریا میں چلتی ہے، اور اُس
میں جسے اللہ نے آسمان سے برسایا اور اس کے ذریعے زمین کو اُس کے مُردہ ہو جانے
بعد زندہ کیا، اور پھیلا دیئے اُس میں ہر نوع کے جاندار، اور ہواؤں کے چلانے میں او
بادل میں کہ جو آسمان اور زمین کے مابین مامور ہے نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے
سے کام لیں!" —— الغرض توحید کا شجرۂ طیبہ بھرپور غذا حاصل کرتا ہے
انسانی کی زمین سے بھی اور آیاتِ آفاقی میں غور و فکر سے بھی — اور پھر بھر
لاتا ہے اخلاقِ حسنہ، اعمالِ صالحہ، اور اعلیٰ سیرت و کردار کا — جن کے نمونے

درسِ حدیث

الحُبُّ لِلّٰہِ وَالبُغضُ لِلّٰہِ

از مولانا محمد حسین ، استادِ عربی ، قرآن اکیڈمی

عن ابی امامۃؓ، قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من احبّ اللہ و ابغض للہ و اعطی للہ ومنع للہ فقد استکمل الایمان ط (رواہ ابوداؤد والترمذی)

"حضرت ابو اُمامہؓ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اللہ کے لئے محبت کی اور اللہ ہی کیلئے دشمنی کی، اللہ کے لئے بخشش کی اور اللہ ہی کے لئے ہاتھ روکا، اُس نے ایمان کو کامل بنا لیا!"

ہمارا دین اسلام ہے۔ اسلام کا معنیٰ ہے سپردگی یا اپنے آپ کو کسی کے حوالے کر دینا۔ بندہ ہونے کی حیثیت سے ہم سے اللہ تعالیٰ کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم مکمل طور پر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔ اور ہمارے مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو کُلیتہً اللہ کے حوالے کر دیا۔ یہ کیفیت کسی بندے میں جتنی زیادہ شدید اور اعلیٰ درجے کی ہوگی، اُتنی ہی اس کی عبدیّت کامل ہوگی اور اُتنا ہی وہ خدا کا زیادہ محبوب و مقرّب ہوگا۔

امرِ واقعی تو یہی ہے کہ اس خاکی زمین سے لے کر اس نیلگوں آسمان کی پہنائیوں تک جو کچھ بھی ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ بلکہ اگر ہم اپنی ذات پر بھی ذرا گہری نظر ڈالیں تو یہاں بھی ہر چیز اسی کی اور صرف اسی کی ہے۔ مگر انسان کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت نے ان اشیاء کی محبت سے کچھ اس طرح جذباتی طور پر وابستہ کر رکھا ہے کہ وہ ان غیر مرئی روابط میں بڑی سختی کے ساتھ بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ انسان کو اپنی طرف کھینچنے والی یہ مقناطیسی قوّتیں اور اسے مختلف بندھنوں میں جکڑنے والے یہ رشتے اور یہ علائق بے شمار قسم کے ہیں۔ ان میں سے کچھ فطری اور ناگزیر بھی ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں انسان نے اپنے مفاد کے لئے مصنوعی طور پر اپنے اردگرد لپیٹ

اللّٰہُ الظّٰلِمِیۡنَ ۝ - واضح رہے کہ ظلم سے قرآن مجید میں اکثر و بیشتر "شرک" مراد ہوتا ہے از روئے الفاظِ قرآنی : اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ۝ (یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے!) - اب ظاہر ہے کہ مشرک کو بھی جس طرح حیاتِ مادّی کے لئے پانی اور ہوا کی ضرورت ہے اسی طرح ضمیر کے اطمینان کے لئے جھوٹ موٹ کی کسی نہ کسی نیکی کا سہارا ضروری ہے - چنانچہ کچھ نہ کچھ اُلٹی سیدھی اور جھوٹی سچی نیکیاں وہ بھی اپنے نامۂ اعمال میں جمع کراتے ہیں - لیکن ان کے یہ اعمال نتیجہ خیز اور بار آور نہیں ہوتے، اس لئے کہ اُن کی پشت پر توحید یا اخلاص موجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایسی تمام نیکیاں رائیگاں جاتی ہیں - جیسے کہ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۸ میں تمثیل بیان ہو چکی ہے کہ : مَثَلُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِرَبِّهِمۡ اَعۡمَالُهُمۡ کَرَمَادِ ِۨاشۡتَدَّتۡ بِهِ الرِّیۡحُ فِیۡ یَوۡمٍ عَاصِفٍ ؕ لَا یَقۡدِرُوۡنَ مِمَّا کَسَبُوۡا عَلٰی شَیۡءٍ ؕ ذٰلِکَ هُوَ الضَّلٰلُ الۡبَعِیۡدُ ۝ یعنی : "اُن لوگوں کے اعمال کی مثال جنھوں نے اپنے رب کا کفر کیا ایسے ہے جیسے راکھ جس پر کسی آندھی والے دن تیز ہوا چلے - چنانچہ جو کمائی (بزعمِ خویش) انہوں نے کی ہوگی، اس میں سے اُن کے پلّے کچھ بھی نہ پڑ سکے گا - (ظاہر ہے کہ) یہی گمراہی کی انتہا ہے!" — اس اہم مضمون کے لئے ایسی ہی فصیح و بلیغ تمثیل وہ بھی ہے جو سورۂ نور میں وارد ہوئی :

وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُهُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَةٍ یَّحۡسَبُهُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَهٗ لَمۡ یَجِدۡهُ شَیۡـًٔا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنۡدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ۝

"اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی اُن کے اعمال (یعنی نیکیاں) اس سراب کے مانند ہیں جو کسی چٹیل میدان میں ہو، اور جسے پیاسا پانی سمجھ رہا ہو - لیکن جب وہ وہاں پہنچے تو اُسے کچھ بھی نہ پائے، بلکہ وہ پائے وہاں اللہ کو جو اس کا حساب چکا دے - اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی — !"

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دردناک انجام سے بچائے - اور توحید کی دولت سے سرفراز فرمائے اور خلوص و اخلاص کی نعمت مرحمت فرمائے - آمین — یاربّ العالمین!

اَقُوۡلُ قَوۡلِیۡ هٰذَا وَ اَسۡتَغۡفِرُ اللّٰهَ لِیۡ وَ لَکُمۡ وَ لِسَآئِرِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمَاتِ

وَ اٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

بنانے کی خاطر، ایک بے آب وگیاہ زمین میں انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں لا بٹھایا۔ جہاں زندگی کی کوئی سہولت میسّر نہ تھی۔ چار چار کنال کے رقبہ میں پھیلی ہوئی کوٹھیوں میں تمام مادی آسائشوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے والوں کو تو شاید اس کے تصوّر ہی سے جھرجھری آجائے مگر قرآن گواہ ہے کہ خدا کے ایک بندے نے جس نے کہا تھا کہ : اسلمت لرب العالمین ۰ یہ کر دکھایا اور آخر میں چشم فلک نے یہ منظر بھی دیکھا کہ خدا کے اس ضعیف العمر بندے نے اپنے ہونہار، فرمانبردار، نوجوان بچّے جو نا معلوم کتنی دعاؤں کے بعد ملا تھا، کے گلے پہ محض اللہ کی خاطر بے دریغ چھری چلادی۔ راہِ محبت میں یہ قربانی دیتے وقت نہ اس کا اپنا بڑھاپا آڑے آیا، نہ اپنے لختِ جگر کا معصوم چہرہ اس کو مانع ہوا اور نہ ایک بوڑھی ماں کی اُجڑتی گود کے تصوّر نے اس کا ہاتھ پکڑا۔ یقین ہے کہ جب یہ واقعہ پیش آیا ہوگا، گردشِ فلک بھی رُک گئی ہوگی۔ ان فرشتوں نے بھی مُنہ میں انگلیاں ڈال لی ہوں گی جنھوں نے کل خدا کے حضور میں اسے "سفّاک و مفسد" قرار دیا تھا۔ مگر دُنیا کی قیادت و امامت یونہی نہیں مل جایا کرتی۔ اب خود خدا کی طرف سے اعلان ہوا کہ ابراہیم! تونے جو کہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو ربّ العالمین کے حوالے کر دیا، تو تونے وہ پورا کر دکھایا۔ اب تم دُنیا کے امام ہو اور دُنیا تمھاری مقتدی۔ تمھارے اس عمل کو ہم نے یوں شرفِ قبولیت بخشا کہ قیامت تک کے لئے اسے انسانوں کی سُنّت بنا دیا ؎

خود سرورِ کائناتؐ کی مثال کو سامنے لائیے کہ کس طرح خدا کی خاطر ہر دوسری محبت اور ہر نفرت کو دل سے نکال دیا۔ اپنا وطن کسے پیارا نہیں ہوتا، مگر جب دیکھا کہ وطن کی سرزمین خدا کی عبادت کے لئے تنگ ہو رہی ہے تو اس کو ان الفاظ کے ساتھ الوداع کہہ دیا کہ اے مکّہ! تو مجھے سب شہروں سے زیادہ عزیز ہے مگر تیرے باسی مجھے یہاں رہ کر اپنے محبوبِ حقیقی کی عبادت کی اجازت نہیں دیتے۔ حبشیؓ پیارے چچا۔ حمزہؓ ___ کے قاتل ہیں۔ مگر جب وہ ایمان لاکر اللہ کے دین میں آجاتے ہیں تو حضورؐ اُن کو سینے سے لگا لیتے ہیں ؎

۹۰

مَیں سوچا کرتا تھا کہ ہم تعداد میں نوّے کروڑ ہونے اور ہر طرح کے مالی وسائل رکھنے کے باوجود آخر کیوں ذلیل و خوار ہیں اور صحابہؓ مٹھی بھر اور بے سروسامان ہو کر بھی کس طرح

لیا ہے۔ انسان کے لئے ان میں ایک کیف و سرور ہے، آسائش و آسودگی ہے لیکن
اگر ہم واقعتہً خدا تعالیٰ کے وجود، اس کی رحمت کی وسعتوں، اُس کی ربوبیت اور
کی آقائی و مولائی پر پورے شعور اور صدقِ دلی سے ایمان رکھتے ہیں اور اپنے آپ
کو واقعی اس کا بندہ سمجھتے ہیں تو اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم کلیتہً ہر چیز سے اس
کے حق میں دستبردار ہو جائیں، یہاں تک کہ ہمارے حریمِ دل میں صرف اس ایک ہ
کی محبت جاگزیں ہو۔ ہماری باقی تمام محبتیں اس کی محبت کے تابع ہوں۔ ہم کسی
سے محبت کریں تو صرف اس لئے کہ وہ اللہ والا ہے یا اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس
سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور اگر کسی سے دشمنی کریں تو صرف اس لئے کہ وہ اللہ
دشمن ہے یا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے دشمنی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ اسی طرح
ہماری بخشش و عطا بھی اس کی خاطر ہو اور ہمارا بخل و امساک بھی اس کے لئے
اس کا حکم ہو تو ہم اپنی پونجی کی آخری کوڑی تک اس پر نثار کر دیں اور اگر اسے پسند
نہ ہو تو پھر ہمارے ہاتھ بھی بندھ جائیں ٭

کون نہیں جانتا کہ والدین کی محبت و اطاعت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت
اطاعت کے بعد دوسرے درجے پر رکھا ہے۔ قرآن و سنت ایسے احکام سے بھرے
پڑے ہیں مگر فرمایا کہ اس کے باوجود اگر والدین خدا سے بغاوت یا اُس کے ساتھ شرک
کفر کرنے کی ترغیب دیں تو پھر اُن کا کہا مت مانو۔ بیوی اور اولاد سے محبت
انسان کا فطری تقاضا ہے، اسلام اس کی تاکید کرتا ہے اور اسے فروغ دینا چاہتا
ہے، مگر وہیں تک جہاں تک اللہ تعالیٰ کی رضامندی اس میں شامل ہے۔ لیکن
جب ان کی محبت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بنتی ہو تو پھر اُن سے کٹ جائے
چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے کہ: اِنَّ مِن اَزوَاجِکُم وَ اَولادِکُم عَدُوًّا لَّکُم
فَاحذَرُوھُم۔ اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی مثال کو سامنے رکھئے
کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ہر محبت کو قربان کر دیا۔ اپنے حقیقی باپ کو جب خدا کا باغی پایا
اس سے منہ موڑ لیا۔ قوم کو خدا کا سرکش دیکھا تو اس سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ وطن کی سرز
کو اپنے مولیٰ کی محبت کے لئے تنگ پایا تو کبھی مصر، کبھی فلسطین اور کبھی جزیرہ نمائے عرب
کی خاک چھانی۔ اپنی محبوب و وفاشعار بیوی اور معصوم بچے کو اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر

اسلامی سن کی ابتداء

مولانا محمد امین اثری (علی گڑھ، انڈیا)

یہ حقیقت ہے کہ قومی زندگی کی بنیادی چیزوں میں سے ایک نہایت اہم چیز سن اور تاریخ ہے۔ جو قوم اپنا قومی سنہ نہیں رکھتی گویا اپنی بنیاد کی ایک اینٹ نہیں رکھتی۔ قوم کا سنہ اس کی پیدائش اور ظہور کی تاریخ ہوتا ہے۔ یہ اس کی قومی زندگی کی روایات کو قائم رکھتا ہے اور دنیا میں اُس کے اقبال و عروج کا عنوان ثبت کر دیتا ہے۔ یہ قومی زندگی کے ظہور و عروج کی ایک جاری و ساری یادگار ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سن رائج تھے۔ زیادہ مشہور سن یہودیوں، رومیوں اور ایرانیوں کے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں چونکہ عربوں کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی۔ اس لئے اوقات و موسم کی حفاظت اور یادداشت کے لئے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اسی سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ من جملہ سنون کے عام الفیل بھی تھا۔ یعنی ابرہہ حبش سے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سن استعمال ہوتا رہا۔ لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا تو خود عہدِ اسلام کے واقعات کو اہمیت حاصل ہو گئی۔ صحابۂ کرام رض کا دستور تھا کہ اسلامی واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اس سے حساب لگاتے۔ مثلاً جب ہجرتِ مدینہ کے بعد وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی تو اسی کو سن کا درجہ دے دیا تھا، لوگ اسے سن اذن سے کرتے تھے۔ اسی طرح سورۂ برائت کے نزول کے بعد بول چال میں سنہ برائت کا رواج پایا جاتا ہے۔ حجۃ الوداع کے واقعہ کو بھی کچھ دنوں تک بطور ایک سن کے استعمال کیا جاتا تھا۔ بعض روایتوں میں صاف تصریح آچکی ہے کہ صحابۂ کرام رض کی بول چال میں سب سے زیادہ مشہور سنے سنہ التمحیص، سنہ الترفیہ، سنۃ الزلزال بھی ان ہی میں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک یہی حالت رہی۔ لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور

بساطِ عالم پر چھا گئے۔ تو بات اس طرح سمجھ میں آئی کہ وہ کاملاً خدا کے ہو کر رہ گئے۔ اُن کے سارے جذبات و عواطف خدا کی محبت کے تابع تھے۔ انہوں نے محض خدا کی خاطر اپنے دشمنوں سے پیار کر لیا اور محض خدا ہی کی خاطر اپنے حقیقی خون کے رشتہ سے نہ صرف کٹ گئے بلکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میدانِ جنگ میں اپنے کے ماموں کو اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو اپنے سگے کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے سے ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر جنگِ بدر میں جس میں تم کفار کے ساتھ تھے، میری تلوار کی میں آجاتے تو کبھی بچ کر نہ جاتے اور باپ بیٹے کا یہ خونی رشتہ کبھی ہمارے درمیان حائل نہ ہو سکتا۔

"الحُبّ للہ والبُغض للہ" کا یہی وہ مقام ہے جسے فنا فی اللہ سے تعبیر کیا ہے کہ انسان اپنی پسند و ناپسند، محبت و عداوت غرض ہر طرح کے جذبات کو اللہ کی محبت کے تابع کر دے۔ آج ہم اُس کی رحمتوں اور نصرتوں سے اسی لئے محروم کہ ہماری دشمنی اور محبت کا معیار بدل گیا ہے۔ ہم خدا کی نافرمانی برداشت کر سکتے لیکن کسی رشتے کو خدا کی خاطر کاٹنا گوارا نہیں کرتے۔ ہمیں خدا کے باغیوں اور سرکشوں سے محبت ہے، صرف اس لئے کہ اُن سے ہمارے ایسے مفادات وابستہ ہیں جن خُدا کی خاطر نہیں چھوڑ سکتے۔ جب ہم خُدا سے محبت اور اُس سے تعلق کے مقابلے میں مفادات کی محبت اور اپنے وابستگان سے تعلقات کو ترجیح دینے لگے تو پھر اس کی نصرتیں ہمیں کیسے حاصل ہوتیں۔ ہم نے اُسے چھوڑا تو اُس نے بھی ہمیں چھوڑ دیا: نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُّقَرِّبُ اِلٰى حُبِّكَ ط ــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

حدیث:

المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله والمهاجر من هجر الخطايا والذنوب ط (البیهقی فی شعب الایمان)

مجاہد وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت فرمانبرداری میں اپنے نفس سے جہاد کرے اور مہاجر وہ ہے جو برائیوں اور گناہوں کو چھوڑ دے!

بستہ ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لئے اسلام
کا ظہور تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش تھی، بدر کی تاریخی فتح تھی، مکّہ
کا فاتحانہ داخلہ تھا، حجۃ الوداع کا اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی
تکمیل اور فتح کا آخری اعلان تھا۔ لیکن ان واقعات میں سے کسی ایک کو بھی اختیار
نہیں کیا گیا اور نظر گئی تو ایسے واقعہ کی طرف جو نہ تو کسی کی پیدائش کا جشن تھا اور نہ
کسی کی شوکت کا ظہور، نہ کسی غلبہ اور تسلط کا شادیانہ بلکہ ایک ایسے زمانہ کی یاد تھی
بلکہ آغازِ اسلام کی بے سروسامانیاں اور بظاہر ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں
کہ محسنِ انسانیت، ہادیٔ اعظم، پیغمبرِ آخرالزماں، ساقیٔ کوثر حضرت محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اپنے وطن عزیز میں زندگی بسر کرنا بھی ناممکن ہوگیا تھا بیچارگی
اور مظلومیت کی انتہا تھی کہ اپنا عزیز وطن، اپنا گھر، اپنے عزیز و اقارب اور اپنا سب
کچھ چھوڑ چھاڑ کر صرف ایک رفیق غمگسار کے ساتھ رات کی تاریکی میں نکل کھڑے ہوئے
تھے۔ تاریخ کا یہ واقعہ دُنیا کی تمام تاریخوں اور قومی یادگاروں کے خلاف تھا۔ اقوامِ عالم
فتح و اقبال سے اپنی تاریخ شروع کیا کرتی ہیں۔ لیکن صحابۂ کرام رضا کا یہ نرالا اور اچھوتا
انتخاب تھا کہ بے چارگی اور درماندگی سے اپنی تاریخ شروع کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ
عالم کی طاقت و شوکت کی بنیاد اس وقت پڑتی ہے جبکہ وہ ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ
کرکے انسانوں کو محکوم بنا لیا کرتی ہیں۔ لیکن صحابہ کرامؓ کا یہ یقین تھا کہ ان کی طاقت
اور شوکت کا دروازہ اس وقت کھلا جب انہوں نے اپنے وطنِ مالوف کو خیر باد کہا۔
وہ سمجھتے تھے کہ ان کی کامرانیاں ہجرت اور اس دور کے اعمال میں ہی مضمر ہیں اس
لئے اوّلیت واقعۂ ہجرت کو حاصل ہے۔ اسی حقیقت کی بنا پر صحابہ کرام رضا نے قومی سنہ
کا مبداء واقعۂ ہجرت کو قرار دیا تاکہ نہ صرف آغازِ سال ہر ماہ محرّم میں اس کی یاد تازہ
ہوتی رہے۔ بلکہ جب بھی یہ سن نظر سے گذرے تو اس کی معنوی فتح مندی کی یاد دہانی ہوتی
رہے ——!!

ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ریاست، اقتدار، دولت
اور حکومت کے لئے نہ تھی بلکہ آپؐ کی ہجرت اعلائے کلمۃ اللہ اور تبلیغ و دعوتِ حق اور
ادائیگی امانت رسالت نیز شہادتِ حق کے لئے تھی۔ چنانچہ آپؐ کی جدّ و جُہد کے نتیجے
میں ساری دنیا میں اسلام کا پرچم لہرایا اور اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہوا اور مشرق و مغرب میں

دفاترِ حکومت کے قیام سے حساب و کتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہو گئے اس لئے ضرورت پیش آئی سرکاری طور پر کوئی ایک سن قرار پا جائے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے میمون بن مہران روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک کاغذ پیش کیا گیا جس پر شعبان کا مہینہ درج تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ شعبان سے کونسا شعبان مراد ہے، اس برس کا یا آئندہ برس کا؟ پھر آپ نے سربرآوردہ صحابہؓ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا اس لئے ضروری ہے کہ حساب و کتاب کے لئے کوئی طریقہ اختیار کیا جائے جس سے اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں اس پر لوگوں نے کہا کہ اس کے متعلق ایرانیوں سے مشورہ کرنا چاہیئے، اور دریافت کرنا چاہیئے کہ اُن کے یہاں اس کے کیا طریقے ہیں ؛

اسی طرح طبری نے امام شعبی سے نقل کیا ہے کہ ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے پاس خطوط آتے ہیں مگر ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔ اور یہ وقت تھا جب کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کر دیئے تھے اور خراج کے اُصول و ضوابط طے پا گئے تھے اور محسوس کر رہے تھے کہ ضبطِ اوقات کے لئے ایک خاص تاریخ قرار پا جائے۔ پرانی تاریخیں موجود تھیں لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ انہیں اختیار کریں۔ اب ابو موسیٰ اشعری کے لکھنے سے حضرت عمرؓ کو اور زیادہ اس کی طرف توجہ ہو گئی تھی۔ اس لئے صحابہؓ کو پھر جمع کر کے مشورہ کیا تو بعض نے رائے دی کہ ایرانیوں کے یہاں آخری سنہ یزدگرد کا سنہ ہے اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ ان ہی دونوں میں سے کسی کو اختیار کر لیا جائے۔ لیکن حضرت عمر فاروقؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ پھر خیال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کے وقت سے سنہ کی ابتداء کی جائے اور بعض نے رائے دی کہ حضورؐ کی وفات سے شروع کیا جائے لیکن کوئی بات طے نہ پا سکی کہ اخیر میں حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ واقعہ ہجرت سے سنہ کی ابتداء کی جائے تو بہتر ہے تو لوگوں نے اس سے اتفاق کیا اس وقت واقعہ ہجرت پر سولہ برس گذر چکے تھے ؛

الغرض اسلامی سنہ کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے ہمیشہ

انقلاب نبویؐ کے خلاف تخریبی ردّعمل

یعنی "الفتنۃ الکبریٰ"

اسرار احمد

شامِ ہمدرد میں مختلف مقامات پر پچھلے دنوں اخلاق کا موضوع زیرِ بحث رہا ہے پشاور میں میں نے تقریر کی تھی کہ: "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"! صد فی صد درست ہے۔ لیکن انفرادی اخلاق تو پہلے بھی بہت بلندی پر تھا۔ عفو، درگذر، احسان، ایثار۔ اس کی مثالیں سابقہ انبیاء میں بھی ملتی ہیں۔ خود حضرت مسیح علیہ السّلام کی تعلیم تھی کہ: "دشمن سے محبت کرو، اپنے آپ کو جھٹلا دو، دوسرے کو جھوٹا نہ کہو"! انہوں نے ایک شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھا اور پکڑ لیا تو اس نے کہا میں چوری تو نہیں کر رہا تھا آپؑ نے فرمایا: "ہاں بھئی! میری آنکھ نے غلط دیکھا!" لیکن یہ تھا انفرادی اخلاق۔ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ نے اجتماعی اخلاق دیئے ہیں۔ آپؐ نے نظامِ اجتماعی کو اخلاق کی بنیاد پر قائم کیا، یہ ہے اصل کارنامہ! ذہن میں رکھیے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اصل کارنامہ کیا ہے۔ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ ایک کامل دین کی حیثیت سے اس کو قائم کر کے اور چلا کر دکھا دینا اور اس کی برکات کا ظہور اس طرح ہونا کہ پوری نوعِ انسانی اُن سے متمتع ہو۔ میں اس کے لئے یہ تشبیہ دیا کرتا ہوں کہ جیسے کبھی کوئی انسان حسین خواب دیکھے اور پھر اس کی یاد ذہن میں محفوظ و برقرار رہے۔ نوعِ انسانی کے اجتماعی شعور - COLLECTIVE MEMORY - میں خلافتِ راشدہ اس حسین خواب کے مانند ہے جو بنی نوعِ انسان دیکھ رہی ہے کہ اس کرۂ ارضی پر ایک نظام کبھی ایسا بھی تھا اور یہ ہے محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف سے اصل اتمامِ حجّت۔ لیکن اب آتا ہے اس کا دردناک پہلو اور وہ ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہدِ خلافت کے آخری ایام

لوگ دینِ اسلام کے تابع ہوگئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ذیل کے نتائج کی حامل ہے۔ (۱) شجاعت و بہادری (۲) راہِ خدا میں محنت و مشقت (۳) صبر و تحمل (۴) اخلاص (۵) اللہ تعالیٰ کے اوامر کی پابندی اور نواہی سے اجتناب

اب جبکہ مسلمانانِ عالم نے پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کی تقریبات کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے چودھویں صدی کے آخری سال جو اَب ماہِ محرّم شروع ہوا ہے اور پندرھویں صدی کے پہلے سال جو کہ ماہِ محرّم سے شروع ہوگا، کو منتخب کیا ہے۔ اِن استقبالیہ تقریبات کے آغاز پر خداوندِ عالم سے دعا ہے کہ اسے پوری اُمّت مسلمہ کے لئے خیر و برکت، امن و سلامتی کا سال بنائے اور امّتِ مسلمہ کی تحریکاتِ دین کو جو عملاً جدّ و جُہد میں مصروف ہے، کامیابی عطا فرمائے۔ نیز مجاہدین کی مدد و نصرت فرمائے اور اُمّتِ مسلمہ کو متحدّ و منظّم جِدّ و جُہد کی توفیق سے نوازے۔ آمین!

پندرھویں صدی ہجری کے استقبال کی تقریبات منانے کا تقاضا ہے کہ برائی سے اجتناب کرکے بھلائی کا راستہ اختیار کریں، شر سے ہجرت کرکے خیر کی طرف گامزن ہوں، شہواتِ نفسانی اور لذّاتِ شیطانی سے باز آئیں، کتمانِ حق چھوڑ کر شہادتِ حق کے مقام پر آئیں اور فریضۂ اقامتِ دین کی ادائیگی میں کما حقّہٗ جُہد کریں — اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ : بقیہ صت۲ پر د

مراد آباد (انڈیا) سے جناب افتخار احمد فریدی اطلاع دیتے ہیں

"۲۳ مارچ کو دیوبند سے واپس مراد آباد پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری اہلیہ طاہرہ خاتون کا دوپہر چند منٹ کی علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ گھر کے تین فرد تھے اب دو رہ گئے ہیں محمد اُسامہ کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اسی رنج و غم کے ماحول میں اُس کی شادی کی گئی ہے۔ دُعا کی بہت ضرورت ہے مرحومہ کے لئے بھی اور ہمارے لئے بھی۔۔ اگر 'میثاق' میں دُعائے مغفرت کے لئے چند الفاظ دے دیں تو بڑا کرم ہو۔ وہاں کے بہت سے تعلق والوں کو معلوم ہو جائے گا، کچھ پہنچا سکیں گے!" — اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنّت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !! (ادارۂ میثاق)

یہودیت اسلام کی سب سے بڑی دشمن تھی - جیسے الجبرے کے QUESTIONS کبھی حل کیا کرتے تھے - ایسے ہی ایک نتیجہ نکال کر رکھ لیجئے کہ ۱ - سیاسی اور مملکتی سطح پر میں عرض کر چکا ہوں کہ سلطنتِ رُوما کی تین ٹانگیں تھیں - دو ٹوٹ چکی تھیں ایک برقرار تھی نام تو نہیں مٹا، وہ تو اُس وقت مٹا ہے جب قسطنطنیہ فتح ہوا ہے - لیکن سلطنتِ کسریٰ تو اس طرح نیست و نابود ہو گئی جیسا کہ اُس کا وجود ہی نہ تھا - کون زیادہ AGGRIE-VED ہے؟ وہ مملکت جو پورے عرب کو اپنی جاگیر سمجھتی تھی - جس نے حضورؐ کو اپنی رعیّت کا ایک فرد سمجھ کر گرفتاری کا حکم دیا تھا - ذرا اُس کے طنطنے اور اُس کے غرور کا تصوّر کیجئے اور پھر یہ بھی تصوّر کیجئے کہ اُس کا نام و نشان باقی نہ رہے - فلسفۂ تاریخ کے اعتبار سے ایک اور بات بڑی اہم ہے - سلطنتِ روما COSMOPOLITAN تھی - بے شمار قومیتیں، بے شمار نسلیں، بے شمار زبانیں اُس میں بولی جاتی تھیں - کوئی ایک مرکزی NATIONALISM اس کی پشت پر نہ تھا جیسا کہ ایران میں ایک زبان، ایک کلچر، ایک تہذیب، بہت حد تک ایک نسل تھی اور اس طرح ایک بہت بڑا —— NATONALIST SENTIMENT وہاں پر موجود تھا - یہ اڑھائی ہزار سالہ جشن جو منایا گیا تھا اور اپنی پرانی بنیادوں کو از سرِ نو زندہ اور تازہ کرنے کا جو عزم تھا اس کا رشتہ اُسی سے جوڑا گیا تھا، اس کو بھی ذہن میں رکھئے -

فردوسی نے عربوں کے بارے میں جو اشعار کہے ہیں، وہ عربوں کے بارے میں ایرانیوں کی ذہنیت کی پوری عکاسی کرتے ہیں - وہ کہتا ہے اور دیکھئے عربوں کے متعلق کتنی نفرت اور استہزاء کا اظہار کیا ہے ؎

زشیرِ شتر خُوردن و سُوسمار ❖ عرب را بجائے رسید است کار
کہ ملکِ کیاں را کُنند آرزو ❖ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

یہ اُونٹنیوں کا دودھ پینے والی قوم اُجڈ، گنوار اور سوسمار (گوہ) کھانے والی وحشی قوم، اُس کی یہ جرأت؟ کہ عظمت و سلطنتِ کیانی حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے - اس بات کو ذہن میں رکھئے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے REACTIONARY - FORCE - ابھری ہیں - انتقام کا آغاز ہوا، جس کا پہلا مظہر ہے شہادتِ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ —— ایران نے وار کیا، اور بھر پور وار کیا - آپ کو معلوم ہے اُن کا

میں فتنہ — الفتنۃ الکبریٰ کا ظہور — اس کو بالکل IENTIFICALLY :
لیجئے کہ اصل میں یہ تھا کیا۔ DETAILED EVENTS میں آدمی گم سا
لیکن یہ یاد رکھئے ایک ہے علمِ تاریخ اور ایک ہے فلسفۂ تاریخ۔ فلسفۂ تاریخ
TAIL — میں نہیں جایا کرتا کہ فلاں تاریخ کو کیا دن تھا، دوشنبہ کا دن تھا
ٹھیک ہے وہ بھی RESEARCH کے موضوعات ہیں۔ فلسفۂ تاریخ یہ ہے
NTS
کیوں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اجتماعی حادثات کے اسباب کیا ہیں۔ تو اب سمجھئے
اصل میں تھا کیا۔ اس کے پس منظر میں یہ سمجھ لیجئے کہ REVOLUTION کے
COUNTER REVOLUTION کا فلسفہ میں کل بھی بیان کر چکا ہو
بھی بیان کیا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں، ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ کسی انقلا
تکمیلی مراحل جب بالکل اپنی آخری حدود کو آتے ہیں تو مخالف قوتیں دبک جا
لبادہ اوڑھ لیتی ہیں اور منتظر رہتی ہیں کہ جب موقع ملے گا تو ہم انتقام لیں گے
کے سوا کوئی صورت نہیں کہ لبادہ اوڑھ لو، جان بچاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ
عرب میں انقلاب مکمل فرمایا۔ ان کے خلاف جو تحریکیں اٹھیں اُن سے حضرت
رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبرد آزما ہوئے۔ پھر خلافتِ فاروقی و عثمانی کے دوران جو
سطح پر انقلابِ محمدیؐ کا سیلاب آیا۔ یہ ذہن میں رکھئے کہ اس سلسلے میں کون کو
AGGRIEVED PARTIES تھیں اور زک کنہوں نے اٹھائی تھی،
بڑا عجیب ہوگا۔ ذرا توجہ کو مرتکز کیجئے۔ جہاں تک شرک کا تعلق ہے، اُس کا
ہو چکا تھا اور وہ ختم ہو چکا تھا۔ باقی دو مذاہب تھے عیسائیت اور یہودیت
وہ مذاہب تھے جن سے اسلام کا براہِ راست تصادم ہوا اور دو ہی سیاسی قوتی
سلطنتِ رُوما اور سلطنتِ کسریٰ تھیں، جن سے اسلام کا تصادم ہوا۔ اِن مذا
سے عیسائیوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کوئی تصادم نہیں
جزیرہ نمائے عرب میں نجران وغیرہ مقامات پر جو عیسائی تھے انہوں نے
کر لیا تھا۔ ہاں! یہودیوں کا معاملہ دوسرا تھا۔ میں بیان کر چکا ہوں بنو قینق
بنو نضیر نکلے۔ بنو قریظہ کے کئی سو افراد قتل ہوئے، خیبر اُن کا بڑا قلعہ تھا، و
ہاتھ سے گیا۔ مذہبی سیادت اور چودھراہٹ اُن کے ہاتھ سے گئی۔ لہٰذا مذ

تاریخی حقیقت ہے، اِس کو سامنے رکھیئے، نہ پڑھنا چاہیں تو بات اور ہے۔ سمجھا یہ گیا تھا
کہ شاید عمرؓ ہی بھاری پتھر ہیں، یہ ہٹ گئے تو معاملہ صاف ہو جائے گا۔ لیکن معلوم ہوا
کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب اتنا بودا نہیں تھا۔ اگرچہ عمرؓ ہٹ
گئے لیکن میدان صاف نہ ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا دورِ خلافت جیسا کہ میں
عرض کر چکا ہوں پہلے دس سال تک اسی شان کا حامل رہا جس کا دورِ فاروقی۔ اور
اب آتی ہے یہودی سازش جو مکمل سازش، از سرتا پا سازش اور اپنے نقطۂ عروج
کو پہنچی ہوئی سازش ہے۔ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ دُنیا گواہ ہے کہ یہودیوں کی سازش
نے بڑی بڑی سلطنتیں اُلٹ دیں۔ علامہ اقبال کا مشاہدہ ہے کہ "فرنگ کی رگِ جاں
پنجۂ یہود میں ہے" — ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر ہر وقت خائف رہتا ہے کہیں
یہودی ناراض نہ ہو جائیں، نہیں تو کوئی نہ کوئی سکینڈل شروع ہو جائے گا — اگر
WATERGATE نہیں تو کوئی خشکی کا گیٹ ہوگا — نظر بھی نہیں آئیں گے
کہاں گئے۔ یمن کا ایک یہودی عبداللہ بن سبا، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر آیا۔ تاریخ
اپنے آپ کو دُہرا رہی ہے۔ پال (PAUL) ساری عمر حضرت مسیح کی مخالفت
کرتا رہا۔ مگر پھر اس نے جو داؤ کھیلا ہے، عیسائیت کا لبادہ اوڑھ کر اُس
جڑ کاٹ دی۔ توحید کی جڑ کاٹی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُلوہیت میں شریک
دیا اور اس طرح عیسائیت میں انسان پرستی کو داخل کر دیا اور واقعۂ صلیب پر ایسا
جذباتی فضا پیدا کی کہ دینِ حق کہیں کا کہیں رہ گیا۔ عیسائیت کی بنیاد تثلیث ا
مظلومیتِ مسیح پر قائم ہوئی۔ میں نے یہ مثال اس لئے پیش کر دی کہ مبادا آپ
یہ خیال ہو کہ کیا ایک یہودی اتنا بڑا کام کر سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں بعض
طرح لوگ یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ ایک شخص یہ سب کچھ کیسے کر سکتا ہے۔ کیا پال
نہ تھا کیا مارکس (MARX) اکیلا نہ تھا، مگر دیکھئے کتنے لوگ اس کے فلسفہ
فکر کے نخچیر ہوئے۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی بھی بڑی شے ہے۔ لبادہ اوڑھا، کام
کی، ایک مہم شروع ہو گئی کہ سلطنت تو حضور کے خاندان، حضور کے اہلِ بیت
کی نسل یا داماد کا حق تھا یہ کسی اور کے پاس کیسے چلی گئی۔ قبائلی عصبیت کے بارے
یاد رکھئے کہ دورِ نبویؐ میں بالکل ختم نہیں ہو گئی تھی۔ بار بار ایسا ہوا، واقعات
ہیں۔ انصار و مہاجرین کے درمیان تلواریں کھنچ جاتی تھیں۔ یہ تو حضور صلی اللہ

قاتل کون تھا؟ ابو لؤلؤ فیروز جو جنگِ نہاوند میں CAPTURE ہوا۔ غلام بنا حضرت مغیرہ بن شعبہ کے حصے میں آیا۔ اُس کا پُشت پناہ کون تھا؟ ہرمزان، ایک سابقہ گورنر۔ یہ ایک مکمل سازش تھی، اور وہ کئی دن پہلے دھمکی دے گیا تھا۔ بظاہر شکایت لے کر آیا تھا کہ مجھ پر میرے مالک مغیرہ بن شعبہ نے ٹیکس زیادہ مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کیا کرتے ہو؟ کیا کیا فن جانتے ہو؟ اُس نے اپنے فنون گنوائے۔ میں فلاں کام بھی جانتا ہوں اور فلاں کام کا بھی ماہر ہوں، چکیاں بھی بناتا ہوں، ہتھیار بنانا بھی جانتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر یہ رقم زیادہ نہیں۔ طیش میں آکر جانے لگا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر چکیاں بنانا جانتے ہو تو میرے لئے بھی ایک چکی بنا کر لانا۔ کہنے لگا: آپ کے لئے تو میں وہ چکی بناؤں گا جسے دُنیا یاد رکھے گی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یہ مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے۔ لیکن وہاں PREVENTIVE DETENTION یا SAFETY ACT کے قوانین تو تھے نہیں کہ فوراً گرفتار کر لیا جاتا۔ اسلام میں حریّت ہے۔ جب تک کسی جرم کا ظہور نہ ہو سزا کیسی؟ اگر ظن ہے تو ظن پر تو بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئاً۔ شہادتِ عمر فاروقؓ سے شاید ایک ہی دن پہلے حضرت عمرؓ کے صاحبزادے نے دیکھا کہ ہرمزان اور وہ کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ جب دیکھا کہ کوئی آ رہا ہے تو گھبرا کر وہاں سے ہلے۔ گھبراہٹ میں ایک خنجر بھی گرا جسے اُس نے اُٹھا لیا۔ سارے شواہد موجود ہیں۔ ہرمزان کے ساتھ اُس کی یہ ملاقات، گھبراہٹ اور خنجر سارے قرائن پوری کہانی خود کہہ رہے ہیں۔ پھر مسجدِ نبویؐ میں جس طرح یہ واقعہ پیش آیا وہ بھی آپ کو معلوم ہے، اس کے لئے وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیئے کہ حضرت عمرؓ سے اتنی دشمنی کیوں تھی۔ دشمنی حضرت ابوبکرؓ سے بھی تھی مگر اتنی نہیں، کیوں؟ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں شام کسریٰ کی فتوحات کا صرف آغاز ہوا تھا۔ فرمانِ نبویؐ کے مطابق سلطنتِ کسریٰ کو پُرزے پُرزے کرنے والے حضرت عمر فاروقؓ ہی ہیں۔ اس لئے اصل عداوت، دشمنی اور بُغض اُن سے رکھا۔ جو ذرا معتدل قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ حضرت ابوبکرؓ کو معاف کر دیتے ہیں۔ لیکن جو چرکا انہوں نے حضرت عمرؓ کے ہاتھوں کھایا ہوا ہے اُس کو کیسے معاف کر دیں۔ ابو لؤلؤ فیروز کی تصاویر مقدّس سمجھی جاتی ہیں اور DECORATION کے طور پر اس طرح لگائی جاتی ہیں جس طرح ائمۂ اہلِ بیت کی۔ یہ

کر کے اس کو کتابچہ کی صورت میں طبع کرا دیا، چھپا بھی بہت ہے، اس وقت ایک محدود تعداد میں یہاں ہے لیکن وہ فروخت کے لئے نہیں ہے، مفت تقسیم کے لئے ہیں، مگر تعداد محدود ہونے کی وجہ سے طے یہ کیا گیا ہے کہ جو شخص کم از کم دو روپے مالیت کی انجمن کی کوئی اور کتاب خریدے گا، اسے یہ کتابچہ بلا قیمت دیا جائے گا۔ اس کتابچہ میں میں نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے کیونکہ شہادتِ عثمانؓ تاریخ اسلامی کا سب سے زیادہ اندوہناک واقعہ ہے۔ غیروں نے حضرتِ عثمانؓ پر جو ظلم کئے اور جو ستم ڈھائے اُن کا تو میں ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ حد یہ ہے کہ خود اپنوں نے بھی اُن پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اقربا پروری بیت المال کے سلسلے میں بے احتیاطی وغیرہ کے الزامات لگائے گئے۔ یہ الزامات اس عثمانؓ پر لگائے جا رہے ہیں جن کے عقد میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں دیں اور فرمایا کہ اگر میری چالیس بیٹیاں بھی ہوتیں تو بھی یکے بعد دیگرے عثمانؓ کے نکاح میں دیتا چلا جاتا۔ یہ وہ عثمانؓ ہیں جن کے متعلق حضور فرماتے ہیں کہ ہر شخص کا ایک رفیق ہوتا ہے اور عثمانؓ میرا جنّت کا رفیق ہے۔ اُ۔ جن کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ فرشتے بھی اُن سے حیا کرتے ہیں۔

غزوۂ تبوک میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نقد اور اُونٹوں اور گھوڑوں کی صورت میں امداد پر اس قدر خوش ہوئے کہ اُن کی دی ہوئی اشرفیوں کو اُچھالتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اس کے بعد عثمانؓ جو چاہے کرے اُس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ غزوۂ تبوک کا دوسرا نام جیش عسرۃ ہے۔ چونکہ ان دنوں مسلمانوں کی حالت بہت پتلی تھی، دُور دراز کا سفر اور رُومیوں جیسی طاقت کا سامنا تھا۔ آپ نے چندہ کے لئے اپیل کی۔ پہلے حضرت عثمانؓ سو اُونٹ مع ساز و سامان پیش کئے، حضورؐ خوش ہوئے۔ مگر فرمایا کہ سَو اونٹوں سے کیا بنتا ہے۔ اپیل جاری رہی۔ حضرت عثمانؓ ہر بار سو اُونٹ پورے ساز و سامان سمیت دیتے چلے گئے تا آنکہ تعداد تین سو اونٹ تک پہنچ گئی۔ پھر بھی اپیل جاری رہی۔ اس پر انہوں نے ایک ہزار اشرفی لا کر حضورؐ کے سامنے ڈھیر کر دی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ کا چہرہ فرطِ مسرّت سے اس طرح سرخ ہو گیا جیسے کسی نے آپؐ کے رخساروں پر انار نچوڑ دیئے ہوں۔ آپ نے فرمایا: "اے اللہ! میں عثمانؓ سے راضی ہوں تو بھی اُس سے راضی ہو جا"۔ وہ عثمانؓ جو کامل الحیا و الایمان ہیں اُ... پر السیہ تہمت؟ لُطف یہ کہ خود لکھتے ... ...

وسلم کا وجود مسعود تھا کہ جس کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھتی تھی۔ کہیں اوس و خزرج کے درمیان تلواریں کھنچ جاتی تھیں۔ یہ چنگاری دب تو گئی تھی مگر موجود ضرور تھی اور سازشی ذہن اسی کو کہتے ہیں کہ کہاں پھونک ماری جائے۔ یہی صلاحیت ہے اور اسی کا نام ذہانت و فطانت ہے کہ دیکھیں کہ چنگاری کہاں دبی ہوئی ہے جسے پھونک ماری جائے۔ بس اس چیز کو اٹھانا تھا کہ کہانیاں کھڑی ہو گئیں، فلسفے کھڑے ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ پر ذاتی طور پر تہمتیں تراشی گئیں، قصے مشہور ہو گئے۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ دوسرے کے بارے میں اچھی بات مشکل سے مانتا ہے مگر بُری کو فوراً قبول کر لیتا ہے۔ اس کے لئے بھی خود دورِ نبویؐ سے مثال دے دوں۔ حضورؐ کے زمانے میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر بڑی گھٹیا اور کمینی تہمت لگی اور قرآن گواہ ہے کہ صادقین مومنین بھی اس میں ملوّث ہو گئے۔ یہ انسان کی فطری کمزوریاں ہیں۔ بہرحال اب تو بہت سا پانی گذر چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کو لگ بھگ پچیس سال ہونے کو آئے، ربع صدی بیت گئی، صحابہ کبارؓ کی بڑی تعداد اُٹھ گئی تواب تو گویا افواہوں کے لئے پہلے کے مقابلے میں میدان کہیں زیادہ زرخیز تھا۔ اگر شام میں ہیں تو مصر کے گورنر کی بُرائی ہو رہی ہے، ہر جگہ حضرت عثمان کی برائی ہو رہی ہے۔ یہ ہے اصل بنیاد الفتنۃ الکبریٰ کی، یہ ہے وہ محرک جس نے تاریخ اسلامی کے پہلے عظیم فتنے کی بنیاد ڈالی اور یہ عجیب HISTORICAL FACT ہے کہ شیعانِ علیؓ کے نام کا لبادہ اوڑھا گیا اور اسی کے لئے زرخیز زمین ثابت ہوئی ایران کی۔ میں نے عرض کیا تھا کہ مذہب کی سطح پر سب سے زیادہ AGGRIEVED یہودیت تھی۔ سبائیت اسی کا شاخسانہ ہے۔ مملکت کی سطح پر سب سے زیادہ AGGRIEVED ایرانی قوم تھی، جو بڑی نسل پرست قوم تھی۔ پہلا وار انہوں نے کیا، حضرت عمرؓ شہید ہو گئے اور دوسرا وار انہوں نے کیا، حضرت عثمانؓ کی شہادت ہو گئی اور پھر ان دونوں فتنوں نے ایک شکل اختیار کر لی، جس کا مرکز ایران بن گیا، اتفاقی طور پر نہیں بلکہ اس لئے کہ یہاں اس کو سازگار ماحول مل گیا۔ اس کی جڑیں اس سرزمین میں نیچے اتر سکیں جہاں یہ دونوں AFFINITIES جمع ہو سکیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں اب کیا عرض کروں۔ وقت بہت ہو گیا ہے، میرا ایک کتابچہ ہے، میں نے چند تقریریں کی تھیں۔ ہمارے بزرگ دوست شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے انہیں جمع

کہ یہ عثمانؓ کون ہیں۔ قرآن مجید میں ذوالقرنین کا ذکر بڑی شان و شوکت کے ساتھ آیا ہے۔ مطلع الشمس اور مغرب الشمس تک ان کی مہم جوئی کا ذکر ہے۔ اس کے باوجود اُن کی حدودِ مملکت، حضرت عثمانؓ کی مملکت کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں۔ اتنی وسیع و عریض مملکت کا فرماں روا، اتنے بڑے بڑے سے جرنیل و مُدبّر شام میں حضرت معاویہؓ، مصر میں عمرو بن العاص ان کے ماتحت ہیں اور لجاجت و اصرار سے کہہ رہے ہیں کہ آپ ہمیں ان بلوائیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی اجازت دیں۔ مسلمانوں کی فوج اب ہزاروں سے متجاوز ہو کر لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ بلوائی صرف چند ہزار تھے، فوج کشی کا اشارہ بھی کر دیتے تو ان بلوائیوں کی تِکّا بوٹی ہو جاتی، مگر نہیں بلوائی اپنی تمام تر شرارتوں کے باوجود بظاہر کلمہ گو ہیں۔ محمد رسول اللہؐ کا قانون ہے کہ:— "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ" ڈھال ہے۔ اس ڈھال پر کسی کلمہ گو مسلمان کی تلوار نہیں اُٹھ سکتی۔ یہ ڈھال کسی نے سچی اُٹھائی ہے یا جھوٹی اٹھائی ہے۔ اس کا فیصلہ تم دُنیا میں نہیں کر سکتے، یہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ ایک جنگ میں حضرت اُسامہؓ نے ایک کافر پر تلوار اُٹھائی، اُس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا۔ مگر اُٹھی ہوئی تلوار رُک نہ سکی، وہ قتل ہو گیا۔ غالب خیال یہی تھا کہ اُس نے جان بچانے کے لئے جھوٹ موٹ کا کلمہ پڑھا ہو گا۔ حضور کو علم ہوا تو انہوں نے سخت سرزنش فرمائی اور کہا اُس وقت کیا کرو گے جب قیامت کے دن اُس شخص کا کلمہ تمہارے خلاف استغاثہ لے کر آئے گا کہ میرے ہوتے اسے قتل کر دیا— تو کلمہ کی یہی ڈھال بلوائیوں کے پاس تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اس پر وار نہیں کیا، سارے وار اپنی ذات پر لئے کہ میرا خون تمہیں مطلوب ہے تو حاضر ہے۔ اپنی مدافعت میں کسی کلمہ گو کا خون نہیں بہاؤں گا۔ حضرت علیؓ بار بار کہہ رہے ہیں کہ اجازت دیجئے۔ انصار کی طرف سے وفد بن کر حضرت زید بن ثابت آئے ہیں کہ ہمیں دوبارہ اللہ کا مددگار بننے کا موقع دیجئے۔ ہم نے اللہ کے رسول کی مدد کی تھی اور اب خلیفۂ رسول کی مدد کرنا چاہتے ہیں، اجازت دیں۔ مگر اُدھر سے ایک ہی جواب ملتا ہے کہ: "اَمَّا الْقِتَالَ فَلَا!" کہ جنگ کی تو اجازت نہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کمزور انسان تھے ؂

حضرت عبداللہ بن سلام یہود میں سے تھے، ایمان لا چکے تھے، بہت بڑے عالم

پر تھا، حضرت علیؓ بلوائیوں کے سامنے آئے اور اُن تمام الزامات کا جو انہوں نے حضرت عثمانؓ پر لگائے تھے، ایک ایک کر کے جواب دیا اور انہیں غلط ثابت کیا۔ اس کے بعد خود بھی انہی الزامات کو دُہرا رہے ہیں ع بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست!

ہمارے مرزا منوّر صاحب نے بڑی پیاری بات لکھی ہے کہ اُن صاحب نے بھی شاید حضرت علیؓ کو کرائے کا وکیل سمجھا جو فیس لے کر حضرت عثمانؓ کی وکالت کر رہے تھے۔ اگر حضرت علیؓ کی طرف سے کسی غلط بات کا امکان نہیں تو پھر تمام الزامات کی دھجیاں خود انہوں نے بکھیر دیں، اب کون سے الزامات لے کر آئے ہو؟

کہا جاتا ہے کہ وہ کمزور تھے۔ میرے نزدیک اس سے زیادہ بوالعجبی کوئی ممکن نہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ کمزور آدمی کو غصہ بہت جلد آتا ہے، وہ قوی انسان ہوتا ہے جسے غصہ نہیں آتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

لیس الشدید بالصرعة	پہلوان وہ نہیں جو کشتی میں کسی کو پچھاڑ دے
انما الشدید الذی یملک	پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ
نفسه عند الغضب!	پر قابو رکھ سکے!

— کمزور آدمی کے ہاتھ اگر طاقت آجائے تو وہ کیا کچھ نہ کرے گا، اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ ہے، پچاس دن کا محاصرہ، ایک دو دن کی بات نہیں — پانی تک بند ہو چکا ہے۔ وہ بئرِ رومہ جو حضرت عثمانؓ نے اپنے پیسوں سے خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کیا۔ کیونکہ وہ یہودیوں کی ملکیت تھا اور مسلمانوں کو وہاں سے پانی حاصل کرنے میں بڑی دقت تھی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مُنہ مانگے دام دے کر خریدا اور وقف کر دیا۔ اس کا پانی خود ان پر بند ہے۔ محاصرے کی شدت کا یہ عالم کہ حضرت اُمِّ حبیبہؓ کی کچھ امانتیں حضرت عثمانؓ کے پاس تھیں، وہ واپس لانی تھیں وہ انہیں لانے کے لئے جانے لگیں تو ساتھ ہی ایک مشکیزہ پانی کا بھی لیا۔ مگر اس مشکیزے میں بھی چھید کر دیئے گئے اور پانی بہا دیا گیا۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمِّ حبیبہؓ کی بے عزتی بھی کی گئی۔ ان حالات میں حضرت عثمانؓ ایک فیصلہ کر کے اس پر ڈٹے ہوئے ہیں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کے لئے اور اپنی حفاظت میں کسی کلمہ گو مسلمان کا خون نہیں بہاؤں گا۔ کوئی کمزور آدمی اس طرح ڈٹ سکتا ہے۔ سوچئے اس کے لئے کیسی عزیمت چاہیے۔ کیسی پختہ اور قوی قوتِ ارادی درکار ہے۔ پھر یہ معلوم بھی ہے

مان بھی لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ۷۲ کو پہنچے، چار دن سہی، چار دن پانی کی پیاس کتنی کچھ ہو سکتی ہے۔ دجلہ کا کنارا ہے، زمین میں پانی اتنا قریب ہے کہ ذرا گڑھا کھود دیئے تو پانی نکل آتا ہے — اور تاریخ سے ثابت ہے کہ گڑھے کھودے گئے اور پانی نکلا۔ مگر اس کے باوجود یہ سب کچھ کیا ہے، دراصل شہادتِ عثمان پر پردے ڈالے گئے۔ حضرتِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ یقیناً ایک درخشاں ستارہ ہیں۔ اُن کی شہادت ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ لیکن نسبت و تناسب کو دیکھئے ایک شخص میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے قتل ہوا ہے: "یَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ!" سے

"کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے ؛ گو رستم کا بدن زیرِ کفن کانپ رہا ہے!"

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت کے جوہر دکھائے۔ پھر یہ کہ اس وقت ان کے پاس حکومت نہیں تھی اور یہاں جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ عثمان رضی اللہ عنہ اتنی بڑی سلطنت کے فرمانروا ہیں جو ذوالقرنین کی مملکت سے تین گنا بڑی ہے۔ شمالی افریقہ کے مغربی ساحل سے چلئے اور بلخ و بخارا تک چلے جائیے۔ یہ ہیں ان کی سلطنت کے حدود۔ لاکھوں فوج، جب چاہیں وہ آ جائے۔ مگر پھر کس مظلومیت کے ساتھ قتل ہوئے ہیں کہ کسی کلمہ گو کے قتل کا داغ اپنی گردن پر لے کر نہیں مرے۔ کوئی باہم نسبت ہے؟ لیکن اس شہادت کے جاننے والے کتنے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک سے ایک شہادت بڑھ کر ہے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کچھ کم ہے؟ وہ اسداللہ و اسدرسولہ ہیں۔ پھر حضرت سُمیّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت کیا کم ہے۔ یہ وہ پہلا خون ہے جو اللہ کی راہ میں بہایا گیا۔ تو یہ سب شہادتیں چمنِ نبوی کے پھول ہیں ایک سے ایک اعلیٰ، ایک سے ایک عمدہ۔ حق کی گواہی، صداقت کی گواہی، عدل کی گواہی خیر کی گواہی، دین کی گواہی، قرآن کی گواہی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی میں گردنیں کٹوانا اس اُمت کا مقصدِ وجود ہے۔ اس کو کہانی اور افسانہ بنا دینا، سارے دین کو اس کے گرد چکر دے دینا، اُس کے گرد انسان پرستی کے ہالے بُن دینا یہودیت ہے اور یہودیت سازش ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کہنے والا پیدا نہیں ہوا لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خدا کہنے والے پیدا ہو گئے۔ کسی کے ساتھ نسبت ہے کوئی ذہن اس کے پیچھے ہے۔ وہی عیسائیوں والی تثلیث یہاں بھی آ گئی۔ حضرت مریم کی

سکتے۔ وہ آئے اور محاصرہ کرنے والے بلوائیوں سے اجازت مانگی کہ مجھے بھی عثمانؓ سے ملنا ہے کیونکہ انہیں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ یہ خوش ہوئے سمجھے کہ اپنا ہی آدمی ہے۔ کہا کہ اچھا جاؤ، مل لو۔ چنانچہ بیٹ گئے گفتگو ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے شکوک و شبہات ختم ہوگئے۔ معاملہ پورے کا پورا سامنے آگیا، حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ اب انہوں نے واپس آکر ایک خطبہ دیا ہے کہ اے لوگو! میں نے اللہ کی کتاب پڑھی ہے تورات میں ایک بات لکھی ہے آج اُس کے حوالے سے میں تمھیں خبردار کررہا ہوں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نبی کو قتل کیا گیا ہو اور اُس کے ساتھ ستر ہزار انسان قتل نہ ہوئے ہوں اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نبی کے کسی خلیفۂ برحق کو قتل کیا گیا ہو اور کم از کم ۳۵ ہزار انسان اُس کے بعد قتل نہ ہوئے ہوں۔ اللہ کی نگاہوں میں یہ قیمت ہے نبی اور اس کے خلیفہ کی ــــ حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے قتل کے بعد یہودیوں پہ برما بائیٹس رُومی مسلّط کیا گیا تھا۔ ایک لاکھ تیس ہزار یہودی قتل ہوئے۔ لہٰذا باز آجاؤ، خونِ عثمانؓ اپنی گردن پہ نہ لو۔ انہوں نے کہا، یہ بڈھا یہودی پاگل ہوگیا ہے، اسے نکالو۔ یہ عالم تھا اس وقت مخالفت کا۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے خون کے اِن پیاسوں کو خطاب کیا اور بتایا کہ مسلمانو! میں نے جس دن سے حضرت محمد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ پر بیعت کی ہے، اس کے بعد میری زندگی میں کوئی ایسا جمعہ نہیں گذرا کہ میں نے ایک غلام کو آزاد نہ کیا ہو ــ اور اگر کسی جمعہ کو ایسا نہ کرسکا تو اگلے جمعہ کو اس کا فدیہ دیا اور ایک کی بجائے دو غلام خرید کر آزاد کئے۔ میرے احترامِ رسالت کا یہ عالم ہے کہ جو ہاتھ میں نے بیعت کے لئے محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھ میں دیا تھا اسے کبھی اپنی شرمگاہ کو نہیں لگایا۔ مگر کانوں پر پردے پڑے تھے، ہر صدا اُن سے ٹکرا کر واپس آجاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہید کردیئے گئے ــ یہ ہے اصل میں مظلومیت کی شہادت۔ اس پہ پردے ڈال دیئے گئے اور افسانے گھڑے گئے۔ پچاس دن کا یہ گھیراؤ (BLOCKADE) کوئی معمولی چیز نہیں پانی تک بند کردیا گیا۔

کربلا کے بارے میں تو محققین ثابت کررہے ہیں کہ ۹ ر سے پہلے وہاں پہنچ ہی نہیں سکتے تھے اور ۱۰ ر کو شہادت ہوگئی۔ اس لئے پانی کی بندش کی کہانیاں من گھڑت ہیں

نیست و نابود ہو چکی تھی۔ اب اور کون سی طاقت رہ گئی تھی جو مزاحم ہو سکتی۔ یہ INTERNAL SABOTAGE ہے جو روکتا ہے اور ایسا روکا ہے کہ آج تک رکا ہوا ہے۔ یہ تو میری اگلی تقریر کا موضوع ہو گا کہ کیسے روکا ہے۔ اس لئے کہ بعد کی تاریخ، تاریخ اسلام نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی تاریخ ہے۔ خلافتِ راشدہ ختم ہو چکی، خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ جو اللہ کے آخری رسول کے مشن کی عالمی سطح پر تکمیل تھی، ختم ہو گئی۔ اگرچہ ہماری تاریخ کا یہ دَور بھی ایسا نہیں ہے کہ ہم اس پر بہت زیادہ شرمندہ ہوں۔ اس دَور میں بھی مسلمانوں نے بڑی اعلیٰ حکومتیں قائم کیں، بڑے اعلیٰ حکمران پیدا کئے۔ تہذیب بھی ہے، تمدّن بھی ہے، علوم بھی ہیں، فنون بھی ہیں۔ بہت اعلیٰ دَور ہے، مملکتوں کے مقابلے میں مملکت، سلطنتوں کے مقابلے میں سلطنت، بادشاہوں کے مقابلے میں بادشاہ۔ اس اعتبار سے بھی تقابل کیجئے تو اس کی بھی نظیر آپ کو نہیں ملے گی۔ لیکن جو چیز ختم ہو گئی وہ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ ہے کہ وہ نظام برپا ہی اس مقصد کے لئے ہوا تھا کہ پیغام رسالت محمّدی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کو پہنچانا ہے۔ یہ ہے اصل غرض و غایت اور مشن خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کا۔ یہ خلافت کہاں ختم ہوئی؟ یہ ایک تاریخی مسئلہ ہے، اختلافی بھی ہو سکتا ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ تیس سال تک خلافتِ راشدہ کا عرصہ ہے۔ اس کو سامنے رکھیئے تو حضرت حسنؓ کی خلافت کے خاتمے پر وہ وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے خُلفائے راشدین یہ ہوئے: حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ۔ لیکن صحاح ستّہ ہی میں ایک اور روایت بھی ملتی ہے کہ جس میں بارہ خلفاء کا ذکر ہے اور ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ "کُلّھم مِن قُریشٍ"۔ کہ یہ امر بارہ خلفاء تک جاری رہے گا۔ جنہوں نے یہ تعداد بتائی ہے وہ اسے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تک لے جاتے ہیں۔ اس دَور میں حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ، بلکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تک بنو اُمیّہ کا پورا ابتدائی دَور بھی آجاتا ہے۔ بہر حال یہ وہ بات ہے جو امام الہند شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے کہی۔ اور وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ وقیع اور مدلّل ہے۔

یہاں پر کہنا پڑے گا کہ خلیفۂ راشد کی اپنی ذات اور اس نظام کو جو قائم ہے، دونوں کو جُدا جُدا کر کے سوچنا پڑے گا۔ اپنی ذات کے اعتبار سے تو حضرت امیر معاویہؓ

جگہ حضرت فاطمہؓ کو دے دی گئی اور اس طرح تثلیث مکمل ہو گئی۔ آخری دن جب حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت ہوئی ہے، بیس غلام اُن کی ملکیت میں تھے۔ ان سب کو بلا کر کہا کہ تم سب آزاد ہو۔ ساری عمر کبھی شلوار نہیں پہنی تھی۔ اب شلوار منگوائی مبادا شہادت کے وقت ستر کھل جائے۔ حیا کا یہ عالم تھا۔ پھر اس شلوار کو کس کر باندھا اور اس طرح شہید ہونے کے لئے پوری طرح تیار ہو گئے۔ یہ تو نہیں کہ اچانک حادثہ ہو گیا ہو۔ روزہ رکھا ہوا ہے، قرآن مجید پڑھ رہے ہیں، فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ط پر پہنچے تھے کہ شہید ہوئے، اِن الفاظ پر خون گرا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے جو فرمایا تھا وہ سچا ثابت ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد چوراسی ہزار مسلمان تلواروں، نیزوں، اور تیروں کا شکار ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پورا عہدِ خلافت خانہ جنگی کی نذر ہو گیا۔۔۔!!

حضرت حسنؓ کا ایک بہت پیارا خواب ہے۔ حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت ہے حضرتِ حسنؓ نے اپنا خواب بیان کیا کہ میں نے رات خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر متمکن ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عرش کا ایک پایہ تھامے کھڑے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آتے ہیں اور حضورؐ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، حضرت عمر فاروقؓ آتے ہیں اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس حال میں اچانک حضرت عثمان ذوالنورینؓ حاضر ہوتے ہیں، اُن کا کٹا ہوا سر اُن کے ہاتھوں میں ہے اور وہ فریاد کرتے ہوئے آتے ہیں کہ اے اللہ! اپنے رسولؐ کی اُمت سے پوچھ! اِس نے کس جرم کی پاداش میں مجھے شہید کیا:۔ "بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ!" (میں کس گناہ کی پاداش میں قتل کیا گیا ہوں؟) اس پر عرشِ الٰہی تھرّاتا ہے اور زمین کی طرف خون کے دو پرنالے جاری ہو جاتے ہیں۔ خون کے یہ دو پرنالے جنگِ صفین اور جنگِ جمل ہیں جن میں مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کا خون بہا۔ نتیجہ کیا نکلا؟ اس کو اس CONTEXT. میں سمجھئے جسے علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: ع "تھمتا نہ تھا کسی سے سَیلِ رواں ہمارا!"۔ چنانچہ اب وہ سیلِ رواں تھم گیا۔۔۔ کوئی بیرونی قوّت اسے روکنے والی نہ تھی، اسے INTERNAL SABOTAGE نے روکا۔ باہر سے کون روک سکتا تھا۔ سلطنتِ روما کی ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں، سلطنتِ کسریٰ

نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ ایک پورا علاقہ اور پورے کے پورے ممالک ان کی بیعت سے خالی ہیں۔ تو یہ جو اُمّت کا جمع ہو جاتا ہے، وہ موجود نہیں۔ لیکن اس کا کوئی الزام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات پر نہیں ہے۔ نعوذ باللہ من ذالك ثم نعوذ باللہ من ذالك۔ ردِّ عمل کے طور پر ہمارے ہاں ایک خیال پیدا ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں کچھ لوگوں کو حضرت علی رض سے بغض ہو گیا ہے۔ گو یہ ردِّ عمل کے طور پر لیکن یہ صورتِ حال بہت خطرناک ہے۔ یہ بھی یہودیت کا شاخسانہ ہے، یہ دو دھاری تلوار ہے دیکھئے غور کیجئے! اگر حضرت عثمان رض کے بارے میں بدظن ہیں تو بھی اُن کے پوبارہ اور اگر حضرت علی رض سے بدظن ہوئے تو بھی ان کے پوبارہ، انہیں کوئی گھاٹا نہیں۔ گھاٹا دونوں اعتبارات سے اُمّتِ مسلمہ کا ہے۔ حقیقت میں وہ بھی اُمّتِ مسلمہ کے گلِ سرسبد ہیں اور یہ بھی اُمّتِ مسلمہ کے گلِ سرسبد ہیں۔ یہ بھی تربیتِ محمدی کے شاہکار ہیں اور وہ بھی تعلیم و تزکیۂ محمدی کے شاہکار ہیں۔ انہیں مجروح کرتے ہو تب بھی محمد ص کی نبوت پر حرف آتا ہے اور انہیں مجروح کرتے ہو تب بھی رسالتِ محمدی پہ بار پڑا۔ گویا کہ ان کی دونوں طرف سے جیت ہو رہی ہے۔ یہ ہے وہ کیفیت ع

"کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!"

یہ دو دھاری تلوار ہے جس سے ہم مارے جا رہے ہیں۔ معتدل رائے یہی ہے کہ جو منافشات ہوئے ان میں کسی بدنیتی کا کوئی دخل نہیں۔ صرف غیروں کا ڈالا ہوا پیچ تھا جو اس عیاری کے ساتھ ڈالا گیا کہ انتہائی خلوص کے باوجود حل نہیں ہوا۔ لیکن الزام نہ حضرت عثمان رض پر آتا ہے نہ حضرت علی رض پر، نہ حضرت معاویہ رض پر نہ حضرت عمرو بن العاص رض پر اور نہ حضرت عائشہ صدیقہ رض پر، کیونکہ "الصحابة کلهم عدول!" پیچیدگیاں واقعتاً پڑی ہیں مگر ڈالی اغیار نے ہیں اور اس طرح ڈالی ہیں کہ ان کا حل ممکن نہ ہوا۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ حضرت علی رض اور حضرت معاویہ رض کے باہمی اختلاف کے بارے میں اہلِ سنت کا تقریباً اجماع ہے کہ حضرت معاویہ رض کی غلطی تھی لیکن غلطی اور بات ہے اور بدنیتی اور بات۔ ان دونوں کو بالکل ایک دوسرے سے جدا رکھیں۔ ہمارا موقف یہ ہے، اچھی طرح سمجھ لیں کہ نبی کے سوا معصوم کوئی نہیں ہوتا۔ خطا ہو سکتی ہے، غلطی ہو سکتی ہے۔ وہ غلطی ابوبکر رض سے بھی ہو سکتی ہے، عمر رض سے بھی ہو سکتی ہے،

بھی صحابی ہیں: " والصحابة کلھم عدول !"[۲] ان کے بارے میں کسی بدنیتی کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ اگر کسی کو ہے تو اس کا ایمان سلامت نہیں ہے۔ حضرت عمرو بن العاص یا حضرت ابو موسیٰ اشعری کے متعلق جسے بدنیتی کا شبہ ہے وہ ایمان کی خیر منائے، انفرادی سطح پر حضرت علیؓ کا کیا کہنا، ہمارے نزدیک بھی تین افراد کے سوا پوری اُمّتِ مسلمہ میں افضل ترین انسان ہیں۔ سوچئے تو سہی! کوئی لمبا چوڑا فرق تو نہیں۔ ہمارے نزدیک بھی افضل ترین ہیں سوائے تین افراد ___ ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ کے۔ ان کے بعد حضرت علیؓ پوری اُمّت میں افضل ترین انسان ہیں۔ کوئی شخص آپ کو ایسا نہیں ملے گا جو امیر معاویہؓ کو حضرت علیؓ سے افضل سمجھتا ہو، ناممکن ہے، قرآنی نصوص کے خلاف ہے: (سورۃ الحدید آیت ۱۰)

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

نہیں برابر تم میں سے وہ شخص کہ جس نے خرچ کیا تھا پہلے فتح مکّہ سے اور لڑائی کی تھی۔ یہ لوگ بڑے ہیں درجوں میں ان لوگوں کہ خرچ کیا انہوں نے پیچھے اس سے اور لڑائی کی اور ہر ایک کو وعدہ دیا ہے اللہ نے اچھا اور اللہ ساتھ اس چیز کے کہ کرتے ہو تم خبردار ہے!

قرآن مجید کی صریح نص ہے۔ لیکن حضرت معاویہؓ یا حضرت عمرو بن العاص کے بارے میں بد دیانتی کا کوئی شائبہ نہیں ورنہ اس کی زد پڑے گی محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر، تو جب ان دونوں چیزوں ___ خلیفۂ راشد کی ذات اور اُس کے عہد میں قائم نظام کو جدا کریں گے تو ایک عجیب بات سامنے آتی ہے۔ خلافتِ راشدہ ختم ہو گئی شہادت حضرت عثمانؓ پر۔ اُن کے بعد خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کی خلافت کا ساڑھے چار سالہ دور باہمی خانہ جنگی کا دور ہے۔ اس محمدی مشن میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ایک انچ زمین حدودِ بلادِ اسلامیہ میں شامل نہیں ہوئی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

دوسری بڑی حقیقت جس کو شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے بیان کیا ہے یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ کی اوّلین خصوصیت اُمّتِ مسلمہ کا مجتمع رہنا۔ مگر حضرت علیؓ کے پورے دورِ خلافت میں اُمّت یکجا نہ ہو سکی، باہم بٹی رہی۔ حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاص

مختصر روداد

ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس

ازقلم :- قاضی عبدالقادر

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس ۱۸ ر تا ۲۱ ر اپریل ۱۹۸۰ء لاہور میں منعقد ہوئی - ۱۸ ر تا ۲۰ ر اپریل تین روز کے اجلاس شہر کے مرکزی مقام جناح ہال (سابق ٹاؤن ہال) میں اور ۲۱ ر اپریل کے اجلاس قرآن اکیڈمی (ماڈل ٹاؤن) میں منعقد ہوئے - پہلی سالانہ قرآن کانفرنس دسمبر ۱۹۷۳ء میں اور دوسری تیسری اور چوتھی کانفرنسیں بالترتیب ۱۹۷۵ء، ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۷ء میں لاہور میں جناح ہال ہی میں منعقد ہوئی تھیں - لیکن پانچویں اور چھٹی کانفرنسوں کا انعقاد ۱۹۷۸ء اور ۱۹۷۹ء میں کراچی کے آئی - بی - اے ہال میں ہوا تھا - یہ ہے مختصر تاریخ ان سالانہ قرآن کانفرنسوں کی جنھوں نے ملک کی دینی اور سماجی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل کرلیا ہے - مقصد ان کانفرنسوں کا یہ رہا ہے کہ ایک طرف قرآن حکیم کے اعجاز اور اس کی عظمت کا بیان کیا جائے اور دوسری جانب عصرِ حاضر کے اقتصادی، معاشرتی، سیاسی، قانونی، دستوری، ثقافتی اور تہذیبی مسائل کا قرآنِ حکیم کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے اور اُن کا حل تلاش کیا جائے - ہم اللہ تعالیٰ کا شکر بجالاتے ہیں کہ ہم نے ان قرآن کانفرنسوں کے ذریعے مختلف مکاتبِ فکر کے علماء و فضلاء اور ملک کے چوٹی کے اہلِ علم اور دانشور حضرات کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا - اس لئے کہ قرآنِ حکیم ہی وہ حبل اللہ ہے جو نہ صرف ہمارے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے بلکہ وہ اتحاد کا ایک بہت بڑا ذریعہ بھی ہے - اللہ تعالیٰ ہم سب کو حبل اللہ سے اعتصام کی توفیق عطا فرمائے - آمین

عثمان رضؓ سے بھی ہو سکتی ہے، حضرت علیؓ سے بھی ہو سکتی ہے، حضرت معاویہؓ سے بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن اجتہادی غلطی پر بھی اجر ملتا ہے۔ نیک نیّتی سے آپ نے ایک فیصلہ کیا اگرچہ غلط ہو گیا مگر اس میں نیّت کے اخلاص پر بھی اجر ہے۔ یہ ہے اہلِ سُنّت کا موقف اس اعتبار سے اُن کے اور اہلِ تشیّع کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُن کے نزدیک حضرت علیؓ حق پر تھے اور معصوم تھے اور معصوم کے مقابلے میں جو آیا وہ ... . میں تو وہ الفاظ زبان پر بھی نہیں لانا چاہتا۔ لیکن ان کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا تو اسلام بھی معتبر نہیں ـــ اہلِ سُنّت کا موقف بالکل اور ہے۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ معصوم نہیں، خطا اُن سے بھی ہو سکتی تھی، خطا ان سے بھی ہو سکتی تھی۔ اس پہلو سے اگر کوئی کہتا ہے کہ خطا حضرت معاویہؓ کی تھی، اگرچہ بدنیّتی نہ تھی تو اس میں کوئی ہرج نہیں اور اگر کوئی کہے کہ نہیں غلطی حضرت علیؓ کی تھی۔ تو وہ FACE VALUE پر اور FACTS کی بنیاد پر کہہ سکتا ہے۔ کیونکہ معصومیّت نہ اِدھر حائل ہے نہ اُدھر (میں صرف دو منٹ اور لے رہا ہوں! وقت بہت ہو گیا!) پھر ایسا تھا کہ حضرت علی کا فرمان یہ تھا کہ معاویہ! پہلے تم بیعت کرو، پھر میں قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لے لوں گا۔ آپ بتائیں اس میں کیا غلطی ہے؟ حضرت معاویہؓ کو نظر یہ آرہا ہے، ـــ وہ یہ DEFACTO SITUATION دیکھ رہے ہیں کہ قاتلینِ عثمان اس وقت حضرت علی پر چھائے ہوئے ہیں۔ جوں ہی میں نے بیعت کی، میری گردن تو سلامت نہیں رہے گی۔ آگے قاتلینِ عثمان پر کچھ ہوتا ہے یا نہیں؟ مجھے نظر نہیں آتا۔ یہ بھی FACT ہے۔ یہ ہے وہ چکّر ـــ کیا کریں۔ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا جو صورتِ حال ہے اُس کو BLAME کیجئے۔ نہ حضرت علی کو کیجئے نہ حضرت عثمان کو اور نہ حضرت معاویہ کو۔ اعداء کا ڈالا ہوا پھیر اور پھندا ایسا تھا جو حل نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ایک قوم اور ایک بہت بڑی نامزد مملکت کے اعتبار سے، تاریخ کا آغاز ہو گیا۔ اب اس اعتبار خلافتِ راشدہ سے تنسیخ خلافت تک جو اس صدی کے آغاز میں ہوئی، کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر اِن شاء اللہ اگلی جمعرات کو گفتگو ہو گی ÷

اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی و لکم و لسائر المسلمین و المسلمات

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ۞

اس کانفرنس کی ایک خصوصی بات یہ تھی کہ علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب نے نہ صرف کانفرنس کے لئے اپنا پیغام ارسال فرمایا بلکہ یونیورسٹی کی جانب سے کانفرنس میں شرکت کے لئے مندوب بھی بھیجے۔ چنانچہ جو حضرات علی گڈھ سے تشریف لائے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ① پروفیسر اختر الواسع صاحب شعبۂ اسلامیات اور ② ڈاکٹر عبد الغفّار شکیل صاحب شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ناظم دینیات مولانا محمّد تقی امینی صاحب جو برِّ صغیر کے ممتاز عالمِ دین اور بلند پایہ مصنّف ہیں، کو بھی یونیورسٹی کے مندوب کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کرنا تھی اور وہ اس کے لئے بہت مشتاق بھی تھے، ان کے پاسپورٹ اور ویزا کے مرحلے بھی بہت کم وقت میں طے ہوگئے۔ انہیں اور ڈاکٹر شکیل صاحب کو علی گڈھ سے ایک ہی ریل گاڑی میں سوار ہونا تھا۔ اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ڈاکٹر شکیل صاحب گاڑی کے آنے سے کافی قبل اسٹیشن پہنچ گئے۔ گاڑی آئی وہ مع سامان سوار بھی ہوگئے لیکن انتظارِ بسیار کے باوجود ان کے بقول مولانا محمد تقی امینی صاحب اسٹیشن نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ وہ مع سامان کے گاڑی سے اُتر گئے ـــــ مولانا امینی صاحب ٹھیک وقت پر اسٹیشن پہنچے۔ چلتی گاڑی میں سوار ہوگئے۔ یہ سمجھ کر کہ ڈاکٹر شکیل صاحب بھی گاڑی میں کہیں نہ کہیں موجود ہی ہوں گے۔ دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر ملاقات ہو ہی جائے گی۔ اب ڈاکٹر شکیل صاحب مولانا کا انتظار علی گڈھ اسٹیشن پر کررہے ہیں اور مولانا تقی امینی صاحب دہلی کے اسٹیشن پر اترتے ہوئے مسافروں میں ڈاکٹر صاحب کو تلاش کررہے ہیں ـــ مایوس ہوکر ڈاکٹر شکیل صاحب دوسری گاڑی سے علی گڈھ سے دہلی روانہ ہوئے اور مولانا تقی امینی صاحب دہلی سے علی گڈھ؛ اور یوں ڈاکٹر عبد الغفّار شکیل صاحب لاہور پہنچ گئے اور مولانا تقی امینی صاحب جہاں سے چلے تھے وہیں واپس یعنی علی گڈھ ـــ اس لئے کہ مولانا اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے پیش نظر دہلی سے لاہور تک کا سفر تنہا کرنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔ سفر سے اسی طبعی عدم مناسبت کے باعث مولانا دیوبند کے صد سالہ اجلاس میں بھی شرکت نہ

اس سال بعض وجوہات کی بنا پر قرآن کانفرنس کی تاریخیں کئی بار تبدیل کی گئیں مرکزی انجمن خدام القرآن کی مجلسِ منتظمہ نے اپنے اوّلین فیصلہ میں اس کی تاریخیں ۲۱ر تا ۲۳ر مارچ مقرر کیں ۔ کیونکہ اس سے قبل عام طور پر یہ کانفرنس مارچ ہی کے مہینہ میں منعقد کی جاتی رہی ہے ۔ لیکن جب یہ پتہ چلا کہ یہی تاریخیں دارالعلوم دیوبند کے جشنِ صد سالہ کی ہیں اور پاکستان کے بہت سے علماء و فضلاء اس میں شرکت کے لیئے جائیں گے تو تاریخیں تھوڑی سی آگے بڑھا دی گئیں یعنی ۲۳ر تا ۲۷ر مارچ ، اور اس کا اعلان بھی 'میثاق' میں شائع کر دیا گیا ۔ ابھی یہ اعلان شائع ہوا ہی تھا کہ صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو جشن دیوبند میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا اور بعض حضرات کی جانب سے اصرار بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب اس میں ضرور شرکت فرمائیں ۔ چنانچہ کانفرنس کی تاریخیں مزید آگے بڑھا کر ۴ر تا ۹ر اپریل کر دی گئیں اور اس کا اعلان بھی بذریعہ اخبارات کر دیا گیا ۔ لیکن ایک مرتبہ پھر " عرفت ربّی بفسخ العزائم " والا معاملہ ہوا ۔ کسی نے بتایا کہ یکم تا ۱۰ر اپریل یونیورسٹی کی تعطیلات ہیں ، اور چونکہ ایک روز کے اجلاس قرآن اکیڈمی میں منعقد ہونے تھے اور ان میں نیو کیمپس کے قریب ہونے کی وجہ سے طلباء اور اساتذہ کی شرکت متوقع تھی اس لئے تاریخیں مزید بڑھا دی گئیں ۔ یعنی ۱۸ر تا ۲۱ر اپریل اور الحمد للہ ثمّ الحمد للہ کہ کانفرنس ان تاریخوں میں منعقد ہو گئی اور مزید آگے سرکنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔

اجلاس کی تقسیم یوں رکھی گئی تھی کہ ۱۸ر اپریل بروز جمعہ پہلا اجلاس جناح ہال میں صبح ۹ بجے ، دوسرا اجلاس بعد نمازِ عصر اور تیسرا اجلاس بعد نمازِ مغرب ۱۹ر اپریل کو دو اجلاس ، پہلا عصر تا مغرب اور دوسرا بعد مغرب ۔ ۲۰ر اپریل کو صرف ایک اجلاس بعد نمازِ مغرب ۔ ۲۱ر اپریل کو قرآن اکیڈمی میں دو اجلاس پہلا ۸½ تا ۱۰ بجے صبح اور دوسرا ۱۰½ تا ۱ بجے دوپہر ۔ قرآن اکیڈمی ہی میں بعد نمازِ مغرب حُسنِ سماعت (محفلِ سماعِ مسنون یعنی قراءتِ قرآنِ حکیم) اور حُسنِ بصارت (سورۂ رحمٰن کے مناظر کی فلم) کے پروگرام ۔

قرآن کانفرنس میں شرکت کے لیئے جہاں پنجاب کے مختلف شہروں سے لوگ آئے وہاں تقریباً دو درجن افراد پر مشتمل ایک قافلہ کراچی سے بھی شریک ہوا

میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اب قرآن کی تعلیمات کو عام کرنے، اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات ختم کرنے میں صرف کروں گا!"

اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد اس نبّاضِ فطرت نے ہمیں جو رہنمائی دی، "قرآن کانفرنس" کے نام وہی میرا پیغام ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ — یہ کانفرنس نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ کامیاب ہو۔ آمین — !!"

اس اجلاس کی صدارت کے لئے پیر کرم شاہ صاحب بھیروی (جامعہ ازہر) کو دعوت دی گئی تھی۔ لیکن موصوف نے معذوری کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ حافظ نذر احمد صاحب پرنسپل شبلی کالج و مہتمم ادارۂ تعلیم القرآن (بذریعہ خط و کتابت) کو زحمت دی گئی جس کا اعلان بھی ایک روز قبل بذریعہ اخبارات کر دیا گیا تھا۔ مقامی اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات حسبِ سابق پاکستان اسٹیٹ آئل کمپنی لمیٹڈ کی جانب سے شائع ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ادارہ کے منتظمین کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین — !!

حافظ نذر احمد صاحب کی زیرِ صدارت اس اجلاس میں سب سے پہلے پروفیسر اختر الواسع صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ اُن کے بعد ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ موصوف نے ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کی ہے اور کانفرنس میں شرکت کے لئے کینیڈا سے تشریف لائے تھے۔ آپ نے مولانا منتخب الحق صاحب کے افادات پر مشتمل "صداقتِ قرآن" کے موضوع پر خطاب کیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے "عظمتِ قرآن بزبانِ قرآن!" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے "قرآنِ مہجور" کے عنوان سے مقالہ پیش فرمایا۔ ان کے بعد پروفیسر مرزا محمد منور صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور "عظمتِ قرآن بزبانِ اقبال" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ حافظ نذر احمد صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد پہلا اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

فرما سکے تھے ۔۔۔ بہرحال ہماری آنکھیں مولانا محترم کی لاہور میں ایک جھلک دیکھنے کے لئے ترستی ہی رہیں۔

اب آپ کی خدمت میں کانفرنس کے پروگرام کی مختصر الفاظ میں رُوداد پیش کی جاتی ہے۔

۱۸ اپریل | پہلا اجلاس صبح ۹ بجے جناح ہال میں منعقد ہوا۔ جس کا موضوع تھا "عظمتِ قرآن" قاری عبدالقیوم صاحب کی تلاوتِ کلامِ پاک سے کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے افتتاحی کلمات کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مندوب پروفیسر اختر الواسع تشریف لائے۔ آپ نے شروع میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے علی گڑھ کے چند روزہ قیام کے دوران کس طرح اپنی قرآنی فکر سے وہاں کے اہلِ علم طبقے کو متاثر کیا۔ انہوں نے کہا علی گڑھ ہر وقت ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہے۔ بعد ازاں انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر محمد شفیع صاحب کا وہ پیغام پڑھ کر سنایا جو موصوف نے ان کے ہاتھ ارسال فرمایا تھا۔ پیغام کا متن حسبِ ذیل ہے:

"آج مسلمان جن خطرات سے دوچار ہیں وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ ان خطرات سے بچنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچی جارہی ہیں لیکن سب سے زیادہ ملتِ اسلامیہ کے مزاج کے مطابق وہی تدبیر ہے جس کی طرف یہ کانفرنس لوگوں کو متوجہ کر رہی ہے یعنی قرآن پڑھنا، سمجھنا اور اس پر عمل کرنا۔

قرآن اللہ کی کتاب ہے اس کی عظمت و بلندی کے لئے اللہ کی طرف اس کی یہ نسبت کافی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ملتِ اسلامیہ نے جو کچھ پایا اس کی بدولت پایا اور جو کھویا اس کو چھوڑنے کی وجہ سے کھویا۔ یہ زندگی کا سرچشمہ ہے، ملت کی تقدیر اس میں پوشیدہ ہے۔ اس موقع پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کی وہ بات ضرور یاد دلاؤں گا جو انہوں نے مالٹا کی قید سے واپس آکر علماء کے اجتماع میں فرمائی تھی، وہ یہ کہ:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا

آنا تھا، لیکن وہ بھی شرکت نہ کر سکے جس کی وجوہات اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اپنے گراں قدر مقالہ کی ایک نقل موصوف نے ہمیں بھیج دی تھی۔ اس لئے ان کا مقالہ پروفیسر اختر الواسع صاحب (مندوب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) نے پڑھ کر سنایا۔ مقالہ کا عنوان تھا: "قرآن کا دستورِ اساسی"۔ ان کے بعد حافظ عبدالرحمٰن المدنی نے "اسلامی ریاست اور مسئلہ حاکمیت" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ تقریر نہایت علمی تھی لیکن اس میں پیش کردہ خیالات سے کچھ مغالطے لاحق ہو سکتے تھے۔ چنانچہ حافظ عبدالرحمٰن مدنی کی تقریر کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مالک سنبھالا اور اپنی مختصر تقریر میں ان باتوں کی وضاحت فرمائی جو حافظ صاحب کی تقریر میں اجمالاً بیان کی گئی تھیں اور جن سے مغالطے لاحق ہو سکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے بعد موصوف کی تحسین اور تصویب سے پشاور ہائی کورٹ کے جج جسٹس کریم اللہ دُرّانی نے اپنی تقریر کا آغاز فرمایا۔ آپ کی تقریر بہت دلچسپی کے ساتھ سنی گئی۔ تقریر میں دینی لگاؤ اور خلوص کی چاشنی کا عنصر اتنا نمایاں تھا کہ لوگ چاہتے تھے کہ تقریر سنتے ہی رہیں۔ لیکن گیارہ بجے کی فلائٹ سے چونکہ صاحبِ صدر کو واپس کراچی جانا تھا اس لئے جسٹس دُرّانی کو اس عذر پر تقریر ختم کرنا پڑی کہ دوسرے دن بھی وہ خطاب فرمائیں گے۔ جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد آج کے اجلاس کا اختتام ہوا۔

۱۹ اپریل ۱۹۸۰ء (بروز ہفتہ) اجلاس اوّل بعد نمازِ عصر تا نمازِ مغرب منعقد ہوا۔ اس کا موضوع تھا: "معاشی و اقتصادی مسائل اور قرآن حکیم"۔ اور کرسئ صدارت پر رونق افروز تھے جناب ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی۔ قرآن اکیڈمی کے مولانا محمد حسین صاحب میر نے اپنا مقالہ: "قرآن حکیم اور محروم طبقات" پڑھا۔ بعد ازاں جسٹس کریم اللہ دُرّانی صاحب نے تقریر ارشاد فرمائی۔ درمیان میں مغرب کا وقت آ گیا۔ چنانچہ نمازِ مغرب کے بعد قاری محمد عارف کی تلاوت کے بعد اجلاس اوّل کے صاحبِ صدر جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جس کے بعد دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس کا موضوع تھا "قومی و ملی مسائل اور قرآن حکیم"۔ تھا اور اس کی صدارت جناب ڈاکٹر سلیم فارانی سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور نے فرمائی۔ ڈاکٹر عبدالرؤف ڈائریکٹر ٹیکنیکل السنہ کمیشن

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حسبِ معمول خطبۂ جمعہ مسجد دار السلام (باغِ جناح) میں ارشاد فرمایا۔ خطبہ کا موضوع موقع کی مناسبت سے "عظمت و اعجازِ قرآنِ حکیم" تھا۔

دوسرا اجلاس بعد نمازِ عصر جناح ہال میں شروع ہوا جس کی صدارت جناب ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب شعبۂ علومِ اسلامی جامعہ پنجاب نے فرمائی۔ اسٹیج سیکرٹری کے فرائض ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری صاحب نے انجام دیئے۔ صبح کے اجلاس کے لئے مولانا سید حامد میاں مدظلہ کا نام بھی تھا لیکن موصوف تشریف نہ لا سکے تھے، البتہ اپنا مقالہ "عظمتِ قرآن بزبانِ رسالتمآب ﷺ" بھیج دیا تھا۔ پہلے اجلاس میں اس کو پڑھ کر سنانے کا وقت نہ مل سکا۔ چنانچہ دوسرے اجلاس میں اس مقالہ کو قرآن اکیڈمی کے مولانا محمد حسین میر صاحب نے پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد صاحبِ صدر نے "قرآنِ حکیم اور مستشرقین" کے موضوع پر اپنا مقالہ پیش فرمایا اور مغرب کی نماز کے وقت اس اجلاس کی کارروائی ختم ہو گئی۔

مغرب کی نماز با جماعت جناح ہال کے لان میں پڑھی گئی۔ امامت کے فرائض ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے انجام دیئے۔ نماز کے فوراً بعد آج کے دن کے تیسرے اجلاس کی کارروائی شروع ہو گئی۔

ممتاز محقق اور قانون دان جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب جج سندھ ہائی کورٹ جو کراچی سے تشریف لائے تھے، کرسیٔ صدارت پر رونق افروز تھے۔ شریکِ صدارت جناب جسٹس (ریٹائرڈ) قاضی محمد گل صاحب تھے۔ پشاور ہائی کورٹ کے جج جسٹس کریم اللہ دُرّانی صاحب بھی شریکِ اجلاس تھے۔ اس نشست کا موضوع تھا: "اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کے تقاضے"۔ کراچی کے ممتاز قانون دان جناب خالد اسحاق کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ لیکن کسی وجہ سے موصوف تشریف نہیں لا سکے۔ انہیں چند روز قبل ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن جانا تھا، ہو سکتا ہے وہاں ان کی مصروفیت کچھ بڑھ گئی ہو۔ مولانا محمد تقی امینی صاحب ناظم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بھی کانفرنس میں شرکت کے لئے علی گڑھ سے

کے مشترکہ اجلاس کی صدارت ڈاکٹر بشیر احمد صاحب صدیقی نے فرمائی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری صاحب نے ترکی کے سابق نائب وزیر اعظم اور وہاں کی ملی سلامت پارٹی کے صدر جناب نجم الدین اربکان صاحب کا وہ پیغام پڑھ کر سنایا جو آج ہی بذریعہ تار موصول ہوا تھا۔ پیغام کا متن حسبِ ذیل ہے :

" میں آپ کو ۱۹۷۳ء سے تا حال قرآن کانفرنسوں کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ کو ان مساعی جمیلہ میں کما حقہ، کامیابی حاصل ہو۔ اس لئے کہ آپ کی یہ کوششیں قرآن مجید کے ضمن میں امتِ مسلمہ کے سوا ارب افراد کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کا اتحاد یقیناً اہم ترین شے ہے۔ میں دُعا گو ہوں کہ اس کانفرنس سے عالمِ اسلام کے مستقبل کے لئے مفید نتائج برآمد ہوں، اور میں ان تمام برادرانِ اسلام کو جو اس کانفرنس میں شریک ہو رہے ہیں سلام مع تہنیت و اکرام پیش کرتا ہوں۔

● کراچی سے تشریف لائے ہوئے پندرہ روزہ "یقین انٹرنیشنل" کے ایڈیٹر جناب خلیق احمد صاحب نے : "تعلیم قرآن اور علم و عمل کی ہم آہنگی !" کے عنوان سے اپنا مقالہ پیش فرمایا۔ ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے : " قرآن اور سائنس" کے موضوع پر مقالہ پڑھ کر سنایا۔ ڈاکٹر ابوبکر صدر شعبۂ علم الحیوانات جامعہ پنجاب نے اپنا مقالہ بعنوان : "نسلِ انسانی اور تقسیمِ شعوب و قبائل جدید تحقیقات کی روشنی میں !" پیش فرمایا۔ ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم کی ایک تحریر " سائنسی علوم میں ہماری موجودہ درسی کتابوں کے نقائص !" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نہ صرف پڑھ کر سنائی بلکہ ساتھ ہی اس کی تفہیم بھی پیش فرماتے رہے۔ یہ تحریر دو ورقہ کی صورت میں چھپوا کر اجلاس میں تقسیم کی گئی۔ بعد ازاں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے اپنا تقریر نما مقالہ یا مقالہ نما تقریر "اسلام کے خلاف ہندو مت کا مدافعانہ ردِّ عمل : بھگتی تحریک" کے عنوان سے ارشاد فرمائی۔ چشتی صاحب کی تقریر کیا ہوتی ہے کہ لوگ بس جھوم جھوم جاتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ سنتے ہی رہیں۔ آخر میں ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد آج کے اجلاس کی کارروائی ختم ہوئی۔

۱۲ اپریل (بروز پیر) | آخری دن کے یہ اجلاس حسبِ اعلان قرآن

اپنا مقالہ بعنوان: "درسِ قرآن اور تعمیر حیات!" پڑھا۔ بعد ازاں خواجہ غلام صادق صاحب چیئرمین ثانوی تعلیمی بورڈ لاہور نے اپنا مقالہ بعنوان: "قرآنی تعلیمات اور ہم!" پڑھ کر سنایا۔ پروفیسر بختیار حسین صدیقی (گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن) خود تو تشریف نہ لا سکے البتہ ان کا مقالہ بعنوان: "اسلام کا طریق تعلیم!" آگیا تھا لیکن وقت کی کمی کے باعث سنایا نہ جا سکا۔ ان شاء اللہ العزیز 'میثاق' میں شائع ہو گا۔

ساہیوال کے پروفیسر عبدالمنان نے: "قرآن حکیم اور فلاحِ انسانی!" کے موضوع پر تقریر ارشاد فرمائی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مندوب پروفیسر اختر الواسع نے مقالہ پیش فرمایا، عنوان تھا: "قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!" پروفیسر اختر الواسع صاحب جب تک لاہور نہیں آئے تھے تو 'میثاق' میں ان کا خط پڑھ کر بعض دوستوں کا خیال تھا کہ وہ کوئی ضعیف العمر شخصیت یا کم از کم ادھیڑ عمر کے تو ہوں گے لیکن جب وہ یہاں تشریف لائے تو ان دوستوں کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ تو صرف ایک نوجوان ہیں بلکہ ملّت کے مسائل پر سوچنے والا ذہن اور ایک دردمند دل رکھتے ہیں اسی لئے اُن کا مقالہ ان کی خصوصی جذباتی آواز میں بہت پسند کیا گیا۔ ہندوستان میں قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے ہمیں ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ اجلاس کے آخر میں ڈاکٹر سلیم فارانی صاحب نے خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا۔ عنوان تھا: "وراثتِ نبوی ﷺ کی روشنی میں کیفیتِ ملّی کا جائزہ!"

۲۰ اپریل (بروز اتوار) آج اعلان کے مطابق دو اجلاس منعقد ہونے تھے۔ پہلا بعد نماز عصر جس کا موضوع تھا: "قرآن اور سائنس!" اور دوسرا بعد نماز مغرب "فلسفہ و حکمت کے مسائل اور قرآنِ حکیم!" کے موضوع پر۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ان دونوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا۔ اب موضوع تھا: "فلسفہ اور سائنس کے مسائل اور قرآنِ حکیم!" اور آج کا یہ واحد اجلاس بعد نمازِ مغرب شروع ہوا۔ پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خیرات محمد ابن رسا وائس چانسلر جامعہ پنجاب کو کرنا تھی، لیکن وہ اسلام آباد گئے ہوئے تھے اور مصروفیات کی وجہ سے واپس نہیں آ سکے تھے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت بلدیہ حیدرآباد (سندھ) کے میئر اور جامعہ اسلامیہ حیدرآباد کے مہتمم مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب کو کرنا تھی لیکن ان کا ٹیلیگرام آگیا تھا کہ اچانک مصروفیت کی بنا پر وہ شریک نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ آج

اُن کے نام حسب ذیل ہیں :
قاری محمد آصف، قاری محمد عارف، قاری محمد قاسم، قاری محمد احسان الحق، قاری محمد اسلم، قاری مراتب علی، قاری محمد ادریس اور ننھے قاری آصف حمید (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے) یہ وہی صاحبزادے ہیں جنھوں نے چند سال پہلے قرآن کانفرنس کے موقع پر کرسیٔ صدارت پر بالجبر قبضہ کر لیا تھا اور وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ اس دفعہ بھی قرآن کانفرنس کے موقع پر ایک موقع ایسا آیا جب یہ حضرت کرسیٔ صدارت پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی فکر میں تھے۔ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے نومولود بھانجے جنابِ منذر کے واسطے۔ لیکن ہائی جیکرز سے نبیٹنے کے لئے وہاں پہلے سے خاصے انتظامات کرلئے گئے تھے۔ اس لئے کرسیٔ صدارت اس بار محفوظ رہی ہاں! جناب قاری آصف حمید نے قرأت کے اجتماع میں اپنی ننھی منی قرأت سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ اسی پروگرام کا دوسرا جُز "حسنِ لبصارت" کے عنوان سے تھا۔ سراپا حسن۔ "حسنِ سماعت اور حسنِ لبصارت"، یعنی حسن ہی حسن۔ حسنِ لبصارت کے عنوان سے محکمۂ اطلاعات حکومتِ سندھ کی تیار کردہ سورۂ رحمٰن کے مناظر پر مشتمل فلم دکھائی گئی۔ قرآن مجید کے قدیم نسخوں پر مبنی حکومتِ سندھ کے محکمۂ اطلاعات کی تیار کردہ ایک نئی فلم "روشن حروف" بھی نمائش کے لئے لائی گئی تھی، اور اسے دکھانا شروع بھی کر دیا گیا تھا لیکن اس کی نمائش اس لئے بند کر دینی پڑی کہ ایک تو اس میں عورتوں کو قرآنِ حکیم پڑھتے دکھایا گیا تھا۔ دوسرے قرآنِ حکیم کے قدیم نسخے دکھاتے ہوئے اور اس پر کمنٹری پیش کرتے ہوئے پس منظر میں میوزک (MUSIC) کی دُھن بجائی گئی تھی۔ یہ چیزیں اس روح پرور اجتماع کے لئے ناقابلِ برداشت تھیں۔ لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ قرآنِ حکیم کے پرانے نسخوں پر مشتمل یہ فلم کیا اِن لغویات کے بغیر تیار نہیں کی جاسکتی تھی؟ کیا عورتوں کو قرآنِ حکیم پڑھتے دکھانا ضروری تھا۔ ؎

آہ! کہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

مقدس سے مقدس محفل میں بھی بغیر عورت کی رُونمائی کے بات نہیں بنتی — یہ ہمارے جذبات کے سفلہ پن کی ایک علامت ہے! — کیا قرآنِ حکیم کے قدیم نسخوں کی کمنٹری کے پس منظر میں میوزک کی دُھن ضروری تھی؟ — کیا کل کو قرآن

اکیڈمی میں منعقد ہوئے۔ قرآن اکیڈمی جس کی تعمیر پر اب تک پندرہ لاکھ روپے سے زائد رقم خرچ ہو چکی ہے، تعمیر کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ امید ہے کہ اس میں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ ان شاء اللہ اسی سال سے شروع ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں ابتدائی تعلیمی اسکیم پر مشتمل ایک دو ورقہ کانفرنس کے شرکاء میں تقسیم کیا گیا۔

ساڑھے آٹھ بجے صبح پہلے اجلاس کا آغاز ہوا جس کی صدارت قرآن اکیڈمی کے مولانا محمد حسین میر صاحب نے کی۔ اس اجلاس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے ڈاکٹر عبد الغفار شکیل صاحب نے اپنا مقالہ "قرآن حکیم کی تدریس میں لسانیات کا دخل" پیش فرمایا۔ جناب پروفیسر حافظ احمد یار صاحب نے "قرآنِ حکیم اور مشاہیرِ عالم" کے عنوان پر اور ڈاکٹر الطاف جاوید صاحب نے "سُنّتِ رسولؐ" کے موضوع پر اپنے مقالات پڑھ کر سنائے۔ نصف گھنٹہ چائے کا وقفہ ہوا، جس کے بعد "علامہ اقبال مرحوم اور قرآنِ حکیم" کے موضوع پر دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ آج یومِ اقبال کی وجہ سے دفاتر وغیرہ میں عام تعطیل تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کے کانووکیشن ہال میں یومِ اقبال پر منعقدہ تقریب میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے آج صبح تقریر ارشاد فرمائی اور قرآن کانفرنس کے دوسرے اجلاس کے شروع ہونے تک واپس قرآن اکیڈمی تشریف لے آئے۔ دوسرے اجلاس میں ڈاکٹر ثناء اللہ انصاری صاحب نے ایک نظم ترنّم میں پڑھ کر سنائی۔ پروفیسر مرزا محمد منوّر صاحب کا مقالہ: "علامہ اقبال اور کتاب زندہ!" آ گیا تھا، لیکن سنایا نہ جا سکا۔ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کے چوہدری مظفر حسین صاحب کا مقالہ "سائنس بطورِ تصوّف" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پڑھ کر سنایا، نیز درمیان میں وضاحتیں فرماتے رہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے "اقبال کا پیغام" کے عنوان سے تقریر ارشاد فرمائی اور اس طرح یہ دوسرا اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

حسبِ اعلان آج شام کو قرآن اکیڈمی ہی میں دو اضافی پروگرام منعقد ہوئے یعنی (۱) محفلِ سماعِ مسنون یعنی استماعِ قراءتِ قرآنِ حکیم جس کی صدارت قاری عبد القیوم صاحب نے کی۔ اس روح پرور اجتماع میں جن قراء حضرات نے حصہ لیا

اجلاس کی کارروائی تلاوتِ کلام پاک سے شروع کی گئی۔ تلاوت ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے کی۔

سب سے پہلے انجمن کے معتمد جناب چوہدری نصیر احمد ورک صاحب نے سابقہ سالانہ اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی جس کی توثیق حاضرین اجلاس نے باتفاق رائے کی۔

میاں محمد رشید صاحب ناظم بیت المال نے سالانہ گوشوارہ مالیات برائے سال مختتمہ ۳۱ دسمبر ۷۹ء پیش کیا۔ یہ گوشوارہ حسب قواعد اندرونی (INTERNAL) اور بیرونی (EXTERNAL) آڈٹ کے بعد مرکزی ریونیو بورڈ کو بھیجا جا چکا ہے، جس کی توثیق بورڈ کی طرف سے کی جا چکی ہے اجلاس عام نے ان حسابات کی منظوری دے دی۔

بعد ازاں صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حاضرین جلسہ سے مختصر خطاب فرمایا۔ انہوں نے وابستگانِ انجمن کے مسلسل تعاون کا شکریہ ادا کیا اور دروسِ قرآن کی ان مجالس کا خاص طور پر ذکر کیا جو بفضلہ تعالیٰ لاہور میں ہر ہفتہ چوبیس مقامات پر منعقد ہو رہی ہیں، اور جن میں ڈاکٹر صاحب کے تربیت یافتہ نوجوان درس دے رہے ہیں۔ صدر مؤسس نے نیپا (NIPA) کے زیر تربیت افسران کے اجتماعات میں اور جی۔ او۔ آر (سرکاری افسران کی رہائشی کالونی علہ) کی جامع مسجد میں ہفتہ وار درس قرآنِ حکیم کا خاص طور پر ذکر کیا جن کے ذریعہ دعوت کا دائرہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ میں بہتر طریق سے پہنچ رہا ہے اور یہ دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ صدر مؤسس نے قرآن اکیڈمی کے آئندہ تعلیمی پروگرام اور دار المقامہ کے قیام جن کے ذریعہ نئی پود کی رہنمائی اور تربیت ملحوظ خاطر ہے، کی طرف بھی اجمالاً روشنی ڈالی۔ آپ نے اپنے پچھلے سال کے امریکہ کینیڈا اور مصر کے دوروں کا بھی ذکر کیا جن کے ذریعہ کام کی نئی راہیں کھلی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس سال بھی ان شاء اللہ ماہِ اگست میں بیرونی دورے پر جانے کا پروگرام ہے کیونکہ امریکہ اور کینیڈا سے شدت سے تقاضا ہو رہا ہے۔

بعد ازاں ملک محمد بشیر صاحب ناظمِ انتخابات نے خفیہ رائے شماری کے

حکیم کی قرأت بھی آپ میوزک کی دُھن کے ساتھ سنائیں گے؟ بتوں سے ایسی محبت ہے تو براہِ کرم بت خانہ تشریف لے جائیے، مسجد کو بتوں سے آلودہ نہ بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی ؛ مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے "روشن حروف" فلم کی نمائش بند کئے دیر ہو چکی تھی مگر میں اپنے خیالات میں گم اور میرے ذہن میں اقبال کا یہ شعر گھوم رہا تھا ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے ؛ شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب

مگر ہائے افسوس! ہم اس شعر کو جھوم جھوم کر تو پڑھتے ہیں مگر عملاً ہماری حالت یہ ہے کہ: طاؤس و رباب اوّل ، طاؤس و رباب آخر!"

قرآن کانفرنس ختم ہو چکی ہے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو رواں دواں ہیں میں بھی اپنے ٹھکانے پر جا رہا ہوں۔ قرآن کی عظمت و اعجاز پر وعظ تو بہت سن لئے۔ مسائلِ حاضرہ کا حل قرآنِ حکیم کی روشنی میں — اس عنوان پر تقاریر اور مقالات تو بہت گوش گذار کر لئے — مگر عملاً میں کہاں ہوں؟ کیا میرے قرآن کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا کوئی جذبہ پیدا ہوا؟ کاش اے کاش! ایسا ہو جائے، تو میں سمجھوں کہ میرے گذرے ہوئے یہ چند دن راتیں میری زندگی کی متاعِ عزیز بن گئیں ؎

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں

گر یہ نہیں تو بابا! وہ سب کہانیاں ہیں

قبروں پر سنگِ مرمر کے شاندار مزار بنا ڈالو، اندر تو گلی سڑی ہڈیوں کے کچھ نہ ملے گا، اور آج کیا ہم سب چلتی پھرتی قبریں نہیں ہیں؟

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا سالانہ اجلاس

۱۸ر تا ۲۱ر اپریل قرآن کانفرنس جاری رہی جس کے فوراً بعد یعنی ۲۲ اپریل کی شام کو حسبِ اعلان قرآن اکیڈمی میں مرکزی انجمن خدام القرآن کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ یہ اجلاس ہر سال مارچ یا اپریل میں منعقد ہوتا ہے اور اس میں ہر دو سال کے بعد مجلسِ منتظمہ کے انتخابات ہوتے ہیں۔

جنابِ م۔ش کا اعترافِ حقیقت

از قلم :۔ قاضی عبدالقادر

یہ رُبع صدی سے زیادہ کی بات ہے: "دو چار برس کی بات نہیں"۔ میرا طالب علمی کا دور تھا اور میں اسلامی جمعیّت طلباء کا رکن تھا۔ جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہمارے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ آج کی جمعیّت والے کیا جانیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب ہی کی فعّال شخصیّت کا اثر تھا کہ پورے ملک میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً جمعیّت نے اُن کے دور ہی میں قدم جمائے اور ایک فعّال تنظیم کی حیثیّت سے ابھری۔

مجھے خوب یاد ہے کہ ان دنوں ہم "اقدام" اور "چٹان" بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ ایک ہی نشست میں پورا پرچہ ختم کر لیا جاتا تھا اور اگلے پرچے کا انتظار رہتا تھا۔ "م۔ ش" صاحب سے ان کی تحریروں کے ذریعے یہ پہلا غائبانہ تعارف تھا۔

دن گزرتے گئے۔ ایک بار لاہور میں جمعیّت کا سالانہ اجتماع منعقد ہو رہا تھا۔ ناظمِ اعلیٰ غالباً خرّم جاہ مراد تھے۔ "م۔ ش" صاحب بھی عام اجلاس میں تشریف فرما تھے۔ ان کا ذہن کٹّر مسلم لیگی اور اجتماع جمعیّت کا جس کا تنظیمی نہ سہی فکری تعلق بہرحال جماعتِ اسلامی سے تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اجتماع کے دوران ہی اٹھ کر کسی بات پر تنقید شروع کر دی اور تابڑ توڑ ایسے سوالات کر ڈالے جن کی چبھن محسوس کی گئی۔ سوالات کیا تھے اور ان کے جوابات کیا دیئے گئے یہ تو یاد نہیں رہا، ہاں یہ یاد ہے کہ اجتماع میں کچھ بدمزگی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ اس وقت نوجوانی کے دور میں "جمعیتی عصبیّت" کی بنا پر میرے دل میں ان کے خلاف میل آ گیا تھا۔

پھر ملکی سیاست نت نئی کروٹیں لیتی رہی۔ سیاست دانوں کی اکھاڑ پچھاڑ [illegible] تک نوبت "لمن الملک" بجانا، پھر اس کے نتیجے میں مارشل لاء، ایوب خان کا [illegible] پھر ان کا زوال، انتشار و خلفشار کا دور، یحییٰ خان کا مارشل لاء اور سقوطِ مشرقی پاکستان [illegible]

ذریعہ مجلس منتظمہ کے حلقہ وار انتخاب کے طریق کی وضاحت فرمائی، اور انجمن کے وابستگان کے مختلف حلقوں نے دستور کے مطابق انتخابات میں حصّہ لیا۔

اس انتخاب کے بعد دُعا کے ساتھ اجلاس عام کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی اور اصحابِ انجمن میں سے ایک صاحب کی جانب سے شرکائے اجلاس کی تواضع چائے وغیرہ سے کی گئی۔

● بقیہ 'تذکرہ و تبصرہ' صـ۲۴ـ سے آگے ●

میرے برملا اظہارِ اختلاف سے صرف انتشار ہی پیدا ہوگا۔ پروگرام میں کسی تبدیلی کا اب کوئی امکان نہیں ہے —— اس لئے میں نے اپنے بارے میں اجلاس میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا اور سفر کا ارادہ منسوخ کر دیا۔ ممکن ہے جن حضرات نے وہ فیصلے کئے جن سے مجھے اختلاف ہے ان کے پاس اس کی کچھ وجوہ ہوں جن پر وہ فیما بینهم وبین الله مطمئن ہوں۔ لیکن اس عاجز کا نقطۂ نظر وہی ہے جس کو ان سطروں میں عرض کیا گیا ہے: کل یعمل علیٰ شاکلته۔

گذشتہ دو تین ہفتوں میں اندرونِ ملک اور بعض بیرونی ممالک سے بھی راقم سطور کے پاس بکثرت خطوط آئے ہیں جن میں دارالعلوم اور جماعتِ دارالعلوم سے میرے تعلق کی بنیاد پر اجلاس سے متعلق مختلف قسم کے سوالات کئے گئے ہیں۔ بعض اخبارات و رسائل نے بھی اس سلسلہ میں مجھے مخاطب کیا ہے اور میرا موقف دریافت کیا ہے۔ بعض خطوط میں میری عدم شرکت کے بارے میں بھی دریافت کیا گیا ہے۔ میں نے ان خطوط و مراسلات کا الگ الگ جواب دینے کے بجائے 'الفرقان' میں یہ سطریں لکھ دینا مناسب سمجھا: وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ('الفرقان' مئی ۸۲ء)

مولانا نعمانی مدظلہٗ کے دیوبند نہ آنے کا سبب وہاں یہ سننے میں آیا تھا کہ وہ علیل ہیں۔ اصل حقیقت اس تحریر سے سامنے آئی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ بھی جمعہ کی رات کو اس وقت پہنچے جبکہ راقم رخصتِ سفر باندھ چکا تھا۔ اس وقت آپ سے ملاقات کی کوشش یقیناً ہفت خواں طے کرنے کے مترادف ہوتی۔ لہٰذا راقم بہ حسرت بھی دل میں لئے

اللہ تعالیٰ اس لغزش پر مجھے معاف فرمائیں۔ دراصل یہ میری طرف سے کمینگی کا مظاہرہ تھا۔ لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی غلطی کا اعادہ نہیں ہوگا۔ والسلام ـــــ خاکسار : "م۔ ش۔"

واقعہ یہ ہے کہ اس خط نے میرے ذہن پر جماعتی عصبیت کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کے ضمن میں پہلے جھٹکے کا کام کیا۔ اس لئے کہ میرے سامنے یہ حقیقت شدت کے ساتھ اُبھر کر آئی کہ شرافت اور مروّت پر کسی حلقے کا اجارہ نہیں ہے۔ یہ جنس اگرچہ کمیاب ہی نہیں تقریباً نایاب کے درجے میں ہے تاہم جماعتی دائرے کے باہر بھی اس کا وجود پایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ جناب "م۔ ش۔" صاحب کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا ـــــ بعد میں جب مَیں نے یہ دیکھا کہ "شوکتِ اسلام" کے جلوسوں کے بڑے بڑے تعزیے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں دفن کر دیئے گئے تو آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا اور حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی۔ ہم کہاں سے چلے تھے؟ ہم کدھر جا رہے ہیں؟ بلکہ ہمیں کدھر لے جایا جا رہا ہے؟ کیا یہ راستہ واقعی اسی منزل کی طرف جاتا ہے جو ہماری مقصود تھی؟ ہم کہیں غلط موڑ تو نہیں مُڑ آئے؟ یہ اور اسی طرح کے سوالات تھے جنہوں نے ذہن میں کلبلانا شروع کر دیا۔ بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ ایک ہلچل مچادی۔ کتنی ہی راتیں تھیں جو اسی سوچ میں جاگ جاگ کر گذاریں ؎

اسی کش مکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں ؛ کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

۱۹۷۲ء میں حج کے لئے رختِ سفر باندھا۔ حرم شریف میں ان سوالات پر بار بار سوچا اور ذہن کے اُفق پر جوابات آتے گئے، آتے گئے۔ یہاں تک کہ ذہن بالکل صاف ہوگیا، اور اس پر اطمینان ہوگیا کہ تحریک غلط موڑ مڑ گئی ہے اور ایک دلدل ہے جس میں پھنستی چلی جا رہی ہے۔ صحیح راستہ بھی نکھر کر سامنے آگیا۔ ذہن اور قلب دونوں نے مل کر ایک فیصلہ کیا، واپس پاکستان آکر اس فیصلہ پر فوری عمل کیا ـــ ایک طرف سے کٹ گیا اور دوسری طرف جڑ گیا۔ الحمدللہ کہ کوئی درمیانی عرصہ بے عملی کا نہیں گذرا ـــــ اور یوں میرا تعلق ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن سے قائم ہوگیا اور الحمدللہ اسی راستے پر گامزن ہوں۔

آدمی سلیم الفطرت ہو اور حقیقت کو پا جائے تو وہ ایک لمحہ بھی اس کا اعتراف کرنے اور اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔ کچھ یہی حال ہمارے "م۔ ش۔"

انتخابات اور ان کے لئے ایک طویل انتخابی مہم انتہا پسند (EXTREMIST.) گروہوں کی منظر عام پر دھما چوکڑی، ذاتی، گروہی اور علاقائی عصبیتوں، رنجشوں اور کدورتوں کا ننگا ناچ اور ایک دوسرے سے ٹکراؤ، نتیجتاً ملک کا دولخت ہو جانا۔ یہ تو کوئی دُور کی بات نہیں، ان سے تو ہر شخص واقف ہے ؂

ذکر ہو رہا تھا "م۔ ش" صاحب کا، یحییٰ خان کے دَور کے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں موصوف غالباً اوکاڑہ کی مرکزی نشست سے امیدوار تھے۔ مقابلہ میں دیگر حضرات کے علاوہ جماعت اسلامی کے نمائندے تھے ریٹائرڈ میجر جنرل امراؤ خان جنہیں اس زمانہ میں بعض اخبارات جماعت اسلامی کا ڈرل ماسٹر لکھتے تھے۔ "م۔ ش" کی ڈائری اس زمانہ میں "نوائے وقت" میں شائع ہوتی تھی جسے مَیں ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اپنی ڈائری میں ایک بار انہوں نے جنرل امراؤ خان پر کچھ چھینٹے اڑائے۔ یہ تو اب یاد نہیں کہ کیا لکھا تھا۔ البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ اسے پڑھ کر مجھے تاؤ خاصا آیا تھا۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ طالب علمی کے دَور کے بعد میں جماعت اسلامی کا کارکن بن گیا تھا، اور ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں جماعت کے دیگر کارکنوں کی طرح مَیں بھی پُرجوش طریقہ پر کام میں لگا ہوا تھا۔ اپنے حلقے کے انتخابی کام کے علاوہ کراچی کے مرکزی نظم کے شعبۂ نشر و اشاعت سے بھی اعزازی طور پر وابستہ تھا۔ مَیں نے "نوائے وقت" میں جب "م۔ ش" صاحب کی یہ تحریر پڑھی تو وہی پرانی عصبیت جو اَب "جمعیتی" سے ترقی کر کے "جماعتی" بن چکی تھی، جاگ اٹھی۔ فوراً شدید ترین الفاظ میں ایک خط اُن کو لکھ مارا۔ میرے خط کا جو جواب انہوں نے دیا حقیقت یہ ہے کہ وہ میرے "جماعتی عصبیتی ذہن" پر بھرپور طمانچہ تھا۔ موصوف کا وہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ ہے، ملاحظہ فرمائیے اور ان کی عالی ظرفی کی داد دیجئے۔ اس لئے کہ اپنی غلطی کا برملا اعتراف اور وہ بھی تکلّف لپیٹے نہیں بلکہ کھلے الفاظ میں ایک عالی ظرف انسان ہی کا کام ہوتا ہے۔

۸۰۔ سی۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ ۲۵ر جون ۱۹۷۰ء

مکرم بندہ! السلام علیکم

مَیں خلوصِ قلب سے اپنی غلط نگارش پر شرمندہ ہوں۔ دعا کریں کہ

• مزید برآں پچھلے دنوں ساتویں سالانہ قرآن کانفرنس کے موقع پر میرا لاہور آنا ہوا۔ ۱۸؍ تا ۲۱؍ اپریل کانفرنس جاری رہی۔ ۲۳؍ اپریل کو جناح (ٹاؤن) ہال میں امیرِ تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تنظیم اسلامی کے زیرِ اہتمام ایک بڑے جلسۂ عام میں: "اسلام کا پیغام مسلمانانِ پاکستان کے نام!" — کے موضوع پر ایک فصیح و بلیغ تقریر فرمائی۔ اس تقریر کا تذکرہ جناب "م۔ش" نے صاحب نے اپنے کالم میں (روزنامۂ مشرق ۲۷؍ اپریل ۸۰ء) جس انداز سے فرمایا ہے اس پر پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ قلب کی گہرائی سے ان کے لئے دعائیں نکلیں۔ قارئین کرام! کیوں نہ آپ بھی اس تاریخی کالم کو ملاحظہ فرمائیں۔

⊙ "م۔ش" کا کالم ⊙

"ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک!"

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند ؛ اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

ایک دن میں نے حضرت علامہ اقبال کا مندرجہ بالا شعر پڑھ کر ان سے پوچھا کہ آیا اس تین سو سالہ ریفرنس سے اُن کی مراد اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شخصیت سے ہے تو انہوں نے فرمایا: "نہیں میری مراد اس سے مجدد الفِ ثانی سے ہے!"

جمعرات کی شام کو ٹاؤن ہال لاہور میں بیٹھے ہوئے مجھے یہ واقعہ اس وقت معًا یاد آیا جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تقریر میں جس کی اُڑان میں مجدد الفِ ثانیؒ سے لے کر دورِ حاضرہ کی تمام قابل شخصیات سمٹ آئی تھیں تنظیم اسلامی کے عنوان پر علوم و معارف کے دریا بہا رہے تھے۔ کم و بیش تین گھنٹے کی اس تقریر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بلا لومۃ لائم احیائے دین کے لئے برِ صغیر کی تحریکوں پر عمومًا اور پاکستان میں خصوصًا جس بے ساختگی، گھن گرج، تڑپ اور جوش سے تبصرہ کیا، اس پر اقبال کا یہ مصرع میرے شعور کی پہنائیوں میں دھڑکن پیدا کرتا رہا ؎: "ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک!"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مجدد الفِ ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبالؒ، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی تک احیائے دین

صاحب کا ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کے ادراک پر کہ: "اسلام کی نشأۃ ثانیہ" کے لئے فی الوقت "کرنے کا اصل کام" وہی ہے جو "مرکزی انجمن خدّام القرآن" لاہور کے صدر مؤسس اور "تنظیم اسلامی" کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کر رہے ہیں، وہ عمر، تجربے اور بہت سے دوسرے اعتبارات سے ان سے بدرجہا فائق ہونے کے باوجود اپنی ذہنی و جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کا نذرانہ خلوص کی طشتری میں سجا کر ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے درج ذیل خط سے لگائیے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۳- بابر بلاک۔ نیو گارڈن ٹاؤن۔ لاہور ۱۹ر اپریل ۱۹۸۰ء

محترم و معظم جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ ہم سب کے لئے ایک بہت بڑی نعمت ہیں بلکہ عطیۂ خداوندی ہیں۔ آپ جس دردمندی، لگن اور تسلسل سے اپنے آپ کو دین کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہوگا۔ میں اپنی تمام خطاؤں، لغزشوں اور گناہوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حضور آنسو بھری آنکھوں سے یہ دعا کرتا ہوں کہ اے مالکِ کون و مکان! اپنے اس مخلص بندے کی مساعی کو جو وہ تیرے کلام کی خدمت کے سلسلہ میں انجام دے رہا ہے، مشکور فرما۔ آمین اللّٰہم آمین ——!!

خدا نے ایک وقت قائد اعظم اور علامہ اقبال کی حیات میں ایک حقیر کارکن کی حیثیت میں ان دو عظیم انسانوں کے مشن کے لئے کام کرنے کی توفیق ارزاں فرمائی تھی۔ بساط بھر زندگی کے مختلف مراحل میں اپنا کردار ادا کرنے کی حقیر کوشش کرتا رہا ہوں۔ اب میں اپنی زندگی آپ کے قدموں میں بسر کرنے کی تڑپ رکھتا ہوں...... آپ کو اُفق پر ایک ستارے کی طرح چمکتا دیکھ کر دل میں امید پیدا ہوتی ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو —— والسلام

خاکسار: محمد شفیع (م-ش)

نوٹ: کل جمعہ کی نماز آپ کی اقتداء میں ادا کی۔ قرأت پر دل جھوم جھوم اٹھا۔"

سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔

ہمیں یہ احساس نہیں کہ یورپ اور امریکہ علیسائیت کی تبلیغ کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ وہاں پوپ سے لے کر بلی گراہم تک لاکھوں کی تعداد میں علیسائی مبلّغین اپنے آپ کو علیسائیت کی تبلیغ کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ کہنے کو تو یورپ اور امریکہ سیکولر ہیں لیکن اس سیکولرزم کے پردے میں مغربی ممالک کی حکومتیں تثلیث کی اشاعت کے لئے مسلمانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے حیرت انگیز نظام مرتب کر لیا۔ اگر ہم فی الحال اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے فرقہ واریت کو دفن نہیں کر سکتے تو ہمیں کم از کم رواداری سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو اپنی اپنی صوابدید اور ذرائع کے مطابق اپنے اپنے میدان میں کام کرنے کی دل سے اجازت دینا چاہیئے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس ضرورت کی جیتی جاگتی تعبیر اور تفسیر ہیں ان کے نمونہ پر اگر کام کیا جائے تو مسلم معاشرہ فرقہ واریت کی تلخیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔

بقیہ تذکرہ و تبصرہ

اور اس میں انار کا وہ پودا جس کے سائے میں تدریس کا آغاز ہوا تھا، اور دوسری جانب دارالعلوم کی موجودہ شاندار عمارت، ایک طرف مولانا حسین احمد مدنیؒ کا پرانا بوسیدہ مکان — اور دوسری جانب مولانا اسعد مدنی یا تقابہ کی موجودہ 'قلعہ نما حویلی' مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی چھوٹی سی مسجد اور اس کے سامنے ان کا پرانا مکان — اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی رہائش گاہ اور وہ بیٹھک جس میں اکھاڑا ابھی تھا جہاں مولانا 'زور' کیا کرتے تھے — الغرض لگ بھگ ایک صدی کی تاریخ اور ماضی و حال اور قدیم و جدید کے تضادات —!!

سب سے بڑا "تضاد" شام کو اجتماع گاہ اور جلسۂ عام اور مہمانوں کے قیام کے لئے تیار شدہ پنڈالوں کو دیکھ کر سامنے آیا۔ وسیع و عریض رقبہ، نہایت سلیقے سے تیار شدہ نقشہ، بجلی کے سینکڑوں کھمبے اور ان پر تاروں کا بھاری بھرکم جال، کئی ٹیوب ویل اور سینکڑوں ہینڈ پمپ اور بے شمار کچی اور پکی نالیاں جن میں پانی رواں۔ بجلی کے ہزارہا بلب اور ٹیوبیں — نتیجۃً پورا علاقہ بقعۂ نور — ذہن میں سوال پیدا ہوا، کہاں یہ تنظیم و ضبط اور حسنِ انتظام ہی نہیں زیبائش و آرائش کا منظر اور

کے لئے ان سے متعلق تمام دھاروں کو نقطۂ عروج پر لاتے ہوئے آج پاکستان میں غلبہ اور اقامتِ دین کے لئے تاریخی لحاظ سے ہر ایک شخص کو کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب اُمّت کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور چونکہ وہ طب کے ڈگری یافتہ بھی ہیں، اس لئے انہوں نے ماموریت کے مقام سے نہیں بلکہ ایک مُناد کی حیثیت میں ہر شخص کو بقدرِ استطاعت اس مہتم بالشان مہم یعنی تحریک اقامتِ دین میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے ہر سننے والے پر یہ تأثر راسخ کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کو خدا کے منشاء کے مطابق تمام ادیان پر غالب کرنے کے لئے جس میں دُنیا کی بھلائی ہے۔ پاکستان کے ایک ایک مسلمان کو فرقہ بندی سے الگ رہ کر قرآن کی تعلیم کو اپنی زندگی کا نمونہ بنانا چاہیئے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس احساس سے سرشار لوگ ایک نظام میں منسلک ہو کر اپنے آپ کو قرآن کی تعلیم اور اس کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نہ تو واعظ ہیں اور نہ ہی وہ "کمرشل" ہیں بلکہ وہ ایک ایسے انسان ہیں جنھوں نے دُنیا کی متاع پر لات مار کر اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اپنے دل سے ایک فیصلہ کر رکھا ہے۔ وہ اس دھن میں مست دن رات صبح و شام، سردی اور گرمی، آرام اور بے آرامی، تحسین اور تردید سب کچھ سے بے نیاز ہو کر قرآن کے نور کو ہر سطح پر پھیلانے میں معروف ہیں —— انہیں اپنی علمیت پر کوئی ناز نہیں۔ انہیں کسی قسم کی ٹھیکے داری اور اجارہ داری سے غرض نہیں۔ وہ اپنے جنون، اپنے عشق اور وارفتگی میں امّت کے تمام طبقوں اور فرقوں کو قرآن عظیم کے پیغام پر متّحد اور مستفیض ہونے کے لئے کام کئے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کا جو اس مقصد سے لگاؤ رکھتا ہو، کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اُن کا لباس، اُن کی خوراک اور اُن کی رہائش ویسی ہی ہے جیسی کہ پاکستان کے کسی متوسط درجے کے فرد کو حاصل ہو۔ ان کی آواز میں اثر ہے، ان کی شخصیت میں کشش ہے، ان کی آنکھوں میں چمک ہے، وہ جناح ہال میں تین گھنٹے تک بلا تکان، بلا تکلف اپنی کہتے چلے گئے۔ نہ تو ان کا گلا بیٹھا اور نہ اُن پر تھکان کے کوئی آثار نمودار ہوئے اور جب جلسے کے اختتام پر انہوں نے نمازِ عشاء میں امامت کرتے ہوئے قرأت کی تو مقتدیوں کی آنکھوں

تلقین ہی سننے میں آرہی تھی ـــــ اسی ہنگامے میں مسز اندرا گاندھی کی تقریر کا اعلان ہوا ـــ چند منٹ کی تقریر کے دوران ذرا سکون سا رہا اور انہوں نے جو کچھ کہا اس کا متن بھی سمجھ میں آگیا اور بین السطور بھی مخفی نہ رہا ـ لیکن پھر اچانک کم از کم راقم کے اعصاب کے اعتبار سے ایک بم پھٹا ـــ !! یعنی مسز اندرا گاندھی زندہ باد کا وہ نعرہ جو سٹیج سیکرٹری صاحب نے بنفسِ نفیس لگوایا جو راقم کی معلومات کی حد تک مولانا سالم خلف الرشید قاری محمد طیب صاحب تھے (واللہ اعلم !) قال اللہ قال الرسول ﷺ کے عظیم مرکز دارالعلوم دیوبند کا اجلاسِ صد سالہ ـــ اور اس میں اُس کافرہ وملحدہ عورت کے لئے ' زندہ باد ' کا نعرہ جس نے نو سال قبل سقوطِ ڈھاکہ کو " ہزار سالہ شکست کا بدلہ ! " قرار دیا تھا ـ " بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است ! "

بہرحال راقم کے لئے یہ بات قطعاً ناقابلِ برداشت تھی ، لہٰذا اس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ مزید قیام نہ کرے بلکہ فوراً واپسی کا سفر اختیار کرے گا ـ چنانچہ اسی رات تقریباً گیارہ بجے دیوبند سے روانہ ہو کر بعفتہ ۲۲ ، مارچ کو دوپہر کے لگ بھگ راقم واپس اپنے مستقر پر پہنچ گیا ـ

مسز اندرا گاندھی کی اس اجلاس میں شرکت کا ذکر سب سے پہلے جمعرات کی صبح کو دیوبند ریلوے اسٹیشن پر سننے میں آیا تھا ، لیکن وہ اس طور سے کہ جیسے وہ زبردستی آرہی ہوں ـ پھر دن میں ایسی باتیں سننے میں آئیں جن سے ایک سوئے ظن مولانا اسعد مدنی سے پیدا ہوا کہ شاید یہ سب ان کی ' کارستانی ' ہے ـ لیکن سٹیج سیکرٹری صاحب کی جانب سے اس نعرے سے بات کچھ اور ہی سامنے آئی اور بعد میں بعض دوسرے ذرائع سے جو رازہائے درونِ پردہ سامنے آئے وہ تو اتنے ناگفتہ بہ ہیں کہ دارالعلوم دیوبند اور اُس کے مؤسسین و اکابر سے محبت و عقیدت رکھنے والا کوئی شخص سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

" گلہ ء جفائے وفا نما کہ حرم کو اہلِ حرم سے ہے ؛ کسی بتکدے میں بیاں کروں تو کہے صنم بھی ہری ہری "

اِدھر یہ سطور سپردِ قلم ہو رہی تھیں اور ادھر لکھنؤ سے ماہنامہ ' الفرقان ' کا تازہ شمارہ آپہنچا ـــ اس ' حادثہ ء فاجعہ ' پر جو کچھ دارالعلوم کے ایک قدیم خادم اور وفادار وکیل مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ العالی کے قلم سے نکلا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمالیں :

کہاں وہ بدنظمی جس کا مشاہدہ صبح سے ہو رہا تھا !! ——— دماغ کے کمپیوٹر نے جواب فوراً حاضر کردیا ——— وہ کارکنوں کی اپنی کارکردگی تھی ——— اور یہ پیسے کا کھیل ہے، ستر اسی لاکھ روپے کا ٹھیکہ دیا اور فراغت ہوئی - اب ساری ذمہ داری ٹھیکیدار کی یا اس کے مزدوروں اور مستریوں کی !! ——— اپنے نہ جسم پر کوئی مشقت نہ جان پر کوئی کوفت ——— !!!

ہم جمعرات کی صبح دیوبند پہنچے تھے اور "جشن" کا آغاز جمعہ کے روز نماز جمعہ سے ہونا تھا - جمعرات کی شام ہی کو ہجوم کا عالم یہ تھا کہ دارالعلوم کے آس پاس دیوبند کے بازاروں اور گلیوں میں چلنا مشکل ہوگیا اور کھانے وغیرہ کے لئے بازار آنے جانے کے لئے باقاعدہ سوچنا اور ہمت کو مجتمع کرنا پڑتا تھا - جمعہ کی صبح سے تو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے - راقم کا گمان یہ ہے کہ مغربی یوپی کے اضلاع مظفر نگر اور سہارنپور کا تو شاید کوئی بھی مسلمان ایسا نہ رہا ہو جو اس اجتماع میں نہ آگیا ہو - اس کے علاوہ آس پاس کے اضلاع یہاں تک کہ میوات کے علاقے کی آبادی کا بھی بیشتر حصہ دیوبند آگیا تھا ——— جمعہ کے لئے پہنچے تو اس جلسہ گاہ کے تو قریب پھٹکنے تک کا کوئی امکان نہ تھا جسے گذشتہ شام ہم نے دیکھا تھا تو اس کی وسعت پر دنگ رہ گئے تھے کہ اس کے ایک سرے پر کھڑے ہو کر دوسرا سرا کم از کم راقم کو صاف نظر نہ آتا تھا اور اب نہ صرف یہ کہ وہ پُر ہو چکا تھا بلکہ اُس کے اطراف میں دُور دُور تک انسان ہی انسان نظر آرہے تھے ——— نمازِ جمعہ تک تو الحمد للہ کہ لوگ پُرسکون بھی رہے اور منضبط بھی ——— قاری محمد طیب مدظلہ، نے خطبہ ارشاد فرمایا اور نماز پڑھائی اور یہ پورا مرحلہ سکون و اطمینان سے طے پا گیا - لیکن اس کے بعد جب جلسہ کا آغاز ہوا تو جو ہڑبونگ شروع ہوئی اور شور و غوغا بپا ہوا اس میں کارروائی کا آغاز مشکل ہوگیا - یہاں تک کہ قاری عبدالباسط صاحب کی قراءت بھی اس شور اور ہنگامے کو فرو نہ کرسکی ——— بلکہ خود ہی دب کر رہ گئی - قاری محمد طیب صاحب کی تقریر اور زعمائے ملّتِ اسلامی کے وعظ نما پیغامات کے دوران بھی شور اور ہنگامہ اسی طرح جاری رہا ——— ہم تو سٹیج سے اتنے فاصلے پر تھے کہ وہاں صرف کچھ سائے ہی سے حرکت کرتے نظر آتے تھے، پہچاننا کسی کو ممکن نہ تھا ——— واحد رابطہ لاؤڈ سپیکروں کی آواز کا تھا ——— اور اس سے اکثر و بیشتر خاموشی اور نظم و ضبط کے

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

کا کراچی سب آفس

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے کراچی سب آفس کے اعزازی ناظم قاضی عبدالقادر صاحب کی لاہور منتقلی کی وجہ سے انجمن کی مجلس منتظمہ نے پچھلے ماہ کے اجلاس میں جناب عبدالواحد عاصم صاحب کو کراچی سب آفس کا اعزازی ناظم مقرر کیا ہے۔ وہ کراچی میں انجمن کے مکتبہ، دفتر، املاک اور دیگر امور کے نگران اور ذمہ دار ہوں گے۔ ان سے رابطہ انجمن کے سب آفس کے علاوہ حسب ذیل پتہ پر قائم کیا جا سکتا ہے:

شائننگ ٹریڈرز، نزد کارخانہ تجارت کتب بالمقابل آرام باغ، فریئر روڈ، کراچی۔ ٹیلیفون، دکان ۲۱۴۲۰۹، مکان ۲۳۲۸۸۸۔

قارئین کرام کے علم میں ہوگا کہ انجمن نے اب سے کوئی تین سال قبل کراچی کے مرکزی مقام میکلوڈ روڈ کے متوازی مولانا حسرت موہانی روڈ پر نئی تعمیر شدہ عمارت سنی پلازہ میں اپنے سب آفس کے لیے ایک کمرہ مالکانہ حقوق کی بنیاد پر پچاس ہزار روپے میں خریدا تھا۔ اس کا قبضہ ملتے ہی وہاں پر کام کا آغاز ہوگیا تھا اور اب یہ دفتر ہی کراچی میں انجمن کی تمام دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ کام کی توسیع کی وجہ سے اجتماعات وغیرہ کے لیے یہ دفتر ناکافی ثابت ہو رہا ہے۔ خوش قسمتی سے ملحقہ کمرہ کے مالک نے اسے فروخت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انجمن کے کراچی کے ارکان نے موقع غنیمت جان کر انہتر ہزار میں اس کا سودا کر لیا۔ اب کراچی کے وابستگان انجمن، اہل خیر حضرات سے اس خطیر رقم کو جمع کرنے کی تگ ودو میں لگے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قارئین 'میثاق' میں سے جو حضرات اس سلسلہ میں تعاون کرنا چاہیں وہ کراچی کی انجمن کے ارکان یا عبدالواحد عاصم صاحب سے رابطہ قائم فرمائیں جن کا پتہ اور ٹیلیفون نمبر اوپر دیا جا چکا ہے!

المعلن: محمد بشیر ملک۔ ناظم اعلیٰ
مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور

"مرا دردیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد
وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد"

'الفرقان' کے فروری و مارچ کے مشترکہ شمارے میں جو اجلاس سے قریباً ایک ہفتہ پہلے شائع ہوا تھا، اسی عنوان کے تحت جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اپنے دینی انحطاط' دارالعلوم کے موجودہ حالات اور زمانہ کی رفتار سے کچھ خطرات محسوس کرتے ہوئے لکھا گیا تھا، لیکن جو وقوع میں آیا اس نے بتلایا کہ ہم اس سطح سے بہت نیچے گر چکے ہیں جس کا خطرہ تھا ؛

اس عاجز کا دین و دنیا کا سارا سرمایہ بس وہ تھوڑا سا (بہت تھوڑا سا) علم ہی ہے جو از اوّل تا آخر دارالعلوم ہی کا صدقہ ہے —— اس مادرِ علمی کا باقاعدہ طالب علم بن کر تو اب سے قریباً ۵۵ سال پہلے صرف آخری دو درجوں کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن اس سے پہلے بھی جو کچھ کہیں پڑھا، دارالعلوم کے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض یا بالواسطہ فیض یافتہ اساتذہ ہی سے پڑھا۔ اس طرح جو کچھ پایا اُس کا سرچشمہ دارالعلوم ہی ہے —— اس کے علاوہ دارالعلوم اور مسلکِ دارالعلوم سے ایک اختصاصی تعلق یہ بھی رہا کہ مختلف میدانوں میں اس کی نمائندگی اور وکالت و ترجمانی کا شرف بھی اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا اور اس بارے میں اپنے اکابر مرحومین کا پورا اعتماد نصیب رہا۔ ولا فخر ——!!

ایک ضابطہ کا اور کسی درجہ میں ذمہ داری کا تعلق یہ بھی رہا کہ یہ عاجز قریباً چالیس سال سے اس کی مجلسِ شوریٰ کا رُکن چلا آ رہا ہے ——!!!

اِن سب تعلقات کا تقاضا اور حق تھا کہ مَیں اجلاس میں نہ صرف شریک ہوتا بلکہ اُس میں میرا نمایاں حصہ ہوتا۔ اجلاس کے بہت پہلے سے مَیں مختلف ممالک کے دوستوں کے خطوط کے جواب میں لکھتا رہا تھا کہ اِن شاء اللہ العزیز دارالعلوم دیوبند کے اجلاس میں ملاقات ہوگی —— پھر جب تاریخ قریب آنے لگی تو ریزرویشن بھی کرا لیا، لیکن صرف تین دن پہلے (جس دن مجھے دیوبند کے لئے روانہ ہونا تھا) اطلاع ملی کہ اجلاس کے منتظمین اللہ ذمہ دار حضرات نے اجلاس کے پروگرام کے سلسلہ میں (کسی مجبوری سے یا اپنے نزدیک صحیح مناسب سمجھ کر) بعض ایسے فیصلے کر لئے ہیں جن سے بہرحال مجھے شدید اختلاف ہے اور دارالعلوم دیوبند جیسے مقدس روایات رکھنے والے علومِ نبویؐ اور ہدایت و ارشاد کے کسی مرکز کے لئے میرے نزدیک ایسی کسی بات کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ؛

یہ اطلاع ملنے کے بعد مَیں غور و فکر کر کے اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اب وہاں پہنچ کر

ماہنامہ لاہور

میثاق

۱۹۸۰ء

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

Regd. L. No. 7500

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 29 | JUNE 1980 | No. 6

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

عرضِ احوال

'میثاق' کا پیشِ نظر شمارہ —— نہ صرف یہ کہ دو ماہ کی مشترک اشاعت ہے بلکہ دو اشاعتیں اکٹھی کر دینے کے باوجود بھی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا سبب راقم الحروف کی مسلسل علالت ہے جس کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اسلئے کیا جا رہا ہے کہ قارئینِ 'میثاق' بھی اللہ سے دُعا کریں کہ وہ راقم کو شفا عطا فرمائے تاکہ کتابِ مبین اور دینِ متین کی جس حقیر سی خدمت کے لئے اس نے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا ہے اس کا سلسلہ سابق تندہی اور جوش و خروش کے ساتھ جاری رہ سکے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيْزٍ

دروسِ قرآن، تقاریر اور خطابات عام کی کثرت کے باعث راقم کے گلے میں خراش اور سوزش کی شکایت تو گذشتہ دس بارہ سال سے مسلسل چلی آ رہی ہے —— جس کے لئے وقتاً فوقتاً مخالف جراثیم ادویات (ANTI BIOTICS) کا استعمال معمول سا بنا رہا ہے جسے خالص طبی اصولوں کے مطابق تو 'MISUSE' قرار دینا غلط نہ ہو گا —— تاہم اس طرح وہ فوری افاقہ ہو جاتا تھا جس سے کام جاری رکھا جا سکے۔

گذشتہ سالانہ قرآن کانفرنس (منعقدہ اپریل ۸۰) کے دوران اور اس کے بعد محسوس ہوا کہ تکلیف بڑھ رہی ہے اور معمولی ادویات سے افاقہ نہیں ہو رہا۔ تو مجبوراً اوائل ماہ جون میں گلے کے امراض کے ماہر معالجین سے رجوع کرنا پڑا۔ لاہور کے دو چوٹی کے ماہرین نے بالاتفاق FUNGUS INFECTION تشخیص کی اور کسی قدر تشویش کا بھی اظہار کیا، اور آرام کا مشورہ بھی دیا اور نئی ادویات بھی تجویز کیں۔ اب یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ یہ ان ادویات کے سمّی اثرات کے تحت ہوا یا

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۲۹ | جولائی - اگست ۱۹۸۰ء | عدد ۷ ،

مشمولات

ضروری اعلان

(۱) ماہنامہ "**میثاق**" کے ہندوستانی خریداروں سے گذارش ہے کہ سالانہ زر تعاون مبلغ بتیس روپے حسب ذیل پتہ پر ارسال کر کے منی آر[ڈر] کی رسید ہمیں پاکستان بھیج دیں - پرچہ جاری کر دیا جائے گا
ماہنامہ "**الرسالہ**" جمعیت بلڈنگ ۔ قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی

(۲) مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مطبوعات کے لئے بھی رقم مندر[جہ] بالا پتہ پر ارسال کر کے منی آرڈر کی رسید ہمیں بھیجی جا سکتی ہے

(۳) مولانا وحید الدین خاں صاحب کا ماہنامہ "**الرسالہ**" دہلی اور ان مطبوعات کے پاکستانی خریدار ہم سے رابطہ قائم فرمائیں ۔

مینجر ماہنامہ "**میثاق**"

درس بھی میں نہ دے سکوں گا ۔ (میری جگہ یہ ذمہ داری اب میرے ایک نوجوان رفیق کار ڈاکٹر عبدالسمیع سرانجام دے رہے ہیں!)

بہرحال یہ ہے وہ سبب جس کے باعث 'میثاق' کی اشاعت میں اتنی تاخیر و تعویق ہوئی، جس کے لئے میں قارئین سے معذرت خواہ بھی ہوں اور دعا کا خواستگار بھی ۔۔۔ بلکہ جب اتنی تفصیل بیان ہو گئی تو ساتھ ہی ساتھ یہ معذرت ان بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور کرم فرماؤں کی خدمت میں بھی پیش ہے جن کے خطوط کا انبار لگا ہوا ہے ۔۔۔ اور کسی کو جواب نہیں دیا جا سکا ۔ اُمید ہے کہ یہ سب حضرات میری اس معذرت کو قبول فرمالیں گے !

راقم کی صحت کی کچھ ایسی ہی کیفیت آج سے ٹھیک دس سال قبل ۶۸ء میں بھی ہو گئی تھی ۔ یعنی یہ کہ مسلسل حرارت رہتی تھی ۔ جس کے ضمن میں ایک بار تو تپِ دق تک کی تشخیص ہو گئی تھی جو بعد میں غلط ثابت ہوئی، اصل سبب کام کا دباؤ اور متضاد قسم کی مصروفیات کی کثرت تھی جس نے اعصاب کو توڑ کر رکھ دیا تھا ۔ چنانچہ ایک جانب مطب اور اس کی ذمہ داریاں تھیں ۔ دوسری جانب حلقہ ہائے درسِ قرآن تھے ، تیسری جانب ''دارالاشاعت الاسلامیہ'' اور سب سے بڑھ کر 'میثاق' تھا جس کے بارے میں اب غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ۶۹ء کے دوران پوری باقاعدگی کے ساتھ ہر ماہ پورے اسی صفحات پر مشتمل شائع ہوتا رہا ۔۔۔ اس چومکھی جنگ کے باوجود صحت جواب نہ دیتی تو یہ امر باعثِ تعجب ہوتا ۔ بہرحال چار ساڑھے چار سال کی محنتِ شاقہ کے نتیجے میں اوائل ۷۲ء میں صحت نے جواب دے دیا ۔ اور وہ بحال ہوئی تو صرف اس طرح کہ اولاً چار ماہ ملک سے باہر رہا ۔ اور اس عرصے کے دوران رمضان مبارک (اکتوبر، نومبر ۷۲ء) مدینہ منورہ میں بسر کیا ۔ پھر ایک ماہ (دسمبر، جنوری) برادرِ عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلمہ کی دعوت پر انگلینڈ کی سیر کی ۔ بعد ازاں ایک ماہ پھر ارضِ مقدس میں بسر کیا اور حج کی سعادت حاصل کی ۔۔۔ اور ثانیاً اس پورے عرصے کے دوران غور و فکر کے نتیجے میں بالآخر حج ہی کے موقع پر یہ حتمی فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مطب بند ڈاکٹری کے پیشے کو الوداع ۔ اور کُل کی کُل قوت و استعداد اور تمام کے تمام اوقات کامل یکسوئی

ویسے ہی قسمت الٰہیت۔ بہر حال سوزشِ امعاء اور اس کے نتیجے میں بخار کے ساتھ اسہال اور پیچش کا حملہ ہو گیا۔ جس کی شدت اتنی ہوئی کہ کراچی کے دورے کا پروگرام جس کے لئے وہاں کافی اہتمام بھی ہوا تھا۔ اور اعلانِ عام بھی کیا گیا تھا عین وقت پر منسوخ کرنا پڑا۔ یہ حادثہ راقم کی گذشتہ پندرہ سالہ مساعی کے دوران پہلی مرتبہ پیش آیا تھا لہٰذا طبیعت نے اس کا اثر بھی قدرے زیادہ ہی لیا۔ اور شاید یہ اسی کا نتیجہ ہو کہ ایک روز اچانک بخار بھی بہت تیز ہو گیا اور ساتھ ہی سینے میں بائیں جانب شدید درد بھی ہوا — جس کے بارے میں فوری طور پر راقم کے لئے یہ فیصلہ آسان نہ تھا کہ یہ دل سے متعلق ہے یا پھیپھڑے یا پٹھوں سے۔ — اتفاق سے اس وقت گھر پر نہ بڑے بچے موجود تھے نہ ان کی والدہ صرف بچیاں تھیں، ادھر درد اتنا شدید تھا کہ نہ ہلنے جلنے دیتا تھا نہ معمول کے مطابق سانس لینے دیتا تھا، صرف اوپر اوپر کا سطحی سا سانس لینا ممکن تھا ایک مرحلہ پر تو صورت حال ایسی ہولی کہ بچیوں نے رونا شروع کر دیا — بعد میں تفتیش پر معلوم ہوا کہ یہ VIRUS INFECTION، جو جتنی تیزی سے آئی تھی اتنی ہی سرعت سے ختم بھی ہوئی البتہ ماہرین کے مابین یہ اختلاف رائے تاحال قائم ہے کہ متاثر عضو بائیں پھیپھڑے کا نچلا حصہ تھا۔ یا سینے کے عضلات، خدا کا شکر ہے کہ اس امر پر اتفاق ہے کہ اس کا کوئی تعلق قلب سے نہ تھا! بہر حال چند دن کے اندر اندر INFECTION کے "سلوک" کے تمام مراحل بھی طے ہو گئے اور جملہ مقامات کی سیر بھی ہو گئی!![1]

اس کے بعد سے مسلسل ہلکی حرارت چل رہی ہے۔ جو ذرا سی محنت، خصوصاً درس یا خطاب عام سے بڑھ جاتی ہے، — قوتِ کار بہت کم ہو گئی ہے۔ توانائی گویا اندر ہی اندر ختم ہو رہی ہے، ۱۱ر جولائی والے جمعے کو یہ حادثہ بھی پیش آیا کہ خطبے کے دوران اچانک اتنی نقاہت محسوس ہوئی کہ شدید اندیشہ ہوا کہ اگر خطبہ جاری رکھا تو ہو سکتا ہے کہ گر جاؤں لہٰذا مضمون کو درمیان میں چھوڑ کر خطبہ فوری طور پر ختم کرنا پڑا — درسِ قرآن کے باقی تمام پروگرام تو پہلے ہی منسوخ ہو چکے تھے، اس روز مجبوراً یہ اعلان بھی کرنا پڑا کہ تا اطلاعِ ثانی مسجد شہداء کا

---

[1] یعنی BACTERIAL، FUNGAL اور VIRAL ہمہ اقسام کی

شروع کر رکھا تھا کہ ؎

اس سوچ میں کلیاں زرد ہوئیں اس فکر میں غنچے سُوکھ گئے
آئین گلستاں کیا ہو گا دستورِ بہاراں کیا ہو گا ؟؟

کس قدر قابلِ رحم ہے یہ صورتِ حال کہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ بیت جانے کے بعد بھی اس مسئلے میں "ہنوز روزِ اوّل" والا معاملہ ہے۔ اور یہ بے یقینی اور گومگو کی کیفیت کس قدر خوفناک نتائج پیدا کر سکتی ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ شعور انسان بخوبی کر سکتا ہے۔

دوسری طرف کم از کم راقم کا مشاہدہ یہ ہے کہ ہماری بعض اجتماعی غلطیوں کے باعث جن کی تفصیل میں جانا اس وقت نہ ممکن ہے نہ مناسب، پاکستان کے عوام کے ایک خاصے بڑے اور موثر طبقے میں دین سے فرار اور بے زاری کی کیفیت تیزی سے بڑھ رہی ہے — اس سلسلے میں راقم نے جو تجزیہ اکتوبر ۷۸ء کے 'میثاق' میں شائع کیا تھا، وہ اسی شمارے میں پھر شائع کیا جا رہا ہے اس سے راقم کے احساسات [illegible] کا اندازہ کیا جا سکتا ہے — اس لئے کہ اس وقت کے مقابلے میں صورتِ حال [illegible] سے سنگین تر ہی ہوئی ہے، بہتری کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

بیرونی خطرات کا معاملہ اندرونی خدشات سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ چنانچہ ایک طرف روسی جارحیت کا سیلاب ہمارے دروازوں تک پہنچ گیا ہے اور ہماری پوری شمال مغربی سرحد اس کی براہِ راست زد میں ہے دوسری طرف جنوب مشرق میں اندرا گاندھی اور اس کی حکومت کے تیور بدلتے نظر آ رہے ہیں یا یوں کہہ لیں کہ ان کا اصل روپ دوبارہ نکھر کر سامنے آ رہا ہے۔ ہر قسم کی اسلحہ سازی میں پوری طرح خود کفیل ہونے کے باوجود اربوں روپے کا اسلحہ اپنے روایتی دوست روس سے خریدا جا رہا ہے۔ اور کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پردے میں کچھ عجب نہیں کہ پھر گنگا کس کی طرح کا کوئی ڈرامہ قبل منصود ہو۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بظاہر پاکستان کی آزادی اور خود اختیاری کی ضمانت دینے والا امریکہ۔ پاکستان کو بھارت کے ایک طفیلی ملک کا

کے ساتھ وقت برائے خدمتِ قرآن حکیم واحیا واقامتِ دینِ متین۔۔۔ا
طرح راقم کی زندگی کا یہ "قبض" ایک نئے "بسط" کا پیش خیمہ بن گیا ۔۔
؏ "رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور ا" کے مصداق مار پ
سلاء سے راقم کی مصروفیات کا وہ طوفانی دور شروع ہوا جس کے ابتدا
چار سال کی مساعی کے نتیجے میں اوّلاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن
کی تاسیس عمل میں آئی اور پھر ۱۹۷۵ء میں "تنظیمِ اسلامی" قائم ہوئی ۔
راقم کی حالیہ علالت کے ساتھ بھی ایک شدید قسم کی باطنی "قبض" کی کیف
شامل ہے ۔ جس میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" یا بالفاظِ دیگر "قنوطیت" کا
غالب ہے ۔ چونکہ انسان کی جسمانی صحت اور نفسیاتی و رُوحانی کیفیات ایک
دوسرے سے اثر پذیر ہوتی ہیں لہٰذا جہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ باطنی "قبض"
کا نتیجہ ہو وہاں یہ بھی عین ممکن ہے کہ اصل علت باطنی کیفیت ہو اور علا
جسمانی کی حیثیت معلول کی ہو ۔ واللہ اعلم !۔
"اندیشہ ہائے دور و دراز" کے ضمن میں اوّلین معاملہ تو خود پاکستا
اور اس کے مستقبل کا ہے، جس کے ضمن میں اندرونی و بیرونی دونوں اعتبا
سے معاملہ مخدوش سے مخدوش تر ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ چنانچہ ایک طرف م
یہ ہے کہ ایک ملک اور قوم کی عمرِ عزیز کے تینتیس سال گذرنے کے باوجود ابھ
معاملہ تصفیہ طلب ہی ہے کہ یہاں نظامِ حکومت کیا ہو ۔ گویا اس کے اغ
سے تاحال ہم بلوغ کی عمر کو نہیں پہنچے بلکہ ابھی عہدِ طفلی ہی میں ہیں ۔ ہمارا
حالت کے کسقدر مناسب ہے یہ شعر کہ ؎
چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حالِ طفلی نگشت
آج سے ۲۸ سال قبل جب راقم میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور ا
جمعیت طلبہ کے آرگن ہفتہ وار "عزم" کو ایڈٹ کرتا تھا تو ان دنوں بھی پاک
کے "دستور" کا مسئلہ مختلف فیہ تھا چنانچہ جس طرح آج کل بعض اخبارات ا
مسئلے پر خطوط و آراء شائع کر رہے ہیں بالکل اسی طرح راقم نے بھی "عزم"
میں اس مسئلہ کو عنوان بنا کر اس کے ذیل میں مضامین اور خطوط کی اشاعت کا سل

ان سب پر مستزاد اور ان سب سے بڑھ کر قابل حذر اندیشہ یہ ہے کہ بعض مسلمان ممالک میں اسلام کے احیاء و نفاذ کے ضمن میں زبان کا جھاگ جس قدر زور و شور اور شد و مد سے پھیلایا گیا ہے بغیر اس کے کہ اس کے اساسی اور ناگزیر ابتدائی لوازم (RPRE - REQUISITES) کا مناسب حد تک اہتمام کیا گیا ہو اس کے نتیجے میں خدانخواستہ ایک شدید ردِ عمل نہ پیدا ہو جائے - اور مایوسی اور بددلی (FRUSTRATION) کی لہر عالم اسلام کی نوجوان نسل کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے --- اور وہ دین کی جانب سے بالکل دل برداشتہ (DISILLUSION) ہو کر نہ رہ جائے ---

الغرض یہ --- اور اسی قبیل کے بہت سے دوسرے خدشات، جن کا ذکر فی الوقت مناسب نہیں ہے - دل و دماغ پر قابض ہیں اور ان کا ایک شدید دباؤ راقم کے اعصاب پر ہے، جس کے نتیجے میں "قبض" کی کیفیت طول کھینچتی چلی جا رہی ہے -

ان حالات میں جب گذشتہ سال کی طرح اس سال بھی کینیڈا اور امریکہ سے دعوت موصول ہوئی تو راقم نے خیال کیا کہ شاید "انشر" کے مانند اب بھی دو تین ماہ کے لئے ملک سے باہر چلے جانا جسمانی صحت کی بحالی اور باطنی "قبض" کے ازالے کے ضمن میں مفید ثابت ہو - لہٰذا اس کے باوجود کہ اس وقت اندرونِ ملک راقم کی سرگرمیاں بہت حد تک منجمد ہیں راقم نے "باہر" کی یہ دعوت قبول کر لی -

گذشتہ سال کے دورۂ امریکہ، کینیڈا اور مصر کی روداد کی پہلی قسط اس سال جنوری اور فروری کی مشترک اشاعت میں شائع ہوئی تھی۔ خواہش تو شدید تھی کہ اس سال کے سفر سے قبل اس کا بقیہ حصہ بھی ضبطۂ تحریر میں آ جاتا اور "میثاق" میں شائع ہو جاتا - لیکن "ما شاء اللہ کان و ما لم یشأ لم یکن" کے مطابق یہ خواہش پوری نہ ہو سکی -

گذشتہ سال یوں تو امریکہ اور کینیڈا کے بہت سے شہروں میں جانا ہوا تھا لیکن جم کر کام صرف ایک ہی مقام یعنی ٹورنٹو میں ہوا تھا - جہاں مسلسل دو ہفتے

د۔ جبر دے کر کم از کم اپنی حد تک تو اسے بھارت کے چرنوں میں پیش کر ہی چکا ہے ۔ حال ہی میں بھارت میں امریکی سفیر مسٹر گوہن نے جو برسرِ عام اور برملا گل افشانی کی ہے اس امر کے بعد بھی اگر کوئی اس معاملے میں شک کرتا ہے تو اس کی سادہ لوحی یقیناً قابلِ داد ہے ۔ الغرض بیرونی صورت حال اس شعر کی کامل مصداق ہے کہ ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

پاکستان سے آگے عالمِ اسلام پر نگاہ ڈالئے تو وہاں بھی اکثر و بیشتر معاملہ دگرگوں ہی نظر آتا ہے ۔ افغانستان ع ” ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو “ کی تصویر بنا ہوا ہے ۔ نہتے شہری اور مجاہدینِ حریت مرتے ہیں تو وہ بھی مسلمان ہیں اور ادھر سرکاری افغان فوج کے لوگ مارے جاتے ہیں تو وہ بھی کلمہ گو ہیں اور انہوں نے بھی مسلمان ماؤں کا دودھ پیا ہے ـــ لاکھوں کی تعداد میں قتل اور بے خانماں تو مسلمان ہی ہوئے ہیں ، روسیوں کا نقصان تو سینکڑوں میں نہیں تو زیادہ سے زیادہ ہزاروں میں ہوا ہوگا ـــ ایران میں پورا معاملہ MELTING POT میں نظر آتا ہے ۔ پہلے سابق و آنجہانی شاہ نے خون کی ہولی کھیلی تھی تو اب ” انقلاب “ اپنا بدلہ چکاتا نظر آ رہا ہے ۔ اور سب سے بڑھ کر یہ شدید اندیشہ ہے کہ کہیں راسخ العقیدہ علماء اور لبرل مسلمانوں کے مابین کشمکش مسلح تصادم کی صورت اختیار نہ کر لے ـــ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو سارا فائدہ کمیونسٹوں کو پہنچے گا اور ع ” خود بخود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح ۔ دیکھیے گرتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ ! “ کے مصداق ایران از خود روس کے ہتھے چڑھ جائے گا ! ـــ عرب ممالک میں تو ان کے اختلافات جوں کے توں ہیں ، بعض کا رخ امریکہ کی جانب ہے تو بعض کا روس کی جانب ـــ حد ہے کہ افغانستان میں روس کی موجودہ ننگی جارحیت کے باوجود بھی بعض مسلمان ممالک کے کھلاڑیوں نے ماسکو اولمپکس میں حصہ لیا ع ” خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے ! “

شکاگو سے ویسے تو راقم کو واپسی کے سفر کے لئے سیدھے نیو یارک آجانا چاہیئے تھا لیکن چونکہ ٹورنٹو میں جماعت اسلامی کے حلقۂ احباب سے معلوم ہوا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کی صحت اب رو بہ اصلاح ہے اور امید ہے کہ چند روز اوران سے ملاقات ہوسکے گی لہٰذا میں نے ٹورنٹو سے شکاگو جاتے ہوئے واپس ٹورنٹو ہی آنے کا پروگرام بنالیا تھا تاکہ وہاں سے احباب کے ہمراہ بفلو جاکر مولانا سے ملاقات کی جاسکے (واضح رہے کہ بفلو نیاگرا سے بہت قریب ہے اور نیاگرا ٹورنٹو سے کل اسّی میل کی مسافت پر ہے!) — لیکن مشیئتِ الٰہی سے مولانا سے زندگی میں ملاقات کی حسرت تو دل ہی میں رہ گئی اور شکاگو سے بفلو جاکر صرف ان کی صورت دیکھنے اور نمازِ جنازہ ادا کرنے کا موقع مل سکا — بہرحال میں پروگرام کے مطابق شکاگو سے واپس ٹورنٹو آیا — اور پھر وہاں سے دو دن بعد نیو یارک گیا — جہاں خیال تو صرف یہ تھا کہ کچھ سیر ہوجائے گی اس لئے کہ وہاں پہلے سے رابطہ کسی سے بھی نہ تھا۔ لیکن وہاں کے پانچ دن حددرجہ مصروف گزرے — درسِ قرآن کی بھی کئی نشستیں ہوئیں اور بعض ملاقاتیں بھی بالکل اسی نوعیت کی ہوئیں جیسی شکاگو میں ہوئی تھیں، مولانا یوسف اصلاحی (جماعت اسلامی ہند) اور ان کے برادران نسبتی، مزمّل اور مدثّر صاحبان کی ملاقات سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ مولانا ناظم ندوی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، (مدثّر صاحب ان کے داماد ہیں!) مزمّل صدیقی صاحب رابطہ عالم اسلامی کے نیو یارک کے دفتر میں اہم منصب پر فائز ہیں ان سے ملاقات کے ضمن میں اس دفتر کی سیر بھی ہوگئی۔ جمعیت طلبہ کے زمانے کے ایک ساتھی عارف حسین عارف صاحب سے بھی ایک طویل عرصے کے بعد ملاقات ہوئی۔ اور سٹیٹن آئی لینڈ میں واقع ان کے مکان پر بھی جانا ہوا اور وہیں ڈاکٹر قیصر صاحب کے مکان پر درسِ قرآن کی ایک نشست بھی ہوئی — اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلم سنٹر آف نیو یارک میں درسِ قرآن کی دو نشستیں ہوئیں جن میں بعض نہایت ذہین اور فعال نوجوانوں سے تعارف حاصل ہوا۔ جن میں انور حسین صاحب، ذکاءاللہ صاحب، شمشیر علی بیگ صاحب، ظہیر صاحب، حیدر امام صاحب اور محمد رفیع صاحب قابل ذکر ہیں۔ افسوس کہ راقم وہاں سے آنے کے بعد ان حضرات سے رابطہ نہ رکھ سکا —

تک روزانہ درس کا سلسلہ بلاناغہ جاری رہا تھا اور سامعین کی تعداد بھی وہاں کے حالات کے اعتبار سے ناقابلِ اعتبار حد تک کثیر تھی اور ان کی عظیم اکثریت کی شرکت مسلسل بھی تھی اور باقاعدہ بھی۔ اس کے علاوہ کینیڈا میں مانٹریال، اور اٹاوہ ایسے بڑے اور اہم شہروں کے ساتھ ساتھ نیاگرا، کچر اونٹوا، وغیرہ ایسے "قصبات" میں بھی جانا ہوا اور وہاں بھی ایک ایک دو دو نشستیں درس قرآن کی ہوئیں — ریاستہائے متحدہ امریکہ کے شہروں سے بالٹی مور، واشنگٹن اور ڈلاس کا ذکر تو مطبوعہ روداد میں ہو چکا ہے، ان کے علاوہ دو تین دن شکاگو میں بھی بسر ہوئے تھے۔ جہاں درس قرآن کی ایک نشست ڈاؤنرز گروو میں ڈاکٹر خورشید ملک صاحب[1] کے مکان پر ہوئی تھی۔ اور ایک تقریر مسلم کمیونٹی سنٹر میں اور ایک خطاب "اسلامک فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام ہوا تھا — اس کے علاوہ وہاں بہت سے حضرات سے مفصل ملاقاتیں ہوئی تھیں جن کی خوشگوار یاد بھی ابھی تک حافظے میں موجود ہے۔ اور ع "خدایا آں کرم بارِ دگر کن!" کے مصداق ان کی تجدید کی خواہش بھی شدید ہے — ان میں سے نمایاں نام ڈاکٹر وصی اللہ خاں صاحب، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب، ڈاکٹر سید اسد حسین صاحب اور برادرم عرفان احمد خاں صاحب کے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شکاگو ایک شہر نہیں پورا ملک ہے۔ اس کے لئے گذشتہ سال میں صرف تین دن نکال سکا تھا اور ان میں سے بھی ایک دن بفلو کے سفر میں گذر گیا۔ اس لئے کہ ۲۲ ستمبر کو وہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے انتقال کی اطلاع ملی تھی اور وہیں سے میں برادرم ڈاکٹر ظفر الحق انصاری اور چار پانچ دیگر حضرات کی معیت میں بفلو جا کر مولانا کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوا تھا۔ بنابریں شکاگو میں کام بہت کم ہو سکا تھا۔ اب اس سال شکاگو میں بھی بالکل ٹورنٹو ہی کی طرح مسلسل دو ہفتے کے قیام اور درسِ قرآن کا پروگرام ہے۔ اُمید واثق ہے کہ وہاں بھی ٹورنٹو ہی کی سی کیفیت رہے گی۔ واللہ اعلم! (شکاگو میں درس اس سال ۱۲ اگست ۲۶ اگست تک ہے گا۔ ان شاء اللہ!)

---

[1] ڈاکٹر صاحب کا ایک خط بھی شاملِ اشاعت ہے۔

گاہے گاہے باز خواں ... ماخوذ از ... میثاق اکتوبر ۷۷ء

تذکرہ وتبصرہ

انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی ہوگئے اور نہ صرف انتخابی بلکہ ہر قسم کی سیاسی سرگرمی پر پابندی لگ گئی۔ اور اس طرح پاکستان کی تیس سالہ تاریخ کے تیسرے مارشل لاء کا دورِ اوّل ختم ہوگیا اور دورِ ثانی شروع ہوگیا۔

موجودہ مارشل لاء کا نفاذ ابتداءً محدود مقاصد اور متعین مدت کے لیے ہوا تھا۔ اور اس کی نوعیت ملک کے سیاسی و جمہوری عمل میں ایک وقتی رکاوٹ (IMPASSE) کو دُور کرنے والی فوری و عارضی اصلاحی تدبیر (TEMPORARY CORRECTIVE-MEASURE) کی تھی۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے 'OPERATION FAIR-PLAY' کے تحت اقتدار سنبھالتے ہی انتخابات کے لئے نوّے دنوں کی مدت بھی معین کردی تھی۔ اور اس عزم کا اظہار بھی کردیا تھا کہ وہ سیاسی عمل کے اہم اور نازک مرحلے یعنی عام انتخابات میں صرف ریفری کا کردار سرانجام دیں گے اور اپنی جملہ مساعی کو صرف آزاد اور غیر جانبدار انتخاب منعقد کرانے پر مرتکز رکھیں گے۔

لیکن جلد ہی صورتِ حال تبدیل ہوگئی، اور بقول خود اُن کے جو حقائق و واقعات ان کے سامنے آئے انہوں نے انہیں ہلا کر رکھ دیا اور وہ 'احتساب' کا عمل شروع کرنے پر مجبور ہوگئے اور اور یہی 'احتساب' کا عمل بالآخر اس پر منتج ہوا کہ انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی اور 'احتساب' کے ساتھ ساتھ 'اصلاحِ حال' اور 'تعمیرِ نو' کی جدوجہد شروع! اس طرح اب مارشل لاء کے جس دَور کا آغاز ہوا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت مشابہ ہے اس پہلے مارشل لاء سے جو ۱۹۵۸ء میں سابق صدر ایوب نے نافذ کیا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی مدت کتنی طویل ہوگی!

ان حالات میں دو سوالات تو وہ ہیں جو ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بنے ہوئے ہیں یعنی ایک یہ کہ اب کیا ہوگا؟ کیا حالات واقعۃً درست ہوجائیں گے؟ یا یہ بھی ایک عارضی وقفہ ہی ثابت ہوگا اور ملک پھر دو متحارب قوتوں کے تصادم کی جولان گاہ بن جائے گا؟ اور آیا یہ ملک

بہر حال اُمید ہے کہ اب پھر ان حضرات سے ملاقات ہو گی اور کیا عجب کہ آئندہ کے لئے مستقل رابطے کی صورت پیدا ہو جائے۔

نیو یارک کے ذکر میں بڑی کمی رہ جائے گی اگر دو حضرات کا تذکرہ نہ ہو: ایک استاذ مکرم ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب مرحوم و مغفور کے صاحبزادے ڈاکٹر نعیم اللہ صاحب جو عربی کہاوت "الولدُ سِرٌّ لِابیہ" کا مجسم ثبوت ہیں، وہی شکل و صورت، وہی ڈیل ڈول، اسی طرز کی داڑھی اور مزاج میں وہی تواضع اور ملنساری ــــ ان سے راقم کی یہ پہلی ملاقات تھی لیکن انہوں نے شرمندہ کر دینے کی حد تک تواضع کی۔ اور دوسرے راقم کے رفیق و معاون اور یکے از مؤسسین مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور۔ میاں محمد رشید صاحب کے صاحبزادے طارق رشید جن کا اپنا علمی رجحان تو نالالِ دینی یا دینی سرگرمیوں کی جانب زیادہ نہیں ہے تاہم انہوں نے نہایت محبت اور احترام کے ساتھ راقم کی مہمان نوازی کی اور حد درجہ اصرار کے ساتھ قیام اپنے ہی پاس رکھا۔

گذشتہ سال راقم نے شمالی امریکہ میں کُل ۴۲ دن صرف کئے تھے، یعنی از ۱۲؍ اگست تا ۲؍ اکتوبر، اس سال پھر ان شاء اللہ ۲۳؍ اگست کو کراچی سے براستہ نیو یارک سیدھے ٹورنٹو جانا ہو گا۔ ستمبر کے اواخر تک کا پروگرام تو ٹورنٹو اور شکاگو کا ہی ہے ــــ اس کے بعد نیو یارک وغیرہ میں کتنے دن لگیں یہ اللہ ہی کو معلوم ہے ــــ بعد ازاں لندن جانے کا پروگرام ہے ــــ اور خیال یہ ہے پاکستان سے کل غیر حاضری ڈھائی ماہ سے زیادہ نہ ہو۔ تاہم چونکہ یہ پورا عرصہ تو اللہ نے چاہا تو "بامشقت" ہو گا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اگر اس 'تبدیلی' سے صحت بحال نہ ہوئی تو راقم واپسی پر پھر 'ارضِ مقدس' کا رخ اختیار کرے اور وہاں کی روحانی برکات کے ذریعے اپنے 'قبض' کے ازالے کی کوشش کرے مقصدِ زندگی اور نصب العین کی جانب پیشقدمی کے ضمن میں ازسرِ نو STOCK-TAKING کے بعد آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں کچھ منصوبہ بندی کر کے آئے، اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الحقَّ حقًّا وارزقنا اتّباعَہٗ وارِنا الباطِلَ باطِلًا وارزقنا اجتنابہٗ واھدنا یاربنا برحمتك سُبُلَ السّلامِ واجعلنا بفضلك من الرّاشدین آمین یاربَّ العٰلمین ــــ!!

جاگنے سے کیا حاصل ! ـــ بفحوائے الفاظِ قرآنی : "یَوۡمَئِذٍ یَّتَذَکَّرُ الۡاِنۡسَانُ وَ اَنّٰی لَہُ الذِّکۡرٰی"
یعنی ـــ "اُس روز ہوش آئے گا انسان کو! لیکن تب ہوش میں آنے کا کیا فائدہ ؟" یا بقولِ شاعر
ع۔ "جب آنکھ کھلی گُل کی تو موسم تھا خزاں کا !"

اِس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ملک وملّت کو اس کے اصل نصب العین سے منحرف کرنے اور قوم کی سیاسی واجتماعی گاڑی کو پٹڑی سے اُتارنے کے جرم کا اصل مجرم کون ہے ؟ وہ قیادتِ عظمٰی جو اس ملک کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی تھی یا اُس کے وہ حواری اور ہم سفر جن کی اکثریّت کو خود اس نے "کھوٹے سکّوں" سے تشبیہ دی تھی، یا وہ نیم مذہبی و نیم سیاسی جماعتیں جنھوں نے چھوٹتے ہی قصرِ قیادت وسیادت اور ایوانِ حکومت پر ہلّہ بولنا لازمی وناگزیر سمجھا۔ یا وہ علماء و مذہبی پیشوا جنھوں نے صرف 'تنقید' ہی کو کل فرض سمجھا یا وہ مہاجر جو آگ اور خون کے دریا عبور کرکے پاکستان آئے لیکن یہاں پہنچتے ہی ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دولت پر بالکل گِدھوں کے سے انداز میں لوٹ کر گرے، یا وہ مقامی آبادی جس نے پاکستان کے قیام کو اپنے حق میں بالکل "مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ" کے مترادف جانا اور اِس خوانِ نعمت کی ذمّہ داریوں کی جانب نگاہ ہی نہ کی !ـــــ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ جُرم کسی ایک فرد یا جماعت کا نہیں ہے' اس حمام میں پُوری قوم اور اُس کے تمام طبقات ننگے ہیں۔ یہ ہمارا وہ اجتماعی جُرم ہے جس کی سزا ہم بھگت رہے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک بُھگتیں گے ! (اِس موضوع پر جناب زیڈ۔اے سلیری صاحب کے ایک مضمون کا عنوان بڑا ہی پیارا تھا ـــ
("THE LEARNED ALSO FAILED!")

الغرض !ـــ مجرم اور قصوروار خواہ کوئی بھی ہو اس سے اس اصل صورتِ واقعہ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا جو اس وقت بالفعل موجود ہے ـــ یعنی یہ کہ مادّہ پرستی اور لادینیّت نے سرطان کے پھوڑے کی طرح ہمارے پورے جسدِ ملّی میں گہری جڑیں جما لی ہیں۔ اب سے لگ بھگ دس سال قبل تک مادّیت اور الحاد کو معاشرے کے پڑھے لکھے اور اعلیٰ طبقات کے 'فکری انداز' یعنی INTELLECTUAL CULT کی حیثیت حاصل تھی لیکن ماضی قریب میں ذرائع ابلاغِ عامّہ (MASS MEDIA) کے طفیل SECULARISATION کا یہ عمل قوم کے انتہائی نچلے طبقات تک نفوذ کر گیا ہے اور عوام کی ایک عظیم اکثریّت کے قلوب و اذہان شعوری یا غیر شعوری طور پر اس زہر سے مسموم ہو چکے ہیں ـــ اب ظاہر ہے کہ "مادّیت" کے

قائم بھی رہے گا یا نہیں؟ وقِس علیٰ ھٰذا ــــ اور دوسرے یہ کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ ہماری قومی و ملّی زندگی کو استحکام کیوں نصیب نہیں ہو رہا؟ ہماری ملکی سیاست کی گاڑی کا انجن بار بار بند کیوں ہو جاتا ہے؟ اور ہم ایک دائرے ہی میں کیوں حرکت کئے چلے جا رہے ہیں؟ ــــ اور ایک سوال وہ ہے جس پر ہر ذی شعور پاکستانی مسلمان کو اپنی سوچ کو مرتکز کر دینا چاہیئے کہ اِن حالات میں کرنا کیا چاہیئے؟ اور اس مخمصے سے نجات کی سبیل کون سی ہے؟

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے تو اگرچہ آئندہ کے حالات اُمورِ غیبی کے ذیل میں آتے ہیں، جن کا کوئی حتمی اور یقینی علم سوائے انبیاءِ کرام کے اور کسی انسان کو نہیں ہو سکتا، اور نبوت کا دروازہ کُلّیتہً اور مستقلاً بند ہو چکا ہے۔ تاہم حالات کی رفتار اور موجود الوقت ظروف و احوال کے تجزیے سے ایک اندازہ ہر سوچنے سمجھنے والا انسان خود بھی قائم کرتا ہے، اور اس ضمن میں دوسروں کی رائے بھی معلوم کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم سے بھی بہت سے رفقاء و احباب نے اس قسم کے سوالات کئے جن کا جواب گفتگوؤں میں بھی عرض کیا جاتا رہا ہے اور اب اختصار کے ساتھ تحریراً بھی پیشِ خدمت ہے۔

ہماری رائے میں صورتِ حال اس سے بہت زیادہ خراب اور مایوس کُن ہے جتنی کہ وہ بظاہر نظر آتی ہے۔ اور اس کے باوجود کہ ہمیں نہ صرف یہ کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کی نیّت پر کوئی شبہ نہیں بلکہ خدا گواہ ہے کہ ہم انہیں ایک نہایت شریف، دیندار اور مخلص مسلمان سمجھتے ہیں، ہمیں مستقبل قریب میں اصلاحِ احوال کی کوئی امید نظر نہیں آتی اور آئندہ کم از کم دس برس تک تو یہی نظر آتا ہے کہ ہماری ملکی و قومی زندگی کی ناؤ ڈولتے ہی چلے گی۔ بلکہ کوئی عجیب نہیں کہ کسی سقوطِ مشرقی پاکستان ایسے بڑے حادثے سے بھی دوچار ہو جائے!

قومی و اجتماعی سطح پر احتساب کا ہمہ گیر عمل، ترویجِ شریعت کی مبارک و مسعود کوشش اور نظامِ تعلیم کی اصلاح اور تعمیرِ نو ایسے اقدامات جن کے لیے سرتوڑ کوشش اس وقت جنرل ضیاء الحق صاحب کر رہے ہیں، کاش کہ ان کا آغاز قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہو جاتا۔ اُس وقت فضا حد درجہ ساز گار تھی اور قلوب و اذہان اس کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، لیکن افسوس کہ ہم نے نہ صرف یہ کہ وہ موقع کھو دیا بلکہ کوئی تیس سال بالکل مخالف سمت میں تیزی کے ساتھ دوڑنے میں صرف کر دیئے اور اب جب کہ ایک انگریزی مقولے کے مطابق وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ کر گزر چکا ہے اور حالات بالکل دوسری انتہا کو پہنچ چکے ہیں، ہم اگر جاگے بھی تو اس

ع ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آج سے چند سال پہلے جب جماعت اسلامی پاکستان (کالعدم) سیاست کی دلدل میں بری طرح پھنس چکی تھی، کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ جماعت کے حلقے میں "سیاست بیزاری" کا اظہار بھی ممکن ہے۔ عملی سیاست میں پڑ کر جماعت کے اکابر و اصاغر یہ بات ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ مغربی جمہوریت کے جس تصور کو لے کر وہ سیاست بازی کر رہے ہیں اُس کے نتیجے میں اُن کی تمامتر سرگرمیوں کا حاصل سطحی نمود و نمائش، قوت کے بے جا اظہار اور اسلام کو "نظریہ ضرورت" کی حد تک برتنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اُس دور میں جن لوگوں نے جماعت کے اعیان و انصار کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ:

"انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ بڑی خام خیالی پر مبنی ہے، بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی اُمید کی جائے۔ ویسے بھی ہمارے رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں" (قراردادِ تاسیس تنظیم اسلامی)

تو "تحریک اسلامی" کے جانثاروں نے انہیں عافیت کوشی، مصلحت پسندی اور سرکار پرستی کا طعنہ دیا جو اسلامی نظام کے نفاذ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

جب جماعت کے کچھ بہترین لوگ علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تو بھی جماعت والے اپنے طریقِ کار یا اندازِ فکر میں تبدیلی لانے پر آمادہ نہ ہوئے اور ملکی سیاست ہی کو دین کا تقاضا اور اسلام کا مدعا و مقصود سمجھتے رہے اور پچھلے چند سال میں تو جماعت سیاست کے کھیل میں کچھ اس طرح سے الجھی کہ اُن جماعتوں سے بھی آگے بڑھ گئی۔ جو ملکی سیاست ہی کو اپنا منتہا و مقصود قرار دیتی ہیں۔ بائیں بازو

سیلاب کا فطری رُخ "جدلی مادیت" ہی کی جانب ہوتا ہے، لہٰذا آپ چاہیں تو اسے قسمت کی ستم ظریفی قرار دے لیں (IRONY OF FATE) ۔ بہرحال واقعہ یہی ہے کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور جسے دَورِ جدید میں اسلام کی ایک تجربہ گاہ بنانا مقصود تھا عوامی سطح پر تیزی کے ساتھ 'خالص مادیت' ہی نہیں 'جدلی مادیت' کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور اگر اس دھارے کا رُخ حقیقی روحانیت اور واقعی خدا پرستی کی طرف نہ موڑا جا سکا تو کوئی سطحی اور مصنوعی تدبیر حالات کی رفتار کو نہیں روک سکتی۔ گویا بقول علامہ اقبالؔ: ؎

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے و لیکن پیرانِ کلیسا کی دُعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس عرصے میں مختلف دینی تحریکوں اور مذہبی جماعتوں کے زیرِ اثر قوم کے طبقۂ متوسطہ میں مذہبی رجحان اور شعائرِ دینی کے ساتھ عملی وابستگی میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ 'مذہبیت' اکثر و بیشتر ایک ایسے خالی خول کے مانند ہے جس میں نہ حقیقی رُوحانیت کی چاشنی موجود ہے اور نہ واقعی خدا پرستی اور آخرت طلبی کی رُوح۔ چنانچہ وہ یا تو نری رسم پرستی (RITUALISM) کی حیثیت رکھتی ہے یا صرف ایک عقلی و ذہنی ورزش اور ایک مخصوص تہذیبی اور ثقافتی انداز (SOCIAL CULT) کی، اِلّا ماشاءاللہ!

لہٰذا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ہمارے یہاں اس وقت اصل تصادم ان ہی نچلے اور متوسط طبقات کے مابین ہے۔ اور ان دونوں طبقوں کے اصل دھاروں (MAIN CURRENTS) کا رُخ بالکل مخالف سمت میں ہو گیا ہے۔ چنانچہ نچلے طبقات تیزی کے ساتھ مادیت، لادینیت اور سوشلزم کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ جبکہ طبقۂ متوسطہ کے فعّال عناصر اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بنیاد پر منظم ہو رہے ہیں، اور حاکم بدہن! ہمارے تجزیے کے مطابق اُن کے مابین ایک فیصلہ کُن تصادم ناگزیر ہو چکا ہے۔ اِس پورے معاملے میں دلچسپ ترین امر یہ ہے کہ سب سے اوپر کا طبقہ فی الحال بندر کے مانند ترازو ہاتھ میں لئے بیٹھا ہے اور دو طرفہ فوائد حاصل کر رہا ہے۔ چنانچہ "غریبوں" کی قیادت کی اجارہ داری بھی اسی کے پاس ہے اور "مذہب" کی سرپرستی کی ٹھیکہ داری بھی! ۔ لیکن ہمارا اندازہ یہ ہے کہ یہ 'گھپلا' اب زیادہ دیر نہیں چل سکے گا اور اصل متحارب قوتوں کی یہ صف آرائی (POLARISATION) تیزی کے ساتھ اپنی منطقی انتہا پہنچ کر رہے گی۔ چنانچہ سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے مابین بھی ایک بالکل نئی صف بندی (RE-ALIGNMENT) دائیں اور بائیں بازوؤں کی تقسیم اور مرکزیت پسند اور مرکز گریز رجحانات کے تصادم کی بنیاد پر ہو گی۔

سمجھنے کے قابل ہو جائیں کہ اسلام کی قوت کس صورت میں ہے اور اس کا ضعف کس صورت میں ۔ (دعوت اسلامی کا اصل مدّعا و مقصود واضح کرنے کے بعد کس قدر واضح انداز میں اعترافِ ناکامی) یہ ہے کارِ دعوت مجھے اندیشہ ہے کہ ہم اس بنیادی کام میں اپنے ہدف سے پیچھے نہ رہ گئے ہوں اور رفتارِ کار کے لحاظ سے سُست گام ہو گئے ہوں“)

جب جماعت کے بزرگوں سے کہا جاتا تھا کہ ۱۹۴۷ء سے قبل جماعت نے خاموشی سے جو کام کیا وہی اصل میں دعوتِ اسلامی کا صحیح طریقہ کار ہے اور ہلڑ بازی کی سیاست اور نعروں سے لبریز جوش و خروش سوائے وقتی ہنگامہ آرائی کے کوئی مفید برگ و بار نہیں لایا کرتا تو یہ جماعتی احباب خاصے جزبز ہوا کرتے تھے لیکن اب بڑی صاف گوئی سے کہا جا رہا ہے کہ ”حالانکہ جوشیلی تقریریں ہوں یا جلسے جلوس یا پوسٹر یا بیانات یہ ساری چیزیں اظہارِ قوت نمائش قوت کی تعریف میں آتی ہیں .... نمائش قوت سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو مغالطے دیئے جا سکتے ہیں اور کسی معرکہ مسلسل میں جزوی طور پر مغالطہ انگیزی بھی فائدہ دے جاتی ہے مگر فی الحقیقت مستقل دارو مدار اصل قوت پر ہوتا ہے کہ وہ کتنی ہے؟“

اس سخن گسترانہ گفتگو کے بعد ترجمان القرآن کی ہوش مندانہ اور خود احتسابی کے جذبے سے معمور تحریک کے زوردار مقطعے میں تو جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل وہی ہے جو تنظیم اسلامی کے امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور ان کے ساتھی گزشتہ پندرہ بیس سال سے کہہ رہے ہیں اور جس پر جماعت اسلامی کے احباب کی نظر میں وہ معتوب بھی ہیں لیکن اس سے پہلے ”میثاق“ لاہور میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے قلم سے ایک تحریر کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے تاکہ اب تک کی گفتگو سے آپ کوئی نتیجہ اخذ کر سکیں۔

”اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارے دل میں ایک بے اختیار سی ہوک اٹھتی ہے جب ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ برصغیر کی ایک اچھی بھلی دینی تحریک جو صورتحال کی صحیح تشخیص کے ساتھ ایک بہت حد تک صحیح طریق کار پر برسرِ عمل تھی — وہ بھی قیامِ پاکستان کے وقت حالات اور مواقع کی ایک وقتی سی ترغیب و

کی چند سخت جان جماعتوں نے حقیقتاً سیاست کے دھارے سے ہٹ کر اپنی اُصول پسندی کا ثبوت دینے کی کوشش کی لیکن جماعت اسلامی (کالعدم) ہر چہ بادا باد کے مصداق ہر قیمت پر سیاست کا کھیل کھیلنے پر آمادہ نظر آئی اور بعض اوقات فاؤل بھی کھیل گئی۔ ممکن ہے یہ صورت حال مزید کئی سال برقرار رہتی مگر موجودہ فوجی حکومت نے سیاست کو شجرِ ممنوعہ قرار دیکر سیاسیئن کو ہوش کے ناخن لینے کی بالواسطہ تلقین کی تو ہمارا اندازہ ہے کہ جماعت کے سیاست زدہ یا یوں کہیئے کہ سیاست میں غرق افراد کو چھوڑ کر ان لوگوں کو جو جوش میں بھی ہوش کا دامن بہت کم چھوڑتے اور ماضی و حال کا جائزہ لے کر اپنی خامیوں اور کوتاہیوں سے صرف نظر کرنے کے بجائے انہیں دُور کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اپنے گریبان میں جھانکنے، اپنی تیس سالہ بعد از تقسیم ملک (ہندوستان) کارکردگی کا جائزہ لینے اور نفع، نقصان کا اندازہ کرنے کا موقع ملا۔ سیاست کی کساد بازاری نے گہرے غور و فکر کی راہ سجھائی اور ہمیں خوشی ہے کہ اس سوچ بچار کا نتیجہ ترجمان القرآن، جون ۱۹۷۰ء کی اس تحریر کی صورت میں برآمد ہوا''

''پارلیمانی سیاست کی ساری توجہ حالات کے مدّ و جزر پر ہوتی ہے، کون قیادت پر آگیا ہے؟ کسے وزارت مل گئی؟ کیا قوانین پاس ہوگئے، ٹیکس کتنے لگا دیئے گئے؟ داخلی اور خارجی پالیسیاں کیا ہیں؟ وغیرہ''۔

''میرا خیال ہے کہ پچھلے ادوار میں ہماری توجہات کو واقعاتی مدّ و جزر (؟) نے اپنی طرف اس درجہ منعطف کیئے رکھا کہ ہماری ساری گفتگوئیں، بیانات، اعلانات، خط و کتابت انہی کے حوالے سے ہوتی رہی ہے اور انہی کے حل اور توڑ سوچے جاتے رہے ہیں۔ متوازی طور پر جو زور کارِ دعوت پر دیا جاتا تھا وہ نہیں دیا جا سکا ہے۔ (چند سطر آگے) یعنی اب ہمارا طریقہ لوگوں کو اسلام کی اصل دعوت کی طرف کھینچنے کا نہیں، بلکہ وقت کے مسائل اور اُن کے حل کی طرف کھینچنے کا ہے۔ ہم یہ تو کہتے ہیں کہ فلاں چیز ہو جائے تو اسلام کا علم بلند ہوگا اور فلاں کو روکا جائے تو اسلام کو نقصان پہنچے گا مگر اب ہم اسلام کی اساسی تعلیم کو لوگوں میں ایسے طریقے سے نہیں پھیلاتے کہ وہ خود یہ بات

(اشارات ۔ ترجمان القرآن جون ۱۹۸۰ء)

حالانکہ جماعت کے ان فرزانوں کو کون سمجھائے کہ بالکل یہی باتیں دردمندانہ انداز میں چوبیس سال قبل ایک "دیوانے" ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کہتے رہے اور جماعت والوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف ماچھی گوٹھ کے اجتماع ۱۹۵۷ء میں یہ قرارداد پیش کی:

میں تجویز کرتا ہوں کہ جماعتِ اسلامی پاکستان کا یہ اجتماع ارکان حسب ذیل قرارداد پاس کرے۔

"جماعتِ اسلامی پاکستان کا یہ اجتماع ارکان بہت سوچ و بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ اگرچہ جماعت نے پچھلے پندرہ سالوں میں اپنے نصب العین سے اصولاً انحراف نہیں کیا ہے لیکن ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے جو طریق کار جماعت نے اختیار کیا تھا اور جس پر جماعت تا امروز عمل پیرا ہے وہ مجموعی طور پر اس طریق کار سے بالکل مختلف ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی ۔ یہ طریق کار اپنے سابقہ طرزِ عمل سے مختلف بلکہ متضاد ہونے کے علاوہ پاکستان کے عوام اور اس کے برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں کچھ ایسی خوش فہمیوں اور خود جماعت کی طاقت و وسائل و ذرائع کے بارے میں ایسے اندازوں پر مبنی تھا جو بعد میں کلیتہً درست ثابت نہ ہو سکے ۔ اس طریق کار کے تحت ساڑھے نو سالہ جدوجہد کا منفی طور پر یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا ہے کہ کوئی اور نظام بھی اس ملک میں اپنی جڑیں گہری نہیں جما سکا لیکن مثبت طور پر نظامِ اسلامی کے قیام کے لئے جو کچھ کیا جا سکا ہے وہ اس طویل اور انتھک جدوجہد کے مقابلے میں بے حد کم ہے کہ جو ان نو سالوں میں جماعت کو کرنی پڑی ہے ۔ اس جدوجہد کا ماحصل دستور میں شامل شدہ چند کمزور اور متزلزل اسلامی دفعات اور صرف مسئلہ دستور پر اس ملک کے سوچنے سمجھنے والے لوگوں کی اسلامی نقطۂ نظر سے علمی راہنمائی کے سوا کچھ نہیں ۔ اس عرصے میں نہ تو عوام کی

تحریص (TEMPATAION ـــــــ) کے زیر اثر اپنے موقف سے منحرف اور اپنے نہج کار سے دستبردار ہو گئی اور سطحیت فکر و عمل کا شکار ہو کر وہی خالی خولی نعرے لگانے میں مصروف ہو گئی جن کی شدید مذمت ماضی میں وہ خود کرتی رہی تھی — اور آج جب کہ تقریباً ربع صدی گذر چکی ہے وہ سیاست کے ریگزار میں حکومت و اقتدار کے سراب کے پیچھے بھٹکتی پھر رہی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ (تذکرہ و تبصرہ۔ میثاق۔ مئی ۱۹۶۹ء)

اب ملاحظہ کیجئے ٹیپ کا بند، ترجمان القرآن کا وہ اقتباس جس نے جماعت اسلامی کی قیام پاکستان کے بعد کی پوری حکمت عملی کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ہیں اور جس کے بعد جماعت کے رہنماؤں اور بالخصوص اُن لوگوں کی خدمت میں جو جماعت کا فکری سرمایہ تصور کئے جاتے ہیں۔ یہی عرض کیا جا سکتا ہے

ع ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

"خالص نظریاتی بات یہ ہے کہ سیاست جو بجائے خود ضروری ہے، ایک طرح کی محاذ آرائی ہوتی ہے۔ ہم خیال لوگ ایک طرف اور مخالفین ایک طرف۔ دونوں طرف سے بیان بازی، دونوں طرف سے جوڑ توڑ، دونوں طرف سے چالیں اور ان کی کاٹ اس مشغلے کا مزاج جنگی ہے۔ سیاست کے اسٹیج سے آدمی نرم اور ڈھیلی ڈھالی بات نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرح کا انداز اختیار نہیں کر سکتا کہ "ممکن ہے غلطی ہماری ہو، مگر ہمیں صحیح یہی محسوس ہوتا ہے"، کھینچا تانی جب بڑھتی ہے تو نفرت کی سپرٹ کام کرنے لگتی ہے۔ آپ سٹیج سے جسے حریف قرار دے کر اس پر گولہ باری کرتے ہیں پھر اسی سیاسی سٹیج سے اُسے دلگداز انداز میں دعوتِ اسلامی نہیں دے سکتے، دیں بھی تو عبث ہے . . . . . میں کہتا ہوں کہ سینکڑوں سیاسی کامیابیاں اور ہزاروں سیاسی فتوحات اس جدوجہد پر قربان جس کے نتیجے میں خدا کے بندے، نفس اور ماحول کی قوتوں کی بندگی سے نکل کر صحیح معنوں میں خدا کے بندے بن جاتے ہیں یہی اقامت دین کی جدوجہد کی اصل قوت ہوتے ہیں اور اصل قوت میں اضافہ کرنے کی مہم ہر قسم کے حالات میں جاری رہنی چاہیئے۔"

اسلام کی رو سے - یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی اربابِ اقتدار کو اپیل نہیں کرتی،، (قرار داد تاسیس مع توضیحات حصہ اول تنظیم اسلامی صد ۲۲)

اے کاش کہ اب بھی کالعدم جماعت اسلامی کے بزرگ اپنے سابقہ اور موجودہ طرزِ عمل پر نظر ثانی کریں - ہمارے ذہین جناب نعیم صدیقی صاحب (جو ترجمان القرآن کے "اشارات" لکھتے ہیں) کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت گوارا کرلیں اور نعیم صدیقی صاحب نے جو تجزیہ کیا ہے اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جو بائیس تئیس سال سے کہہ رہے ہیں اس سے اتفاق کرتے ہوئے اس دلدل سے نکلنے کی سعی کریں جس میں پھنس کر وہ اپنی منزل ہی کھوٹی نہیں کر بیٹھے بلکہ اپنے نظریاتی تشخص سے بھی محروم ہو گئے ہیں - اے کاش —

میثاق شمارہ مئی ۱۹۸۰ء (النشر القرآن) میں ایک غلطی کی نشاندھی

جناب جسٹس ظہور الحق صاحب جج سندھ ہائی کورٹ کراچی کا گرامی نامہ:-

مکرمی بندہ ۔ سلام علیکم -

آپ کے ماہنامہ برائے مئی ۱۹۸۰ء کو دیکھا - جزاک اللہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے سورہ توبہ کی تفسیر نہایت ایمان افروز طریقے سے فرمائی - اللہ سب مسلمانوں کو نفاق سے محفوظ رکھے ۔

اسی ماہنامہ کے صفحہ ۴۲ پر سورۃ منافقون کی پہلی آیت کے نقل کرنے میں کاتب سے تقصیر ہوگی اس کی تصحیح کرادیں ۔ " وَاِنَّهُ لَيَشْهَدُ " کے بجائے اعلیٰ " وَاللّٰهُ يَشْهَدُ "، صحیح ہے - واللہ اعلم -

والسلام
فقیر الی اللہ
(دستخط) ظہور الحق
نمبر ۱۳۲ برہٹو روڈ
کراچی

ہم معذرت خواہ ہیں کہ پوری احتیاط کے باوجود " میثاق " مئی ۱۹۸۰ء میں کتابت کی غلطی رہ گئی - توجہ دلانے پر ہم جناب جسٹس ظہور الحق صاحب کے شکر گذار ہیں ۔
ایڈیٹر " میثاق " لاہور

اسلامی نقطۂ نظر سے ٹھوس فکری و ذہنی تربیت کی جا سکی ہے نہ اخلاقی و عملی، اور اس معاملے کا دردناک ترین پہلو یہ کہ اس طریق پر جدوجہد کے دوران جماعت کو نہ صرف اپنے کارکنوں کے سرمایۂ دین و اخلاق اور متاعِ خلوص و للّٰہیت کے ایک حصّے کا ضیاع برداشت کرنا پڑا ہے بلکہ اسے خود اپنی بین الاقوامی، اصولی، اسلامی جماعت ہونے کی حیثیت سے ہاتھ دھو کر ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر لینی پڑی ہے۔

موجودہ طریق کار کے غلط ہونے کے علاوہ جماعت کا یہ اجتماعِ ارکان یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اس کے مطابق جدوجہد کو آئندہ جاری رکھنے کی صورت میں جماعت کو جو خطرات پیش آسکتے ہیں وہاں تمام نتائج و خدشات کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں جو اس طریق کار کو چھوڑ کر سابق طریق کو اختیار کرنے میں پیش آسکتے ہیں۔

بنا بریں جماعت کا یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ موجودہ طریق کار کو اسی لمحہ ترک کر کے اسی طریق کار کو اصولاً دوبارہ اختیار کرنے ہی پر جماعت کی اخروی و دنیوی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے کہ جس پر جماعت کی اساس رکھی گئی تھی۔ چنانچہ یہ اجتماع فیصلہ کرتا ہے کہ ماضی کے بارے میں اس نقطۂ نظر اور مستقبل کے بارے میں اس فیصلے کو اصولاً تسلیم کرنے کے بعد اس کے مطابق آئندہ کا لائحہ عمل تجویز کرنے کے لئے جماعت کے اربابِ حل و عقد جمع ہو کر سوچ بچار کریں اور ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کر کے اس اجتماع کے سامنے پیش کریں۔"

بلکہ تنظیم اسلامی قائم کی تو اس کے ابتدائی اجلاس میں یہ حقیقت واضح کی گئی کہ: "اربابِ اقتدار کی ہر بات کو ہدفِ تنقید بنا لینا یہاں تک کہ اُن کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اُن کی مخالفت میں اس حد تک آگے بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی اُن کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رو سے جائز ہے، نہ

گے اور اسی دن مغرب سے عشاء تک پہلا درس ہوگا۔ سینچر کے دن درس ظہر کی نماز کے بعد سے ہوگا۔ شام کے وقت FUND RAISING DINNER ہے جس میں تقریباً ہزار کے لگ بھگ لوگ ہوں گے۔ آپ سے گذارش ہے کہ اس میں ایک گھنٹہ کا خطاب فرمائیں جس کا آئندہ درسوں کی حاضری پر انشاءاللہ اچھا اثر پڑے گا۔ اسی طرح WORKING DAYS میں درس شام کے وقت اور WEEK ENDS میں دن کے وقت ہوا کریگا۔ مسلمانوں کی جو جماعتیں شکاگو اور اس کے مضافات SUBURBS میں ہیں وہاں آپ کا پروگرام WEEK ENDS پر درس کے وقت کے علاوہ دوسرے اوقات میں رکھا جائے گا۔ انشاءاللہ ہم ابھی سے آپ کے پروگرام کے سلسلہ میں لوگوں کو باخبر کرنا شروع کر رہے ہیں

(۳) یہاں پر ریڈیو اسٹیشن سے اسلامی جرنل کے نام سے بدھ کی شام کو ایک گھنٹہ کا پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس پروگرام میں ایک دو دفعہ آپ کے درس کے ٹیپ بھی سنائے گئے تھے۔ لیکن چونکہ وقت کم ہوتا ہے اور بات ایک دفعہ میں پوری نہیں ہو پاتی اس لئے آپ سے درخواست ہے کہ اگر ممکن ہو تو ۱۶ منٹ کا ایسا ٹیپ، جو آپ نے ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر کیا تھا، ہمیں بھجوا دیں تاکہ ۱۶ منٹ کا پروگرام یہاں سے بھی نشر ہو سکے۔

(۴) آپ نے جو درس پچھلے سال ٹورنٹو میں دیتے تھے، اس کے TAPE یہاں آ چکے ہیں اور بہت سے لوگ انہیں سُن چکے ہیں خود میں نے تقریباً ۵ یا ۶ مرتبہ سنا ہے اور سنتا رہتا ہوں۔ اس لئے براہِ کرم وہی درس یہاں پر نہ دیں بلکہ دوسرے درس ہوں تاکہ ہمارے علم میں اضافہ ہو۔

(۵) انجمن خدام القرآن کی ایک برانچ یہاں شکاگو میں کھولنے پر غور کریں۔ یہاں پر کافی لوگ کام کرنے کے لئے تیار ہیں اور مجھ سے جو کچھ ممکن ہوگا انشاءاللہ کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔

(۶) اپنی کتابوں کے ایک سو سیٹ، جیسے آپ نے ٹورنٹو، سمیع اللہ صاحب کو

۴ جولائی ۸۱ء

امریکہ سے ایک خط

محترم جناب ڈاکٹر اسرار بھائی ۔ سلام علیک

پہلی بار خط لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں ۔ کئی مرتبہ ارادہ کیا لیکن نہ لکھ سکا ۔ سمیع اللہ صاحب (ٹورنٹو) سے برابر آپ کے پروگرام کی خبر ملتی رہتی تب اور الحمدللہ آپ کے دوبارہ آنے کی خبر سے بڑی مسرت ہوئی ۔ خدا کرے آپ کا پروگرام کامیاب ہو ۔ دین کی آپ جو خدمت کر رہے ہیں اس کا اجر اللہ تعالےٰ آپ کو اور آپ کے خاندان کو ضرور دے گا ۔ انشاء اللہ ۔ بلکہ دوسرے جو لوگ آپ کے ساتھ اس کام میں دلچسپی لے رہے ہیں انہیں اس سے زیادہ نیک کام اور کون سا کرنے کو مل سکتا ہے ۔

پچھلی دفعہ آپ سے اتنی سرسری ملاقات ہوئی کہ بہت سی باتوں کو جاننے کا موقعہ ہی نہ مل سکا ۔ ٹورنٹو (کناڈا) میں دیئے گئے آپ کے درس کے TAPE سمیع اللہ صاحب نے بھیج کر مجھ پر بڑا احسان کیا ــــــ چھ ماہ ہونے کو آئے، جب سے TAPE ملے ہیں، یقین جانئے روزانہ سنتا ہوں ۔ ان کی بہت سی کاپیاں بنا کر دوسروں کو دی ہیں ۔ خاصی بڑی تعداد میں لوگ ان سے متاثر ہوئے ہیں ۔ اللہ تعالےٰ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں قرآن حکیم عطا فرمایا اور آپ نے ہماری زبان میں اس کی تشریح کر کے ہم پر بڑا اہم رول ادا کیا ہے ۔

باتیں تو اتنی لکھنے کو جی چاہتا ہے کہ ختم نہ ہوں لیکن آپ کی مشغولیت کا اندازہ کر کے چند ضروری باتوں پر اکتفا کر رہا ہوں امید ہے آپ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت نکال کر اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں گے ۔

(۱) آپ کا بھیجا ہوا پرچہ "میثاق" ملا تھا ۔ میری بدقسمتی کہ میں نے اس کا ہدیہ روانہ کر کے جاری نہیں کرایا ۔ اگر گستاخی نہ ہو تو آپ اُسے جاری کرا دیں ۔ میں سال کا چندہ روانہ کر دوں گا ۔ انشاء اللہ ۔

(۲) آپ کا پروگرام شکاگو میں انشاء اللہ ۱۲ ستمبر جمعہ کے دن سے شروع ہوگا ۔ جمعہ کی نماز آپ MUSLIM COMMUNITY CENTRE میں پڑھائیں

درسِ حدیث

لذّتِ ایمان

از قلم: مولانا محمد حسین میر، اُستاذ عربی، قرآن اکیڈمی

عن عباس بن عبد المطلب، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا و بمحمد رسولاً ؎

ترجمہ "حضرت عباسؓ بن عبد المطلب سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان کا مزا اس شخص نے چکھا جس نے اللہ کو بطور رب، اسلام کو بطورِ دین اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بطور رسول پسند کیا!"

کسی لذیذ و شیریں چیز کو دو شخص نوشِ جاں کرتے ہیں۔ ایک وہ شخص جس کے اعضائے اکل و شرب کا اعصابی نظام ماؤف ہو چکا ہو اور قوتِ ذائقہ سے تعلق رکھنے والی اس کی تمام حسیات مردہ ہو چکی ہوں۔ بے شک ایسا شخص اس چیز کو حلق سے نیچے اتار لے گا، اپنا پیٹ بھی بھر لے گا اور اُس کی اشتہاء کی تسکین بھی ہو جائے گی۔ مگر وہ کیفیت جسے لذّت کام و دہن سے تعبیر کرتے ہیں، اسے حاصل نہیں ہو سکے گی۔ اس کے لئے تلخ و شیریں دونوں برابر ہیں۔ اُسے نہ اِس سے کوئی کیف و سرور حاصل ہوگا نہ اُس سے کوئی تکدّر و تنفّر ——————"!

دوسرا وہ شخص جس کی قوتِ ذائقہ نہ صرف قائم و صحیح ہو بلکہ لطیف و حسّاس بھی ہو۔ وہ جب کسی لذیذ و شیریں چیز کو نوشِ جاں کرے گا تو صرف کام و دہن ہی نہیں بلکہ اس کے جسم و جاں کا ذرّہ ذرّہ اس کیفیتِ تلذّذ کو اس طرح محسوس کرے گا کہ یہ احساس بشاشت و انبساط بن کر اُس کے چہرے سے جھلکنے لگے گا۔ ظاہر ہے کہ اسی قسم کے لوگ ہیں جو تلخ و شیریں کے درمیان امتیاز کر سکتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو لذیذ و شیریں اشیاء کی لذّت و شیرینی سے واقعتہً لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ ایمان کا بھی ہے۔ ایک ایمان ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اسلام کے

روانہ فرمائے تھے، ہمارے پاس بھی روانہ کریں تاکہ یہاں پر درس کے موقع پر کام آسکیں۔

آپ شکاگو میں میرے مہمان ہوں گے اور انشاء اللہ آپ کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہوگی۔ ایک خوشی خبری سناتا ہوں جو آپ کے TAPE کے سننے کے اثر سے پیدا ہوئی۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنا مکان جو بنک کے قرض پر خریدا گیا تھا۔ دو۲ ماہ ہوتے سارا قرض بنک کو ادا کرکے بالکل حلال کر دیا اور اس بار انشاء اللہ آپ حلال مکان میں ٹھہریں گے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب میں کسی طرح بھی سُود کے پنجے میں نہیں ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے پرہیز کا مشورہ دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ مجھ میں نیکی کا یہ جذبہ آپ کا درس سننے سے پیدا ہوا۔

اُردو میں خط لکھنے کا موقعہ بہت کم ملتا ہے اس لئے خط کے پڑھنے میں کوئی دشواری پیش آئے تو معافی چاہتا ہوں۔ بیگم، والدہ اور دوسرے تمام لوگ سلام علیک کہتے ہیں۔ تمام لوگوں کو سلام علیک۔

آپ کا بھائی

(ڈاکٹر) خورشید ملک

شکاگو (امریکہ)

عن عبداللہ بن عمرؓ۔ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ

عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ

فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (متفق علیہ)

گہرائیوں سے یہ یقین ابھرتا ہے کہ واقعی اللہ جہاں خلاّق و صنّاع ہے وہاں حکیم و علیم اور مدبّر و قیّوم بھی ہے۔ بلا ریب وہ ربِّ کائنات ہے اور ہم سب اُس کے بندے ہیں اس احساس کے بعد وہ اللہ کے ہر حکم اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ اس کے بعد ان کی پیشانی کسی اور کے سامنے جھکے، یا کسی اور کو وہ اپنا حاکمِ مطلق خیال کریں، یا کسی اور کے سامنے اُن کا دستِ سوال دراز ہو۔

وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ جس طرح اس ربّ العالمین نے ہماری جسمانی و مادّی ضرورتوں کے لئے زمین و آسمان کو طرح طرح کے سامانِ زندگی ہی سے نہیں بلکہ اسبابِ تعیّش و تنعّم سے بھر دیا ہے، اسی طرح اُس نے ہماری روحانی و تمدّنی ضرورتوں کو پورا کرنے کا سامان یوں کیا کہ اپنے برگزیدہ بندے حضرت محمّد مصطفٰے صلّی اللہ علیہ وسلّم کو "اسلام" کے نام سے ایک دین اور بہترین ضابطۂ حیات دے کر بھیجا۔ اسی سے ہماری اس دُنیوی زندگی میں سکون اور چین آ سکتا ہے، اور اسی پر عمل پیرا ہو کر ہم آخرت میں بھی آرام و راحت پا سکتے ہیں۔ وہ اسلام کو محض تقلیدًا قبول نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کے متعلق جو زاویۂ نگاہ دیتا ہے، اُسے علیٰ وجہ البصیرت اپناتے اور اس کے نظامِ اعمال و احکام میں مضمر حکمتوں اور مصلحتوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ دُنیا کے مختلف معاشروں میں کارفرما فلسفوں اور نظامہائے حیات اور ان سے پیدا ہونے والے فساد اور بگاڑ پر بھی اُن کی نظر ہوتی ہے۔ وہ انسانی سوچ پر مبنی ہر فلسفہ و ضابطۂ حیات کو باطل یقین کرتے ہیں پھر وہ اپنے آپ کو دل و جان سے اس سانچے میں ڈھال لیتے ہیں جس میں اسلام بطورِ دین اُن کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ بات کبھی اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی کہ اس دین میں سے کچھ حصّہ جو اُن کے مفادات یا خواہشِ نفس کی تسکین کرتا ہو، اسے تو قبول کر لیں اور دوسرے کو ردّ کر دیں ؟

ان لوگوں کا حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو ماننا بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اللہ کو اپنا ربّ اور اسلام کو دین و دُنیا کی فلاح پر مشتمل ایک دین تسلیم کر لینے کے بعد جب وہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے ایک بندے نے، اُس کی یہ نعمت ہم تک پہنچانے کے لئے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں۔ وہ دُنیا کا شریف ترین انسان تھا مگر محض انسانوں کی بھلائی کی خاطر دربدر کی خاک چھانتا رہا۔ طعنے سُنے، گالیاں کھائیں، الزامات اپنے سر لئے، تین سال تک معصوم بچّوں کے ساتھ بھوکا اور پیاسا محاصرے میں رہا۔ ایذا رسانی کا کوئی ممکن

سیلاب کو اُمنڈتے دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ اب اس کے سامنے کوئی بند باندھنا ممکن نہیں ہے گردنیں ڈال دیں اور اعلان کر دیا کہ : اٰمنّا باللّٰہ وبالیوم الاٰخر، ونشھد انك لرسول اللّٰہ — مگر یہ صرف حلق سے نیچے اتارنے اور پیٹ بھرنے والی بات تھی، ورنہ جب بھی اہل اسلام کو دشمنوں کے ساتھ خلوت میسّر آتی کہتے کہ : اِنَّا مَعَکُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُ وْنَ ٥ — یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی ان کے اِدّعائے ایمان کے فوراً بعد صاف صاف کہہ دیا کہ : مَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۔ اِنَّ الْمُنَافِقِیْنَ لَکَاذِبُوْنَ ٥ — !!

اسی طرح کچھ وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو خدا اور اُس کے رسولؐ پر ایمان اپنے آباء و اجداد سے ورثہ میں ملتا ہے۔ وہ صرف اس لئے مسلمان کہلاتے ہیں کہ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے بڑوں کو اللہ، رسول اور اسلام کا نام تعظیم کے ساتھ لیتے سُنا تھا۔ والدینؔ نے انہیں اسلام کی خوراک دی، انہوں نے اپنے پیٹ میں اتار لی، اور اگر انہوں نے انہیں کسی اور قسم کی خوراک دی ہوتی تو انہیں اس کے نگلنے میں بھی دریغ نہ ہوتا۔ یا اگر وہ کسی پادری یا کسی اور مذہب والے کے ہتھے چڑھ گئے اور اس نے ذرا ڈھنگ سے عیسائیت وغیرہ کی گولی کھانے کو دے دی تو اسے بھی نگل گئے۔ نہ انہیں پہلی خوراک میں کوئی لذّت محسوس ہوئی نہ دوسری میں کوئی تلخی و ناگواری — !!

لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے قلب و رُوح کی گہرائی میں یہ احساسُ شعور اُتر جاتا ہے کہ ہمارا وجود کسی اتّفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ ہمارا ایک پیدا کرنے والا ہے جس نے ہمیں بالارادہ اور ایک مقصد کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ زمین اور اس کے لامحدود خزانے، یہ آسمان کی نیلگوں وسعتیں، یہ سورج اور اس کی گرمی، یہ چاند اور اس کی روشنی، یہ آبِ حیات سے لدے بادل، یہ سمندر بدوش ہوائیں، یہ بحر ہائے ناپیدا کنار سب اس کی صنّاعی کے نمونے ہیں۔ وہ جب غور کرتے ہیں کہ کائنات کا یہ اتنا وسیع نظام کس طرح ریاضیاتی اصولوں کی سی صحت کے ساتھ نامعلوم کب سے چل رہا ہے اور اس میں لمحہ بھر کے لئے بھی کوئی ذرا سا اختلال واقع نہیں ہوتا تو وہ اس کی قدرت کی وسعتوں میں گم ہو جاتے اور ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے ہیں۔ اللہ کی خلّاقی و صنّاعی، حکمت و تدبر اور اس کی بے مثال قیومیت کے سامنے ان کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور اُن کے دل کی

کشتی نوحؑ علیہ السلام

تحریر: شاہد مظفر (بشکریہ روزنامہ نوائے وقت)

کشتی نوحؑ کا تذکرہ قرآن حکیم کے علاوہ دوسری مذہبی کتابوں میں بھی موجود ہے بیشتر ممالک کے متعدد لوگوں کا دعویٰ ہے کہ پانچ ہزار سال پرانی یہ کشتی آج بھی صحیح سالم حالت میں سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر مشہور برف پوش کوہ ارارات سیمیں کے آغوش میں موجود ہے۔

۱۸۸۰ء میں کل ڈیس جیمز بغداد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ تھا اس نے اپنی تصنیف "کردستان میں قیام" کی جلد دوم میں بیان کیا ہے کہ حسین آغا نامی ایک شخص کوہِ "ارارات" پر واقع عیسائیوں کے راستہ سے گزرتا ہوا تقریباً ایک گھنٹہ میں اسی کشتی کے پاس پہنچ گیا۔ کشتی کی بناوٹ، لمبائی چوڑائی اور اونچائی کا اندازہ لگا کر اس شخص نے یہ دعویٰ کیا کہ یہی کشتی نوحؑ ہے۔

۱۸۸۲ء میں حکومتِ ترکی نے ایک تحقیقاتی کمیشن "کوہِ ارارات" کی طرف روانہ کیا۔ اس دور میں اچانک غیر متوقع طوفان آجانے سے پہاڑ کے گردونواح کے بیسیوں گاؤں تباہ ہوجاتے تھے۔ اس کمیشن کا مقصد طوفان کے اسباب معلوم کرنا تھا۔ جب یہ جماعت پہاڑ پر چڑھتی ہوئی چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچی تو ایک جھیل کے کنارے برف میں دبی ہوئی اس عظیم الشان کشتی کا ایک سرا نظر آیا۔ لیکن یہ لوگ کشتی کے اندر زیادہ دور تک نہ جاسکے، کیونکہ اس کا زیادہ تر حصہ برف سے ڈھکا ہوا تھا۔

انیسویں صدی ہی کے آخر میں مالابار (جنوبی ہند) کے رہنے والے نوری نامی ایک پادری نے جوان دنوں ایران اور کردستان کے علاقوں میں سیاحت کر رہا تھا، کشتی نوحؑ کا سراغ لگانے کا ارادہ کیا۔ تین مرتبہ کی پے بہ پے ناکام کوششوں کے بعد بالآخر چوتھی مرتبہ کامیابی نے اس کے قدم چومے۔ قدیم کتب میں کشتی نوحؑ کے تذکروں کے مطابق بابل کے تباہ شدہ

حربہ ایسا نہ تھا جو اُس پر اور اُس کے ساتھیوں پر آزمایا نہ گیا ہو۔ اُس کے قتل کے منصوبے بنائے گئے، اُس کو اپنے ساتھیوں سمیت نہایت بے کسی کے ساتھ وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا، وہ امن پسند تھا اور انسانی خون بہتے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا مگر اُسے جنگ پر مجبور کر دیا گیا، اُسے ساری زندگی سکون کی نیند سونے نہ دیا گیا۔ ان تمام مشکلات کے سامنے وہ پہاڑوں کے سے بلند و مضبوط عزم اور سمندروں سے زیادہ وسیع حوصلہ کے ساتھ ڈٹا رہا۔ اگر اُس نے اِن تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا تو فتح و کامرانی کے وقت وہ کسی نشے سے مدہوش نہیں ہوا۔ اُس کی فروتنی کا یہ عالم تھا کہ عرب کے مرکز سیاست میں فاتحانہ داخلے کے وقت اُس کا سر شکرِ خدا میں جھکا ہوا تھا مسلسل تیئیس سال تک آگ برسانے والے جب مقہور و مغلوب ہو کر اُس کے سامنے آئے تو اس کے چہرے پر انتقام یا غیظ و غضب کی ایک سلوٹ بھی نہ تھی۔ اُس نے بیک جنبش لب سب کو معاف اور آزاد کر دیا۔ اُس کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ پورے عرب کا بلا شرکتِ غیرے حکمران بن جانے کے بعد بھی وہ مٹی کے گھروندے میں رہتا ہے، کھردری چارپائی پر لیٹتا ہے اسباب آسائش پر قدرت کے باوجود اُس نے ساری زندگی نیم فاقہ کشی میں گذار دی۔ وہ مزدوروں میں مزدور بن کر اینٹیں ڈھوتا اور خندقیں کھودتا رہا۔ اُس نے زندگی بھر کسی سے اپنا انتقام نہ لیا، مگر اپنے آپ کو بھرے مجمع میں انتقام کے لئے پیش کر دیا۔ اُس کا عدل و انصاف اتنا بے لاگ تھا کہ اُس میں اُس نے اپنوں تک کا لحاظ نہ کیا۔ وہ جب تک جیا، اہلِ عالم کے لئے رحمت بن کر جیا، اور جب دُنیا سے رخصت ہوا تو بیمار انسانیت کو پیغامِ شفا دیتا گیا۔ (صلّی اللہ علیہ وسلّم)؏

ناممکن ہے کہ حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے اس پہلو سے مطالعہ کرنے اور آپؐ کو خدا کا آخری رسول یقین کر لینے والوں کی نگاہیں کسی اور شخصیت کی طرف اُٹھ سکیں۔ آپؐ کے سامنے تاریخ کے بڑے بڑے نام نہاد فلاسفر اور رہنما بھی بونے نظر آتے ہیں۔ اس محسنِ انسانیت کی زندگی ہی ان کا IDEAL بن جاتا ہے اور پھر وہ اپنے آپ کو کلیتہً آپ کے اُسوۂ حسنہ میں رنگ لیتے ہیں — اللہ کو بطور رب، اسلام کو بطور دین اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بطور رسول پسند کرنے کی یہی وہ کیفیت ہے جسے حضورؐ نے بڑے بلیغانہ اسلوب میں ایمان کا مزا چکھنے سے تعبیر فرمایا ہے ؏

اللّٰھمّ ارزقنا ان نرضیٰ بک ربّاً و بالاسلام دیناً و بعبدک محمد رسولاً و ارض عنا۔

دونوں فضا میں چکّر لگاتے لگاتے چودہ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ گئے۔ ان کے جہاز کا رُخ کوہِ اراراٹ کی طرف تھا۔ اور وہ پہاڑ کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہے تھے کہ انہیں ایک نیلگوں جھیل نظر آئی۔ چاروں طرف سفید برف جمی ہوئی تھی اور وسط میں یہ جھیل نیلم کے مانند چمک رہی تھی۔ ان کا جہاز جھیل کے اوپر سے گزر رہا تھا تو اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے جھیل کے کنارے ایک عظیم کشتی دیکھی۔

کشتی کا بالائی حصّہ گول تھا اور عرشہ پر ۵ فٹ چوڑا ایک پل بنا ہوا تھا، انہوں نے پرواز نیچی کر کے دیکھا تو کشتی کا چوتھائی سے زیادہ حصّہ زیرِ آب تھا اور وہ ایک جانب سے شکستہ بھی ہو چکی تھی۔ دوسری طرف تقریباً بیس مربع فٹ کا ایک دروازہ تھا۔ ونسکی اور اس کا ساتھی جب اپنے اڈّے پر واپس پہنچے تو انہوں نے اپنے اس واقعہ کا تذکرہ اپنے کپتان سے کیا۔ کپتان خود جہاز لے کر جھیل کے قریب پہنچا اور واپسی پر اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ دراصل یہی کشتیٔ نوح ہے جس کا تذکرہ تمام قدیم کتابوں میں اب تک موجود ہے

کپتان نے اس دریافت کی اطلاع اپنے محکمے کے ذریعے زارِ روس کو بھیجی اور زار کے حکم پر فوراً ایک تحقیقاتی جماعت مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔ اس جماعت نے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک کشتیٔ نوح کے قریب قیام کیا، اور اُس کی پیمائش کر کے اس کا بخوبی جائزہ لیا۔ اور مختلف فوٹو بھی اتارے۔ کشتی میں جو لکڑی استعمال کی گئی تھی وہ صرف قبرص کے جنگلات میں دستیاب ہوتی ہے۔ اس کے پالش میں چکناہٹ کی آمیزش کافی تھی اور پانچ ہزار برس گزر جانے کے باوجود اس میں چمک باقی تھی۔ نیچے کے کمرے کافی کشادہ اور بڑے تھے اور ان میں دو دو فٹ موٹے لکڑی کے جنگلے لگے ہوئے تھے جو غالباً ہاتھیوں اور دیگر عظیم الجثّہ جانوروں کے لئے بنائے گئے تھے۔ اوپر کے حصّے میں جالی دار خانے بنے ہوئے تھے جو شاید پرندوں کے لئے مخصوص ہوں گے۔ اس کشتی کی ساخت، کاریگری، اور نفاست سے اعلیٰ تہذیب کا اظہار ہوتا تھا۔

تحقیقاتی رپورٹ کی روانگی کے چند روز بعد روس میں انقلاب برپا ہو گیا اور زار کو معزول کر کے بالشویک گروہ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ونسکی جو سفید نسل روسی تھا، فرار ہو کر امریکہ چلا آیا، اور وہاں اس کی کہانی بے شمار اخبارات و رسائل میں شائع ہوئی۔ اس کی کشتیٔ نوح دریافت کرنے کی کہانی ریڈیو آسٹریلیا سے ۶ر دسمبر ۱۹۴۲ء اور پھر دوبارہ ۲۰ر جنوری ۱۹۴۷ء کو نشر کی گئی۔ ایک روایت کے مطابق دوسری جنگِ عظیم کے دوران انگلستان کے ایک

بقیہ ص ۶۴ پر

شہر سے تقریباً پانچ سو میل کے فاصلے پر اس نے کوہِ ارارات پر اس کشتی کو موجود پایا۔
کوہِ ارارات کی بلندی سطح سمندر سے سترہ ہزار فٹ ہے۔ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر برف گرنا شروع ہو جاتی ہے۔ نوری لکھتا ہے کہ چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر پانچ ہزار سال پرانی تاریخی کشتی میری آنکھوں کے سامنے تھی، اس کا نصف حصہ جھیل میں تھا اور بقیہ نصف برف سے ڈھکا ہوا تھا۔
پہلی نظر میں ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کشتی ایک چھوٹا سا غیر آباد قصبہ ہو۔ میں نے کشتی کی پیمائش کی اور اس کی توریت میں لکھی ہوئی لمبائی چوڑائی اور اونچائی کے عین مطابق پایا۔ یہ کشتی ۵۲۵ فٹ لمبی، ۸۷ فٹ چوڑی اور ½ ۵۲ فٹ اونچی ہے۔ نوری کے بیان کے مطابق پانچ ہزار سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک وہ اچھی حالت میں ہے۔
نوری ایک قابلِ اعتماد شخص تھا، اُس کا تعلق اپنے عہد کے ایک مشہور اور معزز خاندان سے تھا۔ ایک سو کے قریب خطابات پانے والے اس پادری کو بارہ زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس نے برما، چین، افریقہ، آسٹریلیا اور یورپ کے کئی ممالک کی سیاحت کے علاوہ وہاں کے حکمرانوں سے ملاقاتیں بھی کیں۔ آذربائیجان اور آرمینیا کی سیاحت و قیام کے دوران پادری فریڈرک نے تین ماہ تک اس کی میزبانی کی۔ پادری فریڈرک تہِ دل سے اس کا معترف اور قدر دان تھا۔
شکاگو کے عالمی میلہ کی ایک مذہبی کانفرنس میں بھی نوری نے شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر اس نے کیلی فورنیا کا دورہ کیا لیکن لوگوں نے اس کی زبانی کشتیٔ نوح کی بازیافت کی کہانی پر زیادہ اعتبار نہ کیا۔ ان کے خیال میں یہ ممکن نہیں تھا کہ پانچ ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی چودہ ہزار فٹ بلند پہاڑ پر کشتی صحیح سلامت موجود ہو۔ آخر کچھ مخالفین نے دو ڈاکٹروں کی مدد سے سازش کر کے نوری کو پاگل خانے بھجوا دیا، جہاں سے اس کی ایک مدّاح خاتون نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے رہائی دلوائی۔
دونوں عالمی جنگوں کے درمیانی وقفوں میں امریکہ کے ایک اخبار "گنگز ہیرالڈ" میں کشتیٔ نوح کے متعلق ایک رپورٹ شائع ہوئی جس کا راوی ایک روسی ہوا باز پراوسکو ولسکی تھا رپورٹ کے مطابق انقلابِ روس سے کچھ عرصہ قبل روسی ہوا بازوں کا ایک چھوٹا سا دستہ کوہِ ارارات سے ۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ایک عارضی ہوائی اڈے میں مقیم تھا۔ ولسکی کو تجرباتی پرواز کے لئے جہاز نمبر ۷ میں بلندی پر اڑانے کا حکم ملا، اُس کے ساتھ معاون ہوا باز بھی تھا۔ وہ

جانب ہندو مسلمانوں کی کامیابی سے پریشان اور خوفزدہ تھے۔ ہندوؤں نے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ تعاون اور میل ملاپ کی راہ اختیار نہیں کی بلکہ انہیں ناکام کرنے کے لئے اُن کا سوشل بائیکاٹ کیا تاکہ وہ اپنی قومی خصوصیات کو برقرار رکھ سکیں اور اسلامی حکومت کو ختم کرنے کے لئے قوت استعمال کی جائے۔ اس پالیسی پر وہ صدیوں عمل کرتے رہے اور آخرکار بابر کے مقابلے میں رانا سنگرام سنگھ آف راجپوتانہ نے تمام راجاؤں کا محاذ بنا کر بابر کو نکالنے کی کوشش کی رانا اپنی شجاعت اور جوانمردی کے لئے بہت مشہور تھا لیکن بابر کے مقابلے میں اُن کی ناکامی نے ان کی آئندہ توقعات پر بھی پانی پھیر دیا۔ اب انہوں نے اپنی بنیادی پالیسی میں تبدیلی کی۔ اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے جنگ و جدل کی راہ ترک کرکے راجپوتوں کے ایک بڑے گروہ نے مسلمان حکمرانوں سے تعاون کیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ راجپوت راجاؤں کی شہنشاہ اکبر کے ساتھ بیاہ شادی کے تعلقات کی ابتداء کسی وقتی جذبے کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک گہری اور سوچی سمجھی سکیم کا پیش خیمہ تھا۔ ان بیاہ شادی کے تعلقات ان کی پوزیشنیں مختلف ہوگئیں۔ اب انہوں نے کھلم کھلا مخالفت اور میدانِ جنگ میں لڑ کر مقاصد حاصل کرنے کی بجائے حکومت میں شریک ہو کر اور برسرِ اقتدار طبقے سے اپنے رشتے استوار کرکے حکومت کی مشینری کو زیادہ سے زیادہ اپنے مفاد میں ہموار کرنے کی کوششیں شروع کیں۔

ہندو راجاؤں کے ساتھ اکبرِ اعظم کا یہ اشتراک ہندوستان میں مسلمانوں کے حق میں بڑا نقصان دہ ثابت ہوا۔ مشہور مؤرخ مُلّا بدایونی کو اکبر کی ان حرکتوں سے سخت مایوسی ہوئی۔ وہ اپنے سارے احترام اور جاہ و حشم کو خطرے میں ڈال کر اکبر کی مخالفت پر تل گیا اکبرِ اعظم کو یہ خبط بھی سوار ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق ختم کردے۔ چنانچہ دین الٰہی کے نام سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ متعدد ایسے احکامات اور اقدامات کئے جن سے اسلام کی بنیادی تعلیمات بھی مجروح ہوئیں۔ مسلمانوں میں اکبر کے اس رویّہ سے شدید اضطراب پیدا ہوا۔ علماء نے اس کے خلاف فتوے دیئے اور رؤسا نے بغاوتیں کیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اکبر کا اقتدار ڈگمگانے لگا۔ لیکن اکبر کے نئے وفادار اس کی پشت پر تھے۔ ان کی مدد سے وہ وقتی طور پر ان سنگین حالات سے عہدہ برآ ہوگیا۔ اکبر کی ان پالیسیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں میں مشرکانہ رسومات و عقائد سرایت کرگئے بدعات اور کفر کو تقویت پہنچی۔ ٹھیک اکبر کے آخری ایام میں مجدد الف ثانی نے اپنی تحریک احیاءِ اسلام

فتاویٰ عالمگیری

ازقلم : منظور احمد صاحب، لیکچرر، جامعہ زرعیہ، فیصل آباد

اورنگ زیب عالمگیرؒ نے اپنے عہدِ حکومت کے ابتدائی دَور ہی میں روزمرّہ زندگی کے مسائل کو شریعتِ اسلامی کی روشنی میں حل کرنے کے لئے فقہ اسلامی پر ایک جامع اور مستند کتاب تدوین کرائی جو ہندوستان میں "فتاویٰ عالمگیری" کے نام کے ساتھ مشہور ہوئی۔ اس عظیم فتاویٰ کی تدوین کا کام اورنگ زیبؒ کی تخت نشینی کے چار سال بعد ایک شاہی فرمان کے ذریعہ شروع ہوا اور آٹھ سال میں یعنی سنہ ۱۰۸۱ھ مطابق سنہ ۱۶۷۰ء کو پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ یہ کتاب ہدایہ کے بعد فقہائے حنفیہ کے نزدیک مستند، معتبر اور جامع کتاب ہے۔ جو نہایت احتیاط سے ترتیب دی گئی۔ یہ کتاب مشرقِ وسطیٰ میں "فتاویٰ ہندی" کے نام سے مشہور ہے۔ فتاویٰ کا اصل نسخہ عربی میں ہے جو چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ قاہرہ ایڈیشن میں ۳۰۰۰ صفحات اور ایک لاکھ سطریں پائی جاتی ہیں کتاب کی ابتدا فقہ اسلامی کے تفصیلی دیباچے سے ہوتی ہے جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

سیاسی پس منظر "فتاویٰ عالمگیری" کی ترتیب کسی وقتی مصلحت یا محض ایک شخص کی خواہش کا نتیجہ نہیں ہے۔ اس کا باعث مسلمانوں کا یہ شدید جذبہ تھا کہ اُن کے اجتماعی مسائل و مشاکل کا فیصلہ کتاب و سُنّت کی روشنی میں ہو۔ ایسی کتاب کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی جو انفرادی فتاویٰ کے اختلاف کو دور کرسکے اور قانون کی بنیادی کتاب کی حیثیت سے استعمال کی جاسکے۔ لیکن محض سیاسی وجوہات کی وجہ سے ایسی کتاب مُدوّن نہ کی جاسکی۔ اس موقع پر اورنگ زیبؒ کے دَور اور اس سے پہلے کے حالات کا مختصر تذکرہ نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ وہ کون سے سیاسی محرّکات اور تغیّرات تھے جو اس جامع کتاب کی ترتیب کا سبب بنے۔ مسلمانوں کے عہدِ حکومت کی ابتداء صحیح معنوں میں خاندانِ غلاماں سے ہوتی ہے۔ جو ایک مستحکم اور پائیدار حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس دَور میں مسلمانوں میں سیاسی اور فکری اتّحاد تھا۔ حکومت کے قیام اور استحکام کے لئے ضروری تھا کہ باہمی اختلاف نہ ہوں۔ دوسری

بات عالمگیر کے عہد میں ختم ہو گئی اور معاملاتِ انسانی کو شریعتِ اسلامی کی روشنی میں طے کرنے کے لئے فتاویٰ کی ضرورت محسوس ہوئی۔

فتاویٰ کی تدوین | عالمگیری اصلاحات سے حکومت کے ڈھانچے میں اسلامی تصورات کو بہت کچھ دخل ہو چکا تھا۔ لیکن حکومت کی اصلاحات میں بنیادی چیز عدلیہ کے قوانین ہوتے ہیں کیونکہ یہی شعبہ روزمرہ زندگی کے معاملات کو کنٹرول کرتا ہے۔ شہنشاہ عالمگیر کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی رعایا کو شریعتِ اسلامیہ کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرے چنانچہ آپ نے ایسی اصلاحات کیں جن سے روزمرہ زندگی اسلامی ضابطہ کی گرفت میں آگئی۔ آپ سے پہلے فقہ کا کوئی جامع مستند مجموعہ موجود نہیں تھا جس میں تمام فقہائے اسلام کے فیصلے اور آراء محفوظ ہوں۔ جو کچھ تھا وہ منتشر اور پراگندہ صورت میں تھا جسے کام میں لانے کے لئے آسان نہ تھا۔ ساتھ ہی قاضیوں کو کافی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس سے کام متاثر تھے۔ اگرچہ یہ دشواری پہلے بھی موجود تھی لیکن جدید اصلاحات اور اسلامی ماحول کی صورت میں اس دشواری کا احساس زیادہ ہونے لگا۔ چنانچہ عالمگیر نے فقہ کی تدوین کے لئے علماء اور فقہاء کی کمیٹی کے قیام کی شدید ضرورت محسوس کی جو ایک جامع کتاب مرتب کرے تاکہ مسلمانوں کی زندگی کے مسائل فقہ اسلامی کی روشنی میں طے کئے جا سکیں۔ "مآثرِ عالمگیری" کا مصنف بیان کرتا ہے: "بادشاہ نے ہندوستان کے مشاہیر علماء کے ایک گروہ کو حکم دیا کہ تمام فقہ کی کتابوں سے مفتیٰ بہا مسائل کا انتخاب کرکے ایک کتاب تیار کریں اور اس گروہ کے صدر شیخ نظام الدین تھے۔ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے علماء کے وظائف اور دیگر اخراجات کی منظوری دی گئی۔" چنانچہ مشاہیر علماء اور فقہاء کا ایک بورڈ مقرر کیا گیا اور حکم صادر کیا گیا کہ نہایت غور و فکر کے ساتھ تمام مستند کتابیں جو اس وقت پائی جاتی ہیں، مطالعہ کیا جائے اور یہ کتابیں سالہا سال کی کوششوں کے بعد شاہی کتب خانہ میں جمع کی گئی تھیں۔ یہ کام شیخ نظام الدین کے سپرد تھا اور ایک کام یہ بھی تھا کہ علماء کی ایک اسمبلی بلائی جائے جن کی متفقہ آراء کے بعد ہی فیصلوں کو اصل کتاب میں نقل کیا جاتا تھا۔ اس غرض سے جید علماء کو ملک کے کونے کونے سے اکٹھا کیا گیا۔ انہیں سرکاری خزانے سے گراں قدر وظائف دیئے گئے تاکہ دلجمعی کے ساتھ یہ اہم کام سرانجام دے سکیں۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق اس تمام جدوجہد پر کوئی ۳۰ لاکھ روپے خرچ آئے اور یہ عظیم فتاویٰ

شروع کی مسلمانوں میں اسلامی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ آپ کی مخالفت ہوئی اور جہانگیر نے اپنی "تزک جہانگیری" میں آپ کا تذکرہ ہتک آمیز الفاظ میں کیا ہے لیکن آپ کی تحریک روز بروز پھیلتی گئی۔ بادشاہ کو مسلمانوں کی خواہش کے سامنے جھکنا پڑا اور جہانگیر کو جس نے مشرکانہ ماحول میں تربیت پائی تھی، اپنے باپ کی پالیسی ترک کرنی پڑی اور مجبوراً چند ایک ایسی اصلاحات کا اعلان کرنا پڑا جو کفر و شرک کی قوت توڑنے والی تھیں۔ ان ابتدائی دور میں تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تخت دہلی کے امیدواروں میں ایک امیدوار کم از کم ایسا ضرور ہوتا جسے عام آزاد خیال مسلمانوں اور ہندوؤں کا تعاون حاصل ہوتا۔ دوسرا ایسا ہوتا جسے حساس اور باشعور مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہوتا تھا۔ گویا تخت دو مختلف ذہنوں والے امیدواروں کی آماجگاہ بنا رہتا اور دونوں میں قوت آزمائی ہوتی رہتی۔ اس قوت آزمائی میں بالآخر وہ کامیاب ہوجاتا جسے مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہوتی۔

چنانچہ شاہجہاں کی کامیابی سے اور اس کے مختلف اقدامات سے ہندوؤں کو بہت نقصان پہنچا۔ شاہ موصوف اپنے پیش روؤں سے زیادہ دین کی طرف مائل تھا۔ اس نے نئے مندروں کی تعمیر رکوائی، اور جن ہندو امراء کے قبضے میں مسلمان عورتیں تھیں، حکم دیا کہ یا تو وہ مسلمان ہوجائیں یا ان مسلم خواتین کو آزاد کردیں۔ جن مقامات پر باجماعت نماز کا انتظام نہیں تھا اس کا انتظام کرایا۔ اس طرح شاہجہاں کے دورِ حکومت میں مسلمانوں کی قوت جمع ہونا شروع ہوگئی۔ لیکن شاہجہاں کے عہد کے آخر میں شہزادہ دارا کی موجودگی جو اپنی ہندو دلچسپیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا، آئندہ کے لئے خطرہ بن گئی اور اورنگ زیب کے دارا کے ساتھ اختلافات کی وجہ یہی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو عالمگیر کی دیانت اور صلاحیت پر اعتماد تھا۔ اس کے تخت نشین ہوتے ہی ہندوستان میں احیائے اسلام کا نیا دور شروع ہوا۔ شاہی ٹھاٹھ باٹھ کی جگہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں سادہ زندگی اختیار کی گئی۔ لوگوں کی اخلاقی حالت بہتر بنانے کے لئے محکمہ احتساب قائم کیا گیا، جس کا مقصد لوگوں کی اخلاقی حالت کی نگرانی اور انہیں غلط اور غیر شرعی عقائد سے باز رکھنا تھا۔ چنانچہ ان حالات کی تصدیق "مآثر عالمگیری" کے مصنف کے بیان سے بھی ہوتی ہے: "بادشاہ رعیت نواز نے کبھی ایسا حکم صادر نہیں کیا جو رفاہِ عامہ کے خلاف ہو اور کبھی ایسے فعل کا مرتکب نہیں ہوا جو مخلوقِ خدا کی پریشانی کا باعث ہو۔ تمام ممالکِ محروسہ میں احکامِ شرعیہ نافذ کئے گئے"۔ عالمگیر کی کامیابی اور اصلاحات کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین کا آوازہ بلند اور

تبصرہ بر 'مہر منیر'

از قلم :- پروفیسر یوسف سلیم چشتی

پنجاب کے مشہور شیخ طریقت پیر مہر علی شاہ صاحب کے سوانح حیات "مہر منیر" کے نام سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئے تھے۔ پچھلے مہینے یہ کتاب میری نظر سے گذری ۔۔

میں پیر صاحب کے علمی مقام سے تو عرصہ دراز سے آگاہ تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۳۳ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اُن کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا تھا جس کے چند فقرے یہ ہیں :

" اِس وقت ہندوستان بھر میں اور کوئی دروازہ نہیں ہے جو اس مقصد کے لئے کھٹکھٹایا جائے ۔ چند اُمور دریافت طلب ہیں :

اوّل یہ کہ شیخ اکبرؒ نے حقیقت زمان کے متعلق کیا لکھا ہے اور (وہ) ائمہ متکلمین سے کہاں تک مختلف ہے ؟

دوم یہ کہ حضرات صوفیہ میں سے اگر کسی اور بزرگ نے بھی حقیقتِ زمان پر بحث کی ہو تو ان کے ارشادات کے نشانات بھی مطلوب ہیں ! "

لیکن یہ بات مجھے قطعاً معلوم نہیں تھی کہ پیر صاحبؒ موصوف علم عقائد میں بخلاف تمام پنجابی صوفیائے پنجاب اس قدر صحیح عقائد کے حامل ہیں ۔ صوفیوں کو عموماً اور چشتیوں کو خصوصاً حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عقیدت اور ارادت میں جس قدر غلو ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ۔ اس کے ثبوت میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کے صرف دو شعر پیش کرتا ہوں ۔ جن کے متعلق اگر یہ نہ بتایا جائے کہ یہ اقبال کے اشعار ہیں تو پڑھنے والا یقیناً یہی یقین کرے گا کہ یہ کسی غالی شیعہ کے اشعار ہیں :

(۱) اے سرِ خطِ وجوب و امکاں ❊ تفسیر تو سورہ ہائے قرآں

یعنی تجھ میں وجوب (الوہیت) اور امکان (بشریت) دونوں شانیں پائی جاتی ہیں بالفاظ دگر، تو واجب الوجود بھی ہے اور ممکن الوجود بھی ہے یا خدا بھی ہے انسان بھی ہے

ے منقول از "صحیفہ" اقبال نمبر حصہ دوم صفحہ ۴۲

آٹھ سال کی مدت میں مدوّن ہوا۔ "مرآۃ العالم" کے مصنف نے ایسے ہی واقعات کا تذکرہ کیا ہے: "بادشاہ کی دلی خواہش تھی کہ تمام مسلمان شریعت کی تعلیمات اور اصول کو جیسا کہ فقہ حنفی کے مستند علماء اور مفتیوں نے سمجھا اور پیش کیا ہے۔ عام لوگ بھی سمجھیں اور اُن پر عمل کریں لیکن شریعت کے یہ احکام اور ضابطے قاضیوں اور مفتیوں کے مختلف الخیال فیصلوں کی وجہ سے بہت پیچیدہ ہو گئے تھے۔ اس لئے یہ طے ہوا کہ مشاہیر علماء کا ایک گروہ فقہ کی ضخیم اور مستند کتابوں کا جو شاہی کتب خانہ میں موجود ہیں، جائزہ لے کر ایک جامع کتاب تیار کرے تاکہ شریعت کا منشا مستند ذرائع سے متعین ہو سکے۔ یہ کام نظام الدین برہان پوری کے سپرد کیا گیا جو علوم عقلیہ اور نقلیہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اُن کی مدد کے لئے ممتاز علماء اور مشاہیر فقہاء کا ایک بورڈ تشکیل دیا گیا جن کے اخراجات کا حکومت کی جانب سے انتظام تھا۔

فتاوٰی کی ترتیب و تدوین | "فتاوی عالمگیری" جو اورنگ زیب کی دلچسپی اور علماء و فقہاء کی ایک تعداد کی شبانہ روز کوششوں سے آٹھ سال میں مرتب ہوا، یہ فقہ حنفی کی ایک ضخیم اور بلند پایہ تصنیف ہے۔ اس میں ممتاز علماء اور فقیہوں کے فیصلے آراء، مختلف دقیق مسائل کی تشریح، تنقیدیں، مذہبی قوانین، قواعد و ضوابط اور ایسے رسم و رواج جو زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے شخصی قوانین جن کا تعلق وراثت، وصیت اور طلاق وغیرہ سے ہے، انہیں تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ اس طرح فتاوی کا دائرہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ فتاوی کی ابتداء میں ۲۰۰ صفحات پر مشتمل فقہ پر ایک عالمانہ اور محققانہ دیباچہ ہے۔ جو فقہ اور اصول فقہ سے بحث کرتا ہے۔ جہاں تک فتاوی کی تدوین کا تعلق ہے، اس میں نہایت ہی احتیاط کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ کتاب کو مدوّن کرتے وقت مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر حصے کی تیاری کے لئے علماء کا ایک بورڈ متعین تھا۔ جس میں دس سے بارہ تک جید علماء ہوتے تھے۔ اس کا ایک صدر یا انچارج ہوتا تھا جو پیش آمدہ مشکلات میں براہ راست بادشاہ سلامت سے رجوع کرتا تھا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ مباحث اور مضامین کے اعتبار سے فتاوی کئی حصوں میں تقسیم تھا۔ چنانچہ ایک چوتھائی کا دستہ [illegible] وجیہ الدین گوپاموی کے سپرد ہوا اس کی مدد کے لئے علماء کی ایک [illegible] تھا جو [illegible] کتابوں کا مطالعہ کرتے اور حوالے جمع کرتے۔ فتاوی کے دوسرے حصے [illegible] کا کام شیخ جلال الدین جونپوری کے سپرد تھا۔

دلیل میں چند شواہد پیش کرتا ہوں :

(۱) صـ۴۲۴ " واقعۂ فدک میں جنابہ سیّدہ رضہ کے سوال میراث پر آپ فرمایا کرتے تھے کہ اُن رضہ کے سوال سے مسلمانوں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت کا معاملہ واضح ہوگیا۔ اگر آپ یہ تحریک نہ فرماتیں تو صحابہ رضہ کے مجمع کے سامنے حضرت صدیق اکبر رضہ یہ حدیث پیش نہ فرماتے کہ انبیاء علیہم السّلام مال واسباب بطور وراثت نہیں چھوڑتے، اُن کی وراثت علم ہے۔ اس حدیث کی تصدیق تمام حاضرین صحابہ کرام رضہ نے فرمائی جن میں حضرت علی رضہ اور حضرت عباس رضہ بھی شامل تھے۔!"

(۲) صـ۵۹ " حدیث قرطاس کے ضمن میں فرمایا کہ حضرت عمر رضہ کو محلِ طعن بنانے والوں نے دو غلطیاں کی ہیں۔ ایک تو اُن رضہ کے کلام کا مطلب ایسے زہریلے رنگ میں ادا کیا ہے جو کوئی منافق بھی (اس وقت کے منافقین میں سے) نہیں کہہ سکتا تھا۔ دوسری یہ کہ: " اَھَجَرَ اِسْتَفْہِمُوْہُ " کا جملہ بھی مخالفین نے حضرت عمر رضہ سے منسوب کیا ہے جو خلافِ واقعہ ہے۔ پھر فرمایا کہ: خطاب نبوی سب حاضرین سے تھا۔ حضرت عمر رضہ سے مخصوص نہیں تھا۔ جن میں سیدنا علی رضہ اور سیدنا عباس رضہ بھی شامل تھے۔ پس اگر مطعون ٹھہریں گے تو سب نہ صرف حضرت عمر رضہ (اگر حضرت عمر رضہ نے تعمیلِ حکم نہیں کی تو حضرت علی رضہ کو کس نے روک دیا تھا) بلکہ سب سے زیادہ سیدنا علی رضہ پر مطاعن کا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ خطابات اسد اللہ اور خیبر شکن سے ملقب تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کسی سے ڈر کر ارشاد نبوی کی تعمیل سے گریز کیا ہو۔ اگر بفرضِ محال ایسا ہی تھا تو بھی کامل تین دن میں حضرت عمر رضہ سے علیحدگی کے وقت انہیں تعمیلِ حکم کا موقع مل سکتا تھا۔ حاضرین میں سے کسی کا بھی تعمیل نہ کرنا صاف بتا رہا ہے کہ کتابت زیرِ بحث ضروری نہیں تھی ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو بالاتفاق معصوم ہیں کسی کے روکنے سے کب رک سکتے تھے!" (صـ۵۶)

(۳) "خم غدیر والی حدیث کو خلافت بلافصل سیدنا علی رضہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ورنہ در ایام مرضِ وفات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم بارشادِ مکرر، حضرت صدیق اکبر رضہ کو تین دن کی نمازوں کے لئے امام نہ بناتے۔ اسی پر حضرتِ علی رضہ نے فرمایا تھا: قَدَّمَکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یُؤَخِّرُکَ ؟ ۔ یعنی آپ کو رسول اللہ نے پیش امام مقرر

(انصاف کی داد دیجئے کہ ان مدائح کے متعلق یہی عقیدہ ہے!) :[1]

(۲) اے ستارِ نبوتِ محمد ✽ اے وصفِ تو مدحتِ محمد

یعنی اے علیؓ! آپ دراصل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا راز ہیں۔ اسی لئے اے علیؓ! آپ کی ثنا یا مدحت، محمدؐ کی ثنا یا مدحت ہے۔ کیونکہ آپؓ دراصل علیؓ ہیں۔ قارئین اقبال کے یہ شعر پڑھ کر پریشان نہ ہوں۔ اسلامی تصوف جب تشیع اور علی پرستی کا لبادہ زیب تن فرماتا ہے تو وہ سرّیت اور رمزیت اور باطنیت میں غرق ہو کر سراسر غیر اسلامی بن جاتا ہے۔ جس کا تعلق نہ قرآن سے باقی رہتا ہے نہ حدیث سے۔ ہو کر بازآمدم برسرِ مطلب۔ پیر صاحبؒ چشتی ہونے کے باوجود سارے مذہب پر حد کمال پر فائز رہے۔ چونکہ پیر صاحبؒ کی کئی تصانیف میری نظر سے گذر چکی ہیں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس صدی میں (اب ۱۹۸۰ء ہے) پیر صاحب سے بڑا منطقی اور فلسفی اور متکلم صوفی میری نظر سے نہیں گذرا (میری عمر ۸۵ سال کے قریب ہے) اگر وہ سجادہ نشینی کے بجائے معقولات کی تدریس کا شغل اختیار کر لیتے تو بلا شبہ اپنے وقت کے مولینا فضل حق خیر آبادی ہوتے۔

واضح ہو کہ منطقی ہونے کے لئے صرف درسی علم کافی نہیں ہے، اس کے لئے ذہین ہونا پہلی شرط ہے اور پیر مہر علی شاہ، ماں کے پیٹ سے ذہین پیدا ہوئے تھے۔[2]

ایں سعادت بزورِ بازو نیست ✽ تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اس تمہید طولانی کے بعد (جس کے لئے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا!)

---

[1] سپاس جناب امیرؑ مندرجہ "مخزن" بابت ماہ جنوری ۱۹۰۵ء۔ یہ وہ نظم ہے جو اقبال مرحوم صبح کے وقت پڑھا کرتے تھے اور اس میں ۴۳۔ اشعار ہیں ✽ (کما فی الاصل)

[2] اُن کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک عالم دین نے اُن سے کہا کہ میں آپ سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ آپ جواب دیتے وقت قرآن کے معانی میں تاویل سے کام نہ لیں۔ پیر صاحب نے جواب دیا کہ مجھے یہ شرط منظور ہے بشرطیکہ آپ بھی تاویل سے کام نہ لیں اور سوال کرنے سے پہلے مجھے اس آیت کے معنی سمجھا دیں: "مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى"۔ یہ سن کر وہ صاحب خاموش ہو گئے!!

ترتیب و انتخاب
محمد یونس ایم۔ اے،

قسط سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن اور آثارِ کائنات

نظامِ کائنات
سات آسمانوں کی حقیقت

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ

(البقرہ - ۲۹)

"پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان اُستوار کئے۔"

سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے، اس کا تعین مشکل ہے۔ انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظِ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصوّرات قائم کرتا رہا ہے، جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی تصوّر کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراء جس قدر کائنات ہے اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے، یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقہ میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔

(سورہ البقرہ - حاشیہ ۳۴، تفہیم القرآن جلد اوّل)

آسمانی بُرج - اللہ کی کارفرمائی، حکمت، آرٹ

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝

(الحجر - ۱۶)

"یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے بنائے اور اُن کو دیکھنے والوں کے لئے مزیّن کیا۔"

فرمایا ہے تو کون ہے جو آپؐ کو تحفے دے ؟"

(۴) "سیدۃ النساء رضؓ کی نسبت ہبہ یا وصیت کا دعویٰ بھی محض اُن پر افتراء اور بہتان ہے۔ اگر مطالبہ بطورِ ارث تھا تو ہبہ نہیں ہو سکتا اور نہ بالعکس۔ اسی طرح دعویٰ میراث اور دعویٰ وصیت میں تناقض ہے!" (صـ۵۶۱)

(۵) حدیث ثقلین کے بارے میں حضرت (پیر صاحب) فرماتے ہیں کہ طعن کرنے والوں (شیعوں) کا یہ دعویٰ کہ اہل سنت کبھی اس حدیث پر عمل نہیں کیا، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ معاملہ برعکس ہے کیونکہ اہل سنت نے تو اسی قرآن کو جو ان کے پاس ہے اور غیر محرّف ہے، بنیاد مستور العمل بنایا ہوا ہے۔ بخلاف اِن طاعنین (شیعوں) کا عقیدہ یہ ہے کہ اصل معنی قرآن کو جناب امیر رضؓ نے غائب کر دیا تھا اور تیسری صدی سے امام غائب کے پاس غار سُرّمن رَأیٰ میں بتایا جاتا ہے۔ پس ان حضرات کو تو آج تک ... نصیب نہیں ہوا" (صـ۵۶۳)

(۶) ترمذی کی حدیث: "اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا!" — پر شیخ ابن تیمیہ رحؒ نے "منہاج السنّۃ" میں اعتراض کیا ہے اور لکھا ہے کہ امام ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع قرار دیا ہے۔ واقعات کی رُو سے بھی نفسِ مضمون یقینی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ علم نبوّت کا صرف ایک دروازہ حضرت علیؓ ہوں ؟ جن سے صرف کوفیوں نے قلیل مدّت کے لئے علم حاصل کیا ہو اور باقی بلادِ اسلامیہ میں علم اوروں سے پہنچا ہو ؟" (صـ۵۶۳)

(۷) حدیث: "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ!" کی تشریح میں ایک بار حضرت رحؒ نے فرمایا تھا کہ لفظ مولیٰ مشترک ہے، کئی معنی رکھتا ہے۔ مشترک کے معنی کے تعیّن کے لئے قرینے کا لحاظ لازمی ہے۔ اس لئے یہاں مَولیٰ کے معنی محبوب یا دوست کے لئے جائیں گے۔ یعنی علیؓ سب مومنوں کے محبوب یا دوست ہیں۔ لیکن ہمارے برادرانِ طریقت مَولیٰ کے وہ معنی لیتے ہیں جو پنجابی زبان میں مفہوم ہیں یعنی سردار۔ بالفاظ دیگر تمام اصحاب کے سردار۔ لیکن یہ معنی محض خوش فہمی (غلط فہمی) پر مبنی ہیں!" (صـ۵۶۵)

اضافہ از سوانح نگار "اس میں تو شک نہیں کہ حضرت رحؒ کو حضرت علیؓ سے بے حد محبت تھی جو درجہ انہماک تک پہنچی ہوئی تھی مگر آپؐ کا کمال یہ تھا کہ غلبۂ عشق و محبت

سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم ہو جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب ثاقب مراد ہوں جنھیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زمانۂ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دُوربین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱۰ - کھرب روزانہ ہے۔ جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں، اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ اُن کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سیکنڈ ہوتی ہے، اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سیکنڈ تک دیکھی گئی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لے کر صبح تک دو لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا - ۱۹۴۶ء جلد ۱۵ ص ۳۹-۳۳۷)۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالم بالا کی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو۔ کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گزر کر فضائے بسیط میں ۱۰ - کھرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات اُن کے لیے اس فضا کو بالکل ناقابل عبور بنا دیتی ہوگی۔

اس سے کچھ ان 'محفوظ قلعوں' کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے، جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بظاہر فضا بالکل صاف شفاف ہے، جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت نظر نہیں آتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خطوں کو کچھ ایسی غیر مرئی فصیلوں سے گھیر رکھا ہے جو ایک خطے کو دوسرے خطوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انہی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہاب ثاقب دس کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں، وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں (METEORITES) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دُنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ۶۴۵ پونڈ کا ایک پتھر جو گرا کر ۱۱ فٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ۳۶½ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنس دان اس کے سوا نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ قیاس کیجیے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط حصاروں سے

بُرج عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علمِ ہیئت میں 'بُرج' کا لفظ اصطلاحاً اُن بارہ منزلوں کے لئے استعمال ہوتا تھا، جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انہی بروج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد سیارے لئے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالمِ بالا کے وہ خطّے ہیں، جن میں سے ہر خطّے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطّے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضائے بسیط میں غیر مرئی طور پر کھچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطّے سے دوسرے خطّے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ہم بُروج کو محفوظ خطّوں (FORTIFIED SPHERES) زیادہ صحیح سمجھتے ہیں ہر خطّے میں کوئی نہ کوئی روشن سیارہ یا تارا رکھ دیا اور اس طرح سارا عالم جگمگا اٹھا بالفاظِ دیگر ہم نے اس ناپیدا کنار کائنات کو ایک بھیانک ڈھنڈار بنا کر نہیں رکھ دیا بلکہ ایک ایسی حسین و جمیل دُنیا بنائی جس میں ہر طرف نگاہوں کو جذب کر لینے والے جلوے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کاریگری میں صرف ایک صانعِ اکبر کی صنعت اور ایک حکیمِ اجل کی حکمت ہی نظر نہیں آتی، بلکہ ایک کمال درجے کا پاکیزہ ذوق، رکھنے والے آرٹسٹ کا آرٹ بھی نمایاں ہے (سورہ۔ الحجر، حاشیہ - ۸)

شہابِ ثاقب اور محفوظ خطّے

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۝

(الحجر - ۱۸)

"الا یہ کہ کچھ سُن گُن لے لے، اور جب وہ سُن گُن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلہ روشن اُس کا پیچھا کرتا ہے!"

'شہابِ مُبین' کے لُغوی معنی 'شعلۂ روشن' کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن میں اس کے لئے 'شہابِ ثاقب' کا لفظ استعمال ہوا ہے یعنی 'تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ' اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارا ہی ہو۔ جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں (COSMIC RAYS) یا ان

سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزا ر غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ موجودہ زمانے کے سائنسدان اس چیز کو سحابئے (NEBULAE) سے تعبیر کرتے ہیں، اور آغاز کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے اس دخانی یا سحابی شکل میں منتشر تھا" سورہ حٰم السجدہ حاشیہ ۱۴۔ تفہیم القرآن جلد چہارم

نظامِ شمسی

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ط (یٰسٓ-۳۸)

"اور سورج، وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے!"

ٹھکانے سے مراد وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے، جہاں جا کر سورج کو آخر کار ٹھہر جانا ہے، اور وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب وہ ٹھہر جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مفہوم انسان اس وقت متعین کر سکتا ہے، جبکہ اسے کائنات کے حقائق کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جائے۔ لیکن انسانی علم کا حال یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہا ہے اور آج جو کچھ اسے بظاہر معلوم ہے اس کے بدل جانے کا ہر وقت امکان ہے۔ سورج کے متعلق قدیم زمانے کے لوگ عینی مشاہدے کی بنا پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ پھر مزید تحقیق و مشاہدہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جگہ ساکن ہے، اور نظام شمس کے سیارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی مستقل ثابت نہ ہوا۔ بعد کے مشاہدات سے پتہ چلا کہ نہ صرف سورج بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (FIXED-STARS) کہا جاتا ہے، ایک رخ پر چلے جا رہے ہیں۔ ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۰ سے لے کر ۱۰۰ میل فی سیکنڈ تک کیا گیا ہے۔ اور سورج کے متعلق موجودہ زمانہ کے ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظام شمس کو لئے ہوئے ۲۰ کلومیٹر (تقریباً ۱۲ میل) فی سیکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا لفظ سٹار اور لفظ سَن) (سورۂ یٰسٓ حاشیہ ۳۰، تفہیم القرآن جلد چہارم)

آسمانِ دُنیا۔ ہر تارے اور سیارے کا محفوظ کرہ

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ ﴿۶﴾ (الصّٰفّٰت-۶)

"ہم نے آسمانِ دُنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے!"

محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان ٹوٹنے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہ حصار ہیں جن کو قرآن مجید نے 'بُروج' (محفوظ قلعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

(سورۃ الحجر۔ حاشیہ ۱۲ تفہیم القرآن جلد دوم)

رہا یہ سوال کہ ان شہابوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس کے بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات جدید ترین دور تک انسان کے علم میں آئے ہیں، اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معائنے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں، ان کی بنا پر سائنسدانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابئے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں۔ اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ ایڈیشن ۱۹۶۷۔ جلد ۱۵۔ لفظ METEORITES)
سورہ الملک۔ حاشیہ ۱۱، تفہیم القرآن جلد ششم)

کائنات کی ابتدائی شکل

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ

(الانبیاء۔ ۳۰)

"یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انھیں جدا کیا!"

اصل میں لفظ 'رتق' اور 'فتق' کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ 'رتق' کے معنی یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق۔ اور 'فتق' کے معنی پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک تودے (MASS) کی سی تھی۔ بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔ سورہ حم السجدہ، آیت ۱۱ میں فرمایا:

"پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو اُس وقت محض دھواں تھا!"

(سورۃ الانبیاء۔ حاشیہ ۲۸، تفہیم القرآن جلد سوم)

دھوئیں سے مراد مادے کی وہ ابتدائی حالت ہے جس میں وہ کائنات کی صورت گری

م سے لیٹا ہوتا ہے۔ تب ہی آرام کی جگہ تمھارے لئے اس عظیم الشان کرّے کو
یا جو فضا میں معلق ہے۔ جو ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے محور پر گھوم رہا
،، جو ۶۶۶۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں دواں ہے۔ جس کے پیٹ
۔ وہ آگ بھری ہے جو پتھروں کو پگھلا دیتی ہے، اور آتش فشانوں کی شکل میں
ا اگل کر کبھی کبھی تمھیں بھی اپنی شان دکھا دیتی ہے۔ مگر اس کے باوجود تمھارے خالق
اسے اتنا پُرسکون بنا دیا ہے کہ تم آرام سے اس پر سوتے ہو اور تمھیں جھٹکا تک نہیں
۔ تم اس پر رہتے ہو اور تمھیں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ کُرہ معلق ہے اور تم
پر سر کے بل لٹکے ہوئے ہو۔ تم اطمینان سے اس پر چلتے پھرتے ہو۔ اور تمھیں یہ خیال تک
آتا کہ تم بندوق کی گولی سے بھی زیادہ تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو۔ بے تکلف
دتے ہو، اس کا سینہ چیرتے ہو، طرح طرح سے اس کو پیٹ کر اپنا رزق اس سے
ل کرتے ہو۔ حالانکہ اس کی ایک معمولی سی جھرجھری کبھی زلزلے کی شکل میں آکر تمھیں
سے دیتی ہے کہ یہ کس بلا کا خوفناک دیو ہے جسے اللہ تعالیٰ نے تمھارے لئے مسخر کر رکھا

(سورہ الزخرف۔ حاشیہ ۷۔ تفہیم القرآن جلد چہارم)

زمین کے متعلق ایک صاحب کے مکتوب کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

"زمین کی حرکت اور سیاروں کی گردش اور آسمانوں کی ترکیب کے معاملے میں
ن کے ارشادات کو سمجھنے کے لئے اس بنیادی بات کو ذہن نشین رکھنا ضروری ہے
اگر حرکت زمین کا ذکر کیا جاتا تو لوگوں کا دماغ چکرا جاتا۔ آج اگر بطلیموسی نظام کی بات
جائے اور زمین کو ساکن قرار دے کر سورج اور دیگر سیاروں کو اس کے گرد گھمایا جائے
اسکول کا ایک معمولی بچہ بھی مذاق اڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن مجید میں اس معاملے
متعلق کوئی صاف اور قطعی بات نہیں کہی گئی ہے۔ کیونکہ وہ طبیعیات و فلکیات
یرہ علوم سکھانے نہیں آیا ہے۔ جس غرض کے لئے وہ ان آثار کائنات سے استدلال
رہا ہے، اس کے لئے حرکت اور سکون دونوں صورتوں میں یکساں استدلال ممکن ہے
ب خواہ مخواہ ہم کیوں قرآن کے بیان کو کسی ایک چیز پر چسپاں کرنے کی کوشش کریں جو کسی
ب دور کی معلومات یا مظنونات کے مطابق ہو اور دوسرے دور میں انسان کے قائم کردہ
ریات یا مشاہدات اس کو جھٹلا دیں۔ میں نے جس بنا پر یہ کہا ہے کہ قرآن کے بعض اشارات

آسمانِ دُنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے، جس کا مشاہدہ کسی دو
کے بغیر ہم برہنہ آنکھ سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالم مختلف طاقتوں کو
نظر آتے ہیں۔ اور جن عالموں تک ابھی ہمارے وسائل مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوئی
سب دُور تے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ سَماء
چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ
کے ہم معنیٰ الفاظ عالم بالا کے لئے استعمال کرتا چلا آرہا ہے۔

(سورۃ الصّٰفّٰت۔ حاشیہ ۵ تفہیم القرآن جلد چہارم)

عالم بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے
کی بندش ایسی مضبوط ہے اور اس کے مختلف خطّے ایسی مستحکم سرحدوں سے مح
ہیں کہ کسی شیطان سرکش کا ان حدوں سے گذر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے
اور سیّارے کا اپنا ایک دائرہ اور کُرہ (SPHERE) ہے۔ جس کے اندر
نکلنا بھی سخت دشوار ہے۔ اور جس میں باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان
ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہ آئے لیکن حقیقت میں
کے اندر بے حد وحساب خطّے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کئے گئے ہیں۔ جن
میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گوناگوں مش
کیا جا سکتا ہے۔ جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسائے
پہنچنے میں پیش آرہی ہیں۔ ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق یعنی جنّوں کے
عالم بالا کی طرف صعود کرنے میں مانع ہیں۔

(سورۃ الصّٰفّٰت حاشیہ ۶ تفہیم القرآن جلد چہارم)

زمین فضا میں معلّق ایک کُرہ۔ گہوارہ

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ مَھْدًا۔ (الزخرف۔۱۰)

"وہی تھا جس نے تمھارے لئے اس زمین کو گہوارہ بنایا!"

دوسرے مقامات پر تو زمین کو فرش سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے
گہوارے کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک بچہ اپنے پنگھوڑے

بے حد و حساب تاروں (STARS) اور سیاروں (PLANETS) میں جو کمال درجے کا ربط و نظم قائم ہے، درانحالیکہ بظاہر وہ بالکل بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح یہ کتاب بھی ایک کمال درجہ کا مربوط و منظم ضابطۂ حیات پیش کرتی ہے۔ جس میں عقائد کی بنیاد پر اخلاق عبادات، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، قانون و عدالت، صلح و جنگ، غرض انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر مفصل ہدایات دی گئی ہیں۔ اور ان میں کوئی چیز کسی دوسری سے بے جوڑ نہیں ہے، درانحالیکہ یہ نظامِ فکر متفرق آیات اور مختلف مواقع پر دیئے ہوئے خطبوں میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر جس طرح خدا کے باندھے ہوئے عالمِ بالا کا نظم اٹل ہے، جس میں کبھی ذرہ برابر فرق واقع نہیں ہوتا، اسی طرح اس کتاب میں بھی حقائق بیان کئے گئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ بھی اٹل ہیں، اُن کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا۔

(سورۃ الواقعہ۔ حاشیہ ۳۷۔ تفہیم القرآن جلد پنجم)

سورج، ہوا، معدنی اور کیمیاوی اجزاء۔ پانی، کشش ثقل زمین اور سورج کا فاصلہ جیسی مناسبتیں۔ زندگی کیلئے

لازمی ہیں

اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا۔ (النمل - ۶۱)

"یا وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا!"

زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لئے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کُرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے، اُن کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں یہ کُرہ فضائے بسیط میں معلق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب اور اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا، جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آجانے سے [illegible]انی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔ یہ کُرہ باقاعدگی [illegible] سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے۔ جس سے رات اور

زمین سے متحرک ہونے کی تائید کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ قرآن مجید افلاک کا تصور یہ پیش کرتا ہے کہ وہ سمندروں کی طرح ہیں، جن میں کوئی چیز تیر رہی ہے، اور افلاک کی بجائے اجرامِ فلکی کو گردش کرتے ہوئے دکھاتا ہے۔ یعنی وہ افلاک کے اندر تیر رہے ہیں۔ اگر زمین بھی ایک جرمِ فلکی ہی ہے، تو لامحالہ یہ بھی ٹھیری ہوئی نہیں ہے، بلکہ تیر رہی۔ قرآن اس کے ٹھہرے ہوئے ہونے کا جو ذکر کرتا ہے وہ ہماری نسبت سے ہے نہ کہ افلاک کی نسبت سے۔

قطب تارے کے ساتھ زمین کی نسبت یکساں رہنے سے جو استدلال کسی مفسر نے کیا ہے، وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص دو ٹرینوں کو متوازی لائنوں پر ایک ساتھ ایک رفتار سے چلتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس کرے کہ دونوں کھڑی ہوئی ہیں اور اپنے اس احساس کو ان کے سکون پر دلیل کی حیثیت سے پیش کرے۔ آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ آپ کا ٹرین میں بیٹھے ہوں، اور آپ کی ٹرین چل پڑے۔ لیکن برابر کی لائن پر ایک ٹرین کھڑی ہو تو کافی دیر تک آپ کو یوں محسوس ہوتا رہے گا کہ حرکت میں دوسری ٹرین ہے نہ کہ آپ کی ٹرین۔ کیا اس طرح کے احساسات اُمورِ واقعیہ کیلئے کافی ہوسکتے ہیں؟" (مکاتیب سید ابو الاعلیٰ مودودی حصہ اوّل، مکتوب نمبر ا

محکم اور مضبوط اجرامِ فلکی کی طرح مضبوط اور محکم کلام

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝
اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ (الواقعہ - ۷۵ تا ۷۷)

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی اور اگر تم سمجھو تو یہ
بہت بڑی قسم ہے، کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے!"

تاروں اور سیاروں کے مواقع سے مراد ان کے مقامات، ان کی منزلیں اور ان کے مدار ہیں۔ اور قرآن کے بلند پایہ کتاب ہونے پر ان کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ بالا میں اجرامِ فلکی کا نظام جیسا محکم اور مضبوط ہے، ویسا ہی مضبوط اور محکم یہ کلام بھی ہے۔ جس خدا نے وہ نظام بنایا ہے، اُس خدا نے یہ کلام بھی نازل کیا ہے۔ کائنات کے بے شمار کہکشانوں (GALAXIES) اور ان کہکشانوں کے اندر

اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی چیزیں مل جل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ رہنے دیتیں۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لئے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص عقل رکھتا ہو اور ان امور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لئے نہ یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ کسی خالقِ حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثے کے نتیجے میں خودبخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ ہی یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور روبعمل لانے میں کسی دیوی، دیوتا، یا جن یا نبی ولی کا کوئی دخل ہے۔ (سورہ النمل حاشیہ ۷۴، تفہیم القرآن جلد سوم)

قصہ ہُدہُد اور حیوانی زندگی کا جدید مشاہدہ

قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِيْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَيْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ ۝ (سورۃ النمل۔ ۲۷، ۲۸)

"(سلیمان علیہ السلام نے) کہا ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردّ عمل ظاہر کرتے ہیں!"

یہاں پہنچ کر ہدہد کا کردار ختم ہوتا ہے۔ عقلیت کے مدعی حضرات نے جس بنا پر اسے پرندہ ماننے سے انکار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انھیں ایک پرندے کا اس قوتِ مشاہدہ، قوتِ تمیز اور قوتِ بیان سے بہرہ ور ہونا بعید از امکان معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ملک پر گزرے اور یہ جان لے کہ یہ قومِ سبا کا ملک ہے، اس ملک کا نظامِ حکومت یہ ہے، اس کی فرماں روا عورت ہے، اس کا مذہب آفتاب پرستی ہے، اس کو خدائے واحد کا پرستار ہونا چاہیئے تھا، مگر یہ گمراہی میں مبتلا ہے، اور اپنے یہ سارے مشاہدات وہ آکر اس وضاحت کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام سے بیان کر دے۔ انہی وجوہ سے کھلے کھلے ملاحدہ قرآن پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کلیلہ دمنہ کی سی باتیں کرتا ہے۔ اور قرآن کی عقلی تفسیریں کرنے والے اس کے الفاظ کو اُن کے صریح معنی سے پھیر کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ حضرت ہدہد

دن کا اختلاف رُونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رُخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رُخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ کیونکہ ایک رخ کو سردی اور بے نوری نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے قابل نہ رکھتی، اور دوسرے رخ کو گرمی کی شدت بے آب و گیاہ اور غیر آباد بنا دیتی۔ اس کرہ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف ردّہ چڑھا دیا گیا ہے۔ جو شہابوں کی خوفناک بماری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ ورنہ روزانہ دو کروڑ شہاب جو ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے۔ یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی اور زمین کے مختلف حصّوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے۔ اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لئے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزاء بڑے پیمانے پر فراہم کر دیئے گئے ہیں، جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لئے مطلوب ہیں۔ جس جگہ بھی یہ سر و سامان مفقود ہوتا ہے وہاں کی زمین کسی زندگی کو سہارنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اس کرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیرِ زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر لیا گیا ہے۔ اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔ پھر اس پانی، ہوا اور تمام ان اشیاء کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، سمیٹے رکھنے کے لئے اس کرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہ کشش اگر کم ہوتی تو ہوا اور پانی دونوں کو نہ روک سکتی اور درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہوتا کہ زندگی یہاں دشوار ہو جاتی۔ یہ کشش اگر زیادہ ہوتی تو ہوا بہت کثیف ہو جاتی، اس کا دباؤ بہت بڑھ جاتا، بخاراتِ آبی کا اٹھنا مشکل ہوتا اور بارشیں نہ ہو سکتیں، سردی زیادہ ہوتی۔ زمین کے بہت کم رقبے آبادی کے قابل ہوتے۔ بلکہ کششِ ثقل بہت زیادہ ہونے کی صورت میں انسان اور حیوانات کی جسامت بہت کم ہوتی، اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل و حرکت بھی ان کے لئے مشکل ہوتی۔ علاوہ بریں اس کرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، جو آبادی کے لئے مناسب ترین ہے۔ اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو

"اور دیکھو، تمھارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں، اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے چھتے بنا، اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔ اس مکھی کے اندر سے رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے، جس میں شفا ہے لوگوں کے لئے۔ یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں!"

"رب کی ہموار کی ہوئی راہوں!" کا اشارہ اس پورے نظام اور طریق کار کی طرف ہے جس پر شہد کی مکھیوں کا ایک گروہ کام کرتا ہے۔ اُن کے چھتوں کی ساخت، اُن کے گروہ کی تنظیم، ان کے مختلف کارکنوں کی تقسیم کار، اُن کی فراہمی غذا کے لئے پیہم آمد و رفت، ان کا باقاعدگی کے ساتھ شہد بنا بنا کر ذخیرہ کرتے جانا، یہ سب وہ راہیں ہیں جو اُن کے عمل کے لئے ان کے رب نے اس طرح ہموار کر دی ہیں کہ انہیں کبھی سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بس ایک مقرر نظام ہے جس پر ایک لگے بندھے طریقے پر شکر کے یہ بے شمار چھوٹے چھوٹے کارخانے ہزارہا برس سے کام کئے چلے جا رہے ہیں۔

(سورۃ النحل حاشیہ ۵۰ - تفہیم القرآن جلد دوم)

شہد کا ایک مفید اور لذیذ غذا ہونا تو ظاہر ہے، اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا البتہ اس کے اندر شفا ہونا نسبتاً ایک مخفی بات ہے، اس لئے اس پر متنبہ کر دیا گیا۔ شہد اوّل تو بعض امراض میں بجائے خود مفید ہے، کیونکہ اس کے اندر پھولوں اور پھلوں کا رس، اور اُن کا گلوکوز اپنی بہترین شکل میں موجود ہوتا ہے۔ پھر شہد کا یہ خاصّہ کہ وہ خود بھی نہیں سڑتا اور دوسری چیزوں کو بھی اپنے اندر ایک مدت تک محفوظ رکھتا ہے، اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ دوائیں تیار کرنے میں اس سے مدد لی جائے۔ چنانچہ الکوہل کے بجائے دُنیا کے فن دوا سازی میں وہ صدیوں اسی غرض کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ مزید برآں شہد کی مکھی اگر کسی ایسے علاقے میں کام کرتی ہے، جہاں کوئی خاص جڑی بوٹی کثرت سے پائی جاتی ہو۔ تو اس علاقے کا شہد محض شہد ہی نہیں ہوتا بلکہ اس جڑی بوٹی کا بہترین جوہر بھی ہوتا ہے۔ اور اس مرض کے لئے مفید ہوتا ہے، جس کی دوا اس جڑی بوٹی میں خدا

توسرے سے کوئی پرندے مخفے ہی نہیں۔ لیکن ان دونوں قسم کے حضرات کے پاس آخروہ کیا سائنٹیفک معلومات ہیں جن کی بنا پر وہ قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہوں کہ حیوانات اور اُن کے مختلف انواع اور پھر ان کے مختلف افراد کی قوتیں اور استعدادیں کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ جن چیزوں کو وہ معلومات سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت اس نہایت ناکافی مشاہدے سے اخذ کردہ نتائج ہیں، جو محض سرسری طور پر حیوانات کی زندگی اور ان کے برتاؤ کا کیا گیا ہے۔ انسان کو آج تک کسی یقینی ذریعہ سے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ مختلف قسم کے حیوانات کیا جانتے ہیں۔ کیا کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں، کیا سمجھتے اور سوچتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کا ذہن کس طرح کام کرتا ہے۔ پھر بھی جو تھوڑا بہت مشاہدہ مختلف انواع حیوانی کی زندگی کا کیا گیا ہے۔ اس سے ان کی نہایت حیرت انگیز استعدادوں کا پتہ چلا ہے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ جو ان حیوانات کا خالق ہے، ہم کو یہ بتاتا ہے کہ اُس نے اپنے ایک نبی کو جانوروں کی منطق سمجھنے اور اُن سے کلام کرنے کی قابلیت عطا کی تھی، اور اس نبی کے پاس سدھائے جانے اور تربیت پانے سے ایک ہدہد اس قابل ہوگیا تھا کہ دوسرے ملکوں سے یہ کچھ مشاہدے کرکے آتا اور پیغمبرؑ کو ان کی خبر دیتا تھا، تو بجائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی روشنی میں حیوانات کے متعلق اپنے آج تک کے تھوڑے سے علم اور بہت سے قیاسات پر نظرِ ثانی کریں۔ یہ کیا عقل مندی ہے کہ ہم اپنے اس ناکافی علم کو معیار قرار دے کر اللہ تعالیٰ کے اس بیان کی تکذیب یا اس کی معنوی تحریف کرنے لگیں۔

(سورۃ النمل۔ حاشیہ ۲۶۔ تفہیم القرآن جلد سوم)

شہد کی مکھی اور شانِ ربوبیت

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّ
مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۝ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ
فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ يَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ
مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَاۗءٌ لِّلنَّاسِ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (النحل۔ ۶۸، ۶۹)

"انہی کے مانند!" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنے آسمان بنائے اتنی ہی زمینیں بھی بنائیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے متعدد آسمان اس نے بنائے ہیں، ویسی ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ اور "زمین کی قسم سے!" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ زمین، جس پر یہ انسان رہتے ہیں اپنی موجودات کے لئے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور زمینیں بھی تیار کر رکھی ہیں۔ جو اپنی اپنی آبادیوں کے لئے فرش اور گہوارہ ہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو قرآن میں یہ اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی پر نہیں ہیں، عالم بالا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر آسمان میں جو بے شمار تارے اور سیارے نظر آتے ہیں یہ سب ڈھنڈار پڑے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ زمین کی طرح اُن میں بھی بکثرت ایسے ہیں جن میں دُنیائیں آباد ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حال میں امریکہ کے RAND CORPORATION نے فلکی مشاہدات سے اندازہ لگایا ہے کہ زمین جس کہکشاں (GALAXY) میں واقع ہے صرف اسی کے اندر تقریباً ۶۰ کروڑ ایسے سیارے پائے جاتے ہیں۔ جن کے طبعی حالات ہماری زمین سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور امکان ہے کہ اُن کے اندر بھی جاندار مخلوق آباد ہو ——
(اکانومسٹ، لندن۔ مورخہ ۲۶۔ جولائی ۱۹۶۹ء)

(سورہ الطلاق حاشیہ۔ ۲۳۔ تفہیم القرآن جلد پنجم)

مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس علیہ السلام کے زندہ رہنے کا امکان

فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ سَقِيْمٌ ۝ (الصّٰفّٰت-۱۴۵)

"آخر کار ہم نے اُسے بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینک دیا!"

جب حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا اور وہ ایک بندۂ مومن و قانت کی طرح اس کی تسبیح میں لگ گئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مچھلی نے ان کو ساحل پر اُگل دیا۔ ساحل ایک چٹیل میدان تھا، جس میں کوئی روئیدگی نہ تھی، نہ کوئی ایسی چیز تھی جو حضرت یونس علیہ السلام پر سایہ کرتی، نہ وہاں غذا کا کوئی سامان موجود تھا۔

اس مقام پر بہت سے عقلیت کے مدعی حضرات یہ کہتے سُنے جاتے ہیں کہ مچھلی کے پیٹ میں جا کر کسی انسان کا زندہ نکل آنا غیر ممکن ہے۔ لیکن پچھلی ہی صدی کے اواخر میں اس نام نہاد عقلیت کے گڑھ (انگلستان) کے سواحل سے قریب ایک واقعہ پیش آ چکا ہے، جو ان کے

سے پیدا کی ہے۔ شہد کی مکھی سے یہ کام اگر باقاعدگی سے لیا جائے، اور مختلف نباتی دواؤں کے جوہر اس سے نکلوا کر ان کے شہد علیحدہ علیحدہ محفوظ کئے جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ یہ شہد لیبارٹریوں میں نکالے ہوئے جوہروں سے زیادہ مفید ثابت ہوں گے۔

(سورہ النحل۔ حاشیہ ۵۸۔ تفہیم القرآن جلد دوم)

شہد کی مکھیوں کی خلقت گواہی دے رہی ہے کہ ایک حکیم اور ربّ رحیم نے ان چیزوں کو ڈیزائن کیا ہے۔ سورہ النحل حاشیہ ۵۹۔ تفہیم القرآن جلد دوم

سیّاروں میں زندگی کے امکانات

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ
الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ (النحل۔ ۴۹)

"زمین اور آسمانوں میں جس قدر جاندار مخلوقات ہے اور جتنے ملائکہ ہیں، سب اللہ کے آگے سربسجود ہیں!"

زمین ہی کی نہیں آسمانوں کی بھی وہ تمام ہستیاں جنکو قدیم زمانے سے لے کر آج تک لوگ دیوی، دیوتا اور خدا کے رشتہ دار ٹھہراتے آئے ہیں، دراصل غلام اور تابعدار ہیں ان میں سے بھی کسی کا خداوندی میں کوئی حصہ نہیں۔ ضمناً اس آیت سے ایک اشارہ اس طرف بھی نکل آیا کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی میں نہیں ہیں، بلکہ عالم بالا کے سیّاروں میں بھی ہیں۔ یہی بات سورۂ شوریٰ آیت ۲۹ میں ارشاد ہوئی ہے:

"اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش، اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں!"

(سورۃ النحل حاشیہ ۴۲۔ تفہیم القرآن جلد دوم۔)

یعنی زمین میں بھی اور آسمانوں میں بھی۔ یہ کھلا اشارہ ہے اس طرف کہ زندگی صرف زمین پر ہی نہیں پائی جاتی، بلکہ دوسرے سیّاروں میں بھی جاندار مخلوقات موجود ہیں۔

سورہ الشوریٰ حاشیہ ۵۰۔ تفہیم القرآن جلد چہارم

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ط (الطلاق: ۱۲)

"اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی انہی کے مانند!"

کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ سورۃ الصّٰفّٰت حاشیہ ۳ میں تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"سورج ہمیشہ ایک ہی مطلع سے نہیں نکلتا بلکہ ہر روز ایک نئے زاویے سے طلوع ہوتا ہے۔ نیز ساری زمین پر وہ بیک وقت طالع نہیں ہوجاتا، زمین کے مختلف حصوں پر مختلف اوقات میں اس کا طلوع ہوا کرتا ہے۔ ان وجوہ سے مشرق کے بجائے مشارق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ مغارب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیونکہ مشارق کا لفظ خود ہی مغارب پر دلالت کرتا ہے۔ تاہم ایک جگہ ربّ المشارق والمغارب کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ (المعارج۔ ۴۰)

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝ (الرحمٰن۔ ۱۷)

"دونوں مشرق اور دونوں مغرب، سب کا مالک و پروردگار وہی ہے"!

دو مشرقوں اور دو مغربوں سے مراد جاڑے کے چھوٹے سے چھوٹے دن اور گرمی کے بڑے سے بڑے دن کے مشرق و مغرب بھی ہوسکتے ہیں۔ اور زمین کے دونوں نصف کروں کے مشرق و مغرب بھی۔ جاڑے کے سب سے چھوٹے دن میں سورج ایک نہایت تنگ زاویہ بنا کر طلوع و غروب ہوتا ہے اور اس کے برعکس گرمی کے سب سے بڑے دن میں وہ انتہائی وسیع زاویہ بناتے ہوئے نکلتا اور ڈوبتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہر روز اس کا مطلع اور مغرب مختلف ہوتا رہتا ہے۔ جس کے لئے ایک دوسرے مقام پر ربّ المشارق والمغارب کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی طرح زمین کے ایک نصف کرے میں جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے، اس وقت دوسرے نصف کرے میں وہ غروب ہوتا ہے۔ یوں بھی زمین کے دو مشرق اور دو مغرب بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو ان دونوں مشرقوں اور مغربوں کا ربّ کہنے کے کئی معنی ہیں۔ ایک یہ کہ اسی کے حکم سے سورج طلوع و غروب اور سال کے دوران میں ان کے مسلسل بدلتے رہنے کا یہ نظام قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ زمین اور سورج کا مالک و فرمانروا وہی ہے ورنہ ان دونوں کے ربّ الگ الگ ہوتے تو زمین پر سورج کے طلوع و غروب کا یہ باقاعدہ نظام کیسے قائم ہوسکتا تھا، اور دائماً کیسے رہ سکتا تھا۔ تیسرے یہ کہ ان دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک و پروردگار وہی ہے۔ ان کے درمیان رہنے والی مخلوقات

دعوے کی تردید کردیتا ہے۔ اگست ۱۸۹۱ء میں ایک جہاز (STAR OF THE EAST) پر کچھ مچھیرے وہیل کے شکار کے لئے گہرے سمندر میں گئے۔ وہاں انہوں نے ایک بہت بڑی مچھلی کو جو ۲۰ فیٹ لمبی، ۵ فیٹ چوڑی، اور ۱۰۰ ٹن وزنی تھی، سخت زخمی کردیا۔ مگر اس سے جنگ کرتے ہوئے جیمز بارٹلے نامی ایک مچھیرے کو اس کے ساتھیوں کی آنکھوں کے سامنے مچھلی نے نگل لیا۔ دوسرے روز ہی مچھلی اس جہاز کے لوگوں کو مری ہوئی مل گئی۔ انہوں نے بمشکل اسے جہاز پر چڑھایا اور پھر طویل جدوجہد کے بعد جب اس کا پیٹ چاک کیا تو بارٹلے اس کے اندر سے زندہ برآمد ہوگیا۔ یہ شخص مچھلی کے پیٹ میں پورے ساٹھ گھنٹے رہا تھا (اردو ڈائجسٹ۔ فروری ۱۹۶۴ء)۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اگر معمولی حالات میں فطری طور پر ایسا ہونا ممکن ہے تو غیر معمولی حالات میں اللہ تعالیٰ کے معجزے کے طور پر ایسا ہونا کیوں غیر ممکن ہے؟

رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ۔ (المعارج - ۴۰)

"پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی!"

یہاں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔ مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویے پر غروب ہوتا ہے۔ نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں، بلکہ بہت سے ہیں۔ ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جہت مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب۔ اس بنا پر سورۂ شعراء آیت ۲۸ اور مزمل آیت ۹ میں "ربّ المشرق والمغرب" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں۔ کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کرے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طلوع ہوتا ہے۔

(سورہ المعارج حاشیہ ۲۸۔ تفہیم القرآن جلد ششم)

اس بنا پر سورۂ الرحمٰن، آیت ۱۷ میں "ربّ المشرقین وربّ المغربین"!

پہلے اس عظیم لرزے کی وجہ سے سمندروں کی تہہ پھٹ جائے گی، اور ان کا پانی زمین کے اندرونی حصّے میں اترنے لگے گا، جہاں ہر وقت ایک بے انتہا لاوہ کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے اِن دو ابتدائی اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک، یعنی آکسیجن جلانے والی اور دوسری یعنی ہائیڈروجن بھڑک اٹھنے والی ہے۔ اور یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک مسلسل ردِّ عمل (CHAIN REACTION) شروع ہو جائے گا، جس سے دُنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔

وضعِ حمل کی مدّت اور جدید طبّی تحقیقات

وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (الاحقاف - ۱۵)

"اور اُس کے حمل اور دُودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے!"

- سورۂ بقرہ آیت ۲۳۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"مائیں اپنے بچّوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، اُس باپ کے لئے جو رضاعت کی پوری مدّت تک دُودھ پلوانا چاہے!"

- سورۂ لقمان آیت ۱۴ میں فرمایا: "اور دو سال اُس کے دُودھ چھوٹنے میں لگے!"
- اور سورۂ احقاف ۱۵ میں فرمایا:

"اُس کے حمل اور اُس کا دُودھ چھڑانے میں تیس۳۰ مہینے لگے!"

اب اگر تیس۳۰ مہینوں میں سے رضاعت کے دو سال نکال دیئے جائیں تو حمل کے چھ مہینے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حمل کی کم سے کم مدّت جس میں زندہ سلامت بچّہ پیدا ہو سکتا ہے، چھ مہینے ہے ......!

اس مقام پر یہ جان لینا فائدے سے خالی نہ ہوگا کہ جدید ترین طبّی تحقیقات کی رُو سے ماں کے پیٹ میں ایک بچّے کو کم از کم ۲۸ ہفتے درکار ہوتے ہیں۔ جن میں وہ نشوونما پاکر زندہ ولادت کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہ مدّت ساڑھے چھ مہینے سے کچھ زیادہ بنتی ہے۔ اسلامی قانون میں نصف مہینے کے قریب مزید رعایت دی گئی ہے۔ کیونکہ ایک عورت کا زانیہ قرار پانا اور بچّے کا نسب سے محروم ہو جانا بڑا سخت معاملہ ہے، اور اس کی

اس کی ملک ہیں، وہی ان کو پال رہا ہے، اور اسی پرورش کے لئے اس نے زمین پر سورج کے ڈوبنے اور نکلنے کا یہ حکیمانہ نظام قائم کیا ہے۔

سورہ الرحمٰن حاشیہ - ۱۷، تفہیم القرآن جلد پنجم۔

قیامت کے روز سمندر میں آگ، اللہ کی قدرت!

وَ اِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝ (التکویر-۶)

"اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں!"

اصل میں لفظ سُجِّرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ۔

تسجیر عربی زبان میں تنور کے اندر آگ دہکانے کے لئے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت لوگوں کی نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابلِ تعجب محسوس نہ ہوگی یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اُس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن، دو ایسی گیسوں باہم ملایا، جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے او ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادّہ پیدا کیا، جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک اشارہ اس بات کے لئے بالکل کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہو جائیں، جو اُن کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔

(سورۃ التکویر- حاشیہ - ۶، تفہیم القرآن جلد ششم)

وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ (الانفطار-۳)

"اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے!"

سورۃ التکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے، اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رُو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا، جو کسی علاقے تک محدود نہ ہوگا، بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا دی جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور اُن میں آگ بھڑک اُٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ

ہوا پیٹ کی دیوار میں کوکھ کی ہڈی کے عین متوازی ایک نالی — (INGUINAL CANAL) میں سے گذر کر قریب ہی ایک غدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ غدود کا نام (PROSTATE) ہے۔ اور پھر وہاں سے رطوبت لے کر اس کا اخراج ہوتا ہے۔ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے اس کے گذرنے کو میں سمجھ نہ سکا۔ البتہ اس کا کنٹرول ایک ایسے نروس سسٹم سے ہوتا ہے جو کہ سینے کی ہڈی اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان جال کی صورت میں پھیلا ہوا ہے، وہ بھی ایک خاص حد تک۔ اس کا کنٹرول ایک اور غدود جو کہ دماغ میں ہوتا ہے، کی رطوبت سے ہوتا ہے۔ لیکن یہاں سوال اخراج کا ہے (جو کہ ایک نالی کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے) میری درخواست ہے کہ آپ مجھے مفصل لکھیں کہ اس کی تفسیر کیا ہے۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے (جس کے لئے معذرت خواہ ہوں) کہ آپ سائنٹیفک علم پر یقین رکھتے ہیں!"

اس کے جواب میں ہم نے نومبر ۱۹۷۱ء کے رسالہ "ترجمان القرآن" میں لکھا ہے، کہ: "آپ چونکہ ایک ڈاکٹر ہیں اس لئے اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اگرچہ جسم کے مختلف حصوں کے افعال (FUNCTIONS) الگ الگ ہیں۔ لیکن کوئی حصہ بھی بجائے خود تنہا کوئی فعل نہیں کرتا بلکہ دوسرے اعضاء کے تعامل (CO-ORDINATION) سے اپنا کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ مادّہ منویہ بننے کی جگہ بلاشبہ موقع ہے اور وہاں سے اس کا اخراج بھی ایک خاص راستے سے ہوتا ہے۔ لیکن معدہ، جگر، پھیپھڑے دل۔ دماغ، گردے اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا مادّہ منویہ کے بننے اور نکلنے کا یہ نظام بطورِ خود اپنا کام کر سکتا ہے؟ اسی طرح مثال کے طور پر دیکھئے پیشاب گردے میں بنتا ہے اور ایک نالی کے ذریعے مثانے میں پہنچ کر پیشاب کے راستے خارج ہوتا ہے۔ مگر کس چیز کے نتیجے میں؟ خون بنانے والے اور اس کو سارے جسم میں گردش دے کر گردے تک پہنچانے والے اعضاء اگر اپنا کام نہ کر رہے ہوں تو کیا تنہا گردہ خون سے وہ مادّے الگ کر کے مثانے میں بھیج سکتا ہے، جن کے مجموعے کا نام پیشاب ہے؟ اس لئے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ یہ مادّہ ریڑھ کی ہڈی اور سینے کی ہڈیوں سے نکلتا ہے۔ بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ: "ان دونوں کے درمیان جسم کا جو حصّہ واقع ہے اس سے یہ مادّہ خارج ہوتا ہے!" یہ اس بات کی نفی ہے کہ مادّہ منویہ کے بننے اور اس کے اخراج کا ایک خاص نظامِ عمل

زاکت یہ تقاضا کرتی ہے کہ ماں اور بچے دونوں کو اس کے قانونی نتائج سے بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش دی جائے۔ علاوہ بریں کسی طبیب، کسی قاضی، حتیٰ کہ خود حاملہ عورت اور اسے بار آور کرنے والے مرد کو بھی ٹھیک ٹھیک یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ استقرارِ حمل کس وقت ہوا ہے۔ یہ بات بھی اس امر کی متقاضی ہے کہ حمل کی کم از کم قانونی مدت کے تعین میں چند روز کی مزید گنجائش رکھی جائے۔

مادۂ تولید کی پیدائش

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ (الطارق۔ ۶، ۷)

"ایک اچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے!"

اصل میں صُلب اور ترائب کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صُلب ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں۔ اور ترائب کے معنی ہیں سینے کی ہڈیاں یعنی پسلیاں۔ چونکہ عورت اور مرد دونوں کے مادۂ تولید، انسان کے اس دھڑ سے خارج ہوتے ہیں، جو صُلب اور سینے کے درمیان واقع ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ انسان اس پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کے درمیان سے نکلتا ہے۔ یہ مادہ اس صورت میں بھی پیدا ہوتا ہے جب کہ ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کے پورے جسم سے خارج ہوتا ہے۔ درحقیقت جسم کے اعضائے رئیسہ اس کے ماخذ ہیں، اور وہ سب ہی دھڑ میں واقع ہیں۔ دماغ کا الگ ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ صُلب دماغ کا وہ حصّہ ہے، جس کی بدولت ہی جسم کے ساتھ دماغ کا تعلق قائم ہوتا ہے۔

(سورہ الطارق۔ حاشیہ ۳، تفہیم القرآن جلد ششم)

سورۂ طارق آیات ۶، ۷ کی تشریح کرتے ہوئے جو کچھ ہم نے حاشیہ ۳ میں لکھا ہے اس پر ایک ڈاکٹر صاحب نے ہمیں لکھا ہے کہ: "آپ کی تشریح میں نے بغور کافی دفعہ پڑھی ہے، لیکن میں کچھ نہ سکا۔ جہاں تک عملی مشاہدے کا تعلق ہے تو یہ مادہ فوطے (TEST-ICLE) میں پیدا ہوتا ہے اور باریک باریک نالیوں کے ذریعے بڑی نالیوں سے گذر

"اُن سمندروں سے موتی اور مونگے نکلتے ہیں!"

اصل الفاظ ہیں یَخْرُجُ مِنْهُمَا : "اُن دونوں سمندروں سے نکلتے ہیں" معترضین اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ موتی اور مونگے صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں۔ پھر یہ کیسے کہا گیا کہ میٹھے اور کھاری دونوں پانیوں سے یہ چیزیں نکلتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سمندروں میں میٹھا اور کھاری دونوں طرح کا پانی جمع ہوجاتا ہے۔ اس لئے خواہ یہ کہا جائے کہ دونوں کے مجموعہ سے یہ چیزیں نکلتی ہیں، یا یہ کہا جائے کہ وہ دونوں پانیوں سے نکلتی ہیں۔ بات ایک ہی رہتی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ مزید تحقیقات سے یہ ثابت ہوکہ اِن چیزوں کی پیدائش سمندر میں اُس جگہ ہوتی ہے جہاں اُس کی تہہ سے میٹھے پانی کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور اُن کی پیدائش اور پرورش میں دونوں طرح کے پانیوں کے اجتماع کا کچھ دخل ہے۔ بحرین میں جہاں قدیم ترین زمانے سے موتی نکالے جارہے ہیں، وہاں تو یہ بات ثابت ہے کہ خلیج کی تہہ میں میٹھے پانی کے چشمے موجود ہیں۔

سطحِ زمین پر پہاڑوں کی افادیت

وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ۔ (النحل۔ ١٥)

"اُس نے زمین میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دیں تاکہ زمین تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے!"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سطحِ زمین پر پہاڑوں کے اُبھار کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے زمین کی گردش اور اس کی رفتار میں انضباط پیدا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پہاڑوں کے اس فائدے کو نمایاں کرکے بتایا گیا ہے، جس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے تمام فائدے ضمنی ہیں۔ اور اصل فائدہ یہی حرکتِ زمین کو اضطراب سے بچا کر منضبط (REGULATE) کرتا ہے۔

(MECHANISM) ہے جسے جسم کے کچھ خاص حصے انجام دیتے ہیں۔ بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظام عمل مستقل بالذات نہیں ہے۔ یہ اپنا کام اس پورے نظام اعضاء کے مجموعی عمل کی بدولت انجام دیتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے صُلب اور ترائب کے درمیان رکھ دیا ہے۔ اسی لئے میں نے یہ وضاحت کی ہے کہ پورا جسم اس میں شامل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں تب بھی یہ نظام کام کرتا رہتا ہے۔ البتہ صُلب اور ترائب کے درمیان جو اعضائے رئیسہ واقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی باقی نہ رہے تو یہ نظام اپنا عمل جاری نہیں رکھ سکتا!"

اس سوال و جواب کو پڑھنے کے بعد دو مختلف مقامات سے دو ڈاکٹروں نے ہمیں جو طبی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

علم الجنین (EMBRYOLOGY) کی رُو سے ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جنین سے (FOETUS) کے اندر انثیین (TESTES) یعنی وہ غدود جن سے مادّہ منویہ پیدا ہوتا ہے، ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کے درمیان گردوں کے قریب ہوتے ہیں، جہاں سے بعد میں یہ آہستہ آہستہ فوطوں میں اُتر جاتے ہیں۔ یہ ولادت سے پہلے اور بعض اوقات اس کے کچھ بعد ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے اعصاب اور رگوں کا منبع ہمیشہ وہی مقام (بَین الصُّلب والتَّرائب) ہی رہتا ہے۔ بلکہ ان کی شریان (ARTERY) پیٹھ کے قریب شہ رگ (AORTA) سے نکلتی ہے اور پورے پیٹ کا سفر طے کرتی ہوئی ان کو خون مہیا کرتی ہے۔ اس طرح حقیقت میں انثیین پیٹھ ہی کا جُز ہیں، جو جسم کا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہ کرنے کی وجہ سے فوطوں میں منتقل کردیئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں مادّہ منویہ اگرچہ انثیین پیدا کرتے ہیں اور وہ کیسہ منویہ (SEMINAL VESICLES) میں جمع ہوجاتا ہے۔ مگر اس کے اخراج کا مرکز تحریک بین الصّلب والترّائب ہی ہوتا ہے، اور دماغ سے اعصابی رَو جب اس مرکز کو پہنچتی ہے، تب اس مرکز کی تحریک (TRIGERACTION) سے کیسۂ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافق پچکاری کی طرح نکلتا ہے۔ اس لئے قرآن کا بیان ٹھیک ٹھیک علم طب کی جدید تحقیقات کے مطابق ہے۔

(ضمیمہ ۴، بسلسلہ سورۃ الطارق تفہیم القرآن جلد ششم)

موتی اور مونگے سمندر میں کس جگہ بنتے ہیں؟

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۚ (الرحمٰن - ٢٢)

صلی اللہ علیہ وسلم

نظامِ مصطفےٰ

کی نمایاں خصوصیات

اور

اس کا نفاذ کیوں اور کیسے؟

—— از ——

جناب فرید احمد محبوب ترمذی
سینیر انسٹرکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن لاہور

اس مضمون کے بارے میں اتنا عرض کرونگا کہ ہمارے علماء کرام اور اکابرِ دین نے جو شمع روشن کر رکھی ہے اسی کی روشنی میں الفاظ کو ترتیب دینے کی یہ کوشش ہے۔ اس ضمن میں خاص طور پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر انجمن خدام القرآن لاہور کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنکی تقاریر اور تصانیف سے میں نے رہنمائی حاصل کی۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کے دین کی سربلندی کیلئے کچھ کر سکیں۔ فرید احمد محبوب ترمذی

بقیہ از صہ۳۱

رسیتوران میں دو آسٹریلوی ہوابازوں نے لوگوں کو کشتیٔ نوح کی کئی تصاویر دکھائی تھیں۔ آسٹریلیا کے مطابق نیوساؤتھ ویلز کے مقام "بورال" کی ایک خاتون نے جنگ کے زمانہ میں تھا کہ وہ شاہی فضائیہ کے ایک ایسے نوجوان ہواباز کو جانتی ہے جس نے "کوہ ارارات" پر کی تھی اور کشتیٔ نوح کو قریب سے دیکھا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وہ جلد ہی ایک حادثہ میں ہلاک ہوگیا اور اس سے مزید معلومات حاصل نہ کی جاسکیں۔ ہوسکتا ہے یہ وہی ہواباز ہو جس نے رسیتوران میں کشتیٔ نوح کی تصاویر دکھائی تھیں۔

بقیہ از صہ۳۶

تیسرے حصے کی تیاری قاضی محمد حسین جونپوری کو دی گئی۔ ان حضرات کے علاوہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب "انفاس العارفین" میں ملا حامد جونپوری کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ انہیں بھی فتاویٰ کی تیاری کے سلسلے میں ایک چوتھائی کام سپرد کیا گیا

بے شک زمانے کی گاڑی کافی آگے جاچکی ہے۔ احوال وظروف میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوئے ہیں، البتہ قانونِ اسلامی کی تشکیل جدید میں اس سے استفادہ کیا جا چکا ہے۔ کم از کم ہمیں ان ابتدائی مراحل کی تیاری کے لئے وقت کھونا نہیں ہوگا جن کو حسن و خوبی سے طے کیا جاچکا ہے۔ بہرحال فتاویٰ عالمگیری قانونِ اسلامی کی تطبیق میں ایک جامع کوشش ہے جس میں ہماری رہنمائی کا سامان موجود ہے۔

بقیہ از صہ۴۰

کے باوجود شریعِ شریف کے لحاظ و اتباع کا اہل کو کبھی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

حرفِ آخر نہ میں پیر صاحب کا متبع ہوں نہ شاگرد، نہ ہم عقیدہ اور نہ ہم مشرب۔ اس کے باوجود میں نے یہ چند شواہد اس لئے درج کر دیئے ہیں کہ قارئین کو ان کی انصاف پسندی اور سلامتِ طبع اور حق پژوہی کا اندازہ ہوسکے۔ علماء اور صوفیہ دونوں میں یہ صفت بہت کم پائی جاتی ہے اور بہرحال قابلِ ستائش ہے۔ فقط

مذہب سمجھتا ہے حالانکہ یہ تصور درست نہیں ۔ مذہب کے لفظ سے جو تصور
ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ چند مابعد الطبیعیات META PHYSICAL عقائد
کا رکھنا اور ان عقائد کے تحت چند رسوم عبادت کی ادائیگی اور چند رسوم معاشرت
کی پابندی اگر کی جائے تو مذہب کا تقاضہ پورا ہو گیا ۔ یوں دین کو مذہب کی
شکل دیکر آج کا پڑھا لکھا طبقہ اسے ایک انسان کی زندگی کا نجی معاملہ قرار
دیتا ہے جسے نہ اجتماعی نظام سیاست سے کوئی تعلق ہے نہ معاشیات سے
نہ باقی اجتماعی تقاضوں سے ۔

عربی زبان میں لفظ دین کا اصل مفہوم ہے جزا و سزا یعنی بدلہ ۔ چنانچہ سورہ
فاتحہ میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے مالک یوم الدین (جزا و سزا کے دن
کا مالک) ظاہر ہے جزا اور سزا کسی قانون اور ضابطے کے تحت ہی ہوتی ہے
لہذا جزا اور سزا کے ساتھ قانون اور ضابطہ کا تصور بھی ابھرتا ہے جسکی پیروی
کی جاتی اور اس تصور کے ساتھ یہ بھی لازماً ذہن میں آتا ہے کہ کوئی ایسا ادارہ
یا ایسی ہستی ہے جو قانون عطا کرنے والی LAW GIVER ہے اور جو اطاعت
چاہتی ہے ۔ لہذا از روئے قرآن حکیم دین کے معنی ہیں " ایک پورا نظام زندگی
اور مکمل ضابطہ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مقنن LAW GIVER
اور حاکم مطلق SOVEREIGN مان کر اسکی جزا کی امید اور اس کی سزا کے
خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطے کے
مطابق اس ہستی کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے ۔

اس مفہوم میں سورۃ یوسف میں دین الملک کی اصطلاح استعمال ہوئی
ہے ۔ حضرت یوسف کے زمانے میں مصر میں بادشاہت کا نظام بادشاہ کی
حاکمیت کی بنیاد پر قائم تھا ۔ اور اصل حکم انہی بادشاہ کی تصور کی جاتی تھی اس
لئے اسے دین الملک سے تعبیر کیا گیا ۔

اس وضاحت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کے آخری پارے کی سورۃ نصر پر
غور کیجئے :۔

اذا جاء نصر اللہ والفتح ۝ ورایت الناس یدخلون فی دین
اللہ افواجا ۝

یعنی

آجکل نظام مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی اصطلاح چل پڑی ہے۔ یہ نظام معاشرہ میں اسلام کا کلی نفاذ چاہتا ہے جس کے لئے اصل اصطلاح ہے اقامت دین یا دین کا قیام۔ مزید برآں نظام مصطفےٰ مجموعہ ہے بہت سے نظاموں کا۔ اس میں اسلام کا نظام اخلاق۔ نظام معیشت۔ نظام معاشرت، نظام سیاست، نظام عدل، نظام جنگ و صلح۔ نظام حکومت، غرضیکہ پورا نظام زندگی شامل ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں اور بھی تو بہت سی اقوام ہیں جو خدا کو مانتی ہیں اور اپنے اپنے طریقے پر اس کی عبادت بھی کرتی ہیں مگر انہوں نے تو اپنے مذاہب کو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر مسلمان ہی کیوں ایسا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ ان کا معاملہ ہم سے مختلف ہے وہ اس کے مدعی ہی نہیں کر دینی رُخ سے ان کے پاس پوری زندگی کے لئے کوئی لائحہ عمل ہے۔ ان کے ہاں دین کا کوئی تصور نہیں صرف مذہب کا ہے اور مذہب ان کی نظر میں ایک اخلاقی نصب العین ہے یا زیادہ سے زیادہ رُوحانی بلند مقامات و مراتب کے حصول کے لئے روحانیت یا رہبانیت کا ایک کورس ہے جس پر چل کر کوئی فرد ان مقامات کو حاصل کر سکتا ہے۔

اس کے برعکس اسلام ایک مذہب ہی نہیں پورا دین ہے جس کے اندر کامل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں تو زندگی کے ایک ایک گوشے سے متعلق قانون، دستور قواعد و ضوابط اور ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کے جس پہلو کو لیجئے وہاں حدود و قیود لگی ہوئی ہیں کہ یہ جائز ہے وہ ناجائز، یہ حلال ہے وہ حرام، یہ صحیح ہے وہ غلط، یہ کرو وہ نہ کرو وغیرہ وغیرہ۔ بات آگے بڑھانے سے پہلے مذہب اور دین کا فرق سمجھ لیجئے اور ساتھ ہی قرآن کی دو اصطلاحات **عبادتِ رَبّ اور شہادتِ حق** کا مفہوم بھی سمجھ لیجئے تاکہ معاشرہ میں نظام اسلام کے نفاذ کی غرض و غایت واضح ہو جائے۔

مذہب اور دین دونوں عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ مگر پورے قرآن اور ذخیرہ احادیث میں اسلام کی تعبیر میں کسی جگہ لفظ مذہب استعمال نہیں ہوا بلکہ دین استعمال ہوا ہے جو ہماری زبان کے لفظ نظام حیات کے مفہوم سے قریب ترین ہے۔ جدید ذہن اور فکر دین کو فرد کی زندگی کا ایک نجی معاملہ سمجھتے ہوئے اسے لفظ مذہب کے

اطاعت نہیں بلکہ بکمال خوشی و رغبت و محبت یہ اطاعت مطلوب ہے۔ یہاں بندہ اپنی ہر مرضی اور خواہش کو اللہ کی مرضی کے سامنے پست کر دے۔ ایسی اطاعت کلی کے لئے قرآن ایک لفظ استعمال کرتا ہے وہ ہے عبادتِ رب۔ یہ قرآن کا بڑا مرکزی لفظ ہے۔ اور اس کی دعوت کا خلاصہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلّم تک جتنے بھی رسُول اور انبیاء مبعوث فرمائے گئے وہ اسی عبادت رب یعنی اللہ کی بندگی کی دعوت لے کر آئے۔ وہ سب ایک ہی دین پر تھے یعنی دین اسلام پر۔ اسی دین کی طرف وہ اپنی اپنی قوم کے افراد کو بلاتے رہے کہ لوگو! حاکم مطلق درا صل صرف اللہ ہے، وہی تمہارا خالق ہے۔ وہی تمہیں پالنے والا ہے۔ وہی تمہیں جزا اور سزا دینے والا ہے۔ لہٰذا اسی کی بندگی کرو۔ اسی کے سامنے بکمال محبت و شوق جھک جاؤ بچھ جاؤ۔ اسی کے احکامات کی پیروی کرو۔ جو وہ تمہیں انبیاء و رسل کے ذریعے بھیجتا رہا۔ موت کے بعد ایک دن تم اس کے حضور پیش کئے جاؤ گے اور جواب دہ ہوگے۔ اللہ کی توحید کے ساتھ ساتھ ملائکہ، نزول کتب، ارسال انبیاء، حشر و نشر، حساب و کتاب، جزا و سزا، جنت و دوزخ سب پر ایمان لاؤ۔ دین ایک ہی رہا شریعتیں مختلف رہیں۔ حالات کے بدلنے اور انسانی ذہن اس کی تہذیب و تمدن اور اس کے وسائل و ذرائع کی ترقی کے ساتھ ساتھ شریعت یعنی عملی زندگی کے احکام میں تغیّر و تبدل ہوتا رہا۔ یوں کہیئے کہ وہ دین جو اللہ تعالےٰ نے گذشتہ انبیاء پر نازل کیا تھا وہ اپنی تکمیل کو پہنچا حضور خاتم النبیّین والمرسلین حضرت محمدؐ پر جب شریعت الٰہی انسانی زندگی کے ہر انفرادی و اجتماعی پہلو کے بارے میں واضح احکامات اور رہنما اصول لے کر حضورؐ کے ذریعے مکمل صورت اختیار کر گئی۔ اس بات پر قرآن میں سورت مائدہ کی وہ چھوٹی سی آیت جو عین حجۃ الوداع کے موقعہ پر نازل ہوئی مہر تصدیق ثبت کرتی ہے:۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا ط یعنی ———

آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔

جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہوگئی اور (اے نبی) آپ نے دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

"یہاں دین اللہ سے مراد ہے اللہ کو مطاع حاکم مطلق اور حقیقی مقنن تسلیم کر کے اسی کی جزا کی امید اور اسی کی سزا کا خوف رکھتے ہوئے صرف اسی کے قانون، اسی کے ضابطے اور اسی کی دی ہوئی شریعت کے مطابق انفرادی اور اجتماعی معاملات کو انجام دیا جائے۔ بالفاظ دیگر صرف اور صرف اسی کی اطاعت میں پوری زندگی کو جکڑ دیا جائے۔ اسی رویئے اور طرز عمل کا نام ہے اللہ کے دین کے تحت زندگی گزارنا"۔ اسی کا حکم قرآن میں ہے کہ اے ایمان والو! (اللہ کی) اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

نظام مصطفٰی، دین اللہ کو انہی معنوں میں معاشرہ میں کلی طور پر انفرادی اور اجتماعی تقاضوں میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔

یہاں تک تو میں نے مذہب اور دین کے الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے عرض کیا ہے کہ اسلام جو ایک دین ہے کیوں ہر شعبہ حیات میں اپنا غلبہ چاہتا ہے اور نظام اسلام یا نظام مصطفٰی کے معنی کیا ہیں۔ اب آیئے ایک دوسرے سوال کی طرف کہ اس نظام یا دین اسلام کے تحت ہم پر بحیثیت مسلمان کیا انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جن پر پورا اترنے کے لئے پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہم بحمد اللہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا خالق اور رب ہے۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے بکمال مہربانی اپنے بندوں کی رہنمائی کے لئے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے ذریعے احکامات نازل کئے اور حضور نبی اکرمؐ آخری نبی اور رسول ہیں اور ان پر آخری کتاب ہدایت قرآن کی شکل میں اتری جس کی تعلیمات پر حضورؐ نے عملاً چل کر دکھایا اور اسے معاشرہ میں ایک نظام حیات کی شکل میں نافذ فرمایا۔ ظاہر ہے ہمارے فرائض کا تعین بھی قرآن اور سنت کی ہی روشنی میں ہو گا۔

عبادت رب — اللہ اور اس کے رسول اکرمؐ کا دیا ہوا نظام حیات مسلمانوں سے جس اطاعت کلی کا متقاضی ہے وہ سارے بندھن کی

ؔ مطالبات دین۔ (صفحہ نمبر ۱۹)

اے بنی نوع انسان اس اللہ کی بندگی اختیار کرو۔ اطاعت کرو۔ اور پرستش جو تمہارا رب ہے اور جس نے تم سے پہلے ہو گزرنے والے انسانوں کو بھی پیدا کیا۔ تاکہ تم بچ سکو۔

یوں جانیئے کہ" جبتک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وسائل نہیں پیدا کر لئے جو ساری دنیا کو ایک داعی حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لئے ضروری تھے۔ اس وقت تک اللہ تعالےٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کو بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی اور اجتماعی شعور اتنا پیدا ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظام عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائل اور اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام ہدایت دُنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالےٰ کی رحمت اس بات کی متقاضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء جناب محمد مصطفےٰ صلعم کو بھیجے اور ان کے ذریعہ لوگوں کو وہ مکمل نظام زندگی عنایت فرمائے جو بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات وضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظام ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔

اس نظام زندگی کو جسے آپ نظام مصطفےٰ کہہ لیجئے۔ حضور سرورکائنات نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی ایک وسیع خطۂ ارضی پر بالفعل قائم کر کے اسکی برکات لوگوں کے سامنے رکھ دیں تاکہ بنی نوع انسان پر ہمیشہ کے لئے اللہ کی حجت قائم ہو جائے اور قیامت کے روز انسان یہ نہ کہہ سکے کہ اسے تو اس کے انفرادی، سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کا کوئی متوازن اور معتدل حل ہی نہیں دیا گیا تھا۔ لہذا وہ کس بات کے لئے جواب دہ ہو؟

نفس نبوّت کی رعایت سے تو جناب رسالت مآب باقی انبیاء کی طرح شاہد بھی تھے اور بشیر و نذیر بھی، داعی بھی تھے اور مزکّی بھی مگر حضورؐ کی امتیازی شان ہے خاتم النبین ہونے کی۔ یعنی نبوت و رسالت کے مقاصد کی تکمیل آپ کے ہاتھوں ہوئی۔ اور بنی نوع انسان کو قیامت تک جو اجتماعی مسائل پیش آنے والے تھے ان کے حل کے لئے رہنما اصول نہ صرف آپ نے قولاً بتائے بلکہ انہیں معاشرہ میں بالفعل نافذ کر کے بطور نمونہ دکھا دیا کہ اگر تمہیں اپنے عائلی

یوں سمجھ لیجئے کہ دینِ اسلام کی کلی شریعت الٰہی کو لے کر بتدریجاً سابقہ انبیائے کرام کے ہاتھوں تحقق رہی۔ حتیٰ کہ حضور خاتم النبیین و المرسلین کے مقامِ رسالت پر فائز ہونے سے وہ کلی تکمیل شریعت کے ساتھ ایک پورے پھول کی شکل اختیار کر گئی اور دینِ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر بنی نوعِ انسان کے پاس پہنچ گیا۔

یاد رکھیں کہ شریعت کے احکامات مدنی سورتوں میں آئے ہیں مکی سورتوں میں نہیں حالانکہ قرآن حکیم کا کوئی دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ مکہ میں چونکہ مسلمانوں کی حیثیت ایک داعی جماعت کی تھی اور ان کے اپنے معاشرے یا ریاست کے قیام کا مرحلہ جو انہیں مدنی دور میں پیش آیا مکہ میں پیش نہیں آیا تھا اس لئے شریعت کے تفصیلی احکام بھی انہیں مدینے میں دیئے گئے۔ مکی سورتوں میں مسلمانوں کو توحید، ایمان، رسالت، آخرت اور اخلاقِ حسنہ کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا۔ نیز حق و باطل کی کشمکش کے پس منظر میں جو اس وقت انتہائی شدت اختیار کر گئی تھی حضور سرورِ کائنات کو اور آپ کے جانثاروں کو صبر و تحمل کی تلقین بھی فرمائی گئی اور حالات کی مناسبت سے ضروری ہدایات بھی دی گئیں۔

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ تمام انبیاء اور مرسلین ایک ہی دین لیکر اور اللہ کی اطاعت و بندگی یعنی عبادتِ رب کی دعوت اپنی اپنی قوموں کو دیتے رہے جن کی طرف وہ مبعوث ہوئے تھے۔ ہر رسول اپنی دعوت کا آغاز یا قوم کہہ کر کرتا رہا۔ جتنی شریعت یعنی عملی زندگی کے بارے میں احکامات ان انبیاء کے زمانوں میں یہ دین اپنے اندر لے کر پہنچتا رہا وہ اپنی قوم کے افراد تک پہنچاتے رہے، خود بھی عمل پیرا ہوئے اور دوسروں کو بھی عمل کی دعوت دی۔ جب حضور نبی اکرم کے ذریعہ یہ دین پوری شریعت الٰہی لیکر پہنچ گیا تو دعوتِ دین کا خطاب کسی ایک قوم سے نہیں کیا گیا بلکہ پوری نوعِ انسانی کو مخاطب کر کے کہا گیا۔

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون ۔ یعنی

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں۔ اپنی اطاعت کو سرت اسی کے لئے خالص کر کے بالکل یک سو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں (یہی طرز عمل) نہایت صحیح و درست دین (نظام زندگی) ہے۔

غور فرمایئے کہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حکم علیحدہ ہے اور اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا حکم علیحدہ۔ معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ جیسی فرض عبادت کے علاوہ بھی ایک اور عبادت انسان سے مطلوب ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان یک سو ہو کر مخلصانہ طور پر اپنی زندگی کا ہر گوشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں دے دے اور اس کا پورا نظام زندگی اس ضابطہ اور ہدایت کے تحت آ جائے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رُسل کے ذریعہ بنی نوع انسان تک پہنچایا۔

ظاہر ہے کہ عبادت رب کے اس وسیع تر مفہوم کے تحت ہمیں اپنے معاشرہ میں ایسا نظام لاگو کرنا ہوگا جو افراد کی زندگی کو اللہ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھال دے اور انہیں اپنے فریضہ عبادت کی ادائیگی میں مدد دے اس کے برعکس اگر ایسا نظام رائج ہو جاتے جو لوگوں کو شریعت الٰہی سے دور لیجائے تو بار کس کی گردن پر ہوگا؟ مثال کے طور پر اگر نظام ایسا ہو جہاں سود کا کاروبار چل رہا ہے، رشوت ستانی عام ہو، معاشرہ میں لوگ اگر عزت و فضیلت دیکھیں تو ان افراد کی جن کے پاس پیسہ ہے۔ چاہے وہ پیسہ سمگلنگ اور چور بازاری سے اکٹھا ہوا اور یوں وہ پیسہ کی خاطر ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرنے کی طرف راغب ہو جائیں۔ یا جہاں جنسی بے راہ روی پر کوئی قدغن نہ ہو اور چاروں طرف طاغوتی طاقتوں کی یلغار اپنے اندر ایسی جاذبیت اور کشش پیدا کریں کہ معاشرہ کے افراد احکامات الٰہیہ کو پس پشت ڈال کر اپنی نفسانی خواہشات کے چکروں میں پھنس جائیں تو سوچیے ایسے نظام کے بدلنے کی ضرورت ہوگی یا نہیں؟

شہادتِ حق

آب آیئے دین کی دوسری اصطلاح شہادت حق کی طرف۔ اسلام کا ایک عظیم مطالبہ اور تقاضا عبادت رب میں نے پہلے پیش کرنے کی کوشش کی ہے دوسرا اہم اور عظیم مطالبہ ہے شہادت حق

معاشرتی، سیاسی، معاشی، انتظامی یا اور کسی اجتماعی میدان میں کوئی کام کرنا ہے تو شریعت الٰہی کی مطابقت میں اسے کیسے سرانجام دیا جائے اور عبادت رب کا حق کیسے ادا کیا جائے۔

بدقسمتی سے ہم نے لفظ عبادت کے مفہوم کو محدود کر کے رکھ دیا اور صرف چند اعمال اور مراسم بندگی کی ادائیگی کا نام عبادت رب رکھ لیا۔ حالانکہ عبادت اس رویہ اور طرز عمل کا نام ہے جس سے انسان کی پوری زندگی برضا و رغبت اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں آجائے۔ اور عبادت کا یہ وسیع تر مفہوم متقاضی ہے ایک ایسے نظام زندگی کا جس میں انسان، اللہ کی خوشنودی کے لئے اس کے بتائے ہوئے طریق پر چلتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآ ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج ہم پر فرض ہیں، ان کی ادائیگی عبادت رب میں شمار ہوتی ہے اور ان کی اہمیت اتنی اونچی ہے کہ ان سے کوتاہی سزا کا موجب ہوگی۔ مگر عبادت صرف یہی نہیں۔ اور اگر صرف ان کو ادا کر کے سمجھ لیا جائے کہ عبادت رب کا حق ادا ہو گیا تو دین کا تصور محدود ہی نہیں بلکہ مسخ ہو جائے گا اور یہ تصور اس وقت تک صحیح اور درست نہیں ہوگا جبتک کہ یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عبادت پوری زندگی میں خدا کے سامنے بچھ جانے اور ہر گوشے اور ہر معاملے میں اللہ کے حکم کا بخوشی مطیع ہونے کا نام ہے۔ آپ خود سوچیئے ایک شخص نماز بھی پڑھتا ہے۔ روزہ بھی رکھتا ہے، زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہے۔ فریضہ حج بھی پورا کر چکا ہے مگر عملی زندگی میں سمگلنگ، چور بازاری، دھوکہ دہی کرتا ہے، دوسروں کے حق غصب کرتا ہے، رشوت لیتا ہے، انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے رجسٹروں میں ہیر پھیر کرتا ہے تو کیا وہ واقعی عبادت رب کا حق ادا کر رہا ہے۔ اگر صرف نماز، زکوٰۃ، روزہ وغیرہ ہی کی ادائیگی سے عبادت رب کا حق ادا ہو جاتا تو پوری زندگی کو اللہ کی اطاعت میں دینے کی ضرورت نہ ہوتی مگر اس معاملہ کو بھی احکم الحاکمین نے آخری پارہ کی سورت البینہ میں دور فرما دیا۔ سورۃ مبارکہ کے نام کے معنی ہی ہیں روشن دلیل جس کے بعد کسی انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ ارشاد باری ہے۔ اہل کتاب کا ذکر فرماتے ہوئے:

قول و عمل سے بھی دی ۔ اور اسی حق کی شہادت ہی کے لئے اللہ کی اطاعت پر مبنی نظام زندگی بالفعل نافذ کر کے ایک نمونہ تمہارے سامنے پیش کر دیا ۔ گویا کہ رسول کی گواہی ہو گئی تم پر ۔ اب تمہارے ذمہ ہے کہ اس مفہوم اور معنی میں بنی نوع انسانی پر تا قیام قیامت گواہی دو ۔ تمہیں اب اللہ کی ہدایت اور اللہ کے دین کو عملاً نافذ کر کے دنیا کے سامنے حق کی شہادت دینی ہے ۔

اس فرض منصبی کی تاکید مزید سورۃ النسا کی آیت ۱۳۵ میں یوں آئی ہے اے ایمان والو! پوری قوت و استقامت کے ساتھ عدل و انصاف کے علمبردار اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ ۔ یہی تاکید الفاظ کی ترتیب کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۃ النسا سے اگلی سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۸ میں بھی آئی ہے ۔ یوں سمجھیئے کہ قرآن مجید کی پہلی چار طویل سورتیں یعنی سورہ بقرہ سے لے کر سورۃ مائدہ تک جو نزولی اعتبار سے مدنی دور کی ہیں ۔ اُمت مسلمہ کو ان کے فرائض منصبی یعنی عبادت رب اور شہادت حق کی ادائیگی کا حکم دے رہی ہیں اور ساتھ ہی شریعت کے احکام تدریجاً دیئے جا رہے ہیں کہ ان فرائض کی ادائیگی میں مسلمانوں کو اپنے عائلی، معاشرتی اور ملی سطح کے معاملات کیسے طے کرنا ہیں ۔

ہمارے دین میں اس شہادت حق کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام کا آغاز ہی اس لفظ سے ہوا اور ہم اس شہادت کی بنا پر اُمت مسلمہ میں شامل ہوئے جب ہم نے اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھا ۔ ایک مرد مومن دین حق کی شہادت کے لئے زندگی بھر اپنی پوری صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرتے ہوئے ضرورت پڑنے پر اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیتا ہے ۔ ہم اسے شہید کہتے ہیں ۔ اس کی آخری شہادت کی جو قدر و منزلت معبود حقیقی کی نظر میں ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں ۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یہ بات یاد رکھیں ہمیں صرف اپنے ہی مسائل کا حل ہدایت الٰہیہ کی رہنمائی میں نہیں ڈھونڈنا بلکہ بحیثیت اُمت مسلمہ نوع انسانی کی ہدایت و رہنمائی بھی کرنا ہے ۔ مگر بدقسمتی سے ہم وہاں ہیں جہاں ہمیں خود اپنی ہی خبر نہیں ۔ یہ

جس کے لئے پھر نظام مصطفےٰ کے نفاذ کی ضرورت ہے۔
سورہ بقر کے ۱۷ ویں رکوع کی تیسری آیت کے ایک جزو پر غور فرمایئے۔
وکذلک جعلنٰکم امۃ وسطاً لتکونوا شھدآء علی
الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا ط یعنی ——
(اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی اُمت (بہترین اُمت) بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔)
پہلے اس آیت کا پس منظر ذہن میں رکھیئے۔ سورۃ بقر کے چوتھے رکوع سے چودھویں رکوع تک مسلسل ایک مضمون بنی اسرائیل کے متعلق چلا آ رہا ہے۔ بنی اسرائیل درحقیقت ہم سے پہلے کے مسلمان ہیں اور ہم سے پہلے اُمت مُسلمہ یہی بنی اسرائیل تھے اور شریعت محمدی سے پہلے کی شریعت شریعت موسوی کہلاتی ہے۔ اس اُمت مسلمہ نے جس جس طرح سے احکامات خداوندی کی نافرمانی کی اور جس جس طرح اپنے فرائض سے کوتاہی کی اس کی ایک مسلسل فرد قرارداد جرم ان دس رکوعوں میں اللہ نے لگائی ہے اس کے بعد تحویل قبلہ کا ذکر ہے اور اللہ اعلان فرماتا ہے کہ اے بنی اسرائیل! ان جرائم کی پاداش میں تم اُمت مسلمہ کے مقام و مرتبہ سے معزول کئے جا رہے ہو اور اب ایک نئی اُمت تمہاری جگہ فائز کی جا رہی ہے اور وہ ہے اُمت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس نئی اُمت کا قبلہ بھی تمہارے قبلہ بیت المقدس سے بدل کر بیت الحرام مقرر کیا جا رہا ہے اور تمہارے قبلہ کو منسوخ کیا جا رہا ہے۔ ساتھ ہی نئی امت مسلمہ کو متنبہ کر دیا گیا کہ اس منصب پر فائز ہونا جہاں ایک بہت بڑا اعزاز ہے وہاں ایک بھاری ذمہ داری اور نازک فرض کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس کے لئے وہ اللہ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ اس کے بعد اٹھارویں رکوع کے اختتام سے شروع ہوتا ہے خطاب نئی اُمت مسلمہ سے بحیثیت اُمت مسلمہ کے۔ اسے کہا کہ "تم بہترین اُمت ہو جسے نوع انسانی کی رہنمائی کے لئے برپا کیا گیا ہے تاکہ تم ہو جاؤ گواہ تمام لوگوں پر اور رسول ہو جائیں گواہ تم پر۔ یعنی تمہارے پاس ہو گی اللہ کی ہدایت کی امانت (قرآن) اور نوع انسانی اس ہدایت سے استفادہ کرے گی۔ تم پر تبلیغ اور تعلیم کا حق ادا کر دیا جناب محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے۔ انہوں نے حق کی شہادت اپنے

نہ پر برابر کردی جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے ۔"

اب آئیے ایک

نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لئے راہ کیسے ہموار کی جائے ؟

دوسری طرف کہ پاکستان میں نظام مصطفیٰ کو عملاً لاگو کرنے کے لئے پہلے کیا اقدام اٹھائے جائیں جن سے اس نظام کے نفاذ کی راہ ہموار ہو سکے :

(۱) اس وقت سب سے پہلے ان مبادی کی دعوت عام دینے کی ضرورت ہے جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے ۔ اور وہ یہ ہیں:

(الف) خدا پر ایمان کامل توحید کے ساتھ ۔

(ب) رسالت پر ایمان کامل اطاعت کے ساتھ ۔

(ج) آخرت پر ایمان کامل یقین کے ساتھ ۔

بقول مولانا اصلاحی صاحب یہی تین ایمانیات کے پہلو ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی غلط راہوں کی طرف کھسکنا شروع ہو جاتی ہے ۔ اس دعوت کے لئے ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع کا اشتراک عمل ضروری ہے ۔

(۲) اسلام کو صرف ایک مذہب کی شکل میں چند عقائد اور چند رسوم کی حیثیت میں لوگوں کے سامنے نہ پیش کیا جائے (خاص طور پر نوجوان نسل کے سامنے) ، بلکہ ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت میں پیش کیا جائے ۔ تاکہ معلوم ہو کہ مطالبات دین کیا ہیں ۔

(۳) داعین اسلام چاہے وہ مساجد کے آئمہ ہوں ، نیک سرکاری ملازم ہوں ، دین کا درد رکھنے والے سیاستدان ہوں یا انکا شمار معاشرہ کے کسی بھی ایسے ذہین طبقہ سے ہو جو اسلامی نظام کا نفاذ چاہتا ہے ۔ یہ حضرات جب تک اپنے قول و فعل کے تضاد کو کم سے کم تر نہ کریں گے ۔ عوام کو اپنے وعظ و نصیحت سے متاثر نہ کر سکیں گے ۔ تبلیغ کا ذریعہ صرف الفاظ نہیں ۔ حقیقی اسلامی زندگی کا عملی مظاہرہ بھی ضروری ہے ۔

(۴) عوام کے ذریعے ہنگامی اور انقلابی تحریکیں تو چل سکتی ہیں اور یہ تحریکیں نچلی سطح سے چل کر اوپر کے نظام کو درہم برہم بھی کر سکتی ہیں لیکن ٹھوس اصلاحی اور عقلی دعوتیں اس وقت جڑ پکڑ سکتی ہیں جب اوپر سے نیچے

کریں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں کو روک دیں گے۔

اب پاکستان کی شکل میں اللہ نے ہمیں ایک خطہ ارضی دیا ہے جہاں ہمارا اپنا غلبہ ہے اور اپنی حکومت ہے۔ اب ازروئے قرآن ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ نہ صرف اپنی انفرادی زندگی کے ہر شعبے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی اعبادت رب ، ایسے طریق پر کرے کہ اس کا قول وعمل اس بات کی شہادت دے کہ وہ واقعی اللہ کا اطاعت گزار بندہ ہے بلکہ اپنے اجتماعی فریضہ یعنی دوسروں کو نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا اور تمام بنی نوع انسان کے سامنے اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ پیش کرنے کے لئے مسلمان ایسا نظام حیات معاشرے میں رائج کریں کہ وہ اسلامی نظام حیات اس بات کی شہادت دے کہ انسانوں کی فلاح و بہبود اگر ہو سکتی ہے تو صرف اللہ کے دین کی پیروی میں ہی ممکن ہے۔

اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری کامیابی اور نجات صرف عبادت رب کو روبہ اختیار کرنے اور شہادت حق کا فرض انجام دینے میں ہے کیونکہ یہی مقصد تھا امت مسلمہ کو دنیا میں برپا کرنے کا۔ ان فرائض کی پوری پوری تکمیل کے لئے انسانی معاشرہ میں نظام اسلام کا نفاذ اشد ضروری ہے۔ اگر ہم نے انفرادی اور اجتماعی میدان میں اپنے ان فرائض سے کوتاہی کی تو یاد رکھیئے عذاب الٰہی سے ہمیں کوئی نہ بچا سکے گا۔

یہاں غور فرمایئے سورۃ النسا کی آیت نمبر ۴۱ اور ۴۲ پر جہاں نقشہ کھینچ دیا گیا اخروی عدالت کا جس میں قوموں اور امتوں کے محاسبے کے وقت ان کے انبیاء اور رسول سرکاری گواہوں کی حیثیت سے پیش ہونگے اس ضمن میں وہ آیت قابل توجہ ہے جسکی قرأت حضرت عبداللہ بن مسعود سے سن کر آنحضور کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے۔

"تو کیا ہوگا اس دن جبکہ ہم ہر امت میں سے اس کے خلاف ایک گواہ کھڑا کریں گے۔ اور آپ کو کھڑا کریں گے (اے نبی) ان لوگوں کے خلاف گواہ کی حیثیت سے۔ اس روز وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہوگا یا رسول کی نافرمانی کی ہوگی خواہش کریں گے کہ وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین

اور سماجی تعلقات میں اخلاق حسنہ کا مظاہرہ کرسکتا ہے اور اپنے گھر والوں کی بھی مناسب تربیت کرسکتا ہے۔ خندہ پیشانی سے بات کرنا، دوسرے کی دل آزاری سے بچنا، ضرورت مند کی حتی المقدور مدد کرنا۔ پڑوسی کا خیال رکھنا، بڑوں کا احترام اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا، غصہ پر قابو رکھنا، نماز روزہ کی خود پابندی کرنا اور گھر کے افراد کو ترغیب دینا وغیرہ وغیرہ ایسے کام ہیں جو معاشرہ میں صحت مند فضا پیدا کرسکتے ہیں۔

(۱۰) شہری محلہ جات اور دیہات میں نیک اور صالح افراد کی فلاحی کمیٹیاں بنائی جائیں جو نوجوانوں کے ساتھ خلوص و محبت اور شفقت سے رابطہ رکھیں، ان کے مسائل کے حل میں ان کی رہنمائی کریں۔ ان کی شخصیت کی تعمیر کیلئے مناسب تربیتی پروگراموں کا انتظام کریں۔ صحت مند تفریحی مقابلوں کا انتظام کریں، جو بچے اور نوجوان کوئی بھی خیر کا کام کریں اس کی مناسب تشہیر کی جائے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور دوسروں کو بھی فلاحی کاموں کی ترغیب ملے۔

(۱۱) بعض اوقات نیم خواندہ جنونی قسم کے لوگ خود کو خدائی فوجدار بنا لیتے ہیں اور جہاں کسی سے کوئی کوتاہی ہوئی یا نماز روزہ کی ادائیگی میں غفلت ہوئی تو وہ اس بری طرح انہیں ڈانٹتے ہیں کہ بجائے ان کی اصلاح ہو اور وہ اپنے فرائض کی کوتاہی پر نادم ہوں، الٹا ان کے دلوں میں ایک چڑ سی پیدا ہو جاتی ہے اور ان مبلغ صاحب کے لئے ایک نفرت کا جذبہ ان کے دلوں میں ابھر آتا ہے۔ یوں بعض اوقات وہ خیر کی راہ سے اور دور نکل جاتے ہیں حالانکہ اللہ اور اسکے رسول کا حکم ہے کہ دوسرے سے احسن طریق پر بات کرو۔ متذکرہ بالا محلہ فلاحی کمیٹیاں اس غلط قسم کی تبلیغ کو بھی روکیں جو بجائے نفع کے نقصان کا موجب بن رہی ہے۔

(۱۲) ایسے زمانے میں جب کہ ملحدانہ فلسفہ حیات اور مادہ پرستانہ نظریات کی یورش انسانی فکر اور سوچ کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے وہاں لوگوں کو دین اسلام کی طرف راغب کرنے کے لئے صرف چند شرعی حدود اور

کی طرف اثر انداز ہوں ۔ حضرات انبیائے کرامؑ نے کبھی عام لوگوں کو پہلے خطاب نہیں کیا بلکہ سوسائٹی کے کارفرما عناصر کی ذہنیتوں کو تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی اور ان کی اصلاح کا ذریعہ بنایا ۔ ہمیں اس طریق کار کو اپنانا ہوگا

(۵) سکولوں اور کالجوں میں صرف دینیات کے کورس کا رکھنا ہی کافی نہیں، بچوں اور نوجوانوں کے کریکٹر اور انکی شخصیت کی تعمیر کی بھی فکر ضروری ہے ۔

(۶) ہمارے آئمہ مساجد عام طور پر مختلف دارالعلوموں سے ایک لگا بندھا کورس مکمل کرنے کے بعد تبلیغ دین کے فرائض ادا کرنا شروع کر دیتے ہیں مگر ان کی ذاتی تعلیم و تربیت اس نہج پر نہیں ہو پاتی کہ وہ آجکل کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنے خیالات اور اپنی شخصیت سے متاثر کر سکیں ۔ نہ ہی دور حاضرہ کے عمرانی اور معاشرتی تقاضوں کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جدید ذہن و فکر کے حامل افراد کے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکیں ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی مدرسوں اور دارالعلوموں میں قرآن، حدیث اور فقہ کے نصاب کے ساتھ عمرانیات ۔ اجتماعی نفسیات، اقتصادیات جیسے اہم موضوعات سے بھی انہیں اچھی طرح روشناس کر دایا جائے ۔

(۷) تمام سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلباً اور اساتذہ کے لئے ہفتہ میں کم از کم ایک بار ایسے لیکچر ضرور رکھے جائیں جن سے انہیں معلوم ہو کہ قرآن کا پیغام ہے کیا اور یہ آخری کتاب الہٰی نوع انسان سے کیا مطالبہ کرتی ہے اور حضور نبی اکرمؐ نے کیا نمونہ ہمارے لئے چھوڑا ہے ۔ اسی طرح فیکٹریوں اور سرکاری دفاتر میں وہاں کے کارکناں کو قرآن سے روشناس کرانا بہت ضروری ہے ۔

(۸) سنیما، ٹیلی ویژن اور ریڈیو ایسے ذرائع ابلاغ ہیں کہ لوگوں پر اچھا تاثر بھی چھوڑ سکتے ہیں اور غلط بھی ۔ ان کی فلموں اور پروگراموں پر خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ معاشرتی ذہن مطلوبہ نہج پر ڈھالا جا سکے ۔

(۹) بہت سے ایسے چھوٹے چھوٹے کام ہیں جن کی بجاآوری کے لئے نہ کسی سرکاری آرڈیننس کی ضرورت ہے نہ کوئی خاص قانون بنانے کی ۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا سربراہ اگر چاہے تو خود بھی روزمرہ کی بول چال اور لین دین

کہ اخلاقی ہدایات کا ماخذ اور منبع صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن اور اس کے رسول اکرمؐ کی سُنت ہے اور یہ ہدایات ہماری خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے بڑے مسائل کے حل میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔

(۲) اخلاقی قانون کو سیاسی اور انتظامی قوتوں کے تحت نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر اس کے ضمیر کی آواز اور قوت نافذہ کو بھی بیدار کرتا ہے اور اسے بار بار آگاہ کرتا ہے کہ اس کا معاملہ اس حاکم مطلق کے ساتھ ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ دنیا کو دھوکا دے سکتا ہے مگر اپنے اللہ کو نہیں جس کے سامنے اسے ایک روز جواب دہ ہونا ہے۔ یوں اسلامی اخلاقی نظام ہر آدمی کے دل میں خوف خدا بٹھا دیتا ہے۔ اس کا اپنا ضمیر اندر سے اسے تعمیل احکام الٰہی کا حکم دیتا ہے، ایمان کی پختگی کے ساتھ یہ خوف خدا انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کسی خارجی دباؤ کی عدم موجودگی میں بھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

(۳) یہ نظام خوف الٰہی کے ساتھ ساتھ اللہ کی محبت، اس کی رحمت اور جزا کی آس کو بھی دلوں میں پیدا کرتا ہے۔ یہ محبت اور یہ آس انسان کو اخلاقی نظام کی پیروی پر ابھارتی چلی جاتی ہے اور وہ بکمال شوق اس کا پابند ہو جاتا ہے۔

(۴) چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام کا اخلاقی نظام ایسی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف یعنی بھلے کاموں کو پھیلاتے اور منکر یعنی برائیوں کو مٹائے۔

سیاسی نظام کی چند خصوصیات

(۱) زمین و آسمان میں حاکمیت صرف اللہ کی مانتا ہے۔

(۲) قانون صرف اللہ کا چلے گا جو اس نے اپنی کتاب میں دیا اور جس کی مستند تشریح حضور نبی اکرمؐ نے اپنے قول و عمل سے پیش فرمائی۔ احکام کتاب الٰہی اور سنت رسول کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں شریعت ہے اور یہ شریعت ہی وہ اساسی دستور ہے جس پر اسلامی ریاست

تعزیرات کا نفاذ کافی نہیں ۔ پہلے ان کی سوچ کے دھارے کو بدلنا ہوگا، ان کے دلوں میں مقام عبودیت کی عظمت کا احساس پیدا کرنا ہوگا ۔ ان کے منفی نظریات کو بُرا کہنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ جس تیزی سے یہ غلط نظریات پھیل چکے ہیں اور پھیل رہے ہیں اس سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ مثبت نظریات کو معاشرہ میں پھیلانے کی ضرورت ہے ۔ اس کے لئے حکومت اور اسلامی ذہن و فکر کے حامل اشخاص دونوں کی مربوط اور منظم کوشش درکار ہے ۔

(۱۳) بھوک و افلاس کا ستایا ہوا ایک نیک انسان بھی بعض اوقات معاشرہ کی اخلاقی حدود کو پھلانگ جاتا ہے مسلم سوسائٹی کا فرض ہے کہ ایسے افراد کی دستگیری کرے ۔ اب جبکہ ہم زکوٰۃ اور عشر کا نظام نافذ کر رہے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو روپیہ اس مد میں آئے اسے دیانتدارانہ طریق پر اکٹھا کر کے مستحق افراد تک پہنچایا جائے تاکہ اس نظام کی برکات کا لوگوں کو عملی ثبوت ملے ۔ اور وہ اسلام کے اخلاقی نظام، سیاسی اور انتظامی نظام، معاشرتی نظام اور روحانی نظام کے نفاذ کے بھی خود دل سے خواہاں ہوں اور پورا پورا تعاون کریں ۔

نظامِ مصطفےٰ کی چند خصوصیات[۱]

میں نے اس مضمون کے شروع میں کہا تھا کہ نظام مصطفےٰ دراصل بہت سے نظاموں کا مجموعہ ہے جس میں اسلام کا اخلاقی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور دیگر تمام نظام شامل ہیں ۔ آیئے دیکھیں کہ ان نظاموں کے چیدہ چیدہ نکات کیا ہیں جنہیں نظام مصطفےٰ اپنی لڑی میں پرو دیتا ہے اور پھر وہ لڑی ایک مکمل ضابطہ حیات کی شکل میں معاشرہ کے ہر شعبہ کو اپنے حصار کے اندر لے آتی ہے ۔

اخلاقی نظام کی چند خصوصیات

(۱) اسلام کا اخلاقی نظام سب سے پہلے ایک فرد کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے

---

[۱] تفصیل کیلئے دیکھیے: اسلامی نظامِ زندگی ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی

اور زخمی اور بیمار علاج معالجہ کا ہر حال مستحق ہے خواہ وہ دشمن قوم سے ہی تعلق رکھتا ہو۔

ذمیوں (غیر مسلموں) کے لئے جو اسلامی ریاست کی حدود میں رہتے ہیں چند حقوق متعین ہیں۔ ان کی جان و مال اور آبرو بالکل مسلمانوں کی جان و مال اور آبرو کی طرح محترم ہے۔ فوجداری اور دیوانی قوانین میں مسلم اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ان کے پرسنل لاء میں حکومت مداخلت نہیں کرے گی۔ انہیں اپنی مذہبی رسوم و عادات میں پوری آزادی ہے۔ ذمی اپنے مذہب کی تبلیغ ہی نہیں بلکہ قانون کی حد میں رہتے ہوئے اسلام پر تنقید بھی کر سکتا ہے۔

(۷) اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے تحت نہیں۔ ایک قاضی یا جج کو مقرر تو انتظامی حکومت کرے گی مگر وہ اس کو جواب دہ نہیں بلکہ اللہ کو جواب دہ ہے۔

(۸) اخلاقی پابندی صرف افراد پر ہی نہیں بلکہ ریاست پر بھی ہے کہ وہ اپنی سیاست، بے لاگ انصاف بے لوث سچائی اور ایمانداری پر رکھے اور مصلحت کی خاطر جھوٹ، فریب اور بے انصافی نہ کرے۔

اسلام کے معاشرتی نظام کی چند خصوصیات

(۱) ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کے ناطے سے سب انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر۔

(۲) انسان اور انسان کے درمیان اگر فرق ہو سکتا ہے تو نسل، رنگ، وطن اور زبان کی بنا پر نہیں بلکہ خیالات، اخلاق اور اصولوں کا ہو سکتا ہے۔ اور فضیلت کا معیار پرہیزگاری اور تقویٰ ہوگا۔

(۳) دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس اسلام ایک

---

(۵) اسلام کا نظام حیات، (صفحہ نمبر ۱۹)

قائم ہوتی ہے ۔

(۳) انسان اس زمین پر اللہ کا خلیفہ یا نائب ہے اور اسی کے دیئے ہوئے اختیارات وہ اللہ کی زمین پر استعمال کرتا ہے ۔ اس لئے حاکمیت تو اللہ کی ہوگی کیونکہ وہ مالک الملک ہے ۔ البتہ جو ریاست قائم ہوگی وہ انسانی خلافت ہوگی جو اللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اور اسی کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہ کر کام کرے گی تاکہ مالک کا منشا پورا ہو ۔

(۴) مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے جہاں جمہور خود بادشاہ ہیں ۔ اپنا قانون طرز زندگی یا شریعت وہ خود بناتے ہیں اور حکومت کا کام جمہور کے منشا کو پورا کرنا ہے ۔ مگر اسلام جمہوری حاکمیت کی بجائے جمہوری خلافت کا قائل ہے ۔ بادشاہی صرف خدا کی مانتا ہے ۔ جہاں شریعت صرف وہ چلتی ہے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے سے دی اور حکومت کا کام جمہور کی منشا کو پورا کرنا نہیں بلکہ حکومت اور جمہور دونوں کا کام اللہ کی منشا کو پورا کرنا ہے ۔

(۵) ریاست کا مقصد صرف انتظام ملکی ہی نہیں بلکہ اس خیر و فلاح کو عام کرنا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور بگاڑ کی تمام صورتوں کا سد باب کرنا ہے جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اسکے بندوں کو خراب کرنے والی ہیں ۔ اسلامی ریاست اگر اپنے فلاحی کاموں کے پیش نظر غریب و مفلس افراد کے پیٹ کی آگ بجھانے کی فکر میں رہتی ہے تو ساتھ ہی اس بات کا بھی خیال رکھتی ہے کہ ان افراد کی زندگی اس نہج پر نہ چل پڑے کہ کل کو اخروی زندگی میں وہ خود آگ کا ایندھن بن جائیں ۔

(۶) ہر انسان کو چند بنیادی حقوق دیتا ہے خواہ وہ شخص اسلامی ریاست میں رہتا ہے یا باہر خواہ دوست ہو یا دشمن ۔ مثلاً انسانی خون ہر حالت میں محترم ہے اور حق کے بغیر اسے نہیں بہایا جا سکتا عورت، بچے، بوڑھے، بیمار اور زخمی پر دست درازی کرنا کسی طرح جائز نہیں عورت کو بے آبرو نہیں کیا جا سکتا ۔ بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا آدمی کپڑے

کی موجودگی میں اسلامی سوسائٹی میں کوئی شخص ناگزیر ضروریات سے محروم نہیں رہ سکتا۔

(۳) یہ نظام فرد کو جماعت میں ایسے گم نہیں کرتا کہ اس کی آزادی ہی باقی نہ رہے جو اس کی شخصیت کی صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اس کے نزدیک انفرادیت کے لئے جس طرح سیاسی اور معاشرتی آزادی ضروری ہے اسی طرح معاشی آزادی بھی بہت حد تک ضروری ہے۔ مگر ساتھ ہی ایسے اجتماعی نظام کو بھی پسند نہیں کرتا جو افراد کو معاشرت اور معیشت کے میدان میں ایسی بے لگام آزادی دے دے کہ وہ اپنی خواہشات یا مفاد کی خاطر جماعت ہی کو نقصان پہنچا دیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان متوسط راہ اختیار کرتا ہے۔

(۴) فرد پر جماعت کی برتری کے لئے چند حدود عائد کرتا ہے اور اسے کچھ ذمہ داریوں کا پابند کرتا ہے اسے کسب معاش کے میدان میں واضح طور پر بتاتا ہے کہ کون سا کاروبار اس کے لئے حرام ہے کون سا نہیں ہے اس کے حقوق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے مگر محدود دائرے کے اندر۔ مال خرچ کرنے پر بھی ایسی قیود لگائی گئی ہیں جن سے صاف ستھری پاکیزہ زندگی تو گزار سکتا ہے مگر عیاشیوں میں دولت نہیں اڑا سکتا۔

(۵) جائز حدود کے اندر کمائی ہوئی دولت کو بھی یہ نظام زیادہ دیر تک سمٹا نہیں رہنے دیتا بلکہ اپنے قانون وراثت سے پشت در پشت پھیلاتا جاتا ہے۔

اس ساری بحث کے آخر میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نظام مصطفٰے کے نفاذ کے لئے پوری کوشش کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے اور ہم اہل پاکستان کے لئے تو اور بھی ضروری ہے کہ اس سرزمین میں اس نظام کو کلیتاً نافذ کرکے دنیا کو دکھائیں جس کے نفاذ کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا۔

یہ سچ ہے کہ آج دنیا میں مادہ پرستانہ نظریات اور منفی قوتیں کچھ

ری، اخلاقی اور اصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ کی توحید
یقین رکھے اس کو اپنا خالق، مالک، معبود اور رب ماننے اور انبیاء کی لائی
ئی ہدایت کو اپنا قانون زندگی ماننے وہ اس معاشرہ میں شامل ہوسکتا ہے
۴) چونکہ خاندان ہی انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ اس لئے اسلامی معاشرتی
مولوں میں خاندان کے ادارے کو صحیح بنیادوں پر استوار رکھنے کی بہت
اکید ہے۔ مرد کو ناظم کی حیثیت حاصل ہے مگر عورت کو بے بس لونڈی کی
یثیت نہیں دی۔ اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل روح محبت و
مت ہے۔ خاندان کے افراد کے علاوہ رشتہ داروں اور ہمسایوں کے
قوق کا خاص خیال رکھتا ہے۔
۵) عام اجتماعی زندگی کو جن بڑے بڑے اصولوں پر استوار کرنا ہے ان
ں سے چند درج ذیل ہیں۔
(۱) نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا اور بدی اور
یادتی میں نہیں۔
(۲) دوستی یا دشمنی رکھو تو صرف خدا کی خاطر۔
(۳) آپس میں بدگمانی سے بچو، غیبت، بہتان اور حسد سے بچو۔ دوسروں
ے معاملات کا تجسس نہ کرو۔ دوسروں کے لئے بھی وہی پسند کرو جو تم اپنے
لئے پسند کرتے ہو۔

قتصادی نظام کی خصوصیات

(۱) اسلام جس اقتصادی مساوات
کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات
ہیں بلکہ حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ کیونکہ
متوں کی تقسیم میں اللہ نے اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت
ی ہے۔
۲) معاشی جدوجہد کی اس دوڑ میں جو لوگ ایک مقررہ حد سے پیچھے رہ
بائیں یا دوڑ میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ ہوں، اسلام اپنے نظام زکوٰۃ
سے انکی دستگیری کرتا ہے۔ یہ اس کی اپنی اجتماعی انشورنس سکیم ہے جس

مکتوب پاکستان
"الدعوۃ" قاہرہ

میں بھی حاضر تھا وہاں

اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس اس ہنگامی اجلاس کے ٹھیک چار ماہ بعد منعقد ہوئی جو مسلم ملک افغانستان پر سرخ اشتراکیت کے حملے سے نبٹنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ ہنگامی کانفرنس نے کچھ قرار دادیں اور کچھ سفارشات منظور کی تھیں جن میں سے ایک بھی مؤثر طور پہ نافذ نہ ہو سکی۔ اس کا اظہار اسلامی کانفرنس کے سیکرٹری جنرل جناب شطی نے اپنے اس خطاب میں کیا جس میں انہوں نے فرمایا: "بیشک قرار دادیں ان حوادثات سے متعلق تھیں جو اس اسلامی خطہ پر منڈلا رہے ہیں۔ لیکن افغانستان کی صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی جب کہ یہی وہ بات ہے جو ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس نازک مسئلے پر مسلسل نظر رکھیں!" چنانچہ تمام مخلص شرکاء کانفرنس اور مبصرین بد دلی اور مایوسی کا شکار تھے یہاں تک کہ بعض نے تو کہہ بھی دیا کہ ہمیں نئی قرار دادوں کی نہیں بلکہ پہلی قرار دادوں کو عملاً نافذ کرنے کی ضرورت ہے، اور ہمیں صورت حال اور بھی تاریک نظر آنے لگتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرخ اشتراکیت کی جارحیت کا شکار افغان عوام کے رہنماؤں کو ان کے نمائندوں کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت سے محروم رکھا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ افغان مسئلے پر کچھ باہمی صلاح مشورے ہوئے اور ان کا تانا بانا کانفرنس کے انعقاد سے چند روز پہلے رات کی تاریکی میں بُنا گیا۔ شام، لیبیا، جمہوریہ یمن اور تنظیم آزادی فلسطین کے نمائندوں نے اس قضیہ کو اہم بنا کیا انہوں نے روسی سفیر سے ملاقات کی تاکہ سوویت یونین کا دفاع کیا جائے اور اس مسئلے کو کانفرنس کے اندر تک ہی محدود رکھا جائے تاکہ کانفرنس کا اوّلین اور اہم ترین مسئلہ نہ بن سکے۔ یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب رہے افغان عوام کا مسئلہ

ایسی تیزی سے پھیل رہی ہیں کہ بعض اوقات مخلص اور دیندار حضرات بھی گھبرا کر سوچنے لگتے ہیں کہ شاید یہ نظام دورِ جدید کے تقاضوں پر اب پورا نہ اتر سکے۔ مگر یاد رکھیں یہ شیطان کا دھوکہ ہے جو وہ ہمیں دے رہا ہے۔ اگر حضور نبی اکرم کے بعد کسی بھی مسلم معاشرہ میں دین اسلام کا قیام ناممکنات میں سے ہوتا تو اللہ تعالیٰ اُمت مسلمہ کو تا قیامت شہادت علی الناس کا فریضہ کبھی نہ سونپتا۔

ایک مسلمان کی زندگی تو ہے ہی پیہم جہاد۔ جہاد اپنے نفس کی سرکشی کے خلاف اور جہاد تمام غیر دینی قوتوں کے خلاف۔ یہی اس کا امتحان ہے، یہی اس کا مقصدِ حیات۔ اللہ تو کہتا ہے کہ اے مومنو ہم نے تمہارا مال اور تمہاری جان خرید لی ہے آخرت کی نعمتوں کے عوض۔ پھر ایک مومن اس سودے کے بعد کیسے خاموش بیٹھ سکتا ہے۔ اس سے تو ایک روز باز پرس ہوگی کہ اس نے عبادت رب اور شہادت حق کی ادائیگی کے لئے اس دنیا میں کیا کیا۔ اگر وہ اپنی مالی، ذہنی اور جسمانی قوتوں کو کسی غیر مطلوبہ راہ میں خرچ کر رہا ہے۔ تو نقصان اس کا اپنا ہے۔ بظاہر وہ اس دنیا میں چاہے ٹھاٹھ دار زندگی گزارتا نظر آئے مگر وہ خسارے میں ہے اور خسارہ بھی ایسا کہ جس کے کرب اور عذاب کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی خسارہ کا ذکر سورۃ العصر میں ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

> زمانے کی قسم کہ انسان خسارہ میں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے۔ اور آپس میں حق (بات) کی تلقین کرتے اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس خسارہ سے بچائے۔ آمین۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری کے لئے مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

۱۔ مطالبات دین، ڈاکٹر اسرار احمد، مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی، لاہور
۲۔ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار، مولانا امین احسن اصلاحی، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۔ اسلامی نظام زندگی (۴) اسلام کا نظام حیات (۵) اسلامی ریاست۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔

تبدیلیوں کے نتائج پر یہ واویلا ہمارے بعض بھائیوں پر معاملات کو غلط ملط نہ کر دے اور غلط فہمی کا شکار ہو کر دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن نہ سمجھ لیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان حکومتوں اور سوویٹ یونین یا سوشلسٹ نظام کے حامل ممالک کے درمیان پائی جانے والی دوستی کی حفاظت کریں اور سامراجی منصوبوں کی راہ کاٹ دیں جو مسلمانوں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں۔

ہمیں سوویٹ یونین کی اس یقین دہانی پر اعتماد کرنا چاہیئے کہ اس کی فوجیں افغانستان میں ایک محدود وقت تک کے لئے ہیں۔

ایک دوسرے کی تذلیل کانفرنس کے اندر، انہی ماسکو نوازوں کی آواز ہی غالب رہی، روسی بلاک پر چھایا رہا اور ایسا بھی ہوا کہ صومالیہ کے وزیرخارجہ نے افریقی خطے کے حالات بیان کئے اور وہاں روس کی موجودگی کا ذکر کیا اور بتایا کہ کس طرح وہاں اس کا وجود صومالیہ کے امن و سلامتی کے لئے خطرہ ہے کیونکہ اس نے جمہوریہ صومالیہ کے پڑوس میں ساٹھ ہزار چھاتہ بردار فوجی جمع کر رکھے ہیں۔ کیوبا اور حبشہ کے لشکر اُن کے علاوہ ہیں جن کو روسی افسر تربیت دے رہے ہیں۔ یہ فوجیں صومالیہ کے دیہات و قصبات پر مسلسل اور باربار چڑھائیاں کرتے رہتے ہیں۔ اس پر لیبیا کے وزیرخارجہ فوراً روس کی مدافعت کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: صومالیہ کے وفد پر لازم آتا ہے کہ وہ وضاحت کرے کہ اس پر کب زیادتی ہوئی اور اس کا ذمہ دار کون تھا؟ اس حقیقت کو واضح کرنا ضروری ہے کہ صومالیہ کا نظام پہلے مارکسسٹ نظام تھا اور پھر وہ مغربی امریکی ہو گیا اور کچھ پتہ نہیں کل کو بدل کر صیہونی ہو جائے۔ جب اس کا نظام سوشلسٹ تھا تو اس نے مسلمان علماء کو قتل کیا اور انہیں مادّہ پرست بنا دیا۔ آج صومالیہ کا نمائندہ دعوی کرتا ہے کہ اس پر زیادتی ہو رہی ہے، کس طرف سے؟ صومالیہ پر کوئی زیادتی نہیں ہو رہی۔ بلکہ الٹا صومالیہ مسلمان عرب قوم پر زیادتی کر رہا ہے۔ حالانکہ سید بری نے سامراجی ملک بنتے وقت اعلان کیا تھا کہ وہ امریکہ کو کوئی سہولت بہم نہیں پہنچا رہا۔ اس پر صومالیہ کے وزیرخارجہ کھڑے ہوئے اور ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہنے لگے: میں اس جھگڑے میں

فلسطین۔ بیت المقدس اور ایران کے بعد چوتھے نمبر پہ رکھ دیا گیا۔ بلکہ
آلہ کار حکومتوں کے ان نمائندوں نے نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ اتح
اتحادِ اسلامی برائے آزادیٔ افغانستان کے صدر پروفیسر عبدالرّسول س
براہ راست افغان عوام پر ہونے والے ظلم وستم پر بولنے کا حق دینے سے
کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ صرف ایرانی وفد کے پیچھے فارم پر سے کچھ کہہ سکتے
وزیر خارجہ ایران نہ ہوتے تو شاید انہیں کانفرنس ہال میں داخل ہونے کی
نہ ملتی۔ وزیر خارجہ ایران جناب قطب زادہ نے انہیں ایرانی وفد کے ارکان
سے شمولیت کی فرمائش کر دی جسے ان نمائندوں نے بادلِ نخواستہ قبول کر لیا۔
وہ کانفرنس سے چلے جانے کی سوچ رہے تھے اور اس سلسلہ میں انہوں نے
یادداشت بھی صدر کانفرنس کو لکھ بھیجی۔ لیکن انہیں مشورہ دیا گیا کہ وہ ا
کانفرنس کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کرنے کے لئے اس موقع کو ضائع نہ کر
مسئلہ افغانستان سے متعلق کانفرنس کی قراردادیں انہیں حدود سے
رہیں جو ماسکو کی پٹھو حکومتوں کے یہ نمائندے چاہتے تھے۔ چنانچہ سوویٹ یونی
مذمت کا ایک لفظ بھی نہ کہا جا سکا۔ اور نہ افغانستان کے مسلم عوام کے مفا
کوئی قرارداد منظور کی گئی۔ ہوا تو بس اتنا ہوا کہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی
کانفرنس کے سیکریٹری جنرل، ایران و پاکستان کے وزرائے خارجہ پر مشتمل
وہ ایسے وسائل اور طریقے تلاش کرے جن سے افغانستان کے اس عظیم بحرا
عام حل دریافت ہو۔ اس سلسلے میں ضروری مشورے ہوں اور اقوامِ متحدہ
نگرانی حکومتی سطح پر ایک کانفرنس منعقد ہو وغیرہ وغیرہ اور یہ سب کچھ اس
ہو کہ اس قرارداد کے الفاظ سے متعارض نہ ہو۔ یہ ہے حقیقت ان فیصلوں
اس کانفرنس کے ارکان مسئلۂ افغانستان کے بارے میں پہنچ سکے بلکہ تنظیم آ
فلسطین کے نمائندے نے تو مسلمان حکومتوں اور سوویٹ یونین کے درمیا
دوستی کو برقرار رکھنے پر بایں الفاظ زور دیا کہ :

"ایران کے برخلاف امریکہ کے فوجی اقدامات کو دیکھتے ہوئے ڈر ہے کہ کہیں
کی یہ سیاست جس پر امریکی ادارے چل رہے ہیں اور افغانستان میں ہو

ایک منشور ہے!)

کانفرنس کا حافظہ کمزور ہے کانفرنس اکثر اپنی یادداشت کھو بیٹھتی ہے اور اپنے ہنگامی اجلاس میں منظور کردہ قراردادوں کو بھلا دیتی ہے یا بالفاظِ دیگر اس کے ارکان اپنی کسی اندرونی ضرورت کی وجہ سے انہیں جان بوجھ کر بھلا دیتے ہیں۔ اریٹیریا کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعتوں کی مرکزی مجلس کے صدر نے مجھے بتایا کہ اسلامی وزرائے خارجہ کی چوتھی کانفرنس نے جو بن غازی میں ۲۶ / مارچ ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی، نے ایک اعلان منظور کیا کہ وہ اریٹیریا کے عوام کے حقِ خود ارادیت کی تائید اور ان کے ساتھ مکمل ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔ اور افریقی اتحاد کی تائید کرتی ہے کہ افریقی وحدت رہتے ہوئے اس قضیہ کو ایسا حل تجویز کرے جو اریٹیری عوام کے لئے قابلِ قبول ہو اور جس سے علاقے کا امن وسکون بھی محفوظ رہے۔ اس نے اپنے ارکان کو تاکید کی کہ وہ اریٹیری عوام کو مدد پہنچائیں اور قضیہ کے عادلانہ حل کے لئے حکومتِ ایتھوپیا سے اپنے روابط کو کام میں لائیں اور حکومت ایتھوپیا سے مطالبہ کیا کہ وہ امن پسند اریٹیریا کے عوام کے خلاف فوجی اقدامات کو روک دے لیکن کانفرنس اریٹیریا کے مسئلے اور اس کے عوام دونوں کو بھول گئی۔ یہاں تک کہ جب اریٹیریا کا وفد کانفرنس میں مبصر کی حیثیت سے شمولیت کی غرض سے حاضر ہوا تاکہ وہ انہیں ان کی قرارداد یاد دلائے اور ان کے مسائل حل کرنے کے لئے کسی قرارداد کے اجراء کی فرمائش کرے تو کانفرنس نے اس طرح کان بند کر لئے گویا کبھی کوئی قرارداد منظور نہ کی تھی۔

آخری بات اس طرح کی کانفرنسیں کبھی بھی عوام کے مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ یہ تو صرف حکومتوں اور حکمرانوں کے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے ہتھکنڈے ہیں۔ مسلمان عوام کے لئے اپنے موجودہ تکلیف دہ حالات سے عہدہ برآ ہونے کا صرف ایک ہی طریق ہے اور وہ ہے جہاد ..... اپنے اس جامع مفہوم کے ساتھ جس کا آغاز جہادِ نفس سے ہوتا ہے اور جس کی انتہا سرکش قوتوں سے معرکہ آرائی اور غاصب عیسائیوں، یہودیوں اور اشتراکیوں وغیرہم سے اپنے حقوق بقوت چھین لینے میں ہوتی ہے ٭

نہیں پڑنا چاہتا۔ سب جانتے ہیں کہ وہ کون ملک ہے جس نے غیر ملکیوں کو اڈّے مہیا کئے۔ لیبیا یا صومالیہ؟ تیزبزہ کون ہے جو ہر روز نیا روپ دھار لیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دل کو سخت قلق ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ بیالیس حکومتوں کے نمائندے جو مسلمانوں میں شمار ہوتے ہیں، مغرب و مشرق یا ان کے پیروکاروں کے خیمہ بردار بنے ہوئے ہیں اور وہ اس سپر پاور کی زبان میں بات کرتے ہیں جس سے وہ منسوب ہیں، چاہے اس میں مسلمانوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

کانفرنسوں کی آڑ در اصل کرائے کے یہ ٹٹو اکثر ان کانفرنسوں کو آڑ بنا کر اپنے قبیح چہروں کو ان کے پیچھے چھپاتے اور پھر حملہ آور ہوتے ہیں جیسا کہ حکومت شام نے کیا جس کے سربراہ بعث پارٹی کے رہنما حافظ الاسد نصیری ہیں جو اپنے آپ کو صیہونیوں کے مقابلہ میں مرد آہن قرار دیتے ہیں اور یہ بات بھول گئے ہیں کہ ۱۹۶۷ء کی ہزیمت میں جولان یہودیوں کے حوالے کر دینے والے وہی ہیں۔ اور انہوں نے شام کے اکثر شہروں کو مجاہد شامی نوجوانوں کے قتل گاہیں بنا رکھا ہے۔ شام کے نائب وزیر خارجہ ناصر قدوری وہ شخص ہے جس نے کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے کی مخالفت کی، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور صیہونی دشمن پر تنقید کی اور کانفرنس سے مطالبہ کیا کہ اس معاہدہ کے تمام فریقوں کے خلاف سخت ترین قرار داد منظور کی جائے۔ اسے یقین ہے کہ وہ حافظ الاسد کے خون آلود چہرے کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا، اگر اچانک اسے مجاہد شامی عوام کی پکار ارکان کانفرنس کے سامنے پڑی نظر نہ آتی جس نے حافظ اسد کی فرقہ وارانہ حکومت اور اس کے نظام کی رسوائیوں کا پردہ چاک کر کے رکھ دیا۔ اس ’پکار‘ کو پڑھ کر شامی وفد کی صبح گم ہو گئی۔ اس کے ارکان خوفزدہ حالت میں ارکان کانفرنس کے سامنے پڑی ’پکار‘ کے متعلق بحث کرتے اور اسے کھسکانے کی کوشش کرتے پائے گئے (اس سے پہلے کہ وہ شرکائے کانفرنس کے ہاتھوں تک پہنچ پائے) خاص طور پر عراق اور مغرب کے نمائندوں تک پہنچنے سے پہلے، کیونکہ ان کے درمیان پہلے سے کشمکش موجود ہے!) لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگ مہیا کر دیئے جنہوں نے کھسکائے ہوئے اوراق ’پکار‘ کی جگہ اس کی عکسی کاپیاں ہر نمائندے کے کاغذات میں رکھ دیں (النداء ’پکار‘) ہمارے وطن اسلامی سے متعلق

ذرائع سے بھی دارالعلوم سے متعلق فتنہ و فساد کی جو انتہائی تکلیف دہ خبریں
ق ہیں اُن کی جڑ بنیاد دراصل یہی تغیرِ حال اور یہی فسادِ مزاج ہے خواہ اس کا
لوئی بھی عنصر ہو۔

ں عاجز کا جو تعلق دارالعلوم سے ہے وہ کسی ادارے سے نہیں اور جو جماعت
ے ہے وہ کسی جماعت سے نہیں اس لئے اس صورتِ حال کے احساس سے
، و رُوحانی اذیت ہے۔ " انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ "
ں قریباً ۳۵ - ۴۰ سال سے اس کی مجلس شوریٰ کا رکن بھی ہوں (جس کے
، دستور کے لحاظ سے دارالعلوم کے سارے اختیارات ہیں) اس طویل تجربہ
برا یہ یقین ہے کہ جس تغیرِ حال کا ذکر میں نے کیا ہے اور جو میرے نزدیک
فسوسناک حالات کا اصل سبب ہے اس کا علاج نہ موجودہ مجلس شوریٰ
ہے نہ باہر کی کوئی تحریک اور کوشش۔ اس کی اصلاح کی صورت صرف یہ ہے
ب جن کا دارالعلوم سے ذمہ دارانہ اور عاملانہ تعلق ہے (اگر اللہ توفیق دے
پنا احتساب کریں اور اخلاص و صدقِ دل سے اپنا معاملہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ
ئریں۔ ——— ظاہر ہے کہ علماء کی ذمہ داری عوام سے بہت زیادہ ہے
— اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اللہ کا قانون بڑا بے لاگ ہے ——— قرآن پاک
سیاء علیہم السلام کی ایک نسل کے بارہ میں فرمایا گیا ہے۔

لَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَأْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا
دَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ج وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ط
خَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ
سُوْا مَا فِيْهِ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ط اَفَلَا
نَ ۝

۔ عاجز اپنے بارے میں ہرگز کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہے "من آنم کہ
م" اس کی بھی کوئی خاص اُمید نہیں ہے کہ اس گزارش کا کوئی بڑا اثر ہوگا
ض کیا گیا ہے بس معذرۃً الیٰ ربی عرض کیا گیا ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں خلفشار — الفرقان لکھنؤ کا اداریہ

اب سے ۵۶ ۔ ۵۷ سال پہلے جب یہ عاجز ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں دو سال مقیم رہا تھا تو حضرت مولانا محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ صدر مدرسین اور شیخ الحدیث تھے، اُن کے علاوہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید اصغر حسین عرف حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ صف اول کے اکابر اساتذہ میں تھے۔ یہ حضرات صرف اساتذہ درس ہی نہیں تھے بلکہ جہاں تک بشری اندازہ ہے (والعلم عند اللہ) یہ اپنے اپنے رنگ میں سراپا اخلاص و تقویٰ "رجال اللہ" اور "رجال آخرت" تھے۔ ان کو دیکھ کے دل کہتا تھا کہ ان کی فکر بس رضائے الٰہی اور آخرت کی فکر ہے ——— ان کی علاوہ دوسری صف کے جو حضرات اساتذہ تھے قریباً وہ سب بھی کم و بیش کے کچھ فرق کے ساتھ اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ——— فطری طور پر طلبہ پر بھی اپنی اپنی صلاحیت و استعداد کے مطابق اس کا اثر پڑتا تھا اور کم از کم یہ آرزو ضرور پیدا ہوتی تھی کہ اس دولت کا بھی کچھ حصہ نصیب ہو۔ بہرحال میری طالب علمی کے اس دور میں دارالعلوم کی عام فضا پر اخلاص للہ اور فکر آخرت کا غلبہ[1] تھا۔

اس دور کے بعد کچھ تغیرات اور زمانے کی رفتار کے فطری نتیجہ میں دارالعلوم کی اس فضا میں فرق پڑنا شروع ہوا۔ لیکن حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح کی جامع اور طاقتور شخصیت سے اس فضا کو طویل مدت تک سہارا ملتا رہا۔ مگر حضرت مدنی رح کے بعد اس فرق و انحطاط کی رفتار تیز، اور ادھر کے آخری چند سالوں میں تو بہت ہی تیز ہوگئی، ہمارے اس گھر میں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری اس برادری میں اس لحاظ سے جو زوال و انحطاط آیا ہے اور ہم نے جو کچھ کھویا ہے اگر ہم میں احساس ہو تو وہ بڑا المناک حادثہ ہے ——— آج کل اخبارات

---

[1] راقم سطور کا قیاس بھی ہے اور اساتذہ اور اکابر سے سنا بھی ہے کہ دارالعلوم کے اس سے پہلے ادوار (حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور حضرت شیخ الہند رح کی صدارت تدریس کے دور) اخلاص و تقوے کی فضا کے لحاظ سے اس سے بھی فائق اور مبارک تر تھے۔

ماہنامہ

میثاق

لاہور

اکتوبر ۱۹۸۰

عت خصوصی مشتمل بر مقالات ساتویں سالانہ

قرآن کانفرنس

منعقدہ (۱۸ تا ۲۱ اپریل ۱۹۸۰) لاہور

زیر اہتمام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

صدر مؤسس

ڈاکٹر اسرار احمد

س شمارے کی قیمت ——— ۵/- روپے

ٹورنٹو (کینیڈا) میں

گذشتہ سال ڈاکٹر اسرار احمد کے درسِ قرآن

کے ضمن میں جو اشتہار شائع ہوا تھا اس کا عکس



ادارہ

عرضِ احوال

"میثاق" کا یہ شمارہ ایسے وقت میں شائع ہو رہا ہے کہ چودھویں صدی بس چند دنوں کی مہمان ہے - اور پندرھویں صدی کا آغاز ہوا چاہتا ہے - ہماری اگلی ملاقات انشاء اللہ نئی صدی کے آغاز پر ہو گی -

اس صدی میں دنیا نے عالمِ اسلام کا بدترین زوال دیکھا اور پھر خوشگوار بیداری بھی - اس بیداری کے نتیجے میں مسلم ممالک ذہنی طور پر نہ سہی جغرافیائی آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے اور پھر اسی صدی کے اواخر میں عالمِ اسلام کے اتحاد اور بہت سے مسلم ممالک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا غلغلہ بلند ہوا - یہ کہنا تو شائد مبالغہ ہو کہ عالمِ اسلام میں نفاذِ اسلام کی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہے - لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اب کسی مسلم ریاست میں بھی اسلام کا نام لئے بغیر نظام حکومت چلانا آسان نہیں رہا -

ایک طرف جہاں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے ایک عزم، اور تڑپ اور جذبہ حوصلہ افزا ہے - وہاں دشمن بھی پوری ہوشیاری اور تیاری کے ساتھ مقابلے کے لئے خم ٹھونک رہا ہے - البتہ یہ امر انتہائی افسوسناک ہے کہ جس قدر زبانی کلامی باتیں ہو رہی ہیں اور جس نے دشمن کو آنکھیں کھلی رکھنے پر مجبور کر دیا ہے عملی اقدامات کے سلسلے میں اسی قدر غفلت شعاری اور سست رفتاری پائی جاتی ہے چنانچہ اسلام دشمن قوتیں جس رفتار سے اپنی کارروائیوں میں مصروف ہیں - اگر ہمارے لیل و نہار یہی رہے تو خطرہ ہے کہ ہم پھر کسی ناگہانی آفت کا شکار نہ ہو جائیں - ایک طرف اتحاد کی باتیں اور دوسری طرف ایک دوسرے کے خلاف مسلم ممالک کی محاذ آرائی جن خطرات کو دعوت دے رہی ہے اس سے آنکھیں بند کرنا

جلد ۲۹ | ماہ ستمبر ۔ اکتوبر ۱۹۸۰ء | شمارہ نمبر

مشمولات

مقالات قرآن کانفرنس

پبلشر ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع : رشید احمد چودھری
مطبع جدید پریس ... فاطمہ جناح، لاہور

دورۂ کینیڈا، امریکہ و برطانیہ کی رپورٹ پیش کی جائے گی۔ مغرب میں اس وقت رُوحانی تشنگی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہاں قرآنی تعلیمات کی ترویج و اشاعت کا ایک وسیع میدان موجود ہے۔ ہماری دعا ہے کہ نہ صرف وہاں موجود مسلمان ڈاکٹر صاحب کے قرآنی اور رُوحانی پیغام سے مستفید ہوں، بلکہ اللہ کرے کہ مغرب کی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں نژاد نو بھی قرآن آشنا ہو۔ جو ان کی بے قراریوں کا اصل علاج ہے۔

ممکن نہیں - کیا ہی اچھا ہو کہ مسلم ممالک اتحاد کے مسئلے پر مسلم حکومتیں اسلامی ضابطۂ حیات کے نفاذ کے سلسلے میں اور مسلم عوام اسلامی زندگی گذارنے کے لئے اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اپنے عمل سے اپنے دعوؤں کا ثبوت پیش کریں -

" میثاق " کا پچھلا شمارہ اگست کے تیسرے ہفتے کے دوران شائع ہوا تھا خدشہ تھا کہ ستمبر، اکتوبر کی مشترکہ ضخیم اشاعت جو ساتویں قرآن کانفرنس کے مقالات پر مشتمل ہے سابقہ معمول کے مطابق کہیں جا کر اکتوبر کے اواخر تک پیش کی جاسکیگی - لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم اسے ستمبر ہیں مکمل کر رہے ہیں - اب بھی اگر "میثاق" آپ کے پاس تاخیر سے پہنچتا ہے تو اس کی وجہ طباعت، جلد بندی اور ترسیل کے مراحل ہیں جہاں تاخیر کو تعجیل میں بدلنا ہمارے بس میں نہیں - البتہ ہماری کوشش ہوگی کہ ان شاء اللہ آئندہ سے "میثاق" بغیر کسی تاخیر کے ماہ بماہ قارئین تک پہنچتا رہے - اس شمارے میں یوں تو ہر مقالہ اپنے موضوع کا حق ادا کر رہا ہے - لیکن جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تقریر "اسلامی نظام معیشت - چند اہم نکات" خصوصی اہمیت کی حامل ہے - حقیقت بھی یہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ گہرے غور و فکر کے متقاضی ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ ان نکات کو رہنما اصولوں کی حیثیت دیکر نیا معاشی نظام ترتیب دیا جائے یہی ہمارے معاشی اور اقتصادی مسائل کا حل ہے - ہماری خواہش تھی کہ ڈاکٹر صاحب اس پر نظر ثانی فرماتے لیکن عدیم الفرصتی کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے - اور مزید تاخیر ہم نے مناسب نہ سمجھی اس لئے اس مضمون کے سلسلے میں کوئی تشنگی محسوس ہو تو یہ ایک فطری بات ہوگی -

ڈاکٹر صاحب غیر ملکی تبلیغی دورے کے سلسلے میں اب امریکہ میں ہیں جہاں وہ دعوت رجوع الی القرآن پیش کر رہے ہیں اب تک کے پروگراموں کے سلسلے میں جو اطلاعات یہاں موصول ہوئی ہیں اُن کے مطابق ڈاکٹر صاحب کا دورۂ کینیڈا انتہائی کامیاب رہا ہے جس کے بعد توقع ہے کہ ان شاء اللہ ان کا دورۂ امریکہ بھی نوید کامیابی لائے گا - اور وطن واپسی کے بعد ڈاکٹر صاحب کے

دلیسپ بھی لوگوں کے لئے حیران کن تھا اس پر مزید مسرت آمیز تحیّر کا اضافہ ذوق و شوق اور نظم وضبط کے مظاہرے سے ہوا اور سب سے بڑھ کر حیرت افزا بات لوگوں کو یہ محسوس ہوئی کہ اختلاف اور افتراق و انتشار کی اس صدی میں تقریبًا تمام مکاتبِ فکر کے اہل علم وفضل حضرات نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔

پہلا اجلاس جمعہ ۱۴ ، دسمبر صبح ۹ بجے سے ۱۲ بجے تک جاری رہا جس کا موضوع عظمتِ قرآن تھا۔ صدارت مولانا عبیداللہ انور نے کی اور مہمان خصوصی حضرت مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم تھے اس نشست کے مقررین تھے صاحبزادہ مولانا عبدالرحمان (جامعہ اشرفیہ) مولانا محمد اجمل، پروفیسر شکور حسین یاد پروفیسر محمد منور مرزا، مولانا الٰہی بخش جاراللہ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اس اجلاس کی ایک تقریر تو ایسی تھی۔ جسے شاید ہی سامعین بھلا سکے ہوں، جناب مولانا متین ہاشمی نے سقوط مشرقی پاکستان کا ذکر چھیڑ دیا اور پوری محفل اشکبار ہو گئی۔ نماز جمعہ سے قبل مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے جامع مسجد خضرا، سمن آباد میں "عظمت قرآن" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اس لحاظ سے یہ نشست ۱۲ بجے کے بجائے نماز جمعہ تک جاری رہی۔

کانفرنس کی دوسری نشست جناب مولانا محمد یوسف بنوری کی صدارت میں بعد نماز مغرب شروع ہو کر رات گئے جاری رہی۔ اس نشست سے مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، ملک محمد اسلم، عبدالرشید نعمانی اور جناب ریاض احمد فریدی نے خطاب کیا۔ موضوع تھا "قرآن اور سنت کا باہمی ربط و تعلق"۔

ہفتہ ۱۵، دسمبر کو صبح نو بجے، تیسری نشست کا آغاز ہوا جس کی صدارت پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے کی۔ چونکہ اس اجلاس کا موضوع "قرآن حکیم اور علامہ اقبالؒ" تھا اس لئے پہلے مقرر مشہور ماہر اقبالیات جناب سید نذیر نیازی تھے بعد میں جناب مظفر حسین، ڈاکٹر ابصار احمد، پروفیسر محمد منور مرزا اور صدر اجلاس نے خطاب کیا۔ چوتھی نشست اسی شام "قرآن مجید اور علم جدید" کے موضوع پر علامہ علاؤالدین صدیقی (مرحوم) کی زیر صدارت منعقد ہوئی اور جناب محمد حنیف ندوی، ڈاکٹر امان اللہ خان، ڈاکٹر عبدالبصیر پال نے مقالات پڑھے۔ ڈاکٹر

پہلی قرآن کانفرنس سے ساتویں قرآن کانفرنس تک

روشنیوں کا سفر

آج سے آٹھ سال قبل قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم کے لئے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں لایا گیا تھا تب یہ ایک ناتواں پودا تھا۔ جسے مخالفتوں کے جھکڑ اور رکاوٹوں کی آندھیاں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے بیتاب تھیں مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور مالی کی پُر خلوص محنت کے طفیل اس مادہ پرستانہ ماحول کے صحرا میں وہ شجر سایہ دار بن چکا ہے۔

انجمن کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اپنے موسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر سرپرستی ملک میں قرآن کانفرنسوں کی طرح ڈالی اور اب تک اعلیٰ سطح کی سات قرآن کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ یوں تو ہر سال منعقد ہونے والی قرآن کانفرنس کی کارروائی ملکی اخبارات و جرائد اور "میثاق" کے ذریعے قارئین تک پہنچتی رہی ہے۔ مگر کچھ لوگ ابتدا میں رجوع الی القرآن کی اس تحریک سے باخبر نہیں ہو سکے اور کہیں بعد میں جا کر انہیں اس شجر سایہ دار کے ٹھنڈے سائے میں دو گھڑی بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ پہلی قرآن کانفرنس اور پھر بڑھتے قدموں، گھٹتی مسافتوں کی مسلسل داستان آویزہ گوش نہیں کر پائے۔ اس لئے سات برسوں پر پھیلی یہ داستان اختصار کے ساتھ پھر پیش خدمت ہے۔

پہلی قرآن کانفرنس کا انعقاد ۱۴ دسمبر ۱۹۷۳ء کو ٹاؤن ہال (اب جناح ہال)، لاہور میں ہوا۔ ہنگامہ پسندی کے اس دور میں خالص قرآن حکیم کے موضوع پر کانفرنس کا انعقاد

مولانا سید حامد میاں کا مقالہ " قرآن و سنت اور تواتر و تعامل" پر پیش ہوا، اور پروفیسر سید ابوبکر غزنوی نے " بارگاہِ رسالت سے ہمارے تعلق کی بنیادیں " اور مولانا عبد الرحمٰن نے " قرآن اور سنت رسول " کے موضوع پر مقالات پڑھے۔

تیسرے اجلاس کی صدارت جناب ڈاکٹر سلیم فارانی نے کی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، پروفیسر محمد منور مرزا، چوہدری منظر حسین، پروفیسر مشکور حسین یاد، پروفیسر سید نذیر نیازی نے " اقبال، پاکستان اور اسلام" کے حوالے سے گفتگو کی۔

چوتھی نشست ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی صدارت میں ہوئی جس میں جناب عبد البصیر پال نے قرآن حکیم اور فکر جدید، ڈاکٹر ابوبکر نے مسئلہ ارتقاء اور قرآن حکیم اور ڈاکٹر صادق حسین نے علم الجنین اور قرآن حکیم کے موضوعات پر مقالے پیش فرمائے۔

پانچواں اجلاس صبح ۸½ بجے شروع ہوا یہ بارہ ربیع الاوّل کا دن تھا اس لئے اجلاس کا موضوع " قرآن مجید اور بعثت رسول " تھا۔ اس اجلاس کی واحد تقریر مرکزی انجمن خدام القرآن کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تھی اور صدارت کی کرسی پر رونق افروز تھے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر عبد الواحد ہالے پوتا۔

بعد نماز عصر اس کانفرنس کی آخری نشست ہوئی۔ جناب یوسف سلیم چشتی اور مولانا امین احسن اصلاحی اس نشست کے مقررین تھے اور اس طرح سے یہ دوسری کانفرنس تیسری کانفرنس کے لئے مہمیز ثابت ہوئی۔

تیسری قرآن کانفرنس

بھی لاہور کے ٹاؤن ہال ہی میں منعقد ہوئی یہ کانفرنس ۲۱ مارچ کو شروع ہوئی اور ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو بخیر و خوبی اختتام کو پہنچی کانفرنس کی پہلی نشست محفل حُسنِ قرأت کے لئے مخصوص تھی۔ جس میں: (۱) قاری محمد شاکر انور (۲) قاری احمد میاں تھانوی (۳) قاری عاکف سعید (۴) قاری محمد آصف (۵) قاری تقی حسین

محمد عالمگیر خاں نے "اسلام اور جدید طب" پر مقالہ پیش فرمایا۔

ان دنوں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں زوروں پر تھیں اور اسمبلی ہال میں کانفرنس کے انعقاد کے انتظامات کیے جارہے تھے۔ اس لئے صوبائی اسمبلی کے اجلاس کے لئے حکومت نے ٹاؤن ہال کا انتخاب کیا۔ چنانچہ ٹاؤن ہال کے منتظمین نے اسے اسمبلی ہال کے طور پر استعمال میں لانے کی غرض سے قرآن کانفرنس کی آخری نشست کے انعقاد سے معذرت کرلی۔ لہٰذا یہ نشست مسجد شہداء میں منعقد ہوئی۔ آخری نشست کے صدر مولانا امین احسن اصلاحی تھے اور موضوع تھا "تدبر قرآن"۔ مولانا حمید الدین فراہی"، جناب محمد نعیب خالد مسعود، محمود احمد لودھی، نے مقالات پڑھے۔ جناب مولانا عبدالرحیم اشرف نے "اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور قرآن حکیم" کے موضوع پر تقریر فرمائی اور مولانا امین احسن اصلاحی کا صدارتی خطبہ ہوا۔

پہلی کانفرنس کی کامیابی سے انجمن خدام القرآن کے منتظمین کے حوصلے بلند ہوگئے اور وہ ہر سال اس طرح کی کانفرنس منعقد کرنے سے متعلق سوچنے لگے در اصل پہلا قدم ہی آگے بڑھنے یا رک جانے کا فیصلہ کرنے میں ممد ثابت ہوتا ہے پہلا قدم پیام کامرانی لایا تو یہ قدم بڑھنے لگے اور ہر قدم کامرانیوں کی داستاں بن گیا۔

دوسری قرآن کانفرنس

۲۴، ۲۵، مارچ ۱۹۷۵ء کو دوسری سالانہ قرآن کانفرنس بھی ٹاؤن ہال لاہور میں منعقد ہوئی۔

پہلے اجلاس کی صدارت جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث مولانا محمد مالک کاندھلوی نے فرمائی اور اس میں درج ذیل مقالات پڑھے گئے۔

۱۔ حفاظت متن قرآن۔ حافظ احمد یار صاحب

۲۔ قرآن حکیم اور معاشرتی بہبود۔ ڈاکٹر امان اللہ صاحب

۳۔ نشر و اشاعت قرآن کا ایک منصوبہ۔ محمود احمد غفاری صاحب

دوسری نشست کی صدارت مولانا مفتی محمد حسین نعیمی نے فرمائی۔

یہ کانفرنس ملتوی کرنا پڑی ۔ سیاسی ہنگامی آرائی ایک عرصے تک جاری رہی اور پھر کہیں مہینوں بعد جا کر مارشل لا کے ذریعے امن وسکون بحال ہوا ۔ چنانچہ موقع غنیمت جانتے ہوئے نومبر میں اس ملتوی شدہ کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا ۔ ۲۶، ۲۷ ، نومبر ۱۹۷۷ء کو جناح ہال لاہور میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس کے لئے صدر پاکستان (اُس وقت صرف چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر) جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے تفصیلی پیغام ارسال کیا جسے ملکی پریس نے نمایاں طور پر جگہ دی اس کے علاوہ ریڈیو ، ٹی وی نے بھی اس پیغام کی مناسبت سے اس کانفرنس کو خصوصی اہمیت دی اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں دیگر اصحاب علم وفضل کے علاوہ شیخ الحدیث مولانا محمد گوندلوی ، پروفیسر محمد منور مرزا ، ڈاکٹر سلیم فارانی اور مفتی محمد حسین نعیمی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔

پانچویں قرآن کانفرنس

لاہور میں چار قرآن کانفرنسیں ہو چکیں تو کراچی والوں نے یہ سعادت حاصل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مرکزی انجمن خدام القرآن کی مجلس منتظمہ نے بھی کراچی والوں کو اس سعادت میں حصہ دار بنانا مناسب خیال کیا اس لئے پانچویں قرآن کانفرنس کا انعقاد ۲۲ ، ۲۴ ، مارچ ۱۹۷۸ء کو آئی ، بی اے ہال کراچی میں ہوا ۔ اس کانفرنس میں مقالات اور تقریروں کے علاوہ ایک قرآنی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا تھا جسے شرکاء کانفرنس نے خوب سراہا ۔

پہلے اجلاس کی صدارت مولانا محمد ناظم ندوی نے کی اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی ، سید امتیاز حسین بخاری ، ڈاکٹر غلام محمد اور پروفیسر محمد اسلم صاحب نے " عظمت و اعجازِ قرآن " اور قرآن ، سنتِ رسُول اور صحابہ کرام کے موضوع پر مقالات پیش کئے ۔

دوسرا اجلاس مولانا ظفر احمد انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا جس کا موضوع " اُمتِ مسلمہ کے مسائل کا حل قرآن حکیم کی ، روشنی میں " تھا ۔ سید وصی مظہر ندوی ، شیخ ظہور الحق ، نیاز احمد ایڈووکیٹ نے مقالات اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ،

(۶) قاری عبدالواحد (۷)، قاری عبدالقیوم (۸) قاری رحیم بخش اور صدر محفل
حسن شاہ صاحب شریک ہوئے۔ محفل قرأت کے بعد پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے
پیش فرمایا۔ دوسرا اجلاس جناب مولانا شمس الحق افغانی کی صدارت میں بعد
عصر شروع ہوا جو رات گئے تک جاری رہا اس دوران میں نماز مغرب اور
ٹاؤن ہال کے سبزہ زار میں ادا کی گئی۔ مولانا محمد حنیف ندوی، حافظ احمد یار،
محمد موسیٰ خان اور مولانا شمس الحق افغانی نے مقالات اور تقاریر سے مشرف
کانفرنس کو محظوظ فرمایا۔

تیسری نشست کی صدارت مولانا محمد مالک کاندھلوی نے کی مولانا
مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا ڈاکٹر محمد مظہر بقا، ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک مو
سید حامد میاں اور مدیر "برہان" مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے مقالات
چوتھی نشست کے صدر تھے جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور مقالہ
جناب خالد ایم اسحق، مولانا محمد طاسین، ڈاکٹر امان اللہ خان مرزا محمد منور
ڈاکٹر ابصار احمد تھے۔

پانچویں اجلاس کا موضوع "پاکستان، مصور پاکستان اور قرآن حکیم
تھا اس اجلاس کی صدارت پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے کی۔
جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور خواجہ غلام
نے مقالات پیش فرمائے۔

چھٹا اجلاس بھرپور اور پر لطف تھا ملک کے ممتاز خطیب شاہ بلیغ
اور مولانا سید وصی مظہر ندوی کا خطاب سننے کے لئے لوگ امڈ پڑے تھے
کے علاوہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر کا اعلان بھی اخبارات میں
تھا اس لیے پروانے دیوانہ وار آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی حاصل کانفرنس
کے بعد جناب مولانا وصی مظہر ندوی نے خطاب فرمایا۔ اور تیسری قرآن کانفرنس
بخیر و خوبی اختتام پذیر ہوئی۔

چوتھی قرآن کانفرنس

کے انعقاد کے لئے مارچ ۱۹۷۷ء کا انتخاب
کیا گیا۔ مگر ۷ مارچ کو ملک میں عام انتخابات
ہوئے تو ملکی فضا بے اطمینانی اور ہنگامہ آرائی کی زد میں آگئی چنانچہ بادل

یوں اس کانفرنس میں "دستوری، قانونی اور سیاسی مسائل اور قرآن مجید" "حکمت و فلسفہ کے مسائل اور قرآن مجید" "اخلاقی و روحانی مسائل اور قرآن مجید" "معاشی و اقتصادی مسائل اور قرآن مجید" اور ثقافتی و معاشرتی مسائل اور قرآن حکیم" ایسے متنوع موضوعات زیر بحث آئے۔ ملک کے جن جیّد فضلا و علما نے خطاب کیا ان میں جسٹس شیخ ظہور الحق، جناب خالد اسحٰق، پروفیسر اظہر علی صدیقی، جناب نیاز احمد خان، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا ظفر احمد انصاری، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا محمد تقی عثمانی، ڈاکٹر غلام محمد، خواجہ شمس الدین عظیمی۔ ڈاکٹر عبدالرزاق، پروفیسر محمد اسلم، ڈاکٹر شرافت علی ہاشمی ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، مولانا محمد طاسین اور سالار کارواں جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب شامل تھے۔

ساتویں قرآن کانفرنس ۱۸ تا ۲۱ اپریل ۱۹۸۰ء منعقد ہوئی اس کے انعقاد کی سعادت لاہور کو حاصل ہوئی اس مرتبہ کچھ پروگرام اس طرح سے ترتیب دیا گیا کہ اسکی کچھ نشستیں تو ٹاؤن ہال (جناح ہال) میں منعقد ہوں اور کچھ قرآن اکیڈمی میں۔ چنانچہ پہلی نشست ٹاؤن ہال میں حافظ نذر احمد صاحب کی زیر صدارت شروع ہوئی۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے جناب اختر الواسع، جناب ثنا اللہ انصاری جناب پروفیسر مرزا محمد منور جناب حافظ احمد یار اور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے خطاب فرمایا۔

دوسرا اجلاس ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی کی صدارت میں ہوا۔ اور صاحب صدر کے علاوہ جناب سید حامد میاں کا مقالہ پیش کیا گیا۔

تیسرے اجلاس کے دو صدر تھے جناب جسٹس تنزیل الرحمٰن اور جسٹس قاضی محمد گل۔ اس کے علاوہ جسٹس کریم اللہ درانی بھی شریک اجلاس تھے، جناب محمد تقی امینی کے مقالے کے علاوہ حافظ عبدالرحمٰن مدنی جناب جسٹس کریم اللہ درانی اور جسٹس تنزیل الرحمٰن نے خطاب فرمایا۔

چوتھے اجلاس کے صدر جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی تھے مولانا محمد حسین میبر نے "قرآن حکیم اور محروم طبقات" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ جسٹس کریم اللہ

نے اسلام اور پاکستان کے موضوع پر دو گھنٹے کی تقریر کی۔

تیسری نشست کے صدر جناب یوسف سلیم چشتی تھے اور اس نشست کی اہم خصوصیت جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر تھی جو آپ نے "علامہ اقبال اور قرآن حکیم" کے موضوع پر فرمائی۔ جناب مصباح الدین شکیل نے بھی ایک مقالہ پیش کیا۔

چوتھی نشست کا موضوع "قرآن اور فکر جدید" تھا اور صدارت جناب مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے کی۔ جناب ڈاکٹر بشارت علی، جناب مولانا محمد طاسین، شیخ حیدر علی، ڈاکٹر ابصار احمد اور جناب خالد ایم اسحاق ایسے فاضل مقررین نے خطاب کیا۔

آخری نشست جناب مولانا محمد اسحٰق ندوی کی صدارت میں منعقد ہوئی موضوع تھا "قرآن، سُنت اور صحابہ کرامؓ"، اور مقررین تھے مولانا محمد تقی عثمانی، شاہ بلیغ الدین، پروفیسر محمد یامین، اور حکیم فیض عالم صدیقی۔ اس نشست میں خواتین کی بھاری تعداد نے بھی شرکت کی۔ اندرونِ سندھ سے بھی مندوبین شریک ہوئے۔

چھٹی قرآن کانفرنس

پانچویں قرآن کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی تو مرکزی انجمن خدام القرآن کراچی کے کارکن اُمید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھے مبادا انتظامات میں کمی، کوتاہی رہ جائے اور مہمانوں کے سامنے سُبکی ہو۔ لیکن یہ کانفرنس کامیابی سے ہمکنار ہوئی تو پھر اگلی کانفرنس بھی کراچی میں کرانے کی آرزوئیں مچلنے لگیں۔ مجلس منتظمہ نے بھی اس خواہش کا احترام کیا اور چھٹی کانفرنس کے لئے کراچی کا انتخاب کرلیا۔ یہ کانفرنس ۲۲ تا ۲۴ مارچ ۱۹۸۰ء کو انسٹی ٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی کل پانچ اجلاس ہوئے جن سے ڈیڑھ درجن کے قریب مقررین نے خطاب کیا۔ ان میں قانون دان بھی تھے اور علماء بھی۔ عدلیہ سے تعلق رکھنے والے معزز حضرات بھی اور ماہرین تعلیم بھی۔ مذہب اور تصوّف کی وادیوں میں گھومنے پھرنے والوں کی نمائندگی بھی تھی اور "حکمت و فلسفہ آشناؤں کی بھی۔

ارشاد فرمائی تو سامعین میں ایک درجن کے قریب ماہرین معاشیات (پی۔ایچ۔ڈی) موجود تھے، جنہوں نے اس تقریر کی بہت تعریف کی اور کہا کہ تصویر کا یہ رخ پہلی بار ان کے سامنے آیا ہے۔ یہ تقریر ٹیپ کر لی گئی۔ جسے برادرم سید ارشاد احمد نے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ عدیم الفرصتی کی بناء پر ڈاکٹر صاحب اس پر نظر ثانی نہیں کر سکے۔ (قاضی عبدالقادر)

آج کا انسان مکمل طور پر ایک معاشی حیوان بن چکا ہے۔ انسانی اجتماعیات میں سب سے [اہم] پہلو اقتصادیات اور معاشیات کا ہے۔ اب جب کہ عالم اسلام میں اسلامی نشاۃ ثانیہ [کا ج]ذبہ ابھر رہا ہے، وحدت اُمت کا تصور ایک زندہ حقیقت کی شکل اختیار کرتا نظر آتا ہے [او]ر خاص طور پر پاکستان میں اسلامی نظام حیات کی طرف جو پیش رفت ہوئی ہے، صحیح [را]ستے پر چلنے کا عزم ہے، ارادے ہیں، تو فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام [کا م]عاشی نظام ہے کیا؟ بعض لوگوں نے ناسمجھی کی وجہ سے یا بدنیتی کے ساتھ اس تصور کو [عا]م کیا ہے کہ موجودہ اقتصادی اور معاشی نظام ذرا سی کمی بیشی کے ساتھ اسلامی نظام [کی] صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اگر زکوٰۃ اور عشر کا نظام نافذ کر دیا جائے، سود کی لعنت خاتمہ ہو اور شرکت و مضاربت کے اصولوں پر کاروبار شروع ہو جائے تو بس یوں [سمج]ھیئے کہ اسلام کا معاشی نظام نافذ ہو گیا۔ خواہ بنیادی طور پر معیشت کا ڈھانچہ وہی [رہ]ے جس نے یہاں بدترین قسم کی سرمایہ داری کو جنم دیا ہے۔ اسلام کا یہ معاشی تصور [بھی] اس مغالطے کا باعث بنا ہے کہ اسلام کے پاس انسان کے معاشی مسائل کا حل موجود [نہ]یں۔

اسلام کے معاشی نظام کے سلسلے میں یہ معروضات ایک طالب علمانہ کوشش [ہی] قرار دی جا سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے معاشیات اور اقتصادیات کے اس دور [می]ں اس اہم انسانی مسئلے سے صرفِ نظر کر کے اسلامی تعلیمات کی ترویج اور قرآنی [اف]کار کی موثر تبلیغ کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے قرآن مجید نے [مع]اشیات کے ضمن میں جو احکام دیئے ہیں اور جن مقاصد اور حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر

اسلامی

نظامِ معیشت

چند اہم نکات

★ ——— ڈاکٹر اسرار احمد

ڈاکٹر صاحب نے یہ تقریر سب سے پہلے چھٹی قرآن کانفرنس کے موقع پر کراچی میں کی۔ بعد ازاں موصوف نے قرآن اکیڈمی لاہور میں اور پھر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں انہی نکات کو دہرایا۔ اسے تینوں مقامات پر بہت ہی پسند کیا گیا۔ فیصل آباد یونیورسٹی کے وسیع و عریض ہال میں جو طلباء اور اساتذہ سے بھرا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر غلام رسول چوہدری کی زیرِ صدارت جب یہ تقریر

انسان کا اصل مسئلہ بعد الموت زندگی سے متعلق ہے۔ رہی اس دنیا کی ناپائیدار زندگی تو یہ فانی ہے، عارضی ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اگر کچھ ہے بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ایمان کی یہ دو بنیادیں قرآن مجید کی ایک آیت میں یوں سموئی ہوئی ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون واللہ ہی ہمارا مبدا و معاد ہے ہم اسی کی طرف سے آئے ہیں اور اسی کی طرف جانے والے ہیں، گویا یہ ایک سفر ہے جب فی الواقع ایمان کی یہ دو بنیادیں قائم ہو جائیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل د دنیا میں ایک اجنبی یا راہ چلتے مسافر کی طرح زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آجاتا ہے۔ راہ چلتے مسافر کو اس راہ گذر سے جتنی دلچسپی ہوتی ہے مومن کو اس دنیا سے بھی اتنی ہی دلچسپی ہوتی ہے اور بس۔

کمیونزم اور کیپٹلزم

اس گفتگو سے دو نتیجے اخذ ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ اگرچہ سوشلزم یا کمیونزم اور کیپٹلزم ایک دوسرے کی ضد ہیں ایک مشرق ہے اور دوسرا مغرب۔ لیکن اسلام کے مقابلے میں ان دونوں میں ایک قدر مشترک ہے یہ آپس میں تو متضاد ہیں۔ متقابل ہیں۔ لیکن اسلام کے مقابلے میں اپنے فکری پس منظر کے ساتھ یہ ایک ہی تنے کی دو شاخیں ہیں۔ اسلام جہاں مادیت کے مقابلے میں روحانیت اور اس دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی دعوت دیتا ہے یہ دونوں نظام سرف اور صرف مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم ہیں۔ کیپٹلزم تھی جس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور جدلیاتی مادیت کی صورت اختیار کر لی۔ اور مادیت ہی کی بنیاد ہے جس کے ساتھ کیپٹلزم کا دم چھلا لگا ہوا ہے۔

اسلام کا معاملہ ان دونوں سے مختلف ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنی ہی قائم کردہ بنیادوں پر اپنے مکمل ڈھانچے میں قائم ہو سکتا ہے۔ اور کسی قسم کی پیوند کاری قبول نہیں کرتا لہذا جب تک وہ نظریاتی بنیاد استوار نہ ہو اسلامی نظام کا ڈھانچہ قائم کرنے کا خیال گاڑی کے آگے گھوڑا باندھنے کے مترادف ہوگا۔ پہلے نظریاتی اساس کا استحکام ضروری ہے۔ اس لئے کہ اسلام، ایمان کی بنیاد پر قائم ہوگا اس کے علاوہ وہ کسی جڑ یا بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل اہمیت معاد کی ہے معاش کی نہیں۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت اس بات کی متقاضی ہے کہ اصل اہمیت معاد، آخرت و عاقبت کو ہو

یا حکامات وضع کئے گئے ہیں ان کے متعلق چند بنیادی باتیں عرض کی جائیں گی ۔ یہ وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام پر بحث کرتے ہوئے فلسفیانہ موشگافیوں اور عالمانہ مباحث کے بجائے ان اصطلاحات کا سہارا لیا گیا ہے جن کے لوگ عادی ہیں مثلاً لفظ کیپٹلزم ہے ۔ اس کے بارے میں لوگوں کو سب کچھ نہیں تو بہت کچھ معلوم ہے اس کی اساس کیا ہے اس کا نشۂ کار کیا ہے ۔ اس طرح " سوشلزم " کو لے لیجئے یہ لفظ تو اس قدر رواج پا گیا ہے کہ ہمارے ہاں عام لوگ بھی جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں اسے بڑی روانی سے بولتے ہیں ۔ اور اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں " استحصال " جیسا بھاری بھرکم لفظ بھی اب ریڑھی چلانے والے تانگے بان کی زبان پر ہے اور وہ اسے بآسانی استعمال کرتا ہے ۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ جن الفاظ و اصطلاحات سے مانوس ہیں بات کو انہی کے حوالے سے آگے بڑھایا جائے گا ۔ گو یہ احساس بھی دامن گیر ہے کہ ان الفاظ و اصطلاحات سے مرعوبیت کا الزام عائد کیا جائے ۔ یا OVERSIMPLFCATION کا مجرم گردانا جائے ۔ لیکن دونوں خدشات کے باوجود بھی ذریعہ ابلاغ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ ذہنوں تک رسائی کا یہ طریقہ سب سے زیادہ مناسب اور موثر ہے ۔

دنیا میں ہر نظام ، فکری اور عملی دو پہلوؤں پر مشتمل ہوتا ہے ۔ کسی بھی نظام کو اس کے نظریاتی پس منظر سے جدا کر کے زیر بحث نہیں لایا جا سکتا کیونکہ اس پس منظر کا اس نظام سے گہرا تعلق ہوتا ہے ۔

اسلام کے معاملے میں تو یہ اصول مانے بغیر اس کے نظام حیات پر گفتگو ہی نہیں کی جا سکتی ۔ اس کا اعتقادی یا فکری پس منظر اور اس کی نظریاتی اساس کو ایمان سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اور حقیقتاً یہی بنیاد ہے ۔ جس پر اسلامی نظام کی عمارت قائم ہے ۔

ایمان کیا ہے ؟

خدا اور اس کے رسول پر اس یقین کے ساتھ ایمان کہ جو کچھ اللہ تعالے نے فرمایا اور جو راہ اس کے پیارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے دکھائی اس پر چلے بغیر اس زندگی اور آخرت کی زندگی میں کامیابی ممکن نہیں اور اس بات کا یقین کہ آخرت میں ہمارے ہر عمل کا نیکی اور برائی کی صورت میں بدلہ ملے گا ۔ یہی یقین ہی ایمان کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے کہ ہماری یہ دنیوی زندگی ہی حرف آخر نہیں بلکہ اصل زندگی تو موت کے بعد کی ہے اور

الایمان ومن جور الملوک — اور شہنشاہی استبداد سے نجات
الی عدل الاسلام — دلا کر عدل اسلام سے روشناس کرائیں۔

اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بیعت خلافت کے بعد جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اسلامی مملکت کے اصول متعین کرتا ہے آپ نے فرمایا "تم میں سے ہر قوی میرے نزدیک ضعیف ہے جب تک کہ اس سے حق وصول نہ کرلوں اور تم میں سے ہر ضعیف میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ اسے اس کا حق نہ دلوا دوں" گویا نظام عدل و قسط کا قیام، اسلامی ریاست کا بنیادی مقصد ہے۔

عدل۔ اسلامی نظام کا امتیازی سلوگن

ہر نظام میں کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس نظام کا امتیازی سلوگن بن جاتے ہیں کیپٹلزم میں آزادی (FREEDAM) کی تکرار ملے گی۔ یہ گویا ان کے فکر کی بنیاد اور مرکز و محور ہے اس طرح سوشلزم یا کمیونزم میں مساوات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں نوع انسانی کیلئے کشش ہے۔ اس مرحلے پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ دونوں اعلیٰ قدریں ہیں۔ آزادی بھی ایک اعلیٰ قدر ہے اور مساوات بھی، ان کے مقابلے میں اسلام نے عدل کا تصور دیا ہے۔ وہ آزادی اور مساوات کے درمیان عدل کا راستہ تجویز کرتا ہے۔ نہ تو آزادی اس قدر بڑھ جائے کہ مساوات کو ہڑپ کر جائے اور نہ مساوات کا ہوا کھڑا ہو کہ آزادی جیسی اعلیٰ قدر سے انسانی معاشرہ محروم ہو جائے۔ آزادی کی قیمت پر مساوات اور مساوات کی قیمت پر آزادی اسلام ان دونوں کے حق میں نہیں۔ اسلام عدل چاہتا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جسے اسلام کا امتیازی سلوگن قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس دنیا میں نظام عدل کے قیام کی آخر غرض کیا ہے۔ اس طرف انسانی اجتماعیات کے بہت بڑے عالم حضرت شاہ ولی اللہؒ نے توجہ دلائی ہے وہ فرماتے ہیں:۔

قرآن حکیم کی واضح تعلیمات کے مطابق مسلم معاشرے کو حکم دیا گیا ہے کہ نہ اسراف کیا جائے نہ تبذیر، بلکہ راہ اعتدال اختیار کی جائے۔ اسراف کا مطلب ہے حد سے زیادہ خرچ کرنا اور تبذیر سے مراد ہے بیجا اور فضول خرچ کرنا۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سے انکار بھی ممکن نہیں۔ کہ اسلام نے عدل اور قسط کے قیام کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ شریعت، انزال کتب، بعثت رسل کا مقصد، دین کا پورا ڈھانچہ، مرکزی خیال قیام عدل و قسط ہے۔ عدل و انصاف پر مبنی ایک نظام کا قیام گویا اسلام اور ایمان کا بنیادی تقاضہ ہے چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کی ایک صفت قائما بالقسط (انصاف قائم کرنے والا) بھی آئی ہے۔ اس کے علاوہ ارشاد خداوندی ہے

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھدا للہ[1]	اے اہل ایمان عدل اور قسط کے قائم کرنے والے اور اللہ کے گواہ بنو۔
یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط[2]	اے اہل ایمان اللہ کے گواہ بنو تاکہ عدل و انصاف قائم رہو۔

ایک بات کو دو پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس خوبصورت انداز میں کہ رُوح وجد کرتے لگتی ہے اس کے علاوہ فرمایا۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس[3] بالقسط	ہم نے اپنے رسول بھیجے، بیّنات نازل فرمائیں اور ہم نے میزان اتاری اس لئے کہ لوگ عدل و انصاف پر کاربند رہیں۔
وقل امنت بما انزل اللہ من کتاب وامرت لا عدل بینکم	میں ایمان رکھتا ہوں اس پر جو اللہ تعالےٰ نے اتارا مجھ پر اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔

چنانچہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص نے جب ایرانیوں نے پوچھا کہ آپ ہم پر کیوں حملہ آور ہوئے تو آپ نے جواباً فرمایا۔

انا نحن ارسلنا لنخرج الناس من ظلمات الجہالۃ الی نور	ہمیں بھیجا گیا کہ ہم لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نور ایمان کی طرف

---

[1] النساء [2] مائدہ [3] الحدید [4] الشوریٰ

دوسروں کی بھلائی کے لئے بھی کوئی کام کرسکے اور خدا کو بھی یاد کرسکے۔

"اللہ تعالیٰ نے رفاہیت بالغہ (عیاشی) کو ناپسند کیا ہے اور ایسی معاشرت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے جس سے انسان طلب دنیا کے ہی اندر الجھ کر رہ جائے اور معیشت کی باریکیوں میں اتر جائے اور اس کے اندر انتہائی تعمق اور غلو کرنے لگے۔ چنانچہ ریشم اور سونے چاندی کے برتن اور بھاری زیورات مثلاً کنگن، گلوبند، ہار طوق، پازیب وغیرہ کا استعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں انسان کو اسفل السافلین میں پہنچا دیتی ہیں اور انسانی افکار کو مختلف قسم کی تاریکیوں میں الجھا دیتی ہیں۔ رفاہیت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ معاشرتی زندگی میں اچھی چیزیں طلب کی جائیں اور ادنیٰ سے اعراض کیا جائے۔ لیکن رفاہیت بالغہ یہ ہے کہ ایک ہی جنس میں سے سب سے اعلیٰ کا انتخاب کیا جائے۔" (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲۔ صفحہ ۱۰۷)

رفاہیت ناقصہ عموماً ان لوگوں کا معیار زندگی ہوتا ہے جو آبادیوں سے دور پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کا حال وحشی جانوروں کا سا ہوتا ہے [۱] شہروں کے وہ لوگ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں جو دوسروں کی خاطر محنت کرتے ہیں مگر انہیں پورا معاوضہ نہیں ملتا۔ پھر ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگا دیئے جاتے ہیں جس سے ان کی حالت گدھوں اور بیلوں کی سی ہو جاتی ہے جن سے سخت کام لیا جاتا ہے اور محض زندہ رہنے کے لئے کچھ کھانے کو دے دیا جاتا ہے۔ پھر ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ محنت و مشقت سے فرصت ہی نہیں پاتے! ورنہ وہ سعادت اخرویہ کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ بلکہ ان میں سعادتِ اخرویہ کا احساس ہی فنا ہو جاتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں رہتا جو دین کے مطابق کوئی حرکت کرسکے۔[۱]

اگر اس طریقے سے انسان جکڑے ہوئے ہوں جس طرح بنی اسرائیل کو فرعونیوں نے جکڑ ہوا تھا، صبح سے لے کر شام تک ان سے بیگار لی جا رہی ہے، کسی اور بات یا اعلیٰ قدر کی طرف متوجہ ہونے کی انہیں فرصت ہی نہیں ہے۔ اس طرح اگر کسی

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ بحوالہ میثاق ۶۹ء

(۱) وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ہ ¹	کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ بے شک وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
(۲) وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ہ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ہ ²	اور بے جا خرچ نہ کرو۔ بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔
(۳) وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ہ ³	اور اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کیساتھ باندھ کر نہ رکھو اور نہ اُسے بالکل ہی کھول دے ورنہ تو پشیمان خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جائے گا۔
(۴) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ہ ⁴	اور رحمٰن کے بندے، وہ لوگ ہیں جو خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر ہوتا ہے۔

• عموماً معاشرے میں تین قسم کے معیارِ زندگی پائے جاتے ہیں :-

۱ - رفاہیتِ بالغہ یعنی عیاشیانہ معیارِ زندگی جس میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کو پسند کی جاتی ہے۔ اس طرح حد سے زیادہ بلکہ اکثر بے جا خرچ کیا جاتا ہے اور دولت کو ضائع کیا جاتا ہے۔

۲ - رفاہیتِ ناقصہ یعنی پست معیارِ زندگی۔ جس میں زندگی کی ضروریات بھی طرح حاصل نہیں ہوتیں۔ اور جانوروں کی سی زندگی بسر کی جاتی ہے۔

۳ - رفاہیتِ متوسط یعنی درمیانہ معیارِ زندگی جس میں زندگی کی ضروریات متوسط درجے میں میں حاصل ہوتی ہیں اور انسان اتنی فراغت پاتا ہے کہ وہ اپنی اور

---

¹ اعراف ² بنی اسرائیل ³ بنی اسرائیل ⁴ الفرقان

ہمارے ہاں غلط بحث ہوتی ہے اور ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اسلام کے معاشی نظام کی تشریح و تعبیر کرتا ہے۔ جو لوگ سوشلزم اور کمیونزم سے متاثر ہیں وہ انفرادی ملکیت کی کامل نفی کرتے ہیں۔ ضرورت سے زائد ہر چیز لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسرا پہلو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مثلاً قانون وراثت بھی تو قرآن مجید میں موجود ہے اس کے علاوہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام میں بھی جبری مساوات کی نفی کر دی گئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر تصرف بلکہ وراثتاً جائداد کی منتقلی کا حق بھی تسلیم کیا گیا۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کمیونزم سے خار کھاتے ہیں وہ اسلام کے قانون نظام کا دم بھرتے اور اس کے رُوحانی نظام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ ایک استحصالی سرمایہ دارانہ نظام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

یہ دونوں قسم کے نقطہ ہائے نظر کسی غلط فہمی کی بنا پر بھی ہو سکتے ہیں۔ اور خلوص نیت کے ساتھ بھی۔ اسلام کے قرن اوّل میں بھی یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری نے جن پر زہد اور فقر کا غلبہ تھا۔ آیۂ کنز[1] کو ظاہری معنوں پر محمول کیا اور اس رائے کا اظہار کیا کہ سونا چاندی اور سرمایا ایک لمحے کے لئے بھی اپنے پاس رکھنا حرام ہے۔ اس سے ایک بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ خلافت راشدہ نے ان کی اس رائے کو انتہا پسندانہ قرار دیا۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں انہیں مدینہ بدر کیا گیا۔ اور مدینہ منورہ سے باہر ہی ان کا انتقال ہوا۔ ان کے زہد کی شدت کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہو رہا تھا تو صرف ان کی اہلیہ محترمہ ان کے پاس تھیں۔ گھر میں ضرورت کی چند چیزیں تھیں مگر ان کے احساسات یہ تھے کہ ان کی موجودگی پر بھی پریشان تھے۔ اور بار بار کہتے تھے

" حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا تم اپنے گرد سانپ اور بچھو جمع کر لو گے۔ اور یہ مجھے نظر آ رہے ہیں" اہلیہ محترمہ نے کہا۔ کہاں ہیں وہ سانپ اور بچھو جو تم نے

---

[1] الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ (التوبہ)

انسانی معاشرے میں معاشی ناہمواری کی یہ کیفیت ہو جائے کہ لوگوں کی اکثریت صرف روٹی کے حصول میں سرگرداں ہو۔ معاملہ جب یہ ہو جائے کہ انسان بنیادی ضروریات کی فراہمی کے لئے کمر توڑ دینے والی محنت کرے اور پھر بھی اس کی ضروریات پوری نہ ہوں تو انسان کا حیوانی سطح پر آجانا کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ اس بنا پر اسلام، نظام عدل وقسط قائم کرنا چاہتا ہے نہ صرف قانونی نظام میں بلکہ سماجی عدل بھی۔ تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اللہ کی معرفت حاصل کریں۔ اسی سے لو لگائیں، اس سے محبت کریں۔ اپنے مقصد تخلیق کو پورا کریں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں اس کے لئے فرصت ہو، وقت ملے اور یہ نہ کہہ سکیں۔

ع! تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

عدل، جس میں اس نے آزادی اور مساوات دونوں قدروں کو خوبصورت انداز میں سمویا ہے۔ کیا ہے؟ اور اسلام کس قسم کا معاشی و اقتصادی نظام قائم کرنا چاہتا ہے؟ اس کی وضاحت سے قبل اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کے دو پہلو یا یوں سمجھیئے کہ دو حصے ہیں مگر اس طرح کہ دونوں اپنی جگہ ایک مکمل نظام کا نقشہ پیش کرتے ہیں دونوں کا اپنا ایک فلسفہ ہے اپنا نظریہ ملکیت ہے دونوں کا نظریہ حقوق ہے۔ دونوں کا اپنا نظریہ قدر زائد ہے۔ معاشی نظام میں اہمیت رکھنے والی تمام چیزیں ان دونوں نظاموں میں اپنا جداگانہ فلسفہ رکھتی ہیں۔ سورہ رحمٰن کی اس آیت کے مطابق۔

مرج البحرين يلتقيين	دو رونیں ہیں جو برابر چل رہی
بينهما برزخ لا يبغين	ہیں مگر ان کے درمیان ایک غیر
؎۱	مرئی پردہ حائل ہے۔ جو انہیں
	باہم مدغم نہیں ہونے دیتا۔

بالکل اسی شکل میں یہ دونوں نظام موجود ہیں اور اسلام جو مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہاں دونوں کے حسین امتزاج سے قائم ہوتا ہے۔

۱۱

؎۱ الرحمٰن

مثلاً ملازم کی ضرورت پوری ہونے کے بعد کچھ سرمایہ اس کے پاس جمع ہوگیا ہے اب اس فاضل سرمائے کے دو مصرف ہیں یا تو وہ اسے کسی کاروبار میں لگاتے اس صورت میں محنت اس میں شامل نہیں ہوگی۔ فاضل سرمائے میں جو بڑھوتری ہوگی وہ بھی ربوا قرار پائیگی۔ اس کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اسے محتاجوں اور مسکینوں میں تقسیم کیا جائے، وہ لوگ جن کے پاس کاروبار کی بنیاد ڈالنے کے لئے سرمایہ موجود نہیں انہیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ وہ رزق حلال باعزت طریقے سے حاصل کرنے کے قابل ہوسکیں اُن کی مجبوری سے فائدہ اٹھاکر ان کی محنت میں سے حصہ وصول کرنا گو قانونی سطح پر جائز ہو بھی تو اخلاقی اور رُوحانی سطح پر یہ ممنوعات کی فہرست میں شامل ہوگا۔ اس لئے اس فاضل سرمائے کا مصرف یہ ہونا چاہیئے کہ ضرورت مند اس سے فائدہ اٹھائیں اور اگر زیادہ نہیں تو انہیں یہ سرمایہ بطور قرض حسنہ ہی دیا جائے تاکہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور معاشرے میں صاحب عزت اور صاحب حیثیت بن سکیں۔ قرآن کی اخلاقی اور رُوحانی تعلیمات کا یہی نکتہ ہے جسے اپنا کر ایک جنتی معاشرہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

قانونی اور فقہی نظام

اسلام کا قانونی معاشی نظام ایک طرح کی کنٹرولڈ کیپٹلزم ہے کہ اس میں تینوں جبلی تقاضے موجود ہیں اس میں نجی ملکیت (PRIVATE OWNERSHIP) بھی ہے ذاتی دلچسپی بھی ہے اور آزاد معیشت کا تصور بھی۔ البتہ اس میں حلال اور حرام کی تفریق موجود ہے۔ پابندی کمانے پر نہیں بلکہ حلال سے تجاوز کرنے پر ہے۔ ملکی قانون حق تصرف تسلیم کرتا ہے۔ اور اپنی مرضی سے اللہ تعالیٰ کی راہ میں دینے کا تقاضہ بھی کرتا ہے البتہ جو فرض ہے مثلاً زکواۃ وہ جبراً وصول کی جائے گی لیکن زکواۃ کے علاوہ اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہوگی۔ مگر ذہن میں رہے کہ اسلام نے اس قانونی نظام کو دو پہلوؤں سے حدود کا پابند کیا ہے تاکہ یہ ایک لعنت بن کر نوع انسان پر مسلط نہ ہوجائے۔ ایک تو وہ خطوط متعین کئے گئے جنکی موجودگی میں سرمایہ کاری، سرمایہ داری بننے سے محفوظ رہے۔ دوسری طرف آزاد معیشت میں بعض لوگوں کے آگے بڑھ جانے اور بعض لوگوں کے پیچھے رہ جانے کے امکان کو تسلیم

جمع کر لئے ہیں۔ بولے وہ دیکھو توا ہے، استعمال کے کپڑے ہیں یہ سب کچھو ہی ہیں یہ صحیح ہے کہ اسلام قانونی نظام سے رُوحانی نظام کی طرف قدم بڑھانے کا تقاضا کرتا ہے وہ چاہتا ہے کہ انسان اس کی طرف پیش قدمی کرے۔ اور یہی مغالطہ حضرت ابوذر غفاری کو کامل خلوص کے ساتھ لاحق ہوا۔ لیکن آج بدنیتی کے ساتھ جان بوجھ کر یہ غلط فہمی پیدا کی جا رہی ہے کیونکہ اب تو ہمارے سامنے پورے کا پورا نظام موجود ہے اور قرآن و حدیث کے حوالے سے موجود ہے ایک پہلو سے صرف نظر کرنا اور دوسرے پہلو کو نمایاں کرنا اور اسے پروجیکٹ ( ) کرنے کے لئے دلیلیں فراہم کرنا کسی طرح بھی حقیقت پسندی نہیں۔

چار اصول اسلام کے اخلاقی یا رُوحانی نظام کے چار اصول ہیں (۱) ملکیت کی کُلّی نفی (۲) انسان کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس کا کسب نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے اس کی عطا ہے (۳) انسان کا حق اس کی جائز ضروریات ہیں بعض احادیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے انہیں متعین بھی فرما دیا ہے۔ دو وقت کھانے کے لئے سامان، سر چھپانے کے لئے چھت دو جوڑے کپڑے اور اخلاق و کردار کی حفاظت کے لئے بیوی۔ (۴) اب جو کچھ انسان کے پاس بچ رہے اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے وقف کر دے۔ گو قانونی طور پر اسے اس پر حق تصرف حاصل ہے۔ لیکن اخلاقی تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسروں کی طرف منتقل ہو۔ یہ اپنے طور پر ایک مکمل نظام ہے اس میں ملکیت کا نظریہ بھی موجود ہے اپنے حق کا تصوّر بھی اور اگر قدرِ زائد ہے تو اس کا مصرف بھی موجود ہے۔

قرآن مجید میں ربوا کا لفظ دو چیزوں کے ضد کے طور پر آیا ہے (۱) ربوا بمقابلہ بیع واحل اللّٰہ البیع وحرم الربوا [1] (۲) ربوا بمقابلہ صدقات اور تزکیہ نفس کے خرچ کرنے کے لئے۔ اور وما آتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللّٰہ فاولئك هم المضعفون [2] اسلام کی رُوحانی اور ایمانی تعلیمات میں ربوا، صدقات کے مقابلے میں آیا ہے۔ یمحق اللّٰہ الربوا ویربی الصدقت (اللہ تعالیٰ ربوا کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے) [3]

ان آیات میں صدقات کے مقابلے میں ربوا کا لفظ آیا ہے یوں سمجھئے کہ ایک انسان

---

[1] البقرہ [2] الروم [3] البقرہ

سالگرہ پر لاکھوں روپے کے تحائف جمع ہوگئے ہیں ۔سرمایہ کی گردش کا عمل یہاں بھی وقوع پذیر ہوا لیکن بین الاغنیاء (سرمایہ داروں کے درمیان)

اسلام کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں جو بھی ذرائع پیداوار ہیں اور ان میں زمین سب سے بڑا ذریعہ پیداوار ہے ۔ان کی منصفانہ تقسیم ہو اور اس کا حاصل پورے معاشرے میں پھیلے کنٹرولڈ کیپٹلزم کی جو اصطلاح یہاں استعمال کی گئی اسے اب انٹرنل منیج کیپٹلزم کے الفاظ میں ادا کیا جا رہا ہے ۔کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام بھی یہ بات جان چکا ہے کہ ننگی اور عریاں سرمایہ داریت اس دور میں نہیں چل سکتی ۔اس کا کوئی مستقبل نہیں بلکہ وہ تو تباہی کی طرف لے جا رہی ہے ۔اقبالؒ کے الفاظ میں ۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکان نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا ۔
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

سرمایہ دارانہ نظام کلی طور پر اپنے فلسفے کے ساتھ اب قابلِ قبول نہیں رہا ۔اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے اور وہ تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا ہے ۔اس لئے اپنے تحفظ کے لئے کچھ قابلِ عمل اقدامات کر رہا ہے ۔جس کی نمایاں مثال برٹش سوسائٹی میں ملتی ہے ۔وہاں ان لوگوں کے لئے جو کام نہیں کر پاتے نان ایمپلائمنٹ الاونسز مقرر کر دیئے گئے ہیں ۔اس طرح سے بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست اپنے ذمہ لیتی ہے ۔آزاد معیشت کا تصور بھی مجروح نہیں ہوتا ۔اور ضرورت مند لوگوں کی کفالت کا سامان بھی کر دیا جاتا ہے ۔لیکن غور کیا جائے تو اسلام کے نظامِ معیشت میں یہ اصول چودہ سو سال قبل طے کیا جا چکا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام یا بے خدا معاشرہ جہاں ٹھوکریں کھا کر اب پہنچ رہا ہے ۔اسلام چودہ سو سال قبل اس طرف رہنمائی کر چکا ہے ۔اس نے اصول کے طور پر بتا دیا کہ کمانے کھانے کی آزادی ہے ۔ اور آگے بڑھنے کی بھی لیکن جو پیچھے رہ جائیں ان کی بنیادی ضروریات کی فراہمی معاشرہ

کر کے جبری مساوات کے بجائے اس فرق و تفاوت کو بڑی حد تک ختم کر
درمیانی خلا کو پُر کرنے کے لئے راستہ تجویز کرتا ہے۔ نظام زکواۃ اس سلسلہ
کڑی ہے اسلام نے ایک حد فاصل قائم کر دی کہ جو بھی حد سے آگے بڑھ جا
مالدار ہیں۔ اور دینے کے مکلف ہیں اور جو اس حد تک نہیں پہنچ سکے وہ
ضرورت مند ہیں۔ معروف معنوں میں پہلے والوں کو HAVE اور دوسرو
NOT شمار کر لیجئے۔ لیکن یہ تقسیم آپ کے اختیارات کے تابع نہیں کہ آپ
HAVE بنا دیں اور جسے چاہیں HOWE NOT بنا دیں۔ بلکہ نصاب کی
مقرر کر دی ہے کہ اتنے اثاثے ہیں تو دینے والوں کی صف میں اس سے کم
لینے والوں کی صف میں اس تقسیم کے بعد یہ اصول قائم کیا گیا کہ

توخذ من اغنیاءھم وترد الیٰ فقراءھم

(اغنیاء سے لے کر مستحقین میں تقسیم کیا جاتے گا)

تاکہ اس تفریق کا کسی حد تک خاتمہ کیا جا سکے جو معاشرے میں بہ
سی برائیوں کا باعث بنے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہو گا کہ کچھ لوگ تو ارتکاز دولت
عیش وعشرت کی زندگی بسر کریں اور کچھ لوگ ضروریات زندگی سے بھی
جائیں۔ اسلام ارتکاز و احتکار دولت کا مخالف ہے۔ سرمائے کو گردش
کا متقاضی لیکن وہ سرمائے کی فطری گردش کے حق میں ہے۔ سرمائے کی
گردش جو سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ اسلام کے نزدیک پسندیدہ
نے اصولاً یہ بات طے کر دی کہ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء
(دولت، سرمایہ داروں کے درمیان ہی الٹ پھیر میں نہ رہ جائے
پتی کی بیٹی ایک دوسرے کروڑ پتی کے بیٹے سے بیاہی گئی لاکھوں روپے کا
گھر میں جمع ہو گیا جہاں کروڑوں روپے پہلے سے موجود ہیں سرمایہ تو گردش
لیکن مصنوعی انداز میں۔ اور معاشرے کو اس سے قطعاً کچھ فائدہ نہ ہو
سرمایہ نچلے طبقات تک منتقل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح ایک سرمایہ دار کے

لہ الحشر

سامنے آتے ہیں۔

(۱) سرمایہ بحیثیت سرمایہ منافع کا مستحق ٹھہرا (۲) اپنے تحفظ کی ضمانت (۳) نقصان میں عدم شرکت (۴) نفع کی ایک متعین شرح۔

جہاں یہ چاروں صورتیں جمع ہوں تو یہ ربوا ہے۔ اور اسلام نے اپنے نظام معیشت میں اس کی جڑ کاٹ دی ہے۔ زنا، شراب غرض کسی برائی کے بارے میں قرآن مجید نے وہ سخت لہجہ اختیار نہیں کیا۔ جو ربوا کے بارے میں اختیار کیا ہے ربوا کے بارے میں اس کی آتش غضب یوں بھڑکتی ہے۔

یاایھا الذین آمنوا تقوا اللہ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور
وذروا مابقی من الربوا	جو سود کہ کسی کے ذمہ ہے چھوڑ دو۔
ان کنتم مومنین ہ	ہاں اگر نہیں کرو گے تو پھر اللہ اور
فان لم تفعلوا فاذنوا	اس کے رسول کے مقابلے میں جنگ
بحرب من اللہ ورسولہ لہ	کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اس قدر سخت وعید کسی اور معاملے میں نہیں آئی اور اس کی بہترین وضاحت اور ہماری ذہنی سطح کے مطابق بات قرآن کے مزاج شناس اور اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی۔

الربوا سبعون جزً ا	ربوا کے ستر جزو ہیں اُن میں سے
ایسر ھا ان ینکح الرجل	سب سے ہلکا یہ ہے کہ کوئی شخص
اُمہٗ لہ	اپنی ماں سے نکاح کرے۔

یہ انداز کھلتا ہے کہ حضورؐ نے ایسی تشبیہ کیوں اختیار فرمائی لیکن غور کریں تو اس کی حکمت روز روشن کی طرح ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمیں طبعی طور پر نفرت ہے اور بعض چیزیں اس کے ہم پایہ برائی ہیں۔ لیکن ہم انہیں جبلی یا طبعی طور پر برائی نہیں سمجھتے جب کوئی شخص انہیں پہلی چیزوں کی طرح ہمارے سامنے لائے گا ان سے تشبیہ دے کر بیان کریگا تو حقیقت واضح ہو گی یہی حکمت حضورؐ کے اس فرمان میں پوشیدہ ہے۔ تم شاذ و نادر سے جرم نہ سمجھو یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لو کہ سود لے لیا تو کونسی برائی ہو گئی یہ دراصل ماں سے نکاح

کا فرض ہے ۔ اور زکواۃ و عشر کا نظام اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔

کفالت عامہ کے اصول کو کلیکٹو انشورنس بھی کہا جا سکتا ہے ۔ اس فرق کے ساتھ کہ انشورنس خواہ کسی قسم کی ہو اسے انسان اپنی کمائی میں بچت کرتا ہے ۔ لیکن اسلام نے جو اصول وضع کیا ہے اس میں ایک طبقہ بچاتا ہے اور جمع کرتا ہے ۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا فائدہ بھی اسے پہنچے ۔ جس نے بچایا اور جمع کیا ہے ۔ بلکہ ایک طبقہ مالدار یا غنی ہے وہ بچاتا اور جمع کرتا ہے اور دوسرا طبقہ جو ضرورت مند ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور اس کی یہ کفالت نظام زکوٰۃ اور عشر کے ذریعے سے ہوتی ہے ۔ اسلام کے اخلاقی نظام کو تو تفصیل سے بیان کر دیا گیا اب آئیے اس کے فقہی اور قانونی نظام کی طرف جس میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔

حلال وحرام کی حدود

اسلام پہلی شرط حلال وحرام کی پاسداری کی عائد کرتا ہے تاکہ معاشرے میں یہ تمیز اٹھ جانے کے بعد جو طوفان بدتمیزی برپا ہوتا ہے اور انسانیت کی حیوانیت میں تبدیلی کا عمل شروع ہوتا ہے اس کا سدباب کیا جا سکے اس کے بعد ان اقدامات پر نظر ڈالیئے جو قرآن مجید اپنے معاشی نظام میں وضع کرتا ہے اور عش عش کیجئے لیکن یہ وضاحت بہرحال ضروری ہے ۔ کہ قرآن مجید معاشیات کی کتاب نہیں ہے کہ اس نے عنوانات قائم کرکے معاشی اصطلاحات پر بحث کی ہو اور ایک ایک نکتے کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہو لیکن کتاب ہدایت ہونے کی بنا پر قرآن مجید میں زندگی کے اس پہلو سے بھی رہنمائی کی گئی ہے ۔ قرآن مجید نے جو ہدایات دی ہیں ان سب کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ اسلام اپنے قانونی نظام میں بھی زیادہ سے زیادہ محنت پر انحصار کرتا اور سرمایہ کو کم از کم اہمیت دیتا ہے ۔ محنت اور سرمائے کے امتزاج سے معاشی ڈھانچہ کی تشکیل کو وہ تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن محض سرمائے کی بنیاد پر بغیر محنت کے کمائی کو وہ اچھا نہیں سمجھتا ۔ اس کے نزدیک اصل چیز محنت ہے سرمایہ نہیں مثلاً اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ کسی کاروبار میں صرف سرمایہ لگانے والا شخص منافع میں تو شریک ہو لیکن نقصان میں حصہ دار نہ ہو اور منافع کی بھی معین شرح لینے پر مصر ہو تو یہ ایک انتہا پسندانہ سطح ہے ۔ جس میں سرمایہ محض سرمائے کی حیثیت سے کمائی کا حقدار بنا ۔ اس مثال سے چارلو

پر ضائع ہو گیا۔ لیکن سرمایہ دار اس نقصان میں سے ایک پائی بھی برداشت کرنے کیلئے آمادہ نہیں اور خریدار کا خون چوس کو اپنے سرمائے کا تحفظ کرتا ہے یہ سرمایہ داروں کی امداد باہمی کا نظام ہے۔ جو اپنے سرمائے کا تحفظ کر رہے ہیں اس کی حرمت کا اسلام نے قطعی فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیا (۱)

ایک دائرہ اور بھی ہے جس میں بعض چیزیں حلال اور بعض حرام ہیں اور بعض وہ ہیں جنکی حلت درحرمت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان چیزوں کو ہم ایک ہی گروپ میں لاتے ہیں۔ ایک شخص محنت کر سکتا ہے۔ صحت مند اور محنتی ہے لیکن اس کے پاس سرمایہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس ایک دوسرا شخص ہے جسکے پاس سرمایہ موجود ہے یہ دونوں مل کر کاروبار کرتے ہیں ایک شخص سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا اس میں اپنی محنت شامل کرتا ہے۔ اس محنت اور سرمائے کے امتزاج کو مضاربت کہتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے لیکن ناپسندیدہ نہیں جسطرح طلاق جائز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ چیز۔ اسلام کا تقاضہ ہے کہ جس کے پاس صرف اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ اپنی ضرورت ہی پوری کر سکتا ہے تو وہ خود کاروبار کرے اور اپنی ضروریات پوری کرے لیکن اگر اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی موجود ہے مثلاً وہ ملازمت کرتا ہے تو اس کے پاس جو ضرورت سے زائد سرمایہ ہے۔ وہ اپنے مجبور بھائی کو دے دے۔ اور اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی محنت میں سے حصہ نہ بٹائے۔

مضاربت میں بھی یہ شرط رکھی گئی ہے کہ نقصان کا پورا بوجھ سرمائے پر پڑے گا اور محنت کش ایک پائی کے نقصان میں بھی شریک نہیں ہوگا۔ اسلام نے محنت کے تحفظ کو منافع کا جائز ذریعہ قرار دیا ہے۔ اس صورت میں وہی مضاربت جائز ہوگی جس میں نقصان کی پوری ذمہ داری سرمایہ فراہم کرنے والا شخص برداشت کرے اور منافع میں وہ محنت کش کے برابر ہو لیکن یہ وضاحت دوبارہ کر لی جائے کہ اسلام کے نزدیک یہ عمل بھی پسندیدہ نہیں۔ اس کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ اصل زائد سرمایہ رکھنے والا محض یہ سرمایہ کسی دوسرے ضرورت مند مسلمان بھائی کو بطور قرض حسنہ دے تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ اور اس کی خوشحالی، قومی خوشحالی میں حصہ دار بنے اس سے اجتماعی زندگی میں حسن پیدا ہوگا۔

کرنے کے مترادف ہے گویا ہمارے نظام شریعت میں بدترین بُرائی ربوا قرار
نظام سرمایہ داری میں سب سے زیادہ اہمیت ہی سرمائے اور اس کے تحفظ کو
اسلام نے اسے ربوا قرار دے کر اس کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی دوسری
یہ ہے جس میں سرمایہ مارکیٹ کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس کے اتار چڑھاؤ کا باعث
ہے۔ ایک شخص دس لاکھ روپے سے اپنی مالی حیثیت کا تعین کراتا ہے اس
سٹہ کھیلتا ہے۔ زبانی کلامی ہی خریدا اور بیچ دیا۔ لیا اور دیا، صرف اپنی مالی
کی بنا پر مارکیٹ میں اتار چڑھا پیدا کرتا ہے ورنہ حقیقت میں نہ کچھ لیتا ہے
دیتا ہے کبھی یکدم مال خرید کر قیمتیں چڑھا دیتا ہے اور کبھی مال ریلیز کر کے
گھٹا دیتا ہے۔ یہ سب سرمائے کا کھیل ہے۔ سرمایہ منڈی سے کھیل رہا ہو
کراچی سٹاک ایکسچینج میں یہ دلچسپ صورت حال دیکھی جا سکتی ہے
طور پر سودے ہو رہے ہیں نہ کچھ لینا اور نہ کچھ دینا پاگلوں کی طرح چیخ پکار
ہے اور پھر سیٹھوں، ساہوکاروں کو اطلاع دینے کے لئے دوڑتے ہیں یہ منڈی
چڑھاؤ ہو رہا ہوتا ہے اور سرمایہ داروں کا کھیل۔ اسی ضمن میں انشورنس آتی
سب چیزوں کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔ انشورنس میں دو پہلو ہیں جو حرمت
ہوئے ہیں ایک تو جوا ہے اور دوسرا سرمائے کے تحفظ کی ضمانت۔ اس بات
مثال سے سمجھئے۔

ایک شخص دس لاکھ روپے سے ماچس بنانے کا کارخانہ قائم کرتا ہے۔ اور دو
روپے کی انشورنس کراتا ہے اس کا سرمایہ آفات سماویہ کی زد میں ہے کوئی اتفاق
آگ یا سیلاب اس کارخانے کو تباہ کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے سرمائے کا تحفظ یو
ہے کہ اس کی انشورنس کراتا ہے اور دوسرا ظلم یہ کرتا ہے کہ یہ تحفظ اپنی جیب
ڈال کر حاصل نہیں کرتا بلکہ اس کا سالانہ پریمیم بھی جو وہ ادا کرتا ہے لاگت میں شما
ہے۔ ماچس کی ایک ڈبیہ پر وہ پریمیم کی لاگت ڈالتا ہے اور ضرورت مند سے ا
قیمت وصول کرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ اس کا سرمایہ محفوظ ہو جائے۔ کسی
کی صورت میں جہاں تک اجتماعی مفاد کا تعلق ہے کہ ہمارا ایک ملک ایک قوم
جس کے مادی مفادات مشترکہ ہیں۔ تباہی تو آگئی اور دس لاکھ روپے کا سرمایہ

گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اُس دور کے خاص حالات تھے۔ مصالح مرسلہ یا استحسان کے اصول کے تحت ایسی گنجائش نکالی گئی ورنہ حضور نے مزارعت پر لفظ ربوا استعمال کیا ہے۔ حضرت رافع بن خدیج کے بارے میں حضورؐ کو معلوم تھا کہ ان کے پاس کوئی زمین نہیں ہے آپ مدینہ منورہ سے باہر کہیں جا رہے تھے۔ دیکھا کہ رافع کھیت کے پاس کھڑے ہیں پوچھا تم یہاں کیسے؟ انہوں نے عرض کیا زمین فلاں کی ہے میں نے محنت کی ہے اور میرے اور اس کے مابین یہ شرح معین ہو گئی ہے تو حضور نے فرمایا۔ قد اربیتما (تم نے ربوا کا معاملہ کیا ہے) یہ زمین لوٹا دو جو کچھ اس پر تمہارا خرچ ہوا ہے وہ تم لے لو اس لئے کہ اس زمین میں اس کی کونسی محنت شامل ہے جس کا وہ معاوضہ لے رہا ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ زمین کا مالک ہے۔ وہ اپنے بھائی کی گاڑھے پسینے کی کمائی سے حصہ وصول کر رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کا یہ فتویٰ آنکھیں کھول دینے والا ہے اور ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ویسے تو یہاں ملک کی نوے فیصد آبادی حنفیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ایسے ایسے اہم معاملات میں امام ابوحنیفہ کا فتویٰ کوئی ماننے کے لئے تیار نہیں یا تو انہیں امام اعظم کہا اور مانا جاتا ہے۔ اور سید الفقہا بھی۔ لیکن جہاں ان کا فتویٰ اچھا نہیں لگتا اسے اٹھا پھینکنے اور دیوار پر دے مارنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ہماری دو عملی ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہیئے مضاربت اور مزارعت کو ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے۔

اب آیئے چوتھی صورت کی طرف اسلام میں جو مال موجود نہ ہو اس کے بیع کی جو شکل بھی ہوگی حرام ہوگی۔ یہ جتنے ایڈوانس سودے ہو رہے ہیں یہ تمام معاملات جس میں سرمایہ کھیلتا ہے ان سب کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔ بیع وہ ہے کہ مال موجود ہے اور قیمت ادا کر دی گئی یا دو چیزیں ہیں جن کا تبادلہ ہو گیا ایک ہاتھ سے دیا دوسرے سے لیا۔ یہ بیع ہے اور اس میں بھی (عن تراض منکم) باہمی رضامندی ضروری ہے اگر مجبوری سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اگر کہیں مصنوعی قلت کے ذریعے سے ریٹ بڑھا دیئے گئے ہیں اگر کہیں کوئی اور کھیل کھیلا گیا ہے تو اس میں حرمت کا پہلو شامل ہو جائے گا۔ ہمارے ہاں جو سودے بازی ہوتی ہے۔ زمین آپ نے ٹھیکے پر دی ہے اب چاہے کسان کو کچھ بچے نہ بچے آپ کا ٹھیکہ محفوظ ہے۔

اگر آپس کے معاملات مجبوری میں طے پائیں تو یہ حسن کہاں پیدا ہوگا قرآ
باہمی رضامندی سے مشروط کرتا ہے ۔

عن تراض منکم یعنی تمہاری رضامندی ۔

مثال کے طور پر آپ کو ایک جوتا خریدنا ہے آپ مارکیٹ میں
آپ کو اندازہ ہے کہ اس وقت ایک معیاری جوتے کی قیمت سو
آپ جب خریدتے ہیں تو اس میں کسی مجبوری کو دخل نہیں ہوتا ۔
کہ اس وقت لاگت اس قدر ہے ، اس پر منافع کی شرح اندازاً
رضامندی کا سودا ہے لیکن کوئی ایسا معاملہ جس میں کوئی شخص کسی
ایسا کر رہا ہو چاہے قانوناً یہ بات جائز ہو گئی کہ سرمایہ رکھنے والا شخ
صاحب ، وہ میرے پاس اپنی خوشی سے آیا ہے اور سرمایہ لے کر کا
کی صورت میں اس کے منافع میں مجھے شریک کرنے کی پیشکش کرتا ہے
مجبوری کو کوئی دخل نہیں ۔ کہنے کو تو یہ بات ہے لیکن حقیقتاً مجبوری کو
ہے ۔ اگر اس کے پاس سرمایہ موجود ہو تو وہ کسی کو اپنی خون پسینے کی
شریک کرے گا ۔ یہ مضاربت کی وہ شکل ہے جو حلال ہے لیکن اسلا
نہیں کرتا ۔

مزارعت

اس قبیل کی ایک چیز مزارعت بھی ہے ایک شخ
دوسرا اس پر محنت کرتا اس کی پیداوار میں
شریک کرتا ہے ۔ صنعتی انقلاب کے بعد مشین اور دوسری چیزوں
ذرائع پیداوار میں شامل ہو گئیں لیکن قدیم ترین ذریعۂ پیداوار زمین
کے بارے میں بقول علامہ اقبالؒ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے ۔

رزق خود را از زمین بردن رواست
ایں متاع بندہ و ملک خداست

مزارعت کے بارے میں ہمارے ہاں اختلاف ہے ۔ امام ابو
مطلق کہتے ہیں ۔ وہ کسی نوع کی مزارعت اور غیر حاضر زمینداری کو
دوسرا فقہائے نے احادیث پر ذرا غور کر کے کچھ ایسے پہلو نکالے

بات بہرحال بظاہر قابل قبول نہیں ہے۔ میں نے جب تشریح کی کہ یہاں کچھ لوگ دکانیں بنا کر بیٹھے ہیں، منڈی ہوتی ہے۔ ان کا اڈہ ہوتا ہے باہر سے لوگ جنہوں نے کاشت کی ہے اناج اور سبزیاں لے کر آتے ہیں۔ مختلف منڈیاں ہیں وہ ان کا مال فروخت کرتے ہیں۔ منڈی والے کمیشن لیتے ہیں۔ ان کا جواب تھا "یہ تو مطلقاً حرام ہے" اب اندازہ کیجئے کہ اس فیصلے کا بھی اطلاق ہے اس میں بھی لوگوں نے حلال کے بہت سے پہلو نکال لیئے کہ آڑھت کی وہ شکل بھی ہے لیکن اگر ایک طرفہ کمیشن لیا جائے تو وہ حرام نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ دوسری شکل ہو جاتی ہے گویا کہ وہ خریدار کی طرف سے وکیل بن گیا۔ جو وکالت کر کے اس کی طرف سے مال کا خریدار ہے اس طرح وہ اپنی اس وکالت کی اجرت لے رہا ہے۔ جس میں اس کیلئے حلت کا پہلو شامل ہو گیا ہے۔ اس تاویل میں بھی کسی بدنیتی کو دخل نہیں لیکن میں عرض کروں گا کہ جو چیز زمانے میں رواج پا جائے ہمارے ہاں فقہا نے اصول ایسے بنائے ہیں کہ جو عموم بلوی ہو کوئی چیز عام ہو گئی ہو یا زمانے کا ایک خاص نظم ہے اب اس کو بالکل ختم کرنا ممکن نہ ہو تو مصالح مرسلہ کہہ لیں یا استحسان، ایسی چیزوں کے بارے میں فقہا نے لوگوں کی آسانی کے لیئے گنجائش پیدا کی ہے۔ تو بہرحال اس کے اندر جو حلت کا پہلو نکالا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دو طرفہ آڑھت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ حرام مطلق ہے لیکن ہمارے ہاں اجناس سبزیوں اور گوشت کا جو کاروبار ہوتا ہے وہ اس دو طرفہ آڑھت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مثلاً گوشت کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو قصائی لوگ شور مچاتے ہیں کہ ساری مصیبت ان آڑھتیوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ جو اصل منہگائی کا باعث ہیں۔ اس میں خرابی درخرابی یہ ہے کہ آڑھتی اپنا سرمایہ ایڈوانس کرتا ہے اور وہ ایڈوانس کر کے پابند کرتا ہے کہ اپنا مال یہاں میرے پاس ہی فروخت کرو گے۔ یہ خالص ربوا ہے کہ اگر کسی نے کوئی رقم کسی کو دی اور اس رقم سے چاہے کوئی گن کر نقد معاوضہ نہیں لیا لیکن دوسرے کو اس کا پابند کیا وہ اپنا مال میرے پاس فروخت کرے گا۔ یہ درحقیقت ربوا ہے۔ یہ گندگی ہے یہ درحقیقت ظلمات بعضہا فوق بعض صلا ہے۔ بیع کے بارے میں ان حدود وقیود کا مرکزی نقطہ یہ

باغ میں ابھی پھل نہیں آیا اس کا سودا ہوگیا ہے۔ یہ سب حرام مطلق ہے۔ ہمارے دین میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ ادھار کی شکل میں صرف ایک سودا جائز ہے۔ جسے بیع سلم کہتے ہیں۔ دو چیزوں کا بالکل تعین ہوجائے اور ان میں سے ایک چیز کا ملاٹے دی جائے۔ یہ بیع سلم ہے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز فلاں وقت لے لونگا۔ اور یہ بیعانہ لے لیجئے۔ اگر وقت پر وہ چیز نہ دے سکا تو بیعانہ ہضم۔ اب یہ بیعانہ کس کھاتے میں ہضم ہو رہا ہے۔ وہ سودا تو پورا ہو نہیں پایا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت اس وجہ سے ہمارے ہاں رواج پاگئی ہیں کہ ہمارے ہاں شریعت کوئی ہئیت حاکمہ کی حیثیت سے ہے ہی نہیں۔ مارکیٹ میں جو رواج چلا وہ ہم نے اختیار کرلیا۔

اوور ٹریڈنگ

ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپے ہیں وہ اوور ٹریڈنگ میں پچاس لاکھ روپے کا مال لے لیتا ہے اسے ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ ہیں تو پانچ لاکھ کا سودا کر لیجئے۔ پانچ لاکھ اس وقت آپ کو دینا ہوگا۔ اس ادائیگی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ بیع کے ضمن میں بھی حدود قائم کر دی گئی ہیں۔ اور ان سب کا مقصد یہی ہے کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے اسی سلسلے میں میری زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

اسی لاہور کے ایک بڑے دار العلوم میں ایک صاحب سے ملنے گیا۔ عالم دین ہیں شیخ الحدیث ہیں، حدیث کا درس دے رہے تھے میں بھی بیٹھ گیا مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث ہے۔ جو کئی طرق سے آئی ہے۔ متن وہی ہے طریقے مختلف ہیں۔

لا یبیع الحاضر للبادی - کوئی کسی جگہ کا رہنے والا شخص باہر سے آنے والے مال کو فروخت نہ کرے۔ درس مکمل ہوگیا۔ موجودہ کاروبار کے بارے میں کوئی ریفرنس نہ آیا۔ ہمارے معاشرے میں بیع و شرا کے جو طریقے رائج ہیں اس پر کوئی بحث نہ ہوئی میں نے سوال کیا حضرت! ہمارے ہاں جو آڑھت کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں اس کا کیا حکم ہے۔ شیخ الحدیث نے جو جواب دیا وہ آپ بھی سنیئے اور تعجب بھی کیجئے۔ انہوں نے مجھ سے سوال کیا آڑھت کیا ہوتی ہے؟ اب یہ تجاہل عارفانہ تھا یا فی الواقع انہیں معلوم نہیں تھا۔ بہرحال میں تو نیت کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس دور میں شہر لاہور میں ایک شیخ الحدیث جانتے نہ ہوں کہ آڑھت کیا ہوتی ہے یہ

روپیہ ہے وہ اس دس ہزار کی گندم خرید کر بیچے ۔ لیکن اگر ایک شخص اڈہ بنا کر بیٹھ جائے اور اس اڈے کی بنا پر کماتا ہے تو یہ حرام ہے یہ حدود وہ ہیں جن سے سرمایہ کاری، سرمایہ داری نہیں بنتی ۔ سرمایہ کینسر بن کر مسلط نہیں ہوتا ۔ اس کے علاوہ کچھ اضافی اقدامات ہیں جو کچھ بھی مرتکز ہو گیا ہے اسے تقسیم کرنے کے لئے، گردش میں لانے کے لئے وراثت کے احکام ہیں ۔ اسلام کا رجحان ارتکاز دولت کی طرف نہیں بلکہ تقسیم کی طرف ہے ۔ اور وراثت اس میں ایک اہم رول ادا کرتی ہے ۔ اس طرح سے اس میں دو چیزیں مزید شامل کر لیجئے انسانی کمزوریوں کو ایکسپلائٹ کر کے کمانا ۔ جنس انسانی کی بہت بڑی کمزوری ہے ۔ اس کے اس جنسی جذبے کو مشتعل کر کے کمانا حرام مطلق قرار دیا گیا اور ہمارے ہاں فلم انڈسٹری کا کاروبار اس بنیاد پہ ہے اس لئے میں نے اس کو کمزوری کہا ہے قرآن مجید نے بھی شرمگاہ کیلئے لفظ فرج استعمال کیا ہے " اندیشے کی جگہ " فصیل میں جہاں دراڑیں پڑ جائیں ۔ جس سے ایک غنیم کو اندر آنے کا موقع مل سکتا ہے ۔ دشمن کو اندر گھسنے کا موقع مل سکتا ہے قرآن اس کو فرج سے تعبیر کرتا ہے ۔ کہ انسانی شخصیت کی فص[illegible] یں یہ سب سے بڑی اندیشے کی جگہ ہے ۔ اس کا یہ کمزور پہلو ہے ۔ یہاں سے اس پر بڑی جلدی حملہ کیا جا سکتا ہے ۔ شراب کی حرمت ۔ اور فحاشی کے کاروبار پہ قدغن کے بعد انسان اگر دولت، دولت کے لئے کماتا ہے تو اس میں ایک بہت بڑا عنصر اس کی عیاشی کرنے کی خواہش ہوتا ہے ۔ لیکن اسلام نے عیاشی کے دروازے بند کر دیئے ہیں ۔

اب ایک انسان سرمائے کو لے کر کیا کرے گا ۔ آخر وہ سرمایہ کاہے کے لئے ہے ۔ اس طریقے سے سرمائے کے ساتھ اٹیچمنٹ کم کر دیا گیا ہے ۔ اسلام نے سرمایہ داری پہ مختلف پہلوؤں اور اطراف سے حملے کیے ہیں اور ان سب کا حاصل یہ ہے کہ اس نے اپنے قانونی نظام میں پرائیوٹ اونرشپ کی صورت بھی برقرار رکھی ہے ۔ ذاتی دلچسپی کو بروئے کار لانے کا موقع دیا ہے ۔ کھلا بھی چھوڑ دیا ہے محنت کرو کوشش کرو بھاگ دوڑ کرو، کھیت میں خوب محنت سے ہل چلاؤ، پسینہ بہاؤ ۔ جو کچھ نکلے گا تمہارا ہے اس پہ کوئی ظلم اور جبر کے ساتھ قبضہ

جب کہ اسلام نے اپنے فقہی و قانونی نظام میں بھی ایسے اقدامات کیئے ہیں کہ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع نہ ملے۔

رومن امپائر کے عہد میں کرنسی ایجاد ہوتی ہے۔ انسان کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت اپنے سر مسلط کر رہا ہے۔ جب تک یہ کرنسی کا تصور نہیں تھا دنیا میں لین دین ہو رہے تھے۔ لیکن تبادلے کی بنیاد پر تھے اجناس کا تبادلہ تھا ایک شخص نے کھیت میں کام کیا ہے اس نے فصل پیدا کی دوسرا شخص کرگھے پر بیٹھا ہوا کھدر بنا رہا ہے۔ دونوں اپنی ضرورت کے مطابق تبادلہ کر لیتے۔ اس میں ہولڈنگ نہیں ہوتی وہ کتنی گندم اکھٹی کرے گا۔ لیکن جب سونے کو معین کر دیا گیا کہ ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے گز کپڑے کے، ایک تولہ سونا مساوی ہے اتنے من گندم کے۔ کرنسی کی لعنت درمیان میں آئی اب سرمایہ داری کا آغاز ہوا۔ آپ نے اپنی تجوری میں فرض کیجئے دس سیر سونا رکھا ہوا ہے۔ اب آپ کو موقع مل گیا آپ جس طرح چاہیں مارکیٹ سے کھیلیں جس طرح چاہیں اس کو اونچا نیچا کریں جس طرح چاہیں کنٹرول کریں یہ اس سرمائے کی لعنت ہے جس میں اصل چیز کرنسی ہے۔ اس کرنسی نے یہ سارے امکانات پیدا کیئے۔ سرمائے کی اپنی ایک فارم ہے جب کہ آج کل کی اصطلاح میں مکان اور انسانی محنت بھی سرمایہ ہے۔ لیکن انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والی فارم کرنسی ہے لہٰذا اس کرنسی نے یہ ساری مصیبتیں انسان پر لادی ہیں۔ ورنہ انسانی ضرورت آپس کے تبادلے سے پوری ہو سکتیں ہیں۔ اس میں خواہ مخواہ تعراف کا پہلو تلاش نہ کیا جائے تو یہ ایک حقیقت ہے کہ:۔ اشتراکی ممالک میں اس وقت جو معاشی نظام ہے۔ وہاں کمیونزمیں زیادہ تر معاملہ اس تبادلہ سسٹم سے ہوتا ہے وہ اپنی ساری معاشی ضروریات آپس کے تبادلے سے پوری کرتے ہیں۔ اور کرنسی کا عمل دخل کم سے کم ہے۔

انسان ٹھوکریں کھا کر وہاں پہنچ رہا ہے جہاں کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے اور اللہ تعالےٰ کی کتاب نے چودہ سو سال پہلے پہنچا دیا تھا۔ لاالطبیع الحاضر للبادی۔ ایک شخص نے گندم پیدا کی ہے وہ آکر خود بیچے اور اگر کسی کے پاس دس ہزار

اگر یہ فیصلہ نہ فرماتے تو اسلام کے ذریعے دنیا میں بدترین جاگیرداری نظام
بج ہو جاتا کیونکہ ان فوجیوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی قانون کے
سانچے میں بھی غربا کی مصلحت کو پیش نظر رکھا گیا ۔ بجائے سرمائے کے محنت کو
تحفظ دیا گیا کہ اگر کہیں نکتہ عدل بحال نہ رہے تو اسے نجی ملکیت سے نکال کر
ں تحویل میں لے لیا جائے ۔ اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں حضرت عمرؓ کا اجتہاد
متا ہوا سورج ہے ۔ اسلامی ریاست میں دونوں نظام علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے۔
یک وقت ہوتے ہیں اور اسلام کی برکات کا ظہور صرف قانونی نظام سے نہیں
پلنے کا ۔ جب تک کہ معاشرے میں کچھ لوگ ایسے موجود نہ ہوں جو ایمانی اور
عانی سطح پر زندگی بسر کریں کیونکہ معاشرے کی اقدار کو کنٹرول یہی لوگ
تے ہیں ۔ ہمارے معاشرے میں اصل قدر دولت اور سرمایہ ہے جس کے پاس
مت اور سرمایہ ہے اسے بڑے سے بڑا شخص جھک کر ملے گا ۔ لیکن روحانیت
علمبرداروں کے ہاں یہ بات نہیں ۔ وہ گودڑی پوش سلطان الہند نظام الدین
یا جو درویش ہیں اور گویا کہ اسلام کی ایمانی تعلیمات کا مظہر اتم مظہر کامل
ں ۔ انہیں دنیا کی کسی شے سے رغبت نہیں وہ دنیا کی کسی چیز کی ملکیت اختیار
کے فخر کرنے والے نہیں ۔ دن بھر کی ضرورت کے لئے دال روٹی اور ایک
ت سر چھپانے کے لئے ہے تو بس اس سے زیادہ کسی مزید چیز کے حصول
خواہش نہیں ۔ مال و زر کے انبار انہیں قطعاً متاثر نہیں کرتے جب تک
معاشرے میں ایسے لوگ موجود نہ ہوں جو اس اعلیٰ سطح پر زندگی بسر کرتے
ں ۔ اور وہ آیت ویسئلونک ماذا ینفقون ، قل العفو کا نمونہ نہ
جائیں ۔ معاشرے کی قانونی اقدامات سے اصلاح نہیں ہو سکتی ۔ اس لئے
اشرے میں ایک طبقہ ایسا موجود رہنا چاہیئے ۔ جس سے معاشرے میں اقدار
تعین ہوتا ہے ، جس سے وہ ایمانی حقیقت سامنے رہتی ہے ۔ کہ اصل مسند
اش کا نہیں معاد کا ہے ۔ اصل چیز دولت نہیں ، نیکی ہے ۔ عمل صالح ہے ، اللہ
مام ہے اور اس کے رسول کا اتباع اور ان کی محبت ہے یہ اقدار اگر معاشرے
ے روشنی کے یہ مینار بالفعل موجود نہ ہوں تو اسلام کی برکات کا کامل ظہور

نہیں کر سکے گا۔ اس میں سے جو حق معین ہے وہ دے دو۔ اس حق معین کے ذریعے تو کفالت عامہ کا بندوبست ہو گیا کہ HAVE اور HAVE NOT کی تقسیم زیادہ نہ بڑھنے پائے۔ اور کوئی بھی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ وہ نکتہ عدل ہے کہ آزادی بھی برقرار رہے اور مساوات بھی۔ اسکے علاوہ اسلام کے نظام میں یہ گنجائش بھی ہے۔ کہ اگر کسی موقع پر زکواۃ اور عشر کے ذریعے سے حاصل شدہ رقوم یا کفالت عامہ کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں۔ تو جبری ٹیکس وصول کرنے کا اختیار رہے۔ یعنی حق ملکیت کو بھی کسی طرح کا تقدس عطا نہیں کیا گیا۔ جو کسی سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتا ہے۔ بلکہ وہاں اس ریاست کو جو غربا اور مساکین کی کفیل ہے یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کی ضروریات کسی وقت اتنی بڑھ جائیں یا کوئی ایمرجنسی کی صورت ہو مثلاً جنگ شروع ہو گئی۔ قحط نے آلیا۔ اور صرف زکواۃ اور عشر سے کفالت عامہ کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو حکومت مزید بھی لے سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر کسی کاروبار کو پبلک سیکٹر میں دینے سے عدل کے تقاضے پورے نہیں ہوتے ریاست کو نیشنلائزیشن کی اجازت بھی ہے۔ کیونکہ اصل قدر عدل ہے۔ مثلاً اجارہ داری ہے۔ کسی چیز کا صرف ایک ہی کارخانہ ہے۔ اب مالک کے لئے یہ موقع ہے کہ وہ جو قیمت چاہے وصول کرے اور لوگ لینے پر مجبور ہیں۔ اس صورت میں چونکہ تقاضۂ عدل پورا نہیں ہوتا۔ اس صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی پوری پوری آزادی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں عراق کی زمینیں فتح ہوئی ہیں (یہ بات آپ کے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ عراق اور شام کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے) فتوحات کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ یہ زمینیں فوج میں تقسیم کر دی جائیں، اس لئے کہ یہ مال غنیمت ہے۔ اس پر تنازعے کی صورت پیدا ہوئی دونوں طرف سے دلائل دیئے گئے تو حضرت عمر کی اجتہادی بصیرت نے فیصلہ دیا کہ اس طرح عدل کے تقاضے پورے نہیں ہونگے۔ اس لئے یہ سب ریاست کی ملکیت ہونگی۔ اور اس پر کام کرنے والے موروثی مالکان کی حیثیت سے کام کرتے رہیں گے۔ البتہ اسلامی ریاست لگان وصول کرے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ

جمعرات کی شام کو ٹاؤن ہال لاہور میں بیٹھے ہوئے مجھے یہ واقعہ اس وقت معاً یاد آیا جب کہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تقریر میں جس کی اڑان ہیں مجدد الف ثانیؒ سے لے کر دور حاضرہ کی تمام قابل شخصیات سمٹ آئی تھیں "تنظیم اسلامی" کے عنوان پر علوم و معارف کے دریا بہا رہے تھے۔ کم و بیش تین گھنٹے کی اس تقریر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب بلا لومۃ لائم احیائے دین کے لئے برصغیر کی تحریکوں پر عموماً اور پاکستان میں خصوصاً جس بے ساختگی، گھن گرج، تڑپ اور جوش سے تبصرہ کیا، اس پر اقبال کا یہ مصرع میرے شعور کی پہنائیوں میں دھڑکن پیدا کرتا رہا

ع : " ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک!"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مجدد الف ثانیؒ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد۔ علامہ اقبال۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی تک احیائے دین کے لئے ان سے متعلق تمام دھاروں کو نقطۂ عروج پر لاتے ہوئے آج پاکستان میں غلبہ اور اقامت دین کے لئے تاریخی لحاظ سے ہر ایک شخص کو کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب اُمت کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور چونکہ وہ طب کے ڈگری یافتہ بھی ہیں، اس لئے انہوں نے ماموریت کے مقام سے نہیں بلکہ ایک منادی کی حیثیت میں ہر شخص کو بقدر استطاعت اس مہتم بالشان مہم یعنی تحریک اقامت دین میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے ہر سننے والے پر یہ تاثر راسخ کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کو خدا کے منشاء کے مطابق تمام ادیان پر غالب کرنے کے لئے جس میں دُنیا کی بھی بھلائی ہے۔ پاکستان کے ایک ایک مسلمان کو فرقہ بندی سے الگ رہ کر قرآن کی تعلیم کو اپنی زندگی کا نمونہ بنانا چاہئے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس احساس سے سرشار لوگ ایک نظام میں منسلک ہو کر اپنے آپ کو قرآن کی تعلیم اور اس کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نہ تو واعظ ہیں اور نہ ہی وہ "کمرشل" ہیں بلکہ وہ ایک ایسے انسان ہیں جنہوں نے دُنیا کی متاع پر لات مار کر اپنی عاقبت سنوارنے کے لئے اپنے دل سے ایک فیصلہ کر رکھا ہے۔ وہ اس دھن میں مست دن رات،

کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس بات کو ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت سے سامنے رکھیے۔ کہ یہ نقشہ بھی معاشرے میں موجود رہنا چاہیئے۔ ابوذر غفاری موجود رہنے چاہیں۔ اور ابوذر غفاری تو ایک انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ وہ فقرا صحابہ دا صحاب صفہ جو معاشرے کے اندر موجود تھے انتہائی مسکین روکھی سوکھی کھانے والے۔ جنہوں نے سب کچھ اللہ اور اس کے رسول کی راہ میں دے دیا تھا۔ حضرت ابو الدرداؓ مقداد حضرت انس بن مالک وغیرہ انہیں کے متعلق ہی حضورؐ نے فرمایا کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ چہرے غبار آلود۔ لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی بات پر خدا کی قسم کھا بیٹھیں تو خدا تعالےٰ ان کی قسموں کی لاج رکھے" یہ ہے ہمارے روحانی نظام کا ایک نقشہ۔ اگر یہ موجود نہ ہو تو قانونی نظام ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ حضور نے فرمایا جس نے مکہ کی زمین کا کرایہ لیا اس نے سود کھایا کیونکہ لوگ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ آنے پر مجبور ہیں۔ اب یہاں کے پروہت اور پنڈت ہزار ہزار روپے ایک چھوٹے سے کمرے کے چند دنوں کے لئے وصول کرتے ہیں۔ اور یہ سارا ان کے نزدیک حلال ہے اور عیش کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے۔ کہ یہ ساری دولت پہلے بیروت میں عیاشیوں اور فحاشیوں پر خرچ ہوتی تھی۔ اب لندن، پیرس اور امریکہ میں خرچ ہوتی ہے۔

اگر صرف قانونی حیلہ بازیوں پر اکتفا کیا جائے تو یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس لئے قانونی اور روحانی نظام کے حسین امتزاج سے ہی اسلام کا معاشی نظام ترتیب پاتا ہے۔ اور جہاں دو کی یکجائی ہو تب کسی نظام کو اسلام کا معاشی نظام کہا جا سکتا ہے۔ یہ ہیں چند نکات جن کی روشنی میں ایک اسلامی فلاحی معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ع گر یہ نہیں تو بابا سب کچھ کہانیاں ہیں۔

قرآن کا دستورِ اساسی

علامہ محمد تقی امینی

"دستورِ اساسی" سے مراد وہ اصول وضوابط اور قانونی تشریحات ہیں جن کے مطابق زندگی کی تعمیر ہوتی ہے، حکومت کی تشکیل ہوتی اور اس کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ قرآن حکیم اصلاً اصول وضوابط ہی کی کتاب ہے، قانونی تشریحات اس میں بہت کم ہیں لیکن جس قدر بھی ہیں وہ بطورِ "نمونہ" اصول وضوابط سے حاصل کردہ ہیں تاکہ ان کی روشنی میں نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لئے مزید قوانین حاصل کئے جاتے ہیں۔

یہ طریق کار اس "دستور" کے لئے ناگزیر ہے جس کی حیثیت دوامی اور عالمگیر ہو کیونکہ بیک وقت اگر زندگی ومعاشرہ سے متعلق قانون کی تفصیل بیان کردی جاتی یا حکومت کی عملی تشکیل کا خاکہ تیار کردیا جاتا تو وہ ایک دور اور زمانہ کے ساتھ مخصوص او محدود ہوکر رہ جاتا اور اس میں وہ جامعیت وجاذبیت نہ پیدا ہوتی جو نمو پذیر زندگی او ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کے لئے درکار ہے۔

"دستور" سے مزید قوانین حاصل کرنے کے لئے دو قسم کے شعور کی ضرورت ہے۔ (۱) شعورِ نبوّت اور (۲) شعورِ اجتہاد ——!!

شعورِ نبوّت سے مراد علم وحکمت کا نور اور فہم وادراک کا وہ کمال ہے جو نبوّت کے خلقی وجدان وداخلی شعور کا نتیجہ اور فیضانِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ شعورِ اجتہاد سے مرا علم وفہم کی وہ سطح یا ذہن وفکر کی وہ رسائی ہے جو عقلی بصارت وقلبی بصیرت کا نتیجہ او اخذ واستنباط کی صلاحیت کا ذریعہ ہے۔

ختمِ نبوّت پر شعورِ نبوّت کا سلسلہ ختم ہوگیا لیکن یہ اس وقت ختم ہوا جبکہ شعور اجتہ اس کی قائم مقامی کے قابل بن گیا۔ یعنی اس میں اس درجہ پختگی، توانائی اور خود اعتمادی پیب

صبح و شام، سردی اور گرمی، آرام اور بے آرامی، تحسین اور تردید سب کچھ سے بے نیاز ہو کر قرآن کے نور کو ہر سطح پر پھیلانے میں مصروف ہیں۔ انہیں اپنی علمیت پر کوئی ناز نہیں۔ انہیں کسی قسم کی ٹھیکے داری اور اجارہ داری سے غرض نہیں۔ وہ اپنے جنون، اپنے عشق اور وارفتگی میں اُمت کے تمام طبقوں اور فرقوں کو قرآن عظیم کے پیغام پر متحد اور مستفیض ہونے کے لئے کام کئے جاتے ہیں اور ہر اس شخص کا جو اس مقصد سے لگاؤ رکھتا ہو، کھلے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اُن کا لباس، اُن کی خوراک اور اُن کی رہائش ویسی ہی ہے جیسی کہ پاکستان کے کسی متوسط درجے کے فرد کو حاصل ہو۔ ان کی آواز میں اثر ہے، ان کی شخصیت میں کشش ہے، ان کی آنکھوں میں چمک ہے۔ وہ جناح ہال میں تین گھنٹے تک بلا تکان، بلا تکلف اپنی کہتے چلے گئے۔ نہ تو ان کا گلا بیٹھا اور نہ اُن پر تھکان کے کوئی آثار نمودار ہوئے اور جب جلسے کے اختتام پر انہوں نے نماز عشاء میں امامت کرتے ہوئے قرأت کی تو مقتدیوں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے

ہمیں یہ احساس نہیں کہ یورپ اور امریکہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں۔ وہاں پوپ سے لے کر بلی گراہم تک لاکھوں کی تعداد میں عیسائی مبلغین اپنے آپ کو عیسائیت کی تبلیغ کے لئے وقف کر چکے ہیں۔ کہنے کو تو یورپ اور امریکہ سیکولر ہیں لیکن اس سیکولرزم کے پردے میں مغربی ممالک

کی حکومتیں تثلیث کی اشاعت کے لئے مسلمانوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے اسلام کا مقابلہ کرنے کے لئے حیرت انگیز نظام مرتب کر لیا۔ اگر ہم فی الحال اپنے فقہی اختلافات کو ترک کر کے فرقہ واریت کو ختم نہیں کر سکتے تو ہمیں کم از کم رواداری سے کام لیتے ہوئے لوگوں کو اپنی اپنی صوابدید اور ذرائع کے مطابق اپنے اپنے میدان میں کام کرنے کی دل سے اجازت دینا چاہیئے۔ میرے خیال میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس ضرورت کی جیتی جاگتی تعبیر اور تفسیر ہیں۔ ان کے نمونہ پر اگر کام کیا جائے تو مسلم معاشرہ فرقہ داریت کی تلخیوں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔

زندگی ارتقاء پذیر ہے تو اس کو منظّم کرنے والے قوانین لازمی طور سے ارتقاء پذیر ہوں گے۔ لیکن دونوں کو آوارہ گردی سے بچانے کے لئے ارتقاء کی سمت اور شاہراہ کا تعین لازمی ہے کہ ان کے بغیر زندگی اور قانون کی حرکت صحیح سمت کی جانب متعین شاہراہ پر نہیں ہو سکتی۔ یہ اندازِ بیان نہ صرف حرکت درست رکھنے کا انتظام کرتا ہے بلکہ زندگی اور قانون کے درمیان ایسے ربط و تعلق کی نشاندہی کرتا ہے کہ دونوں کی حرکت ایک دوسرے کیلئے لازم بن جاتی ہے۔ اگر کسی زمانہ میں یہ تلازم نہ برقرار رہا اور زندگی اپنے ارتقائی مراحل میں قانون کو ساتھ رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی کی وہ شعوری سطح ابھی نمودار ہی نہیں جو اس کو قانونی ارتقاء پر مجبور کرے صرف چمک دمک دیکھ کر دھوکہ ہو رہا اور سراب پر پانی کا حکم لگایا جا رہا ہے۔

زندگی اور قانون کی حرکت اور دونوں کے درمیان تلازم کو سمجھنے کے لئے ختم نبوّت کے بعد وہ منظر دیکھنا مفید رہے گا کہ جب زندگی کو ایرانی تہذیب اور رومی تمدن سے سابقہ پڑا اور نئی نئی ضرورتیں اُبھر کر سامنے آئیں جن کی بنا پر قانون کی سادگی کو تمدن کی چاشنی کا رنگ دینا پڑا اور اس حد تک وسیع کرنا ناگزیر ہو گیا کہ "دستور" کی دوامی اور عالمگیر پوزیشن برقرار رہے۔ شعورِ نبوّت کے رمز شناسوں اور شعورِ اجتہاد کے قاموس نگاروں کو اللہ کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے کہ انہوں نے جس انداز سے اس چیلنج کو قبول کیا اور جس نیّت کے ساتھ قانون کے دامن کو وسیع کیا وہ قانونی تاریخ کا روشن باب ہے جو رہنمائی کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اگر خدانخواستہ ان پر جمود طاری ہوتا یا زندگی و قانون دونوں کے ایک ساتھ ارتقاء پر اُن کا ایمان نہ ہوتا تو قرآنی دستور صرف عرب میں محدود ہو کر رہ جاتا اور نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی دائمی رہنمائی کی صلاحیت ختم ہو جاتی۔ پھر آج وہ اس قابل ہی نہ رہتا کہ جرأت اور ہمّت اور دعویٰ کے ساتھ اس پر گفتگو کی جا سکے۔

قرآنِ حکیم میں "دستور" کی بنیاد فطرت پر قائم ہے جس کی حیثیت انکشافِ حقیقت کی ہے اور اس کے خیر و شر، جواہر و جراثیم اور طیّبات و خبائث کا فیصلہ قرآنِ حکیم میں موجود ہے۔ سماج پر اُس کی بنیاد قائم نہیں ہے کہ جس کے خیر و شر اور خوب و ناخوب کا فیصلہ سماج کرتا، اور اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک سماج اس کی اجازت دیتا ہے

ہوگئی کہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے اس کو بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہ رہ گئی (جیسا کہ ختمِ نبوت سے قبل رسول اور نبی کے ذریعے آسمانی ہدایت کا انتظار رہتا تھا) بلکہ وہ خود تلاش و جستجو اور غور و فکر سے یہ مسائل حل کرنے لگا۔

لیکن زندگی و معاشرہ کا تجربہ رکھنے والے ماہرین و مفکرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ شعور عقلی بصارت اور قلبی بصیرت کے فیصلے اور نتائج بشری خصوصیات اور کمزوریوں سے خالص اور بے آمیز نہیں ہوتے بلکہ طبعی حجابات اور وقتی حالات ان دونوں میں اس قدر پیوست ہیں کہ کلی طور پر ان کو کسی وقت جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی حالت میں لازمی طور سے شعور اجتہاد (جس کی تکوین میں دونوں کی آمیزش ہے) کے فیصلے اور نتائج نہ بالکلیہ خالص و بے آمیز ہوں گے۔ اور نہ زندگی و معاشرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے اس کو آزاد و خود مختار چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔ بلکہ ہر موڑ اور ہر موقف پر اس کے لئے بلند و برتر رہنما کی تلاش اور ضرورت ہوگی کہ جس کی رہنمائی میں حتی المقدور اپنے فیصلے اور نتائج میں نکھار پیدا کر سکے اور جس کا دامن عصمت اس کی تر دامنی کے لئے ذریعۂ نجات بن سکے!

یہ رہنما شعورِ نبوت ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس سے زیادہ کسی اور کے خالص اور بے آمیز ہونے کی ضمانت نہیں تھی۔ اس شعور سے رہنمائی حاصل کرنے کا براہِ راست سلسلہ اگرچہ ختم ہو گیا لیکن اس سے حاصل شدہ وہ علم و ادراک موجود ہے جو قرآن کی معنوی دلالت سے اخذ و استنباط کیا ہوا ہے اور جس کا اصطلاحی نام "حدیث" ہے۔ یہ نام بھی قرآن سے لیا گیا ہے۔

قرآنِ حکیم میں یہ "دستور" اور کتابوں کی طرح یکجا نہیں بیان کیا گیا بلکہ ایمانیات، اخلاقیات اور تاریخی واقعات وغیرہ کے ساتھ اس کو شامل کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآنی دستور کوئی منفرد شے نہیں بلکہ فکری و اخلاقی نظام کا ایک جزء ہے اور فلسفۂ تاریخ کی طاقت اس کی پشت پر ہے۔ جس نے تمام اجزاء کو حیاتیاتی تعلق کے ساتھ اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ کوئی جزء دوسرے سے جدائی کے بعد اپنی مطلوبہ افادیت نہیں برقرار رکھ سکتا۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ اندازِ بیان دستور کو مؤثر بنانے، ثبات و استحکام بخشنے، وحدت و یکسانیت برقرار رکھنے اور ماضی و حال میں گہرا ربط پیدا کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔

کے منتخب لوگوں میں نمبرِ اوّل پر رکھا ہے۔ اس ذاتِ گرامی کو مقامِ شہادت پر کھڑا کر دینا اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ آپ فہم و ادراک اور قول و عمل ہر لحاظ سے دنیا اور آخرت میں اس دستور کے شاہد ہیں۔

پھر آپ کے بعد آپ کی وراثت کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جنھوں نے آپ کی شہادت کو اپنی زندگی میں رچایا اور بسایا۔ ظاہر ہے کہ فرائضِ وراثت کی ذمّہ داری سے سبکدوشی صرف دستور کی ترجمانی سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے ہر دَور و زمانہ میں وہ تعبیر و تشریح اور اخذ و استنباط کی صلاحیت درکار ہے کہ جس کے ذریعے نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کا رشتہ اس سے منقطع نہ ہونے پائے۔

یہ زندگی اور معاشرہ جوہرِ انسانیت کی انہیں صلاحیتوں سے وجود میں آئے گا جن کی پختگی کے بعد "دستور" آیا ہے اس بناء پر زندگی اور معاشرہ کی ترقی سے جس قدر نئے جزئیات پیدا ہوں گی، ان کا اُصول و کلیات میں موجود ہونا لازمی ہے، صرف ان سے اخذ و استنباط کی ضرورت ہے۔

قرآنِ حکیم میں "دستور" کو کامل و مکمّل شکل میں پیش کیا گیا ہے کہ اب اس میں تبدیلی یا کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے تاریخِ انسانی کو دو حصّوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے:

(۱) قبلِ ختمِ نبوّت اور (۲)۔ بعدِ ختمِ نبوّت

قبلِ ختمِ نبوّت میں جوہرِ انسانیت کے قوی و خواص کی خامی و کمی بتدریج دُور کی جاتی رہی۔ اس لئے ہر قوم اور ہر گروہ میں رسولؑ و نبیؑ آتے رہے اور دستوری اجزاء کا تجزیہ کرتے رہے۔ اگر اس مرحلہ میں دستور کی تکمیل کر دی جاتی تو نہ صرف یہ کہ جوہرِ انسانیت کے قوی و خواص کو پختگی نہ میسّر آتی بلکہ موجودہ خامی و کمی کو استقرار اور جماؤ حاصل ہو جاتا۔ پھر خلافت اور قیادت کا وہ تصوّر نہ ابھرتا جو ختمِ نبوّت کے بعد ابھرا ہے۔

بعد ختمِ نبوّت میں پہلے والی خامی و کمی دُور کرنے کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب بلوغ و پختگی کے بعد قوی و خواص سے ابھرنے والی صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کا مرحلہ تھا جس کے لئے مختلف رسولوں اور نبیوں کا آتے رہنا یا دستور میں ردّ و بدل اور کمی بیشی کرتے رہنا دونوں سخت مضر تھے اس بناء پر صلاحیتوں کی ضابطہ بندی کے لحاظ سے

اس بناء پر زندگی اور قانون کے ارتقاء میں فطرت اور اس سے متعلق قرآنی فیصلوں کو نظر انداز نہ ہونے دینا چاہیئے۔ ورنہ زندگی خود زندگی سے گریزاں اور قانون آوارگی کا شکار ہو جائے گا۔

پھر یہ فطرت انسان کی فطرت ہے جس کو اللہ نے پیدا کیا اور اپنی خلافت اور کائنات کی قیادت کے عظیم منصب سے سرفراز فرمایا۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے اُس کی کشش اللہ کی طرف ہے، اور قائد ہونے کی حیثیت سے کائنات کی کشش اس کی طرف ہے۔ زندگی کے حالات و مساعدت میں اگر یہ کشش اور توازن برقرار نہ رہا تو پھر قانون اور زندگی کے درمیان رابطہ کا تعلق نہ پیدا ہو سکے گا۔ صرف ضابطہ کا تعلق رہ جائے گا جس کی بناء پر ظاہر و باطن میں یکساں قانون کی افادیت برقرار نہ رہ سکے گی

قرآنِ حکیم میں "دستور" کی ابتداء اس وقت سے بیان ہوئی ہے جب کہ انسان دُنیا میں خلافت و قیادت کے منصب پر سرفراز ہو کر آیا اور انتہاء اس وقت ذکر کی گئی ہے۔ جب کہ جوہر انسانیت کے قویٰ و خواص بلوغ کی حد میں داخل ہو گئے۔ اس اثناء میں دستور کے اجزاء کو مختلف مراحل سے گذارنے اور تجربہ کی کسوٹی پر کسنے کے لئے صدیوں کا نہیں بلکہ قرنوں کا موقع ملا ہے۔ ادھر جوہرِ انسانیت اس کی مدد سے رفتہ رفتہ اپنی خامی و کمی دور کرتا اور اپنی قوّت و توانائی میں اضافہ کرتا رہا، یہاں تک کہ اس قابل ہو گیا کہ وہ علم و حکمت کا متحمل ہو سکے۔ چنانچہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرائض منصبی میں تعلیم حکمت داخل کرنا خود اس بات کی قرآنی ضمانت ہے کہ اب جوہر انسانیت پختگی کے اس مرحلہ پر پہنچ گیا ہے کہ انسان کا شعور دستوری اجزاء کی غرض و غایت اور ان کے اسرار و رموز سے واقفیّت حاصل کر کے قانون و ارتقاء کو جاری رکھ سکے۔ اجتہاد کی بنیاد اسی حکمت پر قائم ہے جو ختم نبوّت کے بعد نمو پذیر زندگی اور ترقی پذیر معاشرہ کی رہنمائی کا واحد ذریعہ اور "دستور" کی تکمیل کا اہم باب ہے ــــــ!!

قرآنِ حکیم میں "دستور" پر شاہد افضل الرسل خاتم الانبیاء صلّی اللہ علیہ وسلّم کو بنایا گیا ہے۔ جن کے اثرات زندگی و معاشرہ پر ایسے ہی چھائے ہوئے ہیں جیسے ہر طرف آسمان چھایا ہوا نظر آتا ہے، اور جن کو موافق و مخالف سبھی نے تاریخ انسانی

منفی چارج کے تناسب میں تبدیلی رُونما ہوتی ہے۔ اسی طرح نورانی شعاعوں کے ڈالنے سے رسولؐ اور نبیؑ کے علمی و عملی ACTIVITY میں تبدیلی کی جاتی تھی جو جوہرِ انسانیت کے مثبت و منفی (نورانی و حیوانی بنیاد) چارج کے تناسب میں تبدیلی سے رونما ہوتی تھی لیکن اس تبدیلی اور نورانی شعاعوں کے ڈالنے کی بھی ایک حد مقرر ہے کہ اس کے بعد حیوانی بنیاد کے شعلے بجھ کر بشریت ختم ہو جاتی اور رسولؐ کی ذات دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ نہیں رہتی۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم میں یہ "حد" انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ اس کے بعد تکمیلِ انسانیت کا کوئی اور درجہ نہ رہ گیا تھا۔ اس بناء پر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کی ذاتِ گرامی ختمِ نبوّت کی مستحق تھی۔ تکمیلِ انسانیت کے بعد ہی تکمیلِ "دستور" کا یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا ہے:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط!"

مذکورہ مثال سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ "سائنس" جوہرِ انسانیت میں تبدیلی سے رسول اور نبی بنا سکتی ہے؟ کیونکہ جسمِ انسانی میں جس حد تک اُس کی رسائی ہوئی ہے، اسی میں کارگذاریاں اس کی حد درجہ محدود ہیں۔ مثلاً دماغی سیلوں کا "آرگنائزیشن" انسان میں یکساں نہیں ہوتا بلکہ پیدائشی طور پر مختلف ہوتا ہے (جس میں انسان کو کوئی دخل نہیں)، اس لئے برقی و مقناطیسی لہروں کے ڈالنے سے یکساں تبدیلیاں بھی نہیں کی جا سکتی ہیں۔ سائنس کی رسائی جوہرِ انسانیت تک ابھی نہیں ہو سکی۔ نورانی شعاعیں (جو اس پر ڈالی گئی تھیں) بھی اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ پھر رسولؐ اور نبیؑ کے جوہرِ انسانیت کا آرگنائزیشن دوسرے تمام انسانوں سے پیدائشی طور پر مختلف تھا اس لئے نورانی شعاعوں کے ڈالنے سے کسی اور انسان میں نہ ویسی تبدیلی کا سوال پیدا اور نہ تبدیلی کے نتیجے میں ویسی علمی و عملی ACTIVITY کے ظہور کی گنجائش نکلتی ہے۔ یہ مثال نبوّت و رسالت کو محض قریب الفہم بنانے کے لئے دی گئی ہے، کوئی اور تشبیہ مقصود نہیں ہے ــــــ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

افضل الرّسلؐ اور اس کے لائے ہوئے دستور کو بقاء و دوام کی سعادت سے نوازا گیا۔

جوہرِ انسانیت نورانی اور حیوانی بنیادوں کے امتزاج کے بعد وجود میں آتا ہے اور اسی میں خلافت و قیادت کی صلاحیت پوشیدہ ہے۔ یہ صلاحیت نہ تنہا نورانی بنیاد میں ہے اور نہ تنہا حیوانی بنیاد میں ہے بلکہ ان دونوں کے امتزاج میں ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوہرِ انسانیت میں نورانی وحیوانی بنیادوں کے درمیان "تجاذبی قوت" کی ایک حد مقرر ہے جو دونوں کی طبعی خصوصیات پر مبنی ہے۔ جس کے بعد اس مد میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا ورنہ خلافت و قیادت کی صلاحیتوں کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ جس طرح لوہے کے ٹکڑے میں خارجی مقناطیسی میدان کے ذریعہ لوہائی مقناطیسیت پیدا کرنے میں ایک حد ایسی آتی ہے کہ پیدا شدہ مقناطیسیت میں مزید اضافہ نہیں کیا جا سکتا، خواہ خارجی مقناطیسی میدان میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ کر دیا جائے۔

ختمِ نبوت کے بعد جو "دستور" دیا گیا وہ اس حد کے لحاظ سے نہایت جامع و کامل ہے کہ حد کو اپنی جگہ رکھتے ہوئے اس پر مزید اضافہ کی گنجائش نہیں اور "حد" کو بدل دینے میں خلافت و قیادت کا نظام درہم برہم ہوتا ہے اس لئے "دستور" کو آخری شکل دے کر نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا۔ اگر اس سلسلہ کو جاری رکھا جاتا تو ترقی کی وہ نوع نہ وجود میں آتی جو ختم ہونے کے بعد وجود میں آئی جیسا کہ ختمِ نبوت سے قبل کے حالات و واقعات سے ثابت ہے۔

رسولوں اور نبیوں کا جوہرِ انسانیت نورانی وحیوانی بنیادوں سے ترکیب پانے کے باوجود اس کا "آرگنائزیشن" ابتداء ہی سے اس نوع کے دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتا ہے پھر خارج سے نورانی شعاعوں کے ذریعے اس کو اتنی نورانی قوت پہنچا دی جاتی ہے کہ جوہرِ انسانیت کی نورانی وحیوانی بنیادوں کے تناسب میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور اس کے لحاظ سے علمی و عملی اکٹویٹی (ACTIVITY) میں تبدیلی ہوتی ہے۔

اس کی مثال ایسی سمجھئے کہ جس طرح برقی و مقناطیسی لہروں کے ڈالنے سے دماغی سیلوں کی برقی ACTIVITY میں تبدیلی کی جا سکتی ہے جو "سیل" کے مثبت و

اس کا جھکاؤ کس طرف ہے تاکہ اسلام کی کشتی ان طوفانوں کے تھپیڑوں سے محفوظ رہ کر دکھی انسانیت کو امن وسکون اور خوش حالی و رفاہیت کے ساحلِ مراد تک پہنچا سکے ——— !!

میرے تتبع کے مطابق قرآنِ حکیم میں چار محروم طبقات کا ذکر ملتا ہے مشاغل زندگی کے وسیع تر ہو جانے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ اب محروم طبقات کا شمار بڑھ گیا ہو۔ لیکن اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو نام کی تبدیلیوں سے قطعِ نظر سب کو ان چار کے ذیل میں لایا جا سکتا ہے اور ان کے متعلق قرآنِ حکیم کی دی ہوئی روشنی سے ہم دُور دُور تک اُجالا کر سکتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کا وہ فرمان جو حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بعثت کا مقصد ومدّعا واضح کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا ہماری ہمہ جہت رہنمائی کے لئے بس کرتا ہے۔ ہر ذوقِ سلیم رکھنے والا شخص سمجھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد صرف بنی اسرائیل ہی کے لئے نہ تھا بلکہ ہر دور کے پسے ہوئے طبقات کے بارے میں اس کو یہی مطلوب ومقصود ہے۔ فرمانِ خداوندی یہ ہے :-

" وَ نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ وَ نُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ " ! ترجمہ: ہم چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہماری زمین پر کمزور بنا دیا گیا تھا۔ ان پر احسان کریں، ان کو پیشوا بنائیں۔ انہیں ملک کے وارث بنائیں اور انہیں زمین میں اقتدار بخشیں۔ اس آیۂ کریمہ میں لفظ اُسْتُضْعِفُوْا بصیغۂ مجہول قابلِ غور ہے۔ مطلب یہ کہ ایسے سماجی سیاسی اور اقتصادی نظام رائج کئے گئے کہ کچھ لوگ کمزور، پس ماندہ اور زیردست بن کر رہ گئے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے پیغمبر کے ذریعے اس کی جگہ ایک ایسا نظام قائم کریں کہ کمزور طاقتور ہوں، انہیں ملک کے وسائل معیشت اور اقتدار میں حصہ ملے۔

آئیے ! اب ہم قرآن مجید کے اندر مذکور محروم طبقات کو ایک ایک کر کے لیتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ اس نے ان کے بارے میں کیا روش اختیار کی ہے۔

قرآنِ حکیم اور محروم طبقات

عورت : روزِ اوّل ہی سے مرد ایسی قوتیں اور صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا ہے کہ وہ کشمکشِ حیات میں جراُت مندانہ حصّہ لے سکتا اور حوادث ومشکلات ز... کا مقابلہ ...

قرآنِ حکیم اور محروم طبقات

مولانا محمد حسین میر

تمہیدی کلمات: صاحبِ صدر اور معزز سامعین!

مَیں نے اپنی گفتگو کے لئے جو موضوع منتخب کیا ہے وہ ہے "قرآنِ حکیم اور محروم طبقات" ممکن ہے یہ سنتے ہی معاً آپ کو یہ خیال آئے کہ مَیں قرآن حکیم کے حوالے سے آپ کے سامنے اسلام کا اقتصادی نظام پیش کرنے چلا ہوں ہرگز نہیں بلکہ قرآنِ حکیم کے مطالعہ کے دوران، ان طبقات کے بارے میں اس کا جو رویہ میرے سامنے آیا اور جس نے میرے ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑا، مَیں نے چاہا کہ اپنا وہ تأثر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ قرآنِ مجید کے مطابق ان محروم طبقات کی محرومیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ سیاسی بھی ہیں اور تہذیبی بھی، اقتصادی بھی اور سماجی بھی۔

قرآنِ حکیم کے اس رویّہ کی تصویرکشی سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ اسے ان سے کس قدر ہمدردی ہے اور وہ کس طرح ان کو اوپر اٹھانا چاہتا ہے سماجی یا اقتصادی لحاظ سے پسے ہوئے عوام اب اپنی موجودہ حالت پر قانع رہنے کے لئے تیار نہیں ان کے تیور بدل چکے ہیں، اور وہ ہر ایسے سماج یا اقتصادی نظام سے جس سے ان کی اس زبوں حالی کو استحکام اور دوام ملتا ہو، نہ صرف ٹکرا جانے پر آمادہ ہیں بلکہ اپنی سابقہ محرومیوں کا بدلہ بھی چکانا چاہتے ہیں۔ ساری دنیا میں اقتصاد و معیشت کی اس دَور میں غیر معمولی اہمیت سے اٹھنے والے طوفانوں میں ہمارا فرض ہے کہ ہم قرآنِ حکیم کی روشنی میں اپنی راہ متعین کریں اور دیکھیں کہ

ایک مرد جس تعداد میں چاہتا تھا، عورتیں اٹھا کر گھر میں ڈال لیتا تھا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ باپ کی منکوحات کا پورے کا پورا گلہ، سوائے حقیقی ماں کے بیٹوں کی طرف اسی طرح منتقل ہو جاتا تھا جس طرح اس کی دوسری جائداد، ڈھور ڈنگر وغیرہ۔ وہ جب چاہتا کسی عورت کو کچے دھاگے سے باندھ کر اپنے حرم میں لا ڈالتا اور جب چاہتا اُس دھاگے کو توڑ کر اسے پرے پھینک دیتا۔ عورت سے نہ جوڑتے وقت کوئی رائے لی جاتی نہ توڑتے وقت۔ رشتۂ ازدواج میں منسلک کر لینے کے بعد بھی اسے طرح طرح کے کچوکے دیئے جاتے۔ نکاح اور طلاق، پھر نکاح اور پھر طلاق کی صورت میں اُسے بار بار جھٹکے دیئے جاتے۔ اُس کیلئے مقرر کئے ہوئے مہر کو واپس لینے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کئے جاتے اور بعض دفعہ تو عورت کو کچھ پلے سے دے کر گلو خلاصی کرانی پڑتی۔ ایسے میں اس بات کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ عورت کا سماج پر بھی کوئی حق ہو اور معاملاتِ زندگی میں اس کی بھی کوئی آزادانہ رائے ہو۔

ظلم و ستم سے تپتے ہوئے اس انسانی صحرا میں، عورت حُسنِ سلوک اور شریفانہ برتاؤ کی پیاس سے تڑپ رہی تھی کہ قرآن حکیم اس کے لئے ابرِ رحمت بن کر برسا اور اس طرح برسا کہ اس کے برسائے ہوئے آبِ حیات سے نہ صرف اُس کی پیاس بجھ گئی بلکہ اس میں جان تازہ آگئی۔ قرآنِ حکیم نے مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ سُنو! "هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ" انسانی زندگی کی گاڑی کو رواں دواں رکھنے کے لئے عورت کا وجود تمہارے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا تمہارا ان کے لئے اور پھر اُن کے حقوق کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: " وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ " کہ بے شک عورت پر کچھ فرائض بھی ہیں لیکن اُس کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جو تم پر فرض ہیں۔ یہ معاملہ یک طرفہ نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کا قوام بنا ہے اور اس طرح انہیں ایک حد تک فوقیت حاصل ہے۔ مگر قوّام وہ ہوتا ہے جو کسی کے حقوق کا محافظ و نگران ہو جو انہیں قائم و بحال رکھے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ غاصب ظالم ہے، قوّام نہیں۔ پھر مردوں کو حکم دیا گیا کہ: "عَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ" کہ عورتوں کے ساتھ بھلے لوگوں کی طرح زندگی گذارو! اسی لئے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے: "خیرکم، خیرکم لاھلہ وانا خیرکم لاھلی" ——— !!!

زیادہ حوصلے کے ساتھ کرسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کارزارِ حیات میں ہمیشہ اسی کا کردار نمایاں رہا ہے جب کہ عورت کمزور اور منفعلانہ فطرت پر پیدا کی گئی ہے۔ اس لئے جدّ وجُہد زندگی میں وہ زیادہ تر پسِ پردہ ہی رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرد کے اندر احساسِ برتری نے سر اٹھایا اور وہ اپنے مقابلہ میں عورت کو حقیر اور کمتر تصوّر کرنے لگا۔ یہ احساس آہستہ آہستہ ترقّی کرتا چلا گیا اور نوبت بایں جا رسید کہ معاشرے میں عورت بالکل ہی بے وقار ہو کر رہ گئی، وہ خود بھی احساسِ کہتری میں مبتلا ہو گئی۔ اس کی یہ تحقیر اس قدر جڑ پکڑ گئی کہ رسم و روایت سے آگے بڑھ کر اس نے فلسفہ میں نظریے اور مذہب میں عقیدے کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ کوئی تو اسے سرے سے موجود ہی ماننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ کسی نے اس کو مرد کے جی بہلاوے کا صرف ایک کھلونا قرار دیا۔ کچھ نے اسے ناگزیر برائی سمجھ کر بادلِ ناخواستہ قبول کیا اور کچھ نے اسے ابنِ آدم کی تمام بدبختیوں کا ماخذ و منبع قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے مرد کی زندگی میں اس کی داسی بن کر رہنے اور اس کی موت پر اس کے ساتھ زندہ جل کر مر جانے کا حکم دیا گیا۔ ان حالات میں جبکہ اس کے نفسِ وجود ہی سے انکار کیا جا رہا تھا، کیسے ممکن تھا کہ اس کا ایک مستقل تشخص مانا جاتا، یا اس کے کچھ حقوق تسلیم کئے جاتے۔ عورت کے ساتھ یہ سلوک، اس وقت کے نام نہاد روشن خیال، تہذیب و تمدّن اور علم و دانش کے مرکز ممالک، مثلاً چین، روم، ہندوستان اور یونان وغیرہ میں روا رکھا جا رہا تھا تو عربوں کی اُجڈ اور جاہل قوم سے اس بارے میں کسی بہتر سلوک کی کیا توقّع کی جا سکتی تھی۔ ان کے معاشرے میں عورت کی جو دُرگت بن رہی تھی وہ تاریخ دان حضرات سے مخفی نہیں۔ اس کا درجہ معاشرتی لحاظ سے بے حد پست تھا۔ اس کی پیدائش خاندان کے لئے باعثِ ننگ تصوّر کی جاتی تھی۔ قرآن مجید کہتا ہے: واذا بشّر احدھم بما ضرب للرّحمٰن مثلاً ظلّ وجھہ مسودّاً وھو کظیم ٥ سفّاکی کی حد یہ ہے کہ اس عار سے بچنے کے لئے انہیں اپنے ہاتھوں زندہ گڑھوں میں دفن کر دیا جاتا تھا۔ قرآن مجید شہادت دیتا ہے:۔ وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ۔

عورتوں کے ساتھ وابستگی کے نکاح کے معروف طریقے کے علاوہ اور بھی کئی واہیات قسم کے طریقے رائج تھے۔ نکاح میں مردوں پر تعداد کی کوئی پابندی نہ تھی۔

اکہ وہ اپنے نومولود بچے کو دودھ پلانے کے لئے اسے مجبور کرسکے بلکہ اسے عورت کی
رضامندی پر چھوڑا اور ساتھ ہی اتنے عرصے کے لئے، عورت کے تمام اخراجات مرد پر ڈالے۔
چنانچہ حکم ہوتا ہے کہ: عَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ جدید
کہ مرنے والوں کی جائداد میں عورت کے، بیوی، بیٹی، بہن اور ماں ہونے کی حیثیت
سے باقاعدہ حصے مقرر کئے گئیں۔ آیۂ توریث کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نازل ہی صرف
عورتوں کے حقوق بیان کرنے کے لئے ہوئی ہے۔ مردوں کا ذکر تو صرف ضمناً آگیا ہے،
قرآن حکیم نے عورتوں کو یہ وہ حق دیا ہے جو اس وقت تو کوئی اور قوم کیا دیتی، ہمارے دور
کی بہت سی ترقی یافتہ اور مرد و زن کی مساوات کی علمبردار قوموں نے بھی نہیں دیا۔

قرآن حکیم نے طبقۂ نسواں کے متعلق اپنی روش کچھ اس طرح رکھی ہے کہ جہاں مر
دوں کی سیہ کاریوں کا ذکر نہایت تفصیل سے کرتا ہے، عورتوں کا ذکر اس طرح نہیں
کرتا۔ صرف ایک دو واقعات کا استثنا رہے، اگر کہیں کیا ہے تو مردوں کے ضمن میں۔
اللہ تعالیٰ کو ان کی خاطرداری و دلجوئی کا اتنا پاس ہے کہ مفسرین کی روایت کے مطابق
بعض آیات ان کی فرمائش و خواہش پر بصیغۂ تانیث نازل ہوئیں۔

قرآن مجید میں اگر کچھ سورتیں مردوں کے نام پر ہیں تو عورتوں کو بھی اس افتخار سے
محروم نہیں رکھا گیا بلکہ بعض سورتیں جیسے النساء اور مریم ان کے نام سے معنون کی
ہیں۔ حضرت خولہ بنت ثعلبہ بن مالک سے ان کے خاوند نے ظہار کیا تو قرآن مجید
سے اندازہ لگائیے کہ اس کا لہجہ ان کے بارے میں کتنا دھیما، محبت آمیز، ہمدردانہ
اور رحم و کرم سے لبریز ہے۔ جب کہ ان کے خاوند کے بارے میں کتنا تند و تلخ اور پُرعتاب
ہے۔ نبی علیہ السلام نے عربوں کے ذہنوں سے عورتوں کے متعلق اس تحقیر کو جو متوارث
چلی آتی تھی۔ نکالنے کے لئے ہی فرمایا تھا کہ مجھے تمہاری دنیا سے تین چیزیں محبوب ہیں نماز
خوشبو اور طبقۂ نسواں۔ آپ کو اس کمزور طبقے کے حقوق کا اس قدر اہتمام تھا کہ
حجۃ الوداع اور رحلت کے وقت بھی وصیت فرمائی کہ ان کے حقوق کا خیال رکھنا اور
ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

قرآن مجید نے انسانی معاشرے کے اس صدیوں سے پستے چلے آتے طبقے کو جو
حقوق دیئے، انہی کا نتیجہ تھا کہ عورتوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور وہ جو حیوان غیر ناطق

قرآنِ حکیم میں عائلی زندگی سے متعلق جتنی بھی ہدایات دی گئی ہیں، سب مردوں کو دی گئی ہیں، کیونکہ زیادتی انہی کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ان آیات کو غور سے پڑھا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ قرآنِ حکیم کس طرح عورتوں کے چھنے ہوئے حقوق انہیں واپس دلا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں اوّلین معاملہ نکاح کا ہے چنانچہ اس بارے میں بھی ان سے رائے لینے کا حکم دیا گیا۔ ایک مرد سے طلاق ہو جانے کے بعد عورت کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ــــ نہ کہ مردوں کی مرضی پر ــــ کہ وہ جہاں چاہے پہلے خاوند سے دوبارہ یا کہیں اور جائز طریقے سے شادی کرے۔ مردوں کو روکنے کا کوئی حق نہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے

(۱) "اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ۔"

(۲) ...."فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔"

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: لا تنکح الایم حتیٰ تستامر ولا تنکح البکر حتیٰ تستاذن ــــ مہر کو ان کا حق قرار دیا اور اسے حیلے بہانوں سے واپس لینے کو مروّت کے خلاف اور ایک قسم کی خست و دناءت قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا:

"لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا۔"

مردوں کو یہ تاکید بھی کی گئی کہ اگر انہیں اپنے ساتھ رکھنا ہے تو شریفانہ طریقے سے رکھو اور اگر علیحدہ کرنا بھی ہے تو نیکی و احسان کے ساتھ انہیں رخصت کرو، انہیں درمیان میں اِدھر لٹکتا ہوا نہ چھوڑو۔ امسکوھن بمعروف ... اَوْ سرحوھن باحسان۔ نکاح کی معروف صورت کے علاوہ، بدمعاشی پر مبنی باقی تمام صورتوں کو ممنوع قرار دے دیا اور کہا کہ: اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔

مردوں نے عورتوں کے جسموں کو آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور انہیں عصمت فروشی پر مجبور کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے سختی کے ساتھ اس سے منع کیا اور کہا کہ: لا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے: مهر البغی حرام ... س کا دروازہ بالکل بند کر دیا۔ قرآن حکیم نے طلاق کے بعد مرد کو یہ حق بھی نہیں

کیا جا رہا ہے۔ مگر عورت اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے، مرد کے اصل جذبات و محرّکات سے بے خبر اس بات پر خوش ہو رہی ہے کہ اسے مرد کے برابر حقوق مل گئے حالانکہ وہ اپنے حقوق سے آج بیسویں صدی میں بھی اسی طرح محروم ہے جس طرح چوتھی اور پانچویں صدی میں تھی۔ اسے تلخ حقیقت کا اس وقت سامنا کرنا پڑتا ہے جب وہ کسی معاملہ میں مرد کے سامنے اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرتی ہے یا مرد کی کسی خواہش نفس کے خلاف جاتی ہے چاہے وہ کتنی ہی سچائی پر کیوں نہ ہو۔ طلاق کی تلوار آج بھی اس کے سر پر بدستور لٹک رہی ہے۔ طلاق دینے کے غیر اسلامی طریقے آج بھی اس کی زندگی کو بدستور تلخ بنائے ہیں۔ اس کا حق مہر باندھنے کو تو کئی کئی لاکھ روپے باندھ لیا جاتا ہے مگر ملتی اسے ایک کوڑی بھی نہیں۔ جب تک وہ اپنے ساتھ مرد کی کئی پشتوں تک چلنے والا ساز و سامان لے کر نہ آئے، کوئی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ نئے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے چاروں طرف سے رقیبوں اور حریفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن میں گھر کر وہ اپنی زندگی کو گھن لگا لیتی ہے۔ جہاں تک حقِّ وراثت کا تعلق ہے، اس اسلامی ملک کے مسلمان باشندوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ یہ حق تو اسے کسی قیمت پر نہ لینے دیں گے۔ چنانچہ کہیں تو ان سے زبردستی اقرار نامے لکھوا لئے جاتے ہیں اور کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ سگے بھائی محض چند مرلے زمین کی خاطر اپنی بہنوں کو اپنے ہاتھوں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ اس طرح عورت آج بھی پاؤں کی جوتی ہے جب چاہا اُتار پھینکی۔ الغرض جاہلیّتِ اُولیٰ میں عورت کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا تھا، اگر آپ انصاف سے کام لیں گے تو محسوس کریں گے کہ وہی سلوک اس کے ساتھ جاہلیّتِ ثانیہ کے اس دَور میں کیا جا رہا ہے۔ حقوق کشی اور ظلم و ستم کی اس فضا میں ہماری عائلی زندگی میں کبھی امن و سکون نہیں آ سکتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں استحکام اور امن و سکون ہو تو ہمیں عورت کے وہ تمام حقوق اور عورت کا وہ مقام بحال کرنا ہوگا جو قرآنِ حکیم نے اُسے دیا ہے۔

یتیم | یتیم کسی معاشرے کا مستقل مظلوم طبقہ تو نہیں ہیں بلکہ باپ کے سایۂ شفقت سے محروم ہو کر بے سہارا ہو جانے کی وجہ سے عموماً ان کے لئے لوگ اپنے دلوں میں جذبۂ ترحّم محسوس کرتے ہیں تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ایسے سنگدل لوگ ہمیشہ موجود رہے ہیں جو اُن کی مضبوط پشت و پناہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا استحصال کرتے

بن کر رہ گئی تھیں۔ اب عمرؓ جیسے مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات
لگیں، اور جب انہیں اس پر تعجب ہوا تو انہوں نے ازواج مطہرات اور حضؐ
حوالہ دیا اور پھر وقت بھی آیا کہ ایک خاتون نے حضرت عمرؓ جیسے باہیبت خلیفہ
ٹوک دیا کہ جب ہمارے خدا نے ہمارے مہر کی کوئی حد مقرر نہیں کی تو تم کو اس کا
ہے ؟ اور انہیں اس عورت کے سامنے گردن ڈال دینا پڑی اور اپنا حکم واپس
وہ اُمورِ سلطنت میں عورتوں سے مشورے لیا کرتے تھے اور حضرت شفا بنت
کو اشیائے صرف کی قیمتوں پر کنٹرول کا کام سپرد کر رکھا تھا۔ عورتیں مختلف کام
اپنی روزی کماتی تھیں۔ قرآنِ حکیم نے عورتوں کو گواہی کا حق دیا ہے۔ ظاہر
گواہی واقعاتِ زندگی میں شرکت یا ان کے مشاہدے کے بعد ہی دی جا سکتی
میں سمجھتا ہوں کہ اسلام میں پردے کا حکم بھی عورت کے تحفظ اور اس کا
کو قائم رکھنے کے لیے دیا گیا ہے ۔ اسلام کو ان کا تقدس اس قدر عزیز ہے
نہیں چاہتا کہ کسی کی گناہ آلود نگاہیں اس پر پڑیں۔ اس طرح یہ حکم کسی ناروا پا
بجائے اس کے حقِ احترام و اکرام کی ذیل میں آتا ہے۔

ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ یہ تم نے کیا بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔ اب تو
راج ہے اور مرد ان کا پانی بھرتے ہیں۔ یہ صورتِ حال کا صرف سطحی مطالعہ ہے
غائر جائزہ لیا جائے تو عورت اب بھی مظلوم ہے۔ بے شک اسے بہترین لباس اور
خوراک مہیا کی جائے گی، اس کے رنگ روغن کے لئے مسالہ بھی مہیا کر دیا جائے گا
کار میں بٹھا کر یا انگلی سے لگا کر سڑکوں اور پارکوں میں چہل قدمی بھی کرائی جائے
اگر آپ غور سے مطالعہ کریں گے تو محسوس کریں گے کہ مرد اس طرح صرف اپنی آزا
ترقی پسندی اور سب سے زیادہ اپنی دولت مندی کا اظہار کر رہا ہے اور عورت کو صرف
گڑیا کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مرد اپنے سارے کاروبار
دینے کے لئے اسے استعمال کر رہا ہے۔ ہمارے اخبارات، ہمارے رسائل ہما
ہمارا ادب غرض کوئی ایسا شعبۂ حیات نہیں، جس میں عورت کو استعمال نہ کیا
یہ مقابلہ ہائے حسن، یہ سماجی تقریبات، یہ ریڈیو اور فلم پر نسوانی آواز اور تصو
مرد کی ہوس کا روا ہے کے مظاہر ہیں۔ عورت کو اپنے جذبات کی تسکین کے لئے مرد

محسوس کرتے رہیں گے اور ایک شدید احساسِ تنہائی انہیں ہر لمحہ اندر سے کاٹتا رہے گا۔ اس امر کے سدِّباب کے لئے قرآنِ حکیم نے یہ انتظام کیا کہ مسلمانوں کو پہلی بیویوں کی موجودگی میں یتیم بچّوں کی ماؤں کے ساتھ شادی کرنے کی اجازت دے دی تاکہ ایک طرف وہ ایک خاندان سے وابستہ ہو کر احساسِ تنہائی و بےکسی سے نجات پا سکیں اور دوسری طرف ان کی مائیں اپنے نئے خاوندوں سے انہیں شفقتِ پدری دلا سکیں۔ چنانچہ فرمایا کہ:

"وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ۔

ہوتا یہ تھا کہ اگر کوئی یتیم بچّی کسی کھاتے پیتے باپ کی بیٹی ہے اور اس نے ورثہ میں کافی جائداد پائی ہے تو حریص ورثا اسے اس بات کی اجازت نہ دیتے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے کسی دوسرے گھرانے میں شادی کرلے کہ کہیں اس کی جائداد ادھر منتقل نہ ہو جائے یا اسے زبردستی اس کی مرضی کے برخلاف اپنے خاندان کے کسی فرد سے نتھی کر دیتے تاکہ وہ جائداد انہیں کے پاس رہ جائے اور انہیں مہر وغیرہ دینے کی زحمت بھی نہ اٹھانا پڑے۔ ان تمام زیادتیوں سے یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ:

اَللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ۔

سنگدل قسم کے رشتہ داروں کے لئے سب سے مرغوب صورت یہ ہے کہ یتیم کی خیرخواہی کے نام پر اس کے مال کو اپنے مال میں ملا کر کاروبار میں لگایا جائے۔ اور اس آڑ میں آہستہ آہستہ اس کے مال کو ہضم کر لیا جائے۔ خسارے یا کثیر اخراجات کا بہانہ بنا کر اس کی جائداد کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو یہ فرمایا کہ وہ تمہارے بھائی بند ہیں۔ اگر نیک نیتی سے انہیں اپنے ساتھ ملاؤ گے تو یہ اپنے ہی بھائیوں کی بھلائی اور خیرخواہی ہوگی۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کی تمہاری نیتوں پر پوری طرح نگاہ ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کون ان یتیموں کے حالات کو سدھارنا چاہتا ہے اور کون اُن کا مال اُڑانا چاہتا ہے۔ اس کی پکڑ سے ڈرو، اُن کے مال کو کھانا گویا اپنے پیٹ میں جہنم کے قطعے بھر رہا ہے۔ (۱) وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا

رہے ہیں اور ان پر ظلم وستم توڑنے سے نہیں چوکتے۔ ناممکن تھا کہ مظلوموں اور محروموں کا حامی ' قرآن ' ان کے بارے خاموش رہتا۔

۱- اس نے سب سے پہلے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اپنی یتیمی یاد دلائی اور بتایا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو یتیمی کی بے سروسامانی کی حالت سے نکال کر اپنے پاؤں پر کھڑا کیا، پھر معاً یہ نصیحت کی کہ جب تمھیں اپنے ذاتی تجربے سے معلوم ہے کہ ایک یتیم بچہ کس طرح اس بھری دُنیا میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا اور بے سہارا محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل میں کتنے ہی ارمان اٹھتے اور ڈوب جاتے ہیں مگر کوئی ان کو پورا کرنے والا نہیں ہوتا۔ ناز و نیاز کی کتنی ہی کیفیتیں اس کے ننھے دل پر گذرتی ہیں مگر اُن کے اظہار کے لئے اسے کوئی شفقت بھری ناز بردار گود میسّر نہیں آتی۔ وہ چلنا چاہتا ہے تو کوئی اس کی انگلی پکڑنے والا نہیں ہوتا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گرتا ہے تو کوئی اسے اٹھانے والا نہیں ہوتا۔ اس لئے کسی یتیم پر سختی کر کے اس کے آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ پہنچانا : اَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ۔ خود مہبطِ وحی کو مخاطب کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اُمّت اس کی اہمیّت کو سمجھ لے۔ اسی پر بس نہیں قرآنِ حکیم تو یہ چاہتا ہے کہ ان کی بے کسی کی وجہ سے ہمارے دلوں میں ان کے متعلق استخفاف و استصغار پیدا نہ ہونے پائے۔ بلکہ اس کی جگہ ان کے لئے دلوں میں جذبۂ اکرام و احترام ہو اور جو لوگ انہیں حقیر سمجھتے ہیں انہیں عذابِ الیم میں ڈالتے ہوئے کہا جائے گا کہ تم یتیموں کا اکرام نہیں کرتے تھے : "بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ "!

۲- پھر ان بے سہارا اور بے وسیلہ یتیموں کی ضروریاتِ معاش مہیّا کرنے کو بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ I- فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ۝ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ -

II- وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى -

۳- زکوٰۃ و صدقات کے مصارف میں یتیموں کو ایک اہم مصرف قرار دیا تاکہ سماج یا حکومت ان کی کفالت اپنے ذمّے لے سکے۔

چند خدا ترس ' خوشحال لوگ آسانی سے یتیموں کی ضروریاتِ معاش تو شاید مہیّا کر دیں لیکن جب تک اُن کو سماج میں اہمیّت نہ دی جائے وہ اپنے آپ کو اس سے کٹا ہوا

حالتِ زار کے مناظر شب و روز عام دیکھنے میں آتے ہوں، مَیں نہیں سمجھتا کہ اس ملک کے باشندے کس منہ سے اپنے آپ کو ایک اسلامی ملک کے باشندے کہلاتے ہیں اور اپنے آپ کو قرآنِ پاک کے حامل تصوّر کرتے ہیں۔

غلام آج تو شاید یہ لفظ ایک متمدّن معاشرے کے لئے غیر مانوس بلکہ ناقابلِ برداشت ہو، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ کا ایک دَور ایسا بھی گزرا ہے (اور اسے گزرے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا) کہ یہ طبقہ نہ صرف موجود تھا بلکہ محروم و مظلوم ترین طبقہ تھا۔ بہت سے نام نہاد فلسفوں اور مذاہب نے اسے ایک ناگزیر ضرورت قرار دیا تھا۔ ہر ملک، ہر مذہب اور ہر معاشرے میں غلام نہ صرف موجود تھے بلکہ ان کا مال مویشی کی طرح وسیع پیمانے پر کاروبار ہوتا تھا۔ یہودیوں اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں مختلف وجوہات کی بنا پر کسی بھی شخص کو غلام بنایا جا سکتا تھا۔ الغرض انسانی معاشرہ کے اس طبقہ کی دُنیا پر چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ لیکن آفتابِ جہاں تابِ اسلام کے طلوع ہوتے ہی یہ تاریکیاں چھٹنے لگیں۔ قرآنِ حکیم نے چھوٹتے ہی اعلان کر دیا کہ: اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى .... اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ۔ کہ تمام انسان چاہے ان کی رنگتیں، بولیاں اور قومیتیں کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ایک ہی مرد اور عورت کی اولاد ہیں۔ لہٰذا انسانیت کے ناطے سے سب برابر ہیں۔ غلام ہونے سے کوئی آدمی چھوٹا اور آزاد ہونے سے کوئی آدمی بڑا نہیں ہو جاتا۔ بڑا وہ ہے جس کا کردار بڑا ہے۔ قرآن کا یہ پہلا کڑکا تھا، جس نے ذہنوں میں گڑے ہوئے مولائی و آقائی کے پہاڑوں کو خاشعًا متصدّعًا کر دیا۔ اور پھر اُسی کی صدائے بازگشت تھی حاملِ قرآن صلّی اللہ علیہ وسلّم کا وہ اعلان جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سارے جاہلی امتیازات کی نفی کرتے ہوئے فرمایا کہ: کلکم بنو ادم و آدم من تراب۔ قرآن اور حاملِ قرآن کی دی ہوئی اکرام انسانیت کی یہی تعلیم تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ایک عظیم قریشی گورنر کو ڈانٹتے ہوئے پوچھتے ہیں: متی استعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارًا۔

قرآنِ حکیم نے صرف اس اعلان اور تعلیم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ معاشرے میں پہلے سے موجود اس لعنت کو دور کرنے کے لئے مختلف اقدامات کئے۔ چنانچہ سب سے

لَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ یَّكْبَرُوْا۔

(۲) اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُ
نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا۔

ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ جب تک تمہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ اپنے نقصان کو سمجھنے لگے ہیں اور اُن میں اپنا کاروبارِ معاش خود چلانے کی صلاحیت ہے اس وقت تک اُن کا سرمایہ اُن کے حوالے نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ نادانی سرمایہ تباہ کر لیں اور پھر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو جائیں۔ قرآنِ حکیم کو اُن کے سرمایہ کے تحفظ کا اس قدر اہتمام ہے اور اُن کے مستقبل کی اتنی فکر ہے کہ وہ سرپرست اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ اُن کے مال کے تحفظ و فروغ کی وجہ سے اسے اتنا وقت نہ ملے کہ وہ اپنی روزی کما سکے تو وہ بقدرِ ضرورت و کفایت اُن مال میں سے استعمال کر سکتا ہے:

(۱) وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّ
..... وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ
فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ۔

(۲) مَنْ كَانَ غَنِیًّا فَلْیَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِیْرًا فَلْیَاْكُلْ بِا

تعجب ہے کہ مسلمانوں کی آسمانی کتاب کو تو یتیموں کی فلاح و بہبود کا اہتمام ہو لیکن خود مسلمانوں کے معاشرے میں ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو تو اُن سفاک لوگوں کی ستم رانیوں کا شکار ہیں جو اُن کی جائداد کو ہضم کر جائیں یا وہ ڈاکوؤں، چوروں، جیب کتروں اور دوسرے سماج دشمن عناصر کی صحبت میں پڑ کر امن و امان کا مسئلہ بنے رہیں یا کچھ عیار لوگ اُن کے نام پر ہاتھ پھیلا کر بسوں اور گاڑیوں میں اُن سے بھیک منگواتے رہیں۔ سارے ملک میں معتد بہ تعداد میں ایسے سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نہ ہوں جہاں وہ اپنی صلاحیت کے مطابق نچلی سے اونچی تعلیم اور اعلیٰ سے اعلیٰ ہنر حاصل کر سکیں اور ہر لحاظ سے ایسا مقام حاصل کر لیں کہ سہاروں والے بھی ان پر رشک کریں

مشرک مرد اور عورت چاہے وہ ظاہری اور مادی لحاظ سے کتنے ہی پُرکشش کیوں نہ ہو، کے مقابلے میں مومن غلام یا کنیز کو بہتر اور افضل قرار دے کر ان سے مسلمانوں کو نکاح کرنے کی ترغیب دی اور اس طرح اس معاشرتی دیوار میں شگاف ڈال دیا جو آزاد اور غلام کے درمیان حائل تھی۔ اس سلسلے کی درخشاں مثال رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس طرح پیش کی کہ قریش کے او نچے گھرانے کی ایک عورت — حضرت زینبؓ — کا نکاح اپنے ایک سابق غلام حضرت زیدؓ سے کر دیا اور اس سلسلہ میں اٹھنے والے طوفانِ طعن و تشنیع کی قطعاً پرواہ نہ کی۔ اس کے بعد یہ باب ایسا وا ہوا کہ غلاموں کے حوصلے بلند ہوئے اور انہوں نے بلا حجاب قریش کے اعلیٰ خاندانوں میں نکاح کے پیغام دیئے اور وہ قبول ہوئے۔

قرآنِ حکیم کی پیدا کردہ احترام انسانیت کی یہی وہ روح تھی جس کے پیشِ نظر حضورؐ نے غلاموں کے لئے عبد اور اُن کے مالکوں کے لئے مولیٰ اور ربّ کے الفاظ کا استعمال ممنوع قرار دے دیا اور اُن سے حسنِ سلوک کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

"هم اخوانکم جعلهم الله تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت ایدیه فلیطعمه مما یاکل ولیلبسه مما یلبس ولا یکلفه ما یغلبه فان کان مما یغلبه فلیعنه —

مَیں اس فرمانِ نبوی کا ترجمہ کئے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہتا تاکہ عربی نہ جاننے والے بھی اس کا مفہوم سمجھ لیں اور دیکھیں کہ اسلام کی تعلیم کتنی بلند ہے اور کس بے دردی سے ہم نے اس کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ حضورؐ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ غلام (کوئی گھٹیا مخلوق نہیں بلکہ) تمھارے ہی بھائی بند ہیں جنھیں اللہ نے تمہارا زیردست بنا دیا ہے پس تم میں سے جس کے ماتحت کوئی ایسا انسان ہو اسے چاہیئے کہ اسے اسی کھانے میں سے کھلائے جو وہ خود کھا رہا ہے اور اسی قسم کا لباس پہنائے جو وہ خود پہن رہا ہے اور اس پر کام کا اتنا بار نہ ڈالے جس کے تلے وہ دب کر رہ جائے۔ اگر سوئے اتفاق سے ایسا کوئی کام دے دیا ہے تو پھر خود بھی اس کا ہاتھ بٹائے۔ پیغمبرِ اسلام کی اس تعلیم پر تو سر دھنیئے مگر ان کے نام لیواؤں کے طرزِ عمل پر اپنا سر پیٹ لیجئے۔

قرآنِ حکیم اور حاملِ قرآن کی اس تعلیم ہی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے اسلاف نے غلاموں کو

پہلے تو قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ سارے قرآن میں کسی کو غلام بنانے کا کہیں حکم نہیں دیا گیا اور نہ ہی اس کی کوئی صورت بتائی گئی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ہر انسان کو فطرۃً آزاد تسلیم کرتا ہے اور اُن کی غلامی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ کفار سے جنگ کے نتیجے میں قیدیوں کو غلام بنانے کی ایک صورت اگرچہ اسلام میں ناگزیر حالات کی وجہ سے معمول بہا رہی ہے۔ مگر قرآن حکیم نے اس کی صراحت نہ کر کے اور اس کے بارے میں بھی سکوت اختیار کر کے اپنا منشاء ظاہر کر دیا ہے کہ بہر حال یہ صورت اسے مرغوب و محبوب نہیں۔ ان اقدامات میں سے ایک اقدام یہ بھی تھا کہ غلام کو آزاد کرنا ایک بہت بڑی نیکی قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا کہ:۔
فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَ مَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ ۔ اس ترغیب کا نتیجہ یہ ہوا کہ نبی علیہ السلام اور آپ کے صحابہؓ نے بے شمار غلام لوگوں سے خرید خرید کر آزاد کرنے شروع کر دیئے۔ دوسرا اقدام یہ کیا کہ جنگ میں قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احساناً (بلا معاوضہ) چھوڑنے کا حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جنگوں میں حضورؐ نے قیدیوں کو غلام بنائے رکھنے کی بجائے آزاد کر دیا۔ ارشادِ خداوندی ہے: حتّٰی اذا اثخنتموھم فشدّوا الوثاق فامّا منًّا بعد وامّا فداءً۔ اگر کوئی شخص اپنے غلام کو فی سبیل اللہ آزاد نہیں کر سکتا اور غلام کے پاس اپنی قیمت ادا کرنے کے لئے رقم موجود ہے یا وہ اس کا انتظام کر سکتا ہے تو مالک کو اسے قیمت لے کر آزاد کرنے کا حکم دیا۔ اسے اسلام کی اصطلاح میں مکاتبت کہتے ہیں۔ قرآن مجید کا حکم ہے:

"وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۔"

قسم، ظہار، قتل عمد اور قتل خطا وغیرہ جرائم کا ایک کفارہ یہ بھی مقرر کیا کہ غلام آزاد کئے جائیں۔ دوسرے مذاہب کے برخلاف آزاد انسانوں کے مقابلہ میں غلاموں کے لئے جرائم کی سزائیں نصف کی حد تک کم رکھیں اور اُن کے فرائض میں بھی تخفیف کر دی۔ یہ رویّہ اسلام کے اس جذبۂ ترحم و شفقت کا پتہ دیتا ہے جو وہ غلاموں کے متعلق اپنے اندر رکھتا ہے۔ مصارفِ زکوٰۃ کی ایک مدّ غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے مخصوص کر دی اور اس طرح غلاموں کی آزادی کو حکومت یا پورے معاشرہ کی ذمہ داری بنا دیا۔

ہمارے ماتحت کر دیا - کاش ! ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا فرمان سے روشنی حاصل کریں، اُسے اپنا اُسوہ بنائیں- اگر ہمارے دلوں میں قرآنِ حکیم کی تعلیم کا کچھ بھی پاس ہے اور ہمارے نزدیک اُسوۂ رسولؐ کی کچھ بھی اہمیت ہے تو ہمیں چاہیئے کہ ہم ان لوگوں کے مشاہرے، معاوضے اور شرائطِ کار و ملازمت طے کرتے وقت اس فرمانِ نبویؐ کو مشعلِ راہ بنائیں، ان کے مشاہرے اتنے ہوں کہ وہ ہم سا لباس پہن سکیں اور ہم سا کھانا کھا سکیں انہیں گدھے اور بیل سمجھ کر ان کی پیٹھ پر بوجھ کا آخری تنکا بھی نہ ڈال دیں- بلکہ

انہیں انسان تصوّر کرتے ہوئے، اُن کی اوسط استعداد کے مطابق انہیں کام دیں اور اُن کی قوّتِ کارکردگی کو قائم اور مسلسل رکھنے کے لئے ان پر اتنا بوجھ نہ ڈالیں کہ وہ قبل از وقت دم توڑ دیں بلکہ انہیں آسائش و آرام کا موقع بھی دیں اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا ان سے سلوک ایسا ہو جیسا ایک شریف انسان کا کسی معزّز انسان کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ مسلمان ہونے کے ناطے اس میں اخوت بھائی چارے اور اپنائیت کی روح کارفرما ہونی چاہیئے- مگر یہ جبھی ممکن ہے کہ سرمایہ دار آجر کے ذہن سے یہ بات نکل جائے کہ اس کا سنہری یا رُوپہلی سکّہ محنت کش کے سرخ خون سے افضل ہے اور وہ محنت کو بھی اتنی اہمیّت و فوقیت دینے لگے، جتنی وہ اپنے دھات کے سکّوں یا کاغذ کے نوٹوں کو دیتا ہے اور وہ کام کرنے والے کو نوکر اور اپنے آپ کو آقا سمجھنا بند کر دے اور فریقین کے اس تعامل کو باہمی تعاون تصوّر کرے- جب تک سرمایہ دار (آجر) کے ذہن میں یہ انقلاب نہیں آتا، یہ ملازم یہ خدّام، یہ محنت کش بیسویں صدی کے غلام بنے رہیں گے اور غلامی کی ہر قسم کو مٹانے کا قرآنی مقصد شرمندۂ تعبیر رہے گا-

فقراء و مساکین | معاشرے کے ان محروم طبقوں میں سے ایک طبقہ اُن لوگوں کا بھی ہے جن کے پاس وسائلِ معیشت ان کی بنیادی ضروریات سے بھی کم ہوتے ہیں- محرومین کے اس طبقہ کے متعلق قرآنِ حکیم کا رویّہ کیا ہے- یہ معلوم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ دیکھیں کہ دولت اور دولت مندوں کے متعلق اس کا

بیٹوں کی طرح پالا اور اپنی بیٹیاں ان کے نکاح میں دے دیں۔ یہ امتیاز غالباً صرف مسلمان قوم کو حاصل ہے کہ اس کی تاریخ میں برِّصغیر پر خاندانِ غلاماں اور مصر پر خاندانِ ممالیک (جو غلاماں ہی کا مترادف ہے) مدتوں حکمران رہے اور مسلمانوں نے ان کی بالکل اسی طرح جان و دل سے اطاعت کی جس طرح وہ کسی بڑے سے بڑے خاندانی حکمران کی کرتے تھے۔

اسلام نے معاشرے میں غلام کا مرتبہ اتنا اونچا کر دیا تھا اور غلاموں نے اس حوصلہ افزا فضا میں اپنی صلاحیتوں کو اس طرح چمکایا کہ بنی اُمیّہ کا معروف خلیفہ عبدالملک بن مروان اس وقت سر بہ گریباں رہ گیا جب اسے بتایا گیا کہ اس وقت مکہ، یمن، مصر، شام، جزیرہ اور بصرہ وغیرہ مرکزی شہروں کی علمی سیادت، عطاء بن ابی رباح، طاؤس بن کیسان، یزید بن صہیب، مکحول بن مہران، ضحاک بن مزاحم اور حسن بن ابوالحسن جیسے غلاموں یا غلام زادوں کو حاصل ہے۔ جنگِ موتہ کی مہم میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غلام زادے اُسامہ بن زید کو سپہ سالار بنا کر اور بڑے بڑے قریشی زعماء کو اُن کے زیرِ کمان دے کر غلاموں کے احساسِ کہتری کو مٹانے، سادات و کبرا کے احساسِ برتری کو کچلنے اور انسانی حریت و مساوات قائم کرنے کی ایک نہ بھولنے والی مثال قائم کر دی۔

آج اگرچہ غلامی کے آثار مٹ چکے ہیں، تاہم نام کی تبدیلی کے ساتھ یہ لعنت اب بھی موجود ہے۔ قرآنِ حکیم نے عظمت و احترامِ انسانیت کی جو تعلیم دی تھی اگر اسے قائم رکھنا ہے تو ہمیں غلاموں کے اس طبقے کے ساتھ جو اس دور میں ملازمین، خدّام اور محنت کش کے نام سے مشہور ہے، ہمیں اپنا رویّہ بدلنا ہوگا۔ حضور ؐ کے اس فرمان کو ایک دفعہ پھر اپنے ذہنوں میں تازہ کیجیے کہ وہ: "تمہارے بھائی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس تم میں سے جس شخص کے ماتحت اگر کوئی ایسا شخص ہو تو اُسے چاہیئے کہ اسے وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہی لباس پہنائے جو وہ خود پہنتا ہے اُسے ایسا کام نہ دے جو اُس کی استطاعت سے زیادہ ہو اور اگر ایسا کر بیٹھے تو پھر خود بھی اس کی مدد کرے!"

یہ ملازم و خدّام اور یہ محنت کش بھی تو ہمارے ہی بھائی ہیں جنھیں گردشِ زمانہ نے

وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝

سرمایہ داری کے ان اثراتِ بد کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ چند سرمایہ داروں کا ذکر جس انداز میں کیا ہے، اُس کا حال بھی سُن لیجئے۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کو یہی کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ میں مصر کے تمام وسائلِ معیشت کا مالک اور یہ مدّعیٔ نبوّت بھوکا اور کنگلا، بھلا میں اس کی اطاعت کیسے قبول کرلوں: قَالَ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝؟ قارون بھی اسی کا ایک درباری تھا، جس کے پاس مال و دولت کے وہ انبار تھے کہ بقولِ قرآن، اُس کے خزانوں کی چابیاں اٹھانے کے لئے بھی ایک جتّھا چاہیئے تھا مگر وہ یہ دولت عوام پر خرچ کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس میں خدا کا کیا دخل اور عوام کا کیا حق ہے۔ یہ تو میں نے اپنی لیاقت سے حاصل کی ہے: اِنَّمَاۤ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔

پھر ایک باغ والے (گویا جاگیردار) کا ذکر کیا کہ وہ اپنی دولت کے نشّے میں قیامت ہی سے منکر تھا۔ وہ اپنے غریب ساتھی سے کہتا تھا کہ اوّل تو قیامت کوئی شے نہیں اور اگر بالفرض ہوئی بھی تو میں وہاں بھی تم سے اچھا رہوں گا: "مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۔ گویا دولت نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استحقاق کی بنا پر وہاں بھی آسودگی اور خوش حالی کا اسی طرح مستحق ہے جس طرح یہاں ہے، اور غریب جس طرح یہاں محروم ہے وہاں بھی ایسا ہی رہے گا۔ حضرت شعیب علیہ السّلام کی سرمایہ دار، کاروباری قوم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تمھاری ان نمازوں وغیرہ کا ہمارے کاروبار سے کیا واسطہ؟ ہم ہر قسم کی پابندی سے آزاد معیشت کے مالک ہیں: اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْۤ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ قومِ عاد اتنی سرمایہ دار تھی کہ ہر پُرفضا مقام پر بلاضرورت کوٹھیاں اور محلّات تعمیر کر رکھے تھے، جن میں ہر وقت دادِ عیش دیتے رہتے تھے: اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ اسی افراطِ دولت نے ان کو تکذیبِ پیغمبر پر اکسایا جس کے نتیجے میں انہیں ہلاک کر دیا گیا: فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ـــــ

نقطۂ نظر کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت کو قرآن مجید میں بعض مقامات پر فضل اور خیر سے تعبیر کیا گیا ہے اور واقعتہً اس کے فضل و خیر ہونے میں اس وقت کوئی شک و شبہ نہیں رہتا جب اس کا اکتساب بھی صحیح طریقوں سے ہو اور اس کا انفاق بھی صحیح مصارف پر۔ تاہم قرآن مجید نے ہی بتایا ہے کہ عملاً دولت کے اثرات انسانی سیرت پر بڑے گہرے اور مہلک ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ دولت سے اکثر و بیشتر انسانی طبائع میں غفلت، سنگدلی، استغنا، استحقار، استہزا، بخل، قبول حق سے انکار اور ارتکاب جرائم و معاصی جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے:

(۱) اَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى

(۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى

(۳) اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ

(۴) اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ، اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ هٰذَا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ٥

(۵) اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ٥ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ٥

(۶) بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِكَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ حَتّٰى اِذَا اَخَذْنَا مُتْرَفِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَجْئَرُوْنَ ـ

(۷) فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ... .... وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ٥

(۸) قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ـ

(۹) ذَرْنِيْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيْدًا وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ......
... كَلَّا اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا

انبیائے کرام کو جھٹلانے والے اور ان کی دعوت سے انکار کرنے والے عموماً یہی سرمایہ دار ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم کہتا ہے: (۱) ذَرْنِيْ وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ (۲) مَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ٥ (۳) كُلُوْا

کی آڑمیں انہیں ذہنی وجسمانی اذیت دینے کی کوشش کی یا انہیں گھٹیا قسم کی اشیاء دے کر حاتم کی قبر پر لات مارنا چاہی تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ فقراء ومساکین کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اگرچہ اسلام کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پسند نہیں کرتا لیکن قرآن نے انہیں صراحت کے ساتھ منع نہیں کیا تاکہ ان کے دل نہ دکھیں، صرف اشارے کنائے سے سمجھایا ہے۔ اغنیاء کو تنبیہ کردی گئی کہ اگر کسی تہیدست کو تم سے کام آپڑا ہے تو ماتھے پر تیوری چڑھا کر یا اسے جھڑک کر اس کے آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ پہنچاؤ: اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ --- !!

(۵) اللہ تعالیٰ کو فقراء ومساکین کی بہبود کس قدر محبوب و مقصود ہے؛ اس کا اندازہ سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کیجئے جس میں لوگوں کے اس سوال کا ذکر ہے کہ وہ کیا کچھ خرچ کریں؟ حضور کو حکم دیا جاتا ہے کہ اُن سے کہو جو کچھ بھی تمہاری ضروریات سے فاضل ہے، وہ ان پر خرچ کردو: یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ ط ——— !!!

(۶) اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقتصادیات کے دو ایسے زرّیں اُصول وضع کردیئے جن سے ارتکازِ دولت کے سارے سوتے ہی خشک ہوجائیں اور دولت کا بہاؤ تیز بھی ہوجائے اور کثیر الاطراف بھی۔ پہلا اصول یہ بتایا کہ تمہارا معاشی نظام ایسا ہونا چاہیئے کہ "كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ" کہ دولت سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جمع نہ ہوتی رہے اور دوسرا اصول یہ بتایا کہ "اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْهِ" ۔ کہ تم اپنی دولت کے ایسے مالک نہیں جو مختار مطلق ہو بلکہ اس پر خدا کے امین ہو، اس کی مرضی کے مطابق، اس کی محروم مخلوق پر تقسیم کرنی پڑے گی۔

سارے قرآن کو پڑھ جائیے، سرمایہ داروں کے ذکر کے برخلاف آپ کو کسی ایک محروم انسان کے کردار کی مذمت نہیں ملے گی، حالانکہ ان میں بھی ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی کوتاہیوں کو مجبوری پہ محمول کرتے ہوئے ان کو نظر انداز کردیا ہے یا اُن کا ذکر کرکے اللہ تعالیٰ نے اُن کے

افراد و اقوام کے ذکر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اِن بستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو ذرائع پیداوار کی کثرت نے اس قدر مدہوش کر دیا کہ خدا کے باغی بن گئے اور انجام کار تباہی سے دوچار ہوئے۔ اُن کی سونا اُگلنے والی زمین جھاڑ اور ببول اگانے لگی : وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا۔ قرآن مجید تو یہاں تک کہتا ہے کہ قوموں اور بستیوں کی تباہی کا باعث یہ سرمایہ دار ہی بنتے ہیں۔ کیونکہ فسق و فجور کے امام اور لیڈر بن کر پوری قوم کو کردار کے بحران میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے : اِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ــــ اور آخر میں یہ بھی سن لیجئے کہ قرآن حکیم کا یہ لرزا دینے والا فرمان بھی سرمایہ داروں ہی کے بارے میں ہے کہ : اَلَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

دولت اور دولت مندوں کے اس 'ذکرِ خیر' کے بعد آئیے اس طبقہ کی طرف جنھیں قرآن حکیم فقراء و مساکین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس فقر و مسکنت سے نکالنے کا کیا اہتمام کیا ہے :

(۱) دولت پر زکوٰۃ لازم کی تو اس کا اوّلین مصرف انہی کو قرار دیا :۔ اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ۔

(۲) مالِ غنیمت اور فئے وغیرہ میں ان کا حصّہ رکھا : وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى۔

(۳) زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اغنیاء کے اموال میں ان کا حق ٹھہرایا : فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ لفظِ حق کو خاص طور پر نوٹ کریں کیونکہ حق وہ ہوتا ہے جو واجب الادا ہو۔

(۴) اغنیاء کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دینے کے لئے رکوع کے رکوع وقف کر دیئے، بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ : لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ کہ جب تک خدا کی محروم مخلوق کو اپنی محبوب ترین اشیاء نہیں دے دیتے، تمہارے نیکوکاری کے دعوے غلط ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کے ساتھ انہیں متنبّہ کر دیا گیا کہ اگر انہوں نے ان فقراء و مساکین پر احسان دھرنے یا ان صدقات

کفُوٗا تک آ پہنچی ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس رویّہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان محروم طبقوں کے مفاد کو اوّلیت دیں تو یہ اسلام کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ کیا فقراء و مساکین کو ہمیشہ کے لئے فقراء و مساکین رہنے دینا ہی اسلام ہے، ہرگز ہرگز نہیں۔ نہ یہ اسلام ہے نہ منشائے قرآن کے مطابق۔

یہ بات بھی علمائے کرام اور مفکّرین اسلام کے سوچنے کی ہے کہ قرآنِ حکیم کے ان احکام اور ان کی تفصیل و تبیین میں آنے والے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کو جنھیں ہم اب تک صرف اخلاقیات کی ذیل میں شمار کرتے رہے ہیں، قانون کی صورت دی جائے۔ ارتکازِ دولت اور تکاثر کا صدیوں پرانا مرض محض وعظوں اور اخلاقی اپیلوں سے دور نہیں ہوگا۔ قرآن و سُنّت کی اس اسپرٹ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ایسے ضوابط مدوّن ہونے چاہئیں جن سے یہ تقاضے پورے ہوتے ہوں۔ تاکہ خدا و رسول کے احکام صرف کتابوں کی زینت بن کر نہ رہ جائیں۔ خدّام و عمّال کو وہ معاشرے میں کارفرما بھی نظر آئیں۔ اسلامی شریعت کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اگر کوئی آجر انہیں مزید سہولتیں اور آسائشیں مہیّا کرتا اور ان کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کرتا ہے تو یہ اس کا حسنِ اسلام ہوگا۔ لیکن ارتکازِ دولت کو کم سے کم کرنے اور فقراء و مساکین کو خوش حالی کی سطح تک لانے والے احکام قرآن و سنّت کو قانونی شکل دے کر ان کی پابندی ضروری اور ان کی خلاف ورزی خلافِ قانون قرار دی جائے۔ ان پر عمل صرف سرمایہ داروں کے جذبۂ خیر سگالی پر نہ چھوڑا جائے۔

حرفِ آخر حضرات! ہمارے معاشرے کے ان محروم طبقوں کے بارے میں قرآنِ حکیم کی روش کو بیان کرتے وقت نہ تو میں نے کسی استنباط و اجتہاد سے کام لیا ہے اور نہ اس کی تمام تفصیلات میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس کے صرف سادہ اور صریح احکامات کا ذکر کیا ہے۔ اس گفتگو سے میرا مقصد اربابِ علم و دانش کی توجّہ اس رویّہ کی طرف دلانا تھا جو قرآنِ حکیم نے ان کی فلاح و بہبود، اصلاح و ترقی سے متعلق اختیار کیا ہے اور وہ مقصد و مدّعا بیان کرنا ہے جو وہ اس سلسلے میں اپنے سامنے رکھتا ہے۔ تو میری ان گذارشات کو سننے کے بعد اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے اسے

احساسِ محرومی پر نمک پاشی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم نے ایک خاص واقعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ریکارڈ کر دیا اور فقراء و مساکین جتنا چاہیں اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ ایک فقیر و مسکین شخص عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم۔ سے اعراض برتنے اور نام نہاد بڑوں پر زیادہ توجّہ دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر پر بھی اظہارِ خفگی فرمایا۔

ہماری آبادی کا بیشتر حصّہ انہی فقراء و مساکین پر مشتمل ہے۔ کیونکہ فقہاء اور ائمۂ لغت کے نزدیک فقیر وہ ہے جس کے پاس وسائلِ معیشت ہوں لیکن ضرورت سے کم ہوں اور مسکین وہ ہے جس کے پاس سرے سے کوئی ذریعۂ معاش نہ ہو یا بالعکس اور ہمارے عوام کی اکثریت انہی دو کی ذیل میں آتی ہے۔ قرآنِ حکیم کا اسلوبِ بیان پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ اُس کا رُجحان کس طرف ہے۔ ہمارے علماء، سیاسی جماعتوں، رہنماؤں، ملکی معیشت کی منصوبہ بندی کرنے والوں کو چاہیئے کہ قرآنِ حکیم کے تیوروں کو پہچانیں، اُس کے اشاروں کو سمجھیں اور اپنے سیاسی منشور یا ملک کے میزانیے تیار کرتے وقت ان فقراء و مساکین کی فلاح و بہبود اور ان کی آسودگی و خوش حالی کو زیادہ سے زیادہ اہمیّت دیں۔ ملک کے لئے ایسا نظامِ معیشت وضع کریں جس سے قرآنِ حکیم کا یہ مقصد پورا ہو۔ ایسا اقتصادی ڈھانچہ جس میں ایک ہی شخص پہلے ایک جاگیردار کی حیثیت سے آدھے پاکستان کا مالک بنے اور اپنے مزارعین کا خون نچوڑ کر درآمد و برآمد پر قابض ہو جائے اور اس سے کمائے جانے والے منافع سے کارخانے پر کارخانے لگاتا چلا جائے اور آخر کار اپنی بے پناہ دولت کے زور پر لوگوں کے ووٹ خرید کر حکمران کی حیثیت سے پورے ملک کے وسائلِ معیشت پر قابض ہو جائے اور اس طرح دولت ہر طرف سے ہر پھر کر اُسی کی تجوریوں میں جمع ہونے لگے۔ (ایسا اقتصادی ڈھانچہ) "كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً ۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ" کی صریحًا ضد اور روحِ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔

بے شک اسلام طبقاتی کشمکش کا قائل نہیں لیکن آپ نے سطورِ بالا سے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اُس کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ اس لئے اگر اس دَور میں جب کہ معیشت نے غیر معمولی اہمیّت اختیار کر لی ہے اور نوبت: کاد الفقر ان یکون

قرآن مجید - اِک نسخۂ کیمیا[۷]

جناب اختر الواسع

قرآنِ حکیم ایک نسخۂ شافی ہے جو آج سے تقریباً چودہ سو برس سے زائد عرصہ قبل بیمار انسانیت کے دکھوں کا مداوا کرنے والے قادرِ مطلق کی طرف سے اپنے برگزیدہ پیغمبر خاتم المرسلین حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے بھیجا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دکھیاری انسانیت کفر و شرک، ظلم و شقاوت، جبر و استبداد، بے جا رسوم و رواج، ناجائز اطوار، غلط عادات، غیر اخلاقی روایات اور توہمات کے مہلک جراثیم سے پیدا شدہ ناسور کا شکار تھی۔ جنت سے بھیجے گئے آدمؑ کے بیٹوں نے دنیا کو بھی جہنم بنا دیا تھا اور اس پر ستم یہ کہ خسارے کے اس بیوپار میں مست بھی تھے اور نازاں بھی۔ اب دو ہی راستے تھے یا تو ستم رسیدہ، مظلوم اور درد سے بلکتی انسانیت خودکشی کی حرام موت مرے۔ یا پھر کوئی نسخۂ کیمیا عالمِ وجود میں آئے، جس سے اس کے دکھوں کا مداوا ہو۔ وہ صحت مند ہو کر ایک نئی زندگی پائے تاکہ نئی منزلوں کی طرف ایک سفر کا آغاز کر سکے۔

بلاشبہ حقیقی تعظیم اور سچے شکر کی مستحق صرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے کہ اس ارحم الراحمین نے "دعائے خلیلؑ" اور "نویدِ مسیحاؑ" کی تشکیل میں اپنے محبوب نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھیجا اور ساتھ میں اس کتاب بر حق کو نازل فرمایا جو وادیٔ ظلمات میں منارۂ نور، صراطِ مستقیم کی طرف لے جانے والی رہنما، جادۂ حق کے راہ نوردوں کو کامیابی کی دلیل، غمزدوں اور زندگی سے مایوس افراد کے لئے حوصلہ اور ظفر مندی کی بشارت اور ایک مکمل ضابطۂ حیات کی اساس بن کر آئی۔

انسانی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ غارِ حرا کا گوشہ نشینؐ سوئے قوم جو پیغام لے

صحیح سمجھا ہے اور واقعی قرآنِ حکیم کے نازل کرنے والے کا مقصد و منشاء
ہم ان لوگوں پر احسان کرنا، انہیں امام و پیشوا بنانا، زمین کے وسائل معی
میں حصّہ دلانا چاہتے ہیں تو قرآنِ حکیم، اس کے نازل کرنے والے اور اس
والے کا واسطہ دے کر کہوں گا کہ اصحابِ فکر و دانش کو بالعموم اور علمائے دی
اس سلسلے میں اپنے فرض کو محسوس کرنا چاہیئے۔ وہ نہ صرف اس کے لئے اپ
بلند کریں بلکہ اپنی متفقہ رائے سے معاشرے میں ایسی انقلابی تبدیلیاں لا
بھی پیش کریں تاکہ یہ محروم طبقات اپنی زندگی ہی میں اپنی کھلی آنکھوں سے
دیکھ لیں بلکہ محسوس بھی کر لیں کہ ہاں واقعی اسلام ہم بے نواؤں کا حامی و
ہے اور اُن کی جڑ پکڑتی ہوئی یہ غلط فہمی دور ہوجائے کہ دوسرے مذاہب
مذہب بھی اور اس کے علمبردار بھی سرمایہ داروں کے ایجنٹ، فقراء و مسا
دشمن اور انہیں لوریاں دے دے کر سلانے والے ہیں۔

اور اگر آپ کا خیال ہے کہ میں نے قرآن حکیم کے منشاء کو غلط سمج
نسواں واقعی اسی کا مستحق ہے کہ اس کو ہمیشہ جوتے تلے رکھا جائے۔ یتیم
ہیں کہ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے اور سڑک میں رُلتے رہیں۔ غلاموں کے ان
بھائیوں یعنی ملازمین، خدام اور محنت کشوں کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ مو
کے درمیان لٹکتے رہیں۔ وہ لنڈے کے کپڑوں سے اپنے بدن ڈھانکیں،
کی دال روٹی سے اپنے پیٹ پالیں اور رات کو کسی جوہڑ یا سڑک کے کنار
پھونس کی جھونپڑیوں میں پڑے رہیں اور انہی حالات میں یہ ان لوگوں کے کاروبا
کی طرح چلتے رہیں جو گردشِ زمانہ سے اونچی کرسیوں پر جا بیٹھے ہیں۔ کیونکہ اگر
کے جیتے نہ ہوتے تو انہیں یہ رُتبہ ہائے بلند کیوں ملتے۔ اسی طرح یہ فقراء و مسا
معاشرے کا ایک ناگزیر عنصر ہیں۔ اُن کو تا ابد قائم رہنا چاہیئے تاکہ ہماری گلیا
صدائے "فی سبیل اللہ" سے گونجتی رہیں اور اُن کی پھیلتی ہوئی ہتھیلیوں پر دو چا
کر دولت مندوں کے جذبہ اظہارِ دولت کی تسکین ہوتی رہے۔ حضرات! اگر ایسا
میں اپنی اس آدھ پون گھنٹہ کی جسارت اور آپ کی سمع خراشی پر معافی چاہتا
اتنی دیر تک آپ کو جو زحمتِ سماعت دی ہے اُس پر معذرت خواہ ہوں۔ شکر

اس کے لئے وجہِ فیضان بن جاتی ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ دانشوروں کی نیاد رمانده توہے، درماندگی کی معترف نہیں۔ اس لئے ہمارے علوم اور ہماری زندگی نظریوں ذیلی نظریوں اور ان کی بوجھل تشریحوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔ گویا جسے ہدایت کا نور ہونا چاہیئے وہ ذہن وضمیر کے لئے ناقابلِ برداشت بوجھ بن گیا ہے۔ علم کی اس گمراہ کن رہنمائی سے نجات صرف "وحیٔ الٰہی" کی بدولت ہی ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ وہاں ایک ایسی مکمل روشنی ملتی ہے جو حیات و کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو نکھا کر سامنے لے آتی ہے۔ پھر نہ ظنّ و قیاس کے اندھیرے باقی رہ جاتے ہیں نہ کم نظری کا اندیشہ۔

قرآن کریم نظریہ سے پہلے ایمان دیتا ہے اور اسی لئے نظریہ، ایمان کی طاقت کی بدولت زندگی کا پورا سفر پامردی کے ساتھ طے کرسکتا ہے اور انسانی سماج "ستاروں کی گذرگاہوں کو ڈھونڈنے" سے "سورج کی شعاعوں کو گرفتار" کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے کے لئے ایک ایسی "صراطِ مستقیم" بھی پالیتا ہے جو نہ صرف منزل تک پہنچنے کی امین ہے۔ بلکہ جس پر چلنے والوں کو ربِّ کریم کی نعمتوں کا حقدار ہونے کی "نویدِ ربّانی" بھی دی گئی ہے۔

اب جب مسلم معاشرہ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ پوری ملّتِ اسلامیہ انتشار و افتراق، کرب و بے چینی اور پریشانی و زبوں حالی کا شکار ہے۔ آج اسلامی معاشرے کے افراد کی حالتِ زار یہ ہے کہ نہ ان میں یک جہتی ہے اور نہ ہم خیالی نہ وہ ہم مقصد ہیں اور نہ ہم آہنگ۔ وہ تسبیح کے ٹوٹے ہوئے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ غرض شاعرِ مشرق کے بقول ؎

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے ٭ مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدے بے ذوق ٭ کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

مسلمان اپنے مرکز سے بہت دُور جاچکے ہیں۔ اس مرکز سے کہ جس سے ان کی تمام عبادات، معاملات، معاشرت، تمدّن، تہذیب نیز اجتماعی اور اقتصادی نظام وابستہ ہیں۔ وہ مرکز جس پہ کہ ان کی تمام اخلاقی اور روحانی برتری اور برتری کا دار و مدار ہے اور وہ مرکز ہے قرآنِ پاک

کر آیا تھا، اُس نے وہ روشنی پھیلائی جس نے بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راہ پر لا
گمراہوں کو ہدایت بخشی، غریبوں کو سہارا دیا، غلاموں، پست اور کمزور اقوا
بلندی اور طاقت عطا کی، بے کسوں اور بے بسوں کا مددگار بنا، مردہ قوموں کو
زندگی بخشی اور رحمت کے پیغام کو عام کیا۔ اس نے ایک ایسے خدا پرست سماج
بنیاد رکھی جس میں "ایک سجدہ" کے ذریعے انسان کو "ہزاروں سجدوں" کی لعنت
چھٹکارا ملا۔ جس نے عقائد و عبادات اور اخلاق و معاملات کے تمام مبادیات آ
انداز سے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے واضح کردیا اور پھر زمانہ نے دیکھا کہ نیم
افراد نے ایک عظیم الشّان سماج کی بنیاد ڈالی، ایک شاندار تہذیب کی تشکیل کی
ایک قابل رشک ثقافت سے دنیا کو متعارف کرایا۔ کل کے اُجڈ اور جاہل اس
پر عمل پیرا ہونے کے بعد ایک عالم کے معلم بن گئے اور علوم و فنون کی انہوں
نئی دنیائیں آباد کر کے اس تویدِ باری تعالیٰ کو اپنے دور کی ترقّی اور ضرورت
اعتبار سے عملی طور پر سچ ثابت کردیا کہ :

"اللہ نے سب چیزوں کو جو آسمان اور زمین میں ہیں تمہارے تصرف میں
دے دیا ہے اور اس نے تم کو تمام ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نوازا ہے"!

(پ : ۲۱ ، س : ۱۲)

آج اس تاریخی پس منظر کا مطالعہ کرنے کے بعد جو رفیع الشّان بھی ہے
تابناک بھی جب ہم اپنے ہم عصر معاشروں پر نظر ڈالتے ہیں اور دیدہ ریزی،
وسعتِ نظر کے ساتھ آج کی دنیا کی "رفتارِ ترقی" کا بھرپور جائزہ لیتے ہیں تو یہ
ابھر کر سامنے آتا ہے کہ میکانکی اور طبیعیاتی سطح کی ساری ترقیوں کے باوجود اگر ا
قلب و روح ہمہ گیر امن کی بشارت کے لئے ایک پیاسے کی طرح تڑپ رہے
تو اس "ترقّی" کی معنویت کیا باقی رہ جاتی ہے ؟

آج ذہنِ انسانی پر مسلّط ہونے والی شے ہے وہ عالمی کرب جس نے مد بر
مفکّروں، دانشوروں اور مصلحوں کو یکساں عاجز کر رکھا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے
قرآنِ کریم صبحِ بیداری کی پہلی کرن بن کر پھوٹتا ہے۔ چونکہ قرآنی مطمحِ نظر کی روشنی م
عقلِ انسانی اپنی واماندگی کا عجز و اخلاص کے ساتھ اعتراف کرے تو وحیٔ الٰہی کا

گئی تھی کہ :

"زمانہ (تاریخ انسانی) اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ خسارے اور
گھاٹے میں رہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور
ایک دوسرے کو حق بات کی اور مشکلات میں ثابت قدم رہنے کی صلاح
دیتے رہے!" ــــ (سورۂ عصر)

آج اس سورۂ پاک کی تفسیر ہر صاحب بصیرت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ مرکز فکر و عمل تھا کہ جس کے ذریعہ عرب کے بادیہ نشینوں نے قیصر و کسریٰ کو اپنا مغلوب بنا لیا۔ لیکن آج اس مرکز سے دور ہو جانے کا انجام یہ ہے کہ عظیم الشان سلطنتوں کے مالک اسرائیل کے مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں ذلّت و خواری کا شکار ہیں۔ وہ جن کا کل تک زمانہ تابع تھا، وقت جن کے اشاروں پر گردش کر رہا تھا، آج خود زمانہ کے تابع اور گردشِ دوراں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ بقول اقبالؒ ؎

اے لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں ✤ گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ
تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے ✤ کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

جارج برنارڈ شا جو اسی بیسویں صدی کے ایک مشہور مغربی مفکر، ادیب اور ڈرامہ نگار تھے، سے منسوب یہ روایت بڑی شرم و غیرت دلانے والی ہے کہ ایک بار کسی نے شا سے پوچھا کہ "آپ نے دنیا میں سب سے اچھی چیز کیا دیکھی؟" انہوں نے فوراً جواب دیا: "اسلام" سوال کرنے والے نے پھر پوچھا کہ اور: "وہ کون سی چیز ہے جسے آپ نے زندگی میں سب سے بُرا پایا؟" برنارڈ شا نے بلاتوقف جواب دیا "مسلمان" برنارڈ شا کے بولے ہوئے یہ دو چھوٹے چھوٹے لفظ بڑے معنی خیز ہیں آپ خود ہی ایمان و انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ دنیا کی کسی بھی قوم کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس دنیا کی سب سے زیادہ سچی کتاب موجود ہو، مگر اس نے اسے جزدانوں میں لپیٹ کر طاقِ نسیاں کی زینت بنا دیا ہو۔ جس کے پاس آبِ حیات کا چشمہ ہو مگر وہ خود ایک قطرے سے محروم اور پیاسی ہو۔ جس کے پاس تمام دنیا کے دکھوں کا علاج ہو مگر وہ خود اپنی بیماری دور نہ کر سکے غرض مسلمان تو وہ درماندۂ قسمت ہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں نور کی پرستاری کا اور بھٹکے

"سمجھانے والی اور یاد دہانی ہر اس بندہ کے لئے جو (خدا کی طرف) رجوع کرے!" (س: ق، ر: ۱)

کتاب بن کر نازل ہوا۔ جس کا بھیجنے والا خود فرما رہا ہے کہ:

"یہ (قرآن) ایک کتاب مبارک ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں!" (س: ص، ر: ۳)

یعنی قرآن صرف دعاؤں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل اور جامع قانونِ زندگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ قرآن پاک جو کہ جواں مردی، بے باکی، حق گوئی، راستبازی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جو ایثار، خود داری، حلم و مروّت، اور محبت و شفقت کی تعلیم دیتا ہے۔ جو کہ انسانوں کے لئے ایک بہترین رہنما ہے۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے اس کی تعلیمات کی روحانی قیادت میں کسی جانب رخ کیا، دشمنوں کی صفیں جو پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں، دم کے دم الٹ گئیں اور کفر و شرک کے مضبوط قلعے مفتوح و سرنگوں ہو کر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے۔ انہوں نے روحِ قرآنی کی مشعل کو ہاتھ میں لے کر جب بھی کسی وادئ پرظلمت کی جانب اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ دیں، تردّد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹتی چلی گئیں اور پھر وہاں ایمان و ایقان کا آفتابِ جہاں تاب اس شان سے طلوع ہوا کہ: ع "عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا!"

اس کے برعکس جب بغض و عناد، حرص و ہوس اور طمع و حسد کی ابلیسی سازش کی حکمرانی میں آکر ان کو قرآنِ حکیم سے بُعد ہونا شروع ہوا تو ان کی روحِ ایمانی بھی درماندہ ہونے لگی اور آج اس کے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ؎ (اقبال)

تمدّن، تصوّف، شریعت، کلام ٭ بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی ٭ یہ امّت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ٭ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اور یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہو گیا بلکہ اس کی وعید قرآن مجید میں بہت پہلے دے دی

ی تھی کہ :

"زمانہ (تاریخ انسانی) اس بات پر شاہد ہے کہ انسان ہمیشہ خسارے اور
گھاٹے میں رہے، سوائے ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کئے اور
ایک دوسرے کو حق بات کی اور مشکلات میں ثابت قدم رہنے کی صلاح
دیتے رہے!" ـــــ (سورۂ عصر)

اس سورۂ پاک کی تفسیر ہر صاحبِ بصیرت اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یہی وہ مرکز
عمل تھا کہ جس کے ذریعہ عرب کے بادیہ نشینوں نے قیصر و کسریٰ کو اپنا مغلوب
یا۔ لیکن آج اس مرکز سے دور ہو جانے کا انجام یہ ہے کہ عظیم الشان سلطنتوں
مالک اسرائیل کے مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھوں ذلت و خواری کا شکار ہیں۔ وہ جن
ل تک زمانہ تابع تھا، وقت جن کے اشاروں پر گردش کر رہا تھا، آج خود زمانہ
تابع اور گردشِ دوراں کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ بقول اقبالؒ ؎

لا الٰہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں ؛ گفتارِ دلبرانہ کردارِ قاہرانہ
نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے ؛ کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

جارج برنارڈ شا جو اسی بیسویں صدی کے ایک مشہور مغربی فکر، ادیب اور
مہ نگار تھے، سے منسوب یہ روایت بڑی شرم و غیرت دلانے والی ہے کہ ایک بار
ں نے شا سے پوچھا کہ "آپ نے دنیا میں سب سے اچھی چیز کیا دیکھی؟" انہوں نے
ا جواب دیا: "اسلام" سوال کرنے والے نے پھر پوچھا کہ اور: "وہ کون سی چیز
جسے آپ نے زندگی میں سب سے بُرا پایا۔؟" برنارڈ شا نے بلاتوقف جواب دیا
سلمان" برنارڈ شا کے بولے ہوئے یہ دو چھوٹے چھوٹے لفظ بڑے معنی خیز ہیں
ے خود ہی ایمان و انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ دنیا کی کسی بھی
کی اس سے بڑھ کر بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے پاس دنیا کی سب سے زیادہ
کتاب موجود ہو، مگر اس نے اسے جزدانوں میں لپیٹ کر طاقِ نسیاں کی زینت
یا ہو۔ جس کے پاس آبِ حیات کا چشمہ ہو مگر وہ خود ایک قطرے سے محروم اور پیاسی
جس کے پاس تمام دنیا کے دکھوں کا علاج ہو مگر وہ خود اپنی بیماری دور نہ کر سکے۔
مسلمان تو وہ درماندۂ قسمت ہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں نور کی پرستاری کا اور بھٹکتے

"سمجھانے والی اور یاددہانی ہر اس بندہ کے لئے جو (خدا کی طرف) رجوع کرے!" (س: ق، ر: ۱)

کتاب بن کر نازل ہوا جس کا بھیجنے والا خود فرما رہا ہے کہ:

"یہ (قرآن) ایک کتاب مبارک ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں!"

(س: ص، ر: ۳)

ی قرآن صرف دعاؤں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک مکمل اور جامع قانونِ زندگی کی بثیت رکھتا ہے۔ وہ قرآن پاک جو کہ جواں مردی، بے باکی، حق گوئی، راستبازی جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جو ایثار، خود داری، حلم و مروّت، اور محبت و شفقت کی ہم دیتا ہے۔ جو کہ انسانوں کے لئے ایک بہترین رہنما ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ بے بھی مسلمانوں نے اس کی تعلیمات کی روحانی قیادت میں کسی جانب رخ کیا، دشمنوں نفیں جو پہاڑ کی طرح مضبوط تھیں، دم کے دم الٹ گئیں اور کفر و شرک کے بوط قلعے مفتوح و سرنگوں ہو کر حق و صداقت کا پرچم اڑانے لگے۔ انہوں نے ح قرآنی کی مشعل کو ہاتھ میں لے کر جب بھی کسی وادئ پر ظلمت کی جانب اپنے ڑوں کی باگیں موڑ دیں، تردّد و تذبذب اور شک و شبہ کی تاریکیاں خود بخود چھٹ ئیں اور پھر وہاں ایمان و ایقان کا آفتابِ جہاں تاب اس شان سے طلوع لہ: ع — "عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا!"

اس کے برعکس جب بغض و عناد، حرص و ہوس اور طمع و حسد کی ابلیسی ں کی جکڑ بندی میں آکر ان کو قرآنِ حکیم سے بُعد ہونا شروع ہوا تو ان کی روح بھی درماندہ ہونے لگی اور آج اس کے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہے (اقبال)

تمدن، تصوف، شریعت، کلام ✧ بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی ✧ یہ امت روایات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ✧ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

سب کچھ یوں ہی نہیں ہو گیا بلکہ اس کی وعید قرآن مجید میں بہت پہلے دے دی

مستشرق پروفیسر ہربرٹ وائل نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

"قرآن اخلاقی ہدایتوں اور دانائی کی باتوں سے بھرا ہوا ہے اور قرآن نے عالمِ انسانیت کی زبردست اصلاح کی ہے۔ جن اشخاص نے اس کے مضامین پر غور کیا ہے وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک مکمل قانونِ ہدایت ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی سی شاخ سے لیجئے ناممکن ہے کہ اس شعبہ میں اس کی تعلیم رہنمائی نہ کرتی ہو۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو ایک سمجھدار آدمی بیک وقت دنیوی اور روحانی ترقی حاصل کر سکتا ہے!"

ان حقائق کے باوجود ہمارا حال یہ ہے کہ زبان سے بلند و بانگ دعوے کرنے کے باوجود ہم اس کی عظمت کو آج تک سچے معنوں میں اپنے دل میں نہ اتار سکے اور اگر یہ بات غلط ہے تو بتلائیے کہ کیا وجہ ہے کہ یہی وہ قرآن ہے جس کی چند آیتوں نے عرب کے ایک بڑے شاعر لبید کو اتنا متاثر کیا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ ارادۂ قتلِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) سے نکلنے والے عمر ابن خطاب کو فاروقِ اعظمؓ بنا دیا اور حبش کے دربار میں نجاشی کی ماہیتِ قلب کچھ سے کچھ کر دی —— آج ہماری حالت کو بدلنے میں ہمارا مددگار کیوں نہیں ہوتا —؟ آج ہماری یہ حالت کیوں ہے کہ؟

ذکرِ عرب کے سازمیں، فکرِ عجم کے ساز میں ∴ نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسین رضؓ بھی نہیں ∴ گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اس تلخ حقیقت کا سراغ اور اس پریشان کن سوال کا جواب وہی ہے جو اسی لاہور کے "دانائے راز" نے برسوں پہلے دیا تھا کہ ؎

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو ∴ کتاب خواں ہے، مگر صاحبِ کتاب نہیں

تو پس اگر ہم اس قعرِ مذلت سے نکلنا چاہتے ہیں، زمانے کی تابعداری اور رفت کے جابرانہ چنگل سے نجات چاہتے ہیں، انتشار و افتراق سے محفوظ ہونے کے خواہاں ہیں، عزت، وقعت، غیرت و خود داری اور جمعیت کے ساتھ زندگی کے طالب ہیں تو پھر ہمیں اپنے بھولے ہوئے مرکز کی طرف آنا ہوگا۔ مرکز کی متعینہ راہوں پر اپنے کھوئے ہوئے گوہرِ مقصود کو پانے کے لئے قرآن کریم کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنانا ہوگا

ہیں ظلمتوں کے پیچھے۔

آج مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے پاکیزہ کلام کو محض تعویذ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حیاتِ نو کی بشارت دینے والے اس پیغامِ برحق کا سب سے بہتر استعمال اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جب کوئی موت کے عالم میں ہو تو سورہ یٰسین پڑھ کر اس کے لئے موت آسان بنا دی جائے یا چند آیات کی تلاوت کر کے زندگی بھر کی غفلتوں کی تلافی کر دی جائے اور یا پھر کرایہ کے حافظ کو مامور کر کے ایصالِ ثواب کے لئے قرآن خوانی کرا دی جائے۔

قرآن مجید کا علم رکھنے والے تمام اصحاب یہ جانتے ہیں کہ اللہ کا یہ سارا کلام خطاب کی شکل میں ہے، جس کا مخاطب ہم میں سے ہر شخص ہے۔ اس کی ہر آیت ہمارے لئے مشعلِ راہ اور سرچشمۂ ہدایت ہے مگر ہم نے اس کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہی ہماری کم نصیبی ہے کیونکہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہرؒ کے بقول:

"کلامِ پاک ریشم کے جزدانوں اور الماری کے بالاترین حصوں اور وہاں کے گرد و غبار کے لئے آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ قرآنِ پاک کا ہر ایک نسخہ اس کثرت سے مستعمل ہو کر پنسل کے نشان، کاغذ کی پٹیاں، بین الاوراق یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے نشان ہر جگہ نظر آئیں اور ثابت کر دیں کہ اس کتاب سے زیادہ اس کے ملنے والے کسی کتاب کو نہیں پڑھتے، نہ اس سے زیادہ کسی کتاب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں!"

قرآن شریف میں سورۂ بقرہ کی پہلی آیت ہی میں واشگاف انداز سے اعلان کیا گیا ہے کہ:

"بے شک یہ ایک کتاب ہے جو ان لوگوں کے لئے ہدایت کا پیکر ہے، جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہو!"

معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم صرف اپنی فصاحت و بلاغت کا سکہ جمانے کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ یہ زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہبری اور رہنمائی کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے

قرآنی تعلیمات اور ہم

خواجہ غلام صادق

دیں سراپا سوختن اندر طلب ؛ انتہایش عشق و آغازش ادب
آبروئے گل ز رنگ و بوئے اوست ؛ بے ادب، بے رنگ و بوئے بے آبروست
نوجوانے را چو بینم بے ادب ؛ روزِ من تاریک می گردد چو شب
تاب و تب در سینہ افزاید مرا ؛ یادِ عہدِ مصطفےٰ آید مرا
از زمانِ خود پشیماں می شوم ؛ در قرونِ رفتہ پنہاں می شوم

یہ اشعار 'جاوید نامہ' سے لئے گئے ہیں۔ ان میں علامہ اقبال نئی نسل مخاطب ہیں۔ مگر جس حقیقت کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے، ف صدی گزرنے کے بعد بھی وہ جوں کی توں ہے۔ دین سے وابستگی کا تقاضا ختن اندر طلب ہے۔ دین کا ادب و احترام اس کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ ادب رام فرد کا مستقل رویہ بن جائے، طلبِ صادق کا عمل تیز تر ہو جائے تو عشق ظہور ہوتا ہے اور یہ دین سے وابستگی کی آخری حد ہے۔ علامہ اقبال نے نوجوانوں بے ادب ہونے پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے۔ دین کے احکام اپنانے انہیں فروغ دینے کے لئے اوّلین شرط مذہب کے بارے میں وہ ذہنی لگاؤ اکرنا ہے جسے ادب و احترام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس شرط اوّل کے پورا نے سے قبل دین کے احکام کو انفرادی اور اجتماعی سطحوں پہ دل سے قبول نے اور اپنانے کے بارے میں پُرامید ہونا عمل کی نفسیات سے چشم پوشی کرنے ادف ہے۔ گویا یہ ایک خوابِ خوش کی پرورش کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ بلاشبہ ودہ حکومت کے دورِ اقتدار میں ذرائع ابلاغ سے اسلامی موضوعات پر ن و تدریس، خطبات و تقاریر اور مضامین و مذاکرات کا اہتمام پہلے کی نسبت دہ ہو گیا ہے۔ تاہم جہاں تک انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قرآنی تعلیمات

اس کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔

آج جب کہ چودھویں صدی ہجری رخصت ہونا چاہتی ہے او صدی ہجری کی آمد کی چاپ کے ساتھ مسلم معاشرہ کے دروازہ پر بھی سنائی دینے لگی ہے اور دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام، اسلا اور نشاۃ ثانیہ کا غلغلہ سا بلند ہو رہا ہے، ان تمام مسلمانوں سے جو تعلیم اور شعائرِ اسلام کی پاسبانی کے دعویدار ہیں اقبالؒ کی زبان میں مطالبہ کانوں سے سنا اور ضمیر و عقل کے ذریعے اس کی معقولیت، ا اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے کہ ؎

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقاہی چھوڑ :: مقصود سمجھ میری نوائے سحر
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت :: دے ان کو سبق خود شکنی، خو
تو ان کو سکھا خارا شگافی کے طریقے :: مغرب نے سکھایا انہیں فن

آج اس بات کی گزرے ہوئے کل سے زیادہ ضرورت ہے کہ اق پر لبیک کہا جائے اور ایسی عملی کوششیں کی جائیں جن سے قرآن فہمی کا ہو۔ "خود شکنی" اور "خودنگری" کے سبق پڑھائے اور "خارا شگافی" کے طریقے جائیں اور صرف مسلمانوں کو ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کو۔ اس آپ مجھے اجازت دیں تو میں اسلامیات کے ایک معمولی اور ادنیٰ طالب علم سے یہ تجویز رکھنا چاہوں گا کہ "قرآنی ذوق" اور "قرآنی فہم" کو عام کرنے ہمیں ایک ایسا اصلاحی نصاب دنیا کی تمام بڑی بڑی زبانوں میں مختلف کا تیار کرنا چاہیئے جس کے ذریعے ہم قرآن کریم کے درس و حکمت والے بنیادی تصوّرات اور تعلیمات سے ان تمام لوگوں کو جو آج کسی بھی مذ پیروی کے باوجود حق اور امن و سکون کے متلاشی ہیں، متعارف کرا سکیں وہ بھی قرآنی بصیرت سے بہرہ ور ہو سکیں اور ہم ان لوگوں میں شامل ہ جو نہ صرف: "ایمان لاتے، عمل صالح کرتے بلکہ دوسروں کو بھی حق بات مشکلات میں صبر سے کام لینے کی صلاح دیتے ہیں"۔ اور اس طرح اپ کو ہر قسم کے "خسارہ" اور ہر طرح کے "گھاٹے" سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس

میں ایک ایسے شخص کے ذکر سے آغاز کرنا چاہتا ہوں جو کسی باقاعدہ مذہب کا حامل نہ ہوتے ہوئے بھی حقیقی معنوں میں مذہبی تھا۔ مذہب کا حامل یا پیرو ہونے اور مذہبی ہونے میں بہت زیادہ فرق ہے۔ آگے چل کر میں اس کی وضاحت کروں گا۔

معزز سامعین!

میں جس شخص کا ذکر کر رہا ہوں وہ کسی بڑے مذہب کا علمبردار نہیں تھا۔ مگر اسے زندگی کے اپنائے ہوئے اصولوں کی صداقت پر یقین کامل تھا۔ ان اصولوں سے انحراف اس کے لئے محال تھا۔ میرا اشارہ حکیم سقراط کی طرف ہے جو آج سے پچیس سو سال پہلے یونان کے شہر ایتھنز کا رہنے والا تھا۔ اس کا قول تھا کہ علم نیکی ہے۔ اس کے نزدیک اگر آپ کو صحیح علم میسّر ہو تو آپ لازماً اس پر عمل پیرا ہوں گے۔ بدی گناہ اور جرم کا ارتکاب جہالت یا لاعلمی کی بنا پر ہوتا ہے۔ سچائی اس قدر طاقتور ہے کہ جھوٹ اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔ سقراط زندگی بھر سچائی کا پرچار کرتا رہا۔ موقع پرست حکمران طبقہ کو اس کی یہ حرکت ناگوار گزری۔ کیونکہ ان کے نزدیک مصلحتِ وقت کا خیال رکھنا زندگی میں کامیابی کے لئے ایک اہم ترین اصول تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سچائی کے شیدائی سقراط پر نوجوانوں کو گمراہ کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔

عدالت نے سقراط کے خلاف فیصلہ دیا کہ وہ نوجوانوں کا کردار بگاڑتا ہے لہٰذا وہ اپنے نظریات کا یہ پرچار بند کر دے یا زہر کا پیالہ پی کر موت کی آغوش میں چلا جائے۔ سقراط نے حق و صداقت کی خاطر جان کا نذرانہ دینے کو ترجیح دی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جیل میں سقراط کے بعض شاگردوں نے اسے فرار ہونے کا مشورہ دیا۔ مگر سقراط نے ایسا کوئی مشورہ قبول نہ کیا۔ اس نے انتہائی اطمینان سے قیدخانے میں زہر کا پیالہ پی کر زندگی ختم کر لی۔ مرزا غالب نے ایک جگہ کہا ہے ؎

"جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد ✣ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!"

سقراط کا یہ قول کہ اگر آپ کو صحیح معرفت ہو تو آپ لازماً نیکی کی راہ پر

اپنانے کا تعلق ہے، ابھی تک اس میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں
یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم قرآنی تعلیمات کیوں نہیں اپناتے؟
دعووں میں تو ہم پیش پیش ہیں لیکن عملاً زندگی کے ہر شعبے میں ہم ابھی
منزل سے بہت دور ہیں۔

گذشتہ اڑھائی سو برس سے اس خطۂ ارض میں اسلام کی شمع
رکھنے کی خاطر ہماری دینی تنظیموں، دینی درسگاہوں اور تحریکوں نے نما
کردار ادا کیا ہے۔ نامساعد حالات میں انہوں نے مسلسل قربانیاں د۔
اشاعت اسلام کا کام جاری رکھا ہے۔ ہندی مسلمانوں پر ان کے احسانا
تاریخ کا سنہری باب ہیں۔ ان تنظیموں اور اداروں کے بغیر برِ صغیر
ہند میں اسلام کو اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑتا، جس کا سات
برس کے سیاسی عروج کے بعد ہسپانیہ میں اسے سامنا کرنا پڑا تھا۔ اہل ما
گلا گھونٹتے رہے ہیں لیکن مسجد کے میناروں سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی صدا بلند
ہوتی رہی اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کی اس پکار کا اس دنیا میں اجر، دیگر نع
کے علاوہ ہمیں پاکستان کی صورت میں ملا۔ اسلام سے وابستگی کا یہ صلہ
غیرِ ممنون کی ایک ہلکی سی جھلک اپنے اندر لئے ہوئے ہے [قائدِ اعظم
بجا فرمایا تھا کہ پاکستان اُسی روز معرضِ وجود میں آ گیا تھا جس روز پہ
شخص مسلمان ہوا تھا۔]

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، جہاں تک اسلامی تعلیمات کی تدریس کا تع
ہے، ہمارے دینی مدارس، بعض تعلیمی ادارے اور تنظیمیں اس سلسلے میں مسلسل
جدّوجہد کرتی رہی ہیں۔ مگر اس ساری تگ و دو کے باوجود عملی زندگی میں قر
تعلیمات کا رنگ گہرا نہیں ہو سکا۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے لہٰذا اس کے عوامل
نشاندہی ہمارے لئے لازم ہے۔ درحقیقت ہمیں ایسی سیاسی اور معاشر
تبدیلیوں کی اشد ضرورت ہے جو ہمارے معاشرے کو قرآن و سنت کے قریب
لائے اور ہمارے ملک کو حقیقی معنوں میں اسلامی اور فلاحی مملکت بنا دے
اس سلسلے میں اہلِ وَرَع کی اس مجلس میں مجھے چند گذارشات پیش کرنی ہیں

اجر میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بڑا درگذر کرنے والا اور رحیم ہے۔
حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔" (۱۵ : ۱۴ - ۶۹)

مذہبی صداقتوں کو دل سے قبول کرنا ہی مذہبی ہوتے یعنی مذہبی طریق سے زندگی بسر کرنے کی ضمانت ہے [سقراط نے علم نیکی ہے کا مژدہ سناتے ہوئے علم کو تیقنُ کی وہ فعّال حالت تصوّر کیا تھا جسے ہم آج کی زبان میں ایمان کہتے ہیں] اگر ہم قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا نہیں تو سورہ حجرات کی مندرجہ بالا آیات کا اطلاق ہمارے اوپر بھی ہوتا ہے۔ قرآن کانفرنس میں ہمیں اس صورت حال کا سنجیدگی سے تجزیہ کرنا چاہیئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایمان کس طرح دلوں میں داخل ہو کہ ہم قرآنی تعلیمات پر مکمل طور پر عمل پیرا ہو جائیں۔ علامہ اقبال نے تشکیل الٰہیات جدیدہ میں ایک جگہ ایمان کی جو تعریف کی ہے، اس سے ایمان ایک ایسے عقیدے کی صورت میں سامنے آتا ہے جو ایک واضح مگر نادر تجربے پر استوار ہوتا ہے۔ علامہ کے الفاظ یہ ہیں کہ :

"ایمان سے مطلب یہ نہیں کہ ہم چند ایک قضیوں کو بے چون وچرا مان لیں۔ اس کے برعکس یہ تیقن اور اعتماد کی وہ کیفیت ہے جس کے لئے انسان کو بڑی نادر واردات سے گزرنا پڑتا ہے۔ صرف مضبوط شخصیتوں کے مالک لوگ ہی اس تجربے سے بہرہ ور ہوتے ہیں!" (ص ص ۹ - ۱۰۸)

علامہ خود ہی فرماتے ہیں کہ جس ایمان کی بنیاد مشاہدۂ حق پر ہو ایسے ایمان کے اہل بہت کم لوگ ہوتے ہیں۔ اس میں خدا کے فضل کے ساتھ ساتھ صاحبِ ایمان کی اپنی کاوش کو بھی بہت عمل دخل ہوتا ہے۔ مگر ایک عام شخص تو اس قسم کے مشاہدہ کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ایمان جن مذہبی صداقتوں پر استوار ہوتا ہے، انہیں جملوں میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان تصوّرات و تعقّلات کو اپنانے کے لئے کسی نمونہ کی ضرورت

گامزن رہیں گے اور غالب کا اقرار کہ طاعت و زہد سے آگاہی کے باوجود طبیعت نیکی پہ مائل نہیں ہوتی، متضاد قول ہیں لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں باتوں کے پس پردہ کیسی نفسیات کارفرما ہے۔

ابھی میں نے مذہبی لگاؤ کی دو صورتوں کا ذکر کیا تھا۔ پہلی صورت کسی مذہب کا حامل ہونے سے عبارت ہے۔ دوسری صورت کا تعلق مذہبی ہونے سے ہے۔ پہلی صورت میں مذہب ایک کاروباری رشتے کی طرح سیاسی سماجی اور نجی منفعت کے لئے صرف نام کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پاسپورٹ یا شناختی کارڈ بنانے کے لئے ملازمت حاصل کرنے کے لئے، شادی کے موقع پر نکاح نامہ میں اندراج کے لئے ہم اسے بروئے کار لاتے ہیں۔ اس صورت میں مذہب ایک خول ہے جس کی اساس ایمان پر استوار نہیں ہوئی، گویا وہ ایک سماجی سہولت ہے۔ حالات بدل جائیں تو اس خول کو بھی بدلا جا سکتا ہے۔ غالب کے مندرجہ بالا شعر میں مذہبی اعتقادات کو اسی حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ مذہبی صداقتیں کسی یقین پر استوار نہ ہوں تو وہ عمل پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس مذہبی ہونا ایک جہانِ نو تخلیق کرنے کے مساوی ہے۔ مزید براں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اس کی تمام ذمہ داریاں قبول کرے۔ سقراط کی زندگی میں ہمیں اس کی مثال ملتی ہے۔

معزز سامعین!

یاد رکھئے کہ مذہبی صداقتوں کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرنا ہی حقیقی معنوں میں صاحبِ ایمان ہوتا ہے۔ اگر آپ ایمان کی دولت سے مالامال ہیں تو آپ کے مذہبی نظریات اور رجحانات آپ کے اعمال سے عیاں ہوں گے۔ عمل عقیدہ اور ایمان کی خارجی صورت ہے۔ ایمان اور عمل میں یگانگت خودی کی پختگی کی علامت ہے۔ عمل کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ سورۂ حجرات میں اعراب کے بارے میں واضح ہدایت موجود ہے:

"یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہوگئے۔ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اختیار کرلو تو وہ تمہارے اعمال کے

درسِ قرآن اور تعمیرِ حیات

ڈاکٹر عبدالرؤف

اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو جن ان گنت نعمتوں سے نوازا ہے ان
رآن حکیم سب سے بیش بہا نعمت ہے۔ یہ عظیم کتاب بنی انسانی فکر و کردار
یت تخلیقی انقلاب کا باعث بنی۔ چنانچہ غور و فکر کرنے اور سیرت و کردار سنوارنے
تعلق قرآنِ حکیم میں مندرج بنیادی ضابطوں کے زیرِ اثر ایک ایسی فعال اُمّت
ں وجود میں آئی جو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ رحمت ثابت ہوئی۔ اس میں قطعی
ہیں کہ اگر خدانخواستہ یہ آخری صحیفۂ مطہرہ نازل نہ ہوا ہوتا تو ہماری اس
ت کا نقشہ کہیں مختلف ہوتا۔

ن حکیم سے متعلق حقیقت اور افسانہ | آزادی کے بعد پاکستان میں
ں تعلیمات کی اشاعت کے لئے کافی مثبت کوشش ہوئی۔ مگر اس سلسلہ
ہاں ہم نے اچھے اقدامات اٹھائے وہاں کچھ بنیادی سہو و خطا بھی سرزد ہوئے
طاؤں کا ایک مجموعی نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ قرآنی تعلیمات کے مروجہ طریق روز
ندگی میں اسلامی انقلاب لانے میں ہماری توقعات پر پورا اُترنے میں ناکام
۔ چنانچہ قرآن و سنت کے ظاہری غلغلہ کے باوجود ہماری معیشت و معاشر
ت و ہلاکت کی دلدلوں میں دھنستی چلی گئی۔

ہر چند کہ آج ہمارے ماحول میں قرآنِ حکیم کا اثر و رسوخ بظاہر نمایاں نظر
ہے، اصل صورتِ حال اس قدر مخدوش ہے کہ بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔
یسی بے بصر کو اس مشاہدے سے اب بھی اختلاف ہو تو ہوتا رہے۔ حقیقت
یقے وہی ہے جو سب کے سامنے ہے۔

ہوتی ہے سہ
آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو ؛ لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحب یقین
کرداری نمونے کے قول و فعل میں مطابقت، دل اور زبان کی موافقت سے ایسی شہادت میسّر آتی ہے جس سے لوگوں کے دل سوزِ یقین سے گرم ہوتے ہیں اور سینے نورِ ایمان سے منوّر ہو جاتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ، آپ کا اُسوۂ حسنہ تمام لوگوں کے لئے ایک ایسا نمونہ ہے جس کے مطالعے سے ہماری زندگی میں عظیم انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ ادب، احترام اور محبت کے جذبات سے سرشار ہو کر نوجوان اگر نبی آخر الزّمان کی طرف رجوع کریں تو کایا پلٹ سکتی ہے۔ زندگی کے عام شعبوں میں ہمارے ہاں EXEWERS نہیں رہے۔

تیسری صورت مذہبی صداقتوں پر غور و فکر کرنے اور ان کے لئے دلائل اور استدلال مہیّا کرنے سے عبارت ہے۔ یہ کام علمائے کرام اور سکالرز سرانجام دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں علم کی تقسیم کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ اکثر علماء نے اپنے آپ کو صرف دینوی علوم کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ جب کہ سکالرز سائنسی علوم کے لئے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس تقسیم سے ابلاغ کا ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ عام تعلیمی اداروں میں سائنس کی طرف ہی توجّہ دی جاتی ہے اور مذہب سے متعلق یا مذہبی امور کے بارے میں معلومات تشنگی کے ذیل میں آتی ہیں۔ نہ گھر میں مذہبی ماحول نہ درس گاہوں میں مذہبی تعلیم کا اہتمام اور نہ ہی اسلامی رنگ میں رنگنے کے لئے کوئی تربیت گاہ، ایسی صورت میں مذہبی تصوّرات اور عقائد چند ایسے جملوں کی صورت میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جنہیں رواج اور عادت کے تحت زبان سے ادا کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم مذہب کے حامل تو بن جاتے ہیں مگر عمل صالح کی سعادت سے محروم رہتے ہیں۔ جو کچھ زبان سے ادا کرتے ہیں اس کی تصدیق قلب سے نہیں کرتے۔ اسی سے دل کی ناپختگی پیدا ہوتی ہے۔ کسی حد تک اس صورت حال کی ذمّہ داری ہمارے نظامِ تعلیم پر عائد ہوتی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی بری الذّمّہ نہیں ہیں۔ مشرق و مغرب کے علوم سے آگاہی

(۳) احکامِ قرآنی کو مسائلِ حیات سے مربوط کرنے کی کوششوں کا افسوسناک فقدان اور زندگی سے کٹی ہوئی تشریحات پر بے تحاشا زور۔

(۴) تعلیماتِ قرآنی کا عملی، اصلاحی یا ترقیاتی منصوبوں سے عدمِ ربط۔

(۵) تاثیر اور عدمِ تاثیر یا غلط تاثیر کے تخمینہ کے لئے کسی قسم کے موثق و معروضی طریق کار کا عدمِ استعمال وغیرہ وغیرہ۔

ترمیم و اصلاح کے لئے چند تجاویز: درسِ قرآن کے مروجہ طریقوں میں ان اور اسی قسم کی بیسیوں اور فرو گذاشتوں کی وجہ سے قرآنی تعلیمات کا اصل مقصد تقریباً فوت ہو چکا ہے۔ اور یہ بدنصیب معاشرہ اس وجہ سے بھی صحت و سلامتی کی منزل سے بھٹکتا چلا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ صورت حال میں ترمیم و اصلاح ناگزیر ہے۔ غور و فکر کے لئے چند تجاویز پیش ہیں:

(۱) درسِ قرآن کے متن و معانی کو سلیس، مدلل اور مختصر انداز میں پیش کیا جانا چاہیئے۔

(۲) درسِ قرآن کے لئے مدرس جو موضوع بھی منتخب کرے اسے روزمرہ زندگی اور اس کے بنیادی تقاضوں سے مربوط کر کے پیش کرنا ازحد ضروری ہے۔

(۳) درسِ قرآن سے پہلے، دوران یا بعد منتخب آیات سے متعلق کسی نہ کسی چھوٹے بڑے عملی، اصلاحی یا ترقیاتی منصوبے یا کسی پہلے ہی سے جاری و ساری کارِ خیر میں سامعین درس کے لئے ذاتی مشارکت اور عملی تعاون کی تحریک بھی اشد ضروری ہے۔

(۴) کیا درسِ قرآن سامعین کے فکر و عمل کے دھارے موڑنے کا باعث بنتا ہے یا نہیں؟ —— اس بات کا پتہ لگانے کے لئے تاثیر یا عدم تاثیر کے موثق طریق کار مثلاً احتساب، امتحان، تجزیہ وغیرہ کا باضابطہ استعمال ناگزیر ہے ——!!

(۵) قرآن عزیز کی نشر و اشاعت کرنے والے تمام افراد اور اداروں کی ایسی جامع اور منظم تربیت کا اہتمام بھی ضروری ہے جس سے انہیں جدید مسائل اور ان کے حل کے عملی اصولوں اور افہام و تفہیم کے سائنسی طریقوں سے

درسِ قرآن کی مروّجہ مجالس | "درسِ قرآن اور تعمیرِ حیات!" کے حوالے سے آپ سے مخاطب ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے مروّجہ تدریسِ قرآن کا سرسری جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ ہمارا مستعمل طریق ملک و ملّت کی تعمیر و ترقی میں کس حد تک کامیاب یا ناکام رہا ہے۔

درسِ قرآن کی مروّجہ مجالس کو تین اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے:

اوّل: مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ کے لئے درسِ قرآنِ حکیم۔

دوم: مساجد اور اہم ملّی مراکز میں عامۃ النّاس کے لئے درسِ قرآنِ عزیز۔

سوم: ٹیلیویژن، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعہ ہر قسم کے سامعین اور ناظرین کے لئے درسِ قرآن مجید۔

درسِ قرآن کے ان تمام اہتمامات کے بنیادی محاسن یہ ہیں کہ مدرّس عموماً پڑھے لکھے افراد ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اندازِ خطاب خاصے مؤثر ہوتے ہیں سامعین میں بھی کافی دلچسپی اور حرارت کا رنگ نظر آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے کیا بات ہے کہ تعمیرِ ملّی سے متعلق متوقع اثرات تا ہنوز مرتب ہونا شروع نہیں ہوئے۔ چند تعلیمی اداروں میں درسِ قرآن کے وسیلہ سے حالات میں بہتری کی خال خال اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ مگر مجموعی طور پر صورتِ حال میں سیرت و کردار کا پرنالہ وہیں کا وہیں ہے۔ بلکہ کئی صورتوں میں حالات مزید روبہ انحطاط نظر آتے ہیں۔

ناکامی کے چند اہم اسباب | ظاہر ہے کہ یہ امر ہم سب کے لئے باعثِ تشویش ہے کہ آخر اشاعتِ تعلیماتِ قرآن کے اس غیر معمولی ولولہ کے بعد بھی ہمارے انفرادی اور اجتماعی سیرت و کردار میں صحت و سلیقہ کا افسوسناک فقدان کیوں ہے؟ میرے تجزیہ کے مطابق روزمرّہ معیشت و معاشرت میں متوقع تبدیلی لانے میں مروّجہ درسِ قرآن کی ناکامی کے چند بڑے اسباب یہ ہیں:

(۱) پیشکش کے غیر سائنیٹفک، بورکن، طوالت پسند اور تکراری انداز۔

(۲) درسِ قرآن میں اوّل تا آخر منطق و معقولیّت کی بجائے جذباتیت، اور کئی حالتوں میں گپ اور بکیڑ کا غلبہ۔

عظمت قرآن بزبان رسول صلے اللہ علیہ وسلم

سید حامد میاں

اس موضوع پر مضامین لکھے جاتے رہے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ حسب توفیق چند احادیث جمع کر دوں جن سے قرآن کریم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

عن عطية قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما من كلام اعظم عند الله من كلامه وماردّا العباد الى الله كلامًا احب اليه من كلامه

الدارمی : ح ح

(تعلیق - الحدیث مرسل)

حضرت عطیہ بن قیس رضؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کے کلام پاک سے بڑھ کر باعظمت کوئی کلام نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور بندوں کی طرف سے کوئی کلام اس کے کلام سے زیادہ محبوب و پسندیدہ نہیں پیش کیا جا سکتا

یہ روایت سُنن دارمی کی ہے جو حدیث کی معتبر کتاب ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے دارمی رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف کرا دیا جائے کیونکہ اس مضمون میں صرف ان کی ہی کتاب کی روایات دی گئی ہیں امام دارمی عبد اللہ بن عبد الرحمٰن سمرقندی دارمی امام بخاری رحؒ سے تیرہ سال بڑے تھے، اس لئے ان کی ثلاثیات کی تعداد امام بخاریؒ کی ثلاثیات سے زیادہ ہے۔ امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے صاحبزادے عبد اللہ ان کے شاگرد ہیں۔ ان کی وفات ۲۵۵ ھجری

رُوشناس کرایا جائے۔

(۶) قرآنِ حکیم اور روزمرّہ زندگی میں کھویا ہوا ربط بحال کرنے کے لئے جامع اور ٹھوس تحقیقوں کا فوری اہتمام کیا جائے۔

تعیّش سماعی یا تعمیرِ حیات ان تمام تجاویز کا مدّعا یہ ہے کہ درسِ قرآن کو اصلاح و تعمیرِ ملّی کی ایک فعّال تحریک کی صورت دینے کے سامان فراہم کئے جائیں تاکہ قرآنِ حکیم میں وضع شدہ احکامات کی روشنی میں ملّی اور عالمی معیشت و معاشرت میں خلیفۂ اسلام کی کوئی قابلِ عمل راہ ہموار کی جاسکے۔ ان مختصر گذارشات میں کہنا میں فقط یہ چاہتا ہوں کہ پسند آپ کی ہے چاہے آپ درسِ قرآن کو ایک پُرکیف رسمی، روحانی محفل بنائے رکھیں یا اسے معیشت و معاشرت میں تعمیر اور تخلیق کا مؤثر وسیلہ بنادیں۔ بہرکیف درسِ قرآن کو تعیّشِ سماعی کا ذریعہ بنائے رکھنا، باہمی تنافرت کے فروغ کے حربہ کے طور پر استعمال کرنا یا سُریلی صداؤں کے ایک ایسے غیر مربوط مجموعے تک محدود کئے رکھنا جسے عقل و عمل سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو، انتہائی غیر معقول حرکت ہے۔

محفلِ درسِ قرآن کو ترتیب دینے کا واحد طریق یہی ہے کہ پوری تخلیقی صلاحیتوں سے کام لے کر اس کی تنظیم یوں ہو کہ اس کی وساطت سے ذہن اور جسم میں تحریک عمل پیدا ہو، سیرت و کردار میں جلا آئے، افراد، خاندان اور معاشرہ اس کی روشنی میں ہر قسم کی تاریکی، جہالت، نفاق اور تنزّل سے نجات پاتے دکھائی دیں اور فلاحی سمتوں کی جانب جادہ پیما ہوتے نظر آئیں۔ درسِ قرآن کے بعد اگر اس قسم کے مطلوبہ نتائج برآمد ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی ہو تو پھر فاضل مدرّس، اور حسّاس سامع دونوں کے لئے یہ سوچنا لازم ہو جاتا ہے کہ ہم سب کہیں شعوری یا لاشعوری طور پر نعمتِ قرآن سے کفران اور صراطِ مستقیم سے بھٹکنے کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہیں؟

(بقیہ صـ ۸۴)

معراجِ زندگی نہیں۔ 'علم را بر تن زنی' کی منزل پر رک کے رہنا اپنی قومی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا نہیں۔ علم کا اطلاقی پہلو بھی ہے۔ ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال پوچھنا چاہیئے کہ ہم نوجوان نسل کے لئے اپنے مذہبی تصوّرات کو کیسی منطقی اور فلسفیانہ بنیادیں

كلام الله على خلقه كفضل الله على خلقه - الدارمی ص ۴۷۷
(قلتُ رواه مرسلاً)

کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی برتری اپنی مخلوق پر ویسی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی برتری اپنی مخلوق پر ہے۔

(۴) عن عبد اللہ بن عمرو عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم انہ قال القرآن احب الی اللہ من السموٰت والارض ومن فیھن
(الدارمی ص ۴۷۷)

حضرت عبد اللہ بن عمرو جناب رسول کریم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کو قرآن پاک آسمانوں اور زمین اور جو اُن میں رہتے ہیں ان سب سے زیادہ محبوب ہے۔

(۵) عامر بن واثلة ان نافع بن عبد الحارث لقی عمر بن الخطّاب بعسفان وکان عمر استعمله علی اهل مكة فسلّم علی عمر فقال لهٗ عمر من استخلفت علی اهل الوادی فقال نافع استخلفت علیهم ابن ابزٰی فقال مولًی من موالینا فقال عمر فاستخلفت علیهم مولًی. فقال یا امیر المومنین انهٗ لقارئٌ لکتاب اللہ عالم بالفرائض — فقال عمر : اما ان رسول اللہ صلّی اللہ علیه وسلّم قد قال ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقوامًا ویضع به الاٰخرین ۵
(الدارمی ص ۴۷۳)

عامر بن واثلہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت نافع ابن عبد الحارث رضؓ، حضرت سیّدنا عمر فاروق رضؓ سے عسفان میں ملے۔ حضرت عمر رضؓ نے نافع رضؓ کو مکّہ مکرّمہ کا والی بنا رکھا تھا (انہیں عسفان میں دیکھ کر) دریافت فرمایا کہ اہل وادی (مکّہ) پر کسے اپنا نائب مقرّر کر کے آئے ہو) نافع رضؓ نے کہا کہ ابن ابزٰی کو حضرت نے دریافت فرمایا، اور یہ ابن ابزٰی کون ہے؟ کہا ہمارے آزاد کردہ غلاموں میں سے ایک ہیں۔ فرمایا تو کیا تم نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام کو اپنا قائم مقام مقرّر کیا ہے؟ وہ عرض کرنے لگے: اے امیر المومنین وہ کتاب اللہ کے قاری (عالم) ہیں (اور) فرائض جانتے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضؓ نے فرمایا کہ واقعی جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب سے بہت سے لوگوں کو سربلندی نصیب فرمائے گا اور دوسروں کو زوال دے گا۔

میں امام بخاریؒ کی وفات سے ایک سال قبل ہوئی، مرو میں مدفون ہیں (جو آج کل روس میں ہے)۔ امام بخاریؒ کو جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو سر جھکا لیا۔ پھر سر اٹھا کر اناللہ پڑھی۔ ان کے آنسو رخساروں پر بہہ آئے اور یہ شعر پڑھا ؂

فان تبق تفجع بالاحبة کلھم وفناء نفسك لا أبالك افجع

(اگر تم زندہ رہے تو سارے دوستوں کے غم فراق کا دکھ اٹھاؤ گے اور خود اپنی فناء زیادہ پریشان کن اور تکلیف دہ چیز ہے!)

امام بخاریؒ کی عادت نہ تھی کہ وہ شعر پڑھیں۔ صرف وہ اشعار جو حدیثوں میں آتے ہیں، پڑھتے تھے۔ سُنن دارمی کو بہت سے علماء نے صحاح ستہ میں چھٹا درجہ دیا ہے۔

(۲) عن زید بن ارقمؓ قال قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً فخطبنا فحمد اللہ واثنیٰ علیہ ثم قال یا ایھا الناس انما انا بشر یوشك ان یاتینی رسول ربی فاجیب و انی تارك فیکم الثقلین اولھما کتاب اللہ فیہ الھدیٰ والنور فتمسکوا بکتاب اللہ وخذوا بہ فحث علیہ ورغب فیہ ثم قال واھل بیتی اذکرکم اللہ فی اھل بیتی ثلاث مرات۔ سنن الدارمی ۲ ۳۲ ع (قُلتُ رواہ مسلمٌ)

حضرت زید بن ارقمؓ نے فرمایا کہ ایک دن جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرمانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا کہ اے لوگو! میں انسان ہوں۔ قریب ہے کہ میرے پاس میرے پروردگار کا فرستادہ آئے تو میں اس کے بلانے پر اس کے پاس چلا جاؤں اور میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ان میں پہلی چیز کتاب اللہ ہے اس میں ہدایت اور نور ہے۔ کتاب اللہ کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور اس سے (اصول و مسائل) لیتے رہو۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھارا اور ترغیب دی، پھر ارشاد فرمایا اور میرے اہل بیت میں تم کو اہل بیت کے بارے میں خدائے تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں تین بار ارشاد فرمایا۔

(۳) عن شھر بن حوشب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضل

حضرت شہر بن حوشبؒ فرماتے ہیں کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

(یاد رکھو)

مفسرین قرآن کیلئے سیدنا فاروق اعظمؓ کا بتلایا ہوا زریں اُصول

قال عمر بن الخطاب ان هذا القرآن كلام الله فلا يغرنكم ما عطفتموه على اهوائكم (الدارمی ص ۱٤٤)	سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے تو اسے اپنی خواہش کے مطابق موڑ کر مطلب نکال کر لینے کو دھوکہ میں نہ ڈالنا۔

اہل باطل قرآن پاک کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں۔ اس سے سب بچیں تفسیر احادیث کی روشنی میں ہوا کرتی ہے۔ مفسرین کرام نے اصول بھی مقرر فرما دیئے ہیں ان کی پابندی ضروری ہے۔

قرآن پاک پڑھنے اور قراءت سیکھنے اور سکھانے کی فضیلت کے لئے احادیث ملاحظہ فرمائیں

(۷) عن علیؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خيركم من تعلم القرآن وعلمه (الدارمی ص ۳۷٤ ج ۲)	حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن پاک سیکھیں اور سکھائیں۔
(۸) عن سعد بن عبيدة عن ابی عبد الرحمن السلمی عن عثمانؓ عن النبی صلى الله عليه وسلم قال ان خيركم من علم القرآن وتعلمه قال اقرء القرآن ابو عبد الرحمن فی امرة عثمان حتی كان الحجاج قال ذلك اقعدنی مقعدی هذا (الدارمی ص ۳۷٤ ج ۲)	حضرت سعد بن عبیدہ، حضرت ابو عبد الرحمٰن السلمی سے اور وہ حضرت سیدنا عثمان غنی رضؓ سے اور وہ جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "بلاشبہ تم میں بہتر وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک کی تعلیم دیں اور اس کی تعلیم حاصل کریں!"— سعد بن عبیدہ فرماتے ہیں کہ ابو عبد الرحمٰنؒ نے حضرت عثمان غنی رضؓ کے دور امارت

میں پڑھانا شروع کیا حتی کہ حجاج کا زمانہ آیا۔ فرماتے تھے کہ اسی (فضیلت) نے

(٦) عن الحارث عن علیؓ قال قيل يا رسول الله ان امتك ستفتتن من بعدك قال فسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم او سئل ما المخرج منها قال الكتاب العزيز الذي لا يأتيه الباطل من بين يديه ولا من خلفه تنزيل من حكيم حميد من ابتغى الهدى في غيره فقد اضله الله ومن ولي هذا الامر من جبار فحكم بغيره قصمه الله هو الذكر الحكيم والنور المبين والصراط المستقيم فيه خبر من قبلكم ونبأ ما بعدكم وحكم ما بينكم وهو الفصل ليس بالهزل وهو الذي سمعته الجن فلم تتناهوا ان قالوا انا سمعنا قرانا عجبا يهدي الى الرشد ولا يخلق عن كثرة الرد ولا تنقضي عبرته ولا تفنى عجائبه ثم قال علی للحارث خذها اليك يا اعور۔ (سنن الدارمی ۳۳۶ ع)

حارث حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا: جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ جناب کے بعد جناب کی امت فتنہ میں مبتلا ہو جائے گی۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس عرض کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا یا آپ سے دریافت کیا گیا کہ فتنوں سے بچ نکلنے کی سبیل کیا ہوگی۔ ارشاد فرمایا کہ کتاب عزیز جس کے سامنے یا پیچھے کسی حیثیت سے باطل نہیں آئے گا۔ اللہ پاک کی طرف سے نازل کردہ ہے جو حکیم و حمید ہے جو کتاب اللہ کے احکام کو چھوڑ کر کہیں اور سے ہدایت کا طالب ہوگا تو سمجھ لو کہ یقیناً ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نے گمراہی پر چلتا چھوڑ دیا ہے، اور جو جبار حکمران حکومت پر آجائے اور قرآن پاک کے احکام کو چھوڑ کر دوسرے احکام سے حکومت چلائے تو اللہ تعالیٰ اسے ہلاک و برباد کر دے گا۔ یہ قرآن پاک ذکر حکیم ہے (حکمت والا کلام الٰہی ہے) اور واضح کر دینے والا نور ہے۔ یہی (اس پر عمل کرنا) سیدھا راستہ ہے۔ اس میں تم سے پہلے لوگوں کے حالات ہیں اور تمہارے بعد کے دور کی خبریں ہیں اور تمہارے آپس میں کرنے کے فیصلے ہیں۔ وہ سچا فیصلہ کن کلام ہے، مذاق نہیں۔ یہی وہ کلام ہے کہ جسے جب جنات نے سنا تو یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ ہم نے عجیب کلام پاک سنا ہے جو بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے اور یہ کلام بار بار پڑھنے سے بھی پرانا نہیں لگتا۔ اس کے پڑھنے سے جو سبق حاصل ہوتے رہتے ہیں وہ کبھی ختم نہیں ہوتے اور اس کے عجائبات لافانی ہیں۔ پھر حضرت علیؓ نے حارث سے فرمایا: اے اعور یہ حدیث لے (اپنے

کسی مسلمان کو ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ اسے قرآن پاک کچھ بھی نہ آتا ہو۔ اس حدیث پاک کو دیکھئے :

(۱۰) عن ابن عباسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم ان الرجل الذی لیس فی جوفہ شیٔ من القراٰن کالبیت الخرب
(سنن دارمی ۲۹ ج ۲)

حضرت ابن عباس رضی اللّٰہ عنہما سے روایت ہے کہ جناب رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: "وہ آدمی جس کے اندر قرآن پاک میں سے کچھ بھی نہ ہو ویران گھر کی طرح ہے!"

(۱۱) عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم من شغلہ قراءۃ القرآن عن مسألتی و ذکری اعطیتہ افضل ثواب السائلین وفضل کلام اللّٰہ علی سائر خلقہ کفضل اللّٰہ علی خلقہ۔ (الدارمی ص ۱ ع ع)

حضرت ابوسعید خدری رضؓ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا: "جسے قرآن پاک کی تلاوت نے اتنا مشغول کر دیا ہو کہ وہ مجھ سے مانگنے (مانگنے کا وقت بھی اس کے پاس نہ رہا ہو) اور (دوسرے کلمات اور دعاؤں سے) میرے ذکر کا وقت بھی (اس کے پاس نہ بچتا ہو) تو میں اسے مانگنے والوں سے (زیادہ اور) افضل ثواب دوں گا۔ اور اللّٰہ تعالیٰ کے کلام کی برتری اس کی پوری مخلوق پر ایسی ہے جیسے ذاتِ حق تعالیٰ کی برتری اپنی مخلوق پر۔

(۱۲) عن انسؓ قال قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اِنَّ لِلّٰہِ اَھْلِیْنَ مِنَ النَّاس قیل من ھم یا رسول اللّٰہ قال اھل القرآن۔
(سنن الدارمی ۴۳۳)

حضرت انس رضی اللّٰہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ: لوگوں میں اہل اللّٰہ ہیں۔ دریافت کیا گیا اے اللّٰہ کے سچے رسول وہ لوگ کون ہیں۔ ارشاد فرمایا قرآن پاک والے!

بچوں کے قرآن پاک کے پڑھنے اور سیکھنے کی فضیلت جو صحابۂ کرام میں معروف

مجھے یہاں بٹھا رکھا ہے ۔"

نوٹ : اس حدیث میں حضرت ابو عبد الرحمٰن سُلَمی کا اسم گرامی آیا ہے ۔ یہ نہایت عظیم المرتبت عالم تھے ۔ مقدمہ نصب الرایہ میں ان کے بارے میں تحریر ہے :

"ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن حبیب السلمی رضؓ المتوفی ۷۴ھ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو قرآن پاک سنایا ۔ قراءت میں حضرت علی رضؓ کے یہ بہترین شاگرد ہیں ۔ انہوں نے اپنے آپ کو صرف قرآن پاک کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا تھا اور کوفہ کی مسجد میں چالیس سال پڑھاتے رہے ۔ حضرت حسن رضؓ اور حضرت حسین رضؓ نے اپنے والد ماجد کے حکم سے ان سے قراءت اخذ کی اور امام عاصمؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قراءت ابو عبد الرحمٰن سے اخذ کی یہی وہ قراءت ہے جو امام حفص نے امام عاصم سے روایت کی ہے اور قراءۃ عاصم دونوں طریقوں سے تمام طریقوں میں تواتر کے سبب سے اعلیٰ درجہ کی ہے ۔ ابو عبد الرحمٰن السلمی نے سیدنا عثمان غنی اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کو بھی قرآن پاک سنایا تھا ۔"

(مقدمہ نصب الرایہ ص ۳۱)

(۹) عاصم بن بهدلة عن مصعب بن سعدؓ عن ابيه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم خياركم من تعلم القرآن وعلم القرآن قال فاخذ بيدي واقعدني هذا المقعد اُقرئ

(الدارمی ص ۴۳۷ ج ۲)

حضرت عاصم بن بہدلہ حضرت مصعب سے اور وہ اپنے والد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن پاک کا علم حاصل کریں اور قرآن پاک سکھائیں عاصم بن بہدلہ فرماتے ہیں کہ حضرت مصعب نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس جگہ بٹھا دیا کہ پڑھاؤں ۔

نوٹ : امام عاصمؒ قراء کوفہ میں مشہور قاری ہیں ، انہوں نے زِرّ بن حُبَیش اور ابو عبد الرحمٰن السلمی سے علم قراءت حاصل کیا تھا ۔

(تہذیب التہذیب ص ۳۸ ج ۵)

رہے ہیں۔ ابن اشعث رح کے ساتھ ۸۳ھ میں بحری جنگ میں شہید ہوئے۔
مقدمہ نصب الرایہ ۴۲)

معاذ اللہ! کوئی شخص قرآنِ پاک یاد کر کے بھلا دے تو یہ بہت بڑا گناہ اور محرومی ہے

۱) عن عبد اللہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بئسما لاحدکم یقول نسیت اٰیۃ من کیت و کیت بل ھو نُسّی واستذکروا القراٰن فانہ اسرع تفصّیا من صدور الرجال من النعم من عقلہا۔ (الدارمی ۳۹ ع)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رض جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: "بہت بری بات ہے کہ تم میں سے کوئی یہ کہے کہ میں کوئی آیت فلاں فلاں مقام سے بھول گیا ہوں (یہ نہیں ہوتا) بلکہ اسے یہ بھلادی گئی۔ اور قرآن پاک کو یاد کرتے رہو کیونکہ وہ لوگوں کے سینوں میں سے اس سے بھی زیادہ جلدی چلا جاتا ہے، جانور رسیاں باندھنے کی جگہ سے اگر اسے نہ باندھا جائے تو نکل جاتا ہے!

۱) عن عقبۃ بن عامر عن انہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال تعلموا کتاب اللہ و تعاھدوہ واقتنوہ وتغنوا بہ فوالذی نفسی بیدہ لھو اشد تفلتا من المخاض فی العقل۔ (الدارمی ص ۳۹ ع)

حضرت عقبہ بن عامر رض فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کتاب اللہ سیکھو، اس کا خیال رکھو۔ اسے (یادداشت میں) جمع رکھو اور اسے خوش الحانی سے پڑھو قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، وہ اس سے بھی زیادہ تیزی سے نکل جاتا جیسے چلنے والا تیار جانور اپنی رسیوں سے۔

ف: حدیث شریف میں تغنوا بہ کا لفظ آیا ہے اس کی دو تفسیریں کی گئی ہیں ایک یہ کہ خوش الحانی سے پڑھو۔ دوسری یہ کہ قرآنِ پاک کی وجہ سے مخلوق سے بے نیاز رہو!!

تفنی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ذکر کردی جائے: ثابت بن عجلان بیان فرماتے ہیں کہ:

ثابت بن عجلان الانصاری قال کان یقال ان اللہ لیرید العذاب باھل الارض فاذا یسمع تعلیم الصبیان الحکمۃ صرف ذالک عنھم۔ قال مروان بن محمد یعنی بالحکمۃ القرآن۔

(الدارمی ص ۳۹ ج)

حضرت ثابت بن عجلان انصاریؒ نے بتلایا کہ یہ کہا جاتا تھا کہ حق تعالیٰ اہل زمین کو عذاب میں مبتلا کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں، لیکن جب بچوں کے قرآن پاک پڑھنے کی طرف اس کی صفت سمع متوجہ ہوتی ہے تو اس عذاب کو ان سے ٹال دیتا ہے۔

نوٹ: ثابت بن عجلان انصاری حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت ابوامامہؓ کے شاگرد ہیں (تہذیب التہذیب ص ۱۰ ج ۲)

● صحابہ کرامؓ قرآن پاک کا اکرام کس طرح کرتے تھے ملاحظہ ہو!

عن ابن ابی ملیکۃ ان عکرمۃؓ بن ابی جھل کان یضع المصحف علی وجھہ ویقول کتاب ربی کتاب ربی۔

(الدارمی ج ع)

ابن ابی ملیکہ فرماتے ہیں کہ ابوجہل کے بیٹے حضرت عکرمہؓ قرآن پاک کو اپنے چہرہ پر رکھ لیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ میرے پروردگار کی کتاب ہے، یہ میرے رب کی کتاب ہے۔

قرآن پاک دیکھ کر پڑھنا بہت سے اسلاف سے منقول ہے بعض حضرات تمام دیکھ کر پڑھتے تھے اور بعض کسی اور وقت مثلاً ابن ابی لیلیٰ صبح کو پڑھتے تھے

ثابت قال کان عبد الرحمٰن بن ابی لیلی کان اذا صلی الصبح یقرأ المصحف حتی تطلع الشمس قال وکان ثابت یفعلہ۔

(الدارمی ص ۴۰ ج)

حضرت ثابتؒ فرماتے ہیں کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ جب صبح کی نماز سے فارغ ہوتے تھے تو طلوع آفتاب تک مصحف (دیکھ کر) تلاوت کرتے تھے اور حضرت ثابت بھی اسی طرح کرتے تھے۔

نوٹ: حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے ایک سو بیس صحابہ کرام کو پایا ہے اور فاضی

عہدِ حاضر میں
سُنّتِ رسولؐ کی اہمیّت

ڈاکٹر الطاف جاوید

اس عہد میں جب کہ ایک طرف اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی ضرورت اور شدید احساس
ی حرارت تمام مسلم اقوام کے قلوب کو گرما رہی ہے اور ایک عظیم تحریک بتدریج بڑھتی
ر پھیلتی چلی جا رہی ہے اور دوسری طرف پاکستان میں نظامِ مصطفٰے کے نفاذ کی تیار
ریاں ہو رہی ہیں۔ ایسے مناسب ماحول میں سنّت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تمام
ہلوؤں کا مطالعہ نہ صرف مفید رہے گا بلکہ یہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔

سُنّت کی اصطلاح اسلامی ادب میں اگرچہ صحابہ کرام کے افعال و اقوال اور
ئمہ قانون کے لئے بھی استعمال کی جاتی ہے، مگر یہاں اس اصطلاح کا دائرہ
ف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے افعال و اقوال تک محدود ہے۔

سنّت کا مفہوم اور تعریف جیسا کہ برِّ صغیر کے ممتاز عالمِ دین مولانا
د تقی امینی صاحب نے اپنی کتاب: "فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر" میں
ن بتایا ہے کہ: "سُنّت کے لغوی معنی مرّوجہ طور طریقہ کے ہیں لیکن فقہا کی اصطلاح
ں سُنّت سے مراد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے تمام اقوال و افعال، اور
سروں کے وہ اقوال و افعال مراد ہیں جن سے آپ نے سکوت فرمایا اور جن
قائم و برقرار رکھا!"—— صحابہ کرام رضہ کے اقوال و افعال بھی اس بنیاد پر سنّت
ں داخل ہیں کہ اُن کے پاس رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قولی یا فعلی سند
رد ہو گی۔ "نور الانوار" میں تصریح کی گئی ہے کہ: "سُنّت کا اطلاق رسول اللہ
ی اللہ علیہ وسلّم کے قول و فعل پر، آپ کے سکوت اور صحابہؓ کے اقوال و افعال
ہوتا ہے"۔ البتّہ حدیث کا محل خاص ہے کہ اس کا اطلاق فقہا کے نزدیک
ف رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اقوال پر ہوتا ہے۔ زیرِ مطالعہ مضمون بحث

جو شخص قرآن پاک یاد کر کے بھلا دے اس کے لئے شدید وعید آئی ہے۔ والعیاذ باللہ۔

(۱۵) عن سعد بن عبادة ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال ما من رجل یتعلم القرآن ثم ینساہ الا لقی اللہ یوم القیامة وھو اجذم۔
(الدارمی ص ۴۳۷)

حضرت سعد بن عبادہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو آدمی بھی قرآن پاک سیکھتا ہے پھر بھول جاتا ہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے جذام کی حالت میں ملے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی نافرمانی اور معصیت سے بچائے، توفیق مرضیات اور اسلام پر استقامت بخشے، اپنی رضائے کاملہ نصیب فرمائے۔ آمین! دل تو چاہتا تھا کہ چالیس احادیث ہو جائیں، اسی لئے اس مضمون میں صرف احادیث ان کے عنوانات اور ترجمہ پر اکتفا کیا تھا۔ لیکن مضمون بہت طویل ہو جاتا، خدا کرے کسی وقت یہ ارادہ پورا ہو جائے۔

۲۵ رجمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ھ
۱۲ اپریل ۱۹۸۰ء

حامد میاں عفی عنہ
جامعہ مدنیہ کریم پارک۔ راوی روڈ۔ لاہور

(بقیہ ص ۷۸)

ایک سچے امتی کی طرح اس وعدہ کا بھی ایفاء کریں گے جو حجۃ الوداع میں جبل رحمت پر کھڑے ہو کر میدان عرفات میں محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی امت سے لیا تھا کہ: "گواہ رہنا! میں نے تم تک خدا کا دین پوری طرح پہنچا دیا اور اب تمہیں ان لوگوں تک پہنچانا ہے جو کہ یہاں موجود نہیں ہیں!"

۸۰-۴-۱۵

یلکَ مِنۡ رَّبِّکَ ط (اے رسولؐ! جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل
یا گیا ہے آپ اس کی تبلیغ کریں!)۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبلغ
یا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ شرح تبلیغ اور فیصلہ کی صورت یہ تھی کہ رسول اللہ
ؐ اللہ علیہ وسلم اپنے قول یا فعل سے یا دونوں سے یا مروجہ طریقوں پر سکوت فرما
انہیں سکھنے کے لئے قرآن حکیم کے مطالب و مقاصد کی وضاحت فرماتے تھے۔
ں بنا پر سنت کے نام سے کوئی شے ایسی نہ ہونی چاہیئے جس کے معانی و
اصد کی دلالت اصولی طور پر قرآن حکیم میں موجود نہ ہو۔ علامہ شاطبی فرماتے
ں کہ: "لیس فی السنۃ الا و اصلہ فی القرآن!" (حدیث میں کوئی بیان
یا نہیں کہ جس کی اصل قرآن حکیم میں نہ ہو!)۔ اسی طرح قرآن حکیم کی ایسی تعبیر
بیہ درست نہ ہوگی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ توجیہ و تعبیر کے
ف البتہ علیہ روایت کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ علامہ شاطبی نے "الموافقات"
ں لکھا ہے کہ: "پس حدیث قرآنی احکام و معانی کے لئے تفسیر اور شرح کی حیثیت
ں ہوگی!"

صحابہؓ کا طرزِ عمل | سنت کی نسبت صحابہؓ کے طرزِ عمل پر روشنی ڈالتے
ہوئے مولانا محمد تقی امینی فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
نت پر اسی حیثیت سے عمل درآمد ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا
رِ عمل جو ہدایت الٰہی کی مزاج شناسی میں سب پر فوقیت رکھتے تھے۔ قانون کے بارے
ں یہ منقول ہے کہ ـــ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے سامنے جب کوئی قانونی معاملہ آتا
پہلے قرآن حکیم میں اس کا حل تلاش کرتے، اگر وہاں نہ ملتا تو سنت کی طرف رجوع
تے۔ اگر سنت میں بھی نہ ملتا تو لوگوں سے دریافت کرتے کہ اس معاملہ میں
ول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ کا کسی کو علم ہے؟ بسا اوقات صحابہؓ ہی سے
یہ لوگ بتا دیتے کہ رسول اللہ صلعم نے اس معاملہ میں یہ فیصلہ فرمایا۔ سنت مسے
مل جانے پر صدیق اکبرؓ خوش ہوکر فرماتے کہ: "اللہ کا شکر ہے جس نے ایسے
ں کو باقی رکھا جن میں ہمارے نبی کی سنتیں محفوظ ہیں!" ـــ حضرت عمرؓ نے ایک
نع پر فرمایا کہ: آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو قرآنی شہادت میں تم سے جھگڑیں گے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل اور سکوت سے ہے، خواہ ان کا نام سنت رکھا جائے یا انہیں حدیث کہا جائے ۔۔۔!!

اصطلاح سنت کی مزید تشریح کرتے ہوئے مولانا موصوف فرماتے ہیں:

"دراصل قرآن حکیم نقشۂ تعمیر ہے اور سنتِ رسول اس نقشہ کے مطابق بنائی ہوئی عمارت ہے۔ نقشہ یعنی کتاب کے ساتھ انجینئر یعنی رسول کے بھیجنے کے اصول پر اس وقت سے برابر عمل ہو رہا ہے جب سے ہدایتِ الٰہی کے سلسلہ کی ابتدا ہوئی ہے!"

اس عہد میں سنت کے مطالعہ کی اور بھی اہمیت بڑھ جاتی ہے جب کہ ہمارے ملک میں قرآن حکیم اور اسلامی ادب کے مفسر اور شارح موجود ہیں۔ جنھوں نے مملکتِ پاکستان کے دستور میں قرآن کے ساتھ لفظ سنت کی موجودگی پر شدید احتجاج کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ دستور کی اس شق سے جس میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ "مملکت کا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا" لفظ سنت کو خارج کر دیا جائے اور محض کتاب کا لفظ رہنے دیا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ سنت کی بنیاد کو قرآنِ حکیم، صحابہ کے طرزِ عمل اور ائمہ قانون کی تصریحات میں تلاش کیا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد تقی امینی صاحب مدظلہٗ کی مذکورہ کتاب اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتی ہے۔

قرآن میں سنت کی بنیاد | سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں ہے کہ:

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْھِمْ وَلَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۝ ["اور ہم نے آپ پر الذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے وہ ان پر واضح کر دیں اور تاکہ وہ لوگ غور کریں!"] — اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن حکیم کا شارح قرار دیا گیا ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۰۵ میں تصریح ہے کہ: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ (اے پیغمبر! ہم نے آپ پر "الکتاب" سچائی کے ساتھ نازل کر دی ہے تاکہ جیسا کچھ اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا ہے آپ اس کے مطابق فیصلہ کریں۔) پھر المائدہ کی ۶۷ ویں آیت میں ہے کہ: یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ

دوسرے سے الگ کرنا نہ صرف ناممکن ہے بلکہ یہ غیر مستحسن بھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پس منظر کو سامنے رکھے بغیر، جس میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم مصروفِ عمل رہے اکیلے قرآن کا مطالعہ ناقابلِ فہم رہتا ہے۔ چنانچہ ان معنوں میں آپؐ کا عمل اتنی ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے، جس قدر قرآنی احکام۔ رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہی عمل ہے جسے سُنّت یا آپؐ کا اُسوۂ حسنہ سمجھنا چاہیئے۔ اسی کی روشنی میں ہم قرآن سمجھ سکتے اور اپنی روزمرّہ زندگی نیز قانون سازی کے لئے اس سے ہدایت اور راہنمائی حاصل کر سکتے ہیں!"

احادیث کی اہمیّت کے متعلق علاّمہ اقبال فرماتے ہیں:

"لہٰذا احادیث کا مطالعہ اگر گہری نظر سے کیا جائے اور ہم ان کا استعمال یہ سمجھتے ہوئے کریں کہ وہ کیا روح تھی جس کے ماتحت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے احکامِ قرآنی کی تعبیر فرمائی، تو اس سے ان قوانین کی حیاتیاتی قدر و قیمت کے فہم میں اور بھی آسانی ہوگی جو قرآنِ حکیم نے قانون کے متعلق قائم کئے ہیں۔ پھر یہ اُن اصولوں کی حیاتیاتی قدر و قیمت ہی کا پورا پورا علم ہے جس کی بدولت ہم اپنی فقہ کے بنیادی مآخذ کی از سرِ نو تعبیر اور ترجمانی کر سکتے ہیں!"

پھر فرماتے ہیں کہ:

"بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سب سے بڑی خدمت جو محدّثین نے شریعتِ اسلامیہ کی سرانجام دی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے مجرّد غور و فکر کے رجحان کو روکا اور اس کی بجائے ہر مسئلے کی الگ تھلگ شکل اور انفرادی حیثیت پر زور دیا۔!"

صحابہؓ کے طرزِ عمل اور ائمۂ قانون کے رویّے اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور علاّمہ اقبال مرحوم کے اقتباسات سے واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن حکیم کو سُنّت اور حدیث کے پس منظر سے الگ کر کے مطالعہ کرنا ہمیں اس کے صحیح فہم تک نہیں پہنچاتا۔ کسی واقعہ یا تحریر کو اس کے تاریخی اور عملی پس منظر سے علیحدہ کرنا دراصل اسے بےجان مردہ کر دینے کے مترادف ہوتا ہے جس کے بعد ہر شخص اپنے ذاتی خیالات کی روشنی میں اس کی تعبیر کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے اس تخلیقی مفہوم کو پورا کرنے سے محروم رہ جاتا ہے جس کے لئے وہ معرضِ وجود میں آیا تھا۔

ایسی صورت میں سنتوں کے ذریعہ اُن پر حجّت قائم کرنا کیونکہ اصحابِ سُنن کتاب اللہ کو خوب جانتے ہیں!"

ایک موقع پر سُنّت کی قانونی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا لوگو! تمھارے لئے سنّتیں مقرّر کر دی گئی ہیں، فرائض کی تعیین ہو چکی اس طرح تم کو واضح راستہ پر لگا دیا گیا۔ اب اگر تم لوگوں کی وجہ سے دائیں بائیں دیکھو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے! اسی طرح دیگر صحابہؓ و تابعین کا بھی یہی عمل سنّت کے بارے میں منقول و محفوظ ہے اور سنّت کی نوعیت اور مقام متعین کرنے میں ہمارے لئے دلیل راہ رکھتا ہے۔

ائمۂ قانون کا رویّہ! ائمۂ قانون نے بھی قرآن فہمی اور قانون کے مرحلہ میں سنّت کو خاص اہمیت دی ہے۔ امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ "اگر سنّتیں نہ ہوتیں تو ہم میں سے کوئی قرآنِ حکیم کا فہم نہ حاصل کر سکتا!" ۔۔۔ امام شافعی کا ارشاد ہے کہ: مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جب کسی پر رسول کی سُنّت واضح ہو جائے پھر اس کے لئے کسی کے قول کی وجہ سے اس کو چھوڑنا جائز نہیں!" ۔۔۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ: "جس نے رسول اللہ کی حدیث کو رد کیا وہ ہلاکت کے کنارے پر آ گیا!"۔

مولانا فرماتے ہیں کہ ان تمام تصریحات سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، پہلی یہ کہ قرآن فہمی میں سنّت کی تشریحات و توضیحات ہی کو اوّلیّت حاصل ہے اور دوسری یہ کہ سنّت قرآنِ حکیم کی شرح و تعبیر اور اصول ذنگ میں اسی سے ماخوذ ہے۔

اسی سلسلے میں "ادارۂ طلوعِ اسلام" کے بانی جناب غلام احمد پرویز کے بیان پر ستمبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ماہنامہ فکر و نظر کے ایڈیٹر پروفیسر محمد سرور صاحب نے مفصّل تبصرہ کیا تھا اور بھرپور جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ اس تبصرہ پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کا سنّت کی اہمیت کے متعلق ایک بیان کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے جو کتاب اللہ کے ساتھ سنّت کی اہمیت اور ضرورت پر کما حقہٗ روشنی ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

"سب سے پہلے تو یہ ملحوظ رہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ۲۳ سالہ جدّوجہد قرآن سے پوری طرح مربوط ہے۔ آخر قرآن کا نزول کوئی خلا میں تو نہیں ہوا۔ وہ آپ کی طویل جدّوجہد کے دوران آپ کی راہنمائی کرتا رہا، اس لئے ایک کو

تیسرا مدنی دَور سے متعلق ہے جب مملکت وجود میں آ چکی تھی۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عام طور پر سنّت کی اصطلاح کو یا تو فقہی اور قانونی حدود تک محدود رکھا گیا ہے یا پھر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذاتی حالات و شمائل کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اس مفہوم میں قبل از نبوّت اور مکی دَور کے نبوی عمل کو زیرِ غور نہیں لایا گیا۔ چونکہ مدینہ طیّبہ کی نئی مملکت کے استحکام اُسے دشمن کی دست بُرد سے محفوظ رکھنے اور معاشرتی اداروں کو نئی اساس پر تعمیر کرنے کے تقاضے اوّلین حیثیّت رکھتے تھے۔ اس لئے اس انہماک میں پہلی دونوں باتوں کی طرف دھیان نہیں دیا جا سکا۔ بعد میں یہی رویّہ قرآنِ حکیم کی شرح و تعبیر میں بھی اپنا لیا گیا اور اسلامی آئیڈیالوجی اور اسے معاشرتی سطح پر قائم کرنے کے لئے نبیٔ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مکّی دَور میں مخالف قوّتوں کے خلاف جدّ و جہد کو نظر انداز کر دیا گیا۔ میرے نزدیک ایک تصوّرِ سنّت کے پہلے دو پہلوؤں کی اہمیّت اس کے تیسرے یعنی مدنی پہلو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

لہٰذا غارِ حرا میں عملِ تحنّث کے مضمرات پر جب ہم غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قبل از نبوّت نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنے عربی معاشرہ اس کے ارد گرد رومی و ایرانی سامراجوں کی وجہ سے جو معروضی حقیقتیں موجود تھیں ان کا غائر مطالعہ فرمایا کرتے تھے۔ مکّی دَور کے قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سیاسی، معاشی اور فکری نظامات، معاشرہ کی طبقاتی ترکیب (COMPOSITION) رومی و ایرانی سامراجوں کے عمرانی، فکری اور نفسیاتی اثرات، یہودی، نصرانی اسماعیلی مذہب کی دینِ ابراہیمی کے مقاصد و غایات سے علیحدگی، اور یونان، ہند، ایران اور اسکندریہ کے علمی مراکز سے اٹھنے والے فلسفیانہ دبستانوں کے افکار سے حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام نہ صرف آگاہ تھے، بلکہ اُن پر تنقیدی نظر بھی رکھتے تھے۔ ان حالات کے مطالعہ سے پیدا ہونے والے نظریاتی الجھاؤ کو اگرچہ وحیِ الٰہی کی روشنی نے حل کیا اور وحیٔ الٰہی کی مدد سے جدّ و جہد کے ہر مرحلہ پر آپ کی راہنمائی کرتی رہی۔ مگر اس سے ان افراد کے لئے جو اپنے اندر فکری صلاحیت رکھتے ہیں، سنّتِ تحنّث کی اہمیّت کم نہیں ہوتی۔ اگر نبی کے ساتھ وحیٔ الٰہی کی مدد ہوتی ہے تو غیر نبی کے ساتھ وجدان کی

آج قرآن حکیم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ جدوجہد اور ا
کے تاریخی پس منظر سے علیحدہ کر کے مطالعہ کرنے کا انجام ہمارے سامنے ہے کہ
بھی تفسیر و تشریح اتنی اہلیت نہیں رکھتی کہ وہ قرونِ اولیٰ کی طرح مسلمانو
کے تنِ مردہ میں پھر سے نئی جان پیدا کر دے۔

سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مفہوم کے تعین، نظام مصطفیٰ
نفاذ میں اس کی اہمیت اور قانون سازی میں کتاب اللہ کے ساتھ سنّت سے
استفادہ کی ناگزیری کے ثبوت کے بعد تصوّرِ سنّت کے دوسرے پہلوؤں کا جا
لینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

لیکن اس جائزہ سے پہلے ایک بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ م
حیات، جن میں اسلامی مسائل بھی شامل ہیں، کو مطالعہ کرنا اور ان کی طرف
تنقیدی رویّہ اپنانے کے دو طریق ہیں۔ ایک میکانکی جس میں بندھے ٹکے نقطہ
اور پہلے سے قائم شدہ حدود کے دائرہ میں ہی رہتی ہے۔ اس سے باہر قدم نہ
رکھنی اور مطالعہ کنندہ یا ناقد اپنے مطالعہ اور تنقید میں اپنے عہد کے مخصوص
سیاسی اور فکری تقاضوں کو شامل نہیں کرتا اور ان کی روشنی میں ان کی جانچ
نہیں کرتا۔ دوسرا تخلیقی جس میں موضوع کی حکمت اور لم کو سمجھ کر اپنے عہد
فکری اور عمرانی مطالبوں اور تقاضوں کو بھی شامل کرتا ہے اور ان کا حل تلاش کر
ہوئے پہلے سے قائم شدہ حدود سے باہر نکل کر ان سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ برِ
پاک و ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال، ڈاکٹر فضل الرحمن اور
عبیداللہ سندھی اور مولانا محمد تقی امینی جیسے اصحاب اس تخلیقی مطالعہ کرنے وا
مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ دونوں منہاج اپنے پس منظر
میں دو مختلف تصوّرِ حیات و کائنات اور علمی مسائل کی طرف مختلف رویّوں
حامل ہیں۔

چنانچہ تخلیقی منہاج کے مطالعہ سے سنتِ رسول اللہ صلی کے تصوّر
کئی ایک پہلو سامنے آتے ہیں، جن میں سے یہاں صرف تین کا ذکر کیا جائے گا۔
قبل از نبوت جسے سُنّتِ تحنّث کہا جا سکتا ہے۔ دوسرا بعد از نبوت مکّی دور او

فرانس کے بعد انقلابِ روس پر منتج ہوا۔

مکّی دَور کی اس سنّتِ عظیمہ کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر مسلم پسماندہ اور محکوم معاشروں کو سامراجی غلامی اور نکبت و افلاس کی ظلمتوں سے نکال کر انہیں حرّیت و خوشحالی کی روشنی میں لانا تو ایک طرف رہا خود مسلمان معاشرے بتدریج محکومی اور افلاس وجہالت کی پستیوں میں گرتے چلے گئے، اور حالت یہ ہو گئی کہ اگر کسی مسلم معاشرہ کو اپنی زبوں حالی پر آگہی حاصل بھی ہوتی اور اپنی آزادی و خوشحالی کے لئے اس نے جدّوجہد بھی شروع کی تو دلّی کے ارباب بست وکشاد کو نظریاتی سیاسی اور معاشی وجدان حاصل کرنے کے لئے دوسروں کی طرف دیکھنا پڑا۔ الجزائر، شام، مصر فلسطین، یمن، ترکی اور دوسرے مسلم معاشروں نے اپنی جدّوجہد میں نظریاتی، اور مادّی امداد زیادہ تر یا تو اشتراکی روس سے حاصل کی اور یا پھر مغربی یورپ سے۔ اگر مسلم دانش نے مکّی دَور کی جدّوجہد کے مافیہ اور اس کے مطویات پر غور کیا ہوتا تو اسے نہ صرف یہ کہ غیروں کی طرف نہ دیکھنا پڑتا بلکہ سیاسی آزادی، معاشی خوشحالی اور تہذیبی ارتقاء کا وہ پرچم جو آج مغربی یورپ کے بعد اشتراکی قوّتوں کے ہاتھ میں خود مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتا، اور اقوامِ عالم کی قیادت اُن کے نصیب میں لکھی جا چکی ہوتی یعنی مگر تو اپنی خودی نہ کھوتا، نہ تاریخ برعکس اں نہ ہوتا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے ہی ہم نے اپنی اداؤں کو جن خطوط پر ڈھالنا شروع کیا تھا، اس کے منطقی نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ کائنات اور معاشرہ میں پائی جانے والی ارتقاء پذیر حرکت کی نفی، زندگی کا جامد اور ٹھوس تصوّر، آبائی تقلید، راسخ عقیدۂ اسلام کی عالمگیر، انقلابی اور انجذابی (ASSIMILATIVE) اقدار سے بے اعتنائی، ذہنی لحاظ سے مفلس مگر نظمِ مذہبی پیشوائیت کی مضبوط گرفت اور ایسے ہی دوسرے ظلمت پسند، منفی اور بانجھ تصوّرات نے کچھ اس طرح ہمیں گھیر رکھا ہے کہ حالات کی ستم ظریفی سے تنگ آکر ہم کبھی اس سے نکلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو مزید گرفتار ہو جاتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ جنّت سے نکلنے کے بعد آدمی بیگانگیِ ذات (SELF-ALIENATION) کے جس بھنور میں پھنس گیا تھا، ہم نے بعثتِ انبیاء کی تحریک کو اس تاریخی پس منظر میں رکھ کر کبھی مطالعہ کرنے کی کوشش

اس کے پیروؤں کی بے اعتنائی اگرچہ بڑے بڑے عظیم الشان معبد موجود ہیں اور کتب الٰہی کے مفسر و شارح بھی ہیں اور مذہب کے نام پر بڑی مضبوط اور منظم کلب کی تنظیمیں بھی موجود ہیں مگر مذہبی حقیقت گم ہو چکی ہے۔ اس تمام صورتِ حال کو بدلنے کے لئے تیرہ برس تک ایک جاں گسل اور تابناک جدّو جہد کا آغاز کیا گیا۔ غائر مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس ساری تباہ حالی اور مفاسد کا ذمّہ دار صرف مترفین کے طبقہ کو قرار دے کر جدّو جہد کا رخ اس طبقہ کو اقتدار اور استحصال شدہ دولت سے الگ کرنے کی طرف تھا۔ جیسا کہ مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی نے سورۂ بنی اسرائیل کی سولھویں آیت کی شرح میں بتایا ہے کہ یہ طبعی اور فطری عالمگیر قانون ہے کہ قوموں کی تباہی کا باعث مترفین طبقہ کی بد اعمالیاں ہوتی ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مکّی دَور کی جدّو جہد کا مفہوم یہ ہے کہ محکوم اور پس ماندہ معاشروں میں نئی زندگی پیدا کرنے اور ان کی معاشی، سیاسی ذہنی حالت کو بدل کر انہیں انسانی سطح پر لانے کے لئے مترفین طبقوں کی دولت اور اقتدار پر سے بالا دستی ختم کی جائے ختم کی جائے تاکہ افرادِ معاشرہ کے معاشی اور تہذیبی حالات میں فارغ البالی، ذہنی آزادی اور حسن پیدا ہو سکے اور انسان جو مجموعی طور پر اپنی محنت کی پیداوار، ایک دوسرے انسانوں سے باہمی تعلّقات کی اخلاقی و انسان دوستی کی اساس اور سب سے بڑھ کر اپنے نوعی تقاضوں سے علیحدہ ہو چکا ہے اور غیر انسانی ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اپنی فردوس گم گشتہ کو پھر سے حاصل کر کے اپنی تخلیقی غایت کو حاصل کر سکے۔ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں بعثتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض و غایت یہی بتائی ہے۔

میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی اور معاشرتی محنت کے لئے مکّہ کے مالدار طبقہ کے خلاف انقلابی جدّو جہد بھی ختمِ نبوّت کے متضمنات میں سے ہے مکّی دَور کے اس سارے (PERSPECTIVE) سے مسلمان تو کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے مگر پھر یہ یورپ ہی تھا جس نے سُنّتِ تحنّث کے بتائے ہوئے راستہ پر چل کر اپنی معاشرتی قوّتوں کو جاگیرداری اور ملوکیّت کے قبضہ سے آزاد کرا لیا۔ اس طرح وہاں کی زندگی کے حوالی میں فکری اور معاشرتی انقلابات کا سلسلہ شروع ہو گیا جو بالآخر انقلاب

ظوں میں ہمیں سُنّتِ رسولؐ کی نظریاتی بنیاد کو جانچنا پڑے گا۔ دوسری قابلِ طلب
ت یہ ہے کہ بعثتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو متعین کرنا ہوگا یعنی آپ
دنیا اقوامِ عالم کی طرف قیامت تک کے تمام عہدوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے
یک مخصوص عہد میں محض عرب معاشرہ کی اصلاح کے لیے ؟

ہم دیکھتے ہیں کہ ظہورِ اسلام کے وقت یونان، ہند، ایران اور اسکندریہ کے
لمی مراکز میں کائنات، حقیقتِ مطلقہ اور انسانی معاشرہ کے متعلق تین رویے پائے
اتے تھے۔ ایک یہ کہ حرکت و تغیر (MOVEMENT AND CHANGE
کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ حرکت تو موجود ہے مگر دوری CYCLIE ہے
یسرا یہ کہ حرکت ارتقاء پذیر یعنی SPIRAL ہے۔ قرآنِ حکیم نے پہلے دونوں رویوں
کو رد کر دیا، اور تیسرے رویّہ کی تائید کی۔ یعنی تخلیقی اور تاریخ کا ہر دور اپنے ماقبل
دور سے ترقی یافتہ ہوتا ہے اور ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے اپنے ماسبق دور سے مختلف
ور نئے مطالبات اور تقاضوں کا حامل ہوتا ہے۔ جنھیں حاصل کئے بغیر حیاتِ انسانی
نہ تو پُرامن اور بار آور ہو سکتی ہے اور نہ ہی آگے قدم بڑھا سکتی ہے اور یہ ارتقائی
حرکت ایک متعین منزل یا نصب العین بھی رکھتی ہے جس کے حصول کے لیے وہ مرحلہ
بمرحلہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اس مسئلہ پر روشنی
ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ۔ UNIVERSE IS CHANGEABLE IN-
-ITS NATURE TO INCREASE AND FINITE.
کائنات اپنی فطرت میں تغیر پذیر ہے، ارتقاء پذیر ہے اور محدود یعنی اپنی ایک
انتہائی منزل رکھتی ہے۔ لہٰذا کوئی فکر، کوئی عمل اور کوئی قانون آخری اور قطعی
نہیں ہوتا بلکہ وہ حرکت کے ارتقاء یافتہ مرحلہ میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی تبدیل ہو
جاتا ہے۔ قدیم افکار اور معاشرتی ادارے مر جاتے ہیں اور نئے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔

دوسری بات کے متعلق نبی اکرمؐ کے خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے ان کی حیثیت
عالمگیر اور دائمی ہو گئی ہے۔ اس لیے کسی مخصوص دور کے فیصلے آنے والے دور
پر خارجی اور میکانکی طور پر منطبق نہیں کیے جا سکتے۔ ہر دور مسائل کے متعلق اپنے
فیصلے خود کرتا ہے، البتہ پہلے ادوار کے فیصلے مستقبل کے ادوار کے لیے "نظیر" کی حیثیت

[illegible] اور ان میٹا فزکس کے عمرانی، نظریاتی اور جمالیاتی مضمرات پر کچھ
[illegible] کی [illegible] رحمۃ للعالمین نے اپنی تاریخ ساز جدّ وجہد شروع
کی۔

[illegible] میں تخلیق کی [illegible] فاسد اور [illegible] معاشرہ
[illegible] لئے جدّوجہد کی سنت [illegible] انقلاب میں مدنی دور کی سنت کے
اور [illegible] خلافت میں [illegible] انقلاب کی کامیابی کے بعد نئی مملکت کی بنیاد
[illegible] سے داخلی اور خارجی مخالف قوتوں سے محفوظ رکھنا اور قدیم معاشرہ
[illegible] تخلیق پانے والے [illegible] تعلیمی اور تہذیبی اداروں کو ان
[illegible] قائم کرنے اور پروان چڑھانے
[illegible] میں دو اہم سوالات
[illegible] (METHOD)
[illegible] قرآن کی دائمی اور عالمگیر ہدایات سے مختلف
[illegible] اخذ کردہ [illegible] جنہیں
[illegible] رکھتے تھے یا بدلتے ہوئے حالات
[illegible]

[illegible] طلب ہے جس کی یہ مختصر سی
[illegible] بات کی جا سکتی ہے۔ موجودہ عہد
[illegible] اور معاشرتی حالات کے حامل مسلم
[illegible] افراد اور حیات [illegible] عصر کی حیثیت
[illegible] کے صحیح جوابات پر انحصار رکھتا ہے اس
[illegible] کہ قرآن حکیم اپنے تصوّرِ حیات و
[illegible] کا ہی ایک حصّہ ہے کسی اتفاقی
[illegible] جو بتدریج ایک متعین منزل یا
[illegible] اپنے سابق مرحلہ سے زیادہ
[illegible] آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ دوسرے

جس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تحریفات کے آہنی شکنجہ میں کس دیا گیا ہے۔ دوسری جگہ انہوں نے امام ابو یوسف کی ائمۂ فقہاء کے متعلق یہ رائے دی ہے کہ امام ابو یوسف کے نزدیک ائمۂ فقہاء سنّتِ نبوی کی توسیع اور زندہ سنّت کی تخلیق کرنے کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔"

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے چھٹے خطبہ میں جس کا عنوان:

"THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM." ہے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ: "مجھے اس امر کا یقین ہے کہ جونہی فقۂ اسلام کا مطالعہ غائر نظروں سے کیا گیا۔ اس کے موجودہ ناقدین کی یہ رائے بدل جائے گی کہ اسلامی قانون جامد یا مزید نشو و نما کے ناقابل ہے۔"

امام عبید اللہ سندھی نے حکمت اور فقہ کے امتیاز اور باہمی تعلق پر قابلِ قدر بحث فرمائی ہے۔ اُن کے نزدیک سُنّتِ نبویؐ قرآنِ حکیم کی دائمی حکمت کا عربی جامہ ہے، جس کی نظیر کو سامنے رکھ کر ہر عہد کے فقہاء نے اپنے اپنے مخصوص جاموں کو تیار کیا۔ انہوں نے امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے حوالے سے سنّت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی نے تفہیمات کی جز اوّل میں: "النبوّة تحت الفطرة" کے عنوان کے ماتحت بتایا ہے کہ: "کسی قوم میں جب کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے حالات پر نظر ڈالتا ہے اور اُن کے اعتقادات اور اعمال کو دیکھتا ہے، جو اعمال اور اعتقادات تہذیبِ نفس کے لئے مفید و معاون ہوتے ہیں ان کو تو وہ رہنے دیتا ہے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے اور جو تہذیبِ نفس کے لئے مضر ہوں، اُن سے منع کرتا ہے۔ پھر فرمایا کہ نبوّت کا اصل مقصد تہذیبِ نفس ہوتا ہے تاکہ انسان میں جو بھی استعداد ہو وہ اپنے کمال کو پہنچ سکے۔"

اس اقتباس سے اس منہاج کا بھی تعین ہوتا ہے جس کے ذریعے نبوّت اپنے مخصوص معاشرہ میں سُنّت اللہ کے عالمگیر اصولوں سے قوانین اخذ کرتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی مرحوم "الکلام" میں شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے حوالے سے اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: "اوپر بیان ہو چکا ہے کہ پیغمبر جس

اختیار کرسکتے ہیں۔ سنت کے اس پہلو پر امام رازی نے مطالب عالیہ میں، ابنِ رشد نے فصل المقال اور کشف الادلّہ میں، مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے "اسلامی منہاج تاریخ کے آئینے میں" کے اندر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

سنت کے موضوع پر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب: ———

"THE ISLAMIC METHODOLOGY IN HISTORY."

میں نہایت دقیق بحث کی ہے۔ یہاں چند لفظوں میں اس کے مرکزی مباحث کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک سنت کوئی جامد تصوّر نہیں ہے۔ انہوں نے مدنی معاشرہ میں سُنّتِ نبویؐ کے متعلق: "زندہ اور جاری سُنّت" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ امام ابو یوسف اور شامی فقیہ امام اوزاعی کے باہمی فقہی اختلاف پر بحث کرتے ہوئے سنت کے دو مفہوم سامنے لائے ہیں یعنی سنت ایک طرف اس عمل کے اعتبار سے جو مسلمانوں میں رائج تھا اور دوسری طرف اس خصوصی عمل کی رُو سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح مکہ اور دوسرے مواقع پر سرزد ہوا۔ دونوں فقیہ اپنے اختلافات کے اظہار میں لفظِ "سنت" ہی استعمال کرتے ہیں۔ سنت کے مفہوم کو دوسری صدی ہجری میں جب احادیث کی تدوین عمل میں آچکی تھی، جس طرح متعین کیا گیا اور اوائل مدنی معاشرہ میں جو مفہوم لیا جاتا تھا اس کا تقابل کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ: "جب ہم سُنّت کو ایک ٹھوس اور متعین شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی وہ سُنّت جو اُمّت کے واقعی عمل سے عبارت ہے تو ہمیں سُنّتِ رسولؐ کی اس آزاد تعبیر میں اور زمانہ مابعد کے فقہاء نے سنت کے جامد اور بے لچک عقیدہ کی تشکیل کی' ان دونوں میں ایک عجیب و غریب بُعد نظر آتا ہے۔ یہاں صورتِ حال کی خصوصیات کے اعتبار سے رسولؐ اللہ کے عمل و کردار کی ایک حرکت پذیر لہر ہے جو آزادی کے ساتھ رواں ہے۔ وہاں چند جامد قواعد و ضوابط ہیں جو ایک بار وضع کئے جانے کے بعد ہمیشہ ایک حالت میں رہتے ہیں۔ یہاں جن مقاصد و غایات کے حصول کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرگرداں تھے، ان کی مسلسل اور انتھک تلاش و جستجو ہے وہاں ضوابط کا ایک بے لچک اور متعین نظام ہے

وقت کے معاشرے کو محض خیر و شر کی نسبت سے بطورِ نمونہ پیش کرتی ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں سے دستبردار ہو کر زندگی کی گاڑی کو اسی معاشرے پر چلاتا ہے اور ترقّی یافتہ عمارت کے مقابلے میں ہمیشہ اسی عمارت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ مقصود عمارت نہیں ہوتی بلکہ خیر و شر کی وہ نسبت اور عدل و اعتدال [illegible] ہدایتِ الٰہی کے ذریعہ پیدا ہوتی ہے اور بطورِ نمونہ اسی کو پیش کرتی ہے!"

پھر فرمایا کہ :۔ "معاشرہ فطری افتاد کے مطابق ترقّی کرتا اور بدلتا رہے گا۔ اس کو نہ کسی کا جمود روک سکتا ہے اور نہ کسی قوم کا زوال بریک لگا سکتا ہے۔ اب اگر کسی کو جمود توڑنا اور زوال کو ختم کرنا ہے تو ذہنی اور فکری تبدیلی کے ساتھ اس کے اپنے زمانہ کی تنظیمی، ترقّیاتی چیزوں کو قبول کرنا ناگزیر ہے!"——!!

پھر فرمایا کہ :۔ "جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے بنیادی نقطۂ نگاہ یہ بنانا پڑے گا کہ اگر اس وقت ہدایت کے نزول کا زمانہ ہوتا اور محسنِ کائنات خود بنفسِ نفیس تشریف فرما ہوتے تو آپؐ جلبِ منفعت اور دفعِ مضرّت کا کس قدر لحاظ فرماتے اور معاشرتی فلاح و بہبود کی چیزوں میں کسی جذبہ کو ملحوظ رکھتے۔ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے زمانے کے معاشرے کو "ہدایت" کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے "اِزالہ" (REPLACEMENT) کی بجائے "اِمالہ" (ADDITION) کی جو روش اختیار فرمائی ہے اور ترمیم و تنسیخ نیز تدریج و تخفیف کے جن اصول و ضوابط سے کام لیا ہے وہ سب جدید معاشرہ کی رہنمائی کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں!"

مولانا موصوف نے اپنی ایک اہم تصنیف: "احکامِ شرعیہ میں زمانہ اور حالات کی رعایت!" میں تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب سے چند اہم باتیں پیش کی جاتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ :۔ "مسلم قوم کے زوال نے ایک نئے دَور کو جنم دیا ہے۔ اس نئے دَور کے نظریات نے ایمان و اعتقاد کی بنیادیں ہلادی ہیں اور معاشرہ کی تشکیل نے مذہب و زندگی کے ہر شعبہ میں بے شمار نئے مسائل پیدا کردیئے ہیں۔ پہلے تجدیدِ دین کی بات ایک معاشرہ تک محدود تھی۔ اب اس کا تعلق ایک دَور

قوم میں مبعوث ہوتا ہے اس کی شریعت میں اس قوم کی عادات اور خصوصیات کا خاص طریقے پر لحاظ ہوتا ہے، لیکن جو پیغمبر تمام عالم کے لئے مبعوث ہوا اس کے طریقۂ تعلیم میں یہ اصول نہیں چل سکتا کیونکہ نہ وہ تمام دنیا کی قوموں کے لئے الگ الگ شریعتیں بنا سکتا ہے اور نہ ہی تمام قوموں کی عادات اور خصوصیتیں باہم متفق ہو سکتی ہیں۔ اس لئے وہ پہلے اپنی قوم کی تعلیم وتلقین شروع کرتا ہے اور اسے محاسنِ اخلاق کا نمونہ بناتا ہے۔ یہ قوم اس کے اعضاء و جوارح کا کام دیتی ہے اور اس کے نمونہ پر وہ اپنی تلقین کا دائرہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ اس کی شریعت میں اگرچہ زیادہ تر وہ قواعد کلیہ اور اصولِ عامہ ہوتے ہیں جو قریباً تمام دُنیا کی قوموں میں مشترک ہیں۔ تاہم خاص اُس کی قوم کی عادات وخصوصیات کا لحاظ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن جو احکام ان عادات اور حالات کی بناء پر قائم ہوتے ہیں ان کی پابندی مقصود بالذات نہیں ہوتی اور نہ ان پر چنداں زور دیا جاتا ہے۔"

آخر میں مولینا محمد تقی امینی کے افکار سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ مولانا موصوف نے کتاب اور نبی کو نقشہ اور انجینئر سے تعبیر کیا ہے، اسی سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں کہ :

"البتہ حالات ومقتضیات کی رعایت ہر دور کی عمارت میں کی جاتی ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کی ہوئی عمارت میں بھی اس کی رعایت موجود ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ عمارت کی اصل بنیاد اور ستون باقی رکھ کر اس عایت سے جتنا فائدہ بھی اٹھا سکتے ہیں اٹھائیں اور اپنے زمانے کے مناسب عمارت تعمیر کریں ——!![۹۲]"

مولانا موصوف کے ایک مقالہ سے جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تھیالوجیکل سوسائٹی کی طرف سے یونین ہال میں پڑھا گیا تھا۔ ماہنامہ فکر ونظر نے کچھ اقتباسات شائع کئے تھے، اُن میں سے چند ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں، آپ فرماتے ہیں :

"ہدایتِ الٰہی کسی معاشرے کو وجود میں نہیں لاتی ہے بلکہ انسان کے ہاتھوں معاشرہ وجود میں آتا ہے، جس میں خیر وشر دونوں کی نمود اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ظہور ہوتا ہے۔" پھر فرمایا کہ :- "ہدایتِ الٰہی اپنے نزول کے زمانے میں اس

ہیں اگر مذہبی پلیٹ فارم سے انفرادی ملکیت کی آڑ میں سرمایہ داری وجاگیرداری نظام کی تبلیغ وتائید کی جاتی رہی تو لازمی طور پر وہ اشتراکیت کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے۔"

اس عالی پایہ کتاب سے آخری اقتباس دے کر بحث کو ختم کرتا ہوں۔ آپ فرماتے ہیں: "مسلم معاشرہ ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھ چکا ہے اور آشیانہ بنانے کے لئے تنکوں کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یہ سرگردانی اس لئے کہ دوسری دنیا کے آشیانے اس طائرِ لاہوتی کے جسم و روح پر فٹ نہیں آ رہے ہیں اور اس کا اپنا آشیانہ جس دَور میں تھا وہ دَور ختم ہو چکا ہے۔ اس میں جس دنیا کے تنکے تھے وہ دُنیا لُٹ چکی ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق کوئی دَور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس طرح نہیں لُٹتی کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے۔ یہ عالمِ کون وفساد ہے یہاں بگاڑ کے ساتھ بناؤ، اور تخریب کے ساتھ تعمیر ہے۔ خود فطرت ہر گوشہ میں کانٹ چھانٹ کرتی اور خوب سے خوب تر شئے کو فِٹ کرتی ہے۔ جب کوئی شئے ایک جگہ فٹ ہو جاتی ہے تو کمتر شئے کے لئے وہ جگہ نہ چھوڑے گی بلکہ قبضہ کے لئے اس سے بلند تر اور برتر شئے کا ہونا ضروری ہے!"

ان تمام تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سنّتِ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کوئی جامد شئے نہیں بلکہ ایک الیسا زندہ اور متحرّک رویّہ ہے جو مسائل کو اخذ کرنے کے لئے اپنا مخصوص منہاج رکھتا ہے۔ یہ منہاج آج بھی ہمارے لئے روشنی کا کام دے سکتا ہے۔ اگر ہم نے عہدِ حاضر کی تازہ ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے اور صحیح معنوں میں اپنے ملک میں نظامِ مصطفےٰ کا نفاذ عمل میں لانا ہے تو ہمیں اپنی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ روش ترک کر کے اسلام کی شورائی، اشتراکی، انسان دوستی اور عوام پروری کی اقدار کو اپنانا ہوگا تاکہ ہم اسلام کے عالمگیر، انقلابی اور انجذابی پہلوؤں کا حق ادا کر سکیں جیسا کہ علّامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے ؎

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا ٭ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں"

سے مل گیا ہے !" پھر فرماتے ہیں :۔ "پچھلا دور اپنی سابقہ شکل میں پھر واپس نہیں آتا ہے۔ قانونِ فطرت کے مطابق کوئی دور اس طرح ختم نہیں ہوتا کہ وہ دوبارہ اپنی شکل میں واپس آئے اور کوئی دنیا اس لئے نہیں لٹتی ہے کہ وہ اپنی سابقہ حالت پر پھر آباد کی جائے ..... اس بناء پر یہ توقع فضول ہے کہ سابق دور واپس آئے گا اور اس کے معاشرہ میں ملکی و معاشرتی قانون علیٰ حالہٖ نافذ ہوں گے۔ اب، نئی دنیا کو قبول کئے بغیر چارہ نہیں ہے !"

پھر فرمایا کہ :۔ "مذہب کی نمائندگی جس انداز سے ہو رہی ہے اس میں بڑی حد تک فکر و عمل کی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو دورِ زوال کی یادگار ہیں اور جن کو زمانی تبدیلیوں نے پائمال بنادیا ہے۔ چنانچہ اس امر پر سب کو اتفاق ہے کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ لیکن ان شعبوں کی تفسیر و تعبیر میں اب تک جاگیردارانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ !"

پھر فرمایا کہ :" یہ کام جرأت و ہمت اور کھلے دماغ کے ساتھ براہِ راست غور و فکر کے بغیر سرانجام نہیں پا سکتا۔ لیکن مذہب کے نام پر مختلف برادریاں اور گروہی تعلقات کی جکڑ بندیاں کچھ اس طرح گرفت میں لئے ہوئے ہیں کہ اُن سے صرفِ نظر کر کے جرأت و ہمت کے مظاہرے کی توقع بے سود ہے اور ان کو ساتھ لے کر کھلے دماغ کے ساتھ کسی فیصلے کی امید بے کار ہے !"

پھر فرمایا کہ :" اندازِ فکر بدلنے کی ضرورت ہے۔ مذہب اب تک قدیم تنظیم کو سمجھا جا رہا ہے چونکہ اس کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس بناء پر مذہب کے نام پر چند مراسمِ عبادت سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ خواہ اس کا نام حفاظتِ دین رکھا جائے یا طبیعت خوش کرنے کے لئے اقامتِ دین کا نام دے دیا جائے، نتیجہ ایک ہے، نہ قرونِ وسطیٰ کا دور واپس آئے گا اور نہ زمانہ ہماری خاطر رجعتِ قہقری اختیار کرے گا۔

مزید فرمایا کہ :"۔ دنیا اپنی تنظیمات میں رجعتِ قہقری نہ اختیار کرے گی اور زمانہ ہماری خاطر قدیم شکلوں کو قبول نہ کرے گا۔ اگر زندہ رہنا ہے تو لامحالہ احکام کے موقع و محل کی تعیین کر کے اسلام کی روح اور تعلیمات کو جدید تنظیمات میں بھرنا ہوگا۔ !"۔

پھر فرمایا کہ :" موجودہ دور میں مسلم ممالک طبقاتی کش مکش کی جس منزل پر پہنچے ہوئے

ان کی حکومتیں قائم تھیں اس لئے ان کا خاتمہ نہیں ہو سکا۔

گیارھویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی کے حملوں نے ہندوؤں کو اس قدر حواس باختہ کر دیا کہ وہ جینیوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم نہ کر سکے۔ ادھر جینیوں نے بھی اپنے اندر لچک پیدا کر لی یعنی بت پرستی اور ہندو ثقافت اختیار کر لی۔ اس لئے ان کی تعداد اس وقت ۱۴-۱۵ لاکھ ہے۔ یہ لوگ تہذیب اور تمدن ظاہری رسوم اور طرزِ معاشرت کے لحاظ سے بالکل ہندو ہو گئے ہیں۔ ہندوؤں کے تہوار مناتے ہیں اور ان کے دیوتاؤں کے گن گاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ان کے مندروں اور ہندوؤں کے مندروں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے باقی رہ جانے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو اقتصادی ہے۔ یہ فرقہ ہندوستان کی تجارت پر چھایا ہوا ہے۔ میں بھوپال میں دیکھ چکا ہوں۔ حکمراں تو مسلمان تھا مگر حکومت میں اقتدار پانچ فیصد جینیوں کے ہاتھ میں تھا لیکن مسلمانوں نے ہندوستان میں آ کر اپنے تشخص ہی کو برقرار نہیں رکھا بلکہ ہندوؤں کو مسلمان بنانا شروع کر دیا اور بلا مبالغہ تاریخ ہند کا یہ عدیم المثال حادثہ ہے۔

۱۲۰۶ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی لیکن چشتی سلسلے کے سب سے نامور صوفی حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے ۱۱۹۰ء سے ہی اجمیر کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا۔ ہندوؤں کے پایۂ تخت میں ایک مسلمان صوفی کا تن تنہا مستقل قیام کر لینا اور علانیہ تبلیغ کرنا۔ یہ تاریخ عالم کے عجائبات میں سے ہے اور جب تک کسی شخص میں فوق العادت روحانی طاقت نہ ہو وہ ایسی جسارت کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ خواجہ صاحب نے اجمیر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے سے پہلے پانچ سال تک ملتان میں رہ کر سنسکرت اور ہندو دھرم سے بخوبی واقفیت حاصل کر لی تھی۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی مبلّغ تقابلِ ادیان نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں سے پہلے جو قومیں یہاں آئی تھیں وہ مذہب اور مذہبی کتاب

ہندوستان میں بھکتی تحریک

یوسف سلیم چشتی

۱- ہندوؤں نے جن کو آریہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ان تمام ح
کو اپنے اندر جذب کر لیا جنھوں نے از منۂ قبل مسیح میں ہندوستان
مثلاً سیتھیئن، یونانی، ساکا اور ہن یہ چاروں حملہ آور قومیں رفتہ
شخصیت اور انفرادیت کھو بیٹھیں اور ہندو قوم میں مدغم ہو گئیں۔ یہ
اور اپنی تہذیب دونوں سے بیگانہ ہو کر خالص ہندو ہو گئیں۔
۲- آریائی ذہن یا ذہنیت کی ایک خصوصیت احساسِ برتری ہے
یا فلسفے میں ترقی کی وجہ سے ان کے اندر پیدا ہو گیا تھا۔
۳- دوسری خصوصیت تعصب اور تنگ نظری ہے جو احساسِ بر
نتیجہ ہے۔ اس کا ثبوت اس ظالمانہ طرزِ عمل سے مل سکتا ہے جو ہندو
جینیوں اور بودھوں کے ساتھ روا رکھا۔

ہندوؤں نے ان دونوں سے کہا کہ تم دونوں خدا کو نہیں مانتے
کو ہم گوارا کر لیں گے۔ لیکن اگر تمھیں اس ملک میں رہنا ہے، یعنی آریہ و
تو ویدوں کو پرمان تسلیم کرنا ہوگا۔ ورنہ ہم تمھیں آریہ ورت میں رہنے کی
نہیں دیں گے۔ بزورِ شمشیر ملک بدر کر دیں گے۔

(ل) بودھوں نے ویدوں کو حجت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، نتیجہ یہ نکا
صدی قبل مسیح میں بودھوں کی سارے ملک پر حکومت تھی۔ ۳ ع اشوک
لیکن ساتویں صدی عیسوی میں ایک بودھ بھی آریہ ورت میں باقی نہ
اور آج بھی نہیں ہے، از کاٹھیاواڑ تا آسام اور از ہماچل پردیش تا ٹرا
۲- بودھوں کو ختم کرنے کے بعد جینیوں کی باری آئی۔ لیکن مغرب اور ج

پاس گئے اور قاضیٔ شہر کے عہدے کے لئے دعا کی التجا کی انہوں نے کہا: "ملّا نظام! قاضی مشو، چیزے دیگر شو!" انہوں نے کہا وہ کیا؟ انہوں نے کہا: "پاک پٹن چلے جاؤ اور محبوب الٰہی بن جاؤ!" بلکہ جہانگیر عالم بن جاؤ۔ چنانچہ انہوں نے پیادہ پا دلّی سے پاک پٹن کا سفر کیا اور جب بوقتِ ظہر شیخ کی خدمت میں پہنچے تو وہ وضو کر رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی باوا صاحب کھڑے ہو گئے اور یہ شعر پڑھا

اے آتشِ فراقت دل ہا کباب کردہ ‹› سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

یہ شعر سنتے ہی مُلّا نظام الدّین کے دل و دماغ کی دنیا ہی بدل گئی۔ اور بے اختیار شیخ کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے مُلّا نظام الدّین کو ہند کے تمام صوفیوں کا سلطان بنا دیا۔ چنانچہ ہندوستان میں ہزاروں صوفی گزرے ہیں مگر سلطان کا لقب ایک ہی صوفی کو حاصل ہوا۔ سلطان جی کی درگاہ سات سو برس گزر جانے کے بعد آج بھی مرجعِ خلائق ہے اور شاہ و گدا، مسلمان اور ہندو دونوں حاضر ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ بھارت کے ہندو صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد اور ڈاکٹر رادھا کرشنن دونوں نے حاضری کی سعادت حاصل کی۔

مَیں معافی چاہتا ہوں جذبات کی رَو میں بہہ گیا۔ آمدم بر سرِ مطلب! سلطان جی نے پچپن سال تک مسلسل اسلام کی تبلیغ کی۔ سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا لیکن کسی بادشاہ کے دربار میں جانا تو کجا کسی بادشاہ کو اپنی درگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ان کی تبلیغی خدمات کا اندازہ صرف اس ایک بات سے ہو سکتا ہے کہ شمال میں ان کے ایک مرید کا مزار سرینگر میں ہے جس نے تبلیغِ اسلام کی۔ دوسرے کا مزار جنوب میں بیجاپور میں ہے۔ تیسرے کا مزار مشرق میں سلہٹ (آسام) میں ہے۔ چوتھے کا مزار مغرب میں منگرول (کاٹھیاوار) میں سمندر کے کنارے ہے، جہاں میں اکثر جایا کرتا تھا۔

سلطان جی نے اپنے سات سو مریدوں کو مبلّغ بنا کر دکن بھیجا تھا۔ چونکہ ہر مبلّغ پالکی میں سوار ہو کر آیا تھا اس لئے دکن کی تاریخ میں سات سو پالکیوں سے یہی مبلّغین مراد ہیں۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان جی نے دکن میں سات سو پالکیاں بھیجی تھیں۔

دونوں سے بیگانہ اور محروم تھیں اس لئے ہندوؤں نے انہیں بآسانی اپنے دھرم میں جذب کر لیا۔ لیکن مسلمانوں کے پاس ہندو دھرم سے بہتر اور برتر دھرم تھا اس لئے پانسہ پلٹ گیا اور چشتی سلسلے کے صوفیوں نے ہندوؤں کو مشرف باسلام کرنا شروع کر دیا۔ چونکہ ۱۲۰۶ء شمالی ہند میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی اس تبلیغ کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

چشتی سلسلے کے صوفیوں نے ہندو دھرم اور ہندوؤں کی مذہبی رسوم اور عبادات کا مطالعہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ ان کے دھرم میں موسیقی عبادت میں داخل ہے۔ چنانچہ رگ وید نظم میں ہے اور اس کے منتر گا کر پڑھے جاتے ہیں بلکہ بھجن گانا ہی عبادت کی روح ہے۔ باقی پوجا پاٹ تو فروعی رسوم ہیں (دروہ پروہت انجام دیتا ہے۔

اس لئے ہندوؤں کو اپنی طرف مائل (ATTRACT) کرنے کے لئے چشتی صوفیوں نے قوالی کا سلسلہ شروع کیا۔ جب ہندو قوالی سننے کے لئے جمع ہو جاتے تو قوالی کے بعد انہیں اسلام کی تبلیغ کی جاتی تھی۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

پنجاب میں شیخ فریدالدین گنج شکر نے راجپوتوں کے سولہ قبیلوں کو یعنی ہزاروں ہندوؤں کو مسلمان بنا دیا اور ان کے جانشین سلطان المشائخ محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاء نے تو سارے ہندوستان میں تبلیغ کا نظام قائم کر دیا۔ ان سے بڑا نیز کامیاب مبلغ اسلام آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ان کی زندگی اسلام کی عظمت اور صداقت کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔

(الف) اللہ نے انہیں تبلیغ کے لئے طویل ترین مدت عطا کی یعنی پچپن سال ان کی وفات پچانوے سال کی عمر میں ہوئی۔

(ب) اللہ نے انہیں باطنی علوم کے علاوہ ظاہری علوم سے بھی نوازا تھا صوفی سے پہلے وہ مُلّا نظام الدین تھے اور منطق اور مناظرے میں بے نظیر تھے۔ اسی لئے علماء میں "صف شکن" لقب تھا۔ جب وہ علوم اسلامیہ اور معقولات میں سرآمد روزگار ہو گئے تو دلی کے سب سے بڑے شیخ حضرت شیخ نجیب الدین المتوکل کے

سلہ انہیں تو دیر میں پرشاد کھانا اور بھجن گانا۔

تبلیغ کا فریضہ صوفیوں اور ان کے معتقدین ہی نے انجام دیا۔ فقہ اور حدیث کے علماء کا اس کارِ خیر میں کوئی حصّہ نہیں ہے۔ چشتیوں کے بعد سہروردی سلسلے کے صوفیوں نے اسلام کی اشاعت میں حصّہ لیا۔

پہلے مبلّغ مخدوم جہانیاں جہانگشت سیّد جلال بخاری ہیں جنھوں نے پنجاب اور سندھ میں اسلام کی تبلیغ کی۔ انہوں نے اپنے فرزند شاہ قطب عالم کو گجرات اور کاٹھیاواڑ میں تبلیغ کی۔ ان کا مزار احمد آباد سے ۵ میل کے فاصلے پر موضع باٹوہ میں واقع ہے۔ ۱۹۴۵ء میں جب چندر نگر کے الیکشن کے سلسلے میں احمد آباد گیا تھا تو مزار پر بھی گیا تھا۔

ان کے بعد ان کے فرزند حضرت شاہ عالم نے گجرات اور کاٹھیاواڑ میں تبلیغ کی۔ سلطان محمود بیگڑہ انہی کا مرید تھا۔ چنانچہ جب وہ احمد آباد میں قیام کرتا تھا تو عصر کی نماز کے بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر ہندوؤں کو مخاطب کر کے اسلام کی دعوت دیتا تھا۔ گجرات میں تبلیغ کا سہرا حضرت شیخ احمد کھٹو کے سر ہے، جو شاہ عالم سے پہلے ہوئے ہیں۔ شاہ عالم کا مزار احمد آباد سے ۳ میل اور کھٹو کا مزار سات میل کے فاصلے پر تھا مگر اب دونوں مزار شہر میں آ گئے ہیں!

بہار اور بنگال میں بھی چشتی سلسلے کے صوفیوں نے تبلیغ کی جن میں شیخ جلال تبریزی سلہٹی، شیخ علاء الحق پنڈوہ اور شیخ شرف الدین منیری (بہار) کا نام بہت مشہور ہے۔ تمام ہندو مؤرخین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلام نے اپنی تعلیمات کی بدولت ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا اور ڈاکٹر تارا چند نے تو اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھدی جو بڑی مستند اور محققانہ ہے۔ ڈاکٹر کے کے دت "An Advanced History of India"

"Famous Muslim saints lived and laboured in India during the med. period and disseminated the ideas of m.phil and mysticism in this land

ہندوؤں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اس تحریک کے مرکز قائم کئے اور غور طلب بات یہ ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں بیک وقت سارے ہندوستان میں اس تحریک کے داعی اور مبلغ پیدا ہوگئے جنھوں نے اسلامی سیلاب کے آگے بند باندھ دیا اور ہندوؤں کو مسلمان ہونے سے روک دیا۔ ورنہ آج ہندوستان میں ہندو، اقلیت میں ہوتے۔

مسٹر دت اپنی تاریخ "An Advanced History - of INDIA" میں لکھتا ہے کہ:

All These Reformers were Exponents of the Bhakti cult. They preached the fundamental equality of all religions and the unity of Godhood and held that the dignity of man depends upon his actions and not on his birth. They protested against the ritualism and formalities of religion and domination of the priests and emphasised simple devotion and faith as the means of salvation for one and all. P. 403-404

گویا ان ہندو مصلحین نے ہندو دھرم کی بنیادوں کو منہدم کر دیا کیونکہ ہندو دھرم تو ذات پات کے امتیاز پر قائم ہوا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو منوسمرتی)

اب میں بھگتی تحریک کے چند مشہور مبلغین اور ہندو مصلحین کا مختصر تذکرہ کروں گا۔ ① بھگتی تحریک کا بانی راما نند ہے جو چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں الہ آباد میں برہمن خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ساری عمر بھگتی کا پیغام

Hinduism could not absorb Islam but was in turn, influenced by Islam in two ways.

الحمدللہ! ایک ہندو بھی معترف ہے کہ ہندو دھرم، اسلام کو اپنے اندر جذب نہ کرسکا بلکہ خود متأثر ہوا۔ جب ہندوؤں نے دیکھا کہ ہندو توجوق درجوق مسلمان ہوتے جارہے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ اگر یہی سیل رواں رہا تو ایک دن سارے ہندو مسلمان ہوجائیں گے۔ لہٰذا سیلاب کے آگے بند باندھنا لازمی ہے۔ انہوں نے اس تبلیغی سیلاب کے آگے بند باندھا، بس یہی انداز ان کے ذہن وقاد کے زرخیزی (RESOURCEFULESS) کا ثبوت ہے اور یہی میری تقریر کا مرکزی تصور ہے۔ جب ہندو علماء نے اسلامی اصول کا مطالعہ کیا تو انہیں معلوم ہوا کہ اسلام کے جو اصول ہندوؤں کے دل و دماغ کو اپیل کرتے ہیں وہ

(۱) توحید ذاتِ باری اور اس کا منطقی نتیجہ اصولِ حریت واخوت اور مساوات وغیرہ۔

(۲) فضیلت کا معیار ذات یا قومیت یا نسل یا حسب یا نسب نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔

(۳) رسوم ظاہری قطعًا مقصود نہیں ہیں۔ ع: "درویش صفت باش و کلاہِ تتری دار!" ہندوؤں نے دیکھا کہ ایک شودر بلکہ چنڈال بھی مسلمان ہوتے ہی مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے اور مسجد میں بادشاہ اور عالم دین کے برابر شانہ بشانہ کھڑا ہوجاتا ہے اور ایک ہی دستر خوان پر کھانا کھاسکتا ہے یعنی یہ قانونِ مساوات ہندوؤں کے لئے سب سے بڑی کشش رکھتا ہے۔ پس انہوں نے اسلام کے سیلاب کے آگے جو بند باندھا اس کا نام ہندوستان کی کلچرل ہسٹری میں بھگتی کی تحریک ہے۔ بھگتی کی تحریک کے اساسی اصول سراسر اسلامی ہیں۔

(۱) توحیدِ ذاتِ باری (۲) مساواتِ نسلِ انسانی (۳) اخوت اور (۴) اللہ سے محبت — تلسی داس نے جو بھگتی تحریک کا بہت بڑا مبلغ ہے۔ اس تحریک کا کلمہ یہ "دوہا" مقرر کیا جس میں اس تحریک کی پوری روح سمودی ہے:

جات پات پوچھے نا کوئے ~~~~~~ ہر کو بھجے سو ہر کا ہوئے!

کی بائبل ہے ---- دوہا سے

تلسی من ملنے نہیں جب تک خطا نہ پائے ۔ جیسے ودھوا استھری گربھ لیے پچھتائے

رامائن تصوف اور بھکتی کی تعلیمات سے معمور ہے۔ افسوس تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

(۸) شنکر دیو وسطی ہند ۱۴۴۹-۱۵۶۸ ---- سارے وسطی ہند میں بھکتی کا پرچار کیا۔

(۹) میرا بائی ۱۶۱۰-۱۵۵۰ ---- راجپوتانے کی ریاست میواڑ کی مہارانی کرشن کی محبت میں سرشار تھی اور بھکتی تحریک کی بہت بڑی علمبردار تھی۔ محلوں میں رہنا چھوڑ دیا تھا۔ گاؤں میں غریبوں میں رہتی تھی۔

(۱۰) سنت تکارام نے ۱۶۴۹-۱۵۹۸ ---- جنوبی ہند میں بھکتی یعنی کرشن کی محبت کا پیغام سنایا اور ذات پات کے امتیاز کو مٹایا۔

(۱۱) دادو دیال - ۱۶۰۳-۱۵۴۴ ---- انہوں نے گجرات میں بھکتی کا پیغام گھر گھر پہنچایا اور سنایا۔

(۱۲) نام دیو۔ سولھویں صدی میں تھے۔ انہوں نے یو پی راجپوتانہ اور وسطی ہند میں بھکتی کا درس دیا اور ذات پات کے خلاف جہاد کیا۔

آخری بات | ہندوؤں نے اسلام کا مطالعہ کر کے توحید، اخوت، مساوات اور دوسرے اصول اپنی بھکتی کی تحریک میں شامل کر لئے اور اس طرح تبلیغ کے سیلاب کے آگے بند باندھ دیا۔ لیکن مسلمانوں نے یعنی علماء نے COUNTER ATTACK - نہیں کیا۔ یعنی انہوں نے ہندو دھرم کا مطالعہ کر کے اس کی کمزوریاں ہندوؤں پر واضح نہیں کیں۔

تیمور کے حملے کے بعد ایسے حالات رونما ہو گئے کہ صوفیوں کا قائم کردہ تبلیغی نظام معطل ہو گیا۔ ہندی علماء میں تبلیغ کا جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکا۔ انہوں نے خاندان غلاماں سے لے کر عہد عالمگیر تک تبلیغ کی طرف توجہ ہی نہیں کی جس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے سن ۱۲۰۶ء سے لے کر سن ۱۷۰۷ء تک قرآن کا ہندی میں تو کیا فارسی میں بھی ترجمہ نہیں کیا۔ یہ کام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ۱۷۴۵ء میں انجام دیا۔ علماء کی نظر میں یہ ترجمہ بہت بڑا جرم تھا: چنانچہ

سنایا اور ذات پات کے خلاف لسانی جہاد کیا۔ چنانچہ اس کے بارہ مشہور شاگردوں میں ایک نائی تھا دوسرا موچی تھا تیسرا جولاہا تھا، جن کو ہندو بہت ذلیل سمجھتے ہیں ———!!

(۲) ولبھ اچاریہ ۱۴۷۹ء / ۱۵۳۴ میں بنارس میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک فلسفی تھا اور خالص وحدۃ الوجود (شدّھ ادَویت) کے مدرسۂ فکر کا بانی تھا مگر وہ ایک مذہبی مصلح بھی تھا یعنی بھکتی تحریک کا علمبردار تھا۔

(۳) کبیر بنارس میں پیدا (۱۴۴۰ء / ۱۵۱۸) ہوا اور توحید ایزدی اور مساوات انسانی کا درس دیا۔ "مچھلی کو لاکھ بار گنگا کے پانی سے دھو، بُو نہیں جائے گی اور کوّا لاکھ بار گنگا میں نہائے، سفید نہیں ہوگا!"

(۴) سورداس۔ سولھویں صدی۔ آگرہ — انہوں نے اپنے دوہوں میں توحید ایزدی اور مساواتِ انسانی کا پیغام دیا۔ سورداس پیدائشی نابینا بھی تھے اور پیدائشی ولی بھی تھے۔

(۵) چیتن نے ۱۴۸۵ء / ۱۵۳۴ بنگال میں بھکتی کا درس دیا بلکہ اس تحریک کا سب سے بڑا مبلّغ تھا۔

(۶) نانک پنجاب ۱۴۶۹ء / ۱۵۳۲

دین توحید اور مساوات کا درس دیا۔

نانک اس سنسار میں دکھ سکھ سب کے ہوئے ÷ گیانی کاٹے گیان سے اور مورکھ بیٹھا روئے

(۷) تلسی داس۔ ضلع باندہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے (۱۵۳۲ / ۱۶۲۳ء) میں ۱۹۴۵ء میں ان کی سمادھی پر گیا تھا۔ ان کی تبدیلی کا واقعہ بہت عبرت انگیز ہے یہ بہت بڑے شاعر تھے اور اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کی بیوی میکے گئی یہ ضبط نہ کر سکے اسی دن اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے کہا ہے سوامی! پریم میں اتنے مورکھ ہو گئے! تمھیں بالکل لاج نہیں آئی۔ افسوس! اگر تم رام سے اتنی محبت کرو جتنی مجھ سے تو مہاتما ہو جاؤ۔ یہ سن کر تلسی داس نے بیوی کے کہنے پر عمل کیا۔ ہمیشہ کے لئے بیوی بچوں سے قطعِ تعلق کر کے رام کو اپنا محبوب بنا لیا اور رامائن لکھ کر رام اور اپنے آپ دونوں کو زندۂ جاوید کر دیا۔ تلسی داس کی رامائن گویا ہندوؤں

اور اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ "عیاں را چہ بیاں !" — اگر علماء وید، منو سمرتی، دھرم شاستر اور نیتی شاستر اور پرانوں کا معاملہ کرتے تو ان ہندو ریفامرون سے کہہ سکتے تھے کہ : (۱) ویدوں میں توحید تو کجا ؛ خدا کا ذاتی نام تک مذکور نہیں ہے[۱]۔ سارے رگ وید میں صرف ایک منتر ہے : ایکم ستّ ویرا بہودا ودنتی لیکن یہاں ستّ سے مراد خدا نہیں بلکہ سچائی ہے یعنی صداقت تو ایک ہی ہے مگر علماء نے اس کی تعبیر میں اختلاف کیا ہے۔ اس سے توحید ذات باری ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس کے مقابلے میں رگ وید میں صاف لکھا ہے کہ کائنات میں ۳۳ دیوتا ہیں، ۱۱ زمین میں، ۱۱ فضا میں اور گیارہ آسمان میں۔ اس کے علاوہ رگ وید میں صاف لفظوں میں آفتاب پرستی کی تعلیم دی گئی ہے۔ چنانچہ گائتری منتر کا وہی درجہ ہے جو قرآن میں آیۃ الکرسی کا — پانی میں کھڑے ہو کر آفتاب کی طرف منہ کر کے اس کا جاپ (ورد) انسان میں غیر معمولی قوّت پیدا کر دیتا ہے۔ کسی ہندو کے مرتے وقت برہمن اس کے سرہانے اسی منتر کا جاپ کرتا ہے :

"اوم بھوؔ بھوا، سواہ، تت سویتر ورے نیم بھرگو دیوسیّا دھی مہی دھیو یو نہا پرچود یات !"

(اے آفتاب! ہماری عقل کو صحیح راستے (صراطِ مستقیم) پر چلا، تو سب خوبیوں کا مالک ہے !)

(۲) ہندو دھرم میں نہ حرّیت ہے نہ اخوّت ہے نہ مساوات کیونکہ اس کی بنیاد تو ذات پات پر ہے۔ برہمن، بقول منو مہاراج، برہم کے منہ سے اور شودر اس کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے۔ مساوات کہاں ؟

(۳) جب مساوات نہیں تو اخوّت عقلاً محال ہے۔

(۴) حرّیت بھی محال ہے کیونکہ ہر شخص تناسخ کے قانون میں محبوس ہے کیسی آزادی اور کہاں کی آزادی ؟ فعل پیدائش ہی سابقہ گناہوں کا نتیجہ ہے! مگر مسلمان علماء کو تکفیر باہمی کے دلچسپ مشغلے سے فرصت ہی نہ مل سکی کہ وہ تقابل

---

[۱] ۱۹۲۵ء میں غازی محمود دھرم پال مرحوم نے لاہور کے مشہور مناظرے میں آریہ سماجی مناظر دھرم بھکشو سے یہی مطالبہ کر کے اسے سرِ محفل رسوا کر دیا تھا۔

ان کے قتل کی سازش کی گئی۔ مسجد فتح پوری کے صدر دروازے میں اا
کے لئے ایک سرحدی پٹھان کو آمادہ کیا گیا مگر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فر
اسے حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ اُردو ترجمہ پورے چھ سو سال کے بعد شاہ
نے ۱۸۰۶ء میں شائع کیا، اور ہندی ترجمہ سات سو سال کے بعد خواجہ
نے ۱۹۲۶ء میں شائع کیا۔ میں نے اس ترجمے پر نظر ثانی کی تھی۔

بہرحال علماء کی اس مجرمانہ غفلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھگتی کی تحریک
ہوگئی۔ نیز دیگر مذاہب کا مطالعہ نہ کرنے کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ
۱۵۸۶ء میں اکبر کے حکم سے پادریوں نے اسلام پر اعتراضات کئے تو
کا جواب نہ دے سکے اور نہ جوابی حملہ کرسکے۔ کیونکہ علماء نے انجیل اور
کا مطالعہ بالکل نہیں کیا تھا۔

چنانچہ اکبر، علماء اور اسلام دونوں سے بدظن ہوگیا اور اس نے
کو آگرے میں گرجا تعمیر کرنے کی اجازت بھی دے دی اور ہندوستان
کی اجازت بھی دے دی۔ ہند میں پہلا گرجا ۱۵۸۸ء میں تعمیر ہوا۔
بعد ۱۰۹۲ء میں دوسرا وفد آیا۔ اس وقت اکبر لاہور میں تھا۔ اس نے
دوسرا گرجا تعمیر کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ یہ گرجا ۱۵۹۴ء میں تعمیر ہ
جہانگیر کے عہد میں ایک عیسائی E S U I T / پادری نے فارسی زبان
اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک ضخیم کتاب لکھی اور ۱۶۱۲ء
آگرے میں جہانگیر کی خدمت میں پیش کی۔ لیکن علماء اس کا جواب بھی نہ
کیونکہ تقابل ادیان کا S N B I E C T ان کے نصاب تعلیم ہی سے یکسر
تھا اور آج بھی خارج ہے۔ فارسی تاریخوں میں ان مناظروں کی تفصیل نہ
(کیونکہ علماء کو شکست ہوئی تھی!) مگر پرتگالی E S U I T پادریوں نے
موضوع پر کئی کتابیں لکھیں جو میری نظر سے گزر چکی ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ ہندوؤں کے ذرہ تیز دماغ نے عین وقت پر تبلیغ کے
کے آگے بند باندھ دیا اور اپنی قوم کو مسلمان ہونے سے بچا لیا۔ علماء میں
ذوقِ تبلیغ سرے سے موجود نہ تھا اس لئے انہوں نے کوئی جوابی کارروائی نہ

اسلام کا رُوحانی نظام

جناب خلیق احمد
(ایڈیٹر، یقین انٹرنیشنل)

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہ
نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ہ ...... اَمّا بَعد

جنابِ صدر و سامعینِ گرامی قدر! السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ یہ احقر اپنے مولائے حقیقی ربّ العالمین جلّ شانہٗ کی بارگاہ میں سراپا سپاس گذار اور شکر گذار ہے کہ بندہ کو اس عالی مرتبت اور عظیم المقصد "قرآن کانفرنس" میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کا ذریعہ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ العالی کی پُرشفقت دعوت اور دار التصنیف لمیٹڈ مجاہد آباد۔ کراچی یعنی وہ ادارہ جس سے بندہ سالہا سال سے وابستہ ہے بحیثیت مُدیر پندرہ روزہ عربی انگریزی جریدہ "یقین" انٹرنیشنل کی اجازت اور اعانت ہے۔ بندہ ڈاکٹر صاحب موصوف اور اپنے ادارہ کا تہِ دل سے ممنونِ احسان ہے۔

اس بابرکت "قرآن کانفرنس" کے مقاصد اور مختلف النوّع تقاریر اور مقالہ جات کے پیشِ نظر جو اب تک پیش کئے جا چکے ہیں، بندہ بھی چند گذارشات بہ عنوان "اسلام کا روحانی نظام یعنی تعلیماتِ قرآن مجید اور علم و عمل میں ہم آہنگی" پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے فھو المستعان۔ !!

اوّلاً یہ کہ مرکزی انجمن خدّام القرآن کے زیرِ اہتمام "قرآن کانفرنس" کا انعقاد اور اس کے ضمن میں خطابِ خاص و عام کا انتظام، عامّۃ المسلمین کی ضرورت اور مصلحت کے عین مطابق ہے یہ ایک مستحسن اقدام ہے جس کے طفیل قرآن مجید کی تعلیمات اُس کے عجائبات رموز و نکات اور اعجاز کے متعلق مضامین عام فہم

ادیان یا تبلیغ کی طرف متوجہ ہوتے۔ اس کے علاوہ بنیادی وجہ ہے کہ ہندوستان کے
مسلمان علماء میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا ذوق یا جذبہ سرے سے پیدا ہی نہ ہو سکا۔
اس مختصر مقالے میں اور اس محدود وقت میں اس مجرمانہ غفلت کے اسباب و علل پر
بحث نہیں ہو سکتی۔ بس اس قدر واضح ہے کہ ۱۲۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک سارے
ہندوستان میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لئے کوئی منظم کوشش نہیں کی گئی ——
اور کوئی مستقل جماعت قائم نہیں کی گئی۔ ۲۴-۱۹۲۲ء میں شدھی تحریک
نے مسلمانوں میں عارضی حرکت پیدا کر دی تھی۔ لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے
دیوبندی اور بریلوی علماء کو برسرِ پیکار دیکھا۔ کیونکہ ۱۹۲۳ء میں مجھے بھی مولانا
آزاد سبحانی کانپوری کے ساتھ آگرہ اور پھر متھرا جانے اور دونوں جماعتوں کے
مولویوں کو ہندوؤں کے بجائے آپس ہی میں مناظرہ کرتے دیکھا تھا۔
۱۹۴۷ء کے بعد سے تو ہم خود ہی دین سے بیگانہ ہو چکے ہیں لہٰذا دوسروں
کو تبلیغ کرنے کا خیال ہی ہمارے دماغوں میں نہیں آ سکتا ؎
کرتے ہیں شب و روز مسلمانوں کی تکفیر ✧ بیٹھے ہوئے کچھ ہم بھی تو بیکار نہیں ہیں!
مسلمان علماء کی غفلت کے مقابلے میں عیسائی پادریوں اور عیسائی حکومت
دونوں کی ہوشیاری دیکھئے۔ انگریزوں نے ۱۷۷۲ء میں اپنی حکومت کا اعلان
کیا اور W. HASTINGS بنگال کا پہلا برطانوی گورنر مقرر ہوا۔ عیسائی
حکومت کے زیرِ سرپرستی و اعانت صرف بیس سال کے بعد پادریوں نے N.T.
انجیل کا بنگلہ زبان میں ترجمہ شائع کر دیا اور اس کا سہرا REV. WILLIAM
CAREY کے سر ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مارشمین اور ڈاکٹر ڈف نے ۱۸۲۶ء
میں پوری بائبل کا ترجمہ بنگلہ میں شائع کر دیا۔
۱۸۰۶ء میں پادری ہنری مارٹن نے انجیل یعنی N.T. کا ترجمہ فارسی
میں شائع کر دیا کیونکہ فارسی دفتری اور علمی زبان تھی۔ ۱۸۲۸ء میں Dan
ISH MISSION نے سیرامپور بنگال میں پہلا تبلیغی کالج قائم کیا۔
آج ہندوستان میں عیسائیوں کے چالیس سے زائد مدارس الہٰیات ہیں۔ صرف پاکستان
میں ان کے چار تبلیغی کالج ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمارا ایک کالج بھی نہیں ہے مٹھی بھر

ایک جُزو پر مختصر سی گفتگو کرنا ہے اور وہ ہے تزکیہ نفس۔ حضرات یہ حقیقت آپ سب پر واضح ہے کہ اسلام ایک ایسا جامع نظامِ زندگی ہے جو دُنیا اور آخرت پر محیط ہے اور پوری بنی نوع انسانی سے اس کا تعلّق ہے اور زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اقتصادی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، معیشتی، اقتصادی تعلیمی، عسکری، سیاسی، تجارتی غرض دنیوی اور اُخروی نظامات سب کے سب اسلامی نظامِ حیات میں داخل ہیں اور اُس کے جُزوِ لاینفک ہیں۔ تزکیہ کا نظام بھی اس کا جزو ہے، اور اس قدر اہم جزو ہے کہ ایک مقام کے سوا تمام مقامات پر اسے کتاب و حکمت کی تعلیم پر مقدّم رکھا گیا ہے۔ یعنی یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ پر ــــ يُزَكِّيهِمْ کو مقدّم رکھا گیا ہے۔ کیونکہ تزکیہ کے بعد ہی کتاب و حکمت سے صحیح طور پر استفادہ ہو سکتا ہے۔

تزکیہ کے معنی ہیں پاکیزگی اور بالیدگی پیدا کرنا یعنی افکار و گفتار اور کردار میں پاکیزگی پیدا ہو اور روح میں بالیدگی آئے، اِسی کو روحانی نظام کہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں اسلامی لٹریچر کے نام سے ہزاروں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ سب مفید ہیں اور ان میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ان میں اسلامی نظام کی الگ الگ تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ اسلام کا تصوّرِ تعلیم یہ ہے، اس کا معاشی نظام یہ ہے، اس کا عسکری نظام یہ ہے، اس کے سیاسی نظام کی شکل یہ ہے، اس کا معاشی نظام یہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان مباحث کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ہمیں جو تشنگی محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی لٹریچر میں نظامِ تزکیہ کا ذکر شاذونادر ہی نظر آتا ہے۔ اگر کہیں ہے، بھی تو مختصر سا، اور ایک گوشے میں، گویا کہ برائے وزنِ بیت ــــ سوال یہ ہے کہ آخر بعثتِ نبوی صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم میں ایک اہم ترین مقصد تزکیہ ہی ہے تو اس نظامِ تزکیہ یا نظامِ روحانی کی تفصیلات ہمارے اسلامی لٹریچر میں اسی شدّ ومدّ ــــ شغف اور انہماک کے ساتھ کیوں نہیں؟ ــــ ہماری سوسائٹی میں تعلیمی ادارے ہیں، فوجی اور عسکری ادا رے ہیں، طبّی اور معالجاتی ادارے ہیں، انتخابی و انتظامی ادارے ہیں، قانونی ادارے، تجارتی ادارے، سیاسی ادارے اور اسی طرح

اور دل نشین انداز میں علماء و فضلاء کی زبانی دور دراز اور نزدیک پہنچائے جاتے ہیں اور اس کتاب مقدس، کلام الٰہی سے آگاہی ہی نہیں بلکہ محبت و اطاعت کے جذبات کی افزائش کا ذریعہ اور سبب بنتے ہیں، اللّٰھم زد فزد

ثانیاً میدان عمل کی طرف گامزن ہونے کے لئے مسلمانوں کو طیار کرنے اور مستعد بنانے کے سلسلہ میں چند معروضات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں وھو ھذا۔

قرآن مجید کی سورۃ ع۳ یعنی آل عمران کی آیت شریفہ ع۱۶۴ کے کلمات کی طرف توجہ مبذول کراتا ہوں جو یہ ہیں: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ یعنی اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اہل ایمان پر بڑا احسان فرمایا کہ انہیں میں سے اس نے ایک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجا جو ان پر اس کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور اس کی کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ سب پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

بالکل یہی مضمون قدرے لفظی تبدیلی سے سورہ ع۲ البقرہ کی آیت شریفہ ع۱۵۱ میں اور بصورت دعائے خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام اسی سورۃ کی آیت شریفہ ع۱۲۹ میں وارد ہوا ہے اور پھر یہی مضمون سورۃ ع۶۲ الجمعہ کی آیت شریفہ ع۲ میں آیا ہے۔

ان آیات مقدسہ مذکورہ بالا میں جناب رسالت مآب حضور پر نور رسول مقبول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بتایا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض منصبی کا ذکر فرمایا ہے۔

ان فرائض میں سے اوّل فرض آیات الٰہی کی تلاوت کرنا یعنی اللہ تعالیٰ جل شانہ کے احکام کو سنانا، پہنچانا اور سمجھا دینا ـــــ دوم لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرنا اور سوم کتاب و حکمت کی تعلیم دینا۔

فی الوقت احقر کے پیش نظر ان سب فرائض کی تشریح نہیں بلکہ صرف

ایک ہوتی، ظاہر و باطن ایک ہوتا، افکار و گفتار اور کردار ہم آہنگ ہوتے، دُنیا اُن کا مقصد نہ ہوتی بلکہ حصولِ آخرت کا ایک ذریعہ ہوتی۔ یہ بالکل درست ہے کہ اسلامی نظام کے سارے شعبے ایک دوسرے سے اسی طرح مربوط ہیں، جس طرح گھڑی کے پرزے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا تزکیہ کا مردِ کریم اسلامی مشین کا بنیادی پرزہ نہیں؟ اگر ہے اور لازمی ہے اور بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بنیادی مقصد بھی ہے تو اس نظام کے قائم کرنے کی طرف سے ہم اتنے بے نیاز کیوں ہیں؟ قانونی حکومت کے دباؤ سے کبھی اخلاقی اصلاح نہیں ہوتی لیکن روحانی تربیت کے اثر سے بے شمار درندہ صفت افراد اعلیٰ انسان بن گئے، راہزن محافظ بن گئے، میخوار تہجد گذار ہو گئے گویا بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم ؎

تھے نہ جو خود راہ پر دنیا کے ہادی بن گئے ✽ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

انہی روحانی مرتبوں کے بارے میں علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے ؎

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے ✽ جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے!

● ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کی عقیدت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں —!!

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ روحانیت کے نام سے بے شمار قسم کے پیشہ ور لوگوں نے دکانیں کھول رکھی ہیں۔ دُنیا کماتے ہیں اور دوسروں کا ایمان برباد کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ نقالی اس چیز کی ہوتی ہے جس کی جاندار حقیقت ہوتی ہے۔ بے جان اور بے حقیقت شے کی نقالی نہیں کی جاتی۔ روحانی تزکیہ کرنے والے خاصانِ خدا ہر جگہ اور ہر دور میں ہوتے ہیں مگر اُن کی شناخت مشکل ہوتی ہے۔ مولائے کریم سے توفیق مانگتے رہنا چاہیئے کہ وہ ہمیں اصل و نقل میں تمیز کرنے والی آنکھیں عطا فرمائے۔

حضرات! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین مقاصدِ بعثت کا ذکر تو حتّی المقدور پیش کر سکا یعنی تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت

کے بہت سے ادارے ہیں جن کی سرپرستی یا مالی اور اخلاقی امداد کی
یہ بتائیے کہ روحانی نظام اور تزکیۂ نفوس کے لئے کتنے ادارے ہیں جہا
تربیت کا انتظام ہو۔ جن سے عوام اور عوام کے نمائندے دلچسپی لیتے
یہ تشنگی جو آج ہمیں محسوس ہو رہی ہے کوئی نئی تشنگی نہیں۔
محسوس کرتے ہوئے بعض خاصانِ خدا نے (رحمھم اللہ) روحانی تربیت
قائم کئے ، جن کو تکیہ، حلقہ، یا دائرہ یا خانقاہ کا نام دیا گیا۔ یہ روحا
نیک نیتی سے قائم کئے گئے اور یہاں تزکیۂ نفس کے طریقے سکھائے جا
ریاضت اور نفس کشی سکھائی جاتی تھی۔ اخلاقی تربیت کے ذریعے رو
پاکیزگی اور باطنی بالیدگی پیدا کی جاتی تھی، اُن روحانی بیماریوں کا علا
تھا جو دنیا میں فتنہ و فساد پھیلاتی ہیں۔ وہ کون سی روحانی بیماریاں ہیں
ہوسِ زن و زر، ہوسِ اقتدار، بغض، حسد، کینہ، بدگمانی، مایوسی، لغ
اور تحقیرِ غیر، خوف، غفلت، احساسِ کمتری، احساسِ برتری، جذبۂ ا
اور اسی قسم کے تمام دیگر قلبی اور باطنی امراض ــــ جو کسی قانون کی گرف
نہیں آتے، اور کسی سیاسی طاقت کے دباؤ کو تسلیم نہیں کرتے اور دفع
کئے جا سکتے حالانکہ یہی وہ سب علل اور امراض ہیں جو اخلاقی زندگی کو کھو
کھا جاتے ہیں اور فساد کے سارے دروازے کھول دیتے ہیں۔ درویشوں کے رو
مراکز میں انہیں امراض کا علاج کیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ اُن میں مثبت
کی روحانی بالیدگی و پاکیزگی پیدا کی جاتی تھی۔ ان میں بے نفسی، بے غرضی، ا
تواضع، انکسار، جذبۂ خدمتِ خلق، معاملات کی صفائی، بلند کرداری عا
ایثار اور بے ریا قربانی، کسبِ حلال، صدقِ مقال، رضاجوئی اور اس
سے اخلاقی اور روحانی قدریں پیدا کی جاتی تھیں۔ پھر وہ حاکم بھی ہوتے
صاحبِ ثروت بھی ہوتے تھے، قاضی بھی ہوتے تھے، اور تاجر بھی۔ وہ سب
ہوتے تھے۔ لیکن ہر مرحلے پہ فقر اور درویشی ہی اُن کا طرۂ امتیاز ہوتا تھا
کو محرابِ عبادت میں روتے اور دن میں میدانِ جہاد میں رزم آرا ہوتے یا با
میں آمد و رفت رکھتے یا کرسئ عدالت پہ جلوہ افروز ہوتے۔ اُن کی خلوت و جلو

سُنتے اور دل پر نقش کر لئے۔ وہ فرماتے تھے کہ: "ہمارا مدرسہ دن کا مدرسہ ہے اور رات کی خانقاہ!"

میری آج کی گفتگو کا لُبّ لُباب اور ماحصل یہ ہے کہ تعلیم دین کے ساتھ ساتھ تزکیۂ نفس کا اہتمام اور انتظام از بس ضروری، لازمی اور لابدی ہے:۔ والسّلام علیٰ من اتّبع الھُدٰی۔

(بقیہ صلا ۱۲۶)

لاہوری احمدیوں نے بھی اپنے مرکز دارالسلام میں ایک تبلیغی کالج قائم کر دیا ہے ۱۸۴۰ء میں مرزا پور سے پوری بائبل کا اردو میں ترجمہ شائع ہو گیا۔ اب تک سات سو زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ہم نے ویدوں کا ترجمہ آج تک نہیں کیا۔ ہمارے علماء سنسکرت پڑھنا حرام سمجھتے ہیں لیکن H. H. WILSON نے رگ وید کا ترجمہ ۱۸۶۵ء میں چھ جلدوں میں شائع کر دیا اور اس کے جانشینوں نے باقی ماندہ تین ویدوں کا ترجمہ کر دیا۔ بھگوت گیتا کا اوّلین ترجمہ سر ولیم جونز نے ۱۷۸۵ء میں کلکتہ سے شائع کیا تھا۔ آج ایک درجن سے زائد ترجمے مل سکتے ہیں۔ پادریوں نے ہندوؤں، جینیوں، اور بودھوں کی ساری مذہبی اور فلسفیانہ کتب کا جرمن اور انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں کیونکہ آپ کو اُن کتابوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

پادریوں نے تمام اپنشدوں کا انگریزی، جرمن اور فرنچ میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اپنشد ۱۰۸ ہیں۔ ان میں سے ۱۳ بہت مشہور ہیں۔ ڈاکٹر ہیوم نے ان ۱۳ اپنشدوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی ہر یونیورسٹی میں سنسکرت کا شعبہ قائم ہے۔ ہم نے چھ سو سال حکومت کی لیکن سنسکرت کا ایک عالم پیدا نہیں کیا۔ ؎

یوسف خدا کے واسطے کر قصہ مختصر ؎ اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں!

ہم دیکھتے ہیں کہ تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت، دونوں کا سلسلہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم سے آج تک جاری ہے۔ تو کیا یہ بات عقل قبول کرسکتی ہے کہ روحانی تزکیہ کا سلسلہ ضعیف و ناتواں رہا ہو؟ درانحالیکہ اس کے بغیر تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب و حکمت دونوں بے جان، بے روح اور بے ثمر ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی تلاش جاری رکھنا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے صالح بندے اور روحانی مصلحین ہمیشہ کی طرح آج بھی موجود ہیں۔ آئیے تلاش کیجئے کہ آپ کا حصّہ کہاں ہے؟ دیکھئے کس میں اتباعِ شریعتِ محمّدیہ علیٰ صاحبھا الصّلوٰۃ والسّلام کے ساتھ ساتھ درویشانہ روحانی اوصاف موجود ہیں۔ سرِدست صرف دو باتیں دیکھئے۔ اُن میں مال کی محبّت تو نہیں؟ اُن میں اقتدار کی ہوس تو نہیں؟ قرونِ اُولیٰ، اصحابِ صُفّہ اور تمام سلسلہ ہائے قدیم و جدید کا ذکر تو تحصیلِ حاصل ہوگا۔ ہم اپنے ماضی قریب کی نامور ہستیوں کے کارناموں کے لئے مرہونِ منّت ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ اور اُن کا خانوادہ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی رح اور اُن کی خانقاہ کے تربیت یافتہ نفوسِ قدسی نے اسلام اور اُمّتِ مُسلمہ کی کیا گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں؟ اُن کے ذکرِ خیر سے ہمارا ایمان تازہ، یقین مستحکم اور عقیدہ راسخ ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ کی خدمات کی تقویم و تائید کے لئے ہمارے حضرت مولٰینا خلیل احمد صاحب فاروقی قادری مجددی رح نے اپنی حیات بابرکات میں ایک جامع الفنون تعلیمی ادارہ بنام مدرسہ تعلیم الاسلام تبلیغی کالج کی بنیاد رکھی بفضلہٖ تعالیٰ وبعونہٖ جس کے ذریعہ دینی اور دُنیوی تعلیم کو یک جا کر کے سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھا۔ حضرت والاؒ نے خانقاہ غفوریہ رحیمیہ بھی قائم کی جس کے ذریعہ روحانی تزکیہ کا نظام قائم کیا، جو ماشاء اللہ آب و تاب سے جاری ہے۔ تبلیغ دین کی دیگر مساعی جمیلہ کے علاوہ تصنیف و تالیف کے ذریعے بالعموم اور پندرہ روزہ عربی انگریزی جریدے "یقین" انٹرنیشنل جو گذشتہ ۲۸ سال سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے کے ذریعے بالخصوص اسلام کے پیغام کو بہترین الفاظ اور محبّت آفریں انداز میں دُنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانے کا انتظام فرمایا۔ اس بنا پر حضرت کی زبان حقیقت بیان سے یہ الفاظ

میرے پیغام کی طرف توجہ نہیں کی۔ افسوس کہ ابھی تک نہیں کی ؎

باآں رازے کہ گفتم پے نبردند ۔ ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند

من اے میرِ امم داد از تو خواہم ۔ مرا یاراں غزلخوانے شمردند

مَیں زندگی کا پیغام دے رہا ہوں لیکن مسلمان مجھ سے لوگوں کی تاریخِ وفات کا مطالبہ کر رہے ہیں!

توگفتی از حیاتِ جاوداں گوے ۔ بگوشِ مردۂ پیغامِ جاں گوے

وے گویند ایں حق ناشناساں ۔ کہ تاریخِ وفاتِ این وآں گوے

یعنی اقبالؔ کو مرتے دم تک قوم سے یہ شکایت رہی کہ اس نے میرے کلام کو سمجھا نہ پیغام کو۔ اس پر عمل کرنا تو خارج از بحث ہے۔ یہ دونوں رباعیات وفات سے چند ماہ پہلے کی ہیں۔

در بود و نبود من اندیشہ گمانہا داشت ۔ از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من

اقبالؔ فہمی کے لئے ——— فارسی دانی اور علمی مذاق شرط ہے۔ لیکن قوم کا مذاق اب علمی نہیں بلکہ فلمی ہے اور فارسی کا مطلب ہے تضیعِ اوقات!

(۳) اب تیسرا نکتہ، ان کا کارنامہ کیا ہے ؎

چو رومی در حرم دادم اذاں من ۔ ازو آموختم اسرارِ جاں من

بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او ۔ بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

(۴) چوتھا نکتہ: فتنۂ عصرِ رواں کیا ہے؟ (تاکہ اقبالؔ کا مقام واضح ہو سکے!) عقلِ انسانی، معیارِ حق و باطل ہے۔ جسے عقلِ انسانی حق قرار دے وہ حق ہے ورنہ باطل ہے۔ جدید فلسفے کی مختلف صورتیں ہیں:

POSITIVISM, EMPRIEISM, NATURALISM, LOGICAL, POSITIVISM, PHENOMANONA-ISM, AGNOSFIEISM, SCEPFICISM, EXIST-ANTIALISM, MARXISM. DIALEC. MATERIAL-ISM

اقبال کا پیغام

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

۱- یہ سچ ہے کہ اقبال شاعر بھی ہیں اور بہت بڑے شاعر ہیں - ان کا شمار دنیا کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے - لیکن جیسا کہ خود انہوں نے بار بار کہا ہے بنیادی طور پر وہ ایک ریفارمر یا پیغام گو شاعر ہیں - انہوں نے شاعری کو مقصود بالذات نہیں بنایا بلکہ مقصود بالعرض اسے اپنے پیغام کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔

۲- دوسری بات ذہن نشین کرنے کے لائق یہ ہے کہ ان کا پیغام سراسر قرآن سے ماخوذ ہے - انہوں نے ساری عمر قرآن ہی کی تبلیغ کی --- اب ان دونوں دعووں کا ثبوت پیش کرتا ہوں :

① آشنائے من ز من بیگانہ رفت ❊ از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم ❊ تختِ کسریٰ زیر پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من ❊ آب و رنگِ شاعری خواہد ز من

(گلشنِ راز)

نہ بینی خیر از آں مرد فرو دست ❊ کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست
بجبریل امیں ہم داستانم ❊ رقیب و قاصد و درباں ندارم
دمے در خویشتن خلوت گزیدم ❊ جہانے لازوالے آفریدم

② دوسرے دعوے کا ثبوت (مسافر)

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام ❊ شرحِ رمزِ "صبغۃ اللہ" گفتہ ام
دارم اندر سینہ نورِ لا الٰہ ❊ در شرابِ من سرورِ لا الٰہ
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام ❊ تا درخشی مثلِ تیغ بے نیام

اقبال کو قوم سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ قوم نے مجھے شاعر سمجھا اس لئے

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است ❊ آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است
در شبستانِ حرا خلوت گزید ❊ قوم و آئین و حکومت آفرید
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد ❊ ہمچو او بطنِ اُمّ گیتی نزاد
(اسرار صفحہ 19)

⑨ شانِ فقر پیدا کرنے کا قرآنی پروگرام بیان کرنے سے پہلے ایک اہم نکتہ اور واضح کر دوں۔ غالبًا اقبالؒ کی وفات سے سال بھر پہلے میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ کے فلسفۂ خودی کا قرآنی ماخذ کیا ہے۔ یعنی یہ فلسفہ کونسی آیت سے ماخوذ ہے؟ انہوں نے جواب دیا سورۂ مائدہ کی اس مشہور اور اہم آیت سے : یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ ج (اے مسلماناں! محافظت کنید خویشتن را!) تم پر اپنی خودی کی حفاظت فرض ہے۔ یعنی دیکھتے رہو یا نگرانی کرتے رہو کہ وہ ضعیف نہ ہو جائے :

guard your souls — Take care of yours.

⑩ اب میں شانِ فقر پیدا کرنے کا قرآنی یا اقبالی پروگرام درج کرتا ہوں

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق ❊ ہست ہم تقلید از اسمائے عشق!
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار ❊ تا کمندِ تو کند یزداں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں[۱] ❊ ترکِ خود کن[۲]، سوئے حق ہجرت گزیں[۳]
محکم از حق شو،[۴] سوئے خود گام زن[۵] ❊ لات و عزائے ہوس را سر شکن[۶]
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق ❊ جلوہ گر شو بر سرِ فارانِ عشق[۸]

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح انی جاعل[۹] سازد ترا

حرفِ آخر | یہ استحکامِ خودی کا — 8 Fold Program ہے۔
اسی پروگرام کا خلاصہ "پورِ عجم" میں بیان کر دیا ہے جسے 4 Fold پروگرام کہہ سکتے ہیں اسے

سلطان بمعنی غلبہ یا قوت۔

SECULARISM AND HUMANISM. etc.

لیکن وہ اپنی روح کے اعتبار سے خدا، نفسِ ناطقہ اور آخرت تینوں کے خلاف ہے یا لاادری ہے یا بے تعلق ہے یا ان کو لغو سمجھتا ہے۔ جدید فلسفہ اور جدید سائنس دونوں دین کے خلاف ہیں ؎

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد ÷ زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

⑤ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس زہر کا وہی تریاق مہیا کیا ہے جو رومی نے اپنے زمانے میں کیا تھا۔

⑥ وہ تریاق کیا ہے؟ عشق — یعنی عقل کے بجائے عشق کو اپنا رہنما بناؤ —!

⑦ اس کے لئے شانِ فقر پیدا کرنی لازمی ہے۔ کیونکہ عشق صرف شانِ فقر پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی کو اقبال علم قلندری یا نشۂ درویشی یا ایمانِ کامل سے تعبیر کرتے ہیں۔

⑧ پیغامِ اقبال: اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو، یہ فقر ہے کیا؟ ؎

جز بقرآں ضیغمی روباہی است ÷ فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

فقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر ÷ فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

ذکر اور فکر دونوں قرآن کی اصطلاحیں ہیں۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا — آپ نے دیکھا، غور کیا! اقبال کا پیغام قرآن سے ماخوذ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ میں یہی شانِ فقر پیدا کر دی تھی۔ صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ اس کی نمایاں اور مشہور ترین تاریخی مثالیں ہیں۔ مملکت کا رقبہ ۲۲ لاکھ مربع میل، لیکن قمیص پر پیوند لگے ہوئے ہیں اور بیوہ عورتوں کا سودا سلف بازار سے خرید کر لا رہے ہیں، بس یہی ہے شانِ فقر۔ خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے اور عشق سے عشقِ رسولؐ مراد ہے ؎

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے ÷ بوسہ زن بر آستانِ کاملے

Vedanta Ashrama, Pondicherry.
Dayal Bagh Agra.
گورودت بھون لاہور، ہنسراج ہال لاہور، بریڈ لا ہال لاہور، —
لاجپت رائے ہال لاہور —

لیکن مسلمانوں نے اقبال کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گذشتہ ۴۲ سال میں ایک ادارہ بھی قائم نہیں کیا جہاں پہلے کلامِ اقبال کو پڑھایا جائے پھر اسے سمجھا اور سمجھایا جائے پھر اس پر عمل کرنے کا طریقہ بتایا جائے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم مسلمانانِ پاکستان اقبال کو صرف ایک شاعر سمجھتے ہیں۔ اس لئے

آشنائے من ز من بیگانہ رفت ؛ از خمستانم تہی پیمانہ رفت

خطاب بہ نژادِ نو اقبال نے جاوید نامہ میں نوجوانوں سے خصوصیت کے ساتھ خطاب کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ نوجوانوں میں سے گذشتہ ۴۸ سال میں کسی نے بھی اسے نہیں پڑھا اور اگر کسی نے پڑھا بھی تو اس پر عمل نہیں کیا لیکن یہاں اس طویل خطاب میں سے جو صـ۲۳۳ سے ۲۴۶ تک پھیلا ہوا ہے۔ آخری نصیحت پیش کرنی چاہتا ہوں :-

رقصِ تن درگردش آرد خاک را ؛ رقصِ جاں برہم زند افلاک را
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست ؛ ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم ؛ ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم
رقصِ جاں آموختن کارے بود ؛ غیرِ حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر ؛ جاں بہ رقص اندر نیاید اے پسر
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب ؛ تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
سرِّ دینِ مصطفےٰ گویم ترا
ہم بقبر اندر دعا گویم ترا

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ جسمانی کے بجائے روحانی رقص سیکھو یعنی اپنی روح کو رقص میں لاؤ کہ یہی سرِّ دینِ مصطفےٰ ہے۔ لیکن مسلمانوں نے آج تک کوئی

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن ÷ چوں پختہ شوی، خود را بر سلطنت جم زن

یعنی جب تمہاری خودی عشقِ رسول ؐ کی بدولت مستحکم (پختہ) ہو جائے تو اللہ کا نام لے کر ملوکیت اور قیصریت کے خلاف اعلانِ جنگ کر دو یا بالفاظِ دیگر "باطل سے ٹکرا جاؤ!" ـــ اور اللہ نے تمہیں قرآن میں مطلع کر دیا ہے کہ :-

: اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا ط ـــ اور یہ بھی اطمینان دلا دیا ہے کہ :-

: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ٥ ـــ تقریر تو ختم ہو گئی، اب مرتبہ سن لیجئے :

اللہ نے سورۂ مزمل میں تزکیۂ نفس یا استحکامِ خودی کا 8 fold program ـ ہمیں عطا فرما دیا ہے اور یہ پانچویں وحی ہے :

(۱) قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا (۲) رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا (۳) وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ (۴) وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا (۵) فَاتَّخِذْهُ وَکِیْلًا (۶) وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (۷) وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (۸) ذَرْنِیْ وَالْمُکَذِّبِیْنَ وَمَهِّلْهُمْ قَلِیْلًا ط

<u>نوٹ</u> | بیسویں صدی میں ہندوؤں میں کئی ریفارمر پیدا ہوئے مثلاً (۱) آروبندو گھوش (۱۹۵۰ء) (۲) رابندر ناتھ ٹیگور (۱۹۴۱ء) (۳) شردھانند (۱۹۲۷ء) (۴) گاندھی (۱۹۴۸ء) (۵) تلک (۱۹۲۰ء) (۶) گوکھلے (۱۹۱۵ء) (۷) لالہ ہنسراج (۸) پنڈت گورودت ودیارتھی صاحب جی مہاراج + رادھا سوامی ست سنگ (آگرہ) (۹) مہادیو گووند راناڈے (۱۰) ـــ (۱۱) جی ـ کے ـ بی ـ تلک ـ ہندوؤں نے ان سب مصلحین کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آشرم اور تربیت گاہیں قائم کر دیں مثلاً کانگڑی میں گروکل ـ شانتی نکیتن (بنگال)، دیال باغ (آگرہ) برہمو سماج آشرم (لاہور) سابرمتی آشرم احمد آباد + ودیا پیٹھ احمد آباد ـــ!!

National University, Ahmadabad.
Servants of Indian Society, Poona.
Bhandarkar Research Institute Poona.

۲- جدید تفکر اور تجربہ سے علامہ اقبال کی مراد سائنس کا حسی اور تجرباتی طریق تحقیق ہے جس نے دورِ حاضر کے انسان کو فکرِ محسوس کا عادی بنا دیا ہے۔ علامہ اقبال کے خیال میں یہ وہ طرز فکر ہے جس کی اسلام نے اپنے تہذیبی نشوونما کے ابتدائی ادوار میں حمایت کی۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے مطابق فطرت کے وہ تمام مظاہر جو انسان کے حواس کے سامنے جلوہ گر ہیں درحقیقت اللہ تعالیٰ کے انوار و تجلیات ہیں جن کا مطالعہ و مشاہدہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔

کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر ٭ تختۂ تعلیم اربابِ نظر!

ہر چہ می بینی ز انوارِ حق است ٭ حکمتِ اشیاء ز اسرارِ حق است

ہر کہ آیاتِ خدا بیند حُر است ٭ اصلِ ایں حکمت زحکمِ اُنظر است

چنانچہ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ مظاہرِ قدرت میں اللہ تعالیٰ کے ان نشانات پر غور و فکر کرے اور ان پر سے اس طرح نہ گزر جائے کہ گویا وہ ایک اندھا اور بہرہ شخص ہے۔ قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ جو شخص اس دُنیا میں ان چیزوں کو نہیں دیکھتا وہ اگلی دنیا کے حقائق سے بھی بے بہرہ رہے گا۔ قدرت کا علم درحقیقت خدا کے کردار کا علم ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس خدا کو جاننے کا اوّلین ذریعہ حواسِ خمسہ ہی ہیں۔ خدا کی ہستی اور اس کی صفات مظاہرِ فطرت میں آشکار ہیں اور چونکہ خدا اس محسوس کائنات سے جُدا اور الگ تھلگ نہیں ہے، اس لئے اس محسوس کائنات کا علم ہی خدا کا علم ہے ؎

علمِ حق اوّل حواس آخر حضور ٭ آخرِ او می نہ گنجد در شعور

چنانچہ جب ہم قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو بقولِ اقبال خودیٔ مطلق یعنی خدا سے ہی ایک طرح کی واقفیت پیدا کر رہے ہوتے ہیں جو کہ عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔

یہ سب ہیں ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام ٭ وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسماء

مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار ٭ مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا

مقامِ فکر پیمائشِ زمان و مکاں ٭ مقامِ ذکر سُبحان ربی الاعلیٰ

علامہ اقبال کا یہ خیال ہے کہ عبادت اور دعا درحقیقت مطالعۂ فطرت کی سائنسی سرگرمیوں کا لازمی تکملہ ہیں اور حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں مزید گہری بصیرت کے لئے ہمارے اندرونی ادراک کو تیز تر کر دیتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ فطرت کا مطالعہ (یعنی سائنسی علوم)

سائنس بطور تصوّف = اقبال کا اجتہاد

مظفر حسین

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے دیباچے میں علامہ اقبال مذہبی واردات کے لئے ایک ایسے نئے منہاج کے متلاشی نظر آتے ہیں جو زیادہ [illegible] کا طالب نہ ہو اور نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن کے قریب تر ہو جو ٹھوس محسوسات کا خوگر ہے۔ ان کے نزدیک دورِ حاضر میں قرونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تکنیک بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ وہ بڑے زوردار الفاظ میں فرماتے ہیں کہ اسلام قرونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تجدید کو روا نہ رکھے گا جس نے اس کے پیروؤں کے صحیح رجحانات کو کچل کر اس کا رُخ ایک مبہم تفکر کی طرف پھیر دیا تھا اور جو انہیں یہ تعلیم دیتا تھا کہ ٹھوس حقائق کی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے اپنی نگاہوں کو اُن سرخ، نیلے، پیلے لطائف و تجلّیات پر مرکوز کر دیا جائے جو دماغ کے خلیوں کے اندرونی ہیجان سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کی خارج کی دنیا میں قطعاً کوئی حقیقت ہی نہیں ہوتی۔ تصوّف کی اس قسم میں حقیقت کی تلاش ایسے کونوں اور کھدروں میں کی جاتی ہے جہاں اس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں پایا جاتا۔ ایسے تصوّف کو وہ مسلمانوں کے دورِ انحطاط کی علامت سمجھتے ہیں جس نے مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے اُمورِ سلطنت کو معمولی ذہنی صلاحیت رکھنے والے لوگوں کے حوالے کر دیا جس کے نتیجے میں ان سے دُنیا کی امامت چھن گئی۔ چنانچہ علامہ اقبال پوری تحدّی سے فرماتے ہیں :

> "جدید اسلام اس تجربہ کو نہیں دُہرا سکتا کیونکہ وہ جدید تفکّر اور تجربہ کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور اب کوئی ولی اور پیغمبر بھی اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصوّف کی تاریکیوں کی طرف نہیں لے جا سکتا ۔!"

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات ٭ تو عینِ ذات می نگری و در تبسمے

چنانچہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک رویہ اس سلسلے میں یہ رہا کہ بر بنائے وحی علم کی انتہائی بلندیوں پر فائز ہونے کے باوجود یہی دعا فرماتے رہے کہ اے میرے ربّ میرے علم میں اضافہ کر اور اے میرے ربّ! مجھے اشیاء کی اصل حقیقت سے آگاہ کر جیسی کہ فی الواقع وہ ہیں :

سیّدِ کل، صاحبِ اُمّ الکتاب ٭ پردگی ہا بر ضمیرش بے حجاب
گرچہ عینِ ذات را بے پردہ دید ٭ ربِّ زدنی از زبانِ او چکید

علامہ اقبال بار بار اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ فکر و وجدان ایک دوسرے کی ضد نہیں، دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کا سبب بنتے ہیں۔ ایک جزواً جزواً حقیقتِ مطلقہ پر دسترس حاصل کرتا ہے اور دوسرا من حیث الکل۔ وجدان بھی درحقیقت فکر ہی کی ترقی یافتہ شکل کا دوسرا نام ہے۔ دونوں کی منزل ایک ہے یعنی حقیقت مطلقہ تک رسائی ۔

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں ٭ عقل بحیلہ می بُرد، عشق بُرد کشاں کشاں!

چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ معرفت کو علم پر ترجیح دینا مذہبی اعتبار سے ہر قسم کی رہبانیت کی جڑ ہے اور علمی اعتبار سے ان تمام علومِ حسّیہ و عقلیہ کی ناسخ ہے جن کی وساطت سے انسان نظامِ عالم کے قویٰ کو مسخر کرکے اس زمان و مکان کی دُنیا پر حکومت کرنا سیکھتا ہے۔ یہی امتیازِ عیسوی رہبانیت کی جڑ ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا :-

رَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا : "رہبانیت جس کو انہوں (عیسائیوں) نے ایجاد کیا !"

علامہ اقبال نے سائنسی علوم کو معرفتِ الٰہی کا وسیلہ قرار دینے میں بہت زورِ کلام صرف کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کہیں تو تصوّف کے ان مسلّمات کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جن کی رُو سے علم کو معرفتِ الٰہیہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ کہیں علم و عرفان اور عقل و وجدان کو اصلاً ایک ہی قرار دیا ہے اور کہیں علم کو عرفان پر فوقیت دی ہے اور اس ضمن میں مختلف صوفیائے کرام کی نگارشات سے حوالے بھی دیئے ہیں۔ مثلاً اپنے مضمون "علمِ ظاہر اور علمِ باطن" میں انہوں نے "کتاب المیثاق" میں سے حضرت جنید بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ :

"علم معرفت سے بلند تر، کامل تر اور جامع تر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ علم منسوب

اور فطرت پر ہماری گرفت اور دسترس ہی بالآخر ہمیں اس مقام تک پہنچاتی ہے جہاں ہم حقیقتِ مطلقہ کا مشاہدہ کرنے کے قابل بنتے ہیں۔ حقیقتِ مطلقہ کے مشاہدہ کی خواہش ہر انسان کے دل میں رکھی گئی ہے۔ تصوّف اور سلوک وطریقت کی طرف انسان کا میلان اور جھکاؤ اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

"ہر انسان کے دل میں ایک ہوس ہے، ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ اسے نظامِ عالم کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ یہود کا سوال کہ ہم خدا پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اسے عیاناً نہ دیکھ لیں اسی خواہش کا نتیجہ تھا کہ خود موسیٰ کلیم اللہ نے بھی "ربِّ ارنی" کی درخواست کی تھی، غرض مشاہدہ کی ہوس عالم گیر ہے، میں نے اس خیال کو دو اشعار میں سمجھایا ہے:

خرد گفت او بچشم اندر نہ گنجد ❊ نگاہِ شوق در اُمّید و بیم است!
نہ می گردد کہن افسانۂ طور ❊ کہ در ہر دل تمنّائے کلیم است!

موسیٰ علیہ السّلام کی کہانی پرانی نہیں۔ آج بھی ہر شخص "ربِّ اَرنی" کہہ رہا ہے۔ حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (۱۶ : ۳۰) اس آیت میں حصولِ علم کے ذریعوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ذریعہ تو سمع وبصر ہے، دوسرا ذریعہ انسان کا قلب ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ سمع وبصر کو چھوڑ کر کلّی طور پر قلب کی طرف متوجّہ ہو اور ایسا بھی نہ ہو کہ قلب سے غافل ہو کر بالکل سمع وبصر کے ہو رہو۔ مسلمانوں نے اپنی توجّہات قلب پر مرتکز کردیں اور سمع وبصر سے پورا کام نہ لیا بلکہ ساری ایشیائی تہذیب کا یہی خاصہ ہے!"

آگے چل کر اسی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"نظامِ عالم کی آفرینش یوں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نمو کے لئے یا اپنے آپ کو ظاہر اور نمایاں کرنے کے لئے دُنیا کو پیدا کیا۔ اس خطِ سفر کا آخری نقطہ عالم ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک پہنچنے کی راہ یہ ہے کہ اس آخری نقطہ سے الٹا سفر کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مظاہر کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف متوجّہ ہوں۔ اس کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیئے کہ انسان مشاہدۂ حقیقت کے ساتھ اپنے آپ کو فنا کردے۔ اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ ایک شاعر نے اس حقیقت پر اس شعر میں روشنی ڈالی ہے:

استعداد کے مطابق دعوت دی!"

غور سے دیکھا جائے تو امام غزالی کے یہ خیالات علامہ اقبال کے خیالات سے ذرا بھی مختلف نہیں ہیں۔ دورِ حاضر میں علامہ اقبال کے بعد ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم اس نقطۂ نظر کے سب سے بڑے حامی اور مؤید تھے جنھوں نے اپنی زندگی کا آخری حصہ اسی مقصد کے لئے وقف کر رکھا تھا کہ سائنسی علوم کو اسلام کے عقیدۂ توحید سے مربوط کر کے سائنس کو خدا جوئی، خدا شناسی اور خدا یابی کا سب سے بڑا ذریعہ بنا دیا جائے اور اس سے وہی کام لیا جائے جو ایک زمانے میں اسلام کی روح کی حفاظت کرنے کے لئے تصوّف سے لیا گیا تھا۔ شارحِ اقبال کی حیثیت سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے خود اپنی طرف سے بھی بڑے خوبصورت نکتے پیدا کئے ہیں۔ چنانچہ "حکمتِ اقبال" میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے نزدیک خدا کا تصوّرِ ہستی غائب نہیں اور نہ ہی وہ کوئی ورائے علم ہستی ہے۔ بلکہ وہ وہی ہستی ہے جس کی شہادت خود علومِ جدید یعنی سائنسی علوم ہمیں پہنچا رہے ہیں۔ یہ بات کہ خدا کی ذات ہماری آنکھوں سے مخفی ہے اس صداقت میں ذرّہ برابر فرق نہیں پیدا کرتی کہ خدا عین ہمارے سامنے موجود ہے۔ چنانچہ جس طرح ہم اپنے کسی دوست کی شخصیت (یا خودی) کو اس کے آثار و نتائج سے جو اس کے اعمال و افعال کی صورت اختیار کرتے ہیں اچھی طرح جان لیتے ہیں حالانکہ اس کی شخصیت یا خودی ہمیں نظر نہیں آتی، بالکل اسی طرح مظاہرِ فطرت میں خدا کی صفات کی بھرپور آشکارائی کے باوجود اس کی ذات ہماری نظروں سے مخفی رہتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ چند مظاہرِ فطرت کے بیان کے متصلاً بعد قرآن کا ارشاد ہوتا ہے: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝ (یہ ہے اللہ تمہارا پروردگار، پھر تم کدھر بھٹکتے پھر رہے ہو!)۔ ذٰلِكُمْ کا اشارہ صرف ایسی ہستی کی طرف کیا جا سکتا ہے جو صاف سامنے نظر آ رہی ہو!"

اس سے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جس طرح فلسفۂ مغرب میں نامشہود (UN SEEN) اور فوق الفطرت (SUPERNATURAL) کے الفاظ خدا کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، اسلام میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

علامہ اقبال کے نزدیک یہ عالم اصلاً روحانی عالم ہے اور ان کے نزدیک عالمِ اسلام کو آج جن تین چیزوں کی ضرورت ہے اس میں اوّلین اور سرِفہرست ضرورت اس بات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مدیر ترجمان القرآن کی خدمت میں

ترجمان القرآن ماہ جون و جولائی ۸۰ء کے اشارات سے متاثر ہو کر میں نے چند سطور محترم دوست نعیم صدیقی کو ارسال کی تھیں ۔ ان سطور کا مقصد ان کی اشاعت نہ تھی ۔ بلکہ اس قلبی تعلق کا اظہار تھا جو نعیم صدیقی صاحب کے ساتھ قائم ہے ۔ اور اس تحریک کے ساتھ روحانی رشتے کا نتیجہ تھا جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے بہترین ۳۰ سال صرف کئے ہیں کیونکہ اقامت دین کے اجارہ داروں نے اس تعلق کو اگرچہ بے رحمی کے ساتھ یکطرفہ طور پر منقطع کر دیا ہے ۔ لیکن میں اس کی کسک کو آج بھی دل میں محسوس کرتا رہتا ہوں ۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب مرحوم بحث و فکر کے معاملے میں جس بات کی شدید مخالفت کیا کرتے تھے ۔ ترجمان القرآن کے صفحات کو اسی بات کا ارتکاب کر کے داغ دار بنا دیا ہے ۔ یعنی یہ کہ پہلے مصنوعی کمزور پوزیشن میری جانب منسوب کی گئی اور پھر نہایت "بہادرانہ" تابڑ توڑ حملے کر کے قارئین کو تاثر دیا گیا کہ "دشمن" کو تہس نہس کر دیا گیا ہے ۔ یہ لکھتے ہوئے بے حد صدمہ ہوتا ہے کہ جناب نعیم صاحب کا یہ جواب میری تحریر سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ۔ بلکہ اس کی ایک ایک سطر افترا پردازی اور وسوسہ اندازی کا شاہکار ہے ۔ یہاں پر بھی جناب نعیم صدیقی صاحب نے وہی موقف اختیار کیا جس کی مذمت مولانا مودودی مرحوم ہمیشہ کیا کرتے تھے کہ کسی کی مخالفت میں خوب خوب غلط بیانی کر کے لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر دو ظاہر ہے کہ اس کا جواب ان سب لوگوں تک نہ پہنچ سکے گا جن کے ذہنوں کو مسموم کیا جا چکا ہے ۔ اس لئے جو لوگ جھوٹے پروپیگنڈے کا شکار ہو کر اس شخص کے مخالف بن جائیں گے وہ خالص نفع کی شکل میں تمہارے کیمپ میں آ جائیں گے ۔

میرے محترم دوست اور منجھے ہوئے صحافی نے میری تصویر کشی اتنی چابک

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ ؛ عشق را باز یرکی آمیز دہ

ایک دوسری نظم میں وہ عقل اور عشق (یعنی سائنس اور مذہب) کی باہمی گفتگو کے پیرائے میں اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ موجودہ دَور کے آلام و مصائب کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سائنس کا بنیادی مقصد معرفتِ خداوندی تھا لیکن جب سے سائنس کا رشتہ مذہب سے منقطع ہوا ہے دُنیا ایک عذاب کی جگہ بن گئی ہے :

ز افسونِ تو دریا شعلہ زار است ؛ ہوا آتش گذار و زہر دار است

چو با من یار بودی، نُور بودی ؛ بُریدی از من و نورِ تو نار است

بخلوت خانۂ لاہوت زادی

ولیکن در نخِ شیطاں فتادی

علامہ اقبال کی ان تصریحات کے پیشِ نظر یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ علّامہ اقبال کو مذہبی واردات کے جس نئے منہاج کی تلاش ہے وہ ان کے خیال کے مطابق سائنس میں اسلامی توحید کا عقیدہ شامل کرنے سے معرضِ وجود میں آئے گا۔ اس طرح سے تصوّف میں ایک نیا سلسلۂ سلوک پیدا ہو گا جو ہمیں اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف لوٹائے گا۔

(بقیہ صفحہ ۳۹)

ایسی تربیت گاہ قائم نہیں کی جس میں روح کو رقص کرنا سکھایا جا سکے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ اقبالؔ کا نصف کلام مسلمانوں کی عدم توجہ یا عدم اعتناء کی وجہ سے OBSOLETE یعنی منسوخ اور متروک ہو چکا ہے مثلاً

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت ؛ غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت

مدّاحین و عاشقانِ اقبالؔ میں سے کتنوں نے غوطہ لگایا ہے ؟ ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی ؛ تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

کتنے عاشقانِ اقبال آج تک اپنے من میں ڈوبے ہیں ؟ اس قسم کے اشعار سینکڑوں سے متجاوز ہیں۔ سچّی بات یہ ہے کہ اقبالؔ کا کلام ایک پیغام ہے اور پیغام پر عمل کرنا لازمی ہے۔ صرف اس کی داد یا تحسین ایک فعل عبث ہے۔ مثلاً طبیب کا نسخہ اگر مریض اسے استعمال کرنے کے بجائے صرف زبان سے اس کی تحسین کرتا رہے گا تو اس کے مرض کا کبھی ازالہ نہیں ہو سکے گا۔

ں ہے کہ کائنات کی روحانی تعبیر کی جائے اور وہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ روحانیت
ا چشمہ خود سائنس کے بطن سے پھوٹے۔ علامہ اقبال کا خیال ہے کہ سائنس کے نو بہ نو
نکشافات کے ساتھ ساتھ مذہب اور سائنس میں ایسی ایسی ہم آہنگیوں کا انکشاف
ہوتا رہے گا جو سرِدست ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ جوں جوں علم میں ہمارا قدم آگے
بڑھے گا فکر کے نئے راستے کھلیں گے:

(سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ)

ہاں میں دانش و بینش کی ہے کس درجہ ارزانی ؛ کوئی شے چھپ نہیں سکتی کہ یہ عالم ہے نورانی!
وئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا ؛ نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہانی!
ہ دنیا دعوتِ دیدار ہے فرزندِ آدم کو ؛ کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی!

اس ضمن میں علامہ اقبال کا اپنا تجربہ یہ ہے کہ رسم و رہِ فرزانگی نے انہیں روحانیت
کی دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے ؎

ہے رسم و رہِ فرزانگی ذوقِ جنوں بخشد ؛ من از درسِ خردمنداں گریباں چاک می آیم

ور علامہ اقبال نے اپنی حد تک لینے اس تجربے کو دوسروں تک منتقل کرنے کی کوشش بھی
ی ہے جس کا اعلان "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کے سرِ آغاز "بخوانندۂ کتاب"
یں ان پُرزور الفاظ میں ملتا ہے:

پاہِ تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق ؛ کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است
مانہ ہیچ نہ داند حقیقتِ اُو را ؛ جنوں قباست کہ موزوں بقامتِ خرد است
ں مقام رسیدم چو در برش کردم ؛ طوافِ بام و درِ من سعادتِ خرد است
ماں مبر کہ خرد را حساب و میزاں نیست ؛ نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

لامہ اقبال کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ سائنس کا رشتہ اگر مذہب کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو
س سے ایک ایسی نئی تہذیب جنم لے گی جس کی آج کی دکھی انسانیت کو تلاش ہے۔
جاوید نامہ" میں وہ سعد حلیم پاشا کی زبان سے کہلواتے ہیں:

غربیاں را زیرکی سازِ حیات ؛ شرقیاں را عشق رمزِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس ؛ کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمسر بود ؛ نقش بندِ عالمِ دیگر شود!

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مؤمنین

ماہنامہ

میثاق

لاہور

محرم الحرام و صفر المظفر ۱۴۰۱ھ

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت : ۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور

(فون : 852611 - 852683)

چندہ سالانہ -/۲۰ ——— قیمت فی شمارہ -/۲

(بقیہ صلا)

درانی نے تقریر کی اور صاحب صدر کے مقالہ پر یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ پانچواں اجلاس " قومی و ملی مسائل اور قرآن حکیم " کے موضوع کو اپنے جلو میں لئے ہوئے تھا صدر اجلاس تھے جناب ڈاکٹر سلیم فارانی اور مقررین و مقالہ نگار حضرات جناب عبدالروف ، خواجہ غلام صادق پروفیسر بختیار حسین ، پروفیسر عبدالمنان جناب اختر الواسع -

چھٹے اجلاس کا موضوع " فلسفہ اور سائنس کے مسائل اور قرآن حکیم " تھا صدارت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب خیرات محمد ابن رسا نے کرنا تھی مگر اسلام آباد میں اپنی مصروفیات کے سبب وہ نہ آسکے تو جناب پروفیسر بشیر احمد صدیقی نے صدارت کی کرسی سنبھالی ۔ جناب خلیق احمد (ایڈیٹر " یقین " انٹرنیشنل ، ڈاکٹر ابصار احمد ، ڈاکٹر ابوبکر ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی اور صاحب صدر نے خطاب کیا -

ساتواں اور آٹھواں اجلاس قرآن اکیڈمی میں منعقد ہوا جہاں جناب عبدالغفار شکیل (علی گڑھ یونیورسٹی) ، مظفر حسین ۔ جناب حافظ احمد یار ، ڈاکٹر الطاف جاوید ، پروفیسر مرزا محمد منور ، پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے مقالات پڑھے اور تقریریں کیں ۔ اسی شام سماع مسنون یعنی حسن قرأت کی محفل بھی ہوئی اس کانفرنس کے ایک اجلاس پر ملک کے ممتاز اور معروف صحافی م ، ش نے اپنے ایک کالم میں بھرپور تبصرہ کیا جو نذر قارئین ہے -

" اک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک ! "

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی !

ایک دن میں نے حضرت علامہ اقبالؒ کا مندرجہ بالا شعر پڑھ کر ان سے پوچھا کہ آیا اس تین سو سالہ ریفرنس سے اُن کی مراد اورنگ زیب عالمگیرؒ کی شخصیت سے ہے تو انہوں نے فرمایا : " نہیں میری مراد اس سے مجدد الف ثانی سے ہے ! "

(بقیہ صلا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

عرضِ احوال

'میثاق'، کا پیشِ نظر شمارہ سن عیسوی کے حساب سے تو ۱۹۸۱ء کے آخری دو مہینوں یعنی نومبر اور دسمبر کی اشاعتوں پر مشتمل ہے، لیکن اسلامی تقویم کے حساب سے ۱۴۰۱ھ کے پہلے دو مہینوں یعنی محرم الحرام اور صفر المظفر کی اشاعتوں کے قائم مقام ہے۔ اور چونکہ یکم محرم ۱۴۰۱ھ سے اسلامی کیلنڈر کا صرف نیا سال ہی شروع نہیں ہوا بلکہ نئی صدی یعنی پندرھویں صدی ہجری کا آغاز بھی ہوا ہے لہٰذا ہم بھی اس شمارے سے نہ صرف یہ کہ نئی جلد کا آغاز کر رہے ہیں (جلد نمبر ۳۰)، بلکہ آئندہ ان شاء اللہ العزیز 'میثاق'، کی اشاعتیں انگریزی مہینوں کے بجائے اسلامی مہینوں ہی سے منسوب ہوں گی!

——— (پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے اس شمارے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ایک بصیرت افروز اور معلومات افزا تحریر بھی شائع کی جا رہی ہے۔)

گذشتہ شمارے میں کتابت و طباعت کی بہت سی غلطیوں اور خامیوں کے ساتھ ساتھ مضامین کے "بقیات" کے ضمن میں صفحات کے نمبروں میں بھی بہت تکلیف دہ غلطیاں تھیں جن کے ضمن میں متعدد قارئین کی جانب سے شکایتی خطوط موصول ہوئے۔ ہم ان سب سے معذرت خواہ ہیں۔ ویسے تو ہم اس کے مدعی نہیں ہیں کہ ہمارا عام معیار بھی ان معاملات کے اعتبار سے کچھ زیادہ بلند رہا ہے تاہم اس بار جس کوفت کا سامنا قارئین کو ہوا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ راقم ملک سے باہر تھا اور یہ سارا کام بالکل نئے رفقاء کے ہاتھوں ہوا۔ اور یہ معاملہ صرف اسی شمارے کا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ سال سے بیرونی ممالک کے سفروں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس کے نتیجے

وميثاقه الذي واثقكم به ان كنتم مومنين

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۲۹ — محرم الحرام و صفر المظفر ۱۴۰۱ھ — عدد ۱-۲

مشمولات

پبلشر: ڈاکٹر اسرار احمد ★ طابع: چوہدری رشید احمد

کنونشن میں شرکت کا وعدہ کر لیا۔

یہ کنونشن ۱۲؍ اگست کو پاکستان سیکرٹریٹ کی عمارت میں ہوا۔ اور اس میں ملک کے ہر گوشے سے ڈھائی تین صد کے لگ بھگ علماء و فضلاء شریک ہوئے۔ پروگرام کے مطابق اس کی صرف دو نشستیں منعقد ہونی تھیں ایک صبح ۹ بجے سے نماز ظہر تک اور دوسری ظہر اور ظہرانے کے بعد سے نماز عصر تک رات کو صدر صاحب کی جانب سے ایک عشائیہ تھا۔ دوسرے اجلاس میں کنونشن میں ایک یوم کی توسیع کا فیصلہ کا اعلان ہو گیا۔ تاہم راقم نے دوسرے اجلاس کے اختتام پر صدر صاحب سے رخصت حاصل کر لی۔ اور رات کو جب سب شرکا رڈنر کے لئے پریذیڈنٹ ہاؤس جا رہے تھے راقم اسلام آباد ایئرپورٹ سے براہ راست عازم کراچی ہو گیا۔

کنونشن کے پہلے دن کی دو نشستوں میں کچھ وقت تو مرکزی وزارتِ امورِ مذہبی کے سیکرٹری اور متعلقہ وزیر باتدبیر کے کلماتِ خیر مقدم اور صدر مملکت کے مختصر افتتاحی خطاب میں صرف ہوا اور کچھ وقت جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل نے لیا جس میں انہوں نے کونسل کی کارگذاری کا مختصر جائزہ پیش فرمایا۔ باقی تمام وقت مدعوین کو اظہارِ خیال کے لئے دیا گیا۔ اور اس ضمن میں اگرچہ عمومی رہنمائی کے لئے تین عنوانات متعین کر دیئے گئے تھے تاہم کسی قسم کی کوئی پابندی نہ تھی بلکہ ہر شخص کو کھلی آزادی تھی کہ جو چاہے کہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ علماء کرام نے اپنے دل کی بھڑاس خوب خوب نکالی اور راقم الحروف داد دیئے بغیر نہ رہ سکا صدر ضیاء الحق صاحب کی ہمت اور حوصلے کو کہ انہوں نے پورے صبر و سکون کے ساتھ اور بغیر ایک حرف زبان سے نکالے تمام علماء کی تقاریر کو سنا۔ حتیٰ کہ بعض مقررین پر روک ٹوک سامعین کی جانب سے تو ہوئی صدر صاحب نے خواہ مخواہ کے طولِ کلام پر بھی ایک حرف تک زبان سے نہ نکالا۔ گویا کہ سُورۃ زمر کی آیت ۱۸ کے الفاظ مبارکہ ـــــ "اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ" میں وارد شدہ دو امور میں سے ایک یعنی "استماعِ قول" کے بارے میں تو اطمینان ہوا کہ بحمداللہ صدر ضیاء الحق صاحب میں بخوبی موجود ہے، رہی دوسری چیز یعنی "اتباعِ احسن" تو یہ ذرا مشکل مرحلہ ہے تاہم اگر اللہ کی توفیق شاملِ حال ہو تو بعید بھی نہیں!

میں راقم الحروف "میثاق" کی جانب بہت ہی کم توجہ کر سکا۔ اللہ کرے کہ ہم ایسا نظم قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ تمام معاملات ایک ہی شخص کی ذات سے وابستہ نہ رہ جائیں بلکہ ایک منظم ادارہ ایسا موجود ہو جو اس شخص کی عارضی یا مستقل غیر موجودگی میں بھی جملہ معاملات کو تسلسل اور حسن و خوبی کے ساتھ چلا سکے!

اس بار راقم ۲۲ء اور ۲۳ء اگست کی درمیانی شب کو کراچی سے عازم نیویارک ہوا تھا۔ اس سے متصلاً قبل اسلام آباد میں حکومت پاکستان کے زیر اہتمام "علماء کنونشن" منعقد ہوا تھا۔ اور اگرچہ راقم نہ فی الواقع "علماء" کے زمرے میں شامل ہے، نہ ہی اس سے قبل کسی موقع پر مرکزی تو کیا صوبائی حکومت ہی نے اسے علماء کرام کے کسی ایسے موقر اجتماع میں شرکت کے لائق گردانا تھا۔ تاہم اس موقع پر اس کنونشن کا دعوت نامہ ہی نہیں آیا۔ ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعے تاکید بھی ہوئی۔ راقم نے معذرت کر دی کہ چونکہ کنونشن ۲۱ اگست کو ہے اور میری ۲۲ء کو کراچی سے امریکہ کی روانگی طے ہے لہذا میں شرکت نہیں کر سکتا۔ اس پر اطلاع ملی کہ کنونشن سے چار روز قبل ۱۷ء اگست کو مجوزہ کنونشن ہی کے ضمن میں ایک خصوصی مشاورتی اجلاس ہو رہا ہے محترم صدر مملکت کی شدید خواہش ہے کہ اس میں آپ ضرور شریک ہوں۔ اس کے ضمن میں چونکہ عذر کوئی موجود نہ تھا لہذا اس میں شرکت ہوئی اور دونوں دن ۱۷ء و ۱۸ اگست، پر پھیلی ہوئی متعدد نشستوں میں محترم صدر مملکت اور ان کے بعض نہایت قریبی رفقاء کار سے نہایت بے تکلف ماحول میں تبادلۂ خیالات کا موقع ملا۔ ان ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے بھی بعض نہایت دلچسپ مشاہدات اور تأثرات میں جن میں اگر کبھی موقع ہوا تو ان شاء اللہ قارئین "میثاق" کو بھی شریک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ۱۸ اگست کے اجلاس کے اختتام پر صدر صاحب نے راقم سے براہ راست ہی دریافت فرمالیا کہ امریکہ کے لئے روانگی کب ہے؟ اور جب میں نے بتایا کہ ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی شب کو، تو انہوں نے اصرار فرمایا کہ پھر کنونشن میں بھی ضرور شرکت کرو، تمہارے یہاں اسلام آباد سے براہ راست کراچی پہنچانے کا اہتمام کر دیا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑی پیشکش جو انہوں نے کی اس کو قبول کرنے سے تو راقم نے شکریے کے ساتھ معذرت کر دی تاہم

اور توقعات" کے عنوان سے مقالہ پڑھا (جو پاکستان میں روزنامہ 'مسلم' اسلام آباد میں شائع ہوچکا ہے اور ہندوستان میں ہفت روزہ 'ریڈینٹ' (RADIANT) دہلی میں!)

—— علاوہ ازیں انہی ایام میں ایک روز وقت نکال کر راقم نے برادرم سمیع اللہ صاحب اور برادرم محمد نجم طاہر صاحب کے ساتھ ایک چکر 'بفلو' کا برادرم ڈاکٹر احمد فاروق مودودی خلف الرشید مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ملاقات کے لئے لگایا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا کرم ہے کہ انہوں نے میری وجہ سے ڈیوٹی سے نصف یوم کی رخصت لی، اور نہایت خندہ پیشانی سے استقبال کیا اور صرف یہ کہ دو ڈھائی گھنٹے بے تکلفی کے ساتھ اور بغیر کسی ذہنی تحفظ کے ذاتی، خاندانی اور تحریکی امور پر گفتگو میں حصّہ لیا بلکہ نہایت محبت اور اصرار کے ساتھ کھانا کھلایا۔ فجزاہُ اللہ خیرالجزاء!۔

بالکل ٹورنٹو ہی کی طرح کا بھرپور معاملہ اس سال شکاگو میں رہا۔ جہاں گیارہ دن تو مسلسل قیام رہا۔ جس کے دوران روزانہ درسِ قرآن کے علاوہ بہت سے اجتماعات میں شمولیت اور خطاب کا موقع ملا۔ اور ٹورنٹو ہی کی طرح انجمن کی تشکیل اور تنظیم کے قیام کے سلسلے میں دو مرتبہ مزید جانا ہوا۔ روزانہ درسِ قرآن کی حاضری اس بار شکاگو میں ٹورنٹو سے بڑھ گئی۔ سیرت النبیؐ کے موضوع پر منعقدہ ایک جلسے میں تو حاضری چھ سات صد سے بھی متجاوز تھی۔ یہ جلسہ شکاگو کے ایک وسیع وعریض مرکزِ تقریبات بیکارمک پلیس کے ہال میں منعقد ہوا جس میں راقم نے نہایت مفصّل تقریر کی۔

ٹورنٹو میں راقم نے مطالعہ قرآن حکیم کے اپنے مرتب کردہ "منتخب نصاب" کے کچھ مقامات کا درس تو پچھلے سال دیا تھا۔ جن کے ٹیپ وہاں برادرم سمیع اللہ صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے تیار کر کے بہت وسیع حلقے میں پہنچا دیئے تھے، اس سال راقم نے وہاں اُس نصاب کے بقیہ مقامات کا درس دے کر گویا اس کی تکمیل کر دی اور اُمید واثق ہے کہ اس مکمل نصاب کے ٹیپ شدہ دروس کے ذریعے ان شاء اللہ العزیز امریکہ میں دعوتِ قرآنی کی محکم اساس قائم ہو جائے گی۔

شکاگو میں اس بار تسلسل کے ساتھ سُورۂ حدید کا درس ہوا۔ جس کے فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ایک ماہر امراضِ قلب ڈاکٹر طور صاحب نے ریڈیو ٹیپ تیار کرائے جو لگ بھگ اٹھارہ گھنٹوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ خدا کرے کہ 'خطاب بہ اُمتِ مسلمہ' کے ضمن

راقم الحروف نے بھی کنونشن سے خطاب کیا - اور اپنے اظہار خیال کے لئے "اسلامی قانون کی تنفیذ اور فقہی و گروہی اختلافات" کا عنوان منتخب کیا - وقت اگرچہ بہت مختصر تھا ـــــ اور موضوع نہایت تفصیل طلب تاہم اللہ کا شکر ہے کہ اختصار کے ساتھ کچھ باتیں مرتب صورت میں بیان ہو گئیں اور اللہ کے فضل و کرم سے ایسا نہیں ہوا کہ بعد میں راقم کو یہ احساس ہوا ہو کہ تقریر کی روانی میں کوئی غلط بات زبان سے نکل گئی یا کوئی اہم بات بیان ہونے سے رہ گئی ـــــ یہ کنونشن چونکہ بالکل بند کمرے میں تھا اور اس کی تقاریر کی اشاعت وغیرہ خارج از بحث تھی لہٰذا راقم نے وہیں بیٹھے بیٹھے چند اشارات نوٹ کر لئے جو تقریر تقریباً فی البدیہہ کی تھی اسے بعد میں بھی مرتب کرنے کا کوئی خیال نہ آیا۔ لیکن دورۂ امریکہ سے واپسی پر لاہور میں اس کا جو تذکرہ سنا - اور جہاں بعض حلقوں کی جانب سے اس کی تحسین و تائید موصول ہوئی وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض حلقوں میں اس کی بعض باتوں کو بہت غلط رنگ میں پیش کر کے نہایت بھونڈی تنقید ہو رہی ہے تو راقم نے جمعہ ۳۱ اکتوبر کو مسجد شہداء میں درس قرآن کے بجائے بعض دوسرے امور کے ساتھ ساتھ اپنی اس تقریر میں پیش شدہ نکات پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی - یہ تقریر ٹیپ کر لی گئی تھی ـــــ اور اب ٹیپ کے فیتے سے سفو قرطاس پر بھی منتقل ہو چکی ہے - ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں اسے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا -

---

امریکہ اور کینیڈا کے دورے میں اس سال لگ بھگ دو ماہ صرف ہوئے - اور گذشتہ سال کے مانند اس بار بھی ایک بڑا "مورچہ" ٹورنٹو میں لگا جہاں دو ہفتے تو مسلسل درس قرآن اور خطابات عام کا سلسلہ جاری رہا - اور بعد میں انجمن خدام القرآن ٹورنٹو کی تشکیل اور تنظیم اسلامی کے قیام کے سلسلے میں ایک ایک دو دو دن کے لئے تین بار مزید جانا پڑا - روزانہ درس کی حاضری گذشتہ سال ہی کی طرح دو ڈھائی صد رہی - خطباتِ جمعہ اور ہفتہ اور اتوار کے دروس میں حاضری اس سے کہیں زیادہ ہوتی تھی - ان دو ہفتوں کے دو دن اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے سالانہ کنونشن میں شرکت کی نذر ہوئے جو مشہور عالم آبشار نیاگرا کے عین سامنے نیاگرا سٹی میں شیریٹن ہوٹل میں منعقد ہوا - جس کے آخری اجلاس میں راقم نے "پندرھویں صدی ہجری کے چیلنج، خطرات

اور انہیں سب کو راہِ حق میں ثبات و استقامت عطا فرمائے ۔

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا وَاِیَّاھُمْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْم !! آمین !!!

یہ انجمنیں اور تنظیمیں وہاں جس نہج پر کام کا آغاز کر رہی ہیں اُس کا اندازہ شکاگو سے آمدہ ایک خط سے ہو سکتا ہے ۔ وھو ھٰذا :۔

۲۵ نومبر ۱۹۸۰ء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ڈاکٹر صاحب السّلام علیکم

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے کافی دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر بے انتہا مصروفیت کی وجہ سے قاصر رہا اُمید ہے کہ آپ اس کوتاہی کو نظر انداز کر دیں گے ۔ آپ کے جانے کے بعد سے ہم لوگ باقاعدہ ہر ہفتہ کو بسلسلہ اجتماع انجمن خدام القرآن ایم سی سی (مسلم کمیونٹی سنٹر) میں جمع ہوتے ہیں جو کہ دن کے ۱۲ بجے سے ۳ بجے تک جاری رہتا ہے ۔ الحمدللہ کہ میر حمیدالدین صاحب کافی محنت کر رہے ہیں اجتماع کی کارروائی تین گھنٹے جاری رہتی ہے ان تین گھنٹوں میں سے ۱½ گھنٹہ تجوید قرآن اور عربی کے سیکھنے میں صرف ہوتا ہے باقی وقت آپ کے دروس کے ٹیپ سننے میں صرف ہوتا ہے اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ آئندہ آپکے تشریف لانے تک ہم لوگوں میں اخوت، محبت اور دین سے وابستگی کی وہ کیفیات برقرار رہیں گی ۔ جن سے ہم نے کام شروع کیا ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ اُمید افزا نتائج برآمد ہوں ۔ آمین ۔

ماشاءاللہ تنظیم کا کام بھی آگے بڑھ رہا ہے ۔ اقبال پٹیل صاحب نے اپنا انڈیا جانا فی الوقت ملتوی کر دیا ہے شاید اب موسم گرما میں جانے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ اس کی وجہ سے مجھے کافی تقویت پہنچی ہے چونکہ ضیاء الدین صاحب عنقریب ہی شادی کے سلسلہ میں پاکستان جانے والے ہیں اس لئے فی الوقت میں نے اور اقبال صاحب نے تنظیم کا کام بانٹ لیا ہے وہ اس سلسلے میں شکاگو شہر میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں اور میں اس کی مغربی بستیوں میں محنت کر رہا ہوں ۔ اللہ کے فضل و کرم سے سات آٹھ آدمی میرے خیالات سے اب تک متفق ہو چکے ہیں اور ہر جمعہ کو اس سلسلے میں بھی اجتماع ہوتا ہے بعد نماز جمعہ درس کے ٹیپ سنے جاتے ہیں ۔ ایک دو حضرات نے تو تنظیم میں شمولیت کا بھی ارادہ ظاہر کیا ہے مگر میں نے انہیں کچھ دن اور اچھی طرح سوچ

میں قرآن حکیم کے اس "ذروۂ سنام" کے درس کے یہ ٹیپ کچھ لوگوں کو اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے کمربستہ کرنے کا ذریعہ بن جائیں۔ وَمَا ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْز!

ٹورنٹو اور شکاگو دونوں مقامات پر بحمداللہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ذیلی انجمنیں بھی قائم ہوگئیں اور تنظیم اسلامی کی شاخیں بھی۔ ٹورنٹو کی انجمن کے صدر ڈاکٹر نسیم اللہ خاں صاحب مقرر ہوئے جو نفسیات میں پی ایچ ڈی ہیں اور تعلیمی نفسیات کے میدان میں کنسلٹنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں، ان کا تعلق تحریک اسلامی سے کافی پرانا ہے اور کالج کے دَور میں وہ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے فعّال کارکن رہے ہیں، شکاگو انجمن کے صدر میر حمیدالدین صاحب منتخب ہوئے ہیں۔ ان کے بارے میں اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر میر ولی الدین مرحوم (حیدر آباد دکن) کے صاحبزادے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ سرزمین شمالی امریکہ میں یہ دونوں انجمنیں قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے اور اعلیٰ سطح پر نشر و اشاعت کے کام کی داغ بیل ڈال سکیں۔

ان دونوں ہی مقامات پر اللہ کے فضل و کرم اور اس کی تائید و توفیق سے بعض حضرات نے اگلا قدم بھی اٹھا لیا ——— یعنی "سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد" کی بیعت کے سلسلے میں منسلک ہوکر "تنظیم اسلامی" میں شمولیت اختیار کر لی۔ اور "مقامی تنظیمیں" ارضِ امریکہ میں قائم ہوگئیں۔ اور دعوتِ قرآنی کی یہ تاثیر اور اعجازِ قرآنی کے یہ عملی مظاہر بھی دیکھنے میں آئے کہ ایک مقام پر ایک صاحب نے جو بینک سے سُود پر لی ہوئی رقم کی بدولت پانچ پٹرول پمپ چلا رہے تھے فوراً تین پمپ بند کر دیئے اور صرف دو پر اکتفا کر لی جنہیں وہ اپنے ذاتی سرمایے سے چلا سکتے تھے، دوسرے مقام پر ایک صاحب نے اپنے مکان پر جو انہوں نے "بنک کے پاس رہن" کے اصول پر سُودی قرضے سے لیا تھا فوراً "برائے فروخت" کی تختی لگا دی اور جب راقم وہاں دوسری بار گیا تو معلوم ہوا کہ مکان فروخت ہو چکا ہے لیکن بینک کے چنگل سے پوری طرح نکلنے کے لئے انہیں چند ہزار ڈالر کی مزید ضرورت ہے، اس پر دینی اخوّت، رفاقت کا یہ نادر مظہر بھی سامنے آیا کہ امریکہ کے صد درجہ مادیت پرست معاشرے میں جہاں بین الانسانی علائق میں واقعتہً "نفسی، نفسی" کا دَور دورہ ہے، ایک دوسرے رفیقِ تنظیم نے شدید اصرار کے ساتھ مطلوبہ رقم "قرضِ حسنہ" کی صورت میں فراہم کر دی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات پر اپنی کتابِ عزیز کے صدقے میں رحمتوں کا نزول فرمائے اور ہمیں

نہ نکل سکا)۔

ان تمام مقامات پر درسِ قرآن کی نہایت کامیاب مجالس منعقد ہوئیں جن کی یادیں ابھی تک ذہن میں تازہ ہیں اور وہاں کے احباب کے خلوص و اخلاص اور محبت اور گرم جوشی کے نقوش بھی لوحِ قلب پر پوری طرح کندہ ہیں۔ خاص طور پر مانٹریال کے بھائی محمد شفیق صاحب، جناب غوث پاشا صاحب، اور ڈاکٹر محمد اسحٰق صاحب کے دین سے شغف اور دینی کاموں کے لئے سرگرمی کا نہایت گہرا اثر میرے دل نے قبول کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر رؤف خالد صاحب کی ملاقات بھی ذہن پر گہرے نقش چھوڑ گئی۔ اسی طرح اٹلانٹا کے جناب اقبال گدائی صاحب اور اورینج کاؤنٹی لاس اینجلز کے جناب اعظم قریشی صاحب کی ملاقاتوں کے بھی نہایت گہرے نقوش قلب و ذہن پر قائم ہوئے۔ نیویارک میں جن احباب سے گذشتہ سال کی ملاقات کی تجدید ہوئی ان میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سابق ناظمِ اعلیٰ میاں محمد رشید صاحب کے صاحبزادے عزیزم طارق رشید اور استاذی المکرم ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ صاحب مرحوم کے صاحبزادے ڈاکٹر نعیم اللہ کے علاوہ تحریکی مزاج اور فعّال شخصیتوں کے مالک اور بائمہ مدد رجہ شیروشکر دوست جناب شمشیر علی بیگ اور محترم ذکار اللہ پیرزادہ ــــــــــ اور مزاجاً نہایت دھیمے لیکن مستقل مزاجی سے کام کرنے والے ڈاکٹر قیصر صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔ بالکل نئی ملاقاتوں میں جناب شمیم صدیقی صاحب کا کام قابل ذکر ہے۔ تحریکِ اسلامی کے ساتھ ان کا قلبی و ذہنی رشتہ بہت پرانا ہے اور اس کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں وہ بے حد متفکر ہیں چنانچہ ان سے نہایت بے تکلفانہ ماحول میں بہت طویل گفتگو ہوئی۔ ایک اور 'تجدید ملاقات' بھی قابل ذکر ہے۔ نیویارک کے اسلامک سنٹر میں جمعہ کی نماز کے بعد ایک نوجوان والہانہ انداز میں لپٹ گئے ــــــ انہوں نے پوچھا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں" میں ابھی ذہن پر زور دے ہی رہا تھا کہ انہوں نے آہستہ سے کہا "محمود!" اور اب میری باری تھی چنانچہ میں نے بھی انہوں نے گرم جوشی سے لپٹا لیا ــــــــــ دفعۃً بہت سی پرانی یادیں ذہن میں تازہ ہو گئیں۔ یہ تھے اسلامی جمعیت طلبہ لاہور و پنجاب کی نظامت کے دور میں میرے نائب اور دستِ راست خواجہ محبوب الٰہی کے برادرِ خورد ڈاکٹر محمود احمد خواجہ ــــــــــ!! (جن کی یہ اتفاقی ملاقات خود خواجہ محبوب الٰہی کے ساتھ تجدید

سمجھ لینے کی تلقین کردی ہے، آپ کی موجودگی میں انجمن کے سلسلے میں تو کافی تفصیلی گفتگو میں رہیں مگر بدقسمتی سے تنظیم کے طریق کار کو سمجھنے کے لئے مناسب وقت نہیں مل سکا۔ اب امید ہے کہ آپ خط کے ذریعے سے تفصیلاً آگاہ فرما کر شکریہ کا موقع دینگے۔

اقبال صاحب ہر ہفتہ ایک مختلف گروہ میں جاتے ہیں جس میں دین کی تبلیغ اور درس قرآن کے ٹیپ سنانا شامل ہے نتائج امید افزا نظر آتے ہیں اللہ تعالے سے میری دعا ہے کہ اللہ تعالے انہیں اور ہم سب کو اس نیک کام کی توفیق عطا فرمائے اور ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی ہمت عطا فرمائے آمین آپ بھی ہمارے حق میں دعا فرمایئے۔

آپ کے جانے کے بعد دو تین اہم کام ہوئے ایسٹ ولیسٹ یونیورسٹی کا افتتاح ہوا جس میں پرنس فیصل اور چند دوسری اہم شخصیتوں نے شمولیت کی۔ ہاں میں آپ کو ایک خوشخبری سنانا تو بھول ہی گیا، اقبال پٹیل صاحب اور ڈاکٹر خورشید ملک صاحب نے داڑھی رکھ لی ہے۔ اللہ کرے کہ اتباع سنت کا جذبہ اور زیادہ ہو۔ اب آپ سنایئے وہاں کے کیا حال ہیں؟ جو وقت آپنے یہاں صرف کیا اب اس کی تلافی وہاں کرنی پڑ رہی ہوئی۔ ہم لوگ یہاں اتنی دور ہیں کہ آپ کی کسی قسم کی عملی مدد نہیں کرسکتے۔

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہونگا۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی اب ہم لوگوں کی طرف سے تمام حضرات کو حسب مراتب سلام و دعا پہنچادیں۔

احقر:- احمد سلیم صدیقی۔

ٹورنٹو اور شکاگو کے علاوہ اس بار کینیڈا میں تین روز کے لئے صرف مانٹریال جانے کا موقع مل سکا۔ اوٹوا کے احباب کی جانب سے شدید اصرار کے باوجود وہاں کے لئے وقت نہ نکل سکا البتہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے متعدد شہروں میں دو دو تین تین دن کے لئے جانا ہوا۔ چنانچہ بالٹی مور اور واشنگٹن کی بھی گذشتہ سال کی یادیں تازہ ہوئیں۔ اور نیویارک میں تو دو مرتبہ میں سات آٹھ روز کے قیام کی صورت بن گئی۔ علاوہ ازیں امریکہ کے مغربی ساحل واقع مشہور شہر لاس اینجلیز بھی جانا ہوا۔ چنانچہ بحرالکاہل کی بھی "زیارت" کا موقع مل گیا ——— اور جنوب مشرقی علاقے کے اہم شہر اٹلانٹا (جیارجیا) بھی جانا ہوا۔ (کینیڈا کے مغربی کنارے کے اہم شہر وینکوور سے بھی شدید تقاضا رہا۔ لیکن وہاں کے لئے بھی وقت

خطاب بہ صدرِ مملکت

★ اسرار احمد ★

قارئین 'میثاق' میں سے اکثر کے علم میں ہوگا کہ راقم الحروف کئی سال سے مسجد دار السلام 'باغ جناح' لاہور میں خطبہ جمعہ دے رہا ہے، جمعہ ۲۸ر نومبر کو صدر پاکستان محترم ضیاء الحق صاحب صدرِ انڈونیشیا جناب سوہارتو کے استقبال کے لئے لاہور تشریف لائے تو جمعہ کی نماز انہوں نے مسجد دار السلام میں ادا فرمائی۔ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے راقم الحروف نے کچھ گذارشات ان کی خدمت میں پیش کیں جنہیں ٹیپ سے اتار کر ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔

الحمدللہ کہ محترم صدر صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان گذارشات کو خندہ پیشانی سے سُن کر "یستمعون القول" کی ایک مزید شاندار مثال پیش فرمادی بلکہ نماز کے بعد راقم سے یہ فرما کر کہ میں آپ کی باتوں پر پوری سنجیدگی سے غور کروں گا "فیتبعون احسنہ" کی امید بھی پیدا فرمادی۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقہُ وَاِیَّانَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرضٰی، آمین۔ خاکسار اسرار احمد

"آپ حضرات کے علم میں ہے کہ آج صدر مملکت جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نمازِ جمعہ کی ادائیگی کے لئے اس مسجد میں تشریف فرما ہیں یہ ہمارے لئے بڑی خوشی کی بات ہے۔ اگرچہ ایک پہلو سے ذرا تکلیف بھی ہوئی ہے چونکہ باغ میں ہم نے سیکورٹی کا کچھ زیادہ ہی اہتمام دیکھا (یہ اس وجہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ انڈونیشیا کے صدر جناب سوہارتو صاحب نماز جمعہ کے بعد عصرانہ میں شرکت کے لئے باغ جناح میں تشریف لانے والے تھے) شاید ہمارے چند مستقل نمازی ان غیر معمولی حفاظتی انتظامات کی وجہ سے مسجد تک نہ پہنچ

ملاقات کا ذریعہ بن لئ چنانچہ پاکستان اگریس نے ان سے ملاقات میں 'پہل' کی —— اور عرصۂ دراز سے جمی ہوتی "برف ٹوٹ گئی !"")

اسی قسم کا تذکرہ اگر ٹورنٹو اور شکاگو کے احباب کا کیا جائے تو سلسلہ بے حد طویل بھی ہو جائے گا۔ اور میرے لئے اُن میں تقدیم و تاخیر کا فیصلہ بھی آسان نہ ہوگا۔ البتہ ٹورنٹو کے احباب میں سے برادرم محمد نجم طاہر صاحب اور برادرم سلیم معین الدین صاحب کا شکریہ میرے ذمّے واجب الادا ہے اسلئے کہ طاہر صاحب کے یہاں مسلسل دس روز کے لگ بھگ قیام رہا۔ اور سلیم صاحب کے یہاں بھی کئی دن ٹھہرنا ہوا (برادرم حافظ سعید احمد صاحب کا ذکر اس لئے نہیں کر رہا کہ ان سے تو عزیزداری بھی ہے!) شکاگو میں قیام کا مستقل 'ٹھیکہ' برادرم ڈاکٹر خورشید ملک صاحب کے پاس رہا۔ جن کے بارے میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان کا دل زیادہ مسلمان ہے یا دماغ؟ —— ان کے علاوہ برادرم پیر محمد صاحب کا شکریہ میرے ذمّے واجب الادا ہے، انہوں نے اپنے کام سے طویل رخصت لے کر جس طرح میرے پورے قیام شکاگو کے دوران ہی اپنے آپ کو مجھ سے منسلک نہیں کر لیا تھا بلکہ لاس اینجلیز کے طول طویل سفر اور بلومنگ فیلڈ، (انڈیانا پولس) میں واقع ایم ایس اے کے ہیڈ کوارٹرز کی 'زیارت' میں بھی رفاقت اختیار کی۔ اس کے لئے میں ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزا عطا فرمائے۔ —— اور ان کے جذبۂ دینی کو مزید جلا بھی بخشے اور ثبات و دوام بھی عطا فرمائے!!

امریکہ کے اس سال کے دورے میں راقم نے سفر بہت کیا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ۷۵ دنوں میں لاہور سے اسلام آباد، اسلام آباد سے کراچی، کراچی سے نیویارک، نیویارک سے ٹورنٹو، ٹورنٹو سے مانٹریال، مانٹریال سے پھر ٹورنٹو، ٹورنٹو سے شکاگو، شکاگو سے لاس اینجلیز، لاس اینجلیز سے پھر شکاگو، شکاگو سے اٹلانٹا اور اٹلانٹا سے پھر ٹورنٹو، ٹورنٹو سے نیویارک، نیویارک سے بالٹی مور اور واشنگٹن (بذریعہ کار) واشنگٹن سے پھر (تیسری بار) شکاگو، شکاگو سے پھر ٹورنٹو (چوتھی بار) ٹورنٹو سے نیویارک اور بالآخر نیویارک سے کراچی اور کراچی سے لاہور — یہ تمام سفر تو باستثنائے واحد ہوائی جہاز سے ہوئے۔ ان کے علاوہ ٹورنٹو سے نیاگرا اور واپسی، پھر ٹورنٹو سے بفلو اور واپسی، اور شکاگو سے بلومنگ فیلڈ اور واپسی بذریعہ کار ہوئی —— اور ویسے بھی اس پورے عرصہ کے دوران روزانہ اوسطاً تین گھنٹے کار ہی میں

(بقیہ ص ۱۱۶ پر)

میں اس موقع پر چند چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف صدر مملکت کی توجہ منعطف کرانا چاہوں گا۔ میں بڑی بڑی باتوں کا ذکر دانستہ نظر انداز کر رہا ہوں چونکہ بات موقع و محل کی مناسبت سے کہی مفید ہوتی ہے۔ باتیں گو چھوٹی ہیں لیکن وہ صرف بظاہر ہی چھوٹی ہیں ورنہ ان کا گہرا تعلق ہمارے مجموعی فکر کے ساتھ ہے۔ ایک صاحب نے ایک مرتبہ کہا تھا اور بالکل درست کہا تھا کہ "ہم مسلمانوں کی ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ہم بڑی بڑی باتوں کے متعلق تو بہت سوچتے ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں حالانکہ یہ چھوٹی باتیں بسا اوقات بڑی باتوں کے حل میں مانع ہوتی ہیں۔

اس موقع پر میں صدر صاحب کی خدمت میں پہلی بات تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لئے جائزہ لیجئے کہ ہمارے ملک میں کرکٹ کے کھیل کو حکومت کی جو غیر معمولی سرپرستی حاصل ہے تو کیا یہ گیم قرآن مجید کی طرف سے ہم پر عائد کیا گیا ہے یا سُنتِ رسُولؐ سے ماخوذ ہے یا ہماری روایات اور تہذیب کا کوئی لازمی حصہ ہے۔ اس کھیل کی وجہ سے پانچ پانچ اور چھ چھ دن ہماری پوری قوم معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ کھیل کی وجہ سے دفتروں میں کوئی کام نہیں ہوتا۔ لوگ یا تو ٹی۔ وی کھوٹ کھیل۔ دیکھتے ہیں یا ٹرانسسٹر ریڈیو کے ذریعہ کامنٹری سنتے ہیں۔ غور کیجئے کہ کتنا قیمتی وقت قومی سطح پر ضائع ہوتا ہے۔ ہمارے گیمز اور بھی ہیں، جو ڈیڑھ دو گھنٹے میں کھیلے جاتے ہیں۔ ان میں ایکشن ہے۔ حرکت ہے۔ جوانمردی ہے۔ ایسے گیمز کی سرپرستی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ کرکٹ کا گیم دا تعہ یہ ہے میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آخر کیوں ہم نے اسکو سر فہرست رکھ چھوڑا ہے۔ جبکہ اس گیم کا ہماری روایات سے اور ہماری تہذیب سے کوئی تعلق نہیں! کیا محض اس لئے کہ یہ گیم ہمارے سابق بدیشی حکمرانوں کا خاص اور پسندیدہ کھیل ہے اس کو جاری رکھا گیا ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس کھیل کی سرپرستی کا کوئی جواز یا فائدہ میری سمجھ میں نہیں آتا، وقت کا قومی سطح پر زیاں۔ پھر اس کھیل پر لاکھوں کا خرچ! جو فضول خرچی اور اسراف کے ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے میں عرض کروں گا۔ کہ ہمدردی سے جائزہ لیجئے کہ اس گیم کی سرپرستی سے قومی سطح پر نقصان اور فائدے کا تناسب کیا ہے پھر کوئی مثبت قدم اُٹھایئے!

دوسری بات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک کے حوالے سے پیش

سکے ہوں اور لوٹ گئے ہوں ۔ بایں ہمہ صدر مملکت کی موجودگی ہمارے لئے بڑی مسرّت کی بات ہے ۔ میں اس موقع پر چند باتوں کی طرف صدر صاحب کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں ۔ یہ کام میں اس امید پر کر رہا ہوں کہ صدر صاحب اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ میں ایک خالص غیر سیاسی آدمی ہوں ۔ میں اُس وقت بھی عملی طور پر غیر سیاسی آدمی تھا ، جب یہاں سیاست کی بڑی کھچڑیاں پک رہی تھیں اور بہت سے لوگوں نے بہتی گنگا سے خوب ہاتھ دھوئے تھے ۔ میں اُس وقت بھی تمام ہنگامی کاموں سے بالکلیہ الگ تھلگ رہا اور اُسی کام میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف رہا ۔ جس کو میں نے پورے شعور اور محاسبۂ اُخروی کے احساس مسئولیت کے ساتھ اختیار کیا تھا اور اپنا نصب العین بنایا تھا یعنی قرآن حکیم کی روشنی میں اعلائے کلمۃُ اللہ اور تجدید ایمان کے لئے سعی و جہد ، اور دعوت و تبلیغ ۔ الحمدُ للہ کہ اس کام میں پوری یک سوئی کے ساتھ لگا رہا اور لگا ہوا ہوں اور اللہ تعالےٰ کا صد ہزار شکر کہ اس نے ہر قسم کی سیاسی اور ہنگامی ترغیبات کی طرف مجھے آنکھ اُٹھانے سے محفوظ رکھا ہے ۔ میں فی الوقت صدر صاحب کی خدمت میں جو معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں وہ اس امید پر کہ موصوف ان کو تحمل کے ساتھ سنیں گے ۔ مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ صدر صاحب نے بہت سے لوگوں کی باتیں کمال تحمل اور صبر کے ساتھ سنی ہیں ۔ علماء کنونشن میں واقعہ یہ ہے کہ صدر صاحب نے لوگوں کی لمبی لمبی تقریریں جس تحمل و صبر کے ساتھ سنی ہیں میں ان کے حوصلہ اور ہمت کی داد دیتا ہوں ۔ آپ حضرات اچھی طرح جانتے ہیں کہ لوگوں کی فکری و ذہنی سطح میں عظیم تفاوت ہوتا ہے ۔ مختلف ذہنی و فکری سطح کے لوگ جب کسی پلیٹ فارم پر تقریروں کے لئے آتے ہیں تو ان میں تقریریں کام کی بھی ہوتی ہیں اور بھرتی کی بھی ہوتی ہیں ۔ ایسے مقررین بھی ہوتے ہیں جو زور بیان و تقریر کے اظہار کے لئے اپنی تقریر طویل تر کر دیتے ہیں اور متعلق و غیر متعلق موضوعات پر کافی وقت لے لیتے ہیں ۔ لیکن میں نے علماء کنونشن میں دیکھا ہے کہ صدر صاحب نے بڑے سکون اور توجہ کے ساتھ سب کی باتیں سُنیں ۔ ان کے اس حوصلے اور ہمت کی داد نہ دینا ظلم ہے لہٰذا میں نے ان کے اس وصف کا تذکرہ اپنے امریکہ کے حالیہ دورے میں بھی متعدد مقامات پر کیا اور یہاں بھی اپنی تقریروں میں اور اپنے احباب و رفقاء کی مجالس میں بھی اس کا ذکر کیا ہے ۔

کے لئے سورہ احزاب میں جو احکام آئے ہیں - وہ محض تلاوت کے لئے نہیں ہیں بلکہ عمل کے لئے ہیں - جیسے ہمارے مردوں کے لئے محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُسوۂ حسنہ ہیں۔ ہماری خواتین کے لئے بھی تو اُسوہ چاہیئے تھا سورۂ احزاب ہی میں یہ آیت آئی ہے " لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ -" بلا شبہ اے مسلمانو! تمہارے لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مطہرہ ایک بہترین و کامل نمونہ ہے' - اب خواتین کے لئے بھی تو ایک اُسوہ حسنہ چاہیئے تھا - خواتین کی زندگی کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں، جن کے لئے نبی اکرمؐ کی زندگی اُسوہ نہیں بن سکتی - اس ضرورت کے لئے ہماری خواتین کے لئے اُسوہ ہے ازواجِ مطہرات کا - اسی لئے ازواجِ مطہرات سے قرآن مجید میں اسی سورۂ احزاب میں فرمایا گیا ہے کہ " يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ ٱلنِّسَآءِ -[1] "اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو" - یعنی تمہیں تو اُمت کی خواتین کے لئے نمونہ بننا ہے - اسی لئے فرمایا کہ " اگر تم میں سے کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو اُسے دہری سزا دی جائے گی"[2] اور " تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے"[3] ازواجِ مطہرات کو جو تنبیہہ کی گئی اور جو بشارت دی گئی ہے تو یہ معاملہ ہمارے غور و فکر کا ہے - ہمیں چاہیئے کہ ان آیات پر تدبّر کریں اور ان سے جو ہدایات اخذ ہوں ان پر عمل پیرا ہونے اور دوسروں سے عمل کرانے کی حتی الامکان اور حتی الوسع کوشش کریں - مجھے اندازہ ہے کہ انگریز کی غلامی اور دوسرے اسباب سے ہمارے معاشرے کی ذہنی و اخلاقی اقدار و روایات میں زبردست انحطاط آیا ہے - میں جانتا ہوں کہ ہماری معیشت کا ایسا ڈھانچہ بن گیا ہے - جس میں عورتیں معاشی میدان میں کام کر رہی ہیں - ان کا مسئلہ کافی پیچیدہ ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ Where there is a will there is a way یعنی عزم مصمم ہو اور یہ ارادہ کر لیا جائے کہ یہ کام کرنا ہے اپنی روایات اور اپنے دین کی تعلیمات کو اختیار کرنا ہے تو ان شاء اللہ راہ آسان ہو جائے گی -

تیسری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ صدر ایوب مرحوم کے دور میں جو عائلی قوانین نافذ کیئے گئے تھے، ان کو پاکستان کے ہر مکتبِ فکر کے علماء کرام نے غلط قرار دیا تھا - لیکن آج بھی ان کو تحفظ حاصل ہے - خدا کے لئے سوچیئے کہ جو قوانین بالاتفاق شریعت سے متصادم ہیں، وہ کیوں نافذ رہیں؟ ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لے اور آپ

---

[1] آیت ۳۲ ، [2] آیت ۳۰ ، [3] آیت ۳۱ ،

کرنا چاہتا ہوں ۔حضورؐ نے فرمایا تھا کہ :۔

"میں اپنی اُمت کے بارے میں جس بات کا سب سے زیادہ اندیشہ رکھتا ہوں وہ عورتوں کا فتنہ ہے" (اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے لئے سوچئے ہمارے دین کی کچھ روایات ہیں ۔ کچھ شعائر ہیں ۔ ہماری شریعت میں جہاں زنا اور قذف کے لئے حدود و تعزیرات مقرر کی گئی ہیں، وہاں ستر و حجاب کے لئے بھی کچھ احکامات دیئے گئے ہیں اور کچھ قیود و عائد کی گئی ہیں ۔ مَیں یہ بات مختلف مواقع پر اپنی تقاریر اور تحریرات میں عرض کر چکا ہوں اور ٹیلی ویژن پر بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر آپ شریعت کے تمام احکام کو نافذ نہیں کریں گے تو یہ شریعت پر ظلم ہوگا اور لوگوں پر بھی ظلم ہوگا ۔ ہمیں اپنی روایات کی طرف دیکھنا چاہیئے اور ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم ان سے روگردانی تو نہیں کر رہے

مَیں بڑی دلسوزی کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کچھ پتہ نہیں کہ میری زندگی کتنی ہے اور کتنی زندگی صدر صاحب آپ کی ہے ۔ لہٰذا قول حق کہنے میں نہ مجھے مداہنت اختیار کرنی چاہیئے اور نہ ہی آپ کو اس پر سنجیدگی سے غور و خوض کرنے میں تامّل کرنا چاہیئے۔ آپ سوچئے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آپکے عہد حکومت میں پاکستان میں خواتین کی ہاکی کی ٹیم تیار ہو رہی ہے ۔ اور ایسے معاملات میں قدم پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑھ رہے ہیں ۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ آپ سیلاب کا رُخ موڑیں اور معاشرے سے وہ طور طریقے ختم کرنے کی کوشش کریں جو ہمارے دین کی رو سے بُرائیاں ہیں اور ہماری اخلاقی اقدار کے قطعی منافی ہیں ۔ خدا نے آپ کو اس کا موقع دیا ہے ۔ سیاسی باتیں مَیں اس موقع پر کرنا نہیں چاہتا ۔ وہ اپنی جگہ اہم ہیں لیکن ہر چیز کا اپنا ایک مقام ہے ۔ ویسے بھی مَیں عرض کر چکا ہوں کہ مَیں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں اور میں اپنی زندگی دینِ مُبین اور اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم کی خدمت کے لئے وقف کر چکا ہوں ۔ میری یہ حقیر اور ناچیز کوششیں میرے لئے کسی درجہ میں بھی توشۂ آخرت جائیں تو بھی میرے لئے سب سے بڑی سعادت ہے ۔ لیکن میں اپنا دینی فرض سمجھتا ہوں کہ مجھے کتاب و سُنت سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ نبی اکرمؐ کے قول مبارک کہ "الدین النصیحہ"، کی تعمیل میں آپ کی دینی و دنیوی خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دوں ۔ حجاب کے احکام ہماری شریعت کے جزوِ لاینفک ہیں ۔ اُمہات المومنین رض

انفاق فی سبیل اللہ

ایک نشری تقریر —— ڈاکٹر اسرار احمد

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۲۷۴

"وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال رات اور دن، خفیہ طور پر بھی اور علی الاعلان بھی ان کا اجر ان کے رب کے پاس (محفوظ) ہے اور ان کو نہ کوئی ڈر ہے اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے!"

ابھی آپ نے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۴ مع ترجمہ سنی، جو انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں مال صرف کرنے سے متعلق دو رکوعوں سے بھی زاید پر پھیلی ہوئی ایک نہایت جامع بحث کی آخری کڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لئے مال صرف کرنا اسلام کی بنیادی تعلیمات اور قرآن حکیم کے اساسی مضامین میں سے ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صرفِ مال کی دو بڑی بڑی مدیں ہیں۔ ایک یتیموں، بیواؤں، محتاجوں، مسکینوں اور دوسرے امداد و اعانت کے مستحق لوگوں کی حاجت برآری میں مال خرچ کرنا جس میں غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینا اور مقروضوں کو قرض

اس ملک کی تاریخ میں ایک عظیم شخصیت کا مقام حاصل کریں - ہمارے ہاں بڑے بڑے
پہلے بھی اقتدار میں آئے ہیں - اللہ تعالیٰ نے ان کو مواقع دیئے - بدقسمتی سے وہ محروم رہ
دنیا سے چلے گئے - ہم نہیں چاہتے کہ آپ کا نام بھی ایسے لوگوں میں شامل ہو - لہٰذا میری
اپیل ہے کہ جو مواقع آپ کو حاصل ہیں، ان کو غنیمت سمجھا جائے - تبدیلی اور اصلاح
کا آغاز چھوٹی چھوٹی سی باتوں ہی سے کیجئے "قطرہ قطرہ بہم شود دریا" ____ یہ
کچھ چھوٹی چھوٹی باتیں آپ کے سامنے رکھی ہیں - میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس
توفیق عطا فرمائے کہ جو قول حق ہے اس کو سنیں - اور قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ کا
مصداق بنیں : اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ یعنی جو صحیح
بھی آپکے گوش گذار ہو - اس کو عزم مصمم اور بہترین طریق سے روبعمل لانے کی تو
پائیں - آمین یا رب العالمین -

گذرتے رہے ، گویا ع : "ہر صبح سفر ، ہر شام سفر" کا معاملہ رہا -
عربی زبان میں "سفر" کے اصل معنی "کشف الغطاء" (راغب) کے ہیں یعنی
ہٹیں اور اصل حقائق منکشف ہوں ، اسی لئے کتاب جو لاعلمی کے پردوں کو چاک کر
معلومات کے دائرے کو وسیع کرنے کا ذریعہ بنتی ہے "سفر" کہلاتی ہے اور صبح کے رَ
ہو جانے پر "اسفار" کا اطلاق ہوتا ہے (وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ) زمین میں گھو
پھرنے (فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ) کو بھی سفر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعے نئے مشا
کا موقع ملتا ہے اور معلومات کا دائرہ وسیع ہوتا ہے ، اور بسا اوقات بالکل نئے حقائ
انکشاف ہوتا ہے ____ راقم کو اعتراف ہے کہ امریکہ کے گذشتہ اور موجودہ سال
دوروں سے بہت سی نئی معلومات بھی حاصل ہوئیں اور دُور بیٹھ کر محض 'سمع' کی بنیاد
تصوّرات ذہن میں قائم تھے ان میں سے بعض میں کسی قدر تبدیلی بھی آئی (شنیدہ کے بو
دیدہ !) ____ چنانچہ راقم نے سفر سے واپسی پر جمعہ ۲۴ اکتوبر کو مسجد شہداء میں د
قرآن کے بجائے اپنے سفر امریکہ کے مشاہدات اور تاثرات تفصیلاً بیان کئے تھے ، یہ
بھی ٹیپ سے اتاری گئی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں شائع کر دی جائے گی لس
کی ایک حسین یاد یو این او کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں صدر پاکستان محترم محمد ض
صاحب کی تقریر کے موقع پر حاضری کی بھی ہے ، اس کے ضمن میں بھی راقم کے تاثر

اس اعتبار سے جہاد اور انفاق تقریباً مترادف الفاظ بن جاتے ہیں اور جہاد بالمال والنفس بالانفاقِ جان و مال اور بذلِ مال ونفس دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

سورۂ بقرہ میں چھتیسویں رکوع کے آغاز سے انفاق فی سبیل اللہ کا مضمون شروع ہوتا ہے اور مسلسل دو رکوعوں تک اسی بحث کے مختلف پہلوؤں پر کلام ہوا ہے چنانچہ اس کی اہمیت، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت۔ اس کی جزا۔ اس کے بارگاہِ الٰہی میں قبول ہونے کی شرائط یعنی خلوص و اخلاص۔ اس کے حبط اور ضائع ہوجانے کے اسباب یعنی ریا اور جتلانا، اس کے لئے بہتر اور بیشتر مال نکالنا نہ کہ کمتر اور کہتر، اس کا اظہار اور اخفاء دونوں کا اپنے اپنے محل پر صحیح ہونا اور اس کا بہترین مصرف یعنی یہ کہ ایسے لوگوں پر خرچ کیا جائے جو اللہ کے دین کی خدمت اور اس کے پیغام کی نشر و اشاعت میں اس درجہ مشغول ہوگئے ہوں کہ اپنی معاشی جدوجہد کے لئے کوئی وقت نہ نکال پائیں۔ الغرض انفاق فی سبیل اللہ سے متعلق جملہ امور پر روشنی ڈالنے کے بعد وہ جامع آیت ٹیپ کے بند کے طور پر آتی ہے جو آغاز میں تلاوت کی گئی تھی جس میں انفاق فی سبیل اللہ کے دوام پر بھی زور دیا گیا۔ یعنی یہ کہ یہ انفاق رات دن کرتے رہنا چاہئیے۔ اخفاء و اظہار دونوں کی پسندیدگی کا اعلان بھی فرما دیا گیا۔ یعنی یہ کہ سِرًّا ہو یا علانیۃً دونوں بارگاہ خداوندی میں مقبول ہیں۔ اس کی اخروی جزاء کے قطعی اور یقینی ہونے کا بھی اطمینان دلا دیا۔ یعنی یہ کہ اس کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ امید بھی دلا دی کہ اس کے ذریعے انسان وہ مقام حاصل کرسکتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں اسے نہ کوئی خوف رہے نہ حزن بلکہ سکون ہی سکون ہو اور چین ہی چین۔ گویا کہ یہ اشارہ کردیا گیا کہ اس انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے انسان مرتبۂ ولایت حاصل کرسکتا ہے اس لئے کہ یہ شان صرف اولیاء اللہ ہی کی ہے کہ "اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ"۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

کے بوجھ سے نجات دلانا بھی شامل ہے اور دوسرے دین کی تبلیغ و اشاعت اور اللہ کلمے کی دنیا میں سربلندی اور دین حق کے غلبہ و اظہار کی جدوجہد میں مال کھپانا۔ جو گویا جہاد فی سبیل اللہ کا اہم جزو ہے۔

پہلی مد میں مال کے صرف کرنے کو قرآن کہیں تو محض اعطار کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے کہیں ایتاء مال سے۔ لیکن اس کے لئے اصل اصطلاحیں صدقہ اور زکوٰۃ ہیں صدقہ اس اعتبار سے کہ یہ انسان کے سچے معنی میں شریف، نیک اور صاحب مروت ہونے اور اس کے سچائی کے ساتھ اللہ تعالےٰ اور اس کے وعدۂ جزاء اور وعید سزا پر یقین رکھنے کی علامت اور دلیل ہے اور زکوٰۃ اس اعتبار سے کہ یہی انسان کے تزکیہ نفس کا سب سے موثر طریقہ اور دل کو دنیا کی محبت کی نجاست سے پاک کرنے کا سب سے کارگر ذریعہ ہے۔

دوسری مد میں مال خرچ کرنے کو قرآن بالعموم 'جہاد بالمال' سے تعبیر کرتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں جہاد کا حکم اکثر و بیشتر ان الفاظ میں وارد ہوا ہے کہ " وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ "۔ یعنی جہاد کرو اللہ کی راہ میں اور کھپا اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی، اسی کو بہت سے مقامات پر اللہ کے ذمہ قرض حسنہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور جا بجا سوالیہ انداز میں ترغیب دلائی گئی ہے کہ " مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا "، کون ہے وہ جو اللہ کو قرض حسنہ دے؟ یہ اسلوب اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ واقعتاً انسان کو مال بہت محبوب ہے اور اس کا صرف اس پر فطرتاً گراں گزرتا ہے۔ غالب نے اسی انداز میں کہا ہے ؎

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد!

لیکن اس مد کے لئے قرآن کی سب سے کثیر الاستعمال اور جامع ترین اصطلاح، 'انفاق فی سبیل اللہ' ہے جو جہاد فی سبیل اللہ کا ایک اہم شعبہ اور ضروری جزو ہے۔

الحمدللہ کہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی دو اہم تصانیف جنکا شدت سے انتظار تھا طبع ہو گئی ہیں!

(۱)

اسلامی ریاست

مشتمل بر

- چند بنیادی مباحث
- شہریت کے حقوق و فرائض
- غیر مسلموں کے حقوق
- اطاعت کے شرائط اور حدود
- کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

۱۸ × ۸/۲۲ کے ۳۷۶ صفحات اعلیٰ سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت

مجلد مع ڈسٹ کور: قیمت -/۲۰

(۲)

پاکستانی عورت

دوراہے پر

صفحات ۱۸۴ : قیمت -/۱۰

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن - لاہور (فون: ۳۵۲۶۱۱)

ہر مسلمان پر

حسب صلاحیت و استعداد

قرآن مجید

کے مندرجہ ذیل پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں

(۱) — ایمان و تعظیم — یہ کہ اُسے مانے

(۲) — تلاوت و ترتیل — یہ کہ اُسے پڑھے

(۳) — تذکّر و تدبّر — یہ کہ اُسے سمجھے

(۴) — حکم و اقامت — یہ کہ اُس پر عمل کرے

(۵) — تبلیغ و تبیین — یہ کہ اُسے دوسروں تک پہنچائے

ان حقوق سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنے کے لیے

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی شہرۂ آفاق تالیف

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"

کا مطالعہ اِن شاء اللہ العزیز بے حد مفید ہوگا

پیش کرے ۔ علامہ اقبال کے بقول ؎

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے ۔ کہ ہر شہری امن وسکون اور اطمینان ہے ۔ اپنے لئے، اپنی آئندہ نسل کے لئے چین اور اطمینان کی خواہش کرنا فطری حق ہے ۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حقیقی امن وسکون اور اطمینان اور ہی چیز سے حاصل ہوتا ہے ۔ حقیقی اطمینان وسکون صرف انہیں ہے جو دولت ایمان سے مالا مال ہوتے ہیں ۔ بمصداق الفاظ قرآنی :

أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ

یہ امن اور سکون کا حقیقی نسخہ ہے لیکن عام انسانی سطح پر امن سکون کی جاتی ہے اس کے فقدان کے بارے میں تشویش بھی ایک بالکل فطری ہم امن وسکون کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اس کا محرک یہ حقیقت ہوتی ہے ن اسلام کے لئے وجود میں آیا اس لئے اس کی بقا اور استحکام بھی اسلام ہے ۔ اور اب تک کے حالات نے ثابت کیا ہے کہ کسی خدائی سکیم کے یہ ملک اب تک اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب ہوا ہے ۔ اس ب کبھی مایوسی کے آثار پیدا ہوتے ہیں ۔ تو پھر ایک پاکستانی مسلمان کر رہ جاتا ہے

اسکی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس ملک سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں امید کا ایک ٹمٹاتا چراغ ابھی تک روشن ہے اگرچہ بار بار وہ مراحل آئے دیسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھانے محسوس ہوئے ۔ لیکن پھر ایسا ہوا لے کا خاص فضل ہوا اور ملی سفینہ گرداب میں آکر بھی نکلتا رہا جس سے ت کا اظہار ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی خاص مشیت کے تحت اس ملک کا مقدر وابستہ ہو چکا ہے ۔

ہم تسلیم کر چکے ہیں کہ اس ملک کا وجود اسلام کا مرہون منت ہے اور

اسلام اور پاکستان

خطرے اور خدشے، اور کرنے کے اصل کام

اسرار احمد

"میثاق" کی گذشتہ اشاعت میں بھی راقم الحروف کی ایک تقریر بعنوان "اسلامی نظام معیشت" شائع ہوئی تھی جو راقم نے اولاً چھٹی سالانہ قرآن کانفرنس منعقدہ کراچی (مارچ ۱۹۷۹ء) میں کی تھی۔ اسے ٹیپ سے اتار کر ایک رفیق نے خود ہی اپنے فہم و ذوق کے مطابق کچھ نوک پلک سنوار کر میری نظرثانی کے بغیر شائع کر دیا تھا اس لئے کہ میں اس کی طباعت و اشاعت کے وقت ملک سے باہر تھا۔ اس کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں میں نے ایک مفصل تقریر "اسلام اور پاکستان" کے موضوع پر بھی کی تھی جو ان ہی مراحل سے گذر کر میری واپسی پر کتابت شدہ صورت میں میرے سامنے آئی۔ اس میں اجمال و اختصار بھی کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے اور بعض مقامات پر ربطِ کلام بھی کچھ ٹوٹا سا محسوس ہوتا ہے۔ تاہم بعض مفید باتیں ایک تسلسل کے ساتھ آ گئی ہیں۔ اور اسے از سرِ نو دوبارہ لکھنے پر طبیعت بھی آمادہ نہیں۔ لہٰذا سرِ دست اسی صورت میں ہدیہ قارئین ہے۔ اسرار احمد

ملکی معاملات پر گفتگو کرنا اور ملکی استحکام کے بارے میں سوچنا ہر شہری کا فرض ہے۔ ہر شہری کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ ملکی سالمیت کے تحفظ، ملک و ملت کی عزت اور اس کے وقار کے بارے میں غور و فکر کرے اور اگر اپنے ملک کو درپیش کسی خطرے اور خدشے کا اسے احساس ہو تو اس سلسلے میں بھی جو کچھ وہ کر سکتا ہے کرے۔ اگر وہ ملک و ملت کو خطرات کے گرداب سے نکالنے کا کوئی فارمولا رکھتا ہے تو ابنائے وطن

استحکام تو بہت دُور کی بات ہے اس کا وجود بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ ہمارے اس دعوے سے ہر عقل سلیم رکھنے والا شخص اتفاق کرے گا کہ اس کے وجود کے لئے کوئی ایسی ٹھوس بنیاد موجود نہیں جو آج کے دور میں کسی ملک کے وجود کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہے دین اور مذہب ہی ایسی چیز ہے جو اس ملک کے وجود کا جواز فراہم کرتی ہے لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ یہی جنس اپنے حقیقی تقاضوں کے ساتھ یہاں مفقود ہے۔ اس سلسلے میں ممکن ہے کوئی غلط فہمی پیدا ہو اس لئے ہم اپنے اس موقف کی مزید وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔

جہاں تک اس ملک کے اسلام کے نام پر قائم ہونے کا سوال ہے دنیا میں شاید ہی کوئی شخص انشراح صدر کے ساتھ اس کا انکار کر سکے تحریک پاکستان میں لوگوں کی طرف سے جوش، جذبے اور ایک علیحدہ ملک کے مقام کے لئے قربانی اور ایثار کا مظاہرہ صرف اس لئے ہوا کہ وہ اسلام کی ایک تجربہ گاہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہیں "پاکستان کا مطلب کیا! لا الٰہ الا اللہ" کے نعرے نے جمع کیا۔

دراصل مسلمان کا خمیر جس مٹی سے اُٹھا ہے اس میں کسی ارضی تعلق کو کوئی تقدس حاصل نہیں۔ مسلمانوں کا تو نعرہ ہی یہ رہا ہے ؎

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا تصور ایک عالمی وحدت اور اُمت کا ہے لیکن یہ تکلیف دہ حقیقت ہے کہ آج پوری دنیا میں ایسی متحدہ اُمت موجود نہیں بلکہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور گروپوں میں بٹی ہوئی ہے۔ علامہ اقبالؒ کو بھی جو مسلم اُمت کی وحدت ملی کے سب سے بڑے نقیب تھے یہ ماننا پڑا کہ اس وقت دُنیا میں ایک اُمتِ مسلمہ عملاً موجود نہیں بلکہ مسلمان اقوام پائی جاتی ہیں۔

تاہم برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں کا نقطۂ نظر ہمیشہ آفاقی رہا۔ تحریک خلافت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ایسی عظیم تحریک جس میں ہندو بھی شامل ہونے پر مجبور ہو گئے۔ گاندھی کی اس تحریک میں شمولیت گو اپنے مفاسد کے لئے تھی لیکن اس سے تحریک کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس تحریک سے برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنی افتاد کا پتہ چلتا ہے۔

یہ کسی نہ کسی وقت اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارا بنے گا اس لئے اگر اس پہلو سے ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچا جائے اور غور و فکر کیا جائے تو ہمارے نزدیک یہ ایک عبادت ہے۔ کیونکہ یہ صرف ملک اور قوم کا مسئلہ نہیں بلکہ دین کا مسئلہ ہے

یہ حقیقت تو اب کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ تنتیس سال گذر جانے کے باوجود بھی یہ ملک مستحکم نہیں ہو سکا بلکہ ایک ایسا وقت بھی ہم پر گذر چکا ہے کہ ملک کا نصف بہتر حصہ ہم سے جدا ہو گیا۔ اور جدائی ایسے افسوسناک طریقے سے عمل میں آئی کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا عصمت دری کے واقعات ہوئے، ایک لاکھ کے قریب مسلمان ہندو کے قیدی بنے اور عذاب خداوندی کا وہ نقشہ رونما ہوا جسے قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ او یلبسکم شیعاً و یذیق بعضکم بأس بعض۔ اس واقعہ سے نہ صرف ہم دو حصوں میں تقسیم ہوئے بلکہ ہماری قومی عزت اور ملکی وقار دونوں تباہ ہوئے۔ اس حادثے کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم سنبھلتے اور اپنی کوتاہیوں کا جائزہ لے کر آئندہ اُن سے بچنے کی تدبیر کرتے لیکن ہوا یہ کہ بچے کھچے ملک کو بھی ہم نے بازیچہ اطفال بنائے رکھا۔

یہ شاید دنیا کا منفرد ملک ہو گا جس کے اہل سیاست نے بار بار اس خدشے کا اظہار کیا کہ یہ اب قائم نہیں رہ سکتا اور کوئی دن جاتا ہے کہ ملک پھر ایک اور تقسیم کا مزہ چکھے گا۔ اس بنا پر لوگوں کے ذہنوں میں ایک سوالیہ نشان ہے کہ اس ملک کا مستقبل کیا ہے۔ ع اور اسے کسی صورت استحکام حاصل ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

جب تک مرض کی صحیح تشخیص نہ ہو ظاہر بات ہے کہ اس کے علاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور اگر مرض کے بارے میں کسی سطحی تشخیص پر اکتفا کر لیا جائے تو علاج بھی یقیناً سطحی قسم کا ہو گا جس سے مرض کے خاتمے اور انسان کی تندرستی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ہمارے خیال میں اب تک ملک کے مسائل کی صحیح تشخیص کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔ علاج تو بہت دور کی بات ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان کے مسائل کا سب سے بڑا سبب ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ جب تک وہ حل نہیں ہو گا ہم مسائل اور مشکلات کی تنگناؤں میں بھٹکتے رہیں گے۔ وہ عقدہ یہ ہے کہ یہ ملک صرف مذہب کے نام پر قائم ہوا اور مذہب کے بغیر اس کا

اور آخرت پر یقین ہی اسلام کی بنیاد ہے اس ایمان اور یقین کے مظاہر نماز، روزہ حج، زکواۃ، حلال و حرام کی قیود کو ملحوظ رکھنا اور دیگر سماجی و تہذیبی احکام ہیں، اس اعتبار سے ہم اپنا جائزہ لیں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہم مذہب اور دین کے معاملے میں کسی قدر بے حس اور اس پر عمل کے سلسلے میں کس قدر غافل ہیں۔ کوشش اور عمل سے دور بھاگنے والے ہیں۔

ہم اس معاشرے کو چار دائروں میں تقسیم کر کے اس کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بڑا دائرہ نظر آتا ہے ہماری قوم کا ۹۰٪ یہی دائرہ ہے۔ جس کا دین اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔

نماز سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کن حقائق کی بنا پر ۹۰٪ مسلمان عوام کو اسلام سے بیگانہ قرار دے دیا گیا۔ اس سلسلے میں اپنی طرف سے کوئی پیمانہ مقرر کرنے کے بجائے سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پاک کو بطور پیمانہ ہم آپ کے سامنے پیش کریں گے ارشاد ہے۔

الفرق بین المسلم والکافر	کافر اور مسلمان کے درمیان فرق
ترك الصلواۃ	کرنے والی چیز نماز پنجگانہ ہے۔

اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ اس ملک میں اس پیمانے پر پورا اُترنے والوں کی تعداد کیا ہے۔ آپ جس طرف بھی نظر دوڑائیں گے آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ہمارے عوام کی عظیم اکثریت نماز پنجگانہ کی پابند نہیں ہے بلکہ اسے پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہیں دیتی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد گرامی ہے۔

من ترك ثلثة صلواۃ	جس شخص نے تین جمعہ بغیر عذر کے
الجمعة بغیر عذر لیختِمَنَّ	ترک کئے اللہ اس کے دل پر مہر
اللہ علی قلبه۔	کر دے گا۔

"ختمِ قلوب" کی یہ بدترین سزا اُن فاسقوں اور فاجروں کو ملتی ہے جن سے ایمان کی طرف آنے کی کوئی توقع باقی نہیں رہتی۔ مایوس العلاج مریضوں کے بارے میں فرمایا گیا۔

ختم اللہ علی قلوبھم وعلی	مہر کر دی ہے اللہ نے ان کے دلوں

ایک اور دلیل جو وطنیت کے خلاف دی جا سکتی ہے اور جس پر ممکن ہے کچھ لوگ ناک بھوں چڑھائیں وہ سنجیدہ غور و خوض کا تقاضہ کرتی ہے خطۂ ارضی کی بنا پر کسی قوم کو تقدس حاصل ہو سکتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ کیا سندھ ایک خطۂ ارضی نہیں؟ بلوچستان ایک خطۂ ارضی نہیں؟ اگر پاکستان کی بنیاد پر ایک قوم وجود میں آ سکتی ہے تو پھر سندھ اور بلوچستان جو صدیوں سے ایک خاص زبان تہذیب و تمدن اور ثقافت کے مراکز چلے آ رہے ہیں کیوں نہ ایک علیحدہ قوم و ملک قرار پائیں؟

یہ ایک ایسا تصور ہے کہ جسے اگر قبول کر لیا جائے تو پھر پاکستان کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ہم یہ مزا چکھ چکے ہیں وہاں ہمارے نوجوانوں کو لسانی و ثقافتی قومیت کا فلسفہ پڑھایا گیا اور آخر دشمنوں نے اپنے مقاصد کو پورا

صرف مذہب

دنیا میں ملکوں کی بقا و استحکام کے جو رائج الوقت عوامل ہیں وہ بیان ہو چکے ہیں۔ جس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صرف مذہب ہی ایک ایسی بنیاد ہے جو ہمارے بقا و استحکام کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اب ذرا اس پس منظر میں جائزہ لیجئے کہ یہاں مذہب اور دین کی حالت کیا ہے۔ جذبات، نعروں اور تحریکوں کی افادیت کا انکار کئے بغیر یہ ایک حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے وقت بھی اور آج تک چلنے والی مختلف تحریکوں میں بھی مذہب نے موثر کردار تو ادا کیا ہے جس کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کسی تحریک میں بھی مذہب، مقصدِ اوّلین اور نصبُ العین نہ تھا۔ ورنہ آخر کیا وجہ ہے کہ مذہب اور دین کے لئے چلائی جانے والی تحریکوں میں وہ افراد بھی قیادت میں شامل ہوں جو کبائر کے مرتکب ہی نہیں عادی ہوں اور جو فرائض کی ادائیگی سے بھی واقف نہ ہوں،

دیکھنا یہ چاہیئے کہ حقیقت کیا ہے صرف سطحی اور سرسری طور پر مطالعہ کرنے سے حقائق تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ گہرائی میں جائیں تو درج ذیل تلخ حقائق کرنا پڑتا ہے۔

(۱) اسلام

اسلام اس حقیقت کا مظہر خارجی ہے جسے ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔ اللہ و رسول، کتب اور فرشتوں پر ایمان

عظمیٰ، گھر، بازار، تجارت، لین دین، بین الاقوامی معاملات اور پھر انفرادی معاملات کا دین سمجھتے ہیں۔ ان کے دلوں میں تمنائیں ہیں - یہ دین کے ہمہ گیر نظام کو دنیا پر غالب کرنا چاہتے ہیں - اُن کے اندر یہ انقلاب برپا کرنے میں بہت سے بزرگوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے لیکن نمایاں ترین نام علامہ اقبال؈ اور مولانا مودودیؒ کے ہیں - یہ طبقہ ذہنی طور پر وسیع النظر تو ہے لیکن دین فہمی اور چیز ہے اور اُسے غالب کرنے کے لئے، جدوجہد کا جذبہ اور چیز - اس طبقے میں اس کی کمی ہے - یہ دنیا میں دین کا غلبہ تو چاہتے ہیں لیکن کسی اور کے ذریعے سے - یہ خود جدوجہد کرنے اور قربانی دینے کے لئے تیار نہیں - یہ اپنی دُنیا میں مگن رہنا چاہتے ہیں - البتہ جو تحریکیں دین کے غلبے کے لئے کام کرنا چاہئیں یہ انہیں چندہ دینے کے لئے تیار ہیں - لیکن اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی انہیں گوارا نہیں مرغن کھانے کے بعد محض حدیثِ مائدہ کے طور پر دین کا مرثیہ پڑھیں گے اور غم و غصہ کا اظہار کریں گے کہ یوں نہیں ہو رہا اور ووں نہیں ہو رہا - مگر اُن کی تمام تر صلاحیتیں، تمام اوقات صرف دنیا اور اس کے اموال و اسباب اور لذّتوں اور آسائشوں کے حصول کے لئے وقف ہیں -

مذہبی قیادت چوتھا دائرہ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو مذہب کے انقلابی جذبے سے سرشار ہیں وہ مختلف جماعتوں اور گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں اور قابلِ قدر کام کر رہے ہیں لیکن افسوس کہ وہ معاشرے میں مؤثر کردار کے حامل نہیں - ان میں سے جو سیاست میں آگئے ہیں وہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں یہ ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکتے اِلّا آنکہ کبھی کوئی منفی مقصد انہیں ایک جگہ جمع کر دے -

ایمان کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ جہاں تک نیّت کا تعلق ہے کوئی شخص کسی کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا - لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یقین کی دولت سے سرشار ایمان کا کردار پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے قانونی سطح پر اپنے آپ کو منوا لینا اور بات ہے اور اپنے کردار سے اس کا ثبوت پیش کرنا چیزے دِگر - ایمان اگر صرف موروثی عقیدہ نہیں بلکہ شعور و ادراک کے ساتھ کچھ ذمہ داریوں کو قبول کرنے کا نام ہے - تو پھر اس کا

سمعهم وعلی ابصارهم غشاوة ولهم عذاب الیم ؎ — اور کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردے پڑ چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے دردناک عذاب ہے

اگر پیمانہ یہی ہے تو پھر نتیجہ بھی وہی ہے جو ہم نے نکالا ہے کہ اس قوم آبادی اسلام سے یکسر بیگانہ ہے۔

متوسط طبقہ دوسرے دائرے میں ہمارا متوسط طبقہ آتا ہے۔ میں خاصی بڑی تعداد کاروباری حضرات کی ہے جن مذ کے ساتھ روایتی لگاؤ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انہی کے دم سے مسجدیں اور دارالعلوم چل رہے ہیں۔ لیکن ان کا تصورِ مذہب بھی بس چند رسومات تک محدود ہے۔ شادی، بیاہ، تجارت اور لین دین غرض یہ کہ معاشی، مع ہر معاملے میں اپنی مرضی کرنا ہے، زمانے کی روش کے ساتھ چلنا ہے البتہ نہ کر لینا ہے اور بس نماز روزے۔ حج کے محسوس نتائج ان کی زندگیوں میں نظر نہیں آتے۔ مثلاً ایک شخص حاجی ہے لیکن اوّل درجے کا بلیک مارکٹر مشہ ایک شخص نماز پڑھتا ہے لیکن سنگدلی میں اپنی مثال آپ ہے

حاجی بلیکیا میں جن دنوں میں پریکٹس کیا کرتا تھا وہاں صاحب تھے جو حاجی بلیکیا کے نام سے مشہور تھے اسی طرح ایک صاحب کو "حاجی رشوت" کہا جاتا تھا۔ یہ "حاجی رشوت" صاحب محکمہ انکم ٹ اینڈ ایکسائز میں ملازم تھے۔ لمبی سی داڑھی، پانچ وقت کے نمازی لیکن رشوت لیتے اور اسی رشوت سے مسجدوں کو چندے بھی دیتے تھے اور ناجائز دباؤ کے ذ اور کام بھی چلاتے تھے۔ اپنی سوسائٹی میں وہ "حاجی رشوت" کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے ہمارے خیال میں نوجوانوں کی مذہب سے بغاوت کے اسباب سے ایک اہم سبب ایسے لوگ بھی ہیں۔ کیونکہ جب مذہب ان کے حوالے سے جائے گا جن کا مکروہ کردار سب کے سامنے ہے تو پھر مذہب کے خلاف بغاوت جراثیم کیوں نہیں پیدا ہوں گے۔

تیسرا طبقہ یہ ذرا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو تیسرے دائرے میں ہے ان کا تصورِ مذہب خاصہ وسیع ہے یہ ذہن کو پارلیمنٹ، عا

ٹیکنالوجی تو وہ اس قدر متاثر نہیں ہوتے لیکن جو "انسانی علوم"، فلسفہ، تاریخ، نفسیات، لٹریچر، اخلاقیات وغیرہ پڑھتے ہیں انہیں کفر سے بچاؤ آسان نہیں۔ کوئی فرائڈ کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہے۔ کسی کو ہیگل کے فلسفے سے عشق ہے وغیرہ وغیرہ۔ پھر ان لوگوں نے ہی ملکی قیادت سنبھالنی ہوتی ہے۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کردہ اس ملک میں اسلام کا عقیدہ و عمل مطلوبہ صورت میں موجود ہے۔ موروثی اور خاندانی روایات کا نام اسلام ہو تو اور بات ہے ورنہ یہاں کا پورا نظام حیات جس انداز میں قائم ہے اس میں حقیقی مذہب کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ ایک طرف یہ حقیقت کہ پاکستان کے بقا اور استحکام کا دار و مدار اسلام پر ہے اور دوسری طرف مذہب سے ہمارا تعلق بس اس قدر کہ یہ کہنا ہرگز غلط نہیں ہے کہ ؎ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔ جب تک اس صورت حال کو تبدیل نہیں کیا جائے گا ملک کا مستقبل مخدوش ہی رہے گا۔

لیکن تصویر کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ مسلمان چودہ سو سال میں دو مرتبہ عروج کی طرف جا کر پستیوں میں گرے ہیں۔ ہمارا پہلا عروج عربوں کی قیادت میں تھا۔ پھر زوال آیا۔ نوے برس کے لگ بھگ یروشلم پر عیسائیوں کا قبضہ، صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کا قتل عام، اور پھر فتنۂ تاتار کی تباہ کاریاں۔ یہ سب ہمارے زوال کی آخری حد تھی۔ خلافت عباسیہ ختم ہو گئی اور عالم اسلام کا نقشہ وہ بنا جسے قرآن مجید نے عزیر علیہ السلام الفاظ میں بیان کیا ہے۔ بیت المقدس کو دیکھ کر عزیر علیہ السلام نے فرمایا: اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا عالم اسلام بدترین انتشار کی زد میں تھا طوائف الملوکی اور لامرکزیت کا دور دورہ تھا لیکن پھر ہمارے اقتدار کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے ؎

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

عثمانیوں کے دور میں مسلمان فرانس تک پہنچے ہیں تو ترکوں نے اٹلی کے دروازے پر دستک دی ہے۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ اور تجدید علوم کی جو تحریک چلی وہ

عملی مظاہرہ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہاں خدا، رسول اور آخرت کو زبانی طور پر نام ہی ایمان ہے۔

میرے خیال میں کسی ملک اور معاشرے میں وہ طبقہ ہی لائق اعتنا جسے "ذہین اقلیت" (INTELLECTUAL MINORITY) کہئے

چونکہ اس طبقہ کے ہاتھ میں ملک اور معاشرے کی زمام کار ہوتی ہے اس ایمان مؤثر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ معاشرے کا انجن ہوتے ہیں

ہمارے یہاں جو نظام تعلیم ہے اس کے نتیجے میں دینی مدارس سے تو یہ ط گو کہ دینی مدارس کی یہاں ایک بڑی تعداد موجود ہے اور ایمان و یقی سے زیادہ شہادت انہی اداروں سے ملنی چاہیئے۔

جملہ معترضہ لیکن اگر اسے گستاخی نہ سمجھا جائے تو میں کہونگا سبھی معاملہ کالجوں، یونیورسٹیوں سے چنداں مختلف یقین کی شمعیں شاذ ہی کہیں روشن رہ گئی ہیں پیسے کی جو اہمیت کسی طبقے میں ہے وہ یہاں بھی ہے۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں کا جو رسہ کشی ہوتی ہے وہ یہاں بھی موجود ہے۔ اس کے باوجود ان کی ا ہے اگر یہ دارالعلوم، یہ دینی ادارے موجود نہ ہوں تو یہاں دین کی جو روشنی ہے وہ بالکل ہی ختم ہو کر رہ جائے۔

بہر حال جہاں تک کالجوں یونیورسٹیوں کا تعلق ہے تو یہ معاملہ ہے

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدائے لا الٰہ الا اللہ

یہاں جس قسم کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے اس کے بارے امین احسن اصلاحی کا یہ تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے کہ:۔

"اس نظام تعلیم سے گذرنے کے بعد بھی اگر کسی کے دل کچھ ایمان اور دین کے ساتھ تعلق باقی رہ جائے تو ایسا شخص یا پیدائشی ولی ہے یا پھر بالکل غبی ہے"

ہمارے ان تعلیمی اداروں میں جو لوگ سائنس، (فزکس، کمسٹری) پڑھتے

اُسے ٹھکرا دیا ورنہ مشترکہ دفاع کی صورت میں بالادستی ۶۰ کروڑ کے ملک بھارت ہی کو ہوتی ۔

پھر ۱۹۶۵ء میں جو کچھ ہوا اُسے ذہن میں رکھیئے کہ سوائے معجزہ کے کیا چیز تھی جس نے ہمیں سرخرو کیا ۔ سیکولرزم کے اس دور میں پاکستان میں ایک طبقے کو خاص مذہب کے نام پر اقلیت قرار دینا بھی اس سلسلے کی کڑی ہے اور وہ بھی اس حکومت کے ہاتھوں جو سیکولر ذہن کی مالک تھی ۔

ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خدائی پروگرام ہے جو ملک کو باقی رکھنے کے حق میں ہے ۔ ہم اس سلسلے میں جو کردار ادا کر سکتے ہیں وہ ہمارا فرض ہے ۔ یہاں ایک ہمہ جہتی احیائی عمل کی ضرورت ہے ۔ جو روحانی ، سماجی ، علمی ، فکری اور سیاسی غرضیکہ ہر سطح پر انقلابی خصوصیات کا حامل ہو ۔

پہلا مرحلہ اس سلسلے کا سب سے پہلا مرحلہ تجدید ایمان کا ہے وہ ایمان و یقین جو مطلوب حقیقی ہے اگر ہمارے دلوں میں ہوتا تو ہماری حالت یہ نہ ہوتی ۔ ہماری بہترین صلاحیتیں تجدید ایمان کی تحریک برپا کرنے پر صرف ہونی چاہئیں ۔ اس ایمان کا سرچشمہ قرآن مجید ہے ۔ اس کے ذریعے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین پیدا کیا تھا ۔

دوسرا مرحلہ دوسرے مرحلہ پر توبہ کی منادی ہو ۔

یایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ النصوحا (سورۃ تحریم)	اے اہل ایمان ! اللہ کی جناب میں توبہ کرو جو بالکل خالص اور بے لوث ہو !

ایسی توبہ جس سے ہم حلال و حرام کی تمیز سیکھیں اور اسے اختیار کریں اس کے لئے کچھ نقصان برداشت کرنا پڑے تو کریں ، دنیوی آسائشوں سے دستکش ہونا پڑے تو ہوں پھر یہ منزل حاصل ہوگی ۔

تیسرا مرحلہ تیسرے مرحلے میں ہماری صلاحیتیں خواہ مخواہ کی مخالفت یا توڑ پھوڑ سے ہٹ کر اور دوسرے تمام مطالبات سے قطع نظر صرف ایک مطالبے پر صرف ہونی چاہئیں اور وہ اسلام نظام کے مکمل نفاذ کا مطالبہ

مسلمانوں کی رہین منت ہے

پھر جو دورِ زوال شروع ہوا ہے تو مغربی استعمار نے انڈونیشیا، ملائشیا، ہندوستان سب کو چھین لیا، مسلمانوں کی وحدتِ ملی پارہ پارہ ہوگئی۔ عربوں کو تقسیم کیا گیا اور مولانا حالی پکار اُٹھے ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقت دُعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے

اور ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اس کے بعد ملاحظہ فرمائیے تاریخ کا ایک رُخ روشن۔ ایک ہمہ جہتی احیائی عمل شروع ہوتا ہے۔ مختلف تحریکیں اُٹھیں اور مختلف مسلم ممالک میں اُبھریں۔ سب سے پہلے مغرب سے براہ راست غلامی کا خاتمہ ہوا۔ جہاں جہاں مغرب کا تسلط تھا ختم ہوا اور آزادی مل گئی۔ آزادی کی ان تحریکوں کے ضمن میں ایک حقیقت بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ کسی دوسرے مسلمان ملک کی آزادی کی تحریک میں مذہب نے فیصلہ کن کردار ادا نہیں کیا سوائے برصغیر کی تحریک آزادی میں کہ مذہب کے نام پر علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ پھر یہ کہ اس خطۂ ارضی کے قیام میں جو فکر کارفرما ہے وہ بھی اسلامی فکر ہے جس کے داعی علامہ اقبال تھے بلکہ یہاں فکر ولی اللہ کارفرما ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اس ملک کا قیام بھی ایک معجزہ تھا اور اب تک اس کا قائم رہنا بھی ایک معجزہ ہے ورنہ مسلم لیگ تو کیبنٹ مشن پلان کو تسلیم کر چکی تھی اس کے بعد بھی ایک اور موقع آیا جب ہماری قیادت نے آزاد پاکستان سے ایک طرح کی دستبرداری اختیار کر لی تھی جب ایوب خان نے ہندوستان کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کی۔ وہ تو ہندو کی مت ماری گئی۔ اور پنڈت نہرو نے

ہجرت اور سنہ ہجری کا آغاز[1]

مولانا ابوالکلام آزاد

سنہ ہجری کی ابتدا اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے زیادہ مشہور یہودی رومی اور ایرانی سنین تھے۔ عرب جاہلیۃ کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب وکتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی۔ اوقات و مواسم کی حفاظت اور یادداشت کیلئے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اس سے وقت کا حساب لگا لیتے۔ منجملہ سنین جاہلیۃ کے "عام الفیل" تھا۔ یعنی شاہ حبش کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال۔ عرصے تک یہی واقعہ عرب کے حساب وکتاب میں بطور سنہ کے مستعمل رہا۔ ظہورِ اسلام کے بعد اہمیت خود عہدِ اسلام کے واقعات نے لے لی۔ صحابہ کرامؓ کا قاعدہ تھا کہ عہدِ اسلام کے واقعات میں سے کوئی ایک اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگاتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہی سورہ حج کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت دی گئی تھی۔ اذن للذین یقاتلون بانہم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔ (حج: ۴۰) اس لئے کچھ دنوں تک یہی واقعہ بطور ایک سنہ کے مستعمل رہا۔ لوگ اسے "سنہِ اذن" سے تعبیر کرتے اور یہ تعبیر وقت کے ایک خاص عدد کی طرح یادداشت میں کام دیتی۔ اسی طرح سورۂ براۃ کے نزول کے بعد بول چال میں "سنہ براۃ" کا بھی رواج رہا۔ عہدِ نبویؐ کا آخری سنہ "سنۃ الوداع" تھا۔ یعنی آنحضرت (صلعم) کے آخری حج کا واقعہ جو "حجۃ الوداع" کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ اور ہجرت کے دسویں سال پیش آیا تھا۔ بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتا چلتا ہے۔ مثلاً سنۃ التمحیص، سنۃ الزفۃ، سنۃ الزلزال، سنۃ الاستیناس۔ بیرونی نے آثار الباقیہ میں اس طرح کے دس سنوں کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] ماخوذ از "رسول رحمت" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر۔

ہے۔ حکومت کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ اسلامی نظام کا مکمل نفاذ کرے۔

جو لوگ ہمارے اس تجزیئے سے متفق ہوں انہیں سوچنا چاہیئے کہ وہ کیا کر سکتے ہیں وہ خود آگے بڑھیں اور اس راہ کو اختیار کریں جو تجدید ایمان توبہ اور رجوع الی القرآن کی راہ ہے کیونکہ اس سے ہی پاکستان کی بقا اور استحکام کی ضمانت مل سکتی ہے۔ قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم سے ہی یہ معاملہ چل سکتا ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں حقیر سی کوششوں کا آغاز کر دیا ہے انجمن خدام القرآن کا مقصد قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم اور تنظیم اسلامی تجدید ایمان اور توبہ کے مقاصد کے تحت کام کر رہی ہے۔ جو لوگ اس نظم میں منسلک ہونا چاہئیں تو بسم اللہ ورنہ کوئی ضروری نہیں کہ ایک ہی جماعت ہو جو کام کی رہنمائی کرے۔ اس کے لئے مختلف جماعتیں مختلف گروہ ہو سکتے ہیں

ضرورت اس امر کی ہے کہ اب پوری قوم اور خاص طور پر ذہین طبقے کی توجہ اس ایک مقصد کی طرف مبذول ہونی چاہیئے اور وہ ہے ملک کے استحکام اور بقا کا مقصد جو بغیر تجدید ایمان، توبہ اور قرآن مجید کی تعلیم و تفہیم کے ممکن نہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ۝

(بقیہ سنہ ہجری از صد ۴۹)

السفلی و کلمۃ اللہ ھی العلیا و اللہ عزیز حکیم (توبہ : ۴۰) ۔ وطمانیت اُس پر اُتار دی اور فتح و نصرت کے ایسے لشکروں سے اسکی مدد کی جنہیں دنیا کی ظاہر بیں اور حقیقت نا آشنا آنکھیں نہیں دیکھ سکتی تھیں نتیجہ یہ نکلا کہ ان سرکشوں کی بات جو انکار کرتے تھے ہمیشہ کے لئے پست ہو گئی اور کلمۂ حق کی سربلندی اور کامیابی حاصل ہوئی۔

یہ آیت سورہ برأۃ کی ہے۔ سورہ برأۃ بالاتفاق اُس وقت نازل ہوئی جب اسلام کی ظاہری فتح مندیاں تکمیل تک پہنچ چکی تھیں اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی تمام فتح مندیوں کے ظہور کے بعد اسکی ضرورت باقی تھی کہ واقعہ ہجرت کی معنوی فتح مندی یاد دلائی جائے۔

کیا گیا ہے ۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے ایک عامل آیا تھا۔ اس نے کہا لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے اس طرح کہ فلاں بات فلاں سنہ میں اور سنہ کے فلاں مہینے میں ہوئی اس پر حضرت عمرؓ اور لوگوں کو اس معاملے کا خیال ہوا ۔ پہلے انہوں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت (صلعم) کے مبعوث ہونے کے وقت سے سنہ کا حساب شروع کر دیں ۔ پھر خیال ہوا کہ آپ کی وفات سے شروع کیا جائے لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ہجرت سے سنہ کا تقرر ہو ۔

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کی روایت سے ہوتی ہے ۔ جو محب طبری نے نقل کی ہے ۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ :۔

ان ابا موسیٰ الاشعری کتب	ابو موسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ
الی عمر انہ تاتینا منک	کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے
کتب لیس لہا تاریخ وقد	نام خطوط آتے ہیں ۔ مگر ان پر کوئی
کان عمر دون الدواوین	تاریخ نہیں ہوتی اور یہ وقت وہ
و وضع الاخرجۃ واحتاج	تھا کہ حضرت عمرؓ نے حکومت کے
الی تاریخ ولم یحب	مختلف دفاتر قائم کر دیئے تھے
التاریخات القدیمۃ	اور خراج کے قواعد اصول طے
فجمع علیہ عند ذالک	پا گئے تھے اور اس سے محسوس کر
واستشار الناس فاتفقوا	رہے تھے کہ ضبط اوقات کے لئے
علی ان یکون المبداء من	ایک خاص تاریخ قرار پا جائے ۔ پرانی
الہجرۃ (ریاض النضرۃ)	تاریخیں موجود تھیں ۔ لیکن وہ

پسند نہیں کرتے تھے کہ انہیں اختیار کریں ۔ ابو موسیٰ اشعریؓ نے لکھا تو انہیں زیادہ توجہ ہوگئی ۔ صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا ۔ مشورہ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرت کا واقعہ بنیاد ٹھہرا کر سنہ ہجری اختیار کیا جائے ۔

حضرت علیؓ کی رائے

ابو ہلال عسکری نے "الاوائل" میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب سے نقل کیا ہے

آنحضرت (صلعم) کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک یہی حالت جاری رہی لیکن
ـرت عمرؓ کی خلافت کا عہد شروع ہوا تو ممالک مفتوحہ کی وسعت اور دفاتر حکومت
قیام سے حساب وکتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہوئے اور ضرورت پیش آئی کہ
ـاری طور پر کوئی ایک سنہ قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اس معاملے پر غور کیا گیا۔ اور
ـنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک واقعۂ ہجرت پر سولہ برس گزر
ـچکے تھے۔

ـاسی ضرورت اور مشورہ سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا تو کیوں حضرت عمرؓ اور تمام صحابہ کا ذہن اس طرف گیا کہ
ـلامی سنہ کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کی جائے۔ یہ تاریخ اسلام کا ایک ضروری اور نتیجہ
ـمبحث تھا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نظر و فکر سے محروم رہا۔

اس بارے میں متعدد روایتیں منقول ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن
ـران کی ہے۔ جسے تمام مورخین نے نقل کیا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ
ـک کاغذ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں شعبان کا مہینہ درج تھا۔ حضرت
ـنے کہا۔ شعبان سے مقصود کون سا شعبان ہے۔ اس برس کا یا آئندہ برس کا؟
ـر آپ نے سربرآوردہ صحابہؓ کو جمع کیا۔ اور ان سے کہا اب حکومت کے مالی وسائل
ـت زیادہ وسیع ہو گئے ہیں۔ اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں
ـم نہیں ہو جاتا لہٰذا ضروری ہے کہ حساب کتاب کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار
ـیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں۔ اس پر لوگوں نے کہا کہ ایرانیوں
ـے مشورہ کرنا چاہیئے ان کے یہاں اس کے طریقے کیا تھے؟ چنانچہ حضرت عمرؓ نے
ـرزان کو بلایا۔ اس نے کہا: ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے جسے ماہ روز کہتے
ـں۔ اسی ماہ روز کو عربی میں مو۔ـتہ بنا لیا گیا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ اسلامی حکومت
ـتاریخ کے لئے جو سنہ اختیار کیا جائے۔ اس کی ابتدا کب سے ہو؟ سب نے
ـاق کیا کہ ہجرت کے برس سے کی جائے۔ چنانچہ ہجری سنہ قرار پایا۔

ـسری روایت ابن حبان نے قرہ بن خالد سے ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے اس میں ایک دوسرے واقعے کا ذکر

مشورہ کرنے کا ذکر ہے - یہ خوزستان کا بادشاہ تھا اور مسلمان ہو کر مدینہ میں مقیم ہو گیا تھا - حضرت عمرؓ کی مجالس شوریٰ میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے - بیرونی لکھتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے نہ صرف ایرانیوں کا طریقہ ہی بتلایا بلکہ رومیوں کے طریقے کی بھی تشریح کی - ایرانیوں کے یہاں کا آخری سنہ یزدگرد کا سنہ تھا اور رومیوں کا مشہور سنہ سکندر کی پیدائش سے شروع ہوتا تھا - بعض اصحاب کو خیال ہوا انہی دونوں میں سے کوئی سنہ اختیار کر لیا جاتے لیکن حضرت عمرؓ اور دیگر لوگ اس سے متفق نہ ہوئے اس سے معلوم ہو کہ ایرانیوں اور رومیوں کے سنین مجمع صحابہؓ میں زیر بحث رہے اور بعض نے اسے اختیار کرنے کی رلئے بھی دی لیکن عام رجحان اس طرف تھا کہ نیا سنہ مقرر کرنا چاہیئے۔

اجنبی سنے سے اجتناب کیوں؟

اس حقیقت پر بھی نظر رہے کہ سنہ کی ضرورت اور استعمال کی بڑی جگہ حساب وکتاب کے دفاتر تھے اور حضرت عمرؓ نے باتفاق صحابہؓ، دفاتر کے لئے وہی زبانیں اختیار کر لی تھیں جو پیشتر سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں - ایران کے لئے فارسی شام کے لئے سریانی اور مصر کے لئے قبطی تھی ظاہر ہے کہ دفاتر کے لئے ایران و شام کی زبانیں اختیار کر لی گئیں تھیں تو قدرتی طور پر سنہ بھی وہی اختیار کر لینا تھا جو ان زبانوں کے حساب وکتاب میں رائج تھا اور اس کے قواعد بندھے چلے آتے تھے لیکن حضرت عمرؓ اور صحابہؓ نے ایسا نہیں کیا - ایران اور روم و مصر کی زبانیں اختیار کر لیں مگر سنہ اپنا قائم کرنا چاہا - غور کرنا چاہیئے - اس اجتناب کی علّت کیا تھی؟

کشادہ دلی کی روشن مثالیں

یہ علّت تو قطعاً نہیں ہو سکتی کہ صحابہ کرامؓ محض قومی تعصب اور تنگ دلی کی بنا پر دوسری قوموں کی اچھی اور کارآمد باتوں سے بھی اجتناب کرتے تھے۔ اوّلاً اس بارے میں خود اسلامی احکام کا یہ حال ہے کہ رکاوٹ کی جگہ صریح ترغیب دی گئی ہے - ثانیاً اس عہد کے بے شمار واقعات موجود ہیں - جن سے ثابت ہوتا ہے - کہ اس قسم کے تعصبات کو اس وقت کے مسلمانوں کی ذہنیت میں کوئی جگہ نہیں ملی تھی وہ دنیا کے تمام علمی و تمدنی ذخیرے کو خواہ کسی قوم اور ملک سے

کہ واقعۂ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دی تھی وہ کہتے ہیں کہ :-

جمع عمر الناس فسألهم	حضرت عمرؓ نے صحابہؓ سے مشورہ
من اي يوم يكتب التاريخ؟	کیا کہ کس دن سے تاریخ کا حساب
فقال علي ابن ابي طالب من	شروع کیا جائے ؟ تو حضرت علیؓ نے
يوم هاجر رسول الله و	فرمایا اُس دن سے جن دن آنحضرتؐ
ترك مكة ففعله عمرؓ	نے ہجرت کی اور مکہ سے مدینہ آئے ۔
(کتاب الاوائل قلمی و مقریزی طبع	
ثانی جلد ۲ صفحہ ۵۶)	

یعقوبی نے بھی اسے منجملہ اُن اُمور کے قرار دیا ہے ۔ جو حضرت علیؓ کی رائے سے انجام پائے ۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے ۔

وفيها ارخ عمر الكتب	اسی زمانے میں حضرت عمرؓ نے ارادہ
واراد ان يكتب التاريخ	کیا کہ ضبط کتابت کے لئے
منذ مولد رسول الله ثم	ایک تاریخ قرار دی جائے پہلے
قال من المبعث فاشار	اُنہیں خیال ہوا آنحضرتؐ کی ولادت
عليه علي ابن ابي طالب	سے شروع کریں پھر خیال کیا کہ
ان يكتبه من الهجرة	آپؐ کی بعثت کے واقعہ سے ابتدا
فكتبه من الهجرة .	کی جائے لیکن حضرت علیؓ نے
	رائے دی کہ ہجرت سے شروع کرنا چاہیئے ۔

قومی سنہ کی ضرورت و اہمیت

ان روایات کے مطالعہ کے بعد ضروری ہے کہ بعض امور پر غور کیا جائے : سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اور صحابہؓ نے یہ ضرورت کیوں محسوس کی کہ ایک نیا سنہ قرار دیا جائے ؟ امام شعبی کی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ تاریخ کے تعین و تقرر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسری قوموں کی تاریخ اختیار کریں پہلی روایت میں جس ہرمزان کو بلانے اور

جب کبھی کسی معاملے پر سوچ بچار کرتے تھے تو خواہ علت و موجب سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں لیکن دماغ جاتا اُسی طرف تھا جو علم و حکمت کے لئے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہو سکتے ہیں۔ یہی معنی ہیں انبیائے کرامؑ کے مقام تزکیہ کے کہ "ویزکیھم ویعلمھم الکتٰب والحکمۃ" (جمعہ: ۲) یعنی دل ودماغ کی اس طرح تربیت کر دی جاتی ہے کہ ایک موزوں اور مستقیم سانچہ ڈھل جاتا ہے۔ اب جب کبھی کوئی ٹیڑھی چیز اس میں رکھی جائیگی وہ قبول نہیں کرے گا اور موزوں چیزیں ہی اس میں سما سکتی ہیں۔

واقعہ ہجرت کا اختصاص

بہر حال اس معاملہ میں پہلی بات جو قابلِ غور تھی وہ قومی سنہ کا تقرر اور اُسکی اہمیت سکا احساس تھا بغیر کسی دور دراز توجیہہ کے اختیار کئے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ حضرت عمرؓ اور اکابر صحابہؓ کی اس پہلو پر نظر تھی وہ محسوس کرتے تھے کہ قومی زندگی کی تقویم کے لئے قومی سنہ ضروری ہے اور اس لئے چاہیئے کہ یہ باہر سے نہ لیا جائے اندر ہی طیار کیا جائے۔

اس کے بعد دوسرا اہم نقطۂ نظر واقعہ ہجرت کا اختصاص ہے۔ اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ سنہ کی ابتدا قرار دینے کیلئے جس قدر بھی سامنے کی چیزیں ہو سکتی تھیں ان میں سے کسی چیز کی طرف ان کی نگاہ نہ گئی ہجرت نبویؐ کا واقعہ جو آغاز اسلام کی بے سروسامانیوں اور کمزوریوں کی یاد تازہ کرتا تھا اختیار کیا گیا۔ آخر اس کی علت کیا تھی؟

مسلمانوں کا قومی سنہ قرار دینے کے لئے قدرتی طور پر جو چیزیں سامنے کی تھیں وہ اسلام کا ظہور تھا داعی اسلام کی پیدائش تھی نزول وحی کی ابتدا تھی بدر کی تاریخی فتح تھی۔ مکہ کا فتحمندانہ داخلہ تھا حجۃ الوداع کا اجتماع تھا جو اسلام کی ظاہری اور معنوی تکمیل و فتح کا آخری اعلان تھا لیکن ان تمام واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی اختیار نہیں کیا گیا۔ ہجرت مدینہ کی طرف نظر گئی جو نہ تو کسی پیدائش کا جشن ہے۔ نہ کسی ظہور کی شوکت نہ کسی جنگ کی فتح ہے۔ نہ کسی غلبہ و تسلط کا شادیانہ بلکہ اس زمانے کی یاد تازہ کرتا ہے۔ جب آغاز اسلام کی بے سروسامانیاں اور

تعلق رکھتا ہو ۔ اپنا قومی ورثہ سمجھتے تھے خود اس عہد میں حضرت عمرؓ نے بے شمار معاملات میں غیر قوموں کے علمی اور تمدنی اصول معلوم کئے ہیں ۔ اور ان میں جو باتیں کار آمد اور ضروری نظر آئی ہیں بلا تامل اختیار کر لی ہیں ۔ جب کبھی کوئی ایسا معاملہ پیش آتا وہ ایرانیوں، رومیوں اور مصریوں کو بہ اصرار طلب کراتے ۔ اور اُن سے مشورہ لیتے ۔ دفاتر حکومت کی تقسیم، خراج و محصول کا تعین، اراضی کی پیمائش اور تشخیص خزانے کا قیام حساب و کتاب کے اصول و قواعد اور اسی طرح کے بہت معاملات ہیں ۔ جن میں ایرانی اور رومی قواعد کا تتبع کیا گیا ۔ فقہ کا ایک اہم باب فرائض ہے ۔ یعنی ورثہ کی تقسیم کے اصول و قواعد چونکہ اس کا تعلق فن حساب سے ہے ۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے چاہا اس کے قواعد کی ترتیب و درستگی کے لئے ایک ماہر حساب سے مدد لی جائے مورخین نے تصریح کی ہے کہ اس غرض سے ایک رومی مسیحی مدینہ میں طلب کیا گیا تھا ۔ طلبی کے فرمان میں والیٔ شام کو جو الفاظ لکھے تھے وہ یہ ہیں ۔ ابعث لنا رومی یقیمد لنا حساب فرائضنا ایک رومی کو بھیج دو تاکہ وہ ہمارے فرائض کا حساب استوار کر دے جب حضرت عمرؓ کو فرائض جیسے شرعی مسئلے کے حساب میں ایک رومی عیسائی سے مدد لینا ناگوار نہ ہُوا ۔ تو ظاہر ہے ۔ کہ ایرانی یا رومی سنہ کے اختیار کر لینے میں قومی تعصب کیوں مانع ہوتا جس کا تعلق صرف حساب و تاریخ سے ہے ۔ انہوں نے ایرانی اور رومی سنین جیسے مدون و رائج سنہ چھوڑ دیئے اور ایک نیا سنہ از سر نو قائم کیا ۔

صحابہ کرامؓ کے دماغ کا سانچہ اصل یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرامؓ کا دماغ جس سانچے میں ڈھال دیا تھا وہ ایسا سانچا تھا جس میں دوسرے درجے کا کوئی خیال سما ہی نہیں سکتا تھا وہ صرف اوّل درجہ کے خیالات کے لئے تھا ۔ بہت ممکن ہے ۔ دنیا کے تمدنی علوم و فنون کے رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں مصطلح لفظوں میں ادا نہ کر سکتے ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل و صورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے لیکن ان کی طبیعت کی اُفتاد اور ذہنیت کی روش کچھ اس طرح کی بن گئی تھی کہ

کردی تھی وہ اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر قوموں کی تقلید سے نہیں بلکہ اسلام کی رُوح فکر و عمل سے کرنی چاہتے تھے۔

ہجرت مدینہ کی حقیقت | لیکن واقعۂ ہجرت کیا تھا؟ وہ ایک ہی واقعہ نہ تھا بے شمار اعمال و وقائع کا مجموعہ تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کی حقیقت پر غور کر لینا چاہیئے۔

اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد، مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔ دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا۔ پہلا آنحضرت صلعم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے۔ اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے۔ اور تکمیل غار ثور کے انزوا پر۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا اصلی دور، دوسرا دور تھا۔ کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی اور ظاہری طاقت و حشمت کا سر و سامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگی فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی، مکہ کی فتح عرب کی فتح کا اعلان عام تھی لیکن خود اسلام کی نظروں میں اس کی زندگی کا اصلی دور، دوسرا دور نہیں پہلا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں دوسرے میں نہیں پہلے دور میں استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخرّ طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا۔ لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں؟ بلاشبہ مکہ کی فتح عرب کی فیصلہ کن فتح تھی۔ لیکن اگر مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کی فتح کی راہ کیونکر کھلتی؟ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس دور کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ پس دوسرے دور میں جسم کتنا ہی طاقتور ہو گیا ہو۔ لیکن اس کی روح پہلے ہی دور میں ڈھونڈنی چاہیئے۔[1]

استعداد داخلی و خارجی | وجود اور زندگی کے ہر گوشے کے لئے خدا کا

---

[1] "خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے، نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غار حرا پہلے" اکبرؔ

ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئیں کہ داعی اسلام کے لئے اپنے وطن میں زندگی
کرنا بھی ناممکن ہوگیا تھا۔ بیچارگی اور مظلومیت کی انتہا تھی کہ اپنا وطن اپنا گھر
اپنے عزیز و اقارب اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف ایک رفیق غمگسار کے سا
رات کی تاریکی میں وہ سیار دشتِ غربت ہوا تھا

واقعہ ہجرت کی اہمیت

اس بارے میں قوموں کا طریقہ اُن کے سامنے آ
اور خود اُنہیں بھی یہ بات صاف دکھائی دی کہ ا
اسلام کی پیدائش یا بعثت کو اپنی قومی تاریخ کی بنیاد ٹھہرائیں لیکن چونکہ یہ بات اس
معیارِ نظر سے ہٹی ہوئی تھی جو اس طرح کے معاملات میں اسلام نے قائم کیا تھا اس
نہایت واضح اور نمایاں ہونے پر بھی ان کی طبیعت کو مطمئن نہ کر سکی وہ ایسا محس
کرنے لگے کہ کوئی دوسری بات ہونی چاہیئے وہ دوسری بات کیا تھی ؟ ہجرت کا
کا واقعہ جونہی یہ بات سامنے آئی سب کے دلوں نے قبول کرلی۔ تاریخ کا یہ مبدء دُ نیا
کی تمام تاریخوں اور یادگاروں کے خلاف تھا صرف خلاف ہی نہ تھا بلکہ صریح اُ
تھا۔ دُنیا کی تمام قومیں فتح و اقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں۔ انہوں نے
بیچارگی اور درماندگی سے اپنی تاریخ شروع کی دنیا کی تمام قوموں نے چاہا اپنے
ظہور کی سب سے بڑی فتح یاد رکھیں انہوں نے چاہا اپنی تاریخ ظہور کی سب سے بڑی
سروسامانی یاد رکھیں دنیا کی تمام قوموں کا فیصلہ یہ ہے کہ اُن کی قومی تاریخ اس
وقت شروع ہو جب ان کی تاریخ کا سب سے بڑا انسان پیدا ہوا اور اُس نے جنگ و قتا
کے میدانوں میں فتح حاصل کی لیکن ان کا فیصلہ یہ تھا کہ قومی تاریخ کی ابتدا اس د
سے ہو جب سب سے بڑے انسان کی نہیں بلکہ سب سے بڑے عمل کی پیدائش ہوئی ا
جنگ کے میدانوں میں نہیں بلکہ صبر و استقامت کے میدانوں میں فتح حاصل ہو
دنیا کی تمام قوموں کا یقین تھا کہ ان کی طاقت و شوکت کی بنیاد اس وقت پڑ
جب انہوں نے ملکوں اور سلطنتوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا یقین یہ تھا کہ
طاقت و شوکت کا دروازہ اس دن کھلا جب ملکوں پر اُنہوں نے قبضہ نہیں کیا بلکہ
اپنا ملک و وطن بھی ترک کر دیا۔ بلاشبہ ان کی یہ سمجھ دنیا کی ساری قوموں سے اُلٹ
تھی، لیکن اس سمجھ سے عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت نے ان کے اندر پید

کہ اپنی گرمی اس کے لئے وقف کردے بادل طیار رہے کہ اپنے ذخیروں کا منہ کھول دے زمین مستعد ہے کہ اپنی آغوش اس کے لئے وا کردے لیکن اس تمام کارخانہ بخشش سے وہ جبھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جبکہ خود اس کے اندر کی استعداد صحیح و صالح ہو اگر ایسا نہیں تو پھر یہ تمام کارخانۂ بخشش و نوال اس کے لئے بیکار ہوگیا۔ سورج اپنا دہکتا ہوا تنور رکھنے پر بھی اسے گرم نہ کرسکے گا۔ بادل اگر اپنا تمام ذخیرہ آب ختم کر ڈالے جب بھی اسے زندگی کی رطوبت کا ایک قطرہ نہیں ملے گا۔

پھر ایک صالح بیج جب زمین میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔ تو اس کے اندر کی استعداد ظاہر ہوتی ہے اور اندر ہی اندر پکنے اور بڑھنے لگتی ہے۔ اس وقت وہ ایک چھوٹا سا وجود ہوتا ہے۔ جس کے اندر باریک ذرّوں اور ریشوں کے سوا کوئی چیز نظر نہیں آتی لیکن انہی ذرّوں اور ریشوں کے اندر اس کی آنیوالی ہستی کی ساری بڑائیاں اور عظمتیں پوشیدہ ہوتی ہیں حتٰی کہ کہا جاسکتا ہے۔ ایک عظیم اور تناور درخت کی ساری ٹہنیاں اور پتے اور اس کے ہزاروں پھول اور پھل انہیں ذرّوں اور باریک ریشوں کے اندر موجود ہوتے ہیں وہ بتدریج نشوونما پاتا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے تخلیق و تسویہ کے مختلف درجوں سے گزرتا ہے۔ پھر یہ سب کچھ ہوچکتا ہے۔ تو وہ وقت آجاتا ہے۔ جب زمین کی سطح چاک ہوتی ہے اور اس کی پہلی شاخ باہر نکلتی ہے چنانچہ وہ اُبھرتا ہے۔ اور کائنات فطرت کے جس کارخانۂ فیضان سے زمین کے اندر اکتساب فیض کر رہا تھا اب اس سے زمین کی سطح پر بخشش و نوال حاصل کرنے لگتا ہے۔ اس وقت تم دیکھتے ہو کہ عالم نباتات کا یہ جوان نوخاستہ سرو قد کھڑا ہے۔ اور کارخانہ فطرت کے ہر سامان سے زندگی اور قوت کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اب تم اس کی ہستی کا اعتراف کرتے ہو۔ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ باہر کی استعداد اس کے لئے جو کچھ بہم پہنچا رہی ہے یہ دراصل اسی استعداد کا جواب اور نتیجہ ہے جو زمین کے اندر اُس کی داخلی طبیعت نے پیدا کر لی تھی۔

عالم حیوانات کی مثال

عالم حیوانات میں دیکھو تو یہ حقیقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ حیوان اور انسان

قانون وجود ایک ہی ہے۔ تم اس کے کتنے ہی مختلف نام رکھدو مگر وہ خود ایک سے زیادہ نہیں اب ایک لمحے کے لئے ٹھہرو اور غور کرو کہ تخلیق و تکمیل وجود کے لئے خدا کا قانون حیات کیا ہے؟

فرد کی طرح جماعت کا بھی وجود ہے۔ عالم صورت کی طرح عالم معنی بھی اپنی ہستی رکھتا ہے۔ لیکن کوئی چیز ہو تخلیق و تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ یکے بعد دیگرے دو مختلف دوروں سے گذرے پہلا دور "استعداد داخلی" کا ہے۔ دوسرا "استعداد خارجی" کا۔ ضروری ہے کہ پہلے اندر کی استعداد وجود میں آئے اور ضروری ہے کہ اندر کی استعداد کی تکمیل کے ساتھ ہی باہر کی استعداد بھی اُس کے اندر پیدا ہو جائے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے مثال کی ضرورت ہے۔ خدا کی رحمت و ربوبیت نے تمام کائنات ہستی کو بخشش کا خزانہ اور فیضان عام کی بارش بنا رکھا ہے۔ زندگی اور وجود کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے ہر چیز موجود ہے۔ اور اس کی موجودگی صرف اس لئے ہے۔ تاکہ استعداد کو ڈھونڈنے صلاحیت کو پالے اور انفعال کو فعل سے اور انجذاب کو جذب سے مالا مال کر دے سورج روز آسمان پر چمکتا ہے۔ ستارے ہمیشہ زمین کی طرف جھانکتے ہیں۔ ہوائیں یکساں گرم جوشی سے چلتی ہیں۔ بادلوں کی رفتار میں کبھی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ سورج کی کرنیں سمندروں کو کھینچنے اور پانی کے ذخیرے جمع کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتیں۔ زمین کی سطح اپنے سارے خزانے لئے ہوئے موجود ہے۔ خاک کے ذرّوں میں سے ہر ذرّہ اپنا خاصہ اور اپنی تاثیر رکھتا ہے۔ موسموں کی تبدیلی اور لیل و نہار کی گردش بھی اپنے مقصد اور حکمت سے باہر نہیں۔ اسی طرح کی تمام ان گنت اور بے حد و حساب چیزیں۔ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (ابراہیم ۳۴) اور اگر تم خدا کی نعمتیں اور بخشائشیں شمار کرنی چاہو تو وہ اتنی ہیں کہ کبھی تمہارا اندازہ احاطہ نہیں کر سکتا۔

بیج کی مثال

دہقان ایک بیج اُٹھاتا ہے۔ اور زمین کے حوالے کر دیتا ہے۔ اب دیکھو اس بیج کے بار آور ہونے کے لئے ربوبیت الٰہی نے کس طرح اپنا تمام کارخانہ ہستی مہیا کر دیا ہے۔ سورج منتظر ہے

پرورش کرنے والی اور بہرشئے وجود وکمال تک لے جانے والی ہے ۔ ٹھیک اسی طرح "جماعت" اور "اُمت" کے ظہور و نشو کے لئے بھی ہر طرح کی بخششوں اور ہر طرح کی فیض رسانیوں کا سامان مہیّا کر دیا ہے ۔ ربُوبیّت اس کے ظہور کا انتظار کرتی اور بخششِ فطرت اِس کے قدم اُٹھانے کی راہ تکتی ہے ۔ لیکن جس طرح افراد و اشیا کے لئے فطرت کا تمام سامانِ فیض صرف اسی حالت میں مفید ہو سکتا ہے جبکہ خود اُن کے اندر صحیح و صالح استعداد موجود ہو اسی طرح "جماعت" کا مولود بھی وقت کے فیضان قومی و مرزبومی ماحول کی بخششوں سے اسی حالت میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے ۔ جبکہ خود اُس کے اندر اکتساب و انفعال کی صحیح استعداد موجود ہو ۔ پھر جس طرح اس استعداد کی تکمیل کا پہلا مرحلہ داخلی ہے ۔ دوسرا خارجی اِسی طرح جماعتوں اور گروہوں کے مزاجی استعداد کے لئے بھی پہلا مرحلہ داخلی ہے ۔ دوسرا خارجی کوئی جماعت کوئی قومِ انسانی کی کوئی ہیئت اجتماعیہ کشمکشِ حیات کی کامیابیاں حاصل نہیں کر سکتی ، اگر پہلے ایک تخم اور جنین کی طرح اپنی داخلی استعداد کی منزل طے نہیں کر لیتی اس کی داخلی تخلیق و تکمیل کا بھی ایک معین وقت اور وقت کی معین مقدار ہے اگر ایک جماعت وجود و کمال کا پورا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے ۔ تو ناگزیر ہے کہ پہلے داخلی استعداد کی تکمیل کا وقت بسر کرے اس کے بعد خارج کے اعمال و فتوح کا دروازہ خود بخود اس پر کھل جائے گا کیونکہ خارج کی تمام کامرانیاں اس کی داخلی استعداد کی تکمیل کا نتیجہ و ثمرہ ہوتی ہیں ۔

داخلی استعداد کا دَور

ظہورِ اسلام کا پہلا دور جو بعثت سے شروع ہو کر ہجرت پر ختم ہوا ۔ اور جس کا نقطۂ تکمیل ہجرت کا معاملہ تھا در اصل جماعت کی داخلی استعداد کا دور تھا اور اس لئے ظہورِ اسلام کی تمام فتح مندیوں اور کامرانیوں کا مبدأ یہی دور تھا نہ کہ مدنی زندگی کا دوسرا دور ۔ بلا شبہ دُنیا کی ظاہر بین نگاہوں میں یہ مصیبتوں کا دور اور پے در پے چارگیوں اور درماندگیوں کا تسلسل تھا لیکن بباطن امتِ مسلمہ کی ہر آنے والی فتح مندی اسی کی مصیبتوں اور کلفتوں کے اندر نشو و نما پا رہی تھی یہی مصیبتیں تھیں جو "جماعت" کے ذہن و اخلاق کے لئے تعلیم و تربیت کا مدرسہ اور تزکیہ نفوس و ارواح کی امتحان گاہ تھیں بدر کے فتح مند اسی کے اندر سبق لے رہے تھے ۔ فتح مکہ کے کامران اسی کے اندر بن اور

کا جو وجود عالم ہستی میں قدم رکھتا ہے۔ اور بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی منزلیں طے کرتا ہے۔ دراصل یہ وہی وجود ہے جو پہلے خود اپنی ہستی کے اندر تخلیق و تکمیل کی منزلیں طے کر چکا ہے۔ اگر اس کی داخلی استعداد کا دور صحت اور قوت کے ساتھ ختم نہ ہوتا تو اس کی خارجی استعداد کا یہ دور وجود ہی میں نہ آتا وہ پہلے شکم مادر میں جنین کا ابتدائی مادہ تھا پھر اندر ہی اندر بڑھنے اور پھیلنے لگا بتدریج تخلیق و تسویہ کی مختلف منزلیں وجود میں آئیں۔ پہلے چھوٹے چھوٹے کیڑے تھے جنہوں نے ایک جونک کی سی شکل اختیار کر لی پھر یہ جونک بڑھتے بڑھتے گوشت کا ایک لوتھڑا بن گئی۔ لوتھڑے میں ہڈیوں کا ڈھانچا بننا شروع ہوا اور ڈھانچے پر گوشت پوست کا غلاف چڑھ گیا۔ پھر گوشت اور ہڈیوں کا یہ مجموعہ نظم و تناسب کے ایک ایسے سانچے میں ڈھل گیا کہ شکل و ہیئت کی تمام باریکیاں اور خال و خط کی ساری دلآویزیاں مکمل ہوگئیں پھر جب اندر ہی اندر تکمیل و تسویہ کے یہ تمام مراتب طے ہوگئے تو یہ وجود اس قابل ہوا کہ شکم مادر سے باہر قدم نکالے اور تم نے دیکھا کہ خلقت اور ہستی کا ایک زندہ اور مستعد وجود تمہارے سامنے ہے۔ ثم انشأنہ خلقاً اٰخر فتبارک اللہ احسن الخالقین (مومنون: ۱۴) بہرحال دنیا میں ہر چیز کی تخلیق و تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اس میں کارخانۂ فیضان فطرت سے اکتساب فیض کی صحیح استعداد پیدا ہو اور اس استعداد کے ظہور کا پہلا محل اندرونی ہے۔ دوسرا بیرونی جب تک کوئی چیز اپنے اس پہلے دور میں صحیح استعداد پیدا نہیں کرے گی دوسرے دور کی استعداد پیدا نہیں کر سکتی۔ خارج کے نشوونما کے لئے داخل کا نشوونما بمنزلہ سبب و علت ہے جبتک سبب موجود نہ ہوگا نتائج ظہور میں نہیں آئیں گے۔

جماعت کی داخلی استعداد

فرد اور جماعت دونوں کا ایک ہی حال ہے۔ یہ افراد و اشیا کی مثالیں تھیں انہی کو جماعتوں اور قوموں پر بھی منطبق کرو۔ اشیاء و افراد کی طرح "جماعت" بھی پیدا ہوا کرتی ہے۔ اس کی تخلیق نشوونما اور ترقی و تکمیل کے لئے بھی بعینہٖ وہی قوانین ہیں جو اشیاء و افراد کے لئے ہیں۔ جس طرح فطرت الٰہی کی ربوبیت نے مخلوقات کی زندگی اور نشوونما کے لئے اپنی بخششوں کے بادل زمین پر پھیلا دیئے ہیں ہر شئے زندگی دینے والی ہر شئے

مدینہ کے ساتھ "فتح" کا لفظ سن کر تعجب ہوا ہوگا۔ کیونکہ تم صرف اسی فتح کے شناسا ہو جو جنگ کے میدانوں میں حاصل کی جاتی ہے۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ میدان جنگ کی فتح سے بھی بڑھ کر دلوں کی آبادیوں اور رُوحوں کی اقلیموں کی فتح ہے اور اسی فتح سے میدان جنگ کی فتح مندیاں بھی حاصل ہوتی ہیں عین اس وقت جبکہ اسلام کا داعی اپنے وطن اور اہل وطن کی شقاوتوں سے مایوس ہوگیا تھا باشندگانِ یثرب کی ایک جماعت پہنچتی ہے اور رات کی تاریکی میں پوشیدہ ہوکر اپنی روح کا ایمان اور دل کی اطاعت پیش کرتی ہے اس وقت دنیوی جاہ وجلال کا نام ونشان نہیں ہوتا سیف وسنان کی ہیبت وجبروت کا وہم وگمان بھی نہیں کیا جاسکتا سرتاسر غربت اولی کی بے سروسامانیاں اور عہد مصائب ومحن کی درماندگیاں ہوتی ہیں۔ بایں ہمہ یثرب کی پوری آبادی اس کے سامنے جھک جاتی ہے اور ایمان کے ایسے جوش اور عشق واطاعت کی ایسی خود فروشیوں کے ساتھ اس کے استقبال کیلئے طیار ہوجاتی ہے جو تاریخ عالم کے کسی بڑے سے بڑے فاتح اور شہنشاہ کو بھی میسر نہ آئی ہوگی دلوں اور رُوحوں کی اس فتح وتسخیر سے بڑھکر بھی کوئی اور فتح ہو سکتی تھی؟ لیکن یہ فتح کیونکر ہوئی؟ دور ہجرت کے آلام ومحن میں اس کا آغاز ہوا اور ہجرت نے اس فتح کی تکمیل کر دی۔

واقعۂ ہجرت اور فتح ونصرت الٰہی یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے واقعہ ہجرت کا ذکر اس طریقہ پر کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ بے سروسامانی وغربت کے اس عمل ہی میں فتح ونصرت الٰہی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ تھی۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ	غار کے دو ساتھیوں میں سے جب ایک
اِذْ یَقُولُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ	نے دوسرے سے کہا غم ورنج نہ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ	کرو یقیناً خدا ہمارے ساتھ ہے
سَكِیْنَتَهٗ عَلَیْهِ وَاَیَّدَهٗ	اور اس کی مشیّت وحکمت ہمارے
بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ	لئے فتح ونُصرت کی راہ باز کرنے والی
كَلِمَةَ الَّذِیْنَ كَفَرُوا	ہے پھر ایسا ہوا کہ خدا نے اپنی تسکین

لہ عہ "جو دنوں کو فتح کرنے وہی فاتح زمانہ!"۔ (بقیہ صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ کریں)

ڈھل رہے تھے اتنا ہی نہیں بلکہ یرموک اور قادسیہ کی پیدائش بھی اسی کو
اور خود فروشیوں میں ہو رہی تھی یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس جہاد
کہا جو مدنی زندگی میں اسلحہ جنگ سے کرنا پڑا تھا۔ لیکن نفس و اخلاق کے تزکیہ و
جو جہاد اس سے پہلے دور میں ہو رہا تھا اُسے "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا۔ کیونکہ
بڑا جہاد یہی جہاد تھا فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جہاداً ک
۵۳) بالاتفاق سُورہ فرقان مکی ہے۔ مکی زندگی میں جس بڑے جہاد کا حکم
ظاہر ہے کہ وہ قتال کا جہاد نہ تھا صبر و استقامت اور عزم و ثبات کا جہا
انہی اوصاف میں جماعت کی داخلی استعداد کی اصلی بنیادیں تھیں۔

تکمیل کار کا اعلان

ہجرت کا واقعہ اس دور کی مصیبتوں کی انتہ
لئے اس کی برکتوں اور سعادتوں کی بھی آخری
صحابہ کرامؓ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے اور کیونکر بے خبر ہو سکتے تھے۔ جبکہ
دماغی تربیت کی اصلی روح اسی معاملہ میں مضمر تھی؟ پس جب یہ سوال س
اسلامی سنہ کی ابتدا کس واقعہ سے کی جائے تو اُنہیں کسی ایسے واقعہ کی جس
اُمت کے قیام و اقبال کا اصلی سرچشمہ ہو۔ آنحضرت صلعم کی پیدائش
یقیناً سب سے بڑا واقعہ تھا۔ لیکن اس کے تذکار میں شخصیت سامنے آتی تھ
کا عمل سامنے نہیں آتا تھا۔ بعثت کا واقعہ بھی سب سے بڑا واقعہ تھا لیکن
کی ابتدا تھی انتہا و تکمیل نہ تھی بدر کی جنگ اور مکہ کی فتح عظیم واقعات تھے لیکن
کی فتح و بنیاد نہ تھے کسی دوسری بنیاد کے نتائج و ثمرات تھے۔ یہ تمام و
کے سامنے آئے لیکن ان میں سے کسی پر بھی طبیعتیں مطمئن نہ ہو سکیں۔
بالآخر جب ہجرت کا واقعہ سامنے آگیا تو سب کے دلوں نے قبول
انہیں یاد آگیا۔ اسلام کے ظہور و عروج کا مبدائے حقیقی اسی واقعہ میں
ہے اور اس لئے یہی واقعہ ہے جسے اسلامی تاریخ کا مبدأ بننا چاہیئے۔

مدینہ کی فتح

پھر یہ حقیقت کسی درجہ واضح ہو جاتی ہے۔
پہلو پر نظر ڈالی جائے کہ ظہور اسلام کی تمام فتح
سب سے پہلی فتح مدینہ کی فتح تھی اور اس کی تکمیل ہجرت ہی کے واقعہ سے ہ

اجراء کا چرچا ہے اس لئے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اسلامی قوانین یا اسلامی شریعت کا اصل سرچشمہ کیا ہے - اصل سرچشمہ اور اصل بنیاد قرآن مجید ہے - اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ خواہ عوام ہوں، خواہ حکمران ہوں - اُن کو سب سے پہلے قرآن مجید سے تعلق رکھنا چاہیئے - اور اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے قرآن مجید کے بارے میں بتایا جائے کہ اس کا فہم کیسے حاصل ہوتا ہے - ہم قرآن مجید کو کیسے سمجھ سکتے ہیں - وہ کون سے وسائل اور کون سے ذرائع ہیں - جن کے ذریعہ سے ہم قرآن مجید کو صحیح معنیٰ میں سمجھ سکیں اور جو اس کا مقصد نزول ہے وہ حاصل ہو - درس قرآن مجید جس کا اخبارات میں اعلان کیا گیا تھا، اُس کی دو شکلیں ہیں - ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی سُورت لے لی جائے اور اس سُورت یا اس کی چند آیات کی تشریح کی جائے - اور دوسری شکل درس قرآن کی یہ ہے کہ ایک عنوان چُن لیا جائے اور اس عنوان کے تحت جتنی آیتیں ہیں - اور کتاب و سُنّت سے جو معلومات حاصل ہیں اُن کو یکجا کر کے پیش کر دیا جائے - آج درسِ قرآن کے سلسلہ میں دوسرا طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے یعنی قرآن مجید کے عنوان سے آج درس ہوگا اور اس سلسلہ کی آیات اور سُنّت کی معلومات کو پیش کیا جائے - دُعا کیجئے کہ اللہ تعالےٰ اس مقصد میں کامیابی عطا فرمائے - اور زبان سے وہی نکلے جو سچ ہو اور حق ہو اور خود کہنے والے کو بھی اور سُننے والوں کو بھی عمل کی توفیق حاصل ہو -

یہ آیت جو تلاوت کی گئی ہے اس میں مقصدِ نزولِ قرآن بیان کیا گیا ہے - نہایت ہی فصیح و بلیغ لیکن نہایت ہی سادہ الفاظ میں فرمایا - كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ - اے محمدؐ ہم نے کتاب آپؐ کی طرف اس لئے اتاری ہے تاکہ آپؐ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالیں - یہ مقصد ہے اس کتاب کے نزول کا - تاریکیاں بہت سی پھیلی ہوئی ہیں - اور جس وقت قرآن مجید نازل ہوا تھا اس وقت بہت سی تاریکیاں اور اندھیرے تھے - کفر و شرک کے اندھیرے - رسم و رواج کے اندھیرے، شخصیت پرستی بُت پرستی اور زر پرستی کے اندھیرے - نہ معلوم کتنی تاریکیاں تھیں - قبائل پرستی اور زبان پرستی - ان تمام تاریکیوں کو چھانٹنے اور نُور کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے قرآن مجید کا نزول ہوا - اور یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ مضمون بیان ہوا ہے - وہاں ظلمات کو جمع لایا گیا ہے - ظلمات جمع ہے ظُلمت کی - اور

قرآن فہمی کے بنیادی اصول

(مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدظلہ)

(یہ تقریر ۲۶ اکتوبر ۸۰ء بروز جمعہ رابطۃ العلوم الاسلامیہ کراچی کے ہال میں کی گئی)

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ اِلٰى صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ اللّٰهِ الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدِ ۙ الَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍۢ بَعِيْدٍ ۝

یہ چند آیات سورۃ ابراہیم کے پہلے رکوع کی ہیں۔ فرمایا۔ الرٰ۔ یہ سورت الف۔ لام۔ را ہے اور اس کا دوسرا نام سورت ابراہیم ہے۔ کتابٌ یعنی ھٰذا کتابٌ۔ یہ کتاب ہے۔ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ۔ ہم نے اسے آپ کی طرف اتارا ہے۔ لِتُخْرِجَ النَّاسَ تاکہ آپ لوگوں کو نکالیں۔ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ تاریکیوں سے روشنی کی طرف۔ بِاِذْنِ رَبِّھِمْ۔ اپنے رب کے اذن سے۔ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ۔ وہ نور کیا ہے؟ عزیز وحمید کا راستہ۔ اور وہ عزیز وحمید کون ہے؟ اَللّٰہُ الَّذِیْ وہ اللہ جس کے لئے ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے۔ وَوَیْلٌ لِّلْکٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ۔ اور ویل ہے خرابی ہے کافروں کے لئے سخت عذاب کی۔ اَلَّذِیْنَ یَسْتَحِبُّوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا۔ عَلَی الْاٰخِرَۃِ۔ وہ لوگ جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو پسند رکھتے ہیں۔ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ وَیَبْغُوْنَھَا عِوَجًا۔ اور اس میں کجی تلاش کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ فِیْ ضَلٰلٍ بَعِیْدٍ۔ یہی لوگ گہری گمراہی میں ہیں۔

آج کل ہمارے ملک میں چونکہ اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کے

کوشش کرتے ہیں کہ کوئی چیز ایسی مل جائے جس سے لوگ مغالطہ میں پڑجائیں اور قرآن مجید کی دعوت سے لوگ مستفید نہ ہوسکیں۔ فرمایا: - اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۢ بَعِیْدٍ - یہی لوگ گہری گمراہی میں ہیں - یہاں تک تفسیر ہے اُن آیات کی جن میں قرآن مجید کا مقصدِ نزول بیان کیا گیا ہے ۔

قرآن مجید کا مقصد نزول کیسے حاصل ہو سکتا ہے - اس کے لئے خود قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے قرآن مجید پر انسان ایمان لائے ، اس کی عظمت کا قائل ہو اور اس کو بڑے اطمینان کے ساتھ پڑھے جیسا کہ فرمایا: وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ۝ اور قرآن مجید کو ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھیئے - یا سورۃ اسراء میں فرمایا: - وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِیْلًا ۝

کہ ہم نے اس قرآن مجید کو اتارا ہے تاکہ آپ اسے ٹھیر ٹھیر کر اطمینان سے پڑھیں۔ تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکلنے کے لئے پہلا زینہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو بڑے اطمینان اور خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھا جائے اُس کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ یہ کلام الٰہی ہے اور اس سے ہم فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ۔

دوسرا زینہ یہ ہے کہ محض قرآن مجید کا پڑھ لینا ہی کافی نہیں ہے - جیسا کہ آج کل ہمارے ہاں رواج ہے یا بلادِ عجم میں اور جگہ بھی یہ رواج ہے بلکہ عربوں میں بھی یہ مصیبت آگئی ہے کہ قرآن مجید پڑھتے ہیں سمجھتے نہیں ہیں - یہ ضروری نہیں ہے کہ جو عرب ہو ، عربی جانتا ہو ، وہ قرآن مجید سمجھ ہی جائے بلا تشبیہ عرض ہے کہ جس طرح بہت سے لوگ بانگ درا یا غالب کا دیوان پڑھے ہوئے ہیں یہ اردو میں ہیں ، لیکن ہر ایک اردو دان اس کو نہیں سمجھتا - سمجھنے کیلئے تو کاوش کی ضرورت ہے - عربوں کے اندر بھی اب یہ رواج ہے کہ وہ بس تبرکاً پڑھ لیتے ہیں - یہ تبرک کا ایک فلسفہ ہے - یا نظریہ کہئے خیال کیئے اس نے بھی ہمیں قرآن مجید سے بہت دُور ڈال دیا ہے اور میں یہ کوشش کروں گا کہ درس کے آخر میں " موانعِ فہم قرآن " کے سلسلہ میں کچھ عرض کروں ، اس موقع پر تفصیل سے بتاؤں گا کہ کون کون سی رکاوٹیں ہیں جنہوں نے ، ہمیں قرآن مجید سے دُور کر دیا ہے - جب تک کہ رکاوٹیں نہیں ہٹیں گی اُس وقت تک ہم قرآن مجید سے قریب نہیں ہو سکتے - خلاصہ یہ ہے کہ دوسرا زینہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھا جائے جیسا کہ فرمایا: -

اس کے مقابلہ میں حق کو نُور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ وہاں صرف نُور کہا۔ نُور کی جمع
کہا۔ ظلمات جمع ہے اور نور واحد ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ
اور تاریکیاں بہت سی ہیں ان کے راستے بھی بہت سے ہیں۔ لیکن نُور ایک ہی
ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی ایک ہی ہے۔ یعنی قرآن مجید۔ یہ توحید کو سمجھا
بیان کیا گیا ہے۔ انبیاء کرامؑ اور رسُول اکرمؐ کا یہ مقصد تھا کہ لوگوں کو تاریکیوں
کر روشنی کی طرف لائیں۔ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ۔ یہ اُن کے رب کے اذن سے ہے
اللہ تعالٰی نے حکم دیا ہے۔ اس بنا پر اس دعوت کو رسُول اکرمؐ نے قبول فرمایا۔
اس کو پیش کیا۔ اور وہ نور کیا ہے؟ صِرَاطِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ۔
ہے۔ غالب ہے جس پر کوئی دوسرا غالب نہیں آسکتا اور جو حمید ہے حمد والا۔
رحمتوں اور اپنی نعمتوں اور انعام واکرام کی بنا پر حمد کا مستحق ہے، حمد والا ہے
راستہ کی طرف۔ اور جس کی حکمرانی تمام کائنات پر ہے اور جو کچھ بھی آسمانوں اور
میں ہے سب اُس کے قبضہ میں ہے۔ اُسی کے تابع ہے۔ اُس کے بعد بتایا گیا
گیا ہے۔ روشنی سامنے آجائے تو لوگ اُس کو کیوں نہیں مانتے۔ اس کی وجہ کیا
وَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ۔ جب کفر دلوں میں راسخ
اور انسان معاندانہ روش اختیار کر لیتا ہے تو پھر قبول حق کے دروازے اُس
بند ہو جاتے ہیں اور یہ کفر انسانوں کے دلوں پر ڈیرے کس طرح ڈالتا ہے اس
وجہ ہے اِلَّذِيْنَ يَسْتَحِبُّوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ۔ کہ لوگ دنیا کو
ترجیح دیتے ہیں۔ جب دُنیا کو آخرت پر ترجیح دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ
حق اُن کے مفاد پر چوٹ لگائے گا اور اُن کے فائدوں پر زد پڑے گی تو ظاہر
کہ وہ حق کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ دعوتِ حق اور دعوتِ ق
کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ لوگ دنیا کو ترجیح دیتے ہیں۔ اسے آخ
مقابلہ میں پسند رکھتے ہیں اور اسی بناء پر وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
صرف خود نہیں رُکتے بلکہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ
دعوت حق کو، قرآن مجید کی دعوت کو بدنام کرنے کے لئے اُن کا ایک رویہ یہ
وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا۔ کہ اس میں کجی تلاش کرتے ہیں، کجی ہے نہیں بلکہ تلاش

اُس وقت تک تاریکیوں سے نُور کی طرف نہیں آ سکتے - اگر قرآن مجید کو صرف تبرّک بنا کر رکھ لیں تو اس سے فہم حاصل نہیں ہو سکتا -

قرآن مجید کو کس طرح سمجھا جائے ؟ یہ بڑا اہم سوال ہے - قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خود قرآن مجید ہی سے اس کو سمجھا جائے - القرآن یفسر بعضہ بعضًا قرآن کا کچھ حصّہ کچھ حصّے کی تفسیر کرتا ہے - اگر ایک جگہ پر اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی تفسیر ہے اگر ایک جگہ آپ سمجھتے ہیں کہ بات ذہن میں واضح نہیں ہو رہی ہے تو قرآن مجید میں اُسے دوسری جگہ کھول دیا ہے - قرآن مجید میں آتا ہے - اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ○ دکھا ہم کو سیدھا راہ - راہ اُن کی جن پر تُو نے انعام کیا - اب یہ کون لوگ ہیں جن پر انعام کیا ہے - سُورۃ بقرہ میں مغضوب علیہم کا بیان آیا ہے - سورۃ آلِ عمران میں ضالّین کا - اور اس کے بعد سُورۃ نساء میں جا کر کھولا ہے کہ انعمت علیہم سے کون لوگ مُراد ہیں فرمایا - أُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَٰئِكَ رَفِيقًا ○ (سُورۃ نساء - آیت ۶۹) یعنی انبیاء کرامؑ کی جماعت . صدّیقین کی جماعت، شہداء کی جماعت جنہوں نے اپنی جانیں اللہ کی راہ میں قربان کیں اور اس طرح اپنے ایمان کی شہادت دی - اور صالحین - اللہ کے نیک بندے جو حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں اور اللہ کے دین کو قائم رکھتے ہیں - یہ تفسیر ہوگئی اُس اجمال کی جو سورت فاتحہ میں ہے - اسی طرح سورہ بقرہ میں مغضوب علیہم کے ضمن میں یہود کا ذکر آتا ہے اور سُورت آلِ عمران میں نصاریٰ کا ذکر آتا ہے - یہ ضالّین ہیں - مغضوب علیہم اور ضالّین میں فرق ہے - مغضوب علیہم وہ قوم ہے جو معاندانہ روش اختیار کرتی ہے - جانتے بوجھتے حق سے کتراتی ہے - علم رکھتے ہوئے حق کو جھٹلاتی ہے - یہود اس میں خاص طور پر نمایاں ہیں - وہ جانتے تھے کہ حق کیا ہے - یعرفون کما یعرفون ابناءھم — وہ رسُول اکرمؐ کو پہچانتے تھے - جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے اور کوئی شک نہیں کرتے تھے کہ یہ ہماری اولاد ہے - اُسی طرح رسُول اکرمؐ کو پہچانتے تھے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں - اس معرفت اور علم کے باوجود انکار کیا - یہ یہود تھے جنہوں نے عناد اور سرکشی

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَ
اُولُوا الْاَلْبَابِ (سورۃ ص آیت ۲۹) کہ ہم نے برکت والی کتاب اُتاری تا
اس کی آیات میں تدبر کر لیا جائے جو عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں، یعنی تبرّ
یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی اس کو محض چوم لے اور چاٹ لے جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں ۔
چاٹی ہی تبرک کی نشانی ہے اور اس سے گویا کہ ان کے خیال میں قرآن مجید کا حق ادا ہو
قرآن مجید کو جب آپ نے سمجھ لیا تو پھر تیسرا زینہ عمل بالقرآن ہے کہ قرآن مجید پر
کیا جائے ۔ جیسا کہ فرمایا:۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَ
النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۔ یعنی ہم نے اس کتاب کو اتارا ہے تاکہ آپؐ اُن کے د
فیصلے کریں ۔ اُن کے جھگڑوں کو چکائیں کہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ق
کے احکام کو جاری کریں ۔ اور قرآن مجید نے جن چیزوں کو حلال ٹھیرایا ہے ان کو
سمجھیں اور جن چیزوں کو حرام ٹھیرایا ہے انہیں حرام سمجھیں ۔ محض سمجھنا ہی کافی
ہے ۔ آج کل بہت سے متشرقین ہیں ۔ جنہوں نے قرآن مجید کی بظاہر بڑی خدمت
بہت سے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں لیکن وہ صرف تحقیق برائے تحقیق ہے ۔ اُن کا م
نہیں ہے کہ وہ اس پر عمل کریں گے یا وہ سارے کے سارے قرآن مجید کی عظمت کے
ہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ بعض قائل ہوں لیکن ایمان نہیں لائیں گے ۔ اُن کا مقصد محض
کرنا ہے ۔ جس طرح علوم شرقیہ کی دوسری کتابوں کی تحقیق کر رہے ہیں اُسی طر
قرآن مجید کی بھی تحقیق کر رہے ہیں ۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دل و جان
قرآن مجید کی خدمت کر رہے ہیں ۔ تیسرا زینہ یہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھ کر
عمل کیا جائے ۔ اپنے اوپر، اپنے گھر والوں پر اپنی برادری پر، اپنے کنبہ پر اور اگر اللہ ا
اختیارات دے تو پورے ملک پر ۔ یعنی جس قدر بھی ممکن ہو سکے قرآن مجید کی تعلی
پھیلایا جائے اور نافذ کیا جائے ۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ یہ ہے کہ آپ
اس کو اپنے اوپر اپنے گھر والو پر جاری و نافذ کرتے ہیں تو یہ نعمت آپ کی ذا
محدود نہ رہے بلکہ اس کو پھیلایا جائے ۔ فرمایا: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَ
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۔ (سورۃ النحل ۔ آیت ۴۴) کہ جو ہم نے ذکر
کیا ہے اس کو آپؐ پھیلائیے ۔ جب تک کہ یہ سارے سلسلے اور سارے زینے ہم

کا یہ حال تھا کہ آپ عبادت کرتے تھے (حتیٰ تورمت قدماہ) - یہاں تک کہ آپؐ کے قدم
مبارک پر ورم آجاتا تھا - رات کو تہجد کی عبادت دیر دیر تک کرتے تھے - لمبے لمبے قیام
کرتے تھے - حضرت عائشہؓ نے ایک بار کہا - آپؐ کا اتنا بڑا درجہ ہے - آپؐ بخشے بخشائے
ہیں - آپؐ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں - آپؐ اتنی مشقت کیوں برداشت کرتے ہیں
تو فرمایا - [افلا اکون عبداً شکوراً] کیا میں اللہ تعالیٰ کا عبدِ شکور نہ ہوں
مجھ پر اتنے انعامات اور احسانات اللہ تعالیٰ نے کئے ہیں - کیا میں ان کا شکریہ ادا
نہ کروں - معلوم ہوتا ہے کہ جو جتنا اونچا ہوتا ہے - مراتب کے لحاظ سے، وہ اتنا ہی اللہ
تعالیٰ کے سامنے جھک جاتا ہے اتنا ہی عبادت میں اُس کا ذوق بڑھ جاتا ہے - اور جتنا
وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہوتا ہے - اُسی قدر شیطان کے پھندے میں پھنس کر اللہ تعالیٰ
کی عبادت سے محروم ہو جاتا ہے - قرآن مجید میں یقین کے معنیٰ ایک اور بھی آئے ہیں - سورۃ
مدثر میں آتا ہے کہ جب جہنمی جہنم میں چلے جائیں گے اور جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو
جنتی جہنمیوں سے سوال کریں گے - مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ - تمہیں جہنم میں کس چیز
نے دھکیل دیا - تم نے کیا کرتوت کئے تھے کہ جن کی بنا پر تم جہنم میں گئے - قَالُوا لَمْ نَكُ
مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۝ (سورۃ
مدثر - آیات ۴۲ تا ۴۷) انہوں نے کہا کہ ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نماز نہیں
پڑھتے تھے - نمازیوں میں ہمارا شمار نہیں تھا کیونکہ نماز ادا نہیں کرتے تھے - اور غریبوں
مسکینوں کو ہم کھانا بھی نہیں کھلاتے تھے اُن کی مدد بھی نہیں کرتے تھے اور گپ
شپ کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغول ہو جاتے تھے - اور ہم الدین یعنی یوم
جزاء کے منکر تھے - اور یہ سلسلہ ہمارا جاری رہا حتیٰ اتانا الیقین - یہاں تک کہ ہمیں
یقین آگیا - یہاں یقین کے معنی موت کے ہیں - یعنی آخری سانس تک ہمارا یہی عمل
رہا - یہاں یقین کے جو مشہور معنی ہیں وہ آپ نہیں لے سکتے - قرآن مجید کی اصطلاح
میں یقین کے معنیٰ موت کے بھی آتے ہیں کیونکہ موت سے زیادہ یقینی چیز اور کوئی
نہیں - بہت بڑا وصف موت کا یقین ہے - ہم روزانہ دیکھتے ہیں - آج اس کو کاندھا دے
رہے ہیں - آج اس کے ہاں تعزیت کے لئے جا رہے ہیں - آج وہاں سے خبر آئی ہے کہ
فلاں کا انتقال ہو گیا ہے - آخر یہ کیا ہے ؟ کوئی کتنا ہی عقل کا اندھا ہو بے شعور ہو لیکن یہ چیز ایسی ہے کہ

کی راہ اختیار کی۔ ضالین وہ ہیں جو بغیر علم کے غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ علم ہی حاصل نہیں کیا۔ نصاریٰ میں یہ وصف نمایاں ہیں۔ ان میں معاندین بھی ہوں گے لیکن زیادہ وہ ہیں جنہوں نے علم کے بغیر گمراہی کی راہ اختیار کی۔ اسی لئے نصاریٰ میں بدعات زیادہ پیدا ہوئیں۔ بدعات زیادہ وہاں پیدا ہوتی ہیں جہاں سرکشی اور عناد ہے وہاں بغاوت پیدا ہوتی ہے۔ بغاوت اور بدعت میں فرق ہے۔ بغاوت کے معنی ہیں دین سے نفرت اور بدعت وہ ہے جہاں بدعتی دین سے محبت رکھتا ہے۔ اتنی زیادہ محبت رکھتا ہے کہ پھر وہ دین کے معاملہ میں غلو کر جاتا ہے۔ اور اپنی طرف سے کچھ ایسے طریقے ایجاد کرتا ہے جن سے وہ چاہتا ہے کہ وہ اور آگے بڑھ جائے۔ اسی لئے قرآن مجید میں فرمایا:۔ وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔ کہ رہبانیت یعنی ترک دنیا کا طریقہ نصاریٰ نے اختیار کیا تھا۔ انہوں نے خود اس کو ایجاد کیا ہے۔ یہ بدعت ان کی طرف سے ہے۔ ہم نے یہ طریقہ ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ ہم نے یہ طریقہ اُن کو نہیں سمجھایا تھا۔ یہ اُن کی اپنی ایجاد ہے۔ تو یہ فرق ہے۔ مغضوب علیہم اور ضالین میں۔ اور ان دونوں کی تفسیر سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران میں آگئی۔ اسی طرح قرآن مجید میں آتا ہے۔ ایک اور مثال لیجئے۔ فرمایا:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ٥ (سورۃ الحجر آیت ۹۹)۔ اور اپنے رب کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین آجائے۔ اب یہاں پر لوگوں کو مغالطہ ہو گیا کہ یقین اپنے مشہور مفہوم میں مستعمل ہے۔ اب جب یقین آگیا تو نماز روزہ کی کیا ضرورت ہے۔ معلوم ہوا کہ ناظم آباد میں کوئی پیر صاحب تھے۔ انہوں نے اپنے مرید سے کہا کہ عبادت ہم نے کر لی اور عبادت کر کے اب ایسے مقام پر ہم پہنچ گئے ہیں کہ اُس کے بعد اب نماز روزہ کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص فوج کا سالارِ اعلیٰ بن جائے تو وہ تو پریڈ نہیں کرتا۔ پریڈ تو نیچے کے لوگ کرتے ہیں۔ پریڈ تو سپاہی کرتے ہیں۔ سالارِ اعظم یا کمانڈر انچیف تو پریڈ نہیں کرتا۔ وہ اس سے بالاتر ہو گیا۔ اسی طرح جب یقین آگیا ہے تو عبادت کے تم مکلف نہیں رہے ہو۔ یہ کتنا گمراہ کن عقیدہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسی زندگی میں غیر مکلف ہو گیا۔ اور عبادت کی زحمت سے اپنے آپ کو بچا لیا کیونکہ اسے وہ زحمت سمجھتا ہے حالانکہ رسول اکرمؐ

آپ کو نہیں مل سکے گا اور فہم قرآن میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے بلکہ مغالطہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ آتا ہے :۔ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (سورۃ عنکبوت آیت ۵۱) فرمایا۔ کیا ان کو کافی نہیں ہے کہ ہم نے ان پر کتاب اتاری ہے جس میں رحمت ہے اور نصیحت ہے مومنوں کے لیے۔ اب اس آیت کو ان لوگوں نے مغالطہ دینے کے لئے چن لیا ہے جو حدیث کو حجت نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہمارے لئے اس آیت کی رو سے قرآن کافی ہے۔ حدیث اور سنت کی کیا ضرورت ہے۔ ان مغالطوں کی باقاعدہ کتابوں اور رسالوں میں اشاعت ہو رہی ہے اور ان نوجوانوں کو جو قرآن مجید کو نہیں سمجھتے یا ان کا قرآن مجید سے تعلق نہیں رہا ہے، مغالطہ میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ اور ان کے ذہن میں یہ بٹھانے کی کوشش ہو رہی ہے کہ حدیث و سنت کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ قرآن خود کہہ رہا ہے کہ ہمارے لئے بس قرآن کافی ہے۔ لیکن آپ اگر یہ دیکھیں کہ اس کا سیاق و سباق کیا ہے۔ اس سے پہلے کیا ہے۔ کس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے جو اس سے پہلے یہ آتا ہے۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ اس نبی پر رب کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں نازل ہوتیں۔ ان کا مطالبہ معجزوں کے لئے تھا جس طرح حضرت موسیٰؑ کو معجزہ دیا گیا تھا کہ سمندر پھٹ گیا اور قافلہ گزر گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو معجزات دیئے گئے تھے جنہیں لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کس طرح کوڑھیوں کو اچھا کرتے ہیں اندھوں کو بینا بناتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح کے معجزات اور اس طرح کی نشانیاں رسول اکرمؐ کو کیوں نہیں دی گئیں۔ یہ تھا ان کا سوال ان آیات کو پھر پڑھیئے :۔ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ (سورۃ عنکبوت۔ آیات ۵۰ و ۵۱) فرمایا۔ یہ معجزے اور نشانیاں طلب کرتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو دیئے گئے۔ تو کیا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ان کے لئے کافی نہیں ہے جو ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے اور جو رحمت بھی

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَ
اس کے معنی ہوئے کہ اپنے رب کی عبادت کر آخری سانس تک یہاں تک
موت آ جائے۔ تو قرآن مجید کی ایک آیت کی تفسیر دوسری جگہ آئی۔ یا ایک
میں آ تا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ یعنی تمہیں
غافل کر دیا۔ یعنی کثرت میں مقابلہ آرائی نے اب یہ تکاثر کیا ہے ہم کس چیز
قرآن مجید نے اس بات کو یہاں نہیں چھیڑا ہے۔ سورۃ حدید میں فرمایا:۔
اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَا
بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ - (آیت ۲۰
وہاں اس کو کھول دیا کہ تکاثر زیادہ تر مال میں اور اولاد میں ہوتا ہے
آرائی اور فخر اس چیز میں ہوتا ہے کہ ہمارا جتھا بڑا ہے۔ ہمارے پاس غنڈے
اور لڑنے والے زیادہ ہیں جیسا کہ سورۃ کہف میں فرمایا:۔
فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَا
نَفَرًا ۝ (آیت ۳۴) سورۃ کہف میں ایک کافر اور ایک مومن کا مکالمہ
وہاں کافر کہتا ہے کہ میں تجھ سے مال میں زیادہ ہوں اور میری جمعیت اور
قوی ہے۔ اس طرح قرآن مجید میں ایک جگہ اجمال ہے اور اس کی تفسیر دو
یہاں تفصیل میں جانے کا وقت نہیں صرف چند اشارات کر دیتے ہیں۔ جی
اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی نہیں کہ آپ کہیں
آیت لے لیں اور یہ سمجھیں کہ بس ہم نے قرآن مجید کو سمجھ لیا ہے بلکہ قرآن مجی
پورے قرآن مجید پر نگاہ ڈال جاتی ہے اور ایک آیت کی تفسیر دوسری جگہ

فہم قرآن کا دوسرا ذریعہ ۷

قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے
اس کا سیاق و سباق ہے۔ ت
آگے پیچھے کی عبارت اور آیات سے بھی مطلب حل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی
نے کوئی ایک آیت لے لی اور نہ سیاق دیکھا نہ سباق۔ سباق کے معنی
آیات میں کیا ہے اور سیاق کے معنی کہ بعد کی آیات میں کیا ہے۔ سیاق
بے پرواہ ہو کر اگر آپ قرآن مجید میں غور کرتے ہیں تو اس سے قرآن م

کے خلاف ہے۔ صلوٰۃ وسلام اپنی جگہ ہے۔ آپ اسے پڑھنا چاہیں پڑھیئے۔ لیکن اذان سے قبل یا اذان کے بعد بلند آواز سے تو نہیں پڑھنا چاہیئے۔ پنجاب کے ایک شہر کا ایک قصہ ہے۔ وہاں ایک باپ نے بچی سے پوچھا۔ اذان سناؤ۔ اُس نے کہا۔ السلام علیک یا رسول اللہ، السلام علیک یا رسول اللہ۔ چونکہ وہ روز اذان سے قبل یہ سنتی تھی، اُس نے اسی کو نقل کر دیا، حقیقت یہ ہے کہ اس طرح ہم آہستہ آہستہ سُنّت سے بیگانہ ہو کر بدعات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اذان، نماز کی رکعات کی تعداد تعامل اُمت سے ثابت ہیں۔ پانچ کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا ہے لیکن اُمت کا پورا تعامل ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہے۔ ہاں منکرین حدیث میں سے بعض نے کہا تین وقت، کسی نے کہا دو وقت، کسی نے کہا ایک وقت، کسی نے کچھ اور بھی کہا ہے، یہ الگ مضمون ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تعامل کا جو انکار کرتا ہے وہ قرآن مجید کا منکر ہے۔ تعامل حدیث کی کتابوں میں موجود ہے اُمت کے تعامل سے احادیث کے مضمون کی تائید ہو جاتی ہے اس طرح دونوں کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید کے فہم کا یہ تیسرا ذریعہ ہے ورنہ آپ حج کیسے کریں گے؟ حج نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے کیا ہے۔ جزئیات میں اختلاف ہے۔ لیکن جو بنیادی اور اہم چیزیں ہیں مثلاً طواف سعی احرام اُن میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

فہم قرآن کا چوتھا ذریعہ

اس کے بعد فہم قرآن کا چوتھا ذریعہ ہے اخبار آحاد۔ یعنی وہ احادیث جن کا درجہ تواتر کا نہیں ہے لیکن وہ صحیح روایات ہیں۔ ثقہ راویوں سے وہ روایات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان روایات کی بنیاد پر ہم یہ کہیں گے کہ اگر قرآن مجید کی کسی آیت کا مطلب ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔ جو سیاق وسباق، کسی دوسری آیت یا تعامل اُمت سے ہم نہیں سمجھ سکے ہیں۔ تو پھر ہم نبی اکرمؐ کی ثابت شدہ سُنّت کی طرف رجوع کریں گے۔ ثقہ راویوں سے جو چیز ہمیں حاصل ہوئی ہو اُس کی مدد سے ہم قرآن مجید کو سمجھیں گے، اب مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (سورۃ توبہ آیت ۳۴) جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ہیں اُن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ صحابہ کرامؓ تو اہل زبان تھے۔ جب انہوں نے یہ آیت سنی تو پریشان

ہے اور نصیحت بھی ۔ یہ زندہ معجزہ ہے قیامت تک کیلئے معجزہ ہے ۔ آخر اس
کے ہوتے ہوئے پھر وہ کہتے ہیں کہ ایسے معجزے دکھاؤ جیسے کہ دوسرے انبیاء کرام
یہاں وہ بات بنتی نہیں ہے جو منکرین حدیث بنانا چاہتے ہیں ۔ یہاں نہ حدیث
کا سوال ہے نہ اس کے عدم حجیت کا معاملہ ہے ۔ یہاں جو اُن کا اصلی سوال
تھا کہ محسوس معجزات دکھاؤ، اُس کو رد کیا گیا ہے ۔ تو معلوم یہ ہوا کہ قرآن مجید
کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کا سیاق و سباق بھی ہمارے
رہے ۔ لیکن اگر وہ سامنے نہیں رہتا تو ایسی صورت میں یہ عین ممکن ہے کہ ہم غلط
پر چلے جائیں ۔ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی مثالیں ہو سکتی ہیں لیکن اس
میں ایک ہی مثال پر اکتفا کروں گا ۔

قرآن فہمی کا تیسرا ذریعہ

قرآن فہمی کے لئے تیسرا ذریعہ تعامل اُمت ہے ۔ یعنی پوری اُمت کا جو
چلا آ رہا ہے وہ بھی قرآن مجید کے فہم میں معاون ہے ۔ اگر تعامل امت کو آپ ا
کر دیں تو پھر ایسی صورت میں قرآن مجید کا فہم حاصل نہیں ہو سکتا تعامل سے
عہد نبوی سے لیکر صحابہؓ کے دور میں، تابعین کے دور میں، محدثین اور فقہاء کے
مفسرین کے دور سے لے کر اب تک جو بات لوگوں میں دین کے نام سے رائج ہ
ہے وہ قرآن کے لئے بہترین تفسیر ہے ۔ یہ نہیں کہ ساتویں صدی ہجری سے لے
تک جو رسم و رواج اور بدعات رائج ہو گئیں ۔ اُن کو ہم تعامل امت کہہ دیں
تعامل اُمت نہیں کہلائی جا سکتیں ۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے ۔ اقیموا الصلٰوۃ
نماز قائم کرو ۔ اب یہ نماز کس طرح قائم کریں ۔ کتنی رکعات ظہر کی ہیں کتنی عصر کی
یہ تعامل ہے ۔ یہ تواتر سے اس کا انکار ایسے ہی ہے جیسے قرآن مجید کا انکار جس
قرآن مجید تواتر سے ثابت ہے اُسی طرح نماز کی رکعات بھی ۔ ایک مرتبہ میں یہ
بیان کر رہا تھا تو میری زبان سے غلطی سے عصر کی تین رکعتیں نکل گئیں ۔ فوراً آو
چار رکعتیں ۔ چار رکعتیں ۔ میں نے کہا کہ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ یہ کتنا مشہور
ہے ۔ اذان میں کوئی شخص کوئی لفظ بڑھاتا ہے کم کرتا ہے تو وہ معلوم ہو جاتا
نے اذان کے آگے پیچھے کچھ بڑھانا شروع کر دیا ہے ۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے ۔ یہ تو

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یُوصِیکُمُ اللّٰہُ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔ (سورۂ نساء آیت ۱۱)

یہاں پر کوئی تمہید نہیں ہے کیسی اولاد ہو۔ لیکن حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ "لا یرث القاتل" کہ بیٹے نے اگر باپ کو قتل کر دیا تو وارث نہیں ہوگا۔ حدیث نے یہ مفہوم بیان کر دیا کہ اختلاف دین ہونے کی بنا پر یا قاتل ہونے کی بنا پر وہ اپنے باپ کا وارث نہیں ہو سکتا۔ یا جیسے قرآن مجید میں آتا ہے۔ قرآن مجید میں صرف اشارہ ہے لیکن حدیث میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس آیت کے کیا معنیٰ ہیں۔ قرآن مجید میں محرمات ابدیہ کا بیان ہوا ہے۔ مائیں حرام ہیں۔ بیٹیاں حرام ہیں، بہنیں حرام ہیں۔ یہی آیت ہے اور اس کے بعد فرمایا کہ اس کے علاوہ تمہارے لئے حلال ہے۔ لیکن رسول اکرم ﷺ نے فرمایا۔ آپ کا اجتہاد بھی وحی کی روشنی میں تھا۔ آپ نے فرمایا: لا یجمع بین المرأۃ وعمتہا وبین المرأۃ وخالتہا۔ کہ پھوپھی اور بھتیجی خالہ اور بھانجی کو بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں رکھنا حرام ٹھیرایا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے۔ ان تجمعوا بین الاختین۔ دو بہنوں کا جمع کرنا حرام ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے کہ جب دو سگی بہنیں سوکنیں بن جائیں گی تو سوکن کے رشتہ میں ایک قسم کی رقابت ہوتی ہے عداوت ہوتی ہے۔ اور بہنیں ہونے کا رشتہ یہ چاہتا ہے کہ دونوں میں محبت ہو۔ گویا اس طرح سے دونوں میں قطع تعلق ہو جائے گا۔ اسی لئے ایک حدیث میں ہے ابن حبان کی روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:۔ اذا فعلتم ذالک قطعتم ارحامکم ہ

کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم اپنے رشتوں کو کاٹ ڈالو گے۔ دو بہنوں میں محبت ہوتی ہے وہ نہیں رہے گی۔ ٹھیک اسی طرح پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی ان کا قریبی رشتہ ہے۔ دونوں میں محبت ہے۔ یہ فطری چیز ہے اب اگر دونوں بیک وقت ایک شخص کے نکاح میں ہوں گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ دونوں سوکنیں بن جائیں گے آپس میں رقابت اور عداوت پیدا ہو گی۔ اور اُن کی محبت نفرت میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ حکیمانہ تعبیر حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ اس قسم کی روایات کو اگر آپ تسلیم نہیں کریں گے تو اسلامی نظام قائم نہیں ہوگا۔ قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے

ہو گئے - کنز کے معنی جمع کرنے کے ہیں خواہ تھوڑا مال ہو یا زیادہ اُنہوں نے کہا ا
ہم میں سے کون ہے جس کے پاس کنز نہیں ہے - تھوڑا بہت تو سونا چاندی تقریبًا
کے پاس ہے - اب کیا عذاب جہنم کی سب کے لئے بشارت ہے ؟ حضرت عمرؓ
میں رسُول اکرمؐ کی خدمت میں جاتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ اس کا کیا مطلب
ابوداؤد کی روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا - ما أدی منہ زکواۃ فلیس
جس مال میں سے زکواۃ نکال دی جائے - شریعت کے مطابق غریبوں کا حق د
وہ کنز نہیں رہتا - اب یہاں اگر آپ لغت کے لحاظ سے دیکھیں گے تو کنز بن
خواہ تھوڑا مال ہو یا زیادہ - لیکن رسُول اکرمؐ نے اس کی تشریح کر دی اور ایک
حدیث میں آتا ہے آپؐ نے فرمایا : اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یفرض الزکواۃ الا لیطیب
ما بقی من اموالکم - اللہ تعالیٰ نے زکواۃ اس لئے فرض کی ہے تاکہ اللہ تو
باقی ماندہ مال کو پاک کر دے - زکواۃ نکالنے کے بعد جو مال بچے گا وہ مال پاک ہوگا
ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے سُنّت اور حدیث کے
ہیں - منکرین حدیث یہ کہہ دیتے ہیں کہ کیا قرآن ناقص ہے ؟ کیا قرآن اد
جو ہم سُنّت کو مانیں - کیا ہمارے لئے قرآن کافی نہیں ہے ؟ تو اس کا جواب یہ
قرآن مجید تو اپنے مطالب میں ناقص اور نادھوار نہیں ہے لیکن ہم اس کو سمجھ
سُنّت کے محتاج ہیں - جس طرح کہ ہم عربی زبان کے محتاج ہیں - کیا کوئی صاح
سمجھتے ہیں کہ بغیر عربی زبان جانے وہ قرآن مجید سمجھ جائیں گے - قرآن مجید عربی
میں ہے تو عربی زبان بھی سمجھیں اس کے معنی یہ نہیں کہ چونکہ آپ عربی زبان کے
ہیں اس لئے قرآن مجید ناقص ہے - قرآن مجید محتاج نہیں، ہم عربی زبان کے محتا
اس طرح ہم محتاج ہیں رسُول اکرمؐ کی تشریح و تفسیر کے کہ جس ہستی پر قرآن مج
ہوا تھا - اس ہستیؐ نے اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا - اگر ہم اس سے بے نہ
جاتے ہیں اور اپنی طرف سے مطلب بیان کرتے ہیں تو حقیقت میں ہم سیدھے
سے بھٹک جاتے ہیں اور قرآن مجید کا جو اصل مقصد ہے کہ لتخرج الناس
الظلمٰت الی النور - کہ بجائے ظلمات سے نکلنے کے ہم ظلمات ہی میں ڈ
رہیں گے کہ ایک تاریکی سے نکلیں گے دوسری تاریکی میں چلے جائیں گے - اسی

طرح جھوٹ بول دیں گے کیونکہ انہیں جھوٹ بولنے کی عادت رہی ہے ۔ لیکن اس کے بعد پھر یہ ہوگا کہ :۔ اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ه اللہ تعالیٰ مہر لگا دیں گے ۔جب مہر لگ جائے گی تو یہ اعضاء وجوارح گواہی دیں گے ۔ منہ بند، زبان بند، مہر لگ گئی ۔ اب یہ اعضاء جوارح یہ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان گواہی دیں گے ۔ کہ کیا دیکھا تھا، ہاتھوں سے کیا پکڑا تھا ۔ قدم کہاں کہاں بڑھائے تھے ، اُس وقت کوئی بات نہیں چھپائی جا سکے گی ۔ تو یہ دو مرحلے اور دو وقت ہیں ۔ اب یہ ایک صحابیؓ کی تفسیر ہے ۔ ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ لوگ حدیث میں اتنے مشغول ہو گئے ہیں کہ قرآن بھول گئے اور قرآن سے تعلق کم ہو گیا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود محدثین نے جو خدمت کی ہے وہ تو قرآن مجید کی خدمت ہے اب یہی دیکھئے کہ سائل نے چار آیات پیش کیں اور ان سب کا جواب عبداللہ ابن عباسؓ دیتے ہیں امام بخاریؒ اس کو تفسیر سورہ حم سجدہ میں نقل کرتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث جو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں ۔ وہ حقیقت میں قرآن مجید سے قریب ہوتے ہیں نہ کہ دور ۔ اسی طرح ایک اور تفسیر سُنئے ۔ آج کل جو غلط ماحول چل رہا ہے اُس میں شاید یہ تفسیر نہایت اچنبھے سے سُنی جائے ۔ لیکن بہرحال ایک حق بات ہے اُس کو صاف کہہ دینا چاہیئے ۔ قرآن مجید میں آتا ہے : وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ۔ کہ لوگوں میں سے وہ ہیں جو خریدتے ہیں لھو الحدیث یعنی ایسی باتیں جو لھو ہیں ۔ لھو کیا چیز ہے ۔ کُلّ کلام یُلہی عن ذکر اللہ ۔ ہر وہ کلام جو اللہ کے ذکر سے غافل کر دے ۔ وہ لھو الحدیث ۔ اس کی تفسیر عبداللہ ابن مسعودؓ کرتے ہیں ۔ ترمذی کی روایت ہے ۔ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں ۔ وَاللّٰهِ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ قسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ لہو الحدیث کیا ہے ۔ اس کا بڑا مصداق کیا ہے ۔ الغِنا ۔ یہ ناچ گانے، یہ گانے بجانے ۔ اس کا وہی نشہ ہے جو شراب کا ہوتا ہے اور دوسرے صحابی ان کی تفسیر کرتے ہیں ۔ الغِنا ینبت النفاق ۔ غنا دل میں نفاق پیدا کرتا ہے ۔ یعنی انسان اس طرح مست ہو جاتا ہے کہ اُسے نہ قرآن میں لذت حاصل ہوتی ہے ۔ بس وہ چاہتا ہے کہ ریڈیو ٹی وی اور دوسرے ذرائع سے اچھے گلے رکھنے والے مُغنّی اور مغنیات کا گانا سُنتا رہے ۔ اس کو اُس میں لطف آتا ہے ۔ اسی میں اسے لذت محسوس ہوتی ہے ۔ حضرت

اخبار و احاد یعنی وہ روائتیں جن کے بیان کرنے والے ایک یا دو یا تین ثقہ راوی
ایسی صحیح روایات کو بھی قرآن فہمی میں دخل ہے اور ان کے بغیر ہم قرآن مجید کو ن
سکتے - اور بھی بہت سی مثالیں ہیں لیکن وقت چونکہ کافی ہو رہا ہے اس لیئے بہ
سے کام لے رہا ہوں -

قرآن فہمی کا پانچواں ذریعہ

اس کے بعد ایک ذریعہ ہے کا صحابہ کرام رضؓ کے اقوال. خاص
ابن مسعودؓ عبداللہ ابن عباسؓ ابی ابن کعبؓ یہ لوگ جنہوں نے قرآن مجید کی تعا
ہے - ان کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا ہے - لہٰذا ان کی تفسیر کو مانا جائے گا - اگر
میں اختلاف ہو تو جو قول قرآن مجید سے زیادہ قریب ہو اُس کو لیا جائے گا -
ہے - اس کی مثال لیجئے - امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں نقل کیا ہے - کہ ایک شخص
عبداللہ ابن عباسؓ کے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں اور اس
میں تعارض پایا جاتا ہے ٹکراؤ اور تصادم پایا جاتا ہے - ایک جگہ ہاں ہے ایک
ہے تو وہاں ہم کیا کریں - انہوںؓ نے کہا کہ بتاؤ وہ کون سی آیات ہیں تاکہ میں بھی
تمہارے ذہن میں کیا خلجان ہے. - سائل نے کہا کہ قرآن مجید میں ایک جگہ آتا ہے کہ
کے دن جب مشرکین پہنچیں گے - جب قیامت قائم ہوگی تو وہ اللہ تعالیٰ کے
جا کر کہیں گے - وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (سُوْرَةُ الانعام) قسم خدا کی
مشرک نہیں تھے - ہم نے تو شرک نہیں کیا - وہ انکار کریں گے یعنی اس طرح وہ
کو چھپائیں گے - دنیا کے جیسے رشوت خور کرتے ہیں - کہتے ہیں کہ ہم نے تو رشوت
اور دوسری آیت میں آتا ہے وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا - اور وہ اللہ تعالیٰ
کوئی بات نہیں چھپا سکیں گے - یہاں تعارض ہو گیا - کہ مشرکین نے چھپایا تو ہے
پہلی آیت میں ہے اور دوسری آیت میں آتا ہے کہ وہ چھپا نہیں سکیں گے -
کیا مطلب ہے - اس وقت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ ایک وقت میں
وقت میں ہے - شروع میں جا کر تو کفار یہ سمجھیں گے کہ یہ دربار بھی ہمارے دنیا
اور بادشاہوں کی طرح ہے - اگر ہم یہاں جھوٹ بول دیں اور کچھ چھپا لیں تو ہو
کہ کام چل جائے - اس بنا پر وہ کہیں گے کہ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ -

رآن میں آتا ہے۔ اذا ضربوا فی الارض اور عصا کے معنی جماعت کے بھی آتے
ں جیسا کہ حدیث میں آتا ہے "شق عصا المسلمین" یہاں عصا کے معنی جماعت کے
ں۔ تو جماعت بھی انہوں نے لغت سے ثابت کر دیا اور ضرب کے معنی بھی عربی لغت
سے ثابت ہوگئے حجر کے معنی پتھر کے ہیں یعنی پہاڑ مراد ہے اس سے۔ پتھروں کا مجموعہ
پہاڑ ہوتا ہے۔ قادیانی اور اسی قسم کے لوگ چونکہ حدیث کے منکر ہیں اس لئے انہوں
نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ "اے موسیٰؑ اپنی جماعت کو پہاڑ پر لے جاؤ۔ پہاڑ کا سفر
راؤ۔ پہاڑ کی سیر کراؤ۔ حالانکہ عربی قاعدہ سے دیکھا جائے تو یہ ترجمہ غلط ہوگا۔ اگر
تھوڑی سی عربی آتی ہو تو ایسا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ فاضرب بعصاک الحجر۔ ضرب
کے بعد اگر "فی" آئے تو اس کے معنی سفر کے آتے ہیں اگر "فی" نہ آئے تب اس کے معنی
پیٹنے کے نہیں آتے۔ سفر کرنے کے نہیں آتے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی آیا ہے۔
ضرب فی الارض۔ ضربوا فی الارض۔ جہاں کہیں بھی چلنے اور سفر کرنے کے معنی
ں آیا ہے وہاں اس کے بعد "فی" آیا ہے۔ یہاں چونکہ "فی" نہیں آیا اس لئے یہاں
سفر کرنے کے معنی نہیں ہو سکتے۔ لغت اور عربی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر یہ
ترجمہ کیا گیا ہے۔ اس لئے عربی جاننا ضروری ہے۔ کم سے کم اتنی عربی تو آئے تاکہ قرآن مجید
سمجھ سکیں۔ ترجمہ کی مثال اس طرح سمجھئے کہ ایک چیز تو ہوتی ہے لسی اور ایک ہوتا
ہے خالص دودھ۔ تو خالص دودھ میں جو مزہ ہوتا ہے وہ لسی میں نہیں ہے ترجمہ
ترجمہ ہے۔ ترجمہ کے اندر بھی مترجم کا کچھ نہ کچھ تخیل آجاتا ہے۔ اس کے کچھ خیالات ہوتے
ہیں۔ کچھ جذبات ہوتے ہیں جو اس میں آجاتے ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ عربی زبان کی
التوں سے واقفیت ہو تو پھر قرآن مجید کا فہم، اس کی حلاوت، اس کا مٹھاس اور
اس کی شیرینی سے لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ ورنہ ترجمہ سے صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے
کہ حلال کیا ہے، حرام کیا ہے اللہ تعالیٰ کو کیا چیز پسند ہے کیا ناپسند ہے۔ میں سمجھتا ہوں
کہ جو بوڑھے بوڑھے لوگ ہیں وہ عربی کیا پڑھیں گے لیکن جو نوجوان ہیں ان کو سوچنا
چاہیئے کہ عربی زبان سیکھیں۔ جتنا وقت وہ اپنی معاش میں لگاتے اور دوسرے کاموں
میں صرف کرتے ہیں اس میں روزانہ یا ہفتہ میں کم از کم دو تین گھنٹے عربی زبان سیکھنے کیلئے
نکالیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو حقیقت میں وہ قرآن مجید کے اور قریب ہو جائیں گے۔

عبداللہ ابن مسعود رضؓ نے لھو کی تفسیر غنا سے کی ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ
فہم کے لئے صحابۂ کرام کی تفسیر بھی قابلِ اعتماد ہے - بہت سے وہ مقامات جو ہمارے
میں ان کو انہوں رضؓ نے حل کیا ہے - کیوں کہ اُنؓ کے سامنے قرآن مجید نازل ہوا اور
تھے کہ رسُول اکرمؐ نے کیا تفسیر کی ہے - اور انہیںؓ کس طرح سمجھایا ہے -

اس کے بعد تابعینؒ کے اقوال ہیں - جو صحابہؓ کے شاگرد تھے - قتادہؒ بھی
تابعین ہیں - اُن کے اقوال کو بھی دیکھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کہا ہے - تفسیر با
کوئی کرتا ہے تو اس سے قرآن مجید نعوذ باللہ بازیچۂ اطفال بن جائے گا - جیسے
نے تفسیر کی تھی - یا یہا الذین امنوا اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسُول و او
الامر منکم - اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرسول سے مراد انہوں نے مرکز
لیا - یعنی وہ حکومت جو اللہ تعالیٰ کے نظامِ ربوبیت کو چلانے کے لئے قائم ہو
سے مراد انہوں نے تھانیدار وغیرہ کو لیا - اس طرح آدمی اپنے ذہن سے جو کچھ
غلط سلط بیٹھ کیا ہے اس کے مطابق اپنی طرف سے تفسیر کرتا ہے اور قرآن مجید
ہو جاتا ہے -

قرآن فہمی کا چھٹا ذریعہ

ذریعہ قرآن مجید کے فہم کے لئے عربی
ہے - عربی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے
زبان نہیں جانتے لیکن قرآن مجید کے مفسرین جانتے ہیں - ایسے لوگ ہیں بلا
پاکستان میں ہندوستان میں پائے جاتے ہیں کہ وہ عربی نہیں جانتے لیکن ا
یا اُردو ترجمہ دیکھ کر تھوڑی سی ذہانت کی بنا پر مفسر قرآن بن گئے - یہ انتہائی
ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر آدمی بیان کرتا ہو لیکن عربی زبان سے نا بلد ہو - زبا
پیدا کرو - یہ میں نہیں کہتا کہ سارے علامہ بن جائیں لیکن جب تفسیر لکھنے
تفسیر کوئی بیان کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس نے اس عربی زبان کو
کچھ وقت لگایا ہو - اس کی مثالیں ملتی ہیں - مثلاً ایک تفسیر قادیانیوں نے کی ہے
کہ خلیفہ نورالدین نے بھی کی ہے - میں سمجھتا ہوں کہ یہ تفسیر معاندانہ ہے - جاہلا
"فاضرب بعصاک الحجر" کے معنی یہ ہیں کہ اے موسیٰ تم سے لے جا ڈاپنی؟
کو پہاڑ پر - ضرب کے معنی مارنے کے آتے ہیں - اس کے معنی سفر کرنے کے بھی آتے

ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی - یہ کیوں فرمایا گیا کہ ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی - آخر اس کی کیا وجہ ہے - کون ہے مسلمان جو ایسا سمجھے بلکہ یہ مشرکین کا بھی عقیدہ نہیں تھا کہ اللہ میاں تھک جاتے ہیں - لیکن جب تورات دیکھی - کتاب پیدائش میں لکھا ہوا ہے - اس میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ میاں نے چھ دن میں آسمان اور زمین بنائے اور ساتویں دن آرام کیا - تو قرآن مجید نے کہا کہ ہمیں کوئی تھکاوٹ نہیں ہوئی - اگر تورات کا بیان سامنے ہو تو وَمَا مَسَّنَا مِنۡ لُّغُوۡبٍ کے سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے - افسوس ہوتا ہے کہ اللہ میاں کی طرف انہوں نے کیسی صفت منسوب کر دی۔ اسی طرح سورۃ والشمس میں آتا ہے - فَدَمۡدَمَ عَلَيۡهِمۡ رَبُّهُمۡ بِذَنۡۢبِهِمۡ فَسَوّٰٮهَا وَلَا يَخَافُ عُقۡبٰهَا ۝ (آیت ۱۵) قوم ثمود کو اللہ تعالٰی کے عذاب نے تباہ کر دیا اور اللہ تعالٰی کسی کے انجام کا خوف نہیں رکھتا - اُس نے تباہ کر دیا ہے - اُسے کوئی خوف نہیں ہے - کوئی ڈر نہیں کہ کیوں تباہ کیا ہے - یہ اس وجہ سے فرمایا کہ تورات میں یہ ہے - کتاب الخروج میں لکھا ہے کہ قومِ ثمود کو تباہ کرنے کے بعد اللہ میاں پچھتائے - یعنی خدا پچھتایا - افسوس ہوا نادم ہوا - اس لئے قرآن مجید میں فرمایا - اللہ تعالٰی نے قوم ثمود کو اس کے گناہوں کی وجہ سے تباہ کر دیا - اُس کے انجام سے اللہ تعالٰی کو کوئی خوف نہیں - پچھتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - وہ تو قادرِ مطلق ہے - اُس کو انسانوں پر قیاس کیوں کرتے ہو یہ مختلف ذرائع ہیں جن کی بنا پر ہم قرآن مجید کو سمجھ سکتے ہیں غور کر سکتے ہیں اس میں جو موٹی موٹی چیزیں ہیں وہ تو ابتدائی ہیں - وہ تو لازمی ہیں کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید سے حدیث سے اور پھر لغت سے - اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ لغت کافی نہیں ہے کہ سنت کو آپ چھوڑ و بیٹھیں محض لغت کو لے بیٹھیں - قاموس یا المنجد کو لے کر بیٹھ جائیں کہ قرآن کو حل کر لیں گے یہ بھی غلط ہے - بہت سے کلمات ایسے ہیں - بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ جن کی تشریح شارح نے کی ہے - لغت میں اس کے کچھ اور معنی ہیں - اب لغت میں صلوٰۃ کے معنیٰ دُعا کے آتے ہیں - لیکن صلوٰۃ صرف دُعا تو نہیں ہے - صلوٰۃ ایک خاص اصطلاح ہے دین کی - حج کے معنی عربی زبان میں قصد کرنے کے آتے ہیں - لیکن شریعت میں اس اصطلاح کے ایک خاص معنیٰ ہیں - یہ ایک عبارت ہے

اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ لوگوں نے غلط انداز اختیار کیا ہے لیکن میں اسی
اکتفا کرتا ہوں۔

عربوں کے تمدّن اور اُن کی عادات سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ جس ماحو
میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اُس سے بھی ہم باخبر ہوں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَيْسَ
الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَأْتُوا الْبُيُوتَ
مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم مکا
کے پچھواڑے سے آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ تم دروازہ سے داخل ہو۔ اب اس سے کیا
جائے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ کیوں فرمایا گیا ہے۔ یہ اُن کی عادت تھی کہ جب
طواف کرنے جاتے تھے اور طواف کر کے واپس آتے تھے تو جس دروازے سے جا
تھے اُس سے واپس نہیں آتے تھے مقصد اُن کا یہ مقصد تھا کہ طواف کرنے کے بعد ا
پاک ہو گئے ہیں اس لئے اُس ناپاک دروازے سے داخل نہیں ہوں گے بلکہ پچھواڑ
سے داخل ہوں گے۔ اب اگر ہمیں اُن کی یہ عادت معلوم ہے تو قرآن مجید کا بیان سمجھ
میں آجاتا ہے۔ قرآن مجید نے نیکی کے اس تصوّر کی تردید کی ہے کہ اگلے دروازہ
نہ آیا جائے بلکہ پچھواڑے سے آیا جائے۔ یہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ نیکی تو تقویٰ کا نام
تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ کا خوف اختیار کرو۔

اسی طرح قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے کتب سماوی بھی معاون ہوتی ہیں۔ اگر
یہ ایک بڑا لمبا معاملہ ہے۔ لیکن جو لوگ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھیں تو ایسی تف
جس میں موازنہ کیا گیا ہو۔ وبضدّها تتبيّن الاشياء ضد سے اشیا کی حقی
ظاہر ہوتی ہے۔ نور کی قدر ظلمت سے ہوتی ہے۔ جب بجلی چلی جاتی ہے تو روشنی
قدر ہوتی ہے جب بجلی آجاتی ہے تو روشن ہو جاتی ہے اور خوشی ہوتی ہے۔ اسی
پر بائبل اور تورات میں جو چیزیں ہیں انہیں سامنے رکھیں پھر قرآن مجید پڑھیں
تو کہیں زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔ اور بعض الفاظ کے اضافہ کی قدر معلوم ہوتی
مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا
فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝ (سورۃ قٓ۔ آیت ۳۸) کہ ہم
پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے۔ چھ دنوں میں۔ ا

مَنْ يَّشْتَرِیْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۝ (آیت ۶)

(ترجمہ ایک منکرِ حدیث نے اس طرح کیا ہے کہ لوگوں میں سے وہ ہیں جو خریدتے ہیں حدیث کے مشغلے ہو دماغ میں پہلے سے خیال سمایا ہوا ہے لھوا لحدیث سے وہی مراد لے لیا۔ حالانکہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ لہوا لحدیث کے معنی ہیں ہر وہ کام ہر وہ بات جو اللہ کے ذکر سے غافل کرنے والی ہو۔ اور یہ بھی واضح رہے کہ لفظ حدیث جو قرآن مجید میں آیا ہے اس کے معنیٰ بات کے، کلام کے ہیں۔ اب یہ کلام اللہ تعالیٰ کا بھی ہو سکتا ہے اور رسول اکرمؐ کا بھی ہو سکتا ہے۔ کلام صحابہؓ اور مومنین کا بھی ہو سکتا ہے اور یہ کلام کا فروں، مشرکوں اور منافقوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں لغوی معنی مراد ہیں حدیث کے، شرعی معنی مراد نہیں ہیں۔ شرعی معنیٰ اور ہیں، اصطلاحی معنیٰ اور ہیں۔ اور لغت میں اور ہیں۔ قرآن مجید میں جو حدیث کا لفظ آیا ہے وہ لغت کے لحاظ سے آیا ہے، اس سے حدیث رسول مراد نہیں ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۔ (سورۃ زمر۔ آیت ۲۳) اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے احسن الحدیث۔ یعنی بہترین۔ حدیث۔ یہاں قرآن مجید مراد ہے۔ یعنی تمام کلاموں میں بہترین کلام۔ یا جیسے قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِیْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (سورہ یوسف آیت ۱۱۱) حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ بات جو ہم نے بیان کی ہے کوئی گھڑی ہوئی نہیں ہے۔ کوئی افترا نہیں ہے۔ اسی طرح فرمایا سورۃ کہف کے شروع میں: فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝ (آیت ۶) کہ اے نبیؐ! تم اپنے آپ کو ہلاک کر دو گے اس افسوس میں کہ یہ لوگ اس حدیث پر ایمان نہیں لاتے۔ یہاں حدیث سے مراد کیا ہے؟ قرآن مجید۔ کلام اللہ کو بھی حدیث کہتے ہیں اسی طرح رسول اکرمؐ کی بات کو بھی قرآن مجید میں حدیث کہا گیا ہے۔ سورۃ تحریم میں فرمایا:۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ط (آیت ۳) کہ جب کہ نبی اکرمؐ نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔ صحابہ کرامؓ کی بات کو اور مومنین کی بات کو بھی حدیث کہا گیا ہے۔ سورۃ

اس کے خاص آداب، خاص شرائط اور خاص تعریف ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح صوم ہے۔ صوم۔ صبر کے معنی میں آتا ہے لیکن شریعت کے اندر اس کے کچھ اور معنیٰ ہیں۔ لہٰذا بہت سے الفاظ شریعت کے ایسے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لئے لغت کافی نہیں ہے۔ لیکن بہرحال بہت سے الفاظ قرآن مجید میں ایسے بھی ہیں کہ جن کے لئے ہمیں لغت کی ضرورت پڑتی ہے نیز جاہلیت کے اشعار کی مدد سے بھی ہم قرآن مجید سمجھ سکتے ہیں۔

قرآن فہمی کی راہ کے موانع کچھ موانع اور رکاوٹیں ہیں جو قرآن فہمی میں رکاوٹ بن سکتی ہیں۔ ان میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ انسان ایک خیال اپنے دل میں جما لیتا ہے اور پھر قرآن مجید کا مطالعہ کرتا ہے کہ میں نے جو خیال اپنے دل میں جما لیا ہے۔ یا کسی قوم سے چرا لیا ہے یا اُس کی نقالی کی ہے۔ وہ خیال۔ وہ نظریہ، وہ فکر اب میں قرآن مجید سے ثابت کروں حالانکہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ضروری یہ ہے کہ انسان خالی الذھن ہو کر پڑھے کہ اس مسئلہ میں قرآن مجید کیا رہنمائی دیتا ہے۔ تب تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ورنہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک اشتراکی ذہن ہے اب وہ اگر قرآن مجید پڑھے گا تو کوشش یہ کرے گا کہ یہ جگہ وہ ایسی آیت ڈھونڈے یا ایسا معنی بیان کرے کہ جس سے انفرادی ملکیت کی نفی ہو اور قومی ملکیت ثابت ہو۔ یا ایک سرمایہ دار یا بہت بڑا جاگیردار ہے اُس کی خواہش یہ ہوگی کہ میں ایسی آیتیں تلاش کروں اور ایسا مطلب نکالوں کہ جس سے سُود بھی جائز ہو جائے ساری چیزیں جائز ہو جائیں۔ حرام بھی حلال ہو جائے۔ یہ بہا انتہائی خطرناک ہے۔ اس طریقہ کی بنا پر قرآن مجید سے دُور ہو جائیں گے۔ ایک مثال یہ ہے کہ جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن ہی کافی ہے اب جب وہ قرآن مجید پڑھتے ہیں تو ہر جگہ انہیں نظر آتا ہے کہ حدیث حجّت نہیں ہے ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں انہوں نے کتاب لکھی "مقام حدیث"۔ اُس میں لکھا فبای حدیث بعدہٗ یومنون۔ اس کا ترجمہ کیا۔ کس حدیث پر ایمان لائیں گے قرآن کے بعد۔ یہاں حدیث کا انکار کر دیا۔ حالانکہ یہاں حدیث کے لغوی معنی ابرار ہیں۔ بات کے معنی ہیں یعنی کسی بات پر ہے۔ یا مثلاً سورہ لقمان کی یہ آیت پڑھ ڈالی۔ ومن الناس

يَهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ آیت ۶)
یہاں معنیٰ کچھ اور ہیں۔ معنیٰ یہ ہیں کہ کفار نے کہا چونکہ یہ انبیاء کرام انسان ہیں لہذا
ہم اُن کی دعوت قبول نہیں کرتے۔ فرشتے آنے چاہئیں۔ اس آیت کی تفسیر دوسری
آیت میں موجود ہے۔ فرشتے آئیں وہ آکر ہمیں سمجھائیں۔ وہ ہمیں ہدایت دیں تو ہم
مانیں گے۔ لیکن یہ انسان ہیں ہمارے جیسے ہی ہیں۔ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ
يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْأَسْوَاقِ (سورۃ الفرقان آیت ۷) رسُول کو
کیا ہوگیا ہے کہ بازاروں میں چلتا ہے اور (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے۔ انکار کی وجہ
در اصل یہ ہے؛ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی فہم کے لئے سب سے بڑی ضرورت
اس بات کی ہے کہ ہم ہر قسم کے تعصب، ہر قسم کی عصبیت سے پاک ہو کر اگر قرآن مجید
کو پڑھیں گے۔ تب تو اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کوعقیدہ، کوئی فکر، کوئی ازم اپنے
ذہن میں لے کر قرآن مجید کو سمجھنا چاہئیں گے تو قرآن مجید سے اور دُور ہو جائیں گے۔
لوگوں نے تو۔ یہاں تک مذاق کیا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ
الْحَدِيْثِ۔ تو آپ سن چکے ہیں۔ اسی طرح ایک چیز اور بھی ہے لطا ہر ہنسی کی بات
ہے۔ لیکن میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس طرح مسلمان فرقہ وارانہ عصبیت کی بنا پر
قرآن مجید سے دُور ہو گئے۔ ایک صاحب نے کہا وہ حضرت علیؓ کے بہت چاہنے
والے تھے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت ابراہیمؑ بھی شیعہ تھے۔ اور قرآن مجید کی یہ آیت
پڑھ ڈالی؛ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۝ (سورۃ الصّٰفّٰت۔ آیت ۸۳)
یعنی شیعہ تھے۔ حضرت ابراہیمؑ۔ سُنی کون سے کم ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا اچھا،
اور قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ دی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا
شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ط (سورہ انعام آیت ۱۶۰) جنہوں نے دین
میں تفریق ڈالی وہ سب شیعہ ہیں۔ اور دوسری آیت پڑھ دی۔ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ
مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ۝ (سورۃ مریم
آیت ۶۹) حالانکہ شیعہ کے معنیٰ جماعت کے ہیں۔ حدیث معنیٰ السمیع میں
غلطی کی گئی ہے وہی یہاں کی جا رہی ہے۔ شیعہ کا جو مفہوم مشہور ہو گیا۔ اُس کو سامنے
رکھا گیا ہے۔ لفظ شیعہ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس کے معنیٰ جماعت کے ہیں۔ گروہ کسی

الاحزاب میں فرمایا: وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ط اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي
فَيَسْتَحْيِ مِنْكُمْ - (آیت ۵۳) کھانا کھانے کے بعد نبی اکرمؐ کے گھر میں بہ
شپ مت کرو - اس سے نبی اکرمؐ کو تکلیف ہوتی ہے - یہ حدیث کا لفظ کہ
مشرکین کے اقوال اور اُن کی بات چیت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے - قرآ
میں فرمایا :- وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ - اور دو
میں فرمایا . وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰ
يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ
غَيْرِهٖ - (سورۂ نساء آیت ۱۴۰) - اور جب کوئی ایسی بات کر رہے ہوں
استہزاء ہو - مذاق اڑا رہے ہوں تو مسلمانوں کو چاہیئے اُن کے پاس مت بیٹھ
کی مجلس میں نہ بیٹھیں یہاں تک کہ وہ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں
نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہمارا جو خیال اور عقیدہ ہے اُس کے مطابق قرآن مجید سے
کرکے مسئلہ نکالیں دراصل یہ قرآن فہمی نہیں ہے بلکہ قرآن مجید دشمنی ہے - اس
ایک موٹی سی بات ہے جسے بیان کر دوں - ممکن ہے - آپ کہیں کہ یہ اختلاف
تو وہ ہوتا ہے جس میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف رہا ہو تو اس کو
کیا جا سکتا ہے - کسی حدیث یا آیت کے سمجھنے میں نیک نیتی سے آدمی ا
ہے - اور غلطی ہو سکتی ہے - صحابہ کرامؓ ہیں ائمہ مجتہدینؒ ہیں محدثینؒ ہیں
میں اختلاف پایا جاتا ہے - ان اختلافی مسائل کو بنیاد بنا کر لڑنا جھگڑنا تو غ
لیکن کوئی مسئلہ اب پیدا کر دیں اور پھر قرآن مجید کو لائیں مثلاً "رسول اَ
بشریت سے بالاتر تھے - انسانیت سے بالاتر تھے - اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک
یا نورٌ من نورِ اللہ تھے - بہرحال آپ انسانیت سے بالاتر تھے" اب یہ عقی
میں بیٹھا اور قرآن مجید میں ڈھونڈنا شروع کیا کہ ہمارا یہ نظریہ قرآن مجید سے
ہوتا ہے کہ نہیں - انہوں نے ایک آیت ڈھونڈ نکالی ہے سورۃ تغابن کی :-
اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا - اس کا ترجمہ کیا ہے - انہوں نے کہا کہ
ہمیں ہدایت دیتے ہیں تو کافر ہو گئے - کافر اس لئے ہو گئے کہ انہوں نے ا
کو بشر کہدیا - حالانکہ مطلب یہ نہیں ہے - پوری آیت یہ ہے - فَقَالُوْٓا

کے لئے شفا ہے - ویسے آج کل ایک اور بیماری ہے ممکن ہے آپ لوگوں کو ناگوار ہو- وہ یہ کہ آج کل تعویذ گنڈے بہت چل رہے ہیں - بہت سی کتابیں لکھ دی گئی ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید نزلہ زکام کھانسی بخار کے علاج کے لئے ہے - عورت کے بچہ ہونے والا ہے تو فال کھول جاتی ہے - بتایا جاتا ہے ایسا کرو لیا کرو - گویا کہ یہ ہمارے حکیم ڈاکٹر سب بیکار ہو گئے - اور لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ قرآن مجید بس اسی مقصد کے لئے نازل ہوا تھا - اس کی مثال ایسی ہے کہ توپ تو بنی تھی دشمنوں کو مارنے کے لئے لیکن ہم اس سے مچھر مکھی مار رہے ہیں - مچھر اور مکھی اس سے مر تو جائیں گے لیکن توپ اس لئے نہیں بنائی گئی - قرآن مجید کی آیتوں کے نقش بنائے جاتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑا کام کر رہے ہیں - حالانکہ اس طرح یہ لوگ قرآن مجید سے دُور کر رہے ہیں - ایک اور بڑا مسئلہ ہے اس کا آپ کے ہاں عام رواج ہے - ممکن ہے آپ میں سے بہت سے حضرات اس کو نامانوس محسوس کریں وہ ہے - قرآن خوانی - قرآن دانی کی بجائے قرآن خوانی - قرآن خوانی کا رواج بہت ہے - اگر کوئی مر جائے اور اس نے ساری عمر قرآن نہ پڑھا ہو، اور پڑھنے والے کو بھی قرآن پڑھنا نہ آتا ہو لیکن لوگ جمع ہوتے ہیں، تیجا چالیسواں کیا جاتا ہے - تاکہ قرآن مجید پڑھ کر مُردے کو ثواب پہنچایا جائے - میں نے ایک صاحب سے کہا کہ قرآن مجید میں کتنی بار آیا ہے اقیموا الصلوٰۃ - نماز قائم کرنے پر تو عمل نہیں ہوتا لیکن آپ قرآن خوانی کر رہے ہیں - قرآن خوانی کافی نہیں ہے قرآن دانی ضروری ہے - لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ قبر میں جو دفن ہو گیا ہے قرآن مجید اُس کے لئے اُس کو بخشوانے کے لئے ہے اور بس - ہمارے لئے نہیں ہے - حالانکہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے لئے ہے - اصل بات یہ ہے - تمہارے دلوں میں جو روگ ہیں، جو اخلاقی بیماریاں ہیں جو روحانی امراض ہیں جو عقائد کی بیماریاں ہیں اُن کو دُور کرنے کے لئے قرآن مجید نازل ہوا ہے - یہ اخلاقی اور روحانی لحاظ سے جو چلتے پھرتے مُردے نظر آ رہے ہیں اُن کا علاج قرآن میں ہے جو قبر میں چلے گئے اُن کا معاملہ اللہ کے ہاں ہے - اب آپ چاہے کتنا ہی پڑھتے رہیں - یہ ایسا ہے جیسے عیسائیوں میں رواج ہوا تھا کہ جب کوئی مر گیا تو نجات نامہ، ویزا، جنت کا پرمٹ دیا کرتے تھے - مُردہ کے سینے پر لکھ کر لگا دیا کرتے تھے کہ یہ جہنم میں نہیں جائے گا - سیدھا جنت میں جائے گا

کا ہو۔ وہ اچھے بھی ہو سکتے ہیں بُرے بھی ہو سکتے ہیں لیکن وہ اس کے اپنی جماعت
گروہ پر یا اپنے فرقہ پر چسپاں کرنے کے لئے یا اُن کا جواب دینے کے لئے قرآن
استعمال کرتے ہیں۔ مذہبی فرقہ وارانہ ذہنیت سے بھی انسان قرآن مجید
ہو جاتا ہے۔ اور قرآن کو ایک کھیل بنا لیتا ہے۔

قرآن مجید کے موانع میں سے ایک یہ ہے کہ انسان قرآن مجید پڑھتا ہے
اس کو سمجھتا نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بس تبرکاً پڑھ لینا ہی کافی ہے
اقبالؒ نے ایک بار کہا تھا کہ سب سے مظلوم کتاب قرآن مجید ہے۔ اس لئے کہ سار
اور ساری تحریریں سمجھ کر پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن قرآن مجید ہی ایک ایسی مظلوم کتا
کہ جس کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہم بے سمجھے ہی اس کو پڑھ لیں تو یہ
لئے کافی ہے۔ اور اس طرح قرآن مجید کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقتاً قراء
جو قرآن و حدیث میں آیا ہے یا مشہور ہے۔ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے ا
تھے۔ قراء سے مراد جاہل قاری نہیں ہیں۔ وہ مخرج تو نکال سکتے ہیں۔ لیکن قرآ
کے معنیٰ نہیں جانتے۔ حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے جو ارکان تھے وہ قراء تھے۔ ا
علماء تھے، کتاب و سنّت کے عالم تھے۔ قراء کے معنیٰ پڑھنے کے ہیں کہ آدمی سمجھ کر
میں یہ نہیں کہتا کہ بے سمجھے اگر کسی نے قرآن مجید پڑھا تو ثواب نہیں ملے گا۔ اللہ تع
والا ہے۔ اُس کے خزانہ میں کیا کمی ہے میں اس سے بحث نہیں کرتا۔ میں عرض
ہوں کہ قرآن مجید کا تقاضا کیا ہے۔ وہ ہم سے چاہتا کیا ہے؟ پھر ہم میں ایک او
ہے۔ ہم نے قرآن مجید کو تبرّک سمجھا ہوا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ بادشاہی مسجد
میں ایک صاحب بڑی محنت کر رہے ہیں۔ انہوں نے سونے کے تاروں سے قر
لکھنا شروع کیا ہے بلکہ ختم کر لیا ہے۔ اب لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے
گویا یہ بڑا کمال ہے۔ اب قرآن مجید سونے کے تاروں سے لکھا جا رہا ہے۔
سوال یہ ہے کہ آپ قرآن مجید پڑھنے کا اور اُس کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایسا
اختیار کیجئے کہ جس سے دل کے تار ہل جائیں۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ
مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ (سورۃ یونس
آیت ۵۷) یہ تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت ہے اور سینوں میں جو روگ

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات

محمد یونس جنجوعہ ، ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ایڈ

اسلام بلاشبہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے دور نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے لیکن آج مسلمان اسلام کو مکمل ضابطہ حیات کے طور پر تسلیم تو کرتے ہیں لیکن خود اپنے عمل سے اس کی نفی کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ اسلامی تعلیمات سے واقف نہیں اور جدید علوم حاصل کرکے ان کی چمک دمک سے مرعوب ہوگئے ہیں اور مختلف نظریہ ہائے زندگی کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا خود اسلام کے اصولوں کو قابلِ ترمیم سمجھتے ہوئے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق اُنہیں ڈھالنا چاہتے ہیں ۔ شاید انہیں یہ بات بھول جاتی ہے کہ اسلام اللہ تعالٰے (خالق کائنات) کا پسندیدہ طرز زندگی ہے ۔ چونکہ اللہ رب العزت ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے اسی طرح اس نے جو دین بنی نوع انسان کیلئے پسند کیا وہ بھی بے عیب ہو گا نیز یہ کہ اسی اسلام کو بطور دین کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بالفعل نافذ کرکے مسلمانوں کے حوالے کیا ۔ اور آپؐ کے خلفائے راشدین نے بھی اُس کو اپنے اپنے دور خلافت میں جاری رکھا اور تاریخ عالم نے دیکھا امن وسکون ۔ خوشحالی اور فارغ البالی میں وہ دور اپنی نظیر نہیں رکھتا ۔

آج خود مسلمان اسلام سے مطمئن نہیں ۔ لاتعداد فرقے پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ جب غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ اسلام کے کس فرقے میں شامل ہوں ۔ یہ صورت حال اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ خود مسلمان مختلف اغراض و مقاصد کے حصول میں اس حد تک منہمک ہوگئے کہ اسلامی تعلیمات کے سرچشموں کو فراموش کر بیٹھے ۔ اسلام میں ذاتی پسند کی چیزوں کو داخل کر دیا اور اس طرح مسخ

یسوع مسیحؑ کی بادشاہت میں جائے گا۔ اسی طرح ہمارا بھی یہ عقیدہ ہے، یہ خیال ہے یہ رواج ہو گیا ہے کہ ہم ایصالِ ثواب کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ایصال ثواب غلط ہے۔ ایک تو موجودہ رواج ہے اجتماعی شکل میں، یہ غلط ہے۔ ایک یہ کہ انفرادی طور پر کوئی کچھ پڑھ لیتا ہے۔ ثواب پہنچا دیتا ہے۔ یہ اختلافی مسئلہ ہے سلف میں بعض اس کے قائل ہیں بعض قائل نہیں ہیں۔ جس کو صدمہ پہنچا ہے وہ قرآن مجید پڑھ کے مغفرت کی دعا کرے تو اس کی گنجائش شریعت میں نکل سکتی ہے۔ لیکن یہ طریقہ کہ برادری کے تمام لوگ جمع کر لئے جاتے ہیں اور جس کے ہاں غمی ہوئی ہے اسے کھانا بھی کھلانا پڑتا ہے آخر یہ کیا چیز ہے؟ کہ قرآن مجید قبر والوں کے لئے ہے۔ جو قبر سے باہر ہیں ان کے لئے نہیں ہے؟ یہ چیز درحقیقت ہمیں قرآن مجید سے دور کر رہی ہے۔ یہ بڑا افسوسناک طرزِ عمل ہے۔ یہ قرآن فہمی اور قرآن دانی میں رکاوٹ ہے۔ اس کے علاوہ لوگ قرآن مجید سے فال نکالتے ہیں۔ عدالتوں میں قرآن مجید پر حلف اٹھاتے ہیں۔ سچے ہوں یا جھوٹے ہوں قرآن مجید کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ دلہن اگر جا رہی ہو تو قرآن مجید اچھے غلاف میں لپیٹ کر جہیز میں دیدیا جاتا ہے چاہیے وہ ایسے ساری عمر نہ پڑھے۔ جذبہ تو بہت اچھا ہے لیکن پہلے اسے پڑھایا تو ہوتا۔ پہلے اس میں قرآن مجید کا ذوق وشوق تو پیدا کیا ہوتا تاکہ بعد میں اپنے شوہر کے ہاں جائے تو سمجھ کر پڑھ سکے۔ اس پر عمل کر سکے اور اپنے بچوں کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تربیت دے سکے۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اسلام آئے اور قرآن مجید اور سنت کا نظام جاری ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن مجید کو سمجھا جائے اور اسے صحیح معنی میں سمجھایا جائے۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے اور جو باتیں میں نے صحیح بیان کی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے اور جو غلط بات کہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سینے سے اسے محو کر دے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ

بخاری ؒ ومسلم ؒ —————— عن عثمان ؓ ابن عفان

بالفعل یہ ظاہر کیا کہ اسلام جو رسولؐ اور اُس کے اصحاب نے پیش کیا وہ مکمل نہ تھا بلکہ ابھی اُس میں بہت سی باتوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے بس مسلمانوں کی اجتماعیت کے لئے اصولوں سے انحراف زہر قاتل ثابت ہوا اور ہونا تھا اس طرح مسلمانوں میں خود دو گروہ پیدا ہو کر حق و باطل کی طرح ٹکرانے لگے۔

کاشش کہ مسلمان قرآنی تعلیمات کو فراموش نہ کرتے اور اسلام کو اس کی خالص شکل میں رکھتے اور فرمانِ نبویؐ کو قول فیصل جانتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ بفحوائے الفاظ قرآنی "اگر کسی بات میں تمہارا جھگڑا ہو جائے پس اُس کو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف لوٹاؤ یعنی وہاں سے راہ نمائی حاصل کرو"

ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ تکمیل دین کی آیت کے نزول کے وقت اور خلفائے راشدین کے مبارک ادوار میں صحابہ کرامؓ کی قبریں کچی تھیں نہ اُن کو غسل دیا جاتا تھا نہ اُن پر غلاف چڑھائے جاتے تھے نہ وہاں پیسے ڈالنے کے لئے صندوق ہوتے تھے نہ وہاں روشنی کی جاتی تھی۔ نہ اُن پر گنبد بنائے جاتے تھے۔ نہ درگاہیں تعمیر ہوتی تھیں۔ نہ متولی بیٹھتے تھے نہ عرس ہوتے تھے نہ میلے۔ البتہ قبروں پر جا کر اپنی موت کو یاد کرنا اور فوت شدوں کے حق میں دُعائے مغفرت کرنا معمول تھا۔ خود آنحضرتؐ قبرستان میں تشریف لے جاتے اور مردوں کے حق میں دُعائے مغفرت فرماتے مگر حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ منع فرمایا ہے رسول اللہؐ نے قبروں کو پختہ کرنے سے۔ ان پر عمارت بنانے سے اور ان پر بیٹھنے سے نیز آپؐ نے فرمایا "اللہ کی لعنت ہے قبروں پر چراغ جلانے والوں پر" آپؐ کے ان فرامین پر عہد نبوی میں عمل رہا اور خلافت راشدہ میں بھی قبروں پر گنبد تعمیر نہ کئے گئے یہی چیز کتب تواریخ سے ثابت ہے۔ اب مسلمانوں کا عمل ملاحظہ ہو کہ آنحضرتؐ کے اسوہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کیخلاف قبریں پختہ بن رہی ہیں ان پر گنبد بنائے جارہے ہیں۔ درگاہیں تعمیر ہو رہی ہیں متولی بیٹھے ہیں۔ عرس اور میلے ہو رہے ہیں۔ قبروں کو غسل دیا جارہا ہے۔ غلاف چڑھائے جارہے ہیں اور وہاں منتیں مانی جارہی ہیں۔

یہ ایک مثال ہے علاوہ ازیں بدعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہے اور سنت رسولؐ کے متوازی ایک دوسرا سلسلہ

شدہ اسلام کے حامل بن کر ہر قسم کی برکات سے محروم ہو گئے۔

قرآن حکیم میں جو اسلامی تعلیمات کا اولین ماخذ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی نہ کرو" مسلمانوں نے فرقہ بندی کر کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہے۔ اور وہ اپنے مخصوص فرقے کو ہی اسلام سمجھتا ہے حالانکہ اُس کی غلطی واضح ہے۔

صحابہ کرام صرف مسلمان تھے۔ ان کا کوئی فرقہ یا ٹولہ نہ تھا۔ انہوں نے اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے رسول پاکؐ کا فرمان موجود تھا " میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں جب تک تم اُن کو اختیار کئے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے ایک کتاب اللہ۔ دوسری میری سنت" صحابہ کرامؓ نے قرآن و سنت کے اتباع کی جو مثالیں قائم کی ہیں وہ اسلامی تاریخ کا درخشندہ باب ہے لیکن یہاں طوالت کی خاطر اس سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد کے لوگوں کے لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا "تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے پر چلو اور خلفائے راشدینؓ کی راہ اختیار کرو"۔ اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے خلفائے راشدین پر کہ جنہوں نے پیغمبر اسلام کے اعتماد کو ذرہ برابر ٹھیس نہ پہنچائی اور اپنے زمانے میں سُنت نبوی پر سختی سے عمل پیرا رہے اور کسی ایسی چیز کو اسلام میں داخل نہ کیا جو آنحضرتؐ نے اسلام میں شامل نہ کی تھی اس طرح خلفائے راشدین بھی دین اسلام کو خالص حالت میں چھوڑ کر رخصت ہوئے۔

اُصولی طور پر تو اسلام کی تکمیل بطور ضابطہ حیات خود ربّ العزت نے فرما دی جب آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری ایام میں یہ اعلان کیا گیا کہ " آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام کو بطور دین (ضابطہ حیات) پسند کیا" یوں اللہ تعالیٰ نے ضابطہ حیات مکمل اور تمام صورت میں مرحمت فرمایا اور پیغمبر اسلامؐ نے اُس کو نافذ کیا۔ لیکن اُمت کی بدقسمتی کہ نظری طور پر تو دین کو مکمل ضابطہ حیات تسلیم کیا مگر اُس کی سادگی۔ سہولت اور خلوص کو قائم نہ رکھا پیچیدہ رسمیں۔ مشکل ریاضتیں اور عجیب و غریب بدعات خود اپنی طرف سے گھڑ کر انہیں دین کا اہم جزو قرار دیا اور یوں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِسلام

اور

حقوق اطفال

ازقلم:- غازی عزیر (علی گڑھ)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ط

اَمّا بعد - سالِ گذشتہ (۱۹۷۹ء) تقریباً تمام عالمِ ارضی[1] پر بچوں کا بین الاقوامی[2] بڑے زور و شور سے منایا گیا - اس موقعہ پر حقوقِ اطفال سے متعلق جگہ جگہ سمپوزیم کو دمنائش، تہوار، تحریری و تقریری مقابلوں اور ریڈیائی شو پروگرام کا اہتمام کیا گیا ، بڑے بڑے فنڈ قائم کئے گئے ، ضخیم کتب چھپیں اور فلمیں تیار ہوئیں ، مختلف اصحابِ فکر و دانش نے علوم نفسیات و حیاتیات و عمرانیات و دیگر علوم جدیدہ و فنون لطیفہ کی روشنی میں طول طویل

---

[1] جن ممالک میں بچوں کا بین الاقوامی سال منایا گیا اُن کی کل تعداد ایک سو باسٹھ ہے (انگریزی مجلہ "ٹائم" مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۷۹ء ج ۱۱۴ شمارہ ۱۱ ص ۷۴)

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "شبہات حول الاسلام" محمد قطب و "اسلام کا نظامِ حیات" سید مودودی۔

اہم ہے ۔ بچے کی پیدائش کی رسومات ، وفات پر مختلف ناموں پر اجتماع ۔ نکاح کے
موقعہ پر فضول رسمیں اور اُسوہ حسنہ کی خلاف ورزی ۔ شب برات ، معراج شریف
اور لیلۃ القدر کے خودساختہ پروگرام ۔ میلاد النبیؐ کے نام پر عید ۔ الغرض اسلام کو
مکمل ضابطہ حیات قرار دینے والے خود نئی نئی چیزیں دین میں شامل کر رہے ہیں اور
علمائے حق کا وہ گروہ جو اُن کی ان بدعات کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور دین کو
اسوہ رسولؐ اور عمل صحابہ کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اُسے برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ
خود آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے ہمارے اس دین میں ایسی کوئی نئی بات نکالی جو
اس میں نہیں ہے بس وہ مردود ہے ۔ نیز ”سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے اور
بہترین طریقہ حضرت محمدؐ کا طریقہ ہے اور بدترین چیز وہ ہے جو دین میں نئی پیدا کی گئی
ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے“ بدعت کو آپؐ نے اس لئے بدترین عمل قرار دیا کہ دین
میں اضافہ جائز سمجھنے والا دراصل تکمیل دین کی نفی کر رہا ہے وہ اپنے ناقص ذہن کیساتھ
دین کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ رب العزت اُسے مکمل کر چکا ہے ۔ لہٰذا
بدعات کو مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے مگر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس
سے دین کی سادگی اور سہولت پر زد پڑتی ہے اور دین میں سادگی اور سہولت
منشائے خداوندی ہے ” اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے تمہارے لئے آسانی اور نہیں چاہتا
تمہارے لئے تنگی ۔

دین میں بدعات کے وجود کو صحیح تسلیم کرنے والے کہتے ہیں کہ ان چیزوں سے
ہمارا مقصود قرب الٰہی کا حصول ہے یعنی ہماری نیت نیک ہے ۔ لیکن وہ یہ بات بھول
جاتے ہیں کہ قُرب الٰہی کے حصول کے جو طریقے مناسب اور بھلے تھے وہ خود آنحضرتؐ نے
سکھلا دیتے ہیں اور کسی دوسرے کے لئے اس میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ۔

قرآن پاک میں بدعت کی مذمت سُورۃ الحدید میں مذکور ہے ۔ رہبانیت اسلام
میں نہیں ہے ۔ لیکن نصاریٰ نے دنیا کی شہوات اور لذائذ سے کنارہ کشی کرنے کیلئے
حسن نیت پر ترک دنیا اختیار کیا ۔ اس طرح وہ گناہ سے بچنے کا اہتمام کرنے لگے ۔
گناہ سے بچنے کا یہ اہتمام چونکہ فطرت کے تقاضوں سے متصادم تھا لہٰذا وہ لوگ اس
پر قائم نہ رہ سکے اور اپنی حُسنِ نیت کے باوجود غضبِ الٰہی کے سزاوار ہوتے ۔ بلحواۓ

جاتا تھا، سوسائٹی کے وہ حقیر ترین جزو سمجھے جاتے تھے، اُن کی اپنی زندگی محفوظ نہ تھی، مشرکین عرب اولاد کی پرورش کو اپنے لئے بوجھ تصوّر کرتے تھے اور اس باعث اکثر و بیشتر اُن کو افلاس کے خدشہ سے قتل کر دیا کرتے تھے، لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے چنانچہ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی قبیح و انسانیت سوز رسم عام تھی۔ لڑکیوں کو باعث ننگ و عار سمجھنے اور اُن کو زندہ دفن کر دینے کا ذکر قرآن کریم میں خدا تعالےٰ اس طرح فرماتا ہے:۔

لے مشرکین عرب ایک طرف تو لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لئے باعث ننگ و عار سمجھتے تھے اور دوسری طرف جنوں، فرشتوں اور لڑکیوں کو اللہ کی بیٹیاں تصوّر کرتے تھے۔ خدا تعالےٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:۔

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَّأَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ - (الزخرف - ۱۶)	"ترجمہ: کیا اللہ نے اپنی مخلوق میں سے اپنے لئے بیٹیاں انتخاب کیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا؟"
(۲) وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ○ (النحل - ۵۷)	"ترجمہ: یہ خدا کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں سبحان اللہ ان کے لئے وہ ہے جو یہ خود چاہیں یعنی لڑکے۔"
(۳) أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ؕ أَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ؕ (الطور - ۳۸ و ۳۹)	"ترجمہ: کیا اُن کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر یہ عالم بالا کی سُن گُن لیتے ہیں؟ ان میں سے جس نے سُن گن لی ہو وہ لائے کوئی کھلی دلیل کیا اللہ کے لئے تو ہیں بیٹیاں اور تم لوگوں کے لئے ہیں بیٹے؟"
(۴) أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى ○ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ○ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَا أَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (النجم ۲۱ تا ۲۳)	"ترجمہ: کیا بیٹے تمہارے لئے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لئے؟ یہ تو بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہیں مگر بس چند نام جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کیلئے کوئی سند نازل نہیں کی۔"

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

مقالات بھی لکھے لیکن دینی و مذہبی حلقوں سے جو مقالات پیش کئے گئے وہ نہ صرف ناکافی بلکہ بیحد تشنہ و خانہ پُری کی حد تک تھے ۔ حالانکہ اسلام ایک ایسا نظام اور دین ہے جو انسان کے عالم وجود میں آنے سے قبل تا وفات وحیات اُخروی کے جملہ متعلقات سے مفصل بحث کرتا ہے ۔ اسلام محض رُوحانی عقائد اور چند بدنی و مالی عبادات کے مجموعہ کا نام ہرگز نہیں بلکہ یہ ایک ایسا ہمہ گیر، جامع، فطری و عملی اسلوب حیات ہے جس میں وہ اعتقادی تصور بھی شامل ہے جس سے کائنات کی ماہیت واضح اور اس میں انسان کا مرتبہ و مقام، اس کا طرز زندگی، اس کے فرائض و حقوق، اور اس کے وجود کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے ۔ بلاشبہ یہ اسلوب زندگی مربوط طور پر ان اقدار پر مشتمل ہے جو حیات بشری کے مختلف پہلوؤں کو منظم کرنے والی اقدار، انسان کی حقیقی ضروریات کو پُورا کرنے والی اقدار، انسان کی مختلف سرگرمیوں کی نگرانی اور اُن کے حقوق کی حفاظت کرنے والی اقدار کہلاتی ہیں ۔ اس اسلوبِ حیات کا امتیازی نشان یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی میں لوگ بہت سے معبودوں اور مختلف ارباب کی بندگی چھوڑ کر صرف ایک معبود کی بندگی کرتے ہیں اور الوہیت و ربوبیت و حاکمیت کی صفات میں صرف اُسی سے ہی اپنے تصورات و اقدار، معیارات، حقوق، نظامات، قوانین، اخلاق و آداب حاصل کرتے ہیں[1] ۔ چنانچہ اس مقالہ میں ہم بھی حقوق اطفال کا مطالعہ نصوص الکتاب اور سنّت الحافلہ کی روشنی میں کرنے کی کوشش کریں گے ۔ و باللہ التوفیق ۔

دورِ جاہلیت میں حقوقِ اطفال

اسلام نے اطفال کو کیا مراعات اور خصوصی حقوق عطا کئے ہیں، جو اس سے قبل اُن کو حاصل نہ تھے ؟ اس سوال کے جواب کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم دورِ جاہلیت میں حقوق اطفال کا جائزہ لیں بعد ازاں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کریں ۔

اسلام سے قبل حقوقِ اطفال کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ بچوں کو کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے، معاشرہ میں اُن کی کوئی حیثیت نہ تھی، اُن کو قابل توجہ نہ سمجھا

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "المستقبل لھذا الدین" سیّد قطب شہیدؒ اُردو ترجمہ از عبدالحمید صدیقی ص ۲۶، ۲۷ مطبوعہ مغربی جرمنی

ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ (الزخرف - ١٧) رحمٰن کی طرف منسوب کرتے ہیں (یعنی لڑکی) اُس کی ولادت کا مژدہ جب خود ان میں سے کسی کو دیا جاتا ہے تو اُس کے منہ پر سیاہی چھا جاتی ہے اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔"

اور

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ (النحل - ۵۸ و ۵۹)	"ترجمہ: - جب ان میں سے کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اُس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ بس خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے - لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بُری خبر کے بعد کیا کسی کو منہ دکھائے

سوچتا ہے کہ ذلّت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے۔"

ہثیم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا۔ ایک اس پر عمل کرتا تھا، دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک اسلام نہیں آیا تھا۔ (میدانی)

ایک شخص نے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو عہد جاہلیت میں اپنی لڑکی کو زندہ دفن کرنے کا بیحد رقت انگیز واقعہ سنایا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے کافی مانوس تھی۔ جب میں اس کو پکارتا تھا تو وہ دوڑی ہوئی میرے پاس آتی تھی۔ ایک دن میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستے میں ایک کنواں ملا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کنویں میں دھکیل دیا۔ آخری آواز جو اُس کی میرے کانوں میں پڑی وہ تھی "ہائے ابّا، ہائے ابّا" یہ واقعہ سن کر رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم رو دیئے اور آپؐ کے اشک مبارک بہہ نکلے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا اے شخص! تو نے حضورؐ کو رنجیدہ کر دیا۔ حضورؐ نے فرمایا: اسے مت روکو۔ جس چیز کا اسے سخت احساس ہے اُس کے متعلق اسے سوال کرنے دو۔ پھر آپؐ

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُ هُمْ بِمَا
ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا

" ترجمہ : اور حال یہ ہے
جس اولاد کو یہ لوگ اس خد

(حاشیہ ص۳)

(۵) اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ
تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰى ۝ وَمَا لَهُمْ بِهٖ
مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ج
وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ
شَیْـًٔا ج (النجم - ۲۷ و ۲۸)

" ترجمہ : مگر جو لوگ آخرت کو نہیں
فرشتوں کو دیویوں کے ناموں سے
ہیں - حالانکہ اس معاملہ کا کوئی
نہیں ہے - وہ محض گمان کی پیرو
ہیں اور گمان حق کی جگہ کچھ بھی
دے سکتا - "

(۶) وَجَعَلُوْا بَیْنَهٗ وَ بَیْنَ
الْجِنَّةِ نَسَبًا ؕ وَلَقَدْ عَلِمَتِ
الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝
(الصّٰفّٰت - ۱۵۸)

" ترجمہ : انہوں نے اللہ اور فرش
نسب کا رشتہ بنا رکھا ہے حالان
خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ (م
حیثیت سے) پیش کئے جائی

(۸) وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ
خَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِیْنَ وَبَنٰتٍۭ
بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا
یَصِفُوْنَ ۝ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
اَنّٰى یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ
لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ج

(الانعام - ۱۰۰ ، ۱۰۱)

" ترجمہ : اور لوگوں نے جنوں کو ا
ٹھیرا دیا حالانکہ وہ ان کا خالق ۔
نے بے جانے بوجھے اس کے لئے
بیٹے گھڑ لیں حالانکہ وہ پاک او
ان باتوں سے جو وہ کہتے ہیں ۔
اور زمین کا موجد ہے اس کا ک
ہوسکتا ہے جبکہ کوئی اسکی شریک
نہیں ہے ۔ اس نے ہر چیز کو پید

(۸) اَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ
صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝ (الجن - ۳)

" ترجمہ :- اور یہ کہ ہمارے رب ک
اعلیٰ وارفع ہے - اس نے کسی کو بیوی

(۹) لَمْ یَلِدْ ۥ وَلَمْ یُوْلَدْ ۝
(الاخلاص - ۳)

" ترجمہ : نہ اس کی کوئی اولاد ہے
کسی کی اولاد ہے - "

تھے۔" (بلوغ الارب فی احوال العرب)

دورِ جاہلیت میں صرف لڑکیاں ہی زندہ درگور نہیں کی جاتی تھیں بلکہ اکثر لڑکوں کو بھی اہلِ عرب مُفلسی کے خوف سے قتل کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا ابوالحسن علی الحسینی الندوی صاحب لکھتے ہیں :" اس معاشرے کے عادات واطوار ہلاکت آفریں تھے جو دنیا کو ہلاکت کے غار میں دھکیل رہے تھے .... سنگدلی اور بے رحمی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں اور لڑکے بچپن میں قتل کر دیے جاتے تھے۔" (اردو ترجمہ" ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" ص۱۴۳ مطبوعہ مغربی جرمنی)

اسی بابت "اہلِ عرب میں رائج قتل اولاد کی تین صورتیں" بیان کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب لکھتے ہیں : ...." بچوں (لڑکوں) کا قتل، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جا سکے گا اور ذرائع معاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابل برداشت بوجھ بن جائیں گے .....الخ۔" (تفہیم القرآن ج ۱ ص۵۸۶)

اہلِ عرب کی قدیم تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانۂ جاہلیت کی اس انتہائی غیر انسانی رسم کی قباحت کا شدید احساس تھا۔ جیسا کہ اس عبارت سے پتہ چلتا ہے۔ "عرب کے بعض شرفاء ور ؤساء ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے تھے۔ اور اُن کی جان بچاتے تھے۔" (بلوغ الادب فی احوال العرب)

ایک اور روایت میں ہے کہ مشہور عربی شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ بن ناجیۃ المجاشعی نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا "یا رسول اللہ! میں نے

(بقیہ حاشیہ ص۶) لڑائیوں میں اُلٹی اُن کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ تیسرے عام بدامنی کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تو جو لڑکیاں بھی اُن کے ہاتھ لگتی تھیں انہیں لے جا کر وہ یا تو لونڈیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔" (تفہیم القرآن ج ۶ ص۲۶۵ حاشیہ ۹)

نے اس سے فرمایا: اپنا قصّہ دوبارہ بیان کرو۔ اُس نے دوبارہ اس واقعہ کو بیان کیا۔ آپؐ سن کر اس قدر روئے کہ آپؐ کی داڑھی آنسوؤں سے نم ہوگئی۔ اس کے بعد آپؐ نے فرمایا: جاہلیت میں جو کچھ ہوگیا اللہ نے اُسے معاف کردیا، اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو۔ (سنن الدارمی ج ۱ باب اوّل)

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مرحوم) بیان کرتے ہیں کہ "عرب میں یہ طریقہ چل پڑا تھا کہ کبھی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے آگے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اُسی وقت اُسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جائے۔ اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان والے اس میں مانع ہوتے تو باپ بادلِ ناخواستہ اُسے کچھ مدّت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جاکر زندہ دفن کردیتا۔" (تفہیم القرآن ج ۶ ص ۲۶۵)

سُنن الدارمی میں لکھا ہے کہ "بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہوجاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی، تو جاہل باپ دھوکہ دے کر اُس کو لیجاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کرتا۔" (سُنن الدارمی ج ۱۔ باب ما کان علیہ الناس قبل مبعث النبی صلے اللہ علیہ وسلّم من الجہل والضلالۃ ص ۳)

اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے ہی اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کئے ہیں۔

"بعض ننگ و عار کی بنا پر، بعض خرچ و[1] مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے

---

[1] مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب دَورِ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان فرماتے ہیں: "ایک[1] معاشی خستہ حالی جسکی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پالنے پوسنے کا بار اُن پر نہ پڑے۔ بیٹوں کو تو اس اُمید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصُولِ معیشت میں ہاتھ بٹائیں گے۔ مگر بیٹیوں کو اس لئے ہلاک کر دیا جاتا تھا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انہیں بیاہ دینا ہوگا۔ دوسرے[2] عام بدامنی جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لئے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اُس کے اتنے ہی حامی و مددگار ہوں گے۔ مگر بیٹیوں کو اس لیے ہلاک کردیا جاتا تھا کہ قبائلی

قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل-۳۱)

بھی - درحقیقت اُن کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔"

ایک اور مقام پر فرمایا گیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا۔۔۔۔ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ۔۔۔۔ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ط (الممتحنہ-۱۲)

"ترجمہ:- اے نبیؐ! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گی۔۔۔۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔۔۔۔ تو اُن سے بیعت لے لو، اور اُن کے حق میں اللہ تعالےٰ سے دُعائے مغفرت کرو۔"

کتب حدیث میں وارد ہوا ہے کہ فتح مکّہ کے بعد اہلِ قریش جوق در جوق حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں بیعت کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ آپؐ نے مردوں سے کوہِ صفا پر خود بیعت لی اور حضرت عمر بن الخطابؓ کو عورتوں سے بیعت لینے اور ان تمام باتوں کا اقرار کرانے کے لئے، جو سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ میں بیان کی گئی ہیں، اپنی طرف سے مامور فرمایا۔" (ابن جریر بروایت ابن عباس، ابن ابی حاتم بروایت قتادہ)

ایک اور حدیث میں ہے کہ "مدینہ تشریف لے جانے کے بعد آپؐ نے ایک مکان میں انصار کی خواتین کو جمع کرنے کا حکم فرمایا اور وہاں بھی حضرت عمر بن الخطابؓ کو اُن خواتینِ انصار سے بیعت لینے کے لیے بھیجا۔" ابن جریر، ابن مردویہ، بزار، ابن حبان بروایتِ اُم عطیہ انصاریہ)

امام بخاری ابن عباس سے نقل فرماتے ہیں کہ "عید کے دن مردوں کے درمیان خطبہ دینے کے بعد آپ عورتوں کے مجمع کی جانب تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطبہ کے دوران آپ نے سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۲ تلاوت فرمائی اور اس آیت میں مذکورہ جملہ باتوں کا عہد لیا۔" (بخاری)

دورِ جاہلیت میں کچھ اچھے اعمال بھی کئے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے ۳۶۰ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر لڑکی کی جان کے بدلے دو دو اونٹ فدیے میں دیئے۔ کیا مجھے اس کا اجر ملے گا؟ حضورؐ نے فرمایا: ہاں تیرے لئے اجر ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی ہے۔" (الاغانی لابی الفرج الاصفہانی ورواہ الطبرانی)

بیٹی کو زندہ دفن کرنے والے یا بیٹے کو قتل کرنے والے ماں باپ خدا تعالےٰ کی نگاہ میں اتنے قابلِ نفرت وغضب الٰہی کے باعث ہوں گے کہ روز قیامت اُن کو مخاطب کرکے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ اُن سے نگاہ پھیر کر اُس معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ "تو بے چاری آخر کس قصور میں ماری گئی؟"[1] تو وہ اپنی داستانِ ظلم اس طرح بیان کرے گی کہ "ظالم ماں باپ نے اُس کے ساتھ ظلم کیا اور کس بے دردی سے اُس کو زندہ دفن کر دیا۔"

اسلام میں قتل اولاد کی ممانعت

خدا تعالےٰ نے اس جاہلی رسم پر جہاں سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے وہیں اس کو زبردست خطا و ناقابل معافی گناہ بنایا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے:۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ (الانعام – ۱۴۰)	"ترجمہ:۔ یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا۔"

اور

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ	"ترجمہ: اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں

---

[1] وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر – ۸ و ۹) "ترجمہ: اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی"

من جدته كن له حجابًا من النار (ابن ماجہ، بخاری فی الادب المفرد)

وُسعت کے مطابق اُن کو اچھے کپڑے پہنائے وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی ۔"

(۵) ما من مسلم تدركه ابنتان فيحسن صحبتهما الا ادخلتاه الجنة (بخاری، ادب المفرد)

"ترجمہ: جس مسلمان کے ہاں دو بیٹیاں ہوں اور وہ اُن کو اچھی طرح رکھے وہ اُسے جنت میں پہنچائیں گی"

(۶) من عال ثلث بنات او مثلهن من الاخوات فادبهن ورحمهن حتى يغنيهن الله اوجب الله له الجنة . فقال رجل يارسول الله او اثنتين ؟ قال او اثنتين حتى لو قالوا او واحدة لقال واحدة (شرح السنة)

"ترجمہ: جس شخص نے تین بیٹیوں یا بہنوں کو پرورش کیا، اُن کو اچھا ادب سکھایا اور اُن سے شفقت کا برتاؤ کیا یہاں تک کہ وہ اُس کی مدد کی محتاج نہ رہیں تو اللہ اُس کے لئے جنت واجب کر دے گا. ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ اور دو ؟ حضورؐ نے فرمایا: اور دو بھی (حدیث کے راوی ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ اگر لوگ اس وقت ایک کے متعلق پوچھتے تو حضورؐ اس کے بارے میں بھی یہی فرماتے)۔"

(۷) ان النبي صلى الله عليه وسلم قال لسراقة بن جعشم الا ادلك على اعظم الصدقة او من اعظم الصدقة قال بلى يارسول الله قال ابنتك المردودة اليك ليس لها كاسب غيرك

"ترجمہ: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سراقہ بن جعشم سے فرمایا: میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بڑا صدقہ (یا فرمایا بڑے صدقوں میں سے ایک) کیا ہے ؟ انہوں نے عرض کیا: ضرور بتائیے یا رسول اللہ ۔ فرمایا: تیری وہ بیٹی جو (طلاق پاکر یا بیوہ ہوکر) تیری طرف

اسلام کی برکتوں میں سے ایک بڑی برکت اور اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ اہلِ عرب سے اس انتہائی انسانیت سوز وسنگدلانہ رسم کا خاتمہ کیا بلکہ اس تخیّل کو قطعی مٹا دیا کہ بیٹی کی پیدائش کوئی حادثہ ومصیبت وقلتِ معاش کا باعث ہے جسے بادلِ ناخواستہ برداشت کیا جائے ۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ تعلیم دی کہ بیٹیوں کی پرورش کرنا، اُنہیں عمدہ تعلیم وتربیّت دینا، اور انہیں اس قابل بنانا کہ وہ ایک اچھی واطاعت گزار بیوی ونیک وصالح ماں بن سکیں بہت بڑا نیکی وثواب کا کام ہے ۔ لڑکیوں کی پرورش وتربیّت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے کافی ارشادو فرمودات کتبِ احادیث میں مذکور ہوئے ہیں جن میں سے چند ذیل میں پیش کئے جارہے ہیں :-

(۱) من ابتُلیَ من ھذہ البنات بشیءٍ فاحسن الیھنّ کن لہ ستوا من النار (بخاری ومسلم)

"ترجمہ :- جو شخص ان لڑکیوں کی پیدائش سے آزمائش میں ڈالا جائے اور پھر وہ اُن سے نیک سلوک کرے تو یہ اُس کیلئے جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنیں گی ۔"

(۲) من عال جاریتین حتّٰی تبلغا جاء یوم القیٰمۃ انا و ھٰکذا و ضم اصابعہ (مسلم)

"ترجمہ :- جس نے دو لڑکیوں کو پرورش کیا، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو قیامت کے روز میرے ساتھ وہ اس طرح آئے گا یہ فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی انگلیوں کو جوڑ کر بتایا ۔"

(۳) من کانت لہ انثیٰ فلم یئدھا ولم یھنھا ولم یؤثر ولدہ علیھا ادخلہ اللہ الجنۃ ۔ (ابو داؤد)

"ترجمہ :- جس کے ہاں لڑکی ہو اور وہ اسے زندہ دفن نہ کرے، نہ ذلیل کر کے رکھے نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دے اللہ اُسے جنّت میں داخل کرے گا ۔"

(۴) من کان لہ ثلاث بنات و صبر علیھن و کساھن

"ترجمہ :- جس کے ہاں تین بیٹیاں ہوں اور وہ اُن پر صبر کرے اور اپنی

تاحال ضبط ولادت و تحدید نسل کی مختلف جماعتی و سرکاری تحریکیں اٹھتی رہی ہیں - زمانۂ قدیم میں یہی افلاس کا خوف قتل اولاد و تدفین بنات کا محرک ہوا کرتا تھا آج یہی خوف نسل کشی کی مختلف اشکال مثلاً اسقاط حمل و مانع حمل تدابیر اپنانے پر دنیا کو مجبور کر رہا ہے - اسلام کا یہ منشور عالم انسانی کو کھلی دعوت پیش کرتا ہے کہ وہ کھانے والوں کی تعداد گھٹانے کی مہلک و تخریبی کاروائی ترک کر دیں اور اس کے بجائے اپنی علمی و دینی و جسمانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ان تعمیری مقاصد میں صرف کریں جن سے قانون فطرت رزق میں وسعت و کشادگی بخشتا ہے -

خدا تعالے قلتِ رزق کے خوف یا دوسرے معاشی ذرائع کی قلت کے باعث افزائش نسل کا سلسلہ منقطع کر دینے کی جملہ مساعی کو انسان کی عظیم ترین خطا قرار دیتا ہے اور کھلے الفاظ میں متنبہ کرتا ہے کہ رزق رسانی کا نظم انسانوں کے قبضۂ قدرت میں نہیں بلکہ فقط میرے ہاتھ میں ہے - وہ وعدہ کرتا ہے کہ جس طرح پہلے گزرنے والی نسلوں کو رزق عطا فرماتا رہا ہے، اسی طرح موجودہ و بعد کی آنے والی نسلوں کو بھی روزی عطا فرماتا رہے گا - تاریخ عالم کا مطالعہ بھی یہی بتاتا ہے کہ جوں جوں انسانی آبادی میں اضافہ ہوتا گیا یوں یوں معاشی وسائل بھی وسیع تر ہوتے چلے گئے - لہٰذا خدا تعالیٰ کے تخلیقی نظام میں انسان کی بے جا مداخلت و رخنہ اندازی سوائے اس کی کچھ منقلی و

(حاشیہ صـ۱۲ کا)

۱ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ - (الانعام - ۱۴۰)

"ترجمہ: یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا -"

۲ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا (بنی اسرائیل - ۳۱)

"ترجمہ: اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انہیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی - درحقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے"

(ابن ماجہ، بخاری فی الادب المفرد) پلٹ آئے اور تیرے سوا کوئی اس کے لئے کمانے والا نہ ہو"

ایک طرف اسلام نے لڑکیوں کی زندگی کو تحفظ بخشا، معاشرہ میں انہیں اچھا مقام دیا، اُن کے سرپرستوں کے لئے اُن کی پرورش کو جہنم کی آگ سے بچاؤ کا ذریعہ بنایا تو دوسری طرف لڑکوں کو بھی کسی طرح پیچھے نہیں چھوڑا - قرآن کریم میں لڑکوں کے متعلق فرمایا گیا ہے :-

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ
"ترجمہ : مال اور لڑکے اس دنیا کی زندگی کی زینت ہیں "
(الکہف - ۴۶)

حقوق الجنین والحاملہ

خاندان کے ادارے کو محفوظ و مستحکم بنانے کے لئے اسلام "جنین" اور "حاملہ" کے مخصوص حقوق کا تعاون بھی کراتا ہے اور اُن کے تحفظ و بقاء کی سخت تاکید کرتا ہے۔ ضبط ولادت، نسل کشی، اسقاط حمل اور تمام مانع حمل تدابیر کو قطعاً حرام و ناجائز قرار دیتا ہے -؛ سقاط حمل کو "قتل بیجا" کے مترادف قرار دیتا ہے اور کسی فرد کو اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی پیدا ہونے والی معصوم زندگی کو اس کے حق سے محروم کرے یا جو کچھ رحم مادر میں قانونِ قدرت سے استقرار پا چکا ہے اس کو نکال باہر کرے - قتلِ اولاد کو خدا تعالےٰ مشرکانہ و گمراہ کن فعل قرار دیتا ہے -

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط
"ترجمہ : اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں ، اور ان پر اُن کے دین کو مشتبہ بنا دیں -"
(الانعام - ۱۳۷)

سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۰، ۱۵۱ اور سورۃ بنی اسرائیل کی آیت ۳۱ میں خدا نے واضح الفاظ میں ان تمام معاشی بنیادوں کو منہدم کر دیا ہے جن پر زمانہ قدیم سے

دعویٰ ہیں کہ کسی فرد کو غیر مولود زندگی تباہ کرنے کا قطعی حق، و اختیار نہیں ہے۔" (انگریزی ہفتہ وار "ٹائم" ج ۱۱۴ شمارہ ۱۷ ص ۴۷ و ص ۴۸)

"فلیڈلفیا اور شکاگو میں بھی جان پال دوئم نے تحدید ولادت کی تمام غیر فطری تدابیر کے خلاف سخت الفاظ میں تنقید کی ہے" (ایضاً)

مشہور انگریزی ہفتہ وار "ٹائم"، لکھتا ہے کہ "درحقیقت تاحال صف اوّل کے پروٹسٹنٹ، مشرقی قدامت پسند، یہودی اور مسلم علماء میں سے کسی نے بھی سنجیدگی کے ساتھ مکمل اور آزادانہ اسقاطِ حمل کی اجازت نہیں دی ہے۔ الا یہ کہ ناگزیر و غیر معمولی حالات درپیش ہوں (مثال کے طور پر اگر ماں کی زندگی خطرہ میں ہو تو ایسی صورت میں اسقاط کی گنجائش ہے)۔ (ایضاً ص ۴۹ و ص ۵۰)

کلیسا کی طرف سے اسقاطِ حمل کی مخالفت ایک مذہبی کتاب (CIRCA 100 AD) DIDACHE، جس نے اسقاطِ حمل کو "قتل" قرار دیا ہے، سے شروع ہوئی۔ اس نظریہ کے اندر صدیوں میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ ویٹیکن کونسل دوم (SECOND VATICAN COUNCIL) (روم کی وہ جگہ جہاں پوپ رہتا ہے) نے اسقاطِ حمل کے بارے میں اسی نظریہ کی تجدید و تائید کی اور اس کو "ناگفتہ بہ جرم" قرار دیا ..... جان پال اس کا تعلق انسان کے ایسے بنیادی حقوق کے استحصال کے ساتھ جوڑتا ہے جو قطع صلۂ رحمی کے مترادف ہیں" (ایضاً)

جان پال کے نزدیک انسان کے بنیادی حقوق کے تحفّظ کا اقدام لازمی ہے۔ اس نے کہا کہ: "اگر کسی شخص کے زندہ رہنے کے حق کو اُس لمحہ چھینا جاتا ہے جب کہ وہ رحم مادر میں پہلی بار استقرارِ حمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو بطریق دیگر یہ تمام اخلاقی اقدار پر ایک زبردست گھونسہ مارنا ہے۔" (ایضاً)

کلیسا کی "تحدید ولادت" کے خلاف نفرت ان کی مذہبی تعلیمات کے عین مطابق ہے جس میں لکھا ہے کہ "زرخیز ہو اور افزائش نسل کرو۔" (عہد نامہ قدیم)

۱۹۳۰ء میں اینگلیکن چرچ (ANGLICAN CHURCH) کی پاپائی تنظیم نے اپنی لیمبیتھ کانفرنس (LAMBETH CONFERENCE) میں انتہائی ناپسندیدگی کیساتھ "تحدید ولادت" کو منظور کیا تھا مگر اس فیصلہ کی تردید و مخالفت میں پوپ پائس

نصب العین سے مطابقت رکھتے ہیں۔

میں اپنی بات کو روزمرہ کی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں " فرض کیجئے کہ ایک بچے نے غیر شعوری طور پر کسی فلمی اداکار کو اپنا ہیرو بنا لیا ہے۔ دوسری طرف اُس کے والد ماجد اُس کو ایک اچھا ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے ہوں۔ ایسی حالت میں والد صاحب کی نصیحتوں کو خواہ زبانی طور پر بچہ درست تسلیم کرلے مگر عملاً اپنے خیالی ہیرو کے رنگ میں رنگے جانے کی کوشش کرتا رہے گا۔ اور ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لئے جو ضروری تقاضے ہیں اُن کو اپنی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ سمجھے گا۔

باپ کے خیال سے اگر اُن میں سے کوئی تقاضہ اُسے پورا بھی کرنا پڑ جائے تو انتہائی ناگواری کیساتھ اُسے پورا کرے گا۔ بالکل اسی طرح سے ہوا یہ کہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اقامتِ دین کا جو عظیم الشان نصب العین تحریک اسلامی کی تاسیس کی بنیاد تھا۔ وہ بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اُس کے بجائے ایک دوسرا نصب العین عملی طور پر اختیار کر لیا گیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کی صورت میں جو مصنوعی انقلاب برپا ہوا اُسکے دباؤ کے تحت تحریک نے فیصلہ کیا کہ اُسکے پاس جو بھی قوت ہے اُس کے ذریعے سے زور لگاکر سیاسی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور پھر حقیقی اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے حکومت کے ذرائع اور وسائل کو بھی استعمال کرکے ملّت پاکستان کو جلد از جلد دعوت اسلامی کی علمبردار ملّت میں تبدیل کر دے۔ لیکن کچھ تو اپنی قوت کا اندازہ لگانے میں غلطی ہوئی۔ کچھ ملک کی سیاسی قیادت کی پشت پر کام کرنے والی باطل کی عالمی قوتوں کی ریشہ دوانیوں کا صحیح اندازہ لگایا جاسکا جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک اسلامی کے بڑھتے ہوئے اثرات کو روکنے کے لئے ایک طرف ملک سے بتدریج جمہوریت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ دوسری طرف تحریک کے خلاف تمام گروہوں اور طبقوں کو سرگرم عمل کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی قیادت پر قبضہ کرنے کی منزل دور سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور اس منزل کے حصول میں ہم اس درجہ کھوئے گئے کہ ہم اپنے دشمنوں کی چالوں کو کما حقہٗ سمجھ بھی نہ سکے۔ ہم نے مسلمانوں کی اسلامیت کا ڈھنڈورہ اس طرح پیٹا اور اُن کے آزادانہ ووٹ سے اسلامی قیادت کے وجود میں آجانے کے یقینی

اسلام جہاں جنین کی سلامتی وحفاظت کی تعلیم دیتا ہے وہیں رحم مادر میں اس کی صحیح پرورش و بہتر نشو ونما کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ عورت کے مرضع یا حاملہ ہونے کی صورت میں اگر روزہ جیسی فرض عبادت ماں و بچہ کی صحت کے لئے مضر ثابت ہوتی ہو تو اس کا قضا کرنا درست ہے، اسی طرح وضع حمل کے دوران نماز وروزہ جیسی اہم عبادات بھی قضا کرنا شرعاً درست و جائز ہے۔ اسلام ازدواجی زندگی کے غیر معمولی حالات یعنی طلاق وعدت کے دوران بھی حاملہ وحمل کے حقوق کو نظر انداز نہیں کرتا تاکہ شوہر و بیوی کے آپسی اختلافات کے باعث جنین کے حقوق متاثر نہ ہو سکیں، بلکہ اُن کے لئے خصوصی احکامات بیان کرتا ہے۔

اسلام کا قرینہ ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف تو حاملہ عورت کی عدت[1] کے متعلق خصوصی قوانین کی نشاندھی کرتا ہے اور دوسری طرف اگر مطلقہ عورت حاملہ ہو تو خواہ اُسے رجعی طلاق دی گئی ہو یا قطعی طور پر الگ کر دینے والی بہرحال اُس کے وضع حمل تک اُس

---

[1] قرآن کریم میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے:

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ ۔ "تمہارے لئے ان پر کوئی عدت لازم نہیں ہے۔" (الاحزاب ۔ ۴۹)

اس آیت کی تفسیر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب یوں بیان فرماتے ہیں: "یہ الفاظ اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ عورت پر مرد کا حق ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ صرف مرد ہی کا حق ہے۔ دراصل اس میں دو حق اور بھی شامل ہیں۔ ایک حق اولاد، دوسرے حق اللہ یا حق الشرع۔ مرد کا حق وہ اس بنا پر ہے کہ اس دوران میں اس کو رجوع کر لینے کا حق ہے۔ نیز اس بنا پر کہ اس کی اولاد کے نسب کا ثبوت اس بات پر منحصر ہے کہ عدت کے زمانہ میں عورت کا حاملہ ہونا یا نہ ہونا ظاہر ہو جائے۔ اولاد کا حق اس میں شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اپنے باپ سے بچے کا نسب کا ثابت ہونا اس کے قانونی حقوق قائم ہونے کے لئے ضروری ہے اور اس کے اخلاقی مرتبہ کا انحصار بھی اس امر پر ہے کہ اس کا نسب مشتبہ نہ ہو۔ پھر اس میں حق اللہ یا حق الشرع، اس لئے شامل ہو جاتا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے اور اپنی اولاد کے حقوق کی پرواہ نہ بھی ہو تو خدا کی شریعت ان حقوق کی حفاظت ضروری سمجھتی ہے ۔ ۔ ۔ الخ" (تفہیم القرآن

POPE PIUS (۱۹۲۲-۱۹۳۹ء) نے CASTICONUBII (پُرلطف ازدواجی بندش) نامی ایک خط برائے تشہیر جاری کیا اور اُس میں نہایت فیصلہ کن طریقے پر بیان کیا کہ "مرد و زن کے درمیان ازدواجی تعلقات کا بنیادی مقصد افزائش اولاد ہے۔ وہ افراد جو بحالت تذبذب ایسا کر کے قانونِ فطرت میں افراط و تفریط پیدا کرتے ہیں اُن ہ مقصد فطر.... کے منافی گناہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ ایسے فعل کا ارتکاب کرتے ہیں جو باعث شرم و حد درجہ بُرا اور نفرت انگیز ہے۔" (ایضاً)

پوپ پائیس کے جانشین پائس دوازدھم PIUS - XII (۱۹۳۹-۱۹۵۸ء) نے کہا کہ "طبی، معاشی، معاشرتی و طبیعی محرکات شادی شدہ جوڑوں کو اپنے خاندان مختصر و محدود رکھنے کے قابل قبول جواز ہیں۔" (ایضاً)

پوپ جان بست و سہ (۲۳) POPE JOHN - XXIII نے اس معاملہ کی تحقیق کے لئے ایک مخصوص کمیشن مقرر کیا۔ اس کمیشن کی خفیہ رپورتاژ، جو بعد میں خفیہ نہ رہی تھیں، نے ۱۹۶۶ء میں پال ششم PAUL - VI کو "خود غرض مقاصد کے لئے بچوں سے بچنے کے خلاف متنبہ کیا۔" (ایضاً)

پائیس دوازدہم (۱۲) PIUS - XII کے اقتدار کے بعد رپورتاژ "تعلیم یافتہ انسان اور سائنس" کے درمیان تعاون و تطبیق کی دعوت دی تاکہ "تحدید نسل کے عمدہ انسانی وسائل" دریافت ہوسکیں۔ اخلاق و اقدار بچے، ماں باپ اور خاندان کی فلاح پر منحصر ہیں نہ کہ کسی خصوصی عمل کے ذریعہ زرخیز ہونے پر۔" (ایضاً)

لیکن ۱۹۶۸ء میں پال کے پیغام HUMANAE VITAE (انسانی زندگی) نے اس نظریہ کو قطعاً رد کر دیا اور واضح کیا کہ تحدید نسل کے جملہ غیر فطری وسائل ناقابل قبول ہیں ..... الخ۔" (ایضاً)

پال نے ازدواجی تعلقات کے دوران یا اس سے قبل یا اس کے بعد کسی ایسے طریقہ کو استعمال کرنا، جو ولادت کو ناممکن بنا سکے، خلافِ قانون گردانا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ غیر فطری وسائل کا کثیر استعمال جنسی اقدار کے پست معیار کو فروغ دے گا۔ جان پال دوئم تحدید نسل کے خلاف یہاں بیان کردہ وجوہ کے متعلق کچھ مختلف نظریہ کے قائل ہیں ..... الخ۔" (ایضاً)

مفصّل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "حاملہ مطلقہ خواہ رجعیہ ہو یا مبتوتہ اس کی سکونت اور

(بقیہ حاشیہ ص۱۸۱) کی عدّت کی مدّت اس کے وضع حمل تک ہے"۔ (ابن جریر و ابن ابی حاتم، حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اگرچہ اس روایت کی سند میں کلام کی گنجائش ہے لیکن چونکہ یہ متعدد اسناد سے منقول ہے اس لئے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کی کوئی اصل ضرور ہے)۔ اسکی تائید ایک اور واقعہ سے ہوتی ہے سبیعہ اسلمیہ عہد نبوی میں بحالت حمل بیوہ ہوئی تھیں اور شوہر کی وفات کے چند روز بعد (بعض روایات میں ۲۰ دن بعض میں ۲۳ دن، بعض میں ۲۵ دن، بعض میں ۴۰ دن اور بعض میں ۳۵ دن بیان ہوئے ہیں)، اُن کو وضع حمل ہو گیا تھا۔ حضورؐ سے اُن کے معاملہ میں فتویٰ پوچھا گیا تو آپ نے ان کو نکاح کی اجازت دے دی (بخاری و مسلم نے اسے بروایت حضرت ام سلمہ کئی طریقوں سے نقل کیا ہے۔ ا[illegible] بخاری، مسلم، امام احمد، ابو داؤد، نسائی و ابن ماجہ نے مختلف اسناد کے [illegible] بن مخرمہ سے بھی روایت کیا ہے۔ خود سبیعہ اسلمیہ کا بیان ہے کہ: میں حضرت سعد بن [illegible] کی بیوی تھی، حجۃ الوداع کے زمانے میں میرے شوہر کا انتقال ہو گیا جب کہ میں حاملہ تھی۔ وفات کے چند روز بعد میرے ہاں بچہ پیدا ہو گیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ تم چار مہینے دس دن سے پہلے نکاح نہیں کر سکتیں۔ میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فتویٰ دیا کہ تم وضع حمل ہوتے ہی حلال ہو چکی ہو۔ اب چاہو تو دوسرا نکاح کر سکتی ہو۔ (مسلم، اس روایت کو بخاری نے بھی باختصار نقل کیا ہے۔) صحابہ کی کثیر تعداد سے یہی مسلک منقول ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہؓ بن عمر سے حاملہ بیوہ کا مسئلہ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ اس پر انصار میں سے ایک صاحب بولے کہ حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر شوہر ابھی دفن بھی نہ ہوا ہو بلکہ اسکی لاش اس کے بستر پر ہی ہو اور اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہو جائے تو وہ دوسرے نکاح کے لئے حلال ہو جائے گی۔ یہی رائے حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو مسعودؓ بدری اور حضرت عائشہؓ کی ہے۔ اور اسی کو ائمہ اربعہ اور دوسرے اکابر فقہاء نے اختیار کیا ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر حاملہ کے پیٹ میں ایک سے زیادہ بچے ہوں تو آخری بچے کی ولادت پر عدت ختم ہو گی۔ بچہ خواہ مردہ ہی پیدا ہو اس کی ولادت سے عدت ختم ہو جائے گی۔ اسقاط حمل کی صورت میں اگر دائیاں اپنے فن کی

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی سکونت اور اُس کے نفقہ کا ذمہ دار شوہر کو قرار دیتا ہے کہ حاملہ عورت کی عدت یہ ہے کہ اس کا وضع حمل ہو جائے[1] امام ابوبکر جصاص اسلام کی اس باریک بینی و حکمت عملی پر

(حاشیہ ۱۰، ج ۲، ص ۱۱۰-۱۱۱ حاشیہ ۸۶ شق ۲) - عدت کے اس حق کو ادا کرنے کا طریقہ قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے -

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا
بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ط (البقرۃ - ۲۳۴)

"ترجمہ: تم میں سے جو لوگ مر جائیں ان کے
پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے
آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں -
پھر جب ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں
اختیار ہے اپنی ذات کے معاملے میں معروف
طریقے سے جو چاہیں کریں"

---

[1] قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :-

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ
يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ط (الطلاق - ۴)

"ترجمہ :- اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ
اُن کا وضع حمل ہو جائے"

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۳۴ اور سورۃ الطلاق کی آیت ۴ سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ حاملہ مطلقہ کی عدت تو وضع حمل تک ہی ہے مگر بیوہ حاملہ کی عدت اٰخر الاجلین ہے - یعنی مطلقہ کی عدت اور حاملہ کی عدت میں سے جو زیادہ طویل ہو وہی اس کی عدت ہے - حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ سورۃ الطلاق کی یہ آیت سورۃ البقرہ کی آیت کے بعد نازل ہوئی تھی اس کے بعد کے حکم نے پہلی آیت کے حکم کو غیر حاملہ بیوہ کے لئے خاص کر دیا ہے - اور ہر حاملہ کی عدت وضع حمل تک مقرر کر دی ہے خواہ وہ مطلقہ ہو یا بیوہ - اس مسلک کی تائید حضرت اُبی بن کعب کی یہ روایت کرتی ہے : وہ فرماتے ہیں جب سورہ طلاق کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یہ مطلقہ اور بیوہ دونوں کے لئے ہے ؟ حضورؐ نے جواب دیا : ہاں - ایک دوسری روایت میں حضورؐ نے مزید تصریح فرمائی ہے :- " اجل کل حامل ان تضع ما فی بطنھا یعنی ہر حاملہ عورت

منقول ہوا ہے۔ (احکام القرآن) ابن ابی یعلیٰ کہتے ہیں کہ "اس کا نفقہ متوفی شوہر کے مال میں اسی طرح واجب ہے جس طرح اس کے مال میں کسی کا قرض واجب ہوتا ہے" (احکام القرآن) امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ امام زفرؒ کہتے ہیں کہ "میت کے مال میں اس کے لئے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقہ کا کیونکہ موت کے بعد میت کی کوئی ملکیت ہی نہیں ہے اس کے بعد تو وہ وارثوں کا مال ہے۔ اُن کے مال میں حاملہ بیوہ کا نفقہ کیسے واجب ہو سکتا ہے" (ہدایہ، احکام القرآن) یہی مسلک امام احمدؒ بن حنبل کا بھی ہے۔ (الانصاف) امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ "اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے البتہ اسے سکونت کا حق ہے" (مغنی المحتاج) اس کا استدلال حضرت ابوسعید خدریؓ کی بہن، فریعہ بنت مالکؓ کے اس واقعہ سے ہے کہ ان کے شوہر جب قتل کر دیئے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ شوہر کے گھر ہی میں عدت گزاریں (ابوداؤد، نسائی و ترمذی) مزید برآں ایک اور روایت میں حضورؐ نے فرمایا لیس للحامل المتوفی عنہا زوجہا نفقہ "بیوہ حاملہ کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے" (دارقطنی) یہی مسلک امام مالکؒ کا بھی ہے (حاشیہ الدسوقی)۔ صلۂ رحمی اور تقویٰ کا تقاضہ یہی ہے کہ بیوہ خواہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ اُسے سکونت و نان و نفقہ کچھ عرصہ دیا جائے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ	"ترجمہ:۔ تم میں سے جو لوگ وفات
وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا	پائیں اور پیچھے بیویاں چھوڑ رہے
وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا	ہوں ان کو چاہیئے کہ اپنی بیویوں
اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ	کے حق میں یہ وصیت کر جائیں
(البقرہ ۔ ۲۴۰)	کہ ایک سال تک ان کو نان و نفقہ

دیا جائے اور وہ گھر سے نہ نکالی جائیں"

عن عبداللہ بن عمرؓ۔ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

السمع والطاعۃ

علی المرء المسلم فیما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیۃ

اس کا نفقہ شوہر پر واجب ہے اور غیر حاملہ رجعیہ کے لئے بھی یہ دونوں حقوق ہیں "۔ (احکام القرآن للجصاص)

قرآن کریم میں خدا تعالےٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ "ترجمہ :۔ اور اگر مطلقہ حاملہ ہو اس کے وضع حمل تک نفقہ ادا

(الطلاق - ٦)

حقوق الجنین والحاملہ میں سے یہ امر متفق علیہ ہے کہ مطلقہ خواہ رجعیہ ہو اگر حاملہ ہے تو وضع حمل تک اُس کی سکونت اور اُس کے نفقہ کا ذمہ دار شوہر اگر حاملہ کا شوہر مر گیا ہو تو ایسے حالات میں فقہائے اسلام سے مختلف اقوا ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، قاضی شر شعبی، ابراہیم نخعی اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ شوہر کے مجموعی کا نفقہ واجب ہے۔ (رُوح المعانی و احکام القرآن)۔ حضرت عبداللہ بن ع دوسرا قول یہ ہے کہ اس پر اس کے پیٹ کے بچہ کے حصے میں سے خرچ اگر میت نے کوئی میراث چھوڑی ہو۔ اگر نہ چھوڑی ہو تو میت کے ورثاء کو ا کرنا چاہیئے کیونکہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے : وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ : ۲۳۳ -" (ابن جریر) حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضر حضرت سعید بن المسیب اور حضرت عطاء بن ابی رباح کہتے کہ " متوفی شوہر اس کے لئے کوئی نفقہ نہیں ہے " حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ١٩) رو سے یہ کہیں کہ یہ محض خون کا لوتھڑا نہ تھا بلکہ اس میں آدمی کی صور تھی یا یہ رسُولی نہ تھی بلکہ آدمی کی اصل تھی تو ان کا قول قبول کیا جائے گا اور عدت (مغنی المحتاج) حنابلہ اور حنفیہ کا مسلک بھی اس کے قریب ہے مگر اسقاط کے معاملہ میں یہ ہے کہ جب تک انسانی بناوٹ ظاہر نہ پائی جائے محض دائیوں کے اس بیان ہی کی اصل ہے اعتماد نہیں کیا جائیگا اور اس سے عدت ختم نہ ہو گی ۔ (ا الانصاف)

اس خداپرستانہ زندگی کو اس کی صحیح صورت میں باقی رکھنے کے لئے تنظیم کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلم معاشرہ وپر خدا کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے درمیان سمع وطاعت کا نظام قائم کرے۔ یعنی وہ اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو سربراہ مقرر کرے اور جب ان کا تقرر ہو جائے تو پسند ناپسند کو نظر انداز کر کے ان کی اطاعت کرے۔ نماز باقاعدہ اقامت، زکوٰۃ کی اجتماعی وصولی اور تقسیم، دعوت دین کا عمومی نظام، سب اسی وقت بہتر طور پر ادا سکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان اجتماعی نظم قائم ہو، ان میں کچھ ایسے لوگ مقرر ہوں جو اس کی نگرانی کریں اور م لوگ اس کو ایک دینی فریضہ سمجھ کر اپنے سربراہوں کی اطاعت کریں۔

اس تنظیم سے مراد حکومتی تنظیم نہیں ہے۔ بلکہ وہ تنظیم ہے جو ہر حال میں مسلمانوں کے اپنے بس میں ہے، وان کے پاس سیاسی اقتدار ہو یا نہ ہو۔ اسلامی تنظیم حقیقۃً ایک عبادت ہے اور عبادت وہی مطلوب اور بہتر ہے جو اختیاری طور پر ہو نہ کہ کسی خارجی دباؤ کے تحت۔ اسلامی تنظیم در اصل اس بات کی ایک دنیوی علامت نہ آدمی نے اپنے آپ کو خدا کے حکم کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلامی تنظیم میں اپنے کو باندھنا گویا خدائی اطاعت کے دان میں پورا اترنا ہے اور اسلامی تنظیم میں بندھنے کے لئے تیار نہ ہونا گویا اس خدائی امتحان میں ناکام جانا ہے۔

مزید یہ کہ سیاسی اقتدار بذات خود تنظیم کے وجود کا ضامن نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ زمانہ میں حکومتی اقتدار موجود تھا، اس کے باوجود مسلمانوں کی تنظیم منتشر ہو گئی۔ اسی طرح بعد کے دور میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تنظیم سے مراد ویسی ہی ایک اختیاری تنظیم ہے ن کہ مسجد میں امام کی سربراہی میں نماز کی جماعت بندی کے لئے ہر روز ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی خاطر اپنی آزادی پر ہری لگانا ہے۔ یہ تمام تر ایک اختیاری تنظیم ہے اور اس کا ثواب کسی آدمی کو صرف اس وقت ملے گا جب کہ نے اپنے آزاد ارادہ سے اس کی ماتحتی قبول کی ہو۔ جبر کے تحت قائم شدہ تنظیم بعض دنیوی فائدے دے سکتی گر وہ آدمی کو خدا کے یہاں ثواب کا مستحق نہیں بناتی، نہ اس سے وہ برکتیں ظاہر ہو سکتیں جو حقیقی اسلامی ہم کے لئے خدا نے مقدر کی ہیں۔

دور نبوت میں اس قسم کی تنظیم کی ایک مثال وہ ہے جو ابتدائی دور میں مدینہ میں اختیار کی گئی۔ ہجرت پہلے مدینہ کے ۷۲ آدمی مکہ پہنچے اور آپ سے بیعت ہوئے۔ اس وقت مدینہ میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے بیعت کے بعد ان سے کہا کہ تم لوگ بارہ آدمی منتخب کرو جن کو میں تمہارے اوپر نقیب (نگراں) بنا دوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اندر سے بارہ آدمی چنے۔ آپ نے ان کو مدینہ کے مسلمانوں پر نگراں مقرر فرمایا اور کہا کہ تم قوم کی اجتماعی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہو (انتم کفلاء علی قومکم) مسلمان عرب سے نکل کر جب مختلف ملکوں گئے تو اسی طرح وہ اپنی تنظیم بنا کر اس کی ماتحتی میں منظم زندگی گزارتے رہے۔ جب تک انھوں نے ایسا کیا کے اوپر خدا کا سایہ باقی رہا۔ جب انھوں نے تنظیمی پابندی قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدا کا سایہ بھی ان اوپر سے اٹھ گیا اور وہ دوسری قوموں کے حوالے کر دئے گئے۔

تنظیم

از قلم: مولانا وحید الدین خاں

(ماخوذ از ماہنامہ الرسالہ دہلی، انڈیا)

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے اور اللہ نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں کو مانو اور ان کی مدد کرو اور اللہ کو قرض حسن دو، اگر تم ایسا کرو تو یقیناً میں تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس اس کے بعد تم میں سے جس نے انکار کیا تو اس نے سواء السبیل کھو دی (مائدہ ۱۲)

ایک دانہ کے اندر خدا نے ایک سرسبز و شاداب پودا چھپا رکھا ہے اور ایک گٹھلی کے اندر ایک پورا درخت موجود ہے۔ مگر یہ امکانات صرف اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب کہ دانہ یا گٹھلی کو مٹی میں ڈالا جائے۔ اگر ان کو شیشہ کی میز پر سجا کر رکھ دیا جائے تو نہ دانہ سے پودا نکلے گا اور نہ گٹھلی کبھی درخت کی صورت اختیار کرے گی۔ اسی طرح اللہ نے دنیا کی ہر چیز کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے اٹل ہے۔ ہر چیز اسی مقررہ قاعدہ پر قائم ہوتی ہے اور اسی کے مطابق بڑھتی ہے۔ اگر اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی جائے تو کبھی مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ جو قوم آسمانی کتاب کی حامل ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا مخصوص ضابطہ ہے۔ ایسی قوم کس طرح زمین میں جڑ پکڑتی ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح حاصل کرتی ہے، اس کا ضابطہ مذکورہ آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس قرآنی ضابطہ کو یہاں سواء السبیل کہا گیا ہے۔

سواء السبیل (اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ) یہ ہے کہ آدمی دنیا میں ایک قسم کی پابند زندگی گزارے۔ وہ اس طرح رہے گویا کہ وہ خدا کے عہد کی رسی میں بندھا ہوا ہے۔ اس عہد کی زندگی کی پہلی شرط، ایمان کے بعد، یہ ہے کہ آدمی نماز قائم کرے یعنی اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دے، وہ اللہ کی قربت تلاش کرنے والا بن جائے۔ پھر وہ زکوٰۃ ادا کرے۔ یعنی وہ دوسرے بندوں کا اس حد تک خیر خواہ ہو کہ اپنی کمائی میں ان کا لازمی حق سمجھنے لگے۔ پھر یہ کہ اللہ کے دین کی دعوت کے معاملہ میں وہ غیر جانب دار نہ رہے، بلکہ اس میں اپنے آپ کو پوری طرح شامل کرے، وہ داعیان دین کی مدد کرے۔ اپنے بہترین اثاثہ کو اس کام کو مؤثر اور طاقتور بنانے میں لگا دے۔ یہی وہ عہد کی زندگی ہے جو ہر فرد مسلم سے مطلوب ہے، اس زندگی کو اختیار کئے بغیر کوئی شخص خدا کی قربت و معیت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس قابل قرار پا سکتا کہ خدا اس کی مدد کرے۔

مدیر "ترجمان القرآن" کی خدمت میں

از قلم

مولانا سیّد وصی مظہر ندوی

مہتمم مدرسہ جامعہ اسلامیہ و میئر بلدیہ حیدر آباد

ذیل میں مولانا سید وصی مظہر ندوی کی ایک تحریر ایک تمہیدی نوٹ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے - اس تمہیدی نوٹ میں موصوف نے جس قدر لجاجت سے "میثاق" میں اس تحریر کی اشاعت کی استدعا کی ہے اس کے پیش نظر یہ وضاحت ضروری محسوس ہوئی کہ ماہنامہ 'میثاق' اور ان سطور کے راقم پر مولانا ندوی کا "حق" نہایت قدیم بھی ہے اور حد درجہ 'ثابت' بھی -

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فروری ۱۹۵۷ء میں (فی الوقت کالعدم) جماعت اسلامی کا جو کل پاکستان اجتماع ارکان ماچھی گوٹھ (نزد صادق آباد ضلع رحیم یار خاں) میں پالیسی سے متعلق اختلافات پر تفصیلی بحث اور حتمی فیصلہ کے لئے منعقد ہوا تھا اس میں کوئی باقاعدہ 'حزب اختلاف' تو اگرچہ موجود نہ تھی، تاہم جس پالیسی پر تقسیم ہند کے بعد سے لے کر اس وقت تک عمل ہوتا آیا تھا اُس سے فی الجملہ اختلاف رکھنے والے بہت سے اکابر و اصاغر موجود تھے - ان میں سے اکابر کی اکثریت کا معاملہ تو بد قسمتی سے کچھ گول مول سا رہا اور وہ بعض مصالح کے پیش نظر یا مجبوریوں کے باعث کھل کر اپنا موقف پیش نہ کر سکے - لہٰذا میدان میں صرف چند 'اصاغر' رہ گئے - مثلاً ان سطور کا عاجز و ناکارہ راقم ـــــ یا برادرم ارشاد احمد

جو لوگ اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو ایک اسلامی تنظیم کا پابند کریں وہ اس بات کا ثبوت د
کہ وہ بے نفس لوگ ہیں، انھوں نے اللہ کی خاطر اپنی انانیت کو ختم کر دیا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو
بنا لینا موجودہ دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ کی نظر میں جو لوگ اس معیار پر پورے اتریں ان کے
وہ اپنی ہر قسم کی نعمتیں انڈیل دیتا ہے، وہ دنیا میں بھی عزت اور غلبہ حاصل کرتے ہیں اور آخرت کی سر
بھی ان کے لئے مقدر کر دی جاتی ہے۔ جو لوگ بے نفسی کی حد تک خدا کے فرماں بردار بن جائیں ان کے
جب کوئی صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں۔ ان کا باہمی اتحاد کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ اللہ
کے راستہ کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی بے نفسی ان کو ہر اس چیز کی طرف بڑھنے سے روک دیتی ہے
دنیا و آخرت میں برباد کرنے والی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کا راز بے نفسی ہے۔ اور کوئی آدمی بے نفس
یا نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت تنظیم کے ذریعہ ملتا ہے۔ تنظیمی زندگی میں اپنے کو باندھنا اس کے بغیر نہ
ہو سکتا کہ آدمی نفسانی محرکات سے اوپر اٹھ گیا ہو۔ وہ تنقید اور تعریف سے بلند ہو۔ وہ اختلاف اور اتّ
بنیاد پر کسی کے بارے میں رائے قائم نہ کرتا ہو۔ اس کا رویہ پسند ناپسند کی بنیاد پر نہ بنتا ہو۔ وہ اس سے
ہو چکا ہو کہ اس کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ تنظیمی زندگی میں اس طرح کے مواقع بار بار آتے ہیں۔ اگر آد
چیزوں سے اوپر اٹھا ہوا نہ ہو تو وہ اسی قسم کی باتوں میں الجھ کر رہ جائے گا اور تنظیم کی پابندی کو قبول
میں ناکام رہے گا۔

اللہ کے مومن بندوں پر اللہ کی دو سب سے بڑی نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کی نصرت
بن جاتے ہیں، وہ دنیا میں اپنے مخالفین کے مقابلہ میں خدا کی مدد سے غالب آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ موت کے
جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دئے جاتے ہیں۔ اللہ کی یہ دونوں نعمتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ کی خ
انفرادیت کو ختم کرکے اجتماعیت کے بندھن میں بندھ جائیں اور اس کے تحت اپنی دینی اور اخلاقی زندگی کو م

جو لوگ اپنے آپ کو اللہ میں اس طرح شامل کر لیں کہ اپنی انفرادیت کو وہ اس کے حوالے کر دیں،
طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کے درمیان وہ تمام اسباب بالکل ختم ہو جاتے ہیں جو ایک کو د
سے جدا کرنے والے ہیں۔ اجتماعیت کو توڑنے والی چیز انفرادیت پر اصرار ہے اور اپنی انفرادیت کو اللہ کے
کرکے پہلے ہی وہ اس سے اوپر اٹھ چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا پورا گروہ ایک متحدہ طاقت میں ڈھل جاتا۔
جہاں اتحاد ہو وہاں مغلوبیت کا گزر نہیں۔

جو لوگ انفرادی قربانی کی سطح پر دین کو اختیار کر لیں، ان کی زندگی خدا رخی زندگی بن جاتی ہے
اس شاہ راہ پر چل پڑتے ہیں جو خدا کی قربت اور اس کی جنت کی طرف جانے والی ہے۔ ان کا سفر کبھی
ہوتا، وہ کبھی راستہ کے دائیں بائیں نہیں مڑتے۔ وہ دین کے سیدھے راستے پر چلتے رہتے ہیں یہاں تک ک
جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

حقانی وغیرہ اور ان میں سے بھی سب سے زیادہ "رسوائی" راقم ہی کے حصے میں آئی! چنانچہ جب راقم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی پیش کردہ قرارداد کے مقابلے میں ایک متبادل قرارداد پیش کر کے اس پر تقریر کرنے یا صحیح تر الفاظ میں اختلافی بیان "پڑھنے" میں معروف تھا تو اس وقت جہاں اس نوع کی متضاد "بیداد" سے سابقہ پیش آیا کہ کسی نے تو کھڑے ہو کر کہا کہ "ہمارے پاس اس بکواس کو سننے کیلئے وقت نہیں ہے!" (اور شاید یہ بات قارئین کی دلچسپی ہی نہیں "تفننِ طبع" کا ذریعہ بنے کہ اس قول کے قائل وہ صاحب ہیں جن کا شمار بعد میں 'تحریکِ جمہوریت' کے قائدین میں ہوا، اعنی پروفیسر عبدالغفور صاحب آف کراچی) اور کسی نے راقم کو 'قائدِ حزبِ اختلاف' قرار دے ڈالا اور ایوان سے مطالبہ کیا کہ اس حیثیت میں راقم کو اظہارِ رائے کا بھرپور موقع دیا جائے (یاد پڑتا ہے کہ یہ تھے جناب راؤ خورشید علی خان صاحب) وہاں یہ مسئلہ بھی شدت کے ساتھ سامنے آیا کہ اتنے طویل بیان کے لئے جتنا وقت درکار ہے اس کے لئے اجتماع کی مدت میں پورے ایک دن کی توسیع ضروری ہو جائے گی۔ اس پر ایک جانب تو کھڑے ہوئے محترم سردار محمد اجمل خان صاحب لغاری جنہوں نے یہ فرما کر راقم کے لئے شرمندگی کا سامان پیدا کیا کہ "ڈاکٹر اسرار جیسے کارکن تحریکوں کو روز روز نہیں ملا کرتے اگر ان کے خطاب کی وجہ سے اجتماع کی مدت میں ایک دن کی توسیع ناگزیر ہو تو اس کے جملہ اخراجات میں اپنے ذمے لیتا ہوں!" اور دوسری جانب کھڑے ہوئے مولانا سید وصی مظہر صاحب ندوی جنہوں نے فرمایا کہ: "میں نے بھی تقریر کا نوٹس دیا ہوا ہے، لیکن میں اسے واپس لے کر اپنا وقت بھی ڈاکٹر اسرار کو دیتا ہوں!" ——— راقم الحروف پر مولانا کے اس احسان کی بنا پر مولانا کا حق 'میثاق' کے صفحات پر ثابت ہی نہیں قائم و دائم ہے جسے وہ پورے اطمینان کے ساتھ استعمال فرما سکتے ہیں۔ ——— اسرار احمد

آپ کے اشارات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ مسائل کے بارے میں تحریک کے ندازِ فکر و عمل (APPROACH) میں کیا خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں - آپ نے سوال ہی ے انداز میں سہی تحریک اور اُس سے وابستہ افراد کی ان تمام غلطیوں اور کمزوریوں کو نح طور پر بیان کر دیا ہے - جن میں وہ مُبتلا ہو چکے ہیں - مثلاً محرمات کے ساتھ مصالحت، صلاحِ ذات کے معاملے میں غفلت، دعوتی رابطوں کی وسعت اور گہرائی میں خطرناک حد تک کمی، تعلّق باللہ کے باب میں سہل انگاری - پارلیمانی سیاست میں مبتلا ہو کر الف سیاسی پارٹی کے سے انداز و اطوار کو اپنانا محض وقتی حالات کے مدّوجزر پر نگاہ رکھنا ور کارِ دعوت سے بے نیازی پارلیمانی سیاست یا کسی موجود الوقت سیاسی نظام کے خلاف ملی تحریک کے ضمنی مشاغل کو اصل کام سمجھ لینا، جوشیلی تقریریں اور غیر حقیقی قوت کی نمائش لیکن حقیقی قوت کے حصول کی کوشش میں تغافل و تساہل سیاسی منافرت انگیزی میں شدّت، دعوتی خیر خواہی اور ہمدردی کا فقدان، بندگانِ خدا کو بندگیٔ رب کی طرف لانے کی کوشش ترک کر کے محض رائے دہندگان کی تعداد میں اضافے کے درپے ہونا -

غرض یہ کہ آپ نے دین و سیاست کو جمع کرنے یا انتخابی اور دعوتی سرگرمیوں کو بیک وقت لے کر چلنے کے تجربے میں اس حد تک ناکامی کا اعتراف کر لیا کہ سیاسی اور خانقاہی دائرو ں تقسیم کی تجویز کو بھی ناگزیر برائی کی حیثیت سے قبول کر لینے پر آمادگی ظاہر کر دی -

جون ۱۹۸۳ء کے شمارے میں یہ سارے اعتراف موجود ہیں جن کو دیکھ کر ایک طرف آپ کے مطالعۂ حالات کی صداقت، دوسری طرف غلطیوں اور کوتاہیوں کے اعتراف کی جرأت کو داد دینی پڑتی ہے - لیکن جولائی کے شمارے میں یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ آپ نے اس صورتِ حال کی گہرائی میں اُتر کر اسکے اصل اسباب معلوم کرنے کی یا تو سرے سے کوشش ہی نہیں کی یا اصل اسباب کو عمداً نظر انداز کر کے سطحی طور پر انہی تدابیر کا اعادہ کر دیا جن کے بارے میں تحریک اور اُس سے وابستہ حضرات کا عملی جواب یہ رہا ہے - کہ

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

خدارا مجھے بتائیے کہ آپ نے جولائی کے شمارے میں اصلاحِ احوال کے لئے جن تدبیروں کا ذکر کیا ہے - کیا اُن میں کوئی ندرت ہے ؟ کیا وقتاً فوقتاً تحریک کے پُرانے

دستی اور مہارت ہے کی ہے کہ میں باہر سے مخالفت کرنے والوں اندر رہ کر اختلاف کرنے والوں اور تحریک سے علیحدہ ہو جانے والوں کے تمام مذموم خصائص کا مجموعہ نظر آنے لگا ہوں۔ بہر حال مجھے ملا جیاں سنانا جو بھی انکی داخلی ضرورت ہے۔ جسکے ذریعہ اپنے مؤکلوں کو مخلصانہ وکالت کا یقین دلا سکتے ہیں اس لئے گالیاں سنکر "بے مزہ" نہ ہونگا۔

ان کا مؤکل نعیم صاحب کے اس اظہار کے علی الرغم کہ وہ میرے جواب دینے کے لئے موجود نہیں ہے: اپنے نام نہاد دستور اور ملک کے رائج الوقت نظام کے خلاف زیر زمین پورے تنظیمی ڈھانچے کے ساتھ موجود ہے۔ انتخاب بھی ہو رہے ہیں اور اجتماعات بھی حق کا اختلاف رکھنے والوں کے محض ربط وضبط کی بنا پر رکنیت کی معطلی اور معافی کے بعد بحالی کے فیصلے بھی کئے جا رہے ہیں اس وجہ سے مجبوراً میں اپنی تحریر کی اشاعت کیلئے ماہنامہ میثاق سے درخواست کر رہا ہوں کہ وہ اگر ممکن ہو سکے تو ان کی اشاعت کے لئے اپنے چند قیمتی صفحات کا زیاں برداشت کرے ممکن ہے کہ "گھر والوں" میں سے کسی کی نظر میری اس تحریر پر پڑ جائے اور ان کو معلوم ہو جائے کہ یہ ایک ایسے مظلوم کی فریاد ہے جو گھر سے نکلا نہیں نکالا گیا ہے۔

فقط والسلام سید وصی مظہر ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اپریل تا جون ۱۹۸۰ء کے اشارات میں آپ نے تحریک اسلامی اور دعوت اسلامی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ اس کی وجہ سے میرے اس یقین میں اور بھی اضافہ ہوا کہ آپ کو گذشتہ چند برسوں میں اگرچہ تحریک اسلامی کے عملی حالات سے دور رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن حالات کی ہر کروٹ پر آپ نگاہ رکھتے ہیں۔ اور تحریک جن اجتماعی و انفرادی مسائل سے دوچار ہے ان سے آپ بخوبی واقف ہیں۔

ہونے کی اتنی پرزور وکالت کی کہ خود اپنے استدلال سے متأثر ہو گئے۔ اور ہم نے سمجھنا شروع کر دیا کہ فی الواقع پاکستان کے مسلم معاشرے میں وہ تمام ابتدائی کام مکمل ہو چکا ہے جو اقامتِ دین کے لئے ضروری ہے۔ اور اب معاشرے میں دین کو نافذ کرنے کی شدید طلب پیدا ہو چکی ہے۔ بس ایک دفعہ ان کو اظہارِ رائے کا موقع مل جائے تو صالح قیادت برسرِ کار آجائیگی۔ اور دین کی اقامت کا کام مکمل ہو جائے گا

لیکن جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دشمنوں نے بتدریج جمہوری عمل ... کر دیا۔ اور اس طرح ہماری لڑائی کا رُخ بھی بتدریج جمہوریت کی بحالی۔

اس طویل جنگ میں ہم کو یقین ہوتا چلا گیا کہ دشمن جمہوریت کی راہ اس لئے روک رہا ہے کہ اگر آزادانہ انتخاب ہوئے تو جمہور کا فیصلہ اسلامی نظام کے حق میں جائے گا۔ اس ... ہم بجد خلوص کے ساتھ بحالیٔ جمہوریت کی "مقدس جنگ" میں ہمہ تن مشغول ہو گئے کاش! جمہوریت کو یہاں ایک ہی دفعہ میں ختم کر دیا گیا ہوتا تو شاید ہم کو اپنے طریقِ پر نظر ثانی کی توفیق مل جاتی۔ لیکن جمہوریت کو آہستہ آہستہ ختم کیا گیا۔ اس لئے جمہوریت کی بحالی کے لئے ہماری جدوجہد بھی بتدریج شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔

پھر ہم کو صوبائی یا مرکزی سطح پر چند بار انتخابات میں حصہ لینے کا جو موقع ملا۔ اس میں ہم کو جن ہزیمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے سبق حاصل کرنے کی بجائے ہم نے یہ فلسفہ بیان کرنا شروع کر دیا کہ عوام کی تعلیم اور کارکنوں کی تربیت کیلئے انتخابات میں بار بار شرکت ضروری ہے۔ لیکن ہم بھول گئے کہ انتخابات میں عوام کی تعلیم اور انتخابی مہم میں حصہ لینے والوں کی تربیت جس انداز کی ہوتی ہے وہ تحریکِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے بالکل منفی تعلیم و تربیت ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جو نگاہوں سے اوجھل ہو جانے کے باعث یا یوں کہئے کہ جس کو عمداً دیکھنے سے انکار کے باعث ہماری ساری تگ و دو ہم کو تحریکِ اسلامی کے تقاضوں سے دُور کرتی چلی گئی۔ انتخابات کے اندر ہماری ہر ناکامی ہم کو نہایت مؤثر عملی انداز میں تحریکِ اسلامی کے ان خدا ... کو چھوڑنے پر مجبور کرتی چلی گئی جو کہ انتخابی طریقہ کار سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور اُن طور طریقوں کو اپنانے کا عملی سبق ملتا چلا گیا جن کے ذریعے دوسرے لوگ انتخابات میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

کیا جاتا ہے نہ کہ معرفت "۔ اسی طرح خطبات میں انہوں نے مولانا روم کے مندرجہ ذیل زوردار اشعار نقل کئے ہیں :

دفترِ صوفی سواد و حرف نیست ÷ جز دلِ اسپید مثل برف نیست
زادِ دانش مند آثارِ قلم ÷ زادِ صوفی چیست؟ آثارِ قدم
ہمچو صیاد ے سوئے اشکار شد ÷ گام آہو دید و بر آثار شد
چند گاہش گام آہو در خور است ÷ بعد ازاں خود نافِ آہو رہبر است
راہ رفتن یک نفس بر بوئے ناف ÷ بہتر از صد منزل و گام و طواف

ان اشعار کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

"علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے عبادت ہی کی ایک شکل ہے اس لئے فطرت کا علمی (سائنسی) مشاہدہ بھی کچھ ویسا ہی عمل ہے جیسے حقیقت کی تلاش میں صوفی کا سلوک و عرفان کی منزلوں کو طے کرنا کہا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بحالتِ موجودہ اس کی نگاہیں گامِ آہو پر ہیں، اس لئے اس کا جادۂ طلب بھی محدود ہے لیکن اسکی تشنگیٔ علم اسے بہت جلد اس مقام پہ لے جائے گی جہاں گامِ آہو کی بجائے نافۂ آہو (کی خوشبو) اس کی رہبری کرے گی۔ عالمِ فطرت پر یوں ہی اسے مزید غلبہ حاصل ہوگا اور یوں ہی اسے وہ بصیرت ملے گی جس کی فلسفہ کو آرزو تو ہے لیکن جس کا حصول اس کے لئے ناممکن ہے!"

علامہ اقبال کے یہ خیالات نئے نہیں ہیں، امام غزالی اپنی کتاب : "الحکمتہ فی مخلوقات اللہ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

" برادر! خدا تجھے حقیقت شناسی کی توفیق عطا کرے اور دین و دنیا کی فلاح و کامرانی نصیب فرمائے۔ خدا کی معرفت اس کے عجائبات و مصنوعات میں تدبّر و تفکّر کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی اور درحقیقت یہی معرفت ایمان و یقین کے ثبات و استحکام کا موجب ہے اور اسی سے ابرار و اتقیاء کے منازل و مدارج میں تفاوت ہوتا ہے۔ چونکہ حقیقی معرفت کا حصول مخلوقاتِ الٰہی میں غور و فکر کرنے پہ منحصر تھا۔ اِس لئے اس کتاب کو اربابِ قول کی رہنمائی کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس میں وہ مصلحتیں اور حکمتیں بیان کی گئی ہیں جن کی طرف قرآنِ حکیم کے متعدد مقامات پہ اشارات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقلِ سلیم عطا کی اور وحی کے ذریعے اس کی رہنمائی فرمائی اور اصحابِ نظر اور اربابِ عقول کو اپنی مصنوعات میں غور و فکر کی اپنی اپنی

حماقت کے کچھ نہیں[1]۔ مجملاً شریعت اسلامیہ میں ضبط تولید کا سرے سے کوئی تصور نہیں ہے۔ علمائے اسلام متفقہ طور پر اس کو قطعاً ناجائز و حرام قرار دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قتل اولاد، منع حمل اور اسقاط حمل کو کسی بھی شریعت یا کسی بھی مکتب فکر نے جائز نہیں رکھا ہے، خواہ وہ عیسائی مذہب ہو یا یہودی، اسلامی نظام حیات ہو یا اشتراکی نظریہ[2]۔ ذیل میں ہم ایک انگریزی جریدہ دار کے حوالے سے مذہب عیسائی میں تحدید نسل کے متعلق اُن کے مذہبی احکامات و مذہبی نظریات پیش کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ سب کچھ اسلامی تعلیمات سے مستعار لئے ہوئے نظریات ہیں لیکن پھر بھی قابل قدر ہیں۔

جان پال دوئم (JOHN PAUL - II) نے واشنگٹن کے اپنے حالیہ دورہ میں پونے دو لاکھ سامعین کے اس جلسہ میں اسقاط حمل پر سخت تنقید کرتے ہوئے خطاب فرمایا: "..... ہم ہر وقت اسی نظریہ کے قائل و حامی رہے ہیں کہ انسانی زندگی خطرہ میں ہے۔ اگر پیدائش سے قبل ہی انسانی زندگی پر حملہ کیا جائے تو ہم اس نظریہ کے حامی

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب "ضبط ولادت" مؤلفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

[2] اس امر میں کسی کلام کی گنجائش نہیں کہ اسقاط حمل کائنات و عالم انسانی کے ہر شعبۂ حیات میں ناقابل تلافی نقصان کا موجب ہوتا ہے۔ جیسے کوئی آفاقی یا انسانی نظریہ برداشت نہیں کر سکتا الا یہ کہ وہ اپنی سطح سے فروتر ہو جائے۔ چنانچہ اشتراکی نظام حکومت بھی اسقاط حمل کو قانونی جرم قرار دینے پر مجبور ہو گیا [illegible] بڑھنے پر ماں و اعزاز دیا جائے[3] جناب خورشید احمد [illegible] اسقاط حمل کی قانونی ممانعت لکھنے کے بعد اپنے وضاحتی نوٹ میں [illegible] قانون روس کی تاریخ میں وہ واحد قانون ہے جس کے بارے میں [illegible] فیکٹریوں سے رجوع کیا گیا۔ استصواب رائے کا [illegible] لیکن جب [illegible] آراء کی اکثریت حکومت کے مجوزہ قانون کے خلاف معلوم ہوئیں تو استصواب کو [illegible] دیا گیا اور ۲۷ دسمبر ۱۹۳۶ء کو اسقاط حمل کی ممانعت کا قانون نافذ کر دیا گیا۔" (سوشلزم یا اسلام مؤلفہ خورشید احمد ص ۱۱۶ حاشیہ برائے معلومہ مغربی جرمنی)

خادم انہی خطوط پر اصلاحِ احوال کی کوششیں نہیں کرتے رہے ہیں - ؟ لیکن تحریک نے اُن لوگوں کو سرداروں پر بٹھایا جو پُرجوش مخالفانہ تقریر کے ماہر ہوں - مگر اس کے برعکس جن لوگوں نے سچی خدا پرستی اور پیروئ رسول کی دعوت دی - وہ نامقبول ٹھہرائے جاتے رہے - سوچئے تو سہی کہ کیوں تقریروں اور گفتگوؤں کا رُخ دعوت کی طرف مڑنے کے بجائے ہمیشہ حریفوں پر چوٹیں کرنے پر مرکوز رہا - کیوں پتّہ ماری کے وہ کام جو آپ نے گنائے ہیں - اور جن کی اہمیت کی طرف خود تحریک اور اس کے اہلِ فکر لوگ اکثر توجہ دلاتے رہے ہیں - ہمیشہ نظر انداز کرکے جلسوں، جلوسوں اور پوسٹروں پر پوری قوت صرف کی جاتی رہی -

اگر آپ میری صاف گوئی کو معاف کریں تو میں کہوں گا کہ آپ کے یہ اشارات صرف ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ بن سکتے ہیں - اور وہ یہ کہ تحریک کی صفوں میں اگر کچھ سوچنے والے دماغ اور فکر مندِ دل اب باقی رہ گئے ہوں تو وہ تجزیہ کو دیکھ کر اور تدابیر کو سُن کر ایک دفعہ پھر مطمئن ہو جائیں - اور شجر سے پیوستہ رہ کر امیدِ بہار کے سہارے جیتے یا سسکتے رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ذوق کی یہ خرابی - مذاق کی یہ تبدیلی جس کی بنا پر جو کچھ "ناخوب" تھا وہ بتدریج خوب قرار دے دیا گیا - اس کی بنیادی وجہ کو جب تک دور نہ کیا جائے گا - محض وعظ کے ذریعے اِس انقلابِ معکوس کو نہیں روکا جا سکتا -

اس رجعتِ قہقری یا انقلابِ معکوس کا بنیادی سبب دراصل یہ ہے کہ تحریکِ اسلامی کا وہ نصب العین جس کے لئے یہ قافلہ جمع ہوا تھا - غیر شعوری طور پر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا - اور اس نصب العین کی جگہ بتدریج ایک دوسرے ہی نصب العین نے لے لی - اب آپ اصل نصب العین کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر جن کوتاہیوں کی موجودگی کا اظہار کرتے ہیں - ان کے وجود سے واقعاتی طور پر نہ کوئی انکار کر سکتا ہے اور نہ منطقی طور پر کوئی شخص ان کوتاہیوں کو جائز اور درست ٹھہرا سکتا ہے - کیونکہ زبانی اقرار اور تحریر و بیان کی حد تک تو نصب العین وہی ہے جو آپ بیان کرتے ہیں اور قافلہ کو جمع کرنے کے لئے جس کا اعلان کیا گیا تھا -

لیکن ذہن و فکر میں چونکہ نصب العین وہ نہیں رہا جو آپ بیان کر رہے ہیں بلکہ منزلِ مقصود کچھ اور ہی شئی بن چکی ہے جس کے حصول کے تقاضے کچھ دوسرے ہی ہیں اس لئے زبانی طور پر خواہ آپ کی تنقید کی سچائی کو تسلیم کیا جائے لیکن عملی طور پر اُسی رستے پہ قدم بڑھتے ہیں - اور اُن ہی طور طریقوں کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے جو اس بدلے ہوئے

اس کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ لوگوں نے غلط انداز اختیار کیا ہے لیکن میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں ۔

عربوں کے تمدّن اور اُن کی عادات سے بھی واقف ہونا ضروری ہے ۔ جس ماحول میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اُس سے بھی ہم باخبر ہوں ۔ قرآن مجید میں آتا ہے ۔ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا ۔ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم مکان کے پچھواڑے سے آؤ بلکہ نیکی یہ ہے کہ تم دروازہ سے داخل ہو ۔ اب اس سے کیا سمجھا جائے ۔ اس کا کیا مطلب ہے ؟ یہ کیوں فرمایا گیا ہے ۔ یہ اُن کی عادت تھی کہ جب وہ طواف کرنے جاتے تھے اور طواف کرکے واپس آتے تھے تو جس دروازے سے جاتے تھے اُس سے واپس نہیں آتے تھے مقصد اُن کا یہ مقصد تھا کہ طواف کرنے کے بعد اب پاک ہوگئے ہیں اس لئے اُس ناپاک دروازے سے داخل نہیں ہوں گے بلکہ پچھواڑے سے داخل ہوں گے ۔ اب اگر ہمیں اُن کی یہ عادت معلوم ہے تو قرآن مجید کا بیان سمجھ میں آجاتا ہے ۔ قرآن مجید نے نیکی کے اس تصوّر کی تردید کی ہے کہ اگلے دروازہ سے نہ آیا جائے بلکہ پچھواڑے سے آیا جائے ۔ یہ کوئی نیکی نہیں ہے ۔ نیکی تو تقویٰ کا نام ہے تقویٰ اختیار کرو ۔ اللہ کا خوف اختیار کرو ۔

اسی طرح قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے کتب سماوی بھی معاون ہوتی ہیں ۔ اگرچہ یہ ایک بڑا لمبا معاملہ ہے ۔ لیکن جو لوگ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کو سمجھیں تو ایسی تفسیر جس میں موازنہ کیا گیا ہو ۔ وبضدّها تتبيّن الاشياء ضد سے اشیا کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے ۔ نور کی قدر ظلمت سے ہوتی ہے ۔ جب بجلی چلی جاتی ہے تو روشنی کی قدر ہوتی ہے جب بجلی آجاتی ہے تو روشنی ہوجاتی ہے اور خوشی ہوتی ہے ۔ اسی طرح پر بائبل اور تورات میں جو چیزیں ہیں انہیں سامنے رکھیں پھر قرآن مجید پڑھیں تو تم کہیں زیادہ لُطف محسوس ہوتا ہے ۔ اور بعض الفاظ کے اضافہ کی قدر معلوم ہوتی ہے ۔ مثلاً قرآن مجید میں آتا ہے ۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ ۝ (سورۃ قٓ ۔ آیت ۳۸) کہ ہم نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ۔ چھ دنوں میں ۔ اور

سلطان جی کی وفات ۷۲۵ھ میں ہوئی، ان کے جانشین چراغ دہلیؒ کی وفات ۱۳۵۷ء میں ہوئی۔ چراغ دہلیؒ یعنی حضرت خواجہ نصیر الدین اودھیؒ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب خبطی سلطان محمدؔ تغلق کی وفات کے بعد اس کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو اُس وقت حضرت چراغ دہلی ٹھٹھے میں موجود تھے۔ کیونکہ محمدؔ تغلق انہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور اس خبطی کو پاجامہ پہنانے کی ڈیوٹی ان کے ذمے تھی۔ اس خبطی سلطان کے بھتیجے نے جس کا نام سلطان فیروز تغلق تھا حضرت سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ وعدہ کرو کہ "تم ساری عمر تبلیغ کرو گے!" چنانچہ حضرت کی دعا قبول ہو گئی۔ جب وہ بادشاہ ہوا تو اس نے تبلیغ و اشاعتِ اسلام کیلئے ہندوستان میں پہلا اور آخری تبلیغی کالج قائم کیا۔ اس کی تبلیغ کے لئے 'فرشتہ' کا مطالعہ کافی ہے۔

اس کالج سے ہزاروں مبلّغین تیار ہو کر نکلے جنھوں نے ہندوستان میں تبلیغ کی اور لاکھوں ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ افسوس صد افسوس! سلطان فیروز تغلق کے بعد پھر اس ملک میں دوسرا سلطان فیروز پیدا نہ ہو سکا۔ تیسرا سلطان جس نے تبلیغ کی وہ سلطان سکندر بت شکن تھا جو ایک چشتی صوفی کا مرید تھا۔

چوتھا سلطان جس نے تبلیغ کی وہ سلطان سکندر لودھی تھا۔ جس نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ جو ہندو مسلمان ہو جائے اسے میرے پاس روانہ کیا جائے تاکہ میں اسے شاہی مہمان بناؤں اور چلتے وقت بیس بیس تولے کے دو کڑے اور خلعتِ فاخرہ عطا کروں۔

پانچواں سلطان جس نے تبلیغ کی سلطان محمود بیگڑھا تھا جو حضرت شاہ عالم سہروردی کا مرید تھا۔ ۱۵۱۱ء میں وفات پائی۔

چھٹا اور آخری سلطان جس نے تبلیغ کی وہ سلطان ٹیپو شہید تھا جو ٹیپو مستان ملیسوریؒ کا مرید تھا۔ ۱۷۹۹ء میں شہادت کا مرتبہ حاصل کیا: ع

"ٹیپو بوجہ دینِ محمدؐ شہید شد!"

— (تاریخِ شہادت "شمشیر گم شد" ۱۲۱۴ھ) اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ جن جن بادشاہوں نے تبلیغ کی وہ سب کسی نہ کسی صوفی شیخ کے مرید تھے یعنی